مفردات القرآن (اردو)
تصنیف
امام راغب اصفہانی
ترجمہ وحواشی
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری مدظلہ
حصہ دوم
اسلامی اکادمی
اردو بازار لاہور فون: ۷۳۵۷۵۸۷-۰۴۲

مفردات القرآن (اردو)

جلد دوم

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

شیخ شمس الحق

۲۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

اہتمام: محمد رمضان محمدی، محمد سلیم جلالی

www.KitaboSunnat.com

تعداد: 1000

ناشر: .... شیخ شمس الحق

مطبع: .... عرفان افضل پریس

اسلامی اکیڈیمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور

Phone: 042-7357587

کتاب الصاد

(ص ب ب)

صَبُّ الْمَاءِ کے معنی اوپر سے پانی گرانا کے ہیں۔محاورہ ہے: صَبَّ الْمَاءَ فَانْصَبَّ وَصَبَبْتُهٗ فَتَصَبَّبَ: یعنی اس نے اوپر سے پانی گرایا چنانچہ پانی گر گیا، قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا﴾ (۸۰۔۲۵) ''بے شک ہم نے ہی (اوپر سے) پانی برسایا۔''

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹۔۱۳) تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ﴾ (۲۲۔۱۹) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی گرایا جائے گا۔

صَبَّ اِلٰی کَذَا صَبَابَةً: عاشق ہونا۔اور صفت کا صیغہ خاص کر صَبٌّ (بروزن فَعْلٌ) آتا ہے۔

چنانچہ محارہ ہے۔

فُلَانٌ صَبٌّ بِکَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے۔اور صِرْمَةٌ کی طرح صَبَّةٌ کے معنی بھی جانوروں کی ٹکڑی یا جماعت کے ہیں۔ اَلصَّبِیْبُ: بارش کا پانی۔کسی چیز کا عصارہ۔بہایا ہوا خون۔اَلصَّبَابَةُ وَالصُّبَّةُ: کسی چیز کا باقی ماندہ جو گرانے کے لائق ہو تَصَابَبْتُ الاناء (تَفَاعِلٌ) میں نے برتن سے باقی ماندہ پانی بھی پی لیا۔تَصَبْصَبَ (تَفَعْلَلَ) کسی چیز کا باقی ماندہ بھی ختم ہو جانا۔

(ص ب ح)

اَلصُّبْحُ وَالصَّبَاحُ: دن کا ابتدائی حصہ جب کہ افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔قرآن پاک میں ہے:

﴿أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ﴾ (۱۱۔۸۱) کیا صبح کچھ دور ہے فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷۔۱۷۷) تو جن کو ڈرسنایا گیا ہے ان کے لیے برا دن ہوگا۔

اَلتَّصَبُّحُ صبح کے وقت سونا۔اَلصَّبُوْحُ صبح کی شراب کو کہتے ہیں اور صَبَحْتُهٗ کے معنی صبح کی شراب پلانے کے ہیں۔

اَلصَّبْحَانُ: صبح کے وقت شراب پینے والا (مؤنث صَبْحٰی) اَلْمِصْبَاحُ (۱) پیالہ جس میں صبوحی پی جائے (۲) وہ اونٹ جو صبح تک بیٹھا رہے (۳) قندیل جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكَاةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ﴾ (۲۴۔۳۵)

اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ اور چراغ ایک قندیل میں ہے۔

اور چراغ کو مِصْبَاحٌ کہا جاتا ہے اور صُبَاحٌ کے معنی بتی کی لو کے ہیں۔اَلْمَصَابِیْحُ چمکدار ستارے جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ﴾ (۶۷۔۵) اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی۔

صَبَّحْتُهُمْ مَاءَ کَذَا: میں صبح کے وقت ان کے پاس فلاں

پانی پر جا پہنچا❶ اور کبھی صُبْحٌ یَا صَبَاحٌ کی مناسبت سے بالوں کی سخت سرخی کو بھی صُبْحٌ کہا جاتا ہے۔
صَبُحَ فُلَانٌ خوبصورت اور حسین ہونا۔❷

(ص ب ر)

اَلصَّبْرُ کے معنی ہیں: کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا چنانچہ صَبَرْتُ الدَّابَّۃَ کے معنی ہوں گے: میں نے جانور کو کھلائے بغیر باندھ رکھا۔
صَبَرْتُ فُلَانًا: میں نے اسے زبردستی قسم کھلائی۔ لہٰذا اَلصَّبْرُ کے معنی ہوئے: عقل وشریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا پس صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ جَزْعٌ کی ضد ہے اور جنگ میں نفس کو روک رکھنا کو شجاعت کہا جاتا ہے اس کی ضد جُبْنٌ (بزدلی) ہے۔ یہی صبر اگر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصَّدْرِ (کشادہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ضَجْرٌ ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے کِتْمَانٌ کہتے ہیں اس کی ضد مَذَلٌ (مجبور ہو کر راز فاش کر دینا) ہے۔ قرآن پاک نے ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔❸ چنانچہ فرمایا:
﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ (۲۔۱۷۷) سختی اور تکلیف کے وقت ثابت قدم رہیں۔
﴿وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ﴾ (۳۳۔۳۵) صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔
اور روزہ کو صَبْرٌ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبطِ نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا۔❹ (۱) صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةِ آيَّامٍ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ يُذْهِبُ وَحْرَ الصَّدْرِ: ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (۲۔۱۷۵) یہ آتش (جہنم) کی کیسی برداشت رکھنے والے ہیں۔ کی تفسیر میں ابوعبیدہ نے کہا ہے۔❺ کہ لغت میں صبر کے معنی جرات بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے اپنے خصیم سے کہا۔❻
مَآ اَصْبَرَكَ عَلَى اللهِ کہ تم خدا پر کتنے جری ہو۔

---

❶ راجع الآية (٥٤۔٣٨).
❷ واصبح يأتي بمعنى صار كما في الآية (٥۔٣٠)(٣۔١٠٢).
❸ وقد فصل الغزالي في الاحياء (٤: ٦٦۔٦٧) احسن تفصيل و ابسط من هذا فليراجع اليه وقد كان المولف معاصراً للغزالي والغزالي مع فضله كان يستفيد من كتب المولف كما ذكرنا في التقدمة.
❹ وفي الكنز عن اعرابي مرفوعاً: صم شهر الصبر وصوم ثلاثة ايام من كل شهر يذهبن و حرا الصدر و بمعناه راجع ابن جرير عن عليؓ موقوفاً (٨: رقم ٣٠٢٠، ٣٠١٦، ٣٠٢١).
❺ لم اجده في مجازه بل قالهٗ ابن قتيبة في مشكله (٦٩) وحكى عن الفراء من الاصمعي قول الاعرابي فابن قتيبة تصحف بابي عبيدة و نسب الطبري هذا المعنى الى قتادة واختاره (٢: ٩١۔٩٢) وايضاً قارن حجاز ابي عبيدة (١: ٤٦) ولحكاية الاعرابي معاني القرآن للفراء (١: ١٠٣) والكشاف (١: ١٠٨).
❻ حكاهٗ والاصمعي عن قاضي اليمن (المشكل ٦٩).

لیکن یہاں مجاز بصورت حقیقت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے گناہ پر جرأت کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کیا اور جن لوگوں نے اس کے معنی مَـا اَلْقَاهُمْ عَلَى النَّارِ یا مَا اَعْمَلَهُمْ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّـارِ کیئے ہیں ❶ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ کبھی صبر کے ساتھ وہ شخص بھی متصف ہوتا ہے جو درحقیقت تو صابر نہ ہو لیکن بظاہر دیکھنے میں صابر نظر آتا ہو لہٰذا اس موقع پر صیغہ تعجب کا استعمال مخلوق کے لحاظ سے ہے نہ کہ باری تعالیٰ کے لحاظ سے اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا﴾ (۳۔۲۰۰) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو۔

کے معنی ہیں کہ عبادت الٰہی پر اپنے آپ کو روک رکھو اور خواہشات نفسانی کے خلاف جہاد کرو اور آیت کریمہ:

﴿وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ﴾ (۱۹۔۶۵) اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہو، میں اِصْطَبِرْ کے معنی مشقت کے ساتھ صبر کرنے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اُوْلٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے جو تکالیف انہوں نے برداشت کیں اس کے بدلے انہیں جنت میں بالا خانے دیئے جائیں گے اور آیت:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ﴾ (۱۲۔۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے۔ میں صبر کا حکم اور اس کی تلقین ہے۔

اَلصَّبُوْرُ: صبر پر قدرت رکھنے والا۔ صَبَّارٌ کے معنی تکلیف اور مجاہدہ سے صبر کرنے والے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ (۳۴۔۱۹) اس میں ہر صابر شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور چونکہ انتظار میں صبر لازم ہے بلکہ یہ صبر ہی کی ایک قسم ہے اس لیے کبھی صبر کا لفظ بول کر انتظار کے معنی مراد لے لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (۶۸۔۴۷) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو۔ یعنی کفار پر خدا کے حکم کا انتظار کیجئے۔

(ص ب غ)

اَلصَّبْغُ: یہ صَبَغْتُ (ص) کا مصدر ہے اور صِبْغٌ بمعنی مَصْبُوْغٌ آتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۳۸) (کہہ دو کہ ہم نے) خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے اور وہ اس کے ذریعہ بہائم سے ممتاز ہوتا ہے جیسا کہ فطرت انسانیہ۔

نصاریٰ کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ ساتویں روز اسے ''عمودیۃ'' (زرد رنگ کے پانی) میں غوطہ دیتے اور اس کا نام صِبْغَةٌ یعنی دین رکھتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے دین کو صِبْغَةَ اللهِ کہا اور فرمایا۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ (۲۔۱۳۸) خدا سے بہتر رنگ یعنی دین کس کا ہو سکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ﴾ (۲۳۔۲۰) اور کھانے والے کے لیے سالن۔ میں صِبْغٍ کے معنی سالن کے ہیں اور یہ اَصْبَغْتُ بِالْخَلِّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سرکہ میں روٹی ڈبو کر کھانے کے ہیں۔

❶ منسوب الی مجاهدؒ.

(ص ب و)

اَلصَّبِیُّ: نابالغ لڑکا۔رَجُلٌ مُصْبٍ: عیال دار جس کے بچے نابالغ ہوں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا﴾ (۱۹۔۲۹) (وہ بولے کہ)ہم اس سے جو کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

صَبَا فُلَانٌ یَصْبُوْ صَبْوًا وَصَبْوَۃً: کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَصْبُ اِلَیْھِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰھِلِیْنَ﴾ (۱۲۔۳۳) تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل ہو جاؤں گا۔

اَصْبَانِیْ فَصَبَوْتُ اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں گرویدہ ہو گیا۔

اَلصَّبَا: پروائی ہوا۔صَابَیْتُ السَّیْفَ: الٹی تلوار نیام میں ڈالی۔صَابَیْتُ الرُّمْحَ: نیزہ مارنے کے لیے جھکا دیا۔

اَلصَّابِئُوْنَ: ایک فرقے کا نام ہو جو نوح علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صَابِئٌ کہا جاتا ہے۔یہ صَبَاَ نَابُ الْبَعِیْرِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: اونٹ کے کچلی نکل آئی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالصّٰبِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی﴾ (۲۲۔۱۷) اور ستارہ پرست اور عیسائی۔

﴿وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ (۲۔۶۲) اور عیسائی یا ستارہ پرست۔

اور ایک قرات میں صَابِیْنَ (بدوں ہمزہ کے) ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لَا یَاْکُلُہٗٓ اِلَّا الْخَاطُوْنَ﴾ (۶۹۔۳۷) جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

میں اَلْخَاطُوْنَ اصل میں خَاطِئُوْنَ ہے۔اور بعض نے کہا: نہیں بلکہ یہ صَبَا یَصْبُوْ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونا اور جھکنا کے ہیں۔ (1)

(ص ح ب)

اَلصَّاحِبُ کے معنی ہیں: ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو،جس کے متعلق کہ شاعر نے کہا ہے (الطویل) (2) (۲۷۲) لَئِنْ غِبْتَ عَنْ عَیْنِیْ لَمَا غِبْتَ عَنْ قَلْبِیْ (اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے) اور عرف میں "صاحب" صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی "ھُوَ صَاحِبُہٗ" کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف

---

(1) وکذا ذکر المؤلف تحت (ص ب و).

(2) وصدرہ: انا والذی لو شاء لم یخلق الھویٰ۔ والبیت فی الامالی (۲: ۱۹۲) وقال انشدنا منصور بن بشر و فیہ النوی، بدل الھوی والحصری فی زھرہ (۱: ۱۹۳) بغیر عزو وفیہ فما بدل لما و بعدہ: یوھمنیك الشوق حتی کانما انا جیك عن قرب وان لم تکن قربی وفی روایۃ تربنیك ولم اجد من عزاہ الی قائلہ.

کا مالک ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَاتَحْزَنْ﴾ (۹۔۴۰) اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔
﴿قَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ وَھُوَ یُحَاوِرُہٗ﴾ (۱۸۔۳۷) تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔
﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَھْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۱۱۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔
﴿وَاَصْحَابُ مَدْیَنَ﴾ (۲۲۔۴۴) اور مدین کے رہنے والے بھی۔
﴿اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ﴾ (۲۔۸۲) وہ جنت کے مالک ہوں گے (اور) ہمیشہ اس میں (عیش کرتے) رہیں گے۔
﴿وَلَاتَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (۶۸۔۴۷) اور مچھلی (کا لقمہ ہونے والے یونسؑ) کی طرح نہ ہونا۔ اور آیت کریمہ:
﴿مِنْ اَصْحَابِ السَّعِیْرِ﴾ (۳۵۔۶۰) (تاکہ وہ) دوزخ والوں میں ہوں۔اور آیت کریمہ:
﴿وَمَاجَعَلْنَا اَصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً﴾ (۷۴۔۳۱) اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔
میں اَصْحَابَ النَّارِ سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
پھر ''صاحب'' کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہوتا ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صَاحِبُ الْجَیْشِ (فوج کا حاکم) اور کبھی حاکم کی طرف جیسے: صَاحِبُ الْاَمِیْرِ (بادشاہ کا وزیر) اَلْمُصَاحَبَۃُ وَالْاِصْتِحَابُ میں بنسبت لفظ اَلْاِجْتِمَاع کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مُصَاحَبَۃٌ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے۔ اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے۔لہٰذا اِصْطِحَابٌ کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اِصْطِحَابٌ کا لفظ نہیں بول سکتے۔اور آیت کریمہ:
﴿مَابِصَاحِبِکُمْ مِّنْ جِنَّۃٍ﴾ (۳۴۔۴۶) تمہارے رفیق کو سودا نہیں۔میں آنحضرتؐ کو صَاحِبُکُمْ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا دیوانگی پائی جاتی ہے.....؟ یہی معنی آیت:
﴿وَمَاصَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (۸۱۔۲۲) کے ہیں۔ اَلْاِصْحَابُ لِشَیْءٍ کے معنی ہیں: وہ فرمانبردار ہو گیا اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ رہنے کے ہیں۔چنانچہ اَصْحَبَ فُلَانٌ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا بیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔اور اُصْحِبَ فُلَانٌ فُلَانًا کے معنی ہیں: وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا قرآن میں ہے:
﴿وَلَاھُمْ مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ﴾ (۲۔۴۲) اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔
یعنی ہماری طرف سے ان پر سکینت، تسلی کشائش وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔
اَدِیْمٌ مُصْحَبٌ: کچا چمڑہ جس سے بال نہ اتارے

گئے ہوں۔

(ص ح ف)

اَلصَّحِیْفَۃُ کے معنی پھیلی ہوئی چیز کے ہیں جیسے صَحِیْفَۃُ الْوَجْہِ (چہرے کا پھیلاؤ) اور وہ چیز جس میں کچھ لکھا جاتا ہے اسے بھی صحیفہ کہتے ہیں اس کی جمع صَحَائِفُ و صُحُفٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿صُحُفِ اِبْرَاھِیْمَ وَمُوْسٰی﴾ (۸۷۔۱۹) یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اور آیت کریمہ:

﴿یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ﴾ (۹۸۔۳۰) پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم (آیتیں) لکھی ہوئی ہیں، میں بعض نے کہا ہے کہ صُحُفٌ سے قرآن پاک مراد ہے اور اس کو صُحُفًا اور فِیْھَا کُتُبٌ اس لیے کہا ہے کہ قرآن پاک کتب سابقہ کی بنسبت بہت سے زائد احکام اور نصوص پر مشتمل ہے۔

اَلْمُصْحَفُ متعدد صحیفوں کا مجموعہ اس کی جمع مَصَاحِفُ آتی ہے اور اَلتَّصْحِیْفُ کے معنی اشتباہ حروف کی وجہ سے کسی صحیفہ کی قراءت یا روایت میں غلطی کرنے کے ہیں۔

اور صَحْفَۃٌ (چوڑی رکابی) چوڑے پیالے کی طرح کا ایک برتن۔ [1]

(ص خ خ)

اَلصَّآخَّۃُ یہ صَخَّ یَصِخُّ صَخًّ فَھُوَ صَاخٌّ سے اسم ہے جس کے معنی کسی ذی نطق کی آواز کی سختی اور کرخت پن کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ﴾ (۸۰۔۲۲) تو جب (قیامت کا) غل مچے گا۔ میں صَآخَّۃٌ سے مراد قیامت ہے جس کی طرف کہ آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ﴾ (۲۰۔۱۰۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور اسی سے اَصَاخَ یُصِیْخُ مقلوب ہے۔ جس کے معنی آواز کی سختی سے کسی کو بہرہ کر دینا کے ہیں۔

(ص خ ر)

اَلصَّخْرُ کے معنی سخت پتھر یا چٹان کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ﴾ (۳۱۔۳۱) اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر ﴿وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹۔۹) اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے وادی (قری) میں چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)

(ص د د)

اَلصُّدُوْدُ وَالصَّدُّ: کبھی لازم ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے روگردانی اور اعراض برتنے کے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَیَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا﴾ (۴۔۶۱) کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔

اور کبھی متعدی ہوتا ہے یعنی روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ فَصَدَّھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ﴾ (۲۹۔۳۸) اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر دکھائے اور ان کو سیدھے راستے سے روک دیا۔

﴿اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (۱۶۔۱۸۸) جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا

---

[1] و جمعه صِحَاف (٦٣-٧١).

کے رستے سے روکا۔

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۸۔۴۷)اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

﴿قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَّصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۱۷)(اے پیغمبر) کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا۔

﴿وَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللّٰهِ بَعْدَ إِذْ أُنْزِلَتْ إِلَيْكَ﴾ (۲۸۔۸۷)اور وہ تمہیں خدا کی آیتوں (کی تبلیغ) سے بعد اس کے کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں روک نہ دیں۔

علٰی هٰذا القیاس اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور صُدُوْدٌ وَصَدٌّ دونوں مصدر ہیں۔نیز پہاڑ کی روک کو بھی صَدٌّ کہا جاتا ہے۔[1]

اَلصَّدِيْدُ: پیپ کیونکہ وہ چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور دوزخیوں کے طعام کو بطور مثال کے صدید کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَيُسْقٰى مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ﴾ (۱۴۔۱۶)اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔

(ص د ر)

اَلصَّدْرُ: سینہ کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ (۲۰۔۲۵)میرے پروردگار! اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دے۔اس کی جمع صُدُوْرٌ آتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں۔پھر بطور استعارہ ہر چیز کے اعلیٰ (اگلے) حصہ کو صَدْرٌ کہنے لگے ہیں جیسے صَدْرُ الْقَنَاةِ (نیزے کا بھالا) صَدْرُ الْمَجْلِسِ (رئیس مجلس) صَدْرُ الْكِتَابِ اور صَدْرُ الْكَلَامِ وغیرہ صَدَرَهٗ کے معنی کسی کے سینہ پر مارنے یا اس کا قصد کرنے کے ہیں جیسا کہ ظَهَرَهٗ وَكَتَفَهٗ کے معنی کسی کی پیٹھ یا کندھے پر مارنا کے آتے ہیں۔اور اسی سے رَجُلٌ مَصْدُوْرٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ شخص جو سینہ کی بیماری میں مبتلا ہو پھر جب صَدَرَ کا لفظ عَنْ کے ذریعہ متعدی ہو تو معنی اِنْصَرَفَ کو متضمن ہوتا ہے جیسے۔صَدَرَتِ الْإِبِلُ عَنِ الْمَاءِ صَدَرًا وَصَدْرًا: اونٹ پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹ آئے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ (۹۹۔۶)اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

اور مَصْدَرٌ کے اصل معنی پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹنا کے ہیں یہ ظرف مکان اور زمان کے لیے بھی آتا ہے اور علمائے نحو کی اصطلاح میں مَصْدَرٌ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے فعل ماضی اور مستقبل کا اشتقاق فرض کیا گیا ہو اور صِدَارٌ بروزن دِثَارٌ وَلِبَاسٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے سینہ ڈھانپا جائے اور اسے صُدْرَةٌ بھی کہا جاتا ہے اور صِدَارٌ اس داغ کو کہتے ہیں جو اونٹ کے سینہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

صَدَّرَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں اول آنا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صرف علم و عقل کی طرف اشارہ

---

[1] وایضاً صدَّ (ض) يَصِدُّ صَدِيْدًا (۴۳۔۵۷)۔

ہے جیسے فرمایا:
﴿اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ---﴾ (۵۰۔۳۷) جوشخص دل آگاہ رکھتا ہے اس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔
اور جہاں صَدُوْرٌ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے وہاں علم وعقل کے علاوہ شہوت، ہوائے نفس اور غضب وغیرہ قوی نفسانیہ کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:
﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ﴾ (۲۰۔۲۵) میں نفسانی قوی کی اصلاح کا ہی سوال ہے اسی طرح آیت کریمہ:
﴿وَشِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۱۰۔۵۷) میں بتایا ہے کہ قرآن پاک نفسیاتی امراض کے لیے شفا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۴) میں اشارہ ہے کہ مومن ہی اس سے نفسیاتی شفا حاصل کرتے ہیں۔
اور آیت کریمہ: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔
میں قلوب سے مراد وہ عقول ہیں جو جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کر ان میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور صحیح راستے کی طرف ہدایت نہیں پاسکتیں۔

(ص د ع)

اَلصَّدْعُ: کے معنی ٹھوس اجسام۔جیسے شیشہ لوہا وغیرہ میں شگاف ڈالنا کے ہیں۔❶ صَدَعَ (ف) وَصَدَّعَ متعدی ہے اور اِنْصَدَعَ وَتَصَدَّعَ لازم اسی سے استعارہ کے طور پر صَدَعَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے ظاہر اور واضح کر دینے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۵۔۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے اسے کھول کر بیان کرو اور اسی سے صُدَاعٌ کا لفظ مستعار ہے جس کے معنی دردِ سر کے ہیں جس سے گویا سر پھٹا جارہا ہو۔قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۹) اس سے نہ تو دردسر ہوگا اور نہ ان کی عقلیں زائل ہوں گی۔
اور اسی صَدِيْعٌ بمعنی فجر ہے۔اور صَدَعْتُ الْفَلَاةَ کے معنی بیاباں طے کرنے کے ہیں۔تَصَدَّعَ الْقَوْمُ: لوگ منتشر ہوگئے۔قرآن میں ہے:
﴿يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ﴾ (۳۰۔۴۳) اس روز سب لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔

(ص د ف)

صَدَفَ عَنْهُ کے معنی سخت اعراض برتنے کے ہیں اور اَلصَّدْفُ: اصل میں (۱) پہاڑ کے کنارہ (۲) سیپ اور (۳) اونٹ کی ٹانگوں میں کجی کو کہتے ہیں پھر ٹانگوں کے ٹیڑھے پن یا پہاڑ اور سیپ کی سختی کے اعتبار سے شدت اعراض کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے قران پاک میں ہے:
﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِی الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ......بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۵۷) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور ان سے منہ پھیر لے

---

❶ وفی القرآن: وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۸۶۔۱۲)۔

جو ہماری آیتوں سے اعراض برتتے ہیں اس اعراض کے سبب ہم ان کو......سزا دیں گے۔

(ص د ق)

اَلصِّدْقُ: یہ اَلْکِذْبُ کی ضد ہے۔اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔پھر قول میں بھی صرف خبر کے لیے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے۔اسی لیے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (۴۔۱۲۲)اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ (۱۹۔۵۴)وہ وعدے کے سچے......تھے۔

مگر کبھی بالعرض یعنی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام مثلاً استفہام امر دعا وغیرہ کے لیے بھی آجاتے ہیں مثلاً: اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ؟ (کیا زید مکان کے اندر موجود ہے؟) بظاہر استفہام کلام ہے مگر ضمناً اس میں خبر کے معنی بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ متکلم زید کی حالت سے بے خبر ہے اسی طرح وَاسِنِیْ (میرے ساتھ ہمدردی کیجئے) اصل میں درخواست ہے مگر ضمناً معنی خبر مفہوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ میں ہمدردی کا محتاج ہوں اسی طرح جب لَا تُؤْذِ (مجھے تکلیف مت دو) کہا جائے تو اس کے ضمن میں یہ معنی پایا جاتا ہے کہ وہ اسے ایذا پہنچاتا ہے۔

اَلصِّدْقُ کے معنی ہیں: دل وزبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ایسی صورت میں یا تو وہ کلام صدق کے ساتھ متصف ہی نہیں ہو گی اور یا وہ مختلف حیثیتوں سے کبھی صِدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگی۔مثلاً: ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صِدق (سچ) بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے دل وزبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کِذْبٌ (جھوٹ) بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس دوسری حیثیت سے اللہ نے منافقین کو ان کے اس اقرار میں کہ:

﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (۶۳۔۱)ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔جھوٹا قرار دیا ہے کیونکہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ بات کہہ رہے تھے۔

اَلصِّدِّيْقُ: بہت سچ بولنے والا۔بعض نے کہا ہے: نہیں بلکہ صِدِّيْقٌ اسے کہتے ہیں ''جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو'' اور بعض نے کہا ہے: بلکہ صِدِّيْقٌ وہ ہے جو سچ کا اس قدر خوگر ہو کہ اس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو۔اور بعض کے نزدیک صدیق وہ ہے جو قول واعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی صِدِّيْقٌ اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (۱۹۔۴۱)اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔

﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ (۵۔۷۵)اور ان کی والدہ (مریم علیہا السلام) خدا کی ولی تھی۔اور آیت:

﴿مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾ (۴۔۲۹)

یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء میں صِدِّیْقِیْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ کم درجہ کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم اپنی کتاب "الذريعة الى مكارم الشريعة" میں بیان کر چکے ہیں۔ کبھی صدق وکذب کا استعمال ہر اس چیز کے متعلق ہوتا ہے جو عقیدۃ میں ثابت اور موجود ہو جیسے صَدَقَ ظَنِّیْ وَكَذَبَ (اس نے میرا گمان سچ کر دکھایا یا جھوٹ کر دکھایا) اور کبھی ان کا استعمال افعال جوارح کے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً: کوئی شخص جنگ میں حق شجاعت ادا کرے اور جو کچھ اور جیسا کہ اس پر واجب ہو اسے کر دکھائے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔ صَدَقَ فِی الْقِتَالِ (وہ جنگ میں سچا رہا) اور اگر اس کے خلاف کرے تو كَذَبَ فِی الْقِتَالِ (یعنی وہ جنگ میں جھوٹا نکلا) کہا جاتا ہے اسی کے مطابق قرآن پاک میں ہے:

﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ (۳۳۔۲۳) یعنی ایسے شخص بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ﴾ (۳۳۔۱۷) کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے سچ بولنے والوں سے ان کی عملی سچائی کے متعلق دریافت کرے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ نجات کے لیے زبان سے حق کا اعتراف ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ انسان عملاً اسے پورا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾ (۴۸۔۲۷) میں صدق فعلی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی خواب کو عملاً سچ کر دکھایا اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ﴾ (۳۹۔۳۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو سچائی لوگوں کے پاس لے کر آئے اور پھر اسے اپنے عمل سے بھی سچ کر دکھایا۔ نیز ہر وہ فعل جو ظاہر و باطن کے اعتبار سے فضیلت کے ساتھ متصف ہو اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے اس بنا پر ایسے فعل کو صدق کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) یعنی سچے مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰۔۲) کہ ان کے پروردگار کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔

﴿اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ﴾ (۱۷۔۸۰) (اور کہو کہ اے پروردگار) مجھے (مدینے) اچھی طرح داخل کیجئو اور مکے سے اچھی طرح نکالیو۔ اور آیت:

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِيْنَ﴾ (۲۶۔۸۴) اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک (جاری) کر۔ میں یہ دعا کی ہے کہ اللہ! مجھے ایسا صالح بنا دے کہ میری موت کے بعد جب لوگ میری تعریف کریں تو ان کی تعریف غلط نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسا کہ شاعر نے کہا[1] ہے۔

(۲۷۳) اِذَا نَحْنُ اَثْنَيْنَا عَلَيْكَ بِصَالِحٍ
فَاَنْتَ الَّذِیْ نُثْنِیْ وَفَوْقَ الَّذِیْ نُثْنِیْ

جب ہم کسی بھی اچھے کام پر تیری تعریف کرتے ہیں تو تم

---

[1] قاله ابو نواس فی مدح الامین والبیت فی الوساطة ۳۱۸ و دیوانه والصناعتین ۲۰۸ والحصری (٤ : ۷۱) وستة و بعده: وان جرت الالفاظ يوماً بمدحة لغيرك انسانا فانت الذی تعنی ۱۲۔

واقعی اس تعریف کے اہل نکلتے ہو بلکہ ہماری تعریف سے بھی تم بڑھ کر ہو۔

اور صَدَقَ کبھی دومفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (۳۔۱۵۲) اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا ہے۔

صَدَّقْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں کسی کو سچائی کی طرف منسوب کرنا اور اَصْدَقْتُهٗ کے معنی سچا پانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں فعل ہم معنی ہیں اور ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۲۔۱۰۱) اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغمبر (آخر الزماں) آئے اور وہ ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

﴿وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۵۔۴۶) اور ان پیغمبروں کے بعد انہی کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ جو اپنے سے پہلے (کی) کتاب (تورات) کی تصدیق کرتے تھے۔

اَلتَّصْدِيْق کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس میں کسی چیز کی تحقیق پائی جائے محاورہ ہے۔

صَدَّقَنِیْ فِعْلُهٗ وَكِتَابُهٗ: اس نے اپنے عمل یا کتاب سے میری تصدیق کر دی۔قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۲۔۸۹) اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۳۔۳) اس نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

﴿وَهٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا﴾ (۳۔۳) اور یہ کتاب عربی زبان میں ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یہاں لِسَانًا منصوب علی الحال ہے مثل مشہور ہے۔ [1] (مثل) صَدَقَنِیْ سِنَّ بَكْرِهٖ یعنی اس نے اپنے دل کی بات صحیح طور پر بتادی۔

اَلصَّدَاقَةُ کے معنی سچی دوستی کے ہیں اور یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ (۲۶۔۱۰۱) (تو آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔اس میں آیت کریمہ:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۷) جو (آپس میں) دوست (ہیں)، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اَلصَّدَقَةُ: (خیرات) ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور یہی معنی

---

[1] انظر للكلمة الميداني رقم (۲۰۸۳، ۲۱۱۰) وسن منصوب على معنى عرفني ديرنه ى بالرفع على التوسع قاله عليّ و ابو عمرو نسبه الى الاحنف حين رجع من عند معاوية والخبر فى الميداني واللسان (صدق) ۱۲۔

زکوٰۃ کے ہیں مگر صَدَقَةٌ اسے کہتے ہیں جو واجب نہ ہو اور زکواۃ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔اور کبھی واجب کو بھی صَدَقَةٌ سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔جب کہ خیرات دینے والا اس سے صدق یعنی صلاح تقویٰ کا قصد کرے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (۹۔۱۰۳)ان کے مال میں سے زکوۃ قبول کرلو۔

﴿اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ (۹۔۶۰)صدقات (یعنی زکوۃ وخیرات)تو مفلسوں کا حق ہے۔

صَدَّقَ وَتَصَدَّقَ کے معنی صدقہ دینے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ (۷۵۔۳۱)تو اس (نا عاقبت اندیش) نے نہ تو زکوۃ دی اور نہ نماز پڑھی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ﴾ (۱۲۔۸۸) کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے۔

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ﴾ (۵۷۔۱۸) جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی۔اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں اور تَصَدَّقَ بِهٖ کے معنی اپنے حق سے دست بردار ہو جانا بھی آتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ﴾ (۵۔۴۵)اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۸۰)اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زر قرض بخش ہی دو، تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔

میں مُعْسِرٌ یعنی تنگ دست کو معاف کر دینے کو صَدَقَةٌ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اسی معنی میں آنحضرت سے مروی ہے۔[1] (۲)

((مَا تَاْكُلُهُ الْعَافِيَةُ فَهُوَ صَدَقَةٌ)) کہ جو کھیتی جانور کھا جائیں وہ بھی صدقہ ہے۔

اسی بنا پر آیت کریمہ:

﴿فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا﴾ (۴۔۹۲) اور دوسرے مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے ہاں اگر وہ معاف کر دیں۔میں معاف کر دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً﴾ (۵۸۔۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔ میں صحابہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو شخص آنحضرت سے سرگوشی

[1] انظر مجمع البحار (۲/۴۱۳) والنهاية (صدق) وبمعناه متفق عليه من (وحم، ت) حديث انسؓ راجع الفتح (۵/۳۰۲) وفى الدارمى من حديث جابر: وما اكلت العافية منه و اى من حاصل الارض) ايضاً الترمذى و ابن حبان، عن جابر (كنزالعمال ج۳، ص:۵۱۳).

کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ سرگوشی سے پہلے حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کرے جس کی قرآن نے کوئی مقدار متعین نہیں کی تھی اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصَّالِحِیْنَ﴾ (۶۳۔۱۰) اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سے اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ میں اَصَّدَّقَ صِدْقٍ سے بھی ہوسکتا ہے اور صَدَقَۃٌ سے بھی۔

صَدَاقُ الْمَرْءَۃِ (بفتحہ صاد وکسرآں) وَصَدَقَتُھَا[1] کے معنی عورتوں کے مہر کے ہیں اور اَصْدَقْتُھَا کے معنی ہیں: میں نے اس کا مہر مقرر کیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صُدُقَاتِھِنَّ نِحْلَۃً﴾ (۴۔۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔

(ص د ی)

اَلصَّدٰی! صدائے بازگشت جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر واپس آئے اور اَلتَّصْدِیَۃُ (تفعیل) ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صَدَی کی طرح ہو یعنی جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔اور آیت:

﴿وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً﴾ (۸۔۳۵) اور لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں بتایا ہے کہ ان کی نماز بے معنی ہونے میں صدی یا پرند کی چہچہاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔اَلتَّصَدِّیْ: صدائے بازگشت کی طرح کسی چیز کے درپے ہونا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی﴾ (۸۰۔۵،۶) جو پرواہ نہیں کرتا اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو۔

اَلصَّدٰی کے معنی بومہ یا دماغ کے ہیں کیونکہ دماغ بھی بومہ کی شکل پر ہوتا ہے اسی لیے اس کو ہامہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے۔(مثل)

اَصَمَّ اللّٰہُ صَدَاہُ: خدا اسے ہلاک کرے۔یعنی اس میں آواز ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس کی صدائے بازگشت آئے۔

صَدًی: پیاس۔صَدْیَانٌ: پیاسا آدمی۔اِمْرَءَۃٌ صَدْیَاءُ وَصَادِیَۃٌ: پیاسی عورت۔

(ص ر ر)

اَلْاِصْرَارُ: کسی گناہ پر سختی سے جم جانا اور اس سے باز نہ آنا اصل میں یہ صَرٌّ سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور صُرَّۃٌ اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھ کر رکھ دی جاتی ہے اور صِرَارٌ (پستان بند) اس لتہ کو کہتے ہیں جس سے اونٹنی کے تھن باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کا بچہ دودھ نہ پی سکے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَافَعَلُوْہُ﴾ (۳۔۱۳۵) اور وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔

﴿ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا﴾ (۴۵۔۸) مگر پھر غرور سے ضد کرتا ہے۔

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

﴿وَکَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَی الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ﴾ (۵۶۔۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

[1] قال الجوھری اَلصُّدُقَۃُ بِالضم وتسکین الدال لغکن ور دفی القرآن صدقۃ بضم الدال و جمعہ صدُقات.

اَلْاِصْرَارُ: پختہ عزم کو کہتے ہیں ۔ محاورہ ہے:
هٰذَا مِنِّیْ صِرِّیْ وَاَصِرِّیْ وَصُرِّیْ وَصِرَّی وَصَرَّی وَصُرَّی: وہ مرد یا عورت جو حج نہ کرے وہ شخص جسے نکاح کی خواہش نہ ہو۔ ❶ اور آیت کریمہ:
﴿رِیْحًا صَرْصَرًا﴾ (۴۱۔۱۶) زور کی ہوا (چلائی) میں صَرْصَرٌ کا لفظ صِرٌّ سے ہے گویا سخت سرد ہونے کی وجہ سے اس میں بستگی پائی جاتی ہے۔
اَلصَّرَّةُ جماعت جس کے افراد باہم ملے جلے ہوں گویا وہ کسی تھیلی میں باندھ دیئے گئے ہیں ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ﴾ (۵۱۔۲۹) ابراہیم علیہ السلام کی بیوی چلاتی آئی۔
بعض نے کہا ہے کہ صَرَّۃٍ کے معنی چیخ کے ہیں ۔ ❷

(ص ر ح)

اَلصَّرْحُ: بلند، منقش و مزین مکان ۔ ہر قسم کے عیب سے پاک ہونے کے اعتبار سے اسے صَرْحٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ﴾ (۵۔۲۷۔۴۴) ایسا محل ہے جس کے (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں ۔
﴿وَقِیْلَ لَهَا ادْخُلِیْ الصَّرْحَ﴾ (۲۷۔۴۴) (پھر) اس سے کہا گیا کہ محل میں چلئے۔
لَبَنٌ صَرِیْحٌ: خالص دودھ۔ صَرِیْحُ الْحَقِّ: خالص حق جس میں باطل کی آمیزش نہ ہو صَرَّحَ فُلَانٌ فِیْ نَفْسِهٖ: فلاں نے اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر دی ۔ محاورہ ہے:
عَادَ تَعْرِیْضُكَ تَصْرِیْحًا: تمہاری تعریض نے تصریح کا کام دیا۔
جَاءَ صُرَاحًا: وہ کھلے بندوں آیا۔

(ص ر ط)

اَلصِّرَاطُ: سیدھی راہ ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا﴾ (۶۔۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔
اسے سِرَاط (بسین مهملة) پڑھا جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو (س ر ط)

(ص ر ع)

اَلصَّرْعُ: (ف) کے معنی ہیں: زمین پر پٹخ دینا، پچھاڑ دینا۔ صَرَعْتُهٗ صَرْعًا: میں نے اسے پچھاڑ دیا اَلصِّرْعَةُ: پچھڑے ہوئے آدمی کی حالت ۔ اَلصِّرَاعَةُ کشتی لڑنے کا فن ۔ رجل صَرِیْعٌ: پچھاڑا ہوا آدمی ۔ قَوْمٌ صَرْعٰی: پچھڑے ہوئے لوگ ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْهَا صَرْعٰی﴾ (۶۹۔۷) یعنی تم دیکھو گے کہ لوگ پچھڑے پڑے ہیں ۔
اور قرینتان کی طرح هُمَا صِرْعَان کہا جاتا ہے یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر اور مثل ہیں ۔
اَلْمِصْرَعَانِ مِنَ الْبَابِ: دروازے کے دو پٹ ۔ پھر تشبیہ کے طور پر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی مِصْرَعَانِ کہا جاتا ہے۔

---

❶ وفی روایة عن ابن عباس (لا صرورة فی الاسلام) رواه ابو داؤد والحاکم والطبرانی النیل (۶:۱۰۸) وقال الجاحظ فی الحیوان (۱:۳۴۸) انه اسم اسلامی وانظر بخصوص الحدیث وینسنك ۲۹۸ سطر ۱۳ والفائق ۲/۱۰.

❷ هکذا قال المفسرون و نقل ذالك عن ابن عباسؓ و مجاهد و قال ابو عبیدة معناه شدة الصوت وقال الزجاج: اَلصَّرَّةُ اَشَدُّ الصیاح تکون فی الطائر والانسان وغیرهما وما اعلم احداً من المفسرین ذهب الی ان المرامن صرة مهنا الجماعة والله اعلم.

(ص ر ف)

اَلصَّرْفُ: کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا کسی اور چیز سے بدل دینا۔ محاورہ ہے: صَرَفْتُہٗ فَانْصَرَفَ: میں نے اسے پھیر دیا چنانچہ وہ پھیر گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ﴾ (۳۔۱۵۲) پھر خدا نے تم کو ان کے مقابلے سے پھیر کر اُن کو بھگا دیا۔

﴿اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ﴾ (۱۱۔۸) دیکھو جس روز وہ ان پر واقع ہوگا پھر ٹلنے کا نہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (۹۔۱۲۷) میں بددعا بھی ہوسکتی ہے اور اس حالت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں پیدا کردی تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَمَا تَسْتَطِیْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا﴾ (۲۵۔۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں قدرت نہیں ہوگی کہ ہمارے عذاب کو اپنے آپ سے پھیر سکو یا اپنی جانوں کو آگ سے بچا سکو۔

اور بعض نے صَرْفًا کے معنی کیے ہیں کہ تم اپنی حالت کو تبدیل نہیں کرسکو گے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ [1] (۳)

مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ: یعنی نہ ان کا فرض قبول ہوگا اور لَا یَقْبَلُ نہ نفل۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ﴾ (۴۶۔۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا رخ تیری طرف پھر دیا یعنی ان کو تمہارے پاس لے آئے کہ تم سے قرآن پاک سنیں۔

اَلتَّصْرِیْفُ بمعنی صَرْفٌ ہے، لیکن اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر یہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا ایک امر سے دوسرے امر کی طرف تبدیل کرنے کے لیے آتا ہے اور ﴿تَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ﴾ (۲۔۱۶۴) کے معنی ہیں: ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ﴾ (۴۶۔۱۲۷) اور آیات کو لوٹا لوٹا کر بیان کردیا۔

﴿وَصَرَّفْنَا فِیْهِ مِنَ الْوَعِیْدِ﴾ (۲۰۔۱۱۳) اور اس میں طرح طرح کے وعید بیان کردیے ہیں۔

اور اسی سے محاورہ ہے:

تَصْرِیْفُ الْكَلَامِ: یعنی بات لوٹا لوٹا کر بیان کرنا۔

تَصْرِیْفُ الدَّرَاهِمِ: دراہم کو پرکھنے کے لیے الٹنا پلٹنا۔

تَصْرِیْفُ النَّابِ: دانت پیسنا کہا جاتا ہے۔ لِنَابِهٖ صَرِیْفٌ: وندانش بانگ کنند۔

اَلصَّرِیْفُ: (ایضًا) دودھ جس کے جھاگ بیٹھ گئے ہوں۔ گویا وہ جھاگ سے پھیر دیا گیا ہے یا جھاگ اس سے پھیر دیئے گئے ہیں۔

رَجُلٌ صَیْرَفٌ وَصَیْرَفِیٌّ وَصَرَّافٌ: سکہ پرکھنے والے یا ان کا تبادلہ کرنے والے۔ عَنْزٌ صَارِفٌ بکری جسے نر کی خواہش ہو اور اسے صَارِفٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نر کو اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کرتی ہے۔

---

[1] متفق علیه من روایة علیؓ و انسؓ و فی مسلم من روایة ابی هریرة رضی الله عنه انظر تخریج الکشاف للحافظ، رقم: ۵۰ قاله صلی الله علیه وسلم فی ذکر المدینة و فی الفائق ۲/ ۱۰ الصرف التوبة والعدل: الفدیة.

اَلصِّرْفُ: خالص سرخ رنگ اور ہر خالص چیز کو جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ صِرْفٌ کہا جاتا ہے گویا اس سے ملاوٹ کو پھیر دیا گیا ہے۔

اَلصَّرْفَانُ: قلعی یا سکہ۔گویا وہ چاندی کے برابر ہونے سے پھیر دیا گیا ہے۔

(ص ر م)

اَلصَّرْمُ: کے معنی ریوڑ کے ہیں اور الصَّرِیْمَۃُ کسی کام کے احکام اور ابرام کو کہتے ہیں اور ریت کے علیحدہ ٹکڑے کو اَلصَّرِیْمُ کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ﴾ (۶۸۔۲۰) تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔

کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ باغ ان درختوں کی طرح ہوگیا جن کے پھل کاٹ لیے گئے ہوں یعنی صَرِیْمٌ بمعنی مَصْرُوْمٌ ہے بعض نے کہا ہے کہ صَرِیْمٌ رات کو بھی کہتے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ یعنی کھیتی سوختہ ہوکر رات کی طرح سیاہ ہوگئی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ ڈالیں گے۔

﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ﴾ (۶۸۔۲۱) جب صبح ہوئی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگے: اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔

اَلصَّارِمُ: تیز تلوار۔نَاقَۃٌ مَصْرُوْمَۃٌ: اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو گیا ہو۔گویا اس کے پستان کاٹ دیے گئے ہیں۔ تَصَرَّمَتِ السَّنَۃُ: سال گزر گیا۔اِنْصَرَمَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا منقطع ہوجانا اَصْرَمَ الرَّجُلُ: وہ آدمی بدحال ہو گیا۔

(ص ط ر)

صَطَرَ وَسَطَرَ (ن) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی لکھنا (سیدھی لائنوں میں) اور آیت:

﴿اَمْ هُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ﴾ (۵۲۔۳۷) یا یہ (کہیں کہ) داروغہ ہیں۔میں اَلْمُصَیْطِرُوْنَ سَطَرٌ سے مُفَیْعِلٌ کے وزن پر ہے۔اور اَلتَّسْطِیْر، جس کے معنی لکھنے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ کیا تخلیق سے قبل یہ اپنے نوشتہ تقدیر کے لکھنے پر مقرر تھے (کہ انہیں ہر بات کا علم ہو چکا ہے؟ یعنی نہیں) اس میں آیت کریمہ: ﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ کِتَابٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔اور آیت ﴿کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ﴾ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن (لوح محفوظ) میں لکھ رکھا ہے کے معنی کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت:

﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ (۸۸۔۱۲۷) تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر لکھنے کے لیے مقرر نہیں ہو اور نہ ہی اس چیز کو ثابت کرنے کے ذمہ دار ہو جس کے یہ متولی بنتے ہیں اور عربی میں سَیْطَرْتُ وَبَیْطَرْتُ کے علاوہ تیسرا لفظ اس وزن پر نہیں آتا تشریح کے لیے دیکھئے (س ط ر)

(ص ع د)

اَلصُّعُوْدُ کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُوْدٌ اور نیچے اترنے کے

لحاظ سے حَدُوْرٌ کہا جاتا ہے۔اصل میں صَعَدٌ وَصَعِیْدٌ وَصَعُوْدٌ تینوں ہم معنی ہیں،لیکن صَعُوْدٌ وَصَعَدٌ کا لفظ عقبہ یعنی گھاٹی پر بولا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر دشوار اور گراں امر کو صَعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا.........﴾ (۷۲۔۱۷) اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیرے گا وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ (۷۴۔۱۷) ہم اسے صَعُوْدٌ پر چڑھائیں گے۔

اور صَعِیْدٌ کا لفظ وَجْهُ الْاَرْضِ یعنی زمین کے بالائی حصہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (۴۔۴۳) تو پاک مٹی لو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ صَعِیْدٌ اس گردوغبار کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھ جاتا ہے لہٰذا نماز کے تیمّم کے لیے ضروری ہے کہ گردوغبار سے ہاتھ آلودہ ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾ (۶۔۱۲۶) گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔میں یَصَّعَّدُ اصل میں یَتَصَعَّدُ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔

اَلْاِصْعَادُ: (افعال) بقول بعض اس کے معنی زمین میں دور تک چلے جانا کے ہیں۔عام اس سے کہ وہ جانا بلندی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔گو اس کے اصل معنی بلند جگہوں کی طرف جانا کے ہیں۔مثلاً بصرہ سے نجد یا حجاز کی طرف جانا بعدہٗ صرف دور نکل جانے پر اِصْعَادٌ کا لفظ بولا جانے لگا ہے جیسا کہ تَعَالَ کہ اس کے اصل معنی علو یعنی بلندی کی طرف بلانے کے ہیں اس کے بعد صرف آنے کے معنی میں بطور امر استعمال ہونے لگا ہے عام اس سے کہ وہ آنا بالائی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ﴾ (۳۔۱۵۳) جب تم لوگ دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اِصْعَادٌ سے دور نکل جانا مراد نہیں ہے۔بلکہ اشارہ ہے کہ انہوں نے بھاگنے میں عُلُوٌّ اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جیسے محاورہ ہے:

اَبْعَدْتُ فِیْ کَذَا وَارْتَقَیْتُ فِیْهِ کُلَّ مُرْتَقًی: یعنی میں نے اس میں انتہائی کوشش کی لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم نے دشمن کا خوف محسوس کرنے اور لگا تار ہزیمت کھانے میں انتہا کر دی اور استعارہ کے طور پر صُعُوْدًا کا لفظ انسانی اعمال کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو خدا تک پہنچتے ہیں جیسا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان تک پہنچتی ہے اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵۔۱۰) اسی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۷۲۔۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔میں صَعَدًا کے معنی شاق یعنی سخت کے ہیں اور یہ تَصَعَّدَ فِیْ کَذَا کے محاورہ سے ماخوذ

[1] قال الزجاج لا اعلم خلافاً بین اھل اللغة فی ذالك والطبری (۵: ۱۱۴).

ہے جس کے معنی کسی امر کے دشوار اور مشکل ہونے کے ہیں۔ (1) چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ (2) (۴)

(مَا تَصَعَّدَنِیْ اَمْرٌ مَا تَصَعَّدَ فِیْ خُطْبَةُ النِّکَاحِ) کہ مجھے کوئی چیز خطبہ نکاح سے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوتی۔

(ص ع ر)

اَلصَّعَرُ: کے اصل معنی گردن میں کجی کے ہیں۔ اور تَصْعِیْرٌ کے معنی ہیں تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا کرنا اور اعراض برتنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ (۳۱۔۱۸) اور (تکبر کی بنا پر) لوگوں سے روگردانی نہ کرو۔

اور ہر مشکل امر کو مُصْعَرٌ کہا جاتا ہے شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیدائشی طور پر اَصْعَرُ یعنی کج گردن ہوتا ہے۔

(ص ع ق)

اَلصَّاعِقَةُ اور صَاقِعَةٌ دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ لیکن صَقْعٌ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صَعْقٌ اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صَاعِقَةٌ تین قسم پر ہے۔ اول بمعنی موت اور ہلاکت جیسے فرمایا:

﴿فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۶۸) تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مر جائیں گے۔

﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ﴾ (۵۱۔۴۴) سو تم کو موت نے آ پکڑا۔

(دوم) بمعنی عذاب جیسے فرمایا:

﴿اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (۴۱۔۱۳) میں تم کو مہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔

(سوم) بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک) جیسے فرمایا:

﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۱۳۔۱۳) اور وہی بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گرا بھی دیتا ہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صَاعِقَہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں۔ پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

(ص غ ر)

اَلصِّغْرُ: یہ اَلْکِبْرُ کی ضد ہے جو کہ ایک دوسرے کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ایک ہی چیز دوسری چیز کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے اور وہی کسی چیز کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے پھر صغیر وکبیر کا اطلاق کبھی تو باعتبار زمانہ کے ہوتا ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے سے عمر میں چھوٹا ہوتا ہے اور دوسرا بڑا۔ اور کبھی باعتبار جسامت کے اور کبھی بلحاظ

---

(1) راجع الغریب للقتبی ۴۹۱ والمجاز لابی عبید ۱۲.

(2) انظر لقول عمر الغریب للقتبی ۴۹۱ والقرطبی ۱۸ والکشاف ۴۹۵ والفخر (۳۰۔۱۶۲) والنهایة (۲۔۲۶۳) وائق (۲ : ۲۴) واللسان (صعد) والبحر ۳۵۲ وفی اللسان (کاؤ) واضداد ابی الطیب ۶۰۹ ما تکاؤ فی شیء ما تکاؤنی خطبة النکاح والغریب لابی عبید (۳/۳۸۷) عن عروة عن عمرؓ.

قدر ومنزلت کے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَّكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ﴾ (۵۴۔۵۳) یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔
﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا﴾ (۱۸۔۴۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذَالِكَ وَلَا اَكْبَرَ﴾ (۱۰۔۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ بڑی۔ میں بلحاظِ قدر ومنزلت کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا اور چھوٹا ہونا مراد ہے۔
صَغِرَ صِغَرًا کے معنی چھوٹا ہونا کے ہیں جو اَلْكِبَرُ کی ضد ہے اور صَغُرَ صَغْرًا وَّصَغَارًا کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں اور ذلیل اور کم مرتبہ آدمی کو جو اپنی ذلت پر قانع ہو صَاغِرٌ کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

(ص غ و)(ی)

اَلصَّغْوُ (ن) کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں مثلاً صَغَتِ النُّجُوْمُ وَالشَّمْسُ: ستاروں یا سورج کا مائل بہ غروب ہونا۔ صَغَيْتُ الْاِنَاءَ وَاَصْغَيْتُهٗ: میں نے برتن کو مائل کر دیا۔جھکا دیا۔وَاَصْغَيْتُ اِلٰى فُلَانٍ میں نے اس کی طرف کان لگایا۔اس کی بات سننے کے لیے مائل ہوا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلِتَصْغٰى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۶۔۱۱۳) اور (وہ ایسے کام) اس لیے بھی (کرتے تھے) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں۔
اور کلام عرب میں صَغَوْتُ اِلَيْهِ اَصْغُوْ صَغْوًا وَصَغَيْتُ اَصْغٰى صُغِيًّا: (دونوں طرح) منقول ہے اور بعض نے اَصْغَيْتُ اُصْغِيْ: یعنی باب افعال بھی استعمال کیا ہے اور جو لوگ کسی کے طرفدار اور حمایتی ہوں۔انہیں صَاغِيَةُ الرَّجُلِ کہا جاتا ہے فُلَانٌ مُصْغًى اِنَاءُهٗ: فلاں بدنصیب ہے [1] اور کبھی یہ ہلاکت سے بھی کنایہ ہوتا ہے۔عَيْنُهٗ صَغْوَاءُ اِلٰى كَذَا: وہ فلاں چیز کی طرف مائل ہے اور اَلصَّغٰى کے معنی تالو یا آنکھ میں کجی کے ہیں۔

(ص ف ف)

اَلصَّفُّ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو خط مستوی پر کھڑا کرنا کے ہیں، جیسے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا یا ایک لائن میں درخت وغیرہ لگانا اور بقول ابوعبیدۃ کبھی صَفٌّ بمعنی صَافٌّ بھی آجاتا ہے۔چنانچہ آیات کریمہ:
﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا......﴾ (۶۱۔۴) جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسے طور پر) پرے جما کر لڑتے ہیں......وہ بیشک محبوب کردگار ہیں۔
﴿ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا﴾ (۲۰۔۶۴) پھر قطار باندھ کر آؤ۔
﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۸۹۔۲۲) اور فرشتے قطار باندھ کر آموجود ہوں گے۔میں صَفًّا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی صَافِّيْنَ (اسم فاعل) بھی اور آیات:
﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ﴾ (۳۷۔۱۶۵) اور ہم صف باندھتے رہتے ہیں۔
﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا﴾ (۳۷۔۱) قسم ہے صف بستہ

---

[1] الصحیح ان یقال مصغًی اناءُہ ای من اصغیٰ انظر الصحاح للجوھری و اساس البلاغۃ للزمخشری ۱۲۔

جماعتوں کی میں صَآفُّوْنَ اور صَآفَّاتٌ سے مراد فرشتے ہیں۔نیز فرمایا:

﴿وَالطَّيْرُ صٰفّٰتٍ﴾ (۲۴۔۴۱) اور پرند بازو پھیلائے ہوئے۔

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ صَوَافَّ﴾ (۲۲۔۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت قطار میں کھڑے ہوئے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔

اور صَفَفْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی صف لگانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ﴾ (۵۲۔۲۰) صف میں لگائے تختوں پر۔

صَفَفْتُ اللَّحْمَ: کے معنی گوشت کے پارچوں کو بریاں کرنے کے لیے سیخ کشید کرنے کے ہیں اور سیخ کشید کیے ہوئے پارچوں کو صَفِيْفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفْصَفُ: ہموار میدان۔گویا وہ ایک صف کی طرح ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا﴾ (۲۰۔۱۰۶-۱۰۷) اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کجی (اور پستی) دیکھو گے اور نہ ٹیلا اور نہ بلندی۔

اَلصُّفَّةُ کے معنی سایہ دار چبوترہ یا برآمدہ کے ہیں۔تشبیہ کے طور پر زین کی گدی کو صُفَّةُ السَّرْجِ کہا جاتا ہے۔

اَلصَّفُوْفُ: وہ اونٹنی جو زیادہ دودھ دینے کی وجہ سے دو یا تین برتن بھر دے یا وہ جو دودھ دوہنے کے وقت اپنی ٹانگوں کو ایک قطار میں رکھ کر کھڑی ہو جائے۔

اَلصَّفْصَافُ: بید کا درخت۔

(ص ف ح)

صَفْحٌ کے معنی ہر چیز کا چوڑا پہلو یا جانب کے ہیں۔ مثلاً: صَفْحَةُ الْوَجْهِ (چہرے کی جانب) صَفْحَةُ السَّيْفِ: (تلوار کا چوڑا پہلو) صَفْحَةُ الْحَجَرِ (پتھر کی چوڑی جانب) وغیرہ۔

اَلصَّفْحُ: (مصدر) کے معنی ترک ملامت اور عفو کے ہیں۔مگر یہ عفو سے زیادہ بلیغ ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ (۲۔۱۰۹) تو تم معاف کر دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا دوسرا حکم بھیجے۔میں عفو کے بعد صَفْحٌ کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان عفو یعنی درگزر تو کر لیتا ہے لیکن صَفْحٌ سے کام نہیں لیتا۔یعنی کسی سے اس قدر درگزر کرنا کہ اسے مجرم ہی نہ گردانا جائے نیز فرمایا:

﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ﴾ (۴۳۔۸۹) اس لیے درگذر کرو اور سلام کہہ دو۔

﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ (۱۵۔۸۵) تو تم ان سے اچھی طرح درگذر کرو۔

﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا﴾ (۴۳۔۵) بھلا اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے؟

صَفَحْتُ عَنْهُ (۱) میں نے اس سے درگذر کرتے ہوئے اسے صَفْحٌ جَمِيْلٌ کا والی بنایا یعنی اس کے جرم سے کلیۃً اعراض برتا (۲) اس سے دور ہوتے ہوئے ایک جانب سے ملا (۳) میں نے کتاب کے اس صفحہ سے تجاوز کیا جس میں اس کا جرم لکھ رکھا تھا۔اس صورت میں یہ تَصَفَّحْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہوگا۔جس کے معنی

کتاب کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ (۱۵۔۸۵) اور قیامت تو ضرور آ کر رہے گی لہٰذا تم (ان سے) اچھی طرح درگزر کرو۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ...... ﴾ (۱۶۔۱۲۷) اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیش کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔

اَلْمُصَافَحَةُ مصافحہ کرنا، ہاتھ ملانا۔

(ص ف د)

اَلصَّفَدُ وَالصِّفَادُ کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں اس کی جمع اَصْفَادٌ ہے یعنی لوہے کے زنجیر جن سے قیدیوں کو جکڑا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ (۳۸۔۳۸) جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

نیز اَلصَّفَدُ کے معنی عطیہ بھی آتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اَنَا مَغْلُوْلُ اَيَادِيْكَ وَاَسِيْرُ نِعْمَتِكَ: میں تیرے احسانات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور تیری انعام کا قیدی بن چکا ہوں وغیر ذالك من المحاورات۔

(ص ف ر)

اَلصُّفْرَةُ: (زردی) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لیے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آ جاتے ہیں۔ اسی بنا پر حسنؒ نے آیت:

﴿بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ (۲۔۶۹) اس کا رنگ گہرا زرد ہو، میں صَفْرَاءُ کے معنی سیاہ کیے ہیں۔ [1]

مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فَاقِعٌ نہ آتی بلکہ صَفْرَاءُ کے بعد حَالِكَةٌ کہا جاتا ہے۔ [2] نیز فرمایا:

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷۔۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صُفْرٌ اَصْفَرٌ کی جمع ہے۔ [3] اور بعض نے کہا ہے کہ صُفْرٌ ایک دھات کا نام ہے (جس کے ساتھ زردی میں تشبیہ دی گئی ہے) اسی سے نُحَاسٌ (پیتل) کو صُفْرٌ اور خشک بَهْمٰى (گھاس) کو صُفَارٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صَفِيْرٌ کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو (دور سے) سنائی دے۔ اسی سے صَفِرَ الْاِنَاءُ کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی

---

[1] راجع لقول الحسن الدر المنثور (۱: ۷۸) و تفسیر الطبری (۱: ۳۴۵) و رد علی الحسن ابن قتیبة فی غریبه (۵۳۔۵۴) والطبری والشوکانی (۱: ۹۸) وقال هذا من بدع التفاسیر و منکراتها و قال ابو عبیدة فی مجازه (۱: ۴۴) فان شئت صفراء و ان شئت سوداء و به فسر السجستانی فی غریبه (۱۰۹۔۱۱۰) والبخاری قال فی الفتح (۸: ۱۲۳) من الاضداد والسجستانی فی اضداده.

[2] کذا فی الشوکانی (۱: ۹۸).

[3] قاله ابو عبیدة فی مجازه (۲: ۲۸۱).

برتن کے ہیں جس سے صَفِیْرٌ کی سی آواز سنائی دے پھر عرف میں ہر خالی چیز کو صِفْرٌ کہنے لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کو صَفَرٌ کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں، جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزاء کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صَفَرٌ پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کو کاٹتا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کو لَاصَفَرَ کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی۔ ❶ (۵) یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (ع بسیط)

(۲۷۳) وَلَا یَعَضُّ عَلٰی شُرْسُوْفِهِ الصَّفَرُ: اور نہ اس کی پسلیوں کو صفر (سانپ) کاٹتا ہے۔

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر توشہ سے خالی ہو جاتے تھے اس لیے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہو اسے صَفَرِیٌّ کہا جاتا ہے۔

(ص ف ن)

اَلصَّفْنُ: دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے کچھ حصے دوسروں کے ساتھ مل جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: صَفَنَ الْفَرَسُ قَوَائِمَهٗ: گھوڑے کا تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کا سم اس طرح اٹھانا کہ اس کا اگلا حصہ زمین پر لگا رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ﴾ (۳۸۔۳۱) خاصے کے گھوڑے پیش کیے گئے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ﴾ (۲۲۔۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت صف بستہ کھڑے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔ میں ایک قراءت صَوَافِنَ بھی ہے۔ ❸ اور باطن صلب کی رگ کو جو نیاط قلب کو جمع کرتی ہے بھی صَافِنٌ کہا جاتا ہے صَفَنٌ کے معنی خصیتین کی تھیلی کے ہیں۔ صُفْنٌ وہ ڈول جس کے ساتھ حلقہ بندھا ہوا ہو۔

(ص ف و)

اَلصَّفَاءُ کے اصل معنی کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش

---

❶ رواه البخاری و مسلم و ابو داؤد فی سننه من حدیث ابی هریرة والسائب بن یزید والترمذی فی القدر وغریب ابی عبید(۱: ۲۵) والفائق (۲: ٦۱).

❷ البیت لاعشیٰ باہلة واسمه عامر بن الحارث یرثی المنتشر بن وهب اخیه لامه واختلف الروایات فی صدره: ففی اللسان (صفر) و حمهرة اشعار العرب ۲٥٦ صدره: لا یتأسی لمافی القدر یرقبه، وهذا یوفق روایة الامالی (۲: ۱۹۷) و روایة المرتضیٰ (۲: ۲۲) وملحقات یوان الاعشیٰ ۲٦۸ لکن بلفظ یتاری بدل یتاسی و خطأه والصاغانی وروی صدره لا یغمز الساق من این ولا وصب وهذا مطابق لما رواه الطبری فی تفسیر (۱٤: ۱۱۹) وهی الروایة فی امالی المرتضیٰ (۱: ۲۳۰) و یوافق ما فی اللا لیٔ ۷٥ والکامل بشرح المرصفی (۸: ۲۱۲) والمحاضرات للمولف (٤: ٦۱۹) و روایة حمهرة اشعار العرب ۲۸۲ والمعانی للقتبی ۱۲۳۱ و ٤۰٦ ایضاً راجع الاصمعیات ۳۳ (طبع برلن) وقبله کما فی الکامل ۱۲۳، لا یتاری لما فی القدر یرقبه ولا تراه امام القوم یفتقر والرثاء فی الکامل فی ۲۳ بیتاً والمختارات ۹۔۱۲ (صنعة هبة الله الحسین) فی ۳۰ بیتاً والبیت فی الفائق (۲: ۱٦) و غریب ابی عبید (۱: ۲٦) و تهذیب الاصلاح (۲: ۳۷) و ادب الکاتب ۳۲ والخزانة (۱: ۹۲) والبخلاء (۱۱۹) وفی الاقتضاب کلام جید علی البیت (۳٤۰۔۳٥).

❸ وهی قراءة ابن عباس و جماعة من الصحابة والتابعین و فی قراءة صوا فی راجع ابا حیان (٦۔۳٦۹) واتحاف الفضلاء ۳۱٥.

سے پاک اور صاف ہونا کے ہیں۔اسی سے اَلصَّفَا ہے جس کے معنی صاف اور چکنا پتھر کے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۵۸) بے شک کوہ صفا اور مروۃ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔ میں اَلصَّفَا ایک پہاڑی کا نام ہے۔

اَلْاِصْطِفَاءُ کے معنی صاف اور خالص چیز لے لینا کے ہیں۔جیسا کہ اِخْتِیَارٌ کے معنی بہتر چیز لے لینا کے آتے ہیں اور اَلْاِجْتِبَاءُ کے معنی جِبَایَه یعنی عمدہ چیز منتخب کر لینا آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا۔کبھی بطور ایجاد کے ہوتا ہے یعنی اسے ان اندرونی کثافتوں سے پاک وصاف پیدا کرتا ہے جو دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور کبھی بطریق اختیار اور حکم کے ہوتا ہے گویا یہ قسم پہلے معنی کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (۲۲۔۷۵) خدا فرشتوں اور انسانوں میں رسول منتخب کر لیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾ (۳۔۳۳) خدا نے آدم اور نوح......کو (تمام جہان کے لوگوں میں) منتخب فرمایا تھا۔

﴿اِصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ﴾ (۳۔۴۲) خدا نے تم کو برگزیدہ کیا اور پاک بنایا اور......منتخب کیا۔

﴿اِصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ﴾ (۷۔۱۴۴) میں نے تم کو......لوگوں سے ممتاز کیا۔

﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ﴾ (۳۸۔۴۷) اور یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور بہتر افراد تھے۔اِصْطَفَیْتُ كَذَا عَلٰی كَذَا: ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دینا اور پسند کرنا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَصْطَفَی الْبَنَاتِ عَلَی الْبَنِیْنَ﴾ (۳۷۔۱۵۲) کیا اس نے بیٹوں کی نسبت بیٹیوں کو پسند کیا۔

﴿سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی﴾ (۲۷۔۵۹) اس کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ (۳۵۔۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا۔

اَلصَّفِیُّ وَالصَّفِیَّةُ: مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لیے منتخب کرلے (جمع صَفَایَا) شاعر نے کہا ہے۔❶ (الوافر)

(۲۷۴) لَكَ الْمِرْبَاعُ مِنْهَا وَالصَّفَایَا: تمہارے لیے اس سے ربع اور منتخب کی ہوئی چیزیں ہیں۔

نیز صَفِیٌّ وَصَفِیَّةٌ (۱) بہت دودھ دینے والی اونٹنی (۲) بہت پھلدار کھجور۔اَصْفَتِ الدَّجَاجَةُ: مرغی انڈے دینے سے رک گئی۔گویا وہ انڈوں سے خالص ہوگئی اس معنی کی مناسبت سے جب شاعر شعر کہنے سے رک جائے تو اس کے متعلق اَصْفَی الشَّاعِرُ کہا جاتا ہے اور یہ اَصْفَی الْحَافِرُ کے

❶ قال عبدالله بن عنمة فی مرثیة بسطام بن قیس الشیبانی راجع شروح سقط الزند ۱۹۷۲ والا شتقاق لابن درید (۱۹۹ ۲۰۰) وبسطام هذا احد الفرسان الثلا ثة (التبریزی) قتله عاصم بن خلیفة الضبی والبیت من ثمانیة رواها ابو تمام فی الحماسة (۱: ۴۲) والمرزوی (۳۵۵) وتمامه: وحكمك و والنشطة والفضول، والبیت فی اللسان (ربع، نشط، صفا، فضل) والطبرسی (۲۸۔۳۰) والنقائض (۱۹۲، ۲۳۵) والعقد الفرید (۳۰: ۳۴۲) الاصمعیات ٦٣ والمعانی للقتبی ۹۴۸ والامالی (۱: ۴۴) والسمط (۱: ۳۸۹) والحیوان (۱: ۲۳).

محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کنواں کھودنے والا صفا یعنی چٹان تک پہنچ گیا، جس نے اسے آئندہ کھدائی سے روک دیا جیسا کہ اَکْدٰی وَاَحْجَرَ کے محاورات اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اور اَلصَّفَا کی طرح صَفْوَانٌ کے معنی بھی بڑا صاف اور چکنا پتھر کے ہیں۔اس کا واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ﴾ (۲۔۲۶۴) اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔

یَوْمٌ صَفْوَانٌ: خنک دن میں سورج صاف ہو (یعنی بادل اور غبار نہ ہو)

(ص ل ل)

اصل میں صَلْصَالٌ کے معنی کسی خشک چیز سے آواز آنا کے ہیں، اسی سے صَلَّ الْمِسْمَارُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی میخ کو کسی چیز میں ٹھونکنے سے آواز پیدا ہونا کے ہیں اور (کھنکنے والی) خشک مٹی کو بھی صَلْصَال کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ﴾ (۵۵۔۱۴) ٹھیکری کی طرح کھنکناتی مٹی سے ......

﴿مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۱۵۔۳۳) کھنکنے والی خشک مٹی۔ یعنی سنے ہوئے گارے سے اور صَلْصَلَۃٌ کے معنی باقی ماندہ پانی کے ہیں کیونکہ مشکیزہ میں باقی ماندہ پانی کے ہلنے سے کھنکناہٹ کی آواز پیدا ہو جاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ صَلْصَال کے معنی سڑی ہوئی مٹی کے ہیں اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ سے مشتق ہے جس کے معنی گوشت کے بدبودار ہو جانے کے ہیں صَلْصَالٌ اصل میں صَلَّالٌ ہے۔ایک لام کو صاد سے بدل دیا گیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿اَئِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۳۲) کیا جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہو جائیں گے میں ایک قراءت صَلَلْنَا بھی ہے۔یعنی جب ہم گل سڑ جائیں گے اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ وَاَصَلَّ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

(ص ل ب)

اَلصُّلْبُ کے معنی سخت کے ہیں اور پشت کو بھی اس کی صلابت اور سختی کی وجہ سے صُلْبٌ کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ (۸۶۔۷) جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَحَلَائِلُ اَبْنَائِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ﴾ (۴۔۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی۔

میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اولاد باپ کا جز ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (السریع)

(۲۷۵) وَاِنَّمَا اَوْلَادُنَا بَیْنَنَا
اَکْبَادُنَا تَمْشِیْ عَلَی الْاَرْضِ:

ہماری اولاد ہمارے جگر گوشے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الرجز)

---

[1] والبیت مع خمسة اخری فی الامالی(۲: ۱۸۵)ونسبه فی اللالی والتبریزی ٤١ (طبعه اوردبا)الی حطان بن المعلی قَالَهٗ تَأَسفاً علی ریب الزمان راجع المرزوقی ۲۸۸ والمحاضرات للمولف (۱: ۳۲۱)والبحر(۲: ۳۹٦)والماوردی ۳٦٥ والعقد الفرید(۲: ٤۳۸)و نسبه الی المعلی بن الخطاب الطائی و فی العیون(۳: ۹٥) و قال اعرابی.

[2] قاله العجاج یصف امراءة و قبله سیا العظام فخمة المخدم و بعده: الی سواء قطن موکم و البیت من شواهد الکشاف ۱۲٥ و ایضاً تهذیب الاصلاح (۱: ٦٤)واللسان (صلب)و اضدا د ابی الطیب ۲۳ و فیه بعده: و کفل بنحضه ملکم والارجوزة بتما مها فی دیوانه ۱۷٥۔۱۸۰).

(۲۷۶) فِیْ صُلْبٍ مِثْلِ الْعِنَانِ الْمُؤْدَمِ:
ایسی پشت میں جو چپڑی ہوئی لگام کی طرح نرم ہے۔
اَلصَّلَبُ وَالْاِصْطِلَابُ کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں اور صَلَبَ جس کے معنی قتل کرنے کے لیے لٹکا دینا کے ہیں۔ بقول بعض اسے صَلَبٌ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صَلْبُ الْوَدْكِ سے ہے جس کے معنی ہڈیوں سے چکنائی نکالنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔
﴿لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ (۲۰۔۷۱) اور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھوا دوں گا۔
﴿اَنْ يُّقَتَّلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا﴾ (۵۔۳۳) کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر لٹکوا دیئے جائیں۔
اَلصَّلِيْبُ: اصل میں سولی کی لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز صلیب اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جو عیسائی بطور عبادت کے گلے میں اس خیال پر باندھ لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر سولی لٹکایا گیا تھا۔ اور جس کپڑے پر صلیب کے نشانات بنے ہوئے ہوں اسے مُصَلَّبٌ کہا جاتا ہے۔
صَالِبٌ: سخت بخار جو پیٹھ کو چور کر دے یا پسینہ کے ذریعہ انسان کی چربی نکال لائے۔
صَلَّبْتُ السِّنَانَ: میں نے نیزے کے بھالے کو تیز کیا۔
اَلصُّلْبِيَّةُ: سان کا پتھر (جس پر اوزار تیز کیے جاتے ہیں)۔

(ص ل ح)

اَلصَّلَاحُ: (درست، باترتیب) یہ فساد کی ضد ہے عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ صَلَاح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سَيِّئَةٌ کے۔ چنانچہ فرمایا:
﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (۹۔۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا دیا تھا۔
﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ (۷۔۵۶) اور ملک میں اصلاح کے بعد خرابی پیدا نہ کرنا۔
اور قرآن پاک میں اکثر مقامات پر (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) آیا ہے جس کے معنی صلاحیت بخش کام کرنا کے ہیں اور اَلصُّلْحُ کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے (امن وسلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے) چنانچہ اِصْطَلَحُوْا وَتَصَالَحُوْا کے معنی باہم امن وسلامتی سے رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَّالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (۴۔۱۲۸) کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے۔
﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ (۴۔۱۲۹) اور اگر باہم موافقت پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔
﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾ (۴۹۔۹۰) تو ان میں صلح کرا دو۔
﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (۴۹۔۱۰) تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کر دیا کرو۔
اور اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃ صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۲) اور ان کی حالت سنوار دی۔

﴿يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ (۳۳۔۷۱) وہ تمہارے اعمال درست کو دے گا۔

﴿وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (۴۶۔۱۵) اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح اور (تقویٰ) پیدا کر۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۱۰۔۸۱) خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔ کے معنی یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کر کے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو درست قرار دے اور صالحؑ ایک پیغمبر کا نام بھی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا﴾ (۱۱۔۶۲) صالح ......ہم تم سے کئی طرح کی امیدیں رکھتے تھے۔

(ص ل د)

اَلصَّلْدُ کے معنی ٹھوس اور چکنا پتھر کے ہیں جس پر کچھ پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۴) تو اسے صاف کر ڈالے اسی سے رَاْسٌ صَلْدٌ: ہے یعنی وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں۔ نَاقَةٌ صَلُوْدٌ وَصَلَادٌ: کم دودھ والی اونٹنی فَرَسٌ صَلُوْدٌ: وہ گھوڑا جسے پسینہ نہ آئے صَلَدَ الزَّنْدُ: چقماق سے آگ نکلنا۔

(ص ل و)

اَلصَّلٰوةُ: بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ صَلَاةٌ کے معنی دعا دینے، تحسین وتبریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے صَلَّیْتُ عَلَیْهِ: میں نے اسے دعا دی، نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے۔ (1) (۲)

((اِذَا دُعِیَ اَحَدُكُمْ اِلٰى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ)) کہ جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ ان کے لیے دعا کر کے واپس چلا آئے اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۱۰۳) اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

﴿يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ﴾ (۳۳۔۵۶) (خدا اور اس کے فرشتے) پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں مومنو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

﴿وَصَلَوَاتِ الرَّسُوْلِ﴾ (۹۔۹۹) اور پیغمبر کی دعاؤں کا...... اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کے معنی ہیں ان کو نشو نما دینا، بڑھانا چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ (۲۔۱۵۷) یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صَلَاةٌ کے معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰـهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (۳۳۔۵۶) بے شک خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے

---

(1) مختصر من حدیث ابی هریرة فی (حم، م، د، ت) و فی روایة ابن مسعود (طب) فلیدع انظر کنز العمال (۹: رقم ۱۲۷۳، ۱۲۷۴) و غریب ابی عبید (۱/۱۷۶، ۱۷۷) واستشهد به الزمخشری فی الفائق (۲/۱۷) و ابن الاثیر فی النهایة ۱۲۔

ہیں اور اَلصَّلٰوۃُ جو کہ ایک عبادت مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اسے صَلٰوۃ کہا جاتا ہے۔اور یہ تَسْمِیَۃُ الشَّیْءِ بِاسْمِ الْجُزْءِ کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے ضمنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صَلَاۃٌ (نماز) ان عبادات سے ہے جن کا وجود ہر شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ (۴۔۱۰۳) بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لفظ صَلٰوۃ دراصل صِلَاءٌ سے مشتق ہے لہٰذا صَلَّی الرَّجُلُ کے معنی ہیں: اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ اپنے آپ کو صَلَاءٌ یعنی دوزخ کی آگ سے دور کیا اور جس طرح مَرَّضَ کا لفظ مرض کو دور کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح صَلّٰی میں بھی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں اور کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاۃ کہہ دیا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں کَنَائِسُ یعنی یہود کی عبادت گاہوں کو صَلَوٰۃٌ کہا گیا ہے۔جیسے فرمایا:

﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ﴾ (۲۲۔۴۰) تو راہبوں کے صومعے عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی نماز ادا کرنے کی تعریف کی گئی ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے وہاں اسے لفظ اقامت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ﴾ (۴۔۶۲) اور نماز پڑھتے ہیں۔

﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (۲۔۱۱۰) اور نماز ادا کرتے رہو۔

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (۲۔۲۷۷) اور نماز پڑھتے رہے۔

اور محض مُصَلِّیْنَ کا لفظ صرف منافقین کے متعلق وارد ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۵۱۴) تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

﴿وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَهُمْ کُسَالٰی﴾ (۹۔۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

اور صَلٰوۃ کے ساتھ لفظ اِقَامَۃٌ ذکر کرنے سے غرض یہ ہے کہ نماز کو محض ہیئت مخصوصہ کے ساتھ ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے حقوق وفرائض کو پورا کرنا بھی ضروری ہے اس بنا پر ایک روایت میں ((اَنَّ الْمُصَلِّیْنَ کَثِیْرٌ وَالْمُقِیْمِیْنَ لَهَا قَلِیْلٌ)) کہ محض نماز پڑھنے والے تو بہت ہیں مگر اس کو حقوق وفرائض کے ساتھ ادا کرنے والے بہت کم ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ﴾ (۷۴۔۴۳) ہم مصلین سے نہیں تھے۔کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کرام کی پیروی نہیں کرتے تھے۔اور آیت: ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی﴾ (۷۵۔۳۱) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی میں وَلَا صَلّٰی سے مراد یہ ہے کہ اس نے محض رسمی نماز بھی نہیں پڑھی چہ جائیکہ اس کے حدود وفرائض کے ساتھ اسے ادا کرتا۔اور آیت کریمہ: ﴿مَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّتَصْدِیَةً﴾ (۸۔۳۵) اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس

سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں ان کی نماز کو مُکَاءً اور تَصْدِیَۃً کہہ کر بتایا ہے کہ ان کی نماز بے روح تھی اور ان کا یہ عمل بے وقعت بلکہ ان کی اس نماز کی حیثیت پرندوں کی چہچہاہٹ اور گنبد کی آواز سے زیادہ نہیں تھی۔اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾ کے بعد ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ (۲۳۔۹) اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، میں صلوٰۃ کو دوبارہ لانے کی وجہ ہم اس کتاب کے بعد (یعنی تفسیر قرآن میں) ذکر کریں گے۔انشاءاللہ تعالیٰ۔

(ص ل ی)

اَلصَّلْیُ (س) کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صَلِیَ بِالنَّارِ: اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔صَلِیَ بِکَذَا: اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صَلَیْتُ الشَّاۃَ: میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مَصْلِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِصْلَوْھَا الْیَوْمَ﴾ (۳۶۔۶۴) آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

﴿یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی﴾ (۸۷۔۱۲) بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا۔

﴿تَصْلٰی نَارًا حَامِیَۃً﴾ (۸۰۔۴) دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

﴿وَیَصْلٰی سَعِیْرًا﴾ (۸۴۔۱۲) اور دوزخ میں داخل ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾ (۴۔۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے، میں ایک قراءت ضمہ یا (افعال) کے ساتھ بھی ہے۔نیز فرمایا:

﴿حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ یَصْلَوْنَھَا﴾ (۵۸۔۸) ان کو دوزخ ہی کی سزا کافی ہے (یہ) اسی میں داخل ہوں گے۔

﴿سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ﴾ (۷۴۔۲۶) ہم عنقریب اسے سقر میں داخل کریں گے۔

﴿وَتَصْلِیَۃُ جَحِیْمٍ﴾ (۵۶۔۹۴) اور جہنم میں جلنا۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا الْاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ (۹۲۔۱۵۔۱۶) اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بد بخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں لَا یَصْلٰھَآ کے معنی لَا یَصْطَلِیْ بِھَا ہیں یعنی دوزخ کے ساتھ وابستہ اور چمٹے نہیں رہیں گے۔اور خلیل نے کہا ہے کہ صَلِیَ الْکَافِرُ النَّارَ کے معنی یہ ہیں کہ کافر نے دوزخ کی تکلیف برداشت کی جیسے فرمایا:

﴿یَصْلَوْنَھَا فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ (۵۸۔۸) اسی میں داخل ہوں گے اور وہ بری جگہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صَلِیَ النَّارَ کے معنی آگ میں داخل ہونے کے ہیں اور اَصْلَاھَا کے معنی داخل کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا﴾ (۴۔۳۰) ہم اسے عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ ھُمْ اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا﴾ (۱۹۔۷۰) اور ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس

میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ صِلِيًّا، صَالٍ کی جمع ہے [1]۔ صِلَاءٌ (۱) آگ جلانے کا ایندھن (۲) بھنی ہوئی چیز۔

(ص م م)

اَلصَّمَمُ کے معنی حاسۂ سماعت ضائع ہوجانا کے ہیں (مجازاً) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ وہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن پاک میں ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (۲۔۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔﴿صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ (۲۵۔۷۳) اندھے اور بہرے ہوکر۔

﴿وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ﴾ (۱۱۔۲۴) اور بہرہ ہو اور ایک دیکھتا سنتا، بھلا، دنوں کا حال یکساں ہوسکتا ہے۔

﴿وَحَسِبُوْا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا﴾ (۵۔۷۱) اور یہ خیال کر کے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی یہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی لیکن پھر اندھے اور بہرے ہوگئے۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو صَمَمٌ کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے جس کی آواز سنائی نہ دے چنانچہ محاورہ ہے۔ [2] صُمَّتْ حَصَاةٌ بِدَمٍ یعنی خون ریزی اس کثرت سے ہوئی ہے کہ اگر اس میں کنکر ڈالا جائے تو اس کی حرکت سنائی دے۔

ضَرْبَةٌ صَمَّاءٌ: مہلک ضرب جس کے بعد مضروب کی آواز ہی سنائی نہ دے اسی سے اس بہادر کو جو تلوار کی ایک ہی ضرب سے دوسرے کو ہلاک کر ڈالے صِمَّةٌ کہا جاتا ہے صَمَمْتُ الْقَارُوْرَةَ: میں نے شیشی پر کاک لگایا جس سے اس کا منہ بند ہوگیا یہ اَلْاَصَمّ (بہرے کے ساتھ) تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

صَمَّمَ فِی الْاَمْرِ: اس نے اپنی مرضی کی اور کسی کی نہ سنی صَمَّان: سخت زمین اِشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ رہے۔

(ص م د)

اَلصَّمَدُ: وہ سردار جس کی طرف ہر معاملہ میں رجوع کیا جائے۔ صَمَدَ صَمْدَہٗ کسی کو معتمد سمجھ کر اس کی جانب قصد کرنا۔ بعض نے کہا ہے۔ [3] لَہٗ صَمَدٌ ٹھوس اور بے جوف چیز کو کہتے ہیں۔ اور بے جوف چیزیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جو انسان سے کم درجہ کی ہیں، جیسے جمادات اور دوم وہ جو انسان سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، جیسے باری تعالیٰ اور فرشتے اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ (۱۱۲۔۲) اللہ بے نیاز ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کو صمد کہہ کر اس حقیقت سے آگاہ کردیا ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ ذات الٰہی

---

[1] وفی القرآن (الامن هو صال الجحيم) (۳۷۔۱۶۳) والصحیح ان صلیا مصدر صلی و منه اصطلیٰ (افتعال) کما فی آیة(۲۷۔۷).

[2] انظر للکلمة المیدانی رقم: ۲۰۸۵ واللسان والمحکم (صمم) والحیوان (۴: ۳۹۲) والمعانی للقتبی ۸۵۷ مثل یقال عند شد اد الحرب و کثرة الاراء قال ابن بری: والصحیح ان یقال بدمی بدل بدم و فی المجالس للثعلب (۵۲۱) یقال فی الداهیة.

[3] وفی الطبرسی ۳۰/ ۲۸۰ الی الامام الباقر و کذا قال ابن عباس و عکرمة والضحاك والحن علی ما فی القرطبی والطبری وقال القتبی فی غریبه (۵۴۲) و علی هذا الدال فیه مبدلة من تارت قارت ما ذکره ابو الطیب اللغوی فی ابد اله و (حرف الدال) ۱۲.

ان سب کے برعکس ہے چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (۵۔۷۵) اور ان کی والدہ (مریم خدا کی ولی اور) سچی فرمانبردار تھیں دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے تھے۔ میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(ص م ع)

اَلصَّوْمَعَةُ: (راہب کی کوٹھری) ہر وہ عمارت جس کا سر لمبا اور نوکدار ہو (جیسے گرجے کا منارہ) اس کی جمع صَوَامِعُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ﴾ (۲۲۔۴۰) تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے...... ویران ہو چکے ہوتے۔
اور اَصْمَعُ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہوں گویا وہ سر کے ساتھ پیوست ہیں۔ قَلْبٌ اَصْمَعُ: بہادر گویا اس کی حالت ان لوگوں کے خلاف ہے جو کہ آیت ﴿وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے کے مصداق ہیں۔
اَلصَّمْعَاءُ: بھی گھاس جس کے شگوفے تا حال ظاہر نہ ہوئے ہوں کِلَابٌ صُمْعُ الْكُعُوْبِ: یعنی چھوٹے اور باریک ٹانگوں والے کتے۔

(ص ن ع)

اَلصُّنْعُ (ف) کے معنی کسی کام کو کمال مہارت سے اچھی طرح کرنے کے ہیں اس لیے ہر صُنْع کو فعل تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر فعل کو صنع نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی لفظ فعل کی طرح حیوانات اور جمادات کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲۷۔۸۸) یہ خدا کی صنعت کاری ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے۔
﴿وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ﴾ (۱۱۔۳۸) تو نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی۔
﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ﴾ (۱۱۔۳۷) اور ایک کشتی...... بناؤ۔
﴿اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا﴾ (۱۸۔۱۰۴) کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔
﴿صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ (۲۱۔۸۱) تمہارے لیے نہایت عمدگی سے ایک طرح لباس بنانا۔
﴿مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ (۵۔۶۳) جو کچھ وہ کرتے ہیں۔
﴿وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا﴾ (۱۱۔۱۶) اور جو عمل انہوں نے (دنیا میں) کیے سب برباد۔
﴿تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا، اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ﴾ (۲۰۔۶۹) کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اسے نگل جائے گی جو بھی انہوں نے بنایا وہ تو جادوگر کے ہتھکنڈے ہیں۔
﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ (۲۹۔۴۵) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔
اور لفظ صُنْع میں چونکہ عمدگی کے ساتھ کسی کام کو سرانجام دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کسی کام کے ماہر کاریگر کو جو عمدہ طور پر کام کرتا ہو، صَنَعٌ اور ماہر عورت کو صَنَّاعٌ کہا جاتا ہے اور ہر اچھے اور نیک کام کو صَنِيعَةٌ کہا جاتا ہے فَرَسٌ صَنِيعٌ عمدہ طور پر پرورش کیا ہوا گھوڑا اور معزز اور پر رعب مقامات کو مَصَانِعَ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ مَصْنَعٌ کی جمع ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَتَتَّخِذُوْنَ

مَصَانِعَ﴾ (۲۶۔۱۲۹) اور محل بناتے ہو۔اور کنایہ کے طور پر مُصَانَعَةٌ کے معنی رشوت دینا بھی آتے ہیں
اَلْاِصْطِنَاعُ کسی چیز کی نہایت زور اور توجہ سے اصلاح کرنا۔اور آیت کریمہ:﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ﴾ (۲۰۔۴۱) اور میں نے تم کو (اپنے کام کے لیے) بنایا ہے۔اور آیت:
﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ﴾ (۲۰۔۳۹) اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔
میں حکماء کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اس کی اس طرح دیکھ بال کرتا ہے جیسے ایک دوست اپنے دوست کی۔

(ص ن م)

اَلصَّنَمُ: کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی، پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔عرب لوگ ان چیزوں کے مجسے بنا کر (ان کی پوجا کیا کرتے اور انہیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے) صَنَمٌ کی جمع اَصْنَامٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً﴾ (۶۔۷۵) کہ تم بتوں کو کیوں معبود بناتے ہو۔
﴿لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ﴾ (۲۱۔۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔
بعض حکماء نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا پوجا جائے بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا تعالیٰ سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کر دے صَنَمٌ کہلاتی ہے۔چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ:
﴿وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (۱۴۔۳۵) مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی پرستش اختیار کریں۔
تو اس سے بھی ایسی چیزوں کی پرستش مراد ہے۔کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معرفت الٰہی کے تحقق اور اس کی حکمت پر مطلع ہونے کے بعد یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی۔

(ص ن و)

اَلصِّنْوُ: کسی درخت کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہا جاتا ہے۔
محاورہ ہے فُلَانٌ صِنْوُ اَبِیْهِ: فلاں اس کے باپ کا حقیقی بھائی ہے۔[1] کیونکہ باپ اور چچا ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہوتی ہیں صِنْوٌ کا تثنیہ صِنْوَانِ اور جمع صِنْوَانٌ آتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے هُمَا صِنْوَا نَخْلَةٍ: وہ دونوں ایک ہی کھجور کی دو شاخیں ہیں (یعنی ان کی اصل ایک ہی ہے)۔قرآن پاک میں ہے:
﴿صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ﴾ (۱۳۔۴) بعض کھجوریں ایسی ہیں جو ایک ہی جڑ سے پھوٹتی ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے۔

(ص ھ ر)

اَلصِّهْرُ: کے معنی اَلْخَتَنُ بھی آتے ہیں یعنی وہ رشتہ دار جو شوہر کی جانب سے ہوں نیز بیوی کے خاندان والوں کو اَصْهَارٌ کہا جاتا ہے یہ قول خلیل کا ہے۔ابن

[1] وفی الحدیث العباس صنوابی ای شقیقه الفائق(۲/ ۲۱).

الاعرابی نے کہا ہے [1] کہ پڑوس، نسب یا شادی کی وجہ سے جو تعلق پیدا ہو جائے اسے اِصْہَارٌ (افعال) کہا جاتا ہے رَجُلٌ مُصْہِرٌ: وہ مرد جسے اس قسم کا تعلق حاصل ہو اور آیت کریمہ:

﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا﴾ (۲۵۔۵۴) میں نسب سے وہ رشتے داری مراد ہے جو آباء واجداد کی جانب سے ہو اور صِهْر سے مراد وہ رشتہ جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔

اَلصِّهْرُ (ف) کے معنی ہیں چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا قرآن پاک میں ہے:

﴿یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ﴾ (۲۲۔۲۰) اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں کے اندر ہے گال دیا جائے گا۔

اَلصُّهَارَةُ: پگھلائی ہوئی چربی۔ایک اعرابی کا قول ہے کہ لَاَصْهَرَنَّكَ بِيَمِيْنٍ مُرَّةٍ: یعنی میں تمہیں پگھلا کر چھوڑوں گا۔ [2]

(ص و ب)

اَلصَّوَابُ: (صحیح بات) کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز کی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات کے اعتبار سے قابل تعریف ہو اور عقل و شریعت کی رو سے پسندیدہ ہو۔مثلاً تَحَرِّی الْعَدْلِ صَوَابٌ (انصاف کو مدنظر رکھنا صواب ہے) اَلْكَرَمُ صَوَابٌ (کرم و بخشش صواب ہے) (۲) قصد کرنے والے کے لحاظ سے یعنی جب کوئی شخص اپنی حسب منشا کسی چیز کو حاصل کر لے تو اس کے متعلق اَصَابَ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے مثلاً: اَصَابَهٗ بِالسَّهْمِ (اس نے اسے تیر مارا، پھر اس دوسرے کے معنی کے اعتبار سے اس کی چند قسمیں ہیں۔(۱) اچھی چیز کا قصد کرے اور اس کر گزرے یہ صواب تام کہلاتا ہے اور قابل ستائش۔

(۲) مستحسن چیز کا قصد کرے لیکن اس سے غیر مستحسن فعل سرزد ہو جائے یہ بھی صواب میں داخل ہے کیونکہ اس نے اجتہاد کے بعد اسے صواب سمجھ کر کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے فرمان ((كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيْبٌ)) (کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے) کا بھی یہی مطلب ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ ((اَلْمُجْتَهِدُ مُصِيْبٌ وَاِنْ اَخْطَاَ فَهٰذَا لَهٗ اَجْرٌ)) کہ مجتہد مصیب ہوتا ہے اگر خطاوار بھی ہو تو اسے ایک اجر حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔ [3]

((مَنِ اجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَمَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ)) کہ جس نے اجتہاد کیا اور صحیح بات کو پا لیا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

(۳) کوئی شخص صحیح بات یا کام کا قصد کرے مگر کسی سبب سے اس سے غلطی سرزد ہو جائے۔مثلاً: ایک شخص شکار پر تیر چلاتا ہے مگر اتفاق سے کسی انسان کو لگ جاتا ہے اس

---

[1] ابو عبداللہ محمد بن زیاد والاعرابی شیخ ابی العباس و ربیب المفضل الضبی ولد سنه ۱۵۰ هجری وتوفی ۲۳۱ وقد جاورن الثمانین۔ ابن الندیم (۶۹۰۱۹۔ ۱۳۰) وامالی القالی (۱/۱۶۵، ۲/۲۳۷) والانباه (۱۰۔۱۰۹)(۳/۱۳۱) و معجم الادباء (۱۸/۱۹۴۱) والمزهر (۱: ۳۹۴، ۴۳۹، ۴۷۹، ۵۰۰، ۲/۷۷) کشف الظنون (۲/ ۱۹۸۰) تاریخ بغداد (۵/ ۲۸۲۔۲۸۵) المراجع فی بروکلمن (۲۰۳۰۔۲۰۵).

[2] وفی المطبوع بیمینی مرة والتصویب من المعاجم.

[3] الحدیث باختلاف الفاظه مروی عن ابی هریرة و عمر و بن العاص رواه احمد و اصحاب الکتب الستة و ابن عبدالحکیم فی فتوح مصر باسانید من طریق ابن الهاد (۲۲۷۔۲۲۸) راجع الرسالة للشافعی رقم: (۱۴۰۹۔۱۴۰۱۔) تحقیق احمد شاکر۔

صورت میں اسے معذور سمجھا جائے گا۔

(۴) ایک شخص کوئی برا کام کرنے لگتا ہے مگر اس کے برعکس اس سے صحیح کام سرزد ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ گو اس کا ارادہ غلط تھا مگر اس نے جو کچھ کیا وہ درست ہے۔

اَلصَّوَابُ: (ن) کے معنی بھی اِصَابَۃٌ (افعال) ہی ہیں اور صَابَہٗ وَاَصَابَہٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پہنچنا یا لگانا اور صَوْبٌ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو صرف اسی قدر برسے جس حد تک کہ مفید ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ﴾ (۴۳۔۱۱) ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی نازل کیا، میں بِقَدَرٍ سے یہی معنی مراد ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الکامل)

(۲۷۷) فَسَقٰی دِیَارَكَ غَیْرَ مُفْسِدِھَا...... صَوْبُ الرَّبِیْعِ وَدِیْمَۃٌ تَھْمِیْ

موسم ربیع کی بارش اور متواتر برسنے والا پانی تمہارے شہر کو سیراب کرے۔

اور صَیِّبٌ خاص کر صَابَ یَصُوْبُ سے فَعِیْلٌ کے وزن پر (مبالغہ کا صیغہ) ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا، اوپر سے نیچے آنا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (طویل)

(۲۷۸) فَکَاَنَّھُمْ صَابَتْ عَلَیْھِمْ سَحَابَۃٌ گویا اس پر (زور کا) بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَوْکَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۔۱۸) یا ان کی مثال اس بارش کی ہے جو آسمان سے (برس رہی ہو) میں بعض نے کہا ہے کہ صَیِّبٌ کے معنی بادل ہیں۔ اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔ اور بارش کو مجازاً صَیِّبٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے سَحَابٌ کہہ دیتے ہیں اَصَابَ السَّھْمُ: تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا۔ اور مُصِیْبَۃٌ: اصل میں تو اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے اس کے بعد (عرف میں) ہر حادثہ اور واقعہ کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا﴾ (۳۔۱۶۵) (بھلا یہ) کیا بات ہے کہ جب احد کے دن کفار کے ہاتھ سے تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے انہیں پہنچ چکی تھی۔

﴿فَکَیْفَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ﴾ (۴۔۶۲) تو کیسی (ندامت کی بات) ہے کہ جب...... ان پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے۔

﴿وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾ (۳۔۶۶)

---

❶ قاله طرفة والبيت في اللسان (همى) و ديوانه ٦٢ مع شرحه لاحمد شنقيطي وفيه بلادك والصناعتين ٣٩٠ في بحث التتميم والتكميل وفي ٤٠٨ بحث الاستثناء والعمدة (٢: ٥٠) و مختار الشعر الجاهلي (١: ٢٥٨) و نقد الشعر ٤٩ والعقد الثمين ١٧ و في غريب ابی عبيد (١: ٢٣) و يقال انه لمرقش.

❷ قاله علقمة بن عبدة وتمامه: صواعقها يطر بن وهيب والبيت من كلمة مفضيلته (٢: ١٩٥) في ٤٣ بيتاً وفي الموشح ٩١ (في امثله الابيات المستكرمته) و ديوانه من الستة ١٠٥ والطبری (١: ١٤٨) واللسان والتاج (صوب) و مختار الشعر الجاهلي (١: ٣٢٢) والبحر (١: ٨٤) ، ٤٥٥ / ٤: ٣٢٨) والحيوان (٣: ١٧٦) مع آخر والمعاني للقتبي ٨٦٠ و شرح السبع لابن الانباری ٥٢٢ والعقد الثمين ١٠٧ و ايام العرب ٥٨ و في المطبوع فكانما صابت عليه مصحف.

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مابین مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ (۴۲-۳۰) اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے اعمال سے۔

اور اَصَابَ(افعال) کا لفظ خیر وشر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ﴾ (۹-۵۰) اگر تم کو آسائش حاصل ہوتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر مشکل پڑتی ہے۔

﴿وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۴-۷۳) اور اگر خدا تم پر فضل کرے۔

﴿فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ﴾ (۲۴-۴۳) تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

﴿فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (۳۰-۴۸) پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اسے برسا دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب اَصَابَ کا لفظ خیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ صَوْبٌ بمعنی بارش سے مشتق ہوتا ہے اور جب برے معنی میں آتا ہے تو یہ معنی اَصَابَ السَّهْمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر ان دونوں معانی کی اصل ایک ہی ہے۔

(ص و ت)

اَلصَّوْتُ: (آواز) اس ہوا کو کہتے ہیں جو دو جسموں کے ٹکرانے سے منضغط یعنی دب جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ صوت جو ہر قسم کے تنفس سے خالی ہوتا ہے جیسے صوت ممتد (۲) وہ صوت جو تنفس کے ساتھ ملا ہوتا ہے پھر صوت تنفس دو قسم پر ہے ایک غیر اختیاری جیسا کہ جمادات اور حیوانات سے سرزد ہوتا ہے۔ دوم اختیاری جیسا کہ انسان سے صادر ہوتا ہے۔ جو صوت انسان سے صادر ہوتا ہے پھر دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہو، جیسے عُوْد (ستار) اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی آواز۔ دوم وہ جو منہ سے نکلتا ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نطق کے ساتھ ہو۔ دوم وہ جو بغیر نطق کے ہو۔ جیسے نے یعنی بانسری کی آواز پھر نطق کی دو صورتیں ہیں ایک مفرد، دوم مرکب۔ جو کہ انواع کلام میں سے کسی ایک نوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ (۴۹-۲) اپنی آوازیں پیغمبر ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، میں خصوصیت کے ساتھ صوت یعنی آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ نطق وکلام سے عام ہے اور ہو سکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق صوت یعنی محض آواز کے ساتھ ہو نہ کہ بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے۔ نیز اس کی وجہ تخصیص یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آواز سے بلند آواز کرنے کی کراہت ظاہر کرنا مقصود ہو اور مطلق بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے ممانعت مقصود نہ ہو۔

رَجُلٌ صَيِّتٌ: بلند آواز والا آدمی رَجُلٌ صَائِتٌ چیخنے والا اَلصِّيْتُ کے اصل معنی مشہور ہونے کے ہیں مگر استعمال میں اچھی شہرت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔

اَلْاِنْصَاتُ کے معنی چپ کر کے توجہ کے ساتھ کسی کی بات سننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (۷۔۲۰۴) اور جب قرآن پاک پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِنْصَاتَ کے معنی جواب دینا بھی آتے ہیں۔ ❶ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جواب تو انصات یعنی بات سننے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اگر اس معنی میں استعمال بھی ہو تو آیت میں اس امر پر ترغیب ہوگی کہ کان لگا کر سنو تاکہ اسے قبول کرنے پر قوت حاصل ہو۔

(ص و ر)

اَلصُّوْرَۃُ ۔ کسی عین یعنی مادی چیز کے ظاہری نشان اور خدوخال جس سے اسے پہچانا جاسکے اور دوسری چیزوں سے اس کا امتیاز ہوسکے یہ دو قسم پر ہیں۔ (۱) محسوس، جن کا ہر خاص و عام ادراک کرسکتا ہو۔ بلکہ انسان کے علاوہ بہت سے حیوانات بھی اس کا ادراک کر لیتے ہیں جیسے انسان، فرس، حمار وغیرہ کی صورتیں دیکھنے سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ (۲) صورۃ عقلیہ، جس کا ادراک خاص خاص لوگ ہی کر سکتے ہوں اور عوام کے فہم سے وہ بالاتر ہوں جیسے انسانی عقل وفکر کی شکل وصورت یا وہ معانی یعنی خاصے جو ایک چیز میں دوسری سے الگ پائے جاتے ہیں، چنانچہ صورت کے ان پر ہر دو معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ثُمَّ صَوَّرْنَاکُمْ﴾ (۷۔۱۱) پھر تمہاری شکل وصورت بنائی۔

﴿وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ﴾ (۶۴۔۳) اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی نہایت حسین بنائیں۔

﴿فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ﴾ (۸۲۔۸) اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

﴿اَلَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ﴾ (۳۔۵) جو ماں کے پیٹ میں......... تمہاری صورتیں بناتا ہے۔

اور حدیث ❷ (۷) ((اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ)) کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی خصوصی صورت پر تخلیق کیا۔ میں "صورت" سے انسان کی وہ شکل اور ہیئت مراد ہے جس کا بصر اور بصیرت دونوں سے ادراک ہوسکتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان کو بہت سی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے (اور صُوْرَتِہٖ میں اگر ہ ضمیر کا مرجع ذات باری تعالیٰ ہو تو) اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صورت کی اضافت تشبیہ یا تبعیض کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اضافت ملک یعنی بلحاظ شرف کے ہے یعنی اس سے انسان کے شرف کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جیسا کہ بَیْتُ اللّٰہِ یا نَاقَۃُ اللّٰہِ میں اضافت ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۳۸۔۷۲) میں روح کی اضافت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ﴾ (۲۰۔۱۰۲) جس روز صور پھونکا جائے گا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ صُوْر سے قرن یعنی نرسنگھے کی طرح کی کوئی چیز مراد ہے، جس میں

---

❶ کما فی قولھم وعی فانصات (راجع الصحاح والمعاجم) لکن فی الآیۃ من (ن ص ت) معناہ السکوت والاستماع للحدیث لامن (ص و ت) کما ذکرہ المولف قال الثعلب معنی الآیۃ واذا قرء الامام فاستمعوا لقراء تہ ولا تتکلموا فتدبر ۱۲ .

❷ الحدیث متفق علیہ عن ابی ھریرۃ راجع کنز العمال (۶ ،رقم ۵۵۰) و ایضاً حم و قط فی الصفات وطب فی السنۃ عن ابی ھریرۃ وعب عن قتادۃ مرسلاً و قط فی الصفات عن بن عمر راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ج۲ ، ص۱۶۸ والکنز ج (۱، ص۲۰۲،۲۰۳).

پھونکا جائے گا۔

تو اس سے انسانی صورتیں اور روحیں ان کے اجسام کی طرف لوٹ آئیں گی۔ ایک روایت میں ہے۔❶ ((ان الصور فیہ صورۃ الناس کلھم)) کہ صُوْر کے اندر تمام لوگوں کی صورتیں موجود ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ (۲۔۲۶۰) میں صِرْھُنَّ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف مائل کر لو اور ہلا لو اور یہ صُوْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مائل ہونے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی پارہ پارہ کرنے کے ہیں۔❷ ایک قراءت میں صُرْھُنَّ❸ ہے بعض کے نزدیک صِرْتُہٗ وَصُرْتُہٗ دونوں ہم معنی ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صُرْھُن کے معنی ہیں انہیں چلا کر بلاؤ چنانچہ خلیل نے کہا ہے کہ عُصْفُوْرٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آ جائے۔

ابوبکر نقاش نے کہا ہے کہ اس میں ایک قراءت فَصُرْھُنَّ ضاد کے ضمہ اور رمشدد و مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے یہ صَرٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور ایک قرأت میں فَصِرَّھُنَّ ہے جو صَرِیْرٌ بمعنی آواز سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ انہیں بلند آواز دے کر بلاؤ اور قطع کرنے کی مناسبت سے بھیڑ بکریوں کے گلہ کو صِوَارٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ صِرْمَةٌ قَطِيْعٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ ہیں کہ قطع یعنی کاٹنے کے معنی کے اعتبار سے ان کا اطلاق جماعت پر ہوتا ہے۔❹

(ص و ع)

اَلصُّوَاعُ: اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی مشروب ڈال کر پیا جاتا ہے یا اس سے غلہ ماپ کر دیا جاتا ہے اسے صَاعٌ بھی کہتے ہیں۔ اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آیت: ﴿نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ (۱۲۔۷۲) کہ بادشاہ (کے پانی پینے) کا پیمانہ کھویا گیا ہے۔ کے بعد ﴿ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا﴾ (۱۲۔۷۶) فرمایا ہے (یعنی ھا ضمیر مونث اس کی طرف لوٹ رہی ہے)

اور حدیث❺: ((صَاعٌ مِّنْ بُرٍّ وَصَاعٌ مِّنْ شَعِيْرٍ)) میں صَاعٌ سے وہ چیز مراد ہے جو اس سے ماپی جاتی ہے۔ (یعنی ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے بعض نے کہا ہے کہ کبھی ''صَاعٌ'' کے معنی بطن ارض یعنی گڑھا کے آ جاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔❻ (الکامل)

(۲۷۹) تکرو بِکفّی لَاعِبٍ فِیْ صَاعٍ

---

❶ کذا مروی عن علماء التفسیر انظر القرطبی.

❷ منسوب الی ابن عباس والتابعین کما فی الفتح (۸/ ۱۵۰).

❸ وھی قراءۃ علی و ابن عباس والاکثر و اما الکسر فقراءۃ ابن مسعود وھی لغۃ سلیم قارن اضدا و ابی الطیب (۴۱۸۔۴۲۴) و فی الدانی (۸۲) حمزۃ بکسر الصد [illegible] الباقون بضمھا و فی مجاز ابی عبیدۃ (۸۰۔۸۱) معناہ بالضم: ضمھن الیك و بالکسر فطعھن الاصمعی فی اضدادہ ۳۳ و ابن السکّیت ۵۷ او اللسان (صور).

❹ والجماعۃ النحل الصور و فی الحدیث یطلع من تحت ھذا الصور رجل من اھل الجنۃ فالطلع ابو بکرؓ الفائق (۲/ ۲۱).

❺ والحدیث باختلاف الفاظہ فی ابوداؤد والبخاری ومسلم والنسائی و ابن ماجۃ من حدیث ابن عمر و راجع العون (ج۲، ص۲۶،۲۷)۔ والنیل (۴/ ۱۹۰) والزرقانی (ج۲، ص۱۴۷۔۱۴۹۰).

❻ قالہ المسیب بن علس واولہ: مرحت یداھا للنجاء کانما و فی المطبوع ذکر و ابدل تکر و مصحف والبیت من کلمۃ مفضیلۃ رقم ۱۱ فی ۲۶ بیتاً ذکرھا القالی کلھافی ۱۳۰۔۱۳۲ والبیت فی المرتضی (۱: ۵۶) و فی روایتہ قاع بدل صاع وما قط بدل لاعب وایضاً اصلاح یعقوب (۲۴۴) والفائق (۲/ ۲۲).

جیسا کہ کھیلنے والا اپنے ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ گولی کو گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں صاع کے معنیٰ چوگان کے ہیں جس سے گیند کھیلی جاتی ہے تَصَوَّعَ النَّبْتُ پودا ہوا سے ہلا اور لہلہایا۔ تَصَوَّعَ الشَّعْرُ: بال پراگندہ ہو گئے محاورہ ہے: اَلْکَمِیُّ یَصُوْعُ اَقْرَانَہٗ: کہ بہادر اپنے ہمسروں کو منتشر کر دیتا ہے۔ آیت کریمہ: ﴿صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ میں ایک قرأت صَوْغُ الْمَلِكِ بھی ہے کیونکہ وہ صاع سونے سے ڈھال کر بنایا گیا تھا۔

(ص و ف)

اَلصُّوْف (اون) کی جمع اَصْوَافٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۱۶۔۸۰) اور ان کی اون اور پشم اور بالوں سے تم سامان اور دیگر مفید چیزیں (بناتے ہو جو) مدت تک کام دیتی ہیں۔

اَخَذَ بِصُوْفَةِ قَفَاهُ: اسے گدی کے بالوں سے پکڑ لیا۔ کَبْشٌ صَافٍ وَاَصْوَفُ وَصَائِفٌ: بہت اون والا مینڈھا اور خانہ کعبہ کے خدام کو بھی صُوْفَةٌ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ کعبہ کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے تھے جیسے بھیڑ پر اون جمی رہتی ہے۔ اَلصُّوْفَانُ: ایک قسم کی گھاس جو چھوٹی سی ہوتی ہے بعض نے کہا ہے کہ لفظ صُوْفِیٌّ بھی صوف کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ لوگ اون کا لباس پہنا کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صُوْفَةٌ کی طرف منسوب ہے جس کے معنیٰ خدام کعبہ کے ہیں۔ صوفی لوگ بھی چونکہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے اس لیے انہیں صوفی کہہ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صُوْفِیْ صُوْفَان کی طرف منسوب ہے جس کے معنیٰ نو روئیدہ گھاس کے ہیں اور صوفی لوگ بھی چونکہ زہد سے کام لیتے۔ اور معمولی سی غذا کھاتے تھے جو عدم کفایت میں صوفان گھاس کی مثل ہوتی تھی۔

(ص و م)

اَلصَّوْمُ (ن) کے اصل معنیٰ کسی کام سے رک جانا اور باز رہنا کے ہیں خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا چلنے پھرنے یا گفتگو کرنے سے۔ اس بنا پر گھوڑا چلنے سے رک جائے یا چارہ نہ کھائے اسے بھی صَائِمٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (البسیط)

(۲۸۰) خَيْلٌ صِيَامٌ وَاُخْرٰى غَيْرُ صَائِمَةٍ

کچھ گھوڑے اپنے تھان پر کھڑے ہیں اور دوسرے میدان جنگ میں ہیں۔

اور ہوا کے ساکن ہونے اور دوپہر کے وقت پر بھی صوم کا لفظ بولا جاتا ہے اس تصور پر کہ اس وقت آفتاب وسط آسمان میں ٹھہر جاتا ہے اسی اعتبار سے قَامَ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ دوپہر کے وقت سورج کے خط نصف النہار پر ہونا کے ہیں مَصَامُ الْفَرَسِ اَوْ مَصَامَتُهٗ: گھوڑے کے کھڑا ہونے کی جگہ۔ اصطلاح شریعت میں کسی مکلّف کا روزہ کی نیت کے ساتھ

---

❶ قاله النابغة الذبياني و تمامه: تحت العجاج واخرى تعلك اللجما و فى اللسان (صوم) و خيل بدل و اخرى والبيت فى الصحاح والتاج والمحكم (صوع، كرا) والصاحى ٨١ والطبرى (١٢٨/٢) والبحر (٢ : ٢٦)و مجاز القرآن لابى عبيدة (٢ : ٦)وملحق ديوانه والعقد الثمين (١٧٤) والكامل (٤٨٣).

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے، منی خارج کرنے اور عمداً قے کرنے سے رک جانے کا نام صوم ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ (۱۹۔۲۵) کہ میں نے خدا کے لیے روزے کی منت مانی ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صوم سے مراد کلام سے رکنے یعنی خاموش رہنا کے ہیں۔جیسا کہ بعد میں فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز کلام نہ کروں گی) سے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔

(ص ی ح)

اَلصَّیْحَۃُ کے معنی آواز بلند کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً﴾ (۳۶۔۲۹) وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی۔(آتشین) اور آیت کریمہ:

﴿یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَۃَ بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۵۲) جس روز لوگ چیخ یقیناً سن لیں گے۔

میں صَیْحَۃٌ کے معنی صور (نرسنگھے) میں پھونکنے کی آواز کے ہیں۔دراصل صَیْحٌ کے معنی آواز پھاڑنا کے ہیں اور یہ اِنْصَلَحَ الْخَشَبُ اَوِالثَّوْبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: لکڑی یا کپڑا پھٹ گیا اور اس سے آواز نکلی اور یہی معنی صِیْحَ الثَّوْبُ کے ہیں۔بِاَرْضِ فُلَانٍ شَجَرٌ قَدْ صَاحَ: یعنی فلاں جگہ ایک درخت ہے جو اپنے طول کی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔گویا وہ اپنی ذات پر ایسے ہی دلالت کرتا ہے جیسا کہ چیخنے والے کی آواز اس کے موجود ہونے پر دال ہوا کرتی ہے۔پھر چیخ کبھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے۔لہٰذا صَیْحَۃٌ کے معنی فَزَعٌ یعنی چنگھاڑ کے بھی آتے ہیں۔جیسے فرمایا:

﴿فَاَخَذَتْھُمُ الصَّیْحَۃُ مُشْرِقِیْنَ﴾ (۱۵۔۷۳) سو ان کو سورج نکلتے ہی چنگھاڑ نے آ پکڑا۔

اور صَائِحَۃٌ کے معنی مجلس نوحہ خوانی کی چیخ وپکار کے ہیں۔

محاورہ ہے: مَایَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ صَیْحَۃِ الْحُبْلٰی: یعنی وہ شرِ عاجل کا انتظار کر رہے ہیں۔

اَلصَّیْحَانِیُّ۔ایک قسم کی کھجور۔

(ص ی د)

اَلصَّیْدُ: (ض) یہ صاد کا مصدر اور اس کے اصل معنی تو کسی محفوظ چیز پر قدرت حاصل کر کے اسے پکڑ لینے کے ہیں مگر شرعاً ان حیوانات کے پکڑنے پر بولا جاتا ہے جو اپنی حفاظت آپ کریں بشرطیکہ وہ جانور حلال ہوں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں اور کبھی مَصِیْدٌ یعنی شکار کیے ہوئے جانور کو بھی صَیْدٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُالْبَحْرِ﴾ (۵۔۹۶) کے معنی ہیں کہ (احرام کی حالت میں) تمہارے لیے سمندری جانوروں کا شکار حلال ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵۔۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔

﴿وَاِذَاحَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ (۵۔۲) اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو۔

﴿غَیْرَمُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵۔۱) مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جاننا میں فقہا نے تصریح کی ہے کہ یہاں اَلصَّیْدُ سے وہ جانور مراد ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا

ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔ (1)

(۸) ((خَمْسَةٌ يَقْتُلُهُنَّ الْمُحْرِمُ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: اَلْحَيَّةُ وَلْعَقْرَبُ وَالْفَأْرَةُ وَالذِّئْبُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ)) پانچ جانور یعنی سانپ، بچھو، چوہیا، بھیڑیا اور کاٹ کھانے والے کتے یعنی درندہ جانور کو محرم حرم کی حدود کے اندر اور باہر ہر جگہ قتل کر سکتا ہے۔

اَلْاَصْيَدُ: وہ شخص جس کی گردن ایک جانب جھکی ہوئی ہو۔ اور متکبر آدمی کے لیے یہ لفظ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور صَيْدَانٌ کے معنی ہنڈیا کے پتھر کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ (2) (الطویل)

(۲۸۱) وَسُوْدٍ مِنَ الصَّيْدَانِ فِيْهَا مَذَانِبُ

اور سیاہ دیگیں جن میں نضار لکڑی کے چمچے رکھے ہوئے ہیں۔

اور اسے صاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ (3) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (4) (الطویل)

(۲۸۲) رَاَيْتُ قُدُوْرَ الصَّادِ حَوْلَ بُيُوْتِنَا

میں نے پتھر کی ہنڈیاں اپنے خیموں کے اردگرد دیکھیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿ص، وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ (۳۸۔۱) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے میں ص حروف مقطعات سے ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ صَادَيْتُ كَذَا سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "اسے لے کر قبول کرو"۔

(ص ی ر)

اَلصِّيْرُ: کے معنی ایک جانب یا طرف کے ہیں دراصل یہ صَارَ (ض) کا مصدر ہے۔ اور اسی سے آیت فَصُرْهُنَّ میں ایک قرأت فَصِرْهُنَّ ہے۔ صَارَ ضِ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی خاص مقام تک پہنچ جانا کے ہیں اسی سے صِيْرُ الْبَابِ ہے جس کے معنی دروازہ میں شگاف اور جھروکا کے ہیں اور اسے صَيْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نقل وحرکت کا منتہی ہوتا ہے اور صَارَ کا لفظ ایک حالت سے دوسرے حالت میں منتقل ہونے پر بولا جاتا ہے۔ اسی سے اَلْمَصِيْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز نقل وحرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (۵۔۱۸) یعنی اللہ تعالیٰ ہی لوٹنے کی جگہ ہے۔ (5)

---

(1) حديث قتل الخمس من الدواب رواه مالك فى مؤطاه من حديث ابن عمر قال فى المنتهىٰ رواه الجماعة الا الترمذى و فيه حديث عائشة متفق عليه والحديث باختلاف الفاظه فى النسائى و احمد و مارواه المصنف من الدواب معدودة فى خمس الا الذئب قال فى الفتح (٤ : ٤٠٧) ووقع ذكر الذئب فى حديث مرسل اخرجه ابن ابى شيبة وابوداؤد من طريق سعيد بن المسيب و كذا فى احمد من حديث ابن عمرؓ مرفوعاً و موقوفاً راجع النيل (٤ : ٢٨٩-٢٩) و الزرقانى (٢ : ٢٨٧-٢٨٨) والمعروف فى اكثر الروايات الحدأة والغراب مكان الحية والذئب والتفصيل فى الفتح.

(2) قاله ابو ذؤيب الهذلى وتمامه...... الذُّضار اذا لم نستفدحا نعارب والصيدان يروى بفتح الصاد (جمع صيدا روهى البرمة) وبكسر ها (جمع صادو هوا النحاس) راجع اسمط (١ : ٣٥١) واللسان (صدن، صيد) والاقتضاب (٤٦٢) والكلمة فى ديوانه رقم ٥ فى ٤١ بيتاً وفى اللسان نضار بدل النضار (اى بدون اداة التعريف) كذا فى "المعانى للقتبى ٣٦٥ و البيت (ابو ذؤيب) ايضاً فى "البلغنه فى شذور اللغة ١٣٠١ كتاب الرحل والمنزل.

(3) قال الاصمعى الصاد ويكون للصفروا لحجارة.

(4) قاله حسان بن ثابت وتمامه: قنابل سحمافى المحلة صيّما والبيت فى ديوانه (٣٧٠ مع شرح المرزوقى) والصحاح (صيد) وفيه دهما بدل سحماً واللسان(صيد).

(5) وفى القرآن (وَاِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ) (٤٢-٥٣). وايضاً راجع (٢٥-١٥)(٣-٢٧)(٢-١٢٦).

(ص ی ص)

اَلصِّیْصَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے مثلاً حفاظت گاہ اور قلعہ) اس کی جمع اَلصِّیَاصِیُ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْھُمْ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ مِنْ صَیَاصِیْھِمْ﴾ (۳۳۔۲۶) اور اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محفوظ ہو گئے تھے) اتار دیا۔

پھر معنی حفاظت کے اعتبار سے گائے کے سینگ کو صِیْصَةٌ کہا جاتا ہے نیز اس کے معنی خارخروس بھی آتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں سے لڑتا ہے۔

(ص ی ف)

اَلصَّیْفُ: گرمی کا موسم یہ الشِّتَاءُ کے بالمقابل ہے جس کے معنی سردی کا موسم کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ﴾ (۱۰۶۔۲) جاڑے اور گرمی کے زمانے کا سفر۔

اور گرمی کے موسم میں جو بارش ہو اسے بھی صَیْفٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ موسم بہار کی بارش کو ربیع کہتے ہیں۔ صَافُوْا: گرمی کے موسم میں کسی جگہ چلے گئے اور اَصَافُوْا موسم گرما میں داخل ہوئے۔

❀❀❀

کِتَابُ الضَّادِ

(ض ء ن)

اَلـضَّـأْنُ کے معنی بھیڑ اور دنبہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنَ الضَّأْنِ اثْنَیْنِ﴾ (۶۔۱۴۴) دو (دو) بھیڑیوں میں سے۔

اَضْـأَنَ الـرَّجُلُ: بہت بھیڑ والا ہو گیا بعض نے کہا ہے: ضَأْنٌ کا واحد ضَائِنَةٌ ہے۔

(ض ب ح)

اَلضَّبْحُ کے معنی سرپٹ دوڑ کے وقت گھوڑے کے ہانپنے کے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَالْعَادِیَاتِ ضَبْحًا﴾ (۱۰۰۔۱) ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَبْحًا کے معنی گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز کے ہیں۔کیونکہ وہ ضَبَاحٌ یعنی لومڑی کی آواز سے یک گونہ مشابہت رکھتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوڑنے کی آواز کے ہیں اور یہ لفظ سرپٹ دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔اور بقول بعض ضَبْحٌ اور ضَبْعٌ دونوں لفظ ہم معنی ہیں اور ان کے معنی گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنا کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی لکڑی کو جلانا کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ سرعت رفتاری میں گھوڑے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

(ض ح ک)

اَلـضِّـحْكُ: (س) کے معنی چہرہ کے انبساط اور خوشی سے دانتوں کا ظاہر ہو جانا کے ہیں اور ہنستے وقت چونکہ سامنے کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو ضَـوَاحِكُ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ضحک بمعنی تمسخر بھی آجاتا ہے۔چنانچہ ضَـحِـكْـتُ مِنْهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کا مذاق اڑایا اور جس شخص کا لوگ مذاق اڑائیں اسے ضُـحْـكَةٌ اور جو دوسروں کا مذاق اڑائے اسے ضُحَكَةٌ (بفتح الحاء) کہا جاتا ہے۔❶ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۰) اور تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

﴿إِذَاهُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۷) تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

﴿تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ﴾ (۵۳۔۶۰) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو۔

اور کبھی صرف خوشی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

❶ وكذا لُعَنَة ولعنة وهذءة وهزوة و سخرة وخدعة راجع شرح كتاب الفصيح لابي سهل الهروى و تهذيب اصلاح المنطق للتبريزى وقارن المشكل للقتبى ١٢ والصاحبى ١٩٢.

﴿ضَاحِكَةٌ﴾ (۸۰۔۳۹) چمک رہے ہوں گے اور خنداں۔
﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا﴾ (۹۔۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا خوش ہولیں۔
﴿فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا﴾ (۲۷۔۱۹) تو وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔
شاعر نے کہا ہے۔❶ (المدید)

(۲۸۳) يَضْحَكُ الضَّبُعُ لِقَتْلٰى هُذَيْلٍ...... وَتَرَى الذِّئْبَ لَهَا تَسْتَهِلُّ

بنی ہذیل کے مقتولوں کی وجہ سے بجو خوش ہو رہے ہیں۔ اور بھیڑیے خوشی سے چلا رہے ہیں۔
اور کبھی ضِحْكٌ محض تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضحک انسان کا خاصہ ہے دیگر حیوانات اس کے ساتھ متصف نہیں ہوتے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى﴾ (۵۳۔۴۳) اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ﴾ (۱۱۔۷۱) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (جو پاس) کھڑی تھی ہنس پڑی۔ میں ان کی بیوی کا ہنسنا تعجب کی بنا پر تھا جیسا کہ اس کے بعد کی آیت کریمہ:
﴿اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۷۳) کیا خدا کی قدرت سے تعجب کرتی ہو، سے معلوم ہوتا ہے نیز آیت کریمہ:
﴿ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ .... عَجِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۲)
اے ہے میرے بچہ ہوگا؟ میں تو بڑھیا ہوں......... بڑی عجیب بات ہے، بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور جن لوگوں نے یہاں ضَحِكَتْ کے معنی حَاضَتْ کیے ہیں❷ انہوں نے ضَحِكَتْ کی تفسیر نہیں کی ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کی حالت کا بیان کرنا مقصود ہے کہ جب ان کو خوشخبری دی گئی تو بطور علامت کے انہیں اسی وقت حیض آ گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ ان کا حاملہ ہونا بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ عورت کو جب تک حیض آتا رہے وہ حاملہ ہو سکتی ہے اور شاعر نے سبزہ زار کی صفت میں کہا ہے۔❸ (البسیط)

(۲۸۴) يُضَاحِكُ الشَّمْسَ مِنْهَا كَوْكَبٌ شَرِقٌ

اس کے پھول اور کلیاں دھوپ میں چمکتے اور سورج کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔
یہاں شاعر نے اس روضہ کی چمک دمک کو بطور تشبیہ ضحک سے تعبیر کیا ہے اسی سے چمکنے والے بادل، سفید چمکدار پتھر اور گدری کھجور کا شگوفہ جب شگفتہ ہو جائے تو اس کو ضَاحِكٌ کہا جاتا ہے طَرِيْقٌ ضَحُوْكٌ: واضح راستہ ضَحِكَ

---

❶ البيت في الحماسة مع المرزوقي (۲: ۱٦٤) منسوب لتابط شراقاله في ثار قتيل حين اخذ الثار من بني هذيل والبيت في البحر (۱: ۳۷۸) والمعاني للقتبي ۹۲۷ والمحكم (ضحك) وفي السمط ۱۱۹ تستهل ماليا، وتضحك بدل يضحك واختلف في نسبة القصيدة راجع (خلل).

❷ ذكره ابو جعفر البيهقي في تاج المصادر ونقل عن ثعلب و ابن الاعرابي وهذا قول عكرمة ومجاهد الفيوضات الالهية ۲/ ٤۲٦ والفتح للشوكاني ۲/ ۱۱۰ وقال الفراء: واما قولهم فضحكت اى حاضت فلم اسمعه من ثقه و سئل ابو العباس عن هذا فقال ليس من كلام العرب و ايضاً روى ابن دريد قول ابن الاعرابي ويؤيد قول المولف ۱۲.

❸ قاله الاعشىٰ و تمامه: موزر بعميم النبت مكتهل راجع (كهل) والبيت في العيني (۲: ۵۰۵) وقانون البلاغة ٤۵۵ ضمن رسائل البلغاء وقبله آخر وفيه صنعة التقريع ۱۲.

اَلْغَدِیْرُ حوض لبریز ہوکر چمکنے لگا اَضْحَکْتُہٗ: میں نے اسے لبریز کردیا۔

(ض ح و)

اَلضُّحیٰ۔کے اصل معنی دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں پھر اس وقت کو بھی ضُحیٰ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا﴾ (۹۱۔۱) سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔

﴿اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا﴾ (۷۹۔۴۶) ایک شام یا صبح۔

﴿وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی﴾ (۹۳۔۱) آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے۔

﴿وَاَخْرَجَ ضُحٰھَا﴾ (۷۹۔۲۹) اور اس کی روشنی نکالی۔

﴿وَاَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًی﴾ (۲۰۔۵۹) اور یہ لوگ اس دن چاشت کے وقت اکٹھے ہو جائیں۔

ضَحِیَ یَضْحٰی: شمس۔یعنی دھوپ کے سامنے آنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی﴾ (۲۰۔۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ یعنی نہ ہی دھوپ سے تکلیف اٹھاؤ گے۔

تَضَحّٰی ضحیٰ کے وقت کھانا کھانا جیسے تَغَدّٰی (دوپہر کا کھانا کھانا) اور اس طعام کو جو ضحیٰ اور دوپہر کے وقت کھایا جائے اسے ضَحَاءٌ اور غَدَاءٌ کہا جاتا ہے۔اور ضَاحِیَۃٌ کے معنی کسی چیز کی کھلی جانب کے ہیں اس لیے آسمان کو الضَّوَاحِیْ کہا جاتا ہے۔لَیْلَۃٌ اِضْحِیَانَۃٌ وَضَحْیَاءُ: روشن رات جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے۔

اُضْحِیَۃٌ کی جمع اَضَاحِیُ اور ضَحِیَّۃٌ کی ضَحَایَا اور اَضْحَاۃٌ کی جمع اَضْحیٰ آتی ہے اور ان سب کے معنی قربانی کے ہیں اور شرعاً قربانی بھی چونکہ نماز عید کے بعد چاشت کے وقت دی جاتی ہے اس لیے اسے اُضْحِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔❶ (۹) ((مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ صَلٰوتِنَا ھٰذِہٖ فَلْیُعِدْ)) کہ جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا وہ دوبارہ قربانی دے۔

(ض د د)

بعض نے کہا ہے: ضِدَّانِ ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت ہوں مگر ان میں سے ہر ایک اپنے خصوصی اوصاف کے باعث دوسری سے مخالف ہو اور ان میں انتہائی بُعد پایا جائے جیسے سفیدی و سیاہی اور خیر و شر اور جو متغایر چیزیں ایک جنس کے تحت نہ ہوں انہیں ضدان نہیں کہا جاتا جیسے حلاوت اور حرکت۔

علماء نے کہا ہے کہ ضد متقابلات کی ایک قسم کا نام ہے کیونکہ وہ دو چیزیں جن میں ذاتی اختلاف ہو اور یہ دونوں بیک وقت ایک جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکتی ہوں انہیں متقابلین کہا جاتا ہے اور تقابل چار قسم پر ہے (۱) تقابل تضاد، جیسے سفیدی اور سیاہی (۲) تقابل تناقض، جیسے ضِعف (دوچند) اور نصف (۳) تقابل عدم ملکہ، جیسے بصر و عمی (۴) تقابل ایجاب وسلب، جو جملہ خبریہ میں ہوتا ہے جیسے کُلُّ اِنْسَانٍ ھٰھُنَا وَلَیْسَ کُلُّ اِنْسَانٍ ھٰھُنَا: اکثر متکلمین اور اہل لغت ان سب کو تقابل تضاد کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضد ان ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک محل میں جمع نہ ہو سکتی ہوں

❶ الحدیث باختلاف الفاظہ اخرجہ البخاری فی صحیحہ (۲ / ۳٤) (طبعۃ ہند) عن انسؓ.

اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق لَانِدَّلَہٗ وَلَا ضِدَّلَہٗ کہہ کر دونوں کی نفی کی جاتی ہے۔ کیونکہ نِدٌّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں اور ان دو متخالف چیزوں کو ایک دوسری کی ضد کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت علی سبیل التعاقب پائی جاتی ہوں اور چونکہ ذات باری تعالیٰ جو ہریت اور جنسیت دنوں سے منزہ ہے اس لیے نہ اس کا کوئی نِدٌّ ہو سکتا ہے اور نہ ضد اور آیت کریمہ:

﴿وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ (۱۹۔۸۲) اور وہ ان کے دشمن اور مخالف ہوں گے۔ میں ضد کے معنی دشمن اور مخالف کے ہیں۔

(ض ر ر)

اَلضُّرُّ: کے معنی بدحالی کے ہیں خواہ اس کا تعلق انسان کے نفس سے ہو، جیسے علم وفضل اور عفت کی کمی اور خواہ بدن سے ہو، جیسے کسی عضو کا ناقص ہونا یا قلّت مال وجاہ کے سبب ظاہری حالت کا برا ہونا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَكَشَفْنَا مَابِهٖ مِنْ ضُرٍّ﴾ (۲۱۔۸۴) اور جو ان کو تکلیف تھی وہ دور کردی۔

میں لفظ ضُرٌّ سے تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں نیز فرمایا:

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ﴾ (۱۰۔۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے..................

﴿وَاَنَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّكَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ (۱۰۔۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں جو اسے پہنچی ہوتی ہے تو (بے لحاظ ہو جاتا ہے اور) اس طرح گزر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ ضَرَّهٗ ضَرًّا کے معنی کسی کو ضرر (گزند) پہنچانے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى﴾ (۳۔۱۱۱) اور یہ تمہیں خفیف سی تکلیف کے سوا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ میں متنبہ کیا ہے کہ انہیں کفار کی طرف سے معمولی سی تکلیف کے سوا کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا اور یہ کہ ان کے ضرر سے بے فکر رہیں، جیسے فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳۔۱۲۰) تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

﴿وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا﴾ (۵۸۔۱۰) اس سے انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس جادو سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَايَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ایسے منتر سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور ان دونوں آیتوں:

﴿يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهٗ وَمَالَا يَنْفَعُهٗ﴾ (۲۲۔۱۲) یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے۔

﴿يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ﴾ (۲۲۔۱۱۳) بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے۔

میں سے پہلی آیت میں نفع اور ضرر کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے جان بُت ہیں جو قصد وارادہ سے کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسری آیت میں جس ضرر کو ثابت کیا ہے اس سے وہ ضرر مراد ہے جو بتوں کی عبادت اور ان سے مدد طلب کرنے کی وجہ سے انسان کو پہنچتا

ہے نہ کہ ان کے قصد وارادہ سے اور ضَـرَّآءُ کالفظ سَـرَّاءُ اور نَـعْمَاءُ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور ضُرٌّ کالفظ نفع کے مقابلہ میں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَـئِـنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ﴾ (۱۱۔۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

﴿وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر رَجُلٌ ضَـرِيْـرٌ نابینا شخص کو کہتے ہیں اور ضَـرِيْـرُ الْوَادِيْ، وادی کے اس کنارہ کو کہتے ہیں جسے پانی سے نقصان پہنچا ہو۔

اَلضَّرَرُ: بمعنی مُضَارٌّ یعنی تنگی ہے اور ضَارَرْتُهٗ کے معنی کسی کو نقصان پہنچانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ﴾ (۶۵۔۶) اور ان کو تکلیف نہ دو۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ (۲۔۲۸۲) اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔میں يُضَآرَّ صیغہ معروف ہونے کی صورت میں اصل میں لَايُضَـارِرْ ہوگا۔اور صیغہ مجہول ہونے کی صورت میں لَايُضَارَرْ اور معنی ہوں گے کہ انہیں گواہی کے لیے بلا کر ان کے کاروبار سے روک کر انہیں نقصان نہ پہنچایا جائے اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُـضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا﴾ (۲۔۲۳۳) اور نہ تو ماں کر اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے۔میں لَاتُضَآرَّ کو ضمہ را کے ساتھ پڑھا جائے تو خبر بمعنی امر ہوگا اور فتح را کی صورت میں صیغہ امر (یعنی) نہی ﴿ضِـرَارًا لِّتَـعْتَدُوْا﴾ (۲۔۲۳۱) اور اس نیت سے انہیں نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔

ضَـرَّةٌ اصل میں اس کام کو کہتے ہیں جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے اور ایک مرد کی دو بیویاں ضَـرَّتَـان کہلاتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا ان میں ہر ایک دوسری کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اسی معنی کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۱۰) ((لَاتَسْأَلِ الْمَرْءَ ةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَكْفِئَ مَافِيْ صَحْفَتِهَا)) کہ کوئی عورت اپنی بہن کے برتن کو انڈیلنے کے لیے اس کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے۔

اَلْاِضْـــرَارُ: ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لانا اور جس مرد کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اس کو مُـضِرٌّ کہتے ہیں اور ان میں ہر عورت دوسری کی مُضِرَّةٌ کہلاتی ہے۔

اَلْاِضْـطِـرَارُ کے اصل معنی کسی کو نقصان دہ کام پر مجبور کرنے کے ہیں اور عرف میں اس کا استعمال ایسے کام پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ وہ مجبوری کسی خارجی سبب کی بنا پر ہو، مثلاً مار پٹائی کی جائے یا دھمکی دی جائے حتیٰ کہ وہ کسی کام کے کرنے پر رضامند ہو جائے یا زبردستی پکڑ کر اس سے کوئی کام کروایا جائے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ﴾ (۲۔۱۲۶) پھر اس کو عذاب دوزخ کے بھگتنے کے لیے ناچار کردوں گا۔

﴿ثُـمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (۳۱۔۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔

دوم یہ کہ وہ مجبوری کسی داخلی سبب کی بنا پر ہو اس کی دو قسمیں ہیں (ا) کسی ایسے جذبہ کے تحت وہ کام کرے جسے نہ کرنے

[1] اخرجه ابو داؤد فی سننه (۱/ ۲۹۶) اصح المطابع والطبرانی عن ابن عمر (راجع كنز العمال ٤ : ٣٥٥).

سے اسے ہلاک ہونے کا خوف نہ ہو مثلاً شراب یا قمار بازی کی خواہش سے مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کرے (۲) کسی ایسی مجبوری کے تحت اس کا ارتکاب کرے جس کے نہ کرنے سے اسے جان کا خطرہ ہو، مثلاً بھوک سے مجبور ہو کر مردار کا گوشت کھانا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ (۲۔۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نا فرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِىْ مَخْمَصَةٍ﴾ (۵۔۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے، میں اضطرار کے یہی معنیٰ ہیں اور آیت:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ (۲۷۔۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجاء قبول کرتا ہے۔ میں اضطرار کا لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی اضطرار داخلی اور خارجی دونوں کو شامل ہے۔

اور اَلضَّرُوْرِیْ کا لفظ تین طرح پر استعمال ہوتا ہے ایک وہ جو کسی دباؤ کی وجہ سے ہو مثلاً: سخت ہوا چلنے سے درخت بالضرور ہلتا ہے۔ دوم: وہ جس کے بغیر کوئی چیز باقی نہ رہ سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حفظ بدن کے لیے غذا ضروری ہے۔ سوم: وہ جس کی جانب مخالف ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے: اَلْجِسْمُ الْوَاحِدُ لَا يَصِحُّ حُصُوْلُهٗ فِىْ مَكَانَيْنِ فِىْ حَالَةٍ وَّاحِدَةٍ بِالضَّرُوْرَةِ: بعض نے کہا ہے کہ ضَرَّۃٌ کے معنیٰ انگلی یا پستان کی جڑ کے ہیں۔ نیز وہ چربی جو ران سے نیچے ڈھلک پڑتی ہے اسے بھی ضَرَّۃٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ر ب)

اَلضَّرْبُ کے معنیٰ ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) ہاتھ، لاٹھی، تلوار وغیرہ سے مارنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ (۸۔۱۲) ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

﴿فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ (۴۷۔۴) تو ان کی گردنیں اڑا دو۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ (۲۔۷۳) تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا سا ٹکڑا مقتول کو مارو۔

﴿اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ (۲۔۶۱) اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔

﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ﴾ (۳۷۔۹۳) پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔

﴿يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ﴾ (۸۔۵۰) ان کے مونہوں .... پر مارتے ہیں۔

(۲) اور ضَرْبُ الْاَرْضِ بِالْمَطَرِ کے معنیٰ بارش برسنے کے ہیں (۳) اور ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ اَلضَّرْبُ بِالْمَطْرَقَةِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور ٹکسال کے سکہ میں اثر کرنے کی مناسبت سے طَبْعُ الدَّرَاهِمِ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضَرِيْبَةٌ اور طَبِيْعَةٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔

ضَرَبَ فِى الْاَرْضِ کے معنیٰ سفر کرنے کے ہیں کیونکہ انسان پیدل چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ﴾ (۴۔۱۰۱) اور جب سفر کو جاؤ۔

﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۵۶) اوران کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں......توان کی نسبت کہتے ہیں۔

﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۔۲۷۳) اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہی معنی آیت:

﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ﴾ (۲۰۔۷۷) کے ہیں یعنی انہیں سمندر میں (خشک) راستے سے لے جاؤ۔

ضَرَبَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: (نر کا مادہ سے جفتی کرنا) یہ محاورہ ضَرَبَ بِالْمِطْرَقَةِ (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی مناسبت سے طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ بولا جاتا ہے۔

ضَرْبُ الْخَیْمَةِ: خیمہ لگانا۔ کیونکہ خیمہ لگانے کے لیے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور خیمہ کی مناسبت سے آیت: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ (۲۔۶۱) اور (آخرکار) ذلت......ان سے چمٹا دی گئی ۔ میں ذِلَّةٌ کے متعلق ضَرَبَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذلت نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْکَنَةُ﴾ (۳۔۱۱۲) اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔ کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمْ فِی الْکَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱۰) تو ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ نیز آیت کریمہ:

﴿فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ﴾ (۵۷۔۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ میں ضَرْبٌ کا لفظ ضَرْبَ الْخَیْمَةَ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ ضَرْبُ الْعُوْدِ وَالنَّایِ وَالْبُوْقِ: عود اور نے بجانا یا نرسنگھے میں پھونکنا۔

ضَرْبُ اللَّبِنِ: اینٹیں چننا، ایک اینٹ کو دوسری پر لگانا ضَرْبُ الْمَثَلِ کا محاورہ ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا﴾ (۳۹۔۲۹) خدا ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا﴾ (۳۶۔۱۳) اور ان سے...... قصہ بیان کرو۔

﴿ضَرَبَ لَکُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ﴾ (۳۰۔۲۸) وہ تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ﴾ (۳۰۔۵۸) اور ہم نے...... ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا﴾ (۴۳۔۵۷) اور جب مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) کا حال بیان کیا گیا۔

﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا﴾ (۴۳۔۵۸) انہوں نے عیسیٰ کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۱۸۔۴۵) اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر دو۔

﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْکُمُ الذِّکْرَ صَفْحًا﴾ (۴۳۔۵) بھلا (اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو) ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے۔

اَلْمُضَارَبَةُ: ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس میں ایک شخص کا

سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں) اَلْمُضَرَّبَۃُ: (دلائی رضائی) جس پر بہت سی سلائی کی گئی ہو۔ اَلتَّضْرِیْبُ: اکسانا۔ گویا اسے زمین میں سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اَلْاِضْطِرَابُ: کثرت سے آنا جانا، حرکت کرنا یہ معنی ضَرَبَ فِی الْاَرْضِ سے ماخوذ ہیں۔

اِسْتَضْرَبَ النَّاقَۃَ: سانڈھ نے ناقہ پر جفتی کھانے کی خواہش کی۔

(ض ر ع)

اَلضَّرْعُ: اونٹنی اور بکری وغیرہ کے تھن۔

اَضْرَعَتِ الشَّاۃُ: قرب ولادت کی وجہ سے بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آیا، یہ اَتْمَرَ وَاَلْبَنَ کی طرح کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: زیادہ دودھ یا کھجوروں والا ہونا۔ اور شَاۃٌ ضَرِیْعٌ کے معنی بڑے تھنوں والی بکری کے ہیں۔ مگر آیت کریمہ:

﴿لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ﴾ (۸۸۔۶) اور خار جھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَرِیْعٌ سے خشک شبرق مراد ہے۔ ❶ اور بعض نے سرخ بدبودار گھاس مراد لی ہے جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے۔ ❷ بہر حال جو معنی بھی کیا جائے اس سے کسی مکروہ چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ضَرَعَ الْبُهْمُ: چوپایہ کے بچہ نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا بعض کے نزدیک اسی سے ضَرَعَ الرَّجُلُ ضَرَاعَۃً کا محاورہ ہے جس کے معنی کمزور ہونے اور ذلت کا اظہار کرنے کے ہیں۔ اَلضَّارِعُ وَالضَّرِعُ (صفت فاعلی) کمزور اور نحیف آدمی۔ تَضَرَّعَ: اس نے عجز وتذلل کا اظہار کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ (۶۔۶۳) عاجزی اور نیاز پنہانی سے۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ (۶۔۴۲) تاکہ عاجزی کریں۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ﴾ (۷۔۹۴) تاکہ وہ عاجزی (اور زاری) کریں۔

یہ اصل میں یَتَضَرَّعُوْنَ ہے تاء کو ضاد میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَلَوْلَا اِذْ جَاءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا﴾ (۶۔۴۳) تو جب ان پر ہمارا عذاب آتا رہا کیوں نہیں عاجزی کرتے رہے۔

اَلْمُضَارَعَۃُ: کے اصل معنی ضَرَاعَۃَ یعنی عجز وتذلل میں باہم شریک ہونے کے ہیں۔ پھر محض شرکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اسی سے علماء نحو نے الفعل المضارع کی اصطلاح قائم کی ہے کیونکہ اس میں دو زمانے پائے جاتے ہیں۔

(ض ع ف)

اَلضَّعْفُ: (کمزوری) یہ اَلْقُوَّۃُ کے بالمقابل آتا ہے۔ ضَعُفَ فَهُوَ ضَعِيْفٌ کمزور ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ (۲۲۔۷۳) طالب اور مطلوب یعنی (عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں اور اَلضَّعْفُ: رائے کی کمزوری پر بھی بولا جاتا ہے اور بدن اور حالت کی کمزوری پر بھی۔ اور اس میں ضَعْفٌ اور ضُعْفٌ دو لغت ہیں قرآن پاک میں ہے:

---

❶ قاله مجاهد و نسب بعضهم الى الفراء راجع العينى شرح البخارى: (ص ۲٦٥ ج ۱۹).

❷ كذا قال الخليل العينى شرح البخارى: (ص ۲٦٥، ج ۱۹).

﴿وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا﴾ (۸-۶۶) اور معلوم کرلیا کہ ابھی تم میں کس قدر کمزوری ہے۔

خلیل کا قول ہے کہ اَلضَّعِيْفُ عقل ورائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضُعْفٌ بدنی کمزوری کو، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا﴾ کالفظ ضَعْفٌ سے مشتق ہے اور ضَعِيْفٌ کی جمع ضِعَافٌ اور ضُعَفَاءُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ﴾ (۹-۹۱) کمزوروں پر (کچھ گناہ) نہیں ہے۔

اِسْتَضْعَفْتُهٗ: میں نے اسے کمزور سمجھا، حقیر جانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جنہیں ملک میں کمزور سمجھا گیا ہے ان پر احسان کریں۔

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ (۴-۷۵) اور ان بےبس مردوں عورتوں اور بچوں..........

﴿قَالُوْا فِيْمَا كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (۴-۹۷) تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز اور ناتواں تھے۔

﴿اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ﴾ (۷-۱۵۰) کہ لوگ تو مجھے کمزور سمجھتے تھے۔اور آیت کریمہ:

﴿يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا﴾ (۳۴-۳۳) اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے، میں اِسْتِضْعَاف اِسْتِكْبَارٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا﴾ (۳۰-۵۴) خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں (ابتداء میں) کمزور حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد طاقت عنایت کی پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔

میں پہلے ضُعْف سے نطفہ یا مٹی مراد ہے اور دوسری جگہ اس سے وہ کمزوری مراد ہے جو جنین یا طفولیت کے زمانہ میں پائی جاتی ہے اور تیسرے سے وہ ضعف مراد ہے جو بڑھاپے کی عمر میں انسان کو لاحق ہوتا ہے۔جس کی طرف کہ آیت اَرْذَلِ الْعُمَرِ میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح پہلی جگہ قُوَّةً سے وہ قوت مراد ہے جو بچے کو حرکت کرنے، ہدایت پانے، دودھ مانگنے اور روکر اپنے آپ سے تکلیف کو دفع کرنے کے لیے عطا کی جاتی ہے اور دوسری جگہ قُوَّةٍ سے مراد وہ قوت ہے جو بلوغت کے بعد عطا ہوتی ہے اور آیت کریمہ میں ضَعْفٌ کو نکرہ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر جگہ ضَعْفٌ سے ایک ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو پہلی حالت کی غیر ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اسم نکرہ کو مکرر لا کر اگر پہلا معنی مقصود ہو تو اسے معرفہ بنالیا جاتا ہے جیسے رَاَيْتُ رَجُلًا فَقَالَ لِي الرجل كذا۔ مگر جب اس نکرہ کو دوبارہ نکرہ ہی لایا جائے تو پہلے معنی کا غیر مراد ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (۹۴:۵-۶) کی تفسیر میں فرمایا: لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ

يُسْرَيْنِ کو دو یسر پر ایک عسر غالب نہیں آسکتا۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ (۴۔۲۸) اور انسان (طبعًا) کمزور پیدا ہوا ہے، میں ضَعِيفًا کے لفظ سے انسان کی شدت احتیاجی کی طرف اشارہ ہے جس سے کہ ''ملا اعلیٰ'' مستغنی ہوتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ (۴۔۷۶) (ڈرومت) کیونکہ شیطان کا داؤ کمزور ہوتا ہے۔ میں شیطانی فریب کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر اس کی تدابیر کارگر نہیں ہوسکتیں جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (۱۷۔۶۵) جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

اَلضِّعْفُ: یہ اسمائے متضایفہ سے ہے یعنی وہ الفاظ جو اپنے مفہوم و معنی کے تحقق میں ایک دوسرے پر موقوف ہوتے ہیں جیسے نِصْفٌ زَوْجٌ اور ضِعْفٌ (دگنا) کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کے مثل کا مل جانا اور یہ اسم عدد کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اَضْعَفْتُ الشَّيْئَ وَضَعَّفْتُهٗ وَضَاعَفْتُهٗ کے معنی ہیں: کسی چیز کو دوچند کر دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ ضَاعَفْتُ (مفاعلہ) میں ضَعَّفْتُ (تفعیل) سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر قراء نے آیت کریمہ: ﴿يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ (۳۳۔۳۰) ان کو دگنی سزا دی جائے گی۔

اور آیت: ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا﴾ (۴۔۴۰) اور اگر نیکی (کی) تو اس کو دوچند کر دے گا، میں يُضَاعِفْ (مفاعلہ) پڑھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے نیکیوں کے دس گنا ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (۶۔۱۶۷) سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضَعَفْتُهٗ ضَعْفًا فَهُوَ مَضْعُوْفٌ: تخفیف عین کے ساتھ آتا ہے اس صورت میں ضَعْفٌ مصدر ہوگا۔ اور ضِعْفٌ اس جیسا کہ شَنْئٌ اور شِنْئٌ ہے اس اعتبار سے ضِعْفُ الشَّيْئِ کے معنی ہیں: کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور، جس سے وہ چیز دگنی ہو جائے اور جب اس کی اضافت اسم عدد کی طرف ہو تو اس سے اتنا ہی اور عدد یعنی دوچند مراد ہوتا ہے۔ لہٰذا ضِعْفُ الْعَشْرَةِ اور ضِعْفُ الْمِائَةِ کے معنی بلا اختلاف بیس اور دوسو کے ہوں گے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❷ (الطویل)

(۲۸۵) جزَيْتُكَ ضِعْفَ الوِدِّ لما اشْتَكَيْتَهٗ...... وَمَا ان جَزَاكَ الضِّعْفَ مِنْ اَحَدٍ قَبْلِيْ جب تو نے محبت کے بارے میں شکایت کی تو میں نے تمہیں دوستی کا دوچند بدلہ دیا اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہیں دوچند بدلہ نہیں دیا۔

---

❶ رواہ اصحاب الآثار عن ابن مسعودؓ مرفوعاً راجع الشوکانی (٥/٤٦٣) قال فی الکشاف و عن ابن عباس مثله ولم اجده قال الحافظ فی تخریجه : ذکرها الفراء عن ابن الکلبی عن ابی صالح عنه و بمعناه مروی عن انس قال السیوطی وسنده ضعیف والصحیح عن الحسن به مرسلاً رواه عبدالرزاق عن معمر و عن طریقه اخرجه الحاکم والبیهقی فی الشعب وله طریق اخری اخرجها ابن مردویه من روایة عطیة عن حابر موصولا واسناده ایضاً ضعیف و فی المؤطا عن زید بن اسلم عن ابیه ان عمر بن الخطاب کتب الیه وقال فی الکتاب ولن یغلب عسر یسرین وهذا اصح طرقه راجع تخریج الکشاف للحافظ (١٨٥ـ١٨٦) رقم ٣٣٢ و تفسیر ابن کثیر (٤: ٥٢٥ـ٥٢٦) والطبری ٣٠/٢٣٥ـ٢٣٦).

❷ قاله ابو ذؤیب الهذلی وفی اللسان (ضعف) لما استنیته والبیت فی دیوان الهذلیین (١ : ٣٥) والمجاز لابی عبیدة (١/٤٩، ٣٢٣٦/٢ : ٢٣٢ رقم: ٥٨) والمحکم (ضعف) وفی روایتها لما استشبة ای استغللته وفی المجاز الحب بدل الود والصاحبی ١٧٣ و فیه شاهد علی ان لفظة من یأتی زائدة.

اور اَعْطِهٗ ضِعْفَیْ وَاحِدٍ کے معنی یہ ہیں کہ اسے سہ چند دے دو کیونکہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ایک اور اس کے ساتھ دو اور دے دو اور یہ کل تین ہو جاتے ہیں مگر یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب ضِعْفٌ کا لفظ مضاف ہو ورنہ بدوں اضافت کے ضعفین کے معنی تو زوجین کی طرح دوگنا ہی ہوں گے لیکن جب واحد کی طرف مضاف ہو کر آئے تو تین گنا کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ﴾ (۳۴-۳۷) ایسے لوگوں کو دوگنا بدلہ ملے گا۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ﴾ (۷-۳۸) تو ان کو آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے۔

میں دوگنا عذاب مراد ہے یعنی دوزخی، باری تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا انہیں ہم سے دوگنا عذاب دیا جائے ایک تو ان کے خود گمراہ ہونے کا اور دوسرے ہمیں گمراہ کرنے کا جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ﴾ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے اعمال کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اُٹھائیں گے۔

سے مفہوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد ﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾ (۷-۳۸) کہہ کر بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کو تم سے دگنا عذاب دیا جائے گا۔

بعض نے اس کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تم اور ان میں سے ہر ایک کو اس سے دگنا عذاب ہو رہا ہے جتنا کہ دوسرے کو نظر آ رہا ہے۔

کیونکہ عذاب دو قسم پر ہے ظاہری اور باطنی۔ ظاہری عذاب تو ایک دوسرے کو نظر آئے گا مگر باطنی عذاب کا ادراک نہیں کر سکیں گے اور سمجھیں گے کہ انہیں اندرونی طور پر کچھ بھی عذاب نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ باطنی عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

اور آیت: ﴿لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (۳-۱۳۰) بڑھ چڑھ کر سود در سود نہ کھاؤ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَضْعَافًا کے بعد مُضَاعَفَةً کا لفظ بطور تاکید لایا گیا ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ مُضَاعَفَةٌ کا لفظ ضَعْفٌ (بفتح الضاد) سے ہے جس کے معنی کمی کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ سود، جسے تم افزونی اور بیشی سمجھ رہے ہو یہ دراصل بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے جیسے فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ (۲-۲۷۶) کہ اللہ تعالیٰ سود کو کم کرتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الطویل)

(۲۸۶) زِيَادَةُ شَيْبٍ وَهِيَ نَقْصُ زِيَادَتِي

کہ بڑھاپے کی افزونی دراصل عمر کی کمی ہے۔

(ض غ ث)

اَلضِّغْثُ: ریحان، خشک گھاس یا شاخیں جو انسان کی مٹھی میں آ جائیں اس کی جمع اَضْغَاثٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا﴾ (۳۸-۴۴) اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر گھاس لو۔

[1] قاله المتنبی فی قصیدة له ٣٦ بیتا یمدح فیها احمد بن الحسین ابو الفرج القاضی المالکی (٧٧-٨٠) مطلعها: لحنية ام غادة رفع السجف لوحشية لاما لوحشية شنف و عجزه وقوة عشق وهی من قوتی ضعف والبیت فی دیوان (٧٧) (طبعة هندیه مصر ١٣٤٢)۔

اسی سے ایسے خواب کو، جو ملتبس سا ہو اور اس کا مطلب واضح نہ ہو، اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ﴾ (۱۲۔۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

یعنی پریشان اور بے معنی خوابوں کے پلندے ہیں۔

(ض غ ن)

اَلضِّغْنُ وَالضَّغْنُ: سخت کینہ اور انتہائی بغض۔

اس کی جمع اَضْغَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۹) کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا۔

پھر بطور تشبیہ اس اونٹنی کو جو بدوں مار پٹائی کے صحیح حال نہ چلے اسے نَاقَةٌ ذَاتُ ضِغْنٍ کہا جاتا ہے اسی طرح ٹیڑھے نیزے کو قَنَاةٌ ضَغِنَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلْاِضْغَانُ: (افعال) کپڑا یا اسلحہ وغیرہ پہن کر اس میں مستور ہو جانا۔

(ض ل ل)

اَلضَّلَالُ: کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں۔ اور یہ ہدایت کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ (۱۷۔۱۵) جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔

اور ضَلَالٌ کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے یعنی وہ گمراہی قصداً ہو یا سہواً، معمولی ہو یا زیادہ۔ کیونکہ طریق مستقیم، جو پسندیدہ راہ ہے......... پر چلنا نہایت دشوار امر ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:[1] (۱۱) ((اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا)) کہ استقامت اختیار کرو اور تم پورے طور پر اس کی نگہداشت نہیں کرسکو گے۔

حکماء نے کہا ہے کہ صحت وراستی کی راہ تو صرف ایک ہی ہے مگر گمراہی کے متعدد راستے ہیں کیونکہ استقامت اور صواب کی مثال تیر کے ٹھیک نشانہ پر بیٹھ جانے کی ہے اور صحیح نشانہ کے علاوہ ہر جہت کا نام ضلالت ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید بعض صالحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں:[2] (۱۲) ((شَيَّبَتْنِيْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَّاَخَوَاتُهَا)) کہ سورہ ہود اور اس کی ہم مثل دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سورہ ہود کی جس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا وہ آیت: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) ہے یعنی اے پیغمبر!

---

[1] (حم، ك هق) عن ثوبان (طب) عن ابن عمرو (طب) عن سلمة ابن الاكوع (الفتح الربانی ج۱، ص۱۸۱).

[2] الحديث فی ابن مردويه عن انس (وفی الطبرانی عن ابی بكرؓ و ابن عساكر عن محمد بن علی مرسلاً) هود واخواتها بغير لفظ السورة والحديث ايضاً فی الكشاف راجع تخريج الكشاف ۸۷ رقم ۱۹۵ وفی تخريج العراقی۔ اخرجه الترمذی فی الشمائل من حديث ابن جحيفة وللحاكم من حديث ابن عباس نحوه قال الترمذی حسن و قال الحاكم صحيح علی شرط البخاری (۲/۲۹۷ و ۱۷۰/٤) و قد اطال الكلام عليه الدار قطنی فی العلل و فی الكامل لابن عدی من رواية يزيد الرقاشی عن انسؓ وليس فيه ذكر هود واخواتها بل الواقعه والقارعة وغيرها من السور.

ٹھیک اسی طرح سیدھے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ ضلال کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں، خواہ وہ ہٹنا عمدًا ہو یا سہوًا، تھوڑا ہو یا زیادہ۔ تو جس سے بھی کسی قسم کی غلطی سرزد ہوگی اس کے متعلق ہم ضلالت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام اور کفار دونوں کی طرف ضلالت میں بون بعید پایا جاتا ہے۔ دیکھئے آنحضرت ﷺ کو آیت کریمہ:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (۹۳۔۷) میں ضالاً فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہدایتِ نبوت کے عطا ہونے سے قبل تم اس راہ نمائی سے محروم تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ان کی اولاد کا یہ کہنا: ﴿اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ﴾ (۱۲۔۹۵) کہ آپ اسی پرانی غلطی میں (مبتلا) ہیں۔ یا یہ کہنا: ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۱۲۔۸) کچھ شک نہیں کہ ابا صریح غلطی پر ہیں۔ تو ان آیات میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی محبت اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (۱۲۔۳۰) اس کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہیں۔ میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ﴾ (۲۶۔۲۰) اور میں خطا کاروں میں تھا۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ضال ہونے کا اعتراف کر کے اشارہ کیا ہے کہ قتل نفس کا ارتکاب مجھ سے سہوًا ہوا تھا۔ اور آیت: ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ (۲۔۲۸۲) اور اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی۔ میں تَضِلَّ کے معنی بھول جانا کے ہیں اور یہی وہ نسیان ہے جسے عفو قرار دیا گیا ہے۔[1] ایک دوسرے اعتبار سے ضَلَالَةٌ کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم نظریہ یعنی توحید و نبوات وغیرہما کی معرفت میں غلطی کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا﴾ (۴۔۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا۔ میں اس قسم کی گمراہی کو ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا کہا گیا ہے۔

(۲) علوم عملیہ میں ضلالۃ ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات اور معاملات کی معرفت میں غلطی کرنا اور آیت مذکورہ میں ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء وَمَنْ یَّكْفُرْ اور آیت:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا﴾ (۴۔۱۶۷) جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو خدا کے رستے سے روکا، وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑے، سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت: ﴿فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ﴾ (۳۴۔۸) میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور فِی کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت: ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ﴾ (۶۷۔۹) میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ﴾ (۵۔۷۷) جو (خود بھی) پہلے خود گمراہ ہوئے اور بھی بہت کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک

---

[1] ای فی الحدیث : رُفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرہ ھو علیہ (الطبرانی عن ثوبان).

گئے۔اور آیت کریمہ:

﴿ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۲۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ (۱۔۷) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی﴾ (۲۰۔۵۲) کے معنی ہیں: لَا یَضِلُّ عَنْ رَبِّیْ وَلَا یَضِلُّ رَبِّی عَنْهُ ہیں یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی اور آیت:

﴿اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ﴾ (۱۰۵۔۱۲) کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا گیا۔

میں فِیْ تَضْلِیْلٍ کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ پر لگا دینا کے ہیں

اَلْاِضْلَالُ (یعنی دوسرے کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کا سبب خود اپنی ضلالت ہو۔یہ دو قسم پر ہے:

(۱) ایک یہ کہ کوئی چیز ضائع ہو جائے۔مثلاً: کہا جاتا ہے اَضْلَلْتُ الْبَعِیْرَ: میرا اونٹ کھو گیا۔

(۲) دوم کہ دوسرے پر ضلالت کا حکم لگانا ان دونوں صورتوں میں اِضْلَالٌ کا سبب ضَلَالَةٌ ہی ہوتی ہے۔دوسری صورت اِضْلَال کی پہلی کے برعکس ہے،یعنی اضلال بذاتہ ضلالۃ کا سبب بنے اسی طرح پر کہ کسی انسان کو گمراہ کرنے کے لیے باطل اس کے سامنے پر فریب اور جاذب انداز میں پیش کیا جائے جیسے فرمایا:

﴿لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۱۱۳) ان میں سے ایک جماعت تم کو بہکانے کا قصد کر ہی چکی تھی اور یہ اپنے سوا کسی کو بہکا نہیں سکتے۔

یعنی وہ اپنے اعمال سے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش میں ہیں مگر وہ اپنے اس کردار سے خود ہی گمراہ ہو رہے ہیں۔اور شیطان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ﴾ (۴۔۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

اور شیطان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا﴾ (۳۶۔۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

﴿وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا﴾ (۴۔۶۰) اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

اللہ تعالیٰ کے انسان کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس کا سبب انسان کی خود اپنی ضلالت ہو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اضلال کی نسبت کے یہ معنی ہوں گے کہ جب انسان ازخود گمراہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس پر گمراہی کا حکم ثبت ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخرت کے دن اسے جنت کے راستہ سے ہٹا کر دوزخ کے راستہ پر ڈال دیا جائے گا۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ کی طرف اِضلال کی نسبت کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے انسان کی جبلت ہی کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور

اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے اور آخر کار اس پر اتنی مضبوطی سے جم جاتا ہے کہ اس راہ سے ہٹانا یا اس کا خود اسے چھوڑ دینا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ اعمال اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عادت ''طبیعہ ثانیہ'' ہے۔

پھر جب انسان کی اس قسم کی فطرت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور دوسرے مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ فعل کی نسبت اس کے سبب کی طرف بھی ہو سکتی ہے لہٰذا اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی سکتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گمراہ کر دیا ورنہ باری تعالیٰ کے گمراہ کرنے کے وہ معنیٰ نہیں ہیں جو عوام جہلاء سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت اسی جگہ کی ہے جہاں کافر اور فاسق لوگ مراد ہیں نہ کہ مومن بلکہ حق تعالیٰ نے مؤمنین کو گمراہ کرنے کی اپنی ذات سے نفی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰاهُمْ﴾ (۹۔۱۱۵) اور خدا ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے۔

﴿فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ﴾ (۴۷۔۴) ان کے عملوں کو ہرگز ضائع نہ کرے گا بلکہ ان کو سیدھے رستے پر چلائے گا۔

اور کافر اور فاسق لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۸) ان کے لیے ہلاکت ہے اور وہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾ (۲۔۲۶) اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۴۰۔۷۴) اسی طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔

﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۱۴۔۲۷) اور خدا بے انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ﴾ (۶۔۱۱۱) اور ہم ان کے دلوں کو الٹ دیں گے۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۲۔۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (۲۔۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔

میں دلوں کے پھیر دینے اور ان پر مہر لگا دینے اور ان کی مرض میں اضافہ کر دینے سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔

(ض م م)

اَلضَّمُّ: (ن) کے معنی دو یا اس سے زیادہ چیزوں کو باہم ملا دینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ (۲۰۔۲۲) اور تم اپنے بازو کو اپنی بغل سے لگا لو۔

﴿وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ﴾ (۲۸۔۳۲) اور بازو کو سمٹائے رکھو۔

اَلْاِضْمَامَةُ: لوگوں کی جماعت، کتابوں کا بنڈل، گھاس وغیرہ کا گٹھا۔

اَسَدٌ ضَمْضَمٌ وَضَمَاضِمٌ: اس شیر کو کہتے ہیں جو ہر چیز کو اپنی ذات کے لیے اکٹھا کرنے والا ہو۔ بعض نے اس کے معنی قوی اور مضبوط بھی کئے ہیں۔

فَرَسٌ سَبَّاقُ الْاَضَامِيْمِ: وہ گھوڑا جو بیک وقت گھوڑوں کی ایک جماعت سے سبقت لے جانے والا ہو۔

(ض م ر)

اَلضَّامِرُ: اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس ریاضت کی وجہ سے ہو جو سدھانے کے لیے اس سے کرائی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ﴾ (۲۲-۲۷) دبلی سواریوں پر۔

ضَمَرَ ضُمُوْرًا وَاضْطَمَرَ فَھُوَ مُضْطَمِرٌ کے معنی لاغر ہو جانا کے ہیں۔ اور ضَمَّرْتُہٗ کے معنی لاغر کر دینا کے۔

اَلْمِضْمَار: گھوڑ دوڑ کا میدان جہاں گھوڑوں کو دوڑانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

اَلضَّمِیْرُ: وہ بات جو تمہارے دل میں ہو اور اس پر اطلاع پانا دشوار ہو اسی وجہ سے کبھی ضمیر کا لفظ قوت حافظہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

(ض ن ن)

اَلضِّنَّۃُ (س) کے معنی کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا کے ہیں۔ اس سے عِلْقٌ مَضَنَّۃٌ وَمَضِنَّۃٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ نفیس چیز جس پر بخل کیا جائے۔ فُلَانٌ ضِنِّیْ بَیْنَ اَصْحَابِیْ: میرے ساتھیوں میں سے فلاں اس قابل ہے کہ اس پر بخل کیا جائے اور یہ باب ضَرَبَ وَسَمِعَ دونوں سے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ضَنَنْتُ بِالشَّیْئِ ضَنًّا وَضَنَانَۃً وَضَنِنْتُ: اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا ھُوَعَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ﴾ (۸۱-۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اس (کے عام کرنے) میں بخل نہیں کرتے۔

(ض ن ک)

اَلضَّنْكُ (ک) کے معنی کسی مقام یا معیشت کی تنگی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَعِیْشَۃً ضَنْکًا﴾ (۲۰-۱۲۴) ان کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے: ضَنُكَ عَیْشُہٗ: اس کی معیشت تنگ ہو گئی۔ اِمْرَئَۃٌ ضَنَاكٌ گھٹیلے جسم والی عورت۔ نیز ضَنَاكَ کے معنی زکام بھی آجاتے ہیں۔ اس سے زکام زدہ آدمی کو مَضْنُوْكٌ کہا جاتا ہے۔

(ض ھ ی)

اَلْمُضَاھَاۃُ۔ کے معنی مشابہ اور مشاکلت کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿یُضَاھُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۹-۳۰) یہ بھی انہی جیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں یُضَاھُوْنَ کے معنی یُشَاکِلُوْنَ ہیں۔ یعنی دوسروں کے مشابہ اور ہم شکل ہونا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل مہموز ہے اور اس میں ایک قرأت (یُضَاھِئُوْنَ) ہمزہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔[1]

اِمْرَءَۃٌ ضَھْیَاءَ: وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو اس کی جمع ضُھْیٌ آتی ہے۔

(ض و ء)

اَلضُّوْءُ: کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضَائَتِ النَّارُ وَاَضَائَتْ: آگ روشن ہو گئی اور اَضَائَتْ (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا اَضَائَتْ مَاحَوْلَہٗ﴾ (۲-۱۷) جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کر دیں۔

---

[1] قراءۃ عاصم وعلی الاول اکثر القراء والحمل (۲/ ۳۲۹).

﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ﴾ (۲۸۔۷۱) جو تم کو روشنی لادے۔

اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کرنے لیے نازل کی گئی ہیں۔ ضِيَاءٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرٰى﴾ (۲۱۔۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی اور (سرتاپا) روشنی اور نصیحت (کی کتاب) عطا کی۔

(ض ی ر)

اَلضَّيْرُ: (ض) کے معنی مضرت اور گزند کے ہیں اور ضَارَّہٗ وَضَرَّہٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۰) کچھ نقصان (کی بات) نہیں ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اور فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳۔۱۲۰) ان کا فریب تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

(ض ی ز)

آیت کریمہ: ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ (۵۳۔۲۲) میں ضِيْزٰى کے معنی ناقص اور بے انصافی کے ہیں۔ یہ اصل میں ضُيْزٰى بروزن فُعْلٰى ہے۔ یاء کی مناسبت سے ضاد کو مکسور کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ بقول بعض کلام عرب میں فُعْلٰى کے وزن پر اسم صفت نہیں آتا۔ [1]

(ض ی ع)

ضَاعَ (ض) اَلشَّيْءُ ضَيَاعًا کے معنی ہیں: کسی چیز کا ہلاک اور تلف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۳۔۱۹۵) اور (فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

﴿اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ (۱۸۔۳۰) ہم نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ (۲۔۱۴۳) اور خدا ایسا نہیں جو تمہارے عمل کو یونہی کھودے۔

﴿لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۲۰) خدا نیک کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ضَيْعَةُ الرَّجُلِ: کے معنی جائیداد کے ہیں کیونکہ اگر اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کی جمع ضِيَاعٌ آتی ہے تَضِيْعُ الرِّيْحِ: ہوا کا اس قدر تند ہونا کہ جس چیز پر سے گزرے اسے تلف کرتی چلی جائے۔

(ض ی ف)

اَلضَّيْفُ: (ض) دراصل اس کے معنی کسی جانب مائل ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضِفْتُ اِلٰى كَذَا میں اس کی طرف مائل ہوا اَضَفْتُ كَذَا اِلٰى كَذَا: اسے ایک طرف مائل کر دیا۔

ضَافَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ وَتَضَيَّفَتْ: سورج مائل بغروب ہو گیا۔ وَضَافَ السَّهْمُ وَ تَضِيْفُ عَنِ الْهَدَفِ: تیر نشانہ سے ایک طرف مائل ہو گیا۔

اَلضَّيْفُ: اصل میں اسے کہتے ہیں جو تمہارے پاس ٹھہرنے کے لیے تمہاری طرف مائل ہو مگر عرف میں ضیافت

---

[1] هذا قول سيبويه وحكى عن ثعلب وغيره من العلماء ضُزْىٰ وضِئزىٰ وقال الكسائى انهما مصدران.

مہمان نوازی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اصل میں چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے عام طور پر واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کی جمع اَضْیَافٌ وَضُیُوْفٌ وَضِیْفَانٌ بھی آ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ﴾ (۵۱-۲۴) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔

﴿وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ﴾ (۱۱-۷۸) اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبرو نہ کھوؤ۔

﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ﴾ (۱۵-۶۸) یہ میرے مہمان ہیں۔

اِسْتَضَفْتُ فُلَانًا فَاَضَافَنِیْ: میں نے فلاں سے مہمان نوازی طلب کی تو میری مہمانی کی ضِفْتُہٗ ضَیْفًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنا کے ہیں اور میزبان کو ضَائِفٌ اور ضَیْفٌ بھی کہا جاتا ہے۔

علمائے نحو کے نزدیک اَلْاِضَافَۃُ کا لفظ اس اسم مجرور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے پہلے کوئی اسم (مضاف) ہو۔ اور بعض کے نزدیک اسم اضافی ہر اس اسم کو کہتے ہیں جس کا ثبوت یا فہم دوسرے پر موقوف ہو۔ جیسے اَبٌ، اِبْنٌ، اَخٌ، صَدِیْقٌ کہ ان سب کا وجود دوسرے اسماء کے حصول پر موقوف ہے۔ اس لیے اس قسم کے اسماء کو اسماء متضایفہ کہا جاتا ہے۔

(ض ی ق)

اَلضِّیْقُ وَالضَّیْقُ کے معنی تنگی کے ہیں اور یہ سَعَۃٌ کی ضد ہے اور ضِیْقَۃٌ کا لفظ فقر، بخل، غم اور اس قسم کے دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ (۱۱-۷۷) کے معنی ہیں کہ وہ ان کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے اور آیات:

﴿وَضَآئِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ﴾ (۱۱-۱۲) اور اس خیال سے تمہارا دل تنگ ہو۔ ﴿وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ﴾ (۲۶-۱۳) اور میرا دل تنگ ہوتا ہے۔

﴿يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ (۶-۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۹-۱۱۸) یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں۔

﴿وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ (۶-۱۲۷) اور جو یہ بداندیش کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو، میں ضَیْقٌ بمعنی غم ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ﴾ (۶۵-۶) اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ دو، میں تَضْیِیْقٌ کا لفظ نان ونفقہ میں بخل اور دل کی تنگی یعنی غم کو شامل ہے۔ اور ضَاقَ وَاَضَاقَ فَهُوَ مُضِیْقٌ کے معنی محتاج ہونا بھی آتے ہیں اور فقر پر بھی ضَیْقٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل غنا کو وُسْعَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

❀❀❀

کِتَابُ الطَّاء

(ط ب ع)

اَلطَّبْعُ: (ف) کے اصل معنیٰ کسی چیز کو (ڈھال کر) کوئی شکل دینا کے ہیں۔ مثلاً طَبْعُ السِّکَّۃِ وَطَبْعُ الدَّرَاھِمِ: یعنی سکہ یا دراہم کو ڈھالنا یہ خَتْمٌ سے زیادہ عام اور نَقْشٌ سے زیادہ خاص ہے اور وہ آلہ جس سے مہر لگائی جائے اسے طَابَعٌ وَخَاتَمٌ کہا جاتا ہے اور مہر لگانے والے کو طَابِعٌ مگر کبھی یہ طَابَعٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور یہ نِسْبَۃُ الْفِعْلِ اِلَی الاٰلَۃِ کے قبیل سے ہے۔ جیسے سَیْفٌ قَاطِعٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۶۳۔۴) تو ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

﴿کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۹) اسی طرح خدا ان کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

﴿کَذٰلِکَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ (۱۰۔۷۴) اسی طرح ہم زیادتی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اور یہ بحث آیت: ﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ میں گزر چکی ہے۔❶

اور نقش کرنے کے اعتبار سے سَجِیَّۃٌ (خلقی عادت) کو طَبْعٌ یا طَبِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دل پر بمنزلہ نقش کے ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ پیدائشی ہو یا عادت ہونے کے اعتبار سے لیکن عام طور پر اس کا استعمال خلقی عادت پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔❷

(۲۸۷) فَتَاْبَی الطِّبَاعُ عَلَی النَّاقِلِ

کہ طبیعت کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے آگ یا کسی دوا کا جو مزاج بنایا ہے اس خصوصی مزاج کو ان کی طبیعت کہا جاتا ہے۔

اور طِبْعُ السَّیْفِ کے معنی تلوار کا زنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ رَجُلٌ طَبِعٌ گندے اخلاق والا چنانچہ بعض نے آیات:

﴿طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۹۔۹۳) خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ اور ﴿کَذٰلِکَ یَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکَافِرِیْنَ﴾ (۷۔۱۰۱) اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

میں طَبَعٌ کے معنی دلوں کو زنگ آلود یعنی گندہ کر دینا کے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ﴾ (۸۳۔۱۴) بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِاللّٰہُ اَنْ یُّطَھِّرَ قُلُوْبَھُمْ﴾

---

❶ راجع (خ ت م).

❷ قالہ المتنبی فی قصیدۃ لہ یمدح فیھا سیف الدولۃ ویذکر استنقاذہ ابا وائل من امر الخوارج مطلعھا ولی م طماعیۃ العاذل ولا رأی فی الحب للعاقل والبیت فی دیوانہ ۲۰۷ (طبعہ ھندیہ مصر ۱۳۴۲ھ، ۱۹۲۳ء) وصدر البیت یرادمن القلب نسیانکم وانظر للبیت ایضاً محاضرات المؤلف (۳۔۱۰۲) فی ثلاثۃ وشرح ادب الدنیا والدین للماوردی ۱۸۲.

(۵۔۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا۔
بعض نے کہا ہے کہ طَبَعْتُ الْمِكْيَالَ کے معنی ہیں: میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا کیونکہ اس کا بھر جانا بھی گویا اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آ سکتی اور طِبْعٌ بمعنی مَطْبُوْعٌ بھرا ہوا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے: ❶ (رمل)

(۲۸۸) كَرَوَايَا الطِّبْعِ هَمَّتْ بِالْوَحَلِ

ان کی حالت ان اونٹوں کی سی تھی جن پر پانی کے مشکیزے لدے ہوئے ہوں اور وہ دلدل میں پھنس جائے۔

(ط ب ق)

اَلْمُطَابَقَةُ: اسمائے متضایفہ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے اوپر اس کے برابر دوسری چیز رکھنا۔ اسی سے طَابَقْتُ النَّعْلَ ہے جس کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۲۸۹) إِذَا لَا وَذَا الظِّلَّ الْقَصِيْرَ بِخُفِّهٖ...... وَكَانَ طِبَاقَ الْخُفِّ اَوْقَلَّ زَائِدًا

پھر طِبَاقَ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے مطابق اور موافق ہو جیسا کہ تمام ان الفاظ کا حال ہے جو دومعنوں کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور پھر کسی ایک معنی میں استعمال ہونے لگے ہوں۔ جیسے كَأْسٌ وَنَادِيَةٌ وَغَيْرُهُمَا چنانچہ آیت کریمہ:
﴿الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾ (۶۷۔۳) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (۸۴۔۱۹) کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے اور یہ ان مختلف احوال و مراتب کی طرف اشارہ ہے جن پر سے انسان گذر کر ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کی طرف آیت: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ...... اَلْآيَة﴾ (۳۵۔۱۱) اور خدا ہی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے، میں اشارہ فرمایا ہے نیز آخرت میں حشر و نشر، حساب و کتاب اور پل صراط سے لے کر جنت اور دوزخ میں پہنچنے تک جو مختلف حالات انسان کو پیش آنے والے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے اور ایک جماعت جو باہم مطابقت اور موافقت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هُمْ فِيْ أُمِّ طَبَقٍ نیز کہا جاتا ہے۔ اَلنَّاسُ طَبَقَاتٌ: لوگوں کے مختلف طبقے ہیں طَابَقْتُهٗ عَلٰى كَذَا وَتَطَابَقُوْا وَاَطْبَقُوْا عَلَيْهِ: باہم مطابق ہونا اسی سے جَوَابٌ يُطَابِقُ السُّؤَالَ کا محاورہ ہے۔ یعنی جواب سوال کے عین مطابق ہے۔
اَلْمُطَابَقَةُ: اس آدمی کی طرح چلنا جس کے پاؤں میں بیڑیاں

---

❶ قاله لبيدفي اللذين حاجوه عند النعمان بن المنذر فاد حض حجتهم حتى زلقوا فلم يكلموا فشبههم بروايا مثقلة ارتطمت في الوحل فلم تستطع الخروج و اوله: فتولوا فاترا معهم .... وقبله: والهبانيق قيام معهم كل مجموم اذا صب همل۔ والبيت في اللسان والحكم (طبع، روى) ديوانه ۳۸ الاقتضاب ۳۸۴ وتهذيب الالفاظ (۱: ۱۱) والاصلاح يعقوب ۸ والمعاني للقتبي ۴۶۷ قال في الاصطلاح: الطبع النهر وجمعه اطباع وطبوع قال لبيد...... كذا قال الاصمعي ۱۲۔

❷ والبيت ايضاً في التاج بغير عزو۔

پڑی ہوں اَلطَّبَقُ وَالطَّبَاقُ: (۱) تھالی یا طباق جس پر پھل رکھتے ہیں۔(۲) ہر چیز کا ڈھکنا (۳) پیٹھ کے مہروں میں سے ہر مہرہ کو طَبَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باہم مطابق ہوتے ہیں اور طَبَّقْتُهٗ بِالسَّيْفِ کا محاورہ بھی مُطَابَقَةُ النَّعْلِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں: میں نے ٹھیک اس کے جوڑ میں تلوار ماری اور اسے الگ کردیا۔

طَبَقُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ: (رات اور دن کی ساعات جو باہم مطابق ہوں۔اَطْبَقْتُ عَلَيْهِ الْبَابَ: میں نے اس پر دروازہ بند کردیا رَجُلٌ عَيَايَاءُ طَبَاقَاءُ: آنکہ بروے سخن بستہ گردد۔یہ اَطْبَقْتُ الْبَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور فَحْلٌ طَبَاقَاءُ اس سانڈھ کو کہتے ہیں جو جفتی سے عاجز ہو اور بڑی مصیبت کو بِنْتُ الطَّبَقِ کہا جاتا ہے۔مثل مشہور ہے وَافَقَ شِنٌّ طَبَقَةً کہ شن طبقة کے موافق ہوگئی اور شَنٌّ وَطَبَقَةٌ دو قبیلوں کے نام ہیں۔❶

(ط ح و) (ی)

طحو اور دحو دونوں ہم معنی ہیں اور ان کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور لے جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْاَرْضِ وَمَا طَحَاهَا﴾(۹۱۔۶) اور قسم زمین اور اس کی جس نے اسے پھیلایا۔

شاعر نے کہا ہے۔❷ (الطّویل)

(۲۹۰) طَحَابِكَ قَلْبٌ فِي الْحِسَانِ طَرُوْبٌ
تجھے حسن پرست دل کہاں سے کہاں لے گیا۔

(ط ر ح)

اَلطَّرْحُ کے معنی کسی چیز کو پھینکنے اور دور کردینے کے ہیں اور دور دراز مقام کو اَلطَّرُوْحُ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے: رَأَيْتُهٗ مِنْ طَرْحٍ: میں نے اسے دور سے دیکھا۔

اَلطِّرْحُ: پھینکی ہوئی چیز جس کی کسی کو ضرورت نہ ہو قرآن میں ہے:

﴿اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِاطْرَحُوْهُ اَرْضًا﴾(۱۲۔۹) تو یوسفؑ کو یا تو جان سے مارڈالو یا کسی دوردراز ملک میں پھینک آؤ۔

(ط ر د)

اَلطَّرْدُ: (ن) کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر دور کردینا، ہٹا دینا کہا جاتا ہے: طَرَدْتُهٗ: میں نے اسے بھگا دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ﴾ (۱۱۔۳۰) برادران ملت! اگر میں ان کو نکال دوں تو عذاب خدا سے کون میری مدد کرسکتا ہے۔

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ﴾(۶۔۵۲) اور ان کو مت نکالو۔

﴿وَمَا اَنَا بِطَارِدِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۱۱۔۲۹) اور میں ان

---

❶ مثل يضرب للمتوافقين في امرا نظر لقصة المثل الميداني (۳۵۹/۲) واللسان (طبق) واصلاح يعقوب ۳۲۲ وفي تاريخ الطبرى ۱۲ بيتاً قالها حبيب بن خدرة مولىٰ هلال بن عامر والمثل في المحاضرات (۲۱۵/۳) وبعده: وافقه فاعتقه والصحاح.

❷ قاله علقمة بن الفحل وتمامه: بعيد الشباب عصر حان مشيب والبيت من كلمة مفضيله في ۳۳ بيتاً يمدح فيها الحارث بن جبلة الغساني وكان قدا سره في مأة من تميم وهذا من احدى مشهوراته الثلاث راجع العمدة لابن رشيق (۱:۱۰۳۔۱۰٤) وانظر للبيت شواهد المغنى (۳:۱۵/٤:۱۰۵) والشعراء ۵۰۲، ۱۱۰ وشواهد الشافيه ٤۹٦ والعمدة (۱:۵۷) والمعاهد (۱:۱۷۳) واضداد سجستاني ۱٤۹ وابن الانبارى ۳۹٤ وابن ابى الطيب ٤٦۰ والعقد الثمين ۱۰۵ وايام العرب ۵۵ والمعلقات بشرح ابن الانبارى ۱۷٦ وامالى ابن الشجرى (۲:۲٦۷) والاغانى (۱٤:۲/۲:۱۱۲) والموشح ۹۳ واللسان (طحا) ومختارا الجاهلى (۱:۳۱۹) الطبقات لابن سلام ۵۱ وعده من ثلاث روائع لا يفوقهن شعر ۱۲.

مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔
﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (٦-٥٢) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔
اَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ وَطَرَدَهٗ: بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا اور جہاں سکونت پذیر تھا وہاں سے نکال دینے کا حکم صادر فرمایا۔
طَرْدٌ وَطَرِيْدَةٌ: وہ شکار جسے اس کی جگہ سے نکال بھگایا جائے
مَطَارَدَةُ الْاَقْرَانِ: ہمسروں کا ایک دوسرے پر حملہ کرکے مدافعت کرنا۔
اَلْمِطْرَدُ: دور بھگانے کا آلہ اِطِّرَادُ الشَّيْءِ: کسی چیز کا پے درپے آنا۔

(ط ر ف)

اَلطَّرْفُ: کے معنی کسی چیز کا کنارہ اور سرا کے ہیں اور یہ اجسام اور اوقات وغیرہما کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ (٢٠-١٣٠) اور اس کی تسبیح بیان کرو اور دن کے اطراف میں۔
﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ (١١-١١٤) اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح اور شام کے اوقات میں) نماز پڑھا کرو۔

اور اس سے بطور استعارہ نجیب الطرفین کو کَرِيْمُ الطَّرْفَيْنِ کہا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ طَرْفَيْنِ کے معنی زبان اور ستر کے ہیں اور یہ عفت کی طرف اشارہ ہے۔
طَرْفُ الْعَيْنِ: آنکھ کی پلک۔اور اَلطَّرْفُ کے اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں اور پلک جھپکنے کو دیکھنا لازم ہے اس لیے الطَّرْف کے معنی دیکھنا بھی آ جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ (٢٧-٤٠) میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے، اور آیت کریمہ:
﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ (٥٥-٥٦) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں، میں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ کے معنی یہ ہیں کہ عفیف ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہیں ہمیشہ نیچے جھکی رہتی ہیں۔
طُرِفَ فُلَانٌ اس کی نظر کو صدمہ پہنچا، اور آیت کریمہ:
﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا﴾ (٣-١٢٧) تاکہ ایک جماعت کو ہلاک کر دے میں قطع کرنے کو ایک طرف کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو نابود کرنے کے لیے اس کی جانب سے شروع ہوا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آیت:
﴿نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا﴾ (١٣-٤١) ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آتے ہیں میں بھی کم کرنے کو اطراف کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔
اَلطِّرَافُ: کے معنی چرمی خیمہ کے ہیں، جس کے اطراف کو اوپر اٹھا دیا جاتا ہے۔
مِطْرَفُ الْخَزِّ وَمُطْرَفٌ منقش چادر جس کے کنارے ریشمی ہوں۔ج مَطَارِفُ۔ اَطْرَفْتُ مَالًا: میں نے تازہ مال حاصل کیا۔
نَاقَةٌ طَرِفَةٌ وَمُسْتَطْرِفَةٌ وہ اونٹنی جو اونٹ کی طرح چراگاہ کے اطراف سے گھاس کھائے اور جو گھاس وہ جانور کھاتا ہے اسے طَرِيْفٌ کہا جاتا ہے اور طَرِيْفٌ کے معنی نیا حاصل کردہ مال بھی آتے ہیں۔ نیز جو شخص ایک عورت پر صبر نہ کرے اسے بھی طَرِيْفٌ کہہ دیتے ہیں۔
اَلطِّرْفُ: عمدہ نسل کا گھوڑا جس کے حسن کے سبب اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہوں دراصل طِرْفٌ بمعنی مَطْرُوْفٌ آتا

ہے۔ یعنی جسے نظر اٹھا کر دیکھا جائے جیسا کہ نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آجاتا ہے اسی اعتبار سے خوبصورت چیز کو جس پر نظر جم جائے اسے قَیْدُ النَّوَاظِرِ کہا جاتا ہے۔

(ط ر ق)

اَلطَّرِیْقُ کے معنی راستہ ہیں، جس پر چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ﴾ (۲۰۔۷۷) پھر ان کے لیے دریا میں راستہ بنا دو۔

اسی سے بطور استعارہ ہر اس مسلک اور مذہب کو طریق کہا جاتا ہے جو انسان کوئی کام کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے عام اس سے کہ وہ فعل محمود ہو یا مذموم۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾ (۲۰۔۶۳) اور تمہارے بہتر مذہب کو نابود کردیں۔

اور امتداد میں راستہ کے ساتھ تشبیہ دے کر کھجور کے لیے درخت کو بھی طَرِیْقَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلطَّرْقُ کے اصل معنی مارنے کے ہیں مگر یہ ضَرْبٌ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ طَرْقٌ کا لفظ چٹاخ سے مارنے پر بولا جاتا ہے جیسے ہتھوڑے سے لوہے کو کوٹنا بعد ازاں ضَرْبٌ کی طرح طَرْقٌ کے لفظ میں بھی وسعت پیدا ہوگئی ہے چنانچہ بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

طَرْقُ الْحَصٰى: کاہن کا اپنی کہانت کے لیے کنکر مارنا۔ طَرْقُ الدَّوَابِّ: چوپائے، جانوروں کا پانی میں داخل ہو کر اسے پاؤں سے گدلا کر دینا۔ طَارَقْتُ النَّعْلَ وَطَرَقْتُهَا: میں نے جوتے کے ایک پرتلہ پر دوسرا رکھ کر اسے سی دیا۔ پھر طَرْقُ النَّعْلِ کی مناسبت سے طَارَقَ بَيْنَ الدِّرْعَيْنِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ایک زرہ کے اوپر دوسری زرہ پہننا کے ہیں۔ طَرْقُ الْخَوَافِیْ: پرند کے اندرونی پروں کا تہ بر تہ ہونا اور اَلطَّارِقُ: کے معنی ہیں: راستہ پر چلنے والا مگر عرف میں بالخصوص اس مسافر کو کہتے ہیں جو رات میں آئے چنانچہ طَرَقَ اَهْلَهٗ طُرُوْقًا کے معنی ہیں وہ رات کو آیا اور ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ: کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بالخصوص رات کو ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ (۸۶۔۱) آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الرجز)

(۲۹۱) نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقٍ ہم طارق یعنی سردار کی بیٹیاں ہیں۔

طَوَارِقُ اللَّيْلِ: وہ مصائب جو رات کو نازل ہوں۔ طُرِقَ فُلَانٌ رات میں صدمہ پہنچا۔

شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الطّویل)

---

[1] تمثلت به هند بنت عتبه بن ربیعه یوم احد تحض على المسلمين (ابن هشام ۵٦٢ وابن الانباری ٤٠) والرجز فی الاصل لهند بنت بیاخته الایادیه قالته فی حرب الفرس لایا دو بعده: لاننثنی لوامق نمشیٰ علی النمارق۔ المسك على المفارق۔ راجع اللسان (طرق، والاقتضاب ۳۱۸ والبحر (٧: ٢٣١) واعراب ثلاثین ۳۸ وایام العرب ۳۱ والسیوطی ۲۷۳ والمعانی للقتبی ۵۳۰ وروض الانف (٢: ١٢٩) وقد جاء بعض هذا الرجز منسوباً لامرء ة من بنی عجل انشدته یوم ذی قار، راجع التاریخ للطبری (٢: ١٥٣) منسوباً لابنة للفند الزمانی انشدته یوم التحالف من ایام حرب بکسر وتغلب (الاغانی ٢٠: ١٤٤).

[2] قاله امية بن الصلت في قصيده يشكوفيها عفوق ابنه في سبعة الحماسة مع المرزوقي رقم ٢٥٤ واختلف فی قائلها قال التبریزی تروی لابن عبدالاعلی وقیل لابی العباس الاعمیٰ قال ابو هلال اور دها ابو عبیدة فی اخیار العققة والبررة ونسبه فی العیون (٣: ٨٧) لیحی بن سعید ولیس له لان قائلها انشدبین یدی النبی صلی الله علیه وسلم کما فی الصغیر للطبرانی ۱۹۵ فاخذ النبی صلی الله علیه وسلم بتلابیب الولد وسلمه لوالدة قائلا له "انت ومالك لابيك" انظر ايضاً الاغانی (٣: ١٩١) وتراجم امية بن ابی الصلت فی الاصابة رقم: ٥٥٢ والخزانة (١: ١١٩۔١٢٢) و ابن سلام (٦٦۔٦٨) والاشتقاق (١٨٤) والاغانی (٣: ١٧٩۔١٨٥/ ١٦: ٦٩۔٧٦) وابن قتیبة (٤٢٩۔٤٣٣).

(۲۹۲) كَاَنِّیْ اَنَاالْمَطْرُوْقُ دُوْنَكَ بِالَّذِیْ...... طُرِقْتَ بِهٖ دُوْنِیْ وَعَیْنِیْ تَهْمُلُ

میں اس طرح بے چین ہوتا ہوں کہ وہ مصیبت جو رات کو تجھ پر آتی ہے مجھے پہنچ رہی ہے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔

اور معنی ضرب یعنی جفتی کرنے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: اونٹ کا ناقہ سے جفتی کرنا۔

اَطْرَقْتُهَا: میں نے سانڈھ کو اونٹنی پر چھوڑا۔

اِسْتَطْرَقْتُ فُلَانًا الْفَحْلَ: میں نے فلاں سے جفتی کے لیے سانڈھ طلب کیا اور یہ محاورات ضَرَبَهَا الْفَحْلُ وَاَضْرَبْتُهَا وَاسْتَضْرَبْتُهٗ کی طرح استعمال ہوتے ہیں اور اس ناقہ کو جو گابھن ہونے کے قابل ہو جائے اسے طَرُوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور کنایہ طَرُوْقَةٌ بمعنی عورت بھی آ جاتا ہے۔

اَطْرَقَ فُلَانٌ فلاں نے نگاہیں نیچی کرلیں گویا اس کی نگاہ زمین کو مارنے لگی جیسا کہ مِطْرَقَةٌ (ہتھوڑے) سے کوٹا جاتا ہے اور طَرِیْقٌ بمعنی راستہ کی مناسبت سے جَاءَتِ الْاِبِلُ مَطَارِیْقُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اونٹ ایک ہی راستہ سے آئے اور تَطَرَّقَ اِلٰی كَذَا کے معنی ہیں: کسی چیز کی طرف رستہ بنانا طَرَّقْتُ لَهٗ: کسی کے لیے راستہ ہموار کرنا۔

اَلطَّرِیْقُ کی جمع طُرُقٌ آتی ہے اور طَرِیْقَةٌ کی جمع طَرَائِقُ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا﴾ (۷۲۔۱۱) کے معنی یہ ہیں کہ ہم مختلف مسلک رکھتے ہیں اور یہ آیت کریمہ:

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۶۳) ان لوگوں کے خدا کے ہاں (مختلف اور متفاوت) درجے ہیں، کی مثل ہے یعنی جیسا کہ یہاں درجات سے مراد اصحاب الدرجات ہیں اسی طرح طرائق سے اصحاب طرائق مراد ہیں اور آسمان کے طبقات کو بھی طَرَائِقُ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ﴾ (۲۳۔۱۷) ہم نے تمہارے اوپر کی جانب سات طبقے پیدا کیے ہیں۔ رَجُلٌ مَطْرُوْقٌ: نرم اور سست آدمی پر هُوَ مَطْرُوْقٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مصیبت زدہ کے ہیں یعنی مصائب نے اسے کمزور کر دیا۔ جیسا کہ مصیبت زدہ آدمی کو مَقْرُوْعٌ یا مَدْوُخٌ کہا جاتا ہے۔ یا یہ نَاقَةٌ مَطْرُوْقَةٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ ذلت میں اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

(ط ر ی) (و)

اَلطَّرِیُّ: تروتازہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَحْمًا طَرِیًّا﴾ (۱۶۔۱۴) تازہ گوشت کھاؤ۔

طَرِیًّا کا مصدر طَرَاءٌ وَطَرَاوَةٌ آتا ہے جس کے معنی تروتازہ ہونے کے ہیں۔ محاورہ ہے:

طَرَّیْتُ كَذَا فَطَرِیَ: میں نے اسے تازہ کیا چنانچہ وہ تازہ ہو گیا۔ اسی سے نئے اور تازہ کیے ہوئے کپڑوں کو مُطَرَّاةٌ کہا جاتا ہے اور اِطْرَاءٌ اس تعریف کو کہتے ہیں جس سے ممدوح کی یاد تازہ ہو جائے اور (طَرَءَ) مہموز کے معنی طَلَعَ یعنی اچانک طلوع ہونے کے ہیں۔

(ط س)

طس: یہ حروف مقطعات سے ہیں اور طَسٌّ وَطُسُوْسٌ سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی تشت ہیں۔

(ط ع م)

اَلطَّعْمُ: (س) کے معنی غذا کھانے کے ہیں اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طَعْمٌ یا طَعَامٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ﴾(۵۔۹۶) اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لیے۔

اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابوسعید الخدری سے روایت ہے:❶ ((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِصَدَقَةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ اَوْصَاعًا مِنْ شَعِیْرٍ)) کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر میں ایک صاع طعام یا ایک صاع جو دینے کا حکم دیا۔'' قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ﴾(۶۹۔۳۶) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے) لیے کوئی کھانا ہے۔

﴿وَطَعَامًا ذَاغُصَّةٍ﴾(۷۳۔۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔

﴿طَعَامُ الْاَثِیْمِ﴾(۴۴۔۴۴) گناہ گار کا کھانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ﴾(۱۰۷۔۳) اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

میں طَعَامٌ بمعنی اِطْعَامٌ یعنی کھانا کھلانا کے ہیں۔

﴿فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا﴾(۳۳۔۵۳) اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا﴾(۵۔۹۳) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَعِمْتُ بمعنی شَرِبْتُ آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ﴾(۲۔۲۴۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو شخص اس سے پانی نہ پیے گا تو (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ وہ) میرا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مَن لَّمْ یَشْرَبْهُ کی بجائے وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس پر بھی طَعِمْتُ کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر مَنْ لَّمْ یَشْرَبْهُ لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس یَطْعَمْهُ کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہر حالت ممنوع ہو جاتا ہے اور ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے زمزم کے پانی کے متعلق اِنَّهٗ طَعَامُ طُعْمٍ وَشِفَاءُ سُقْمٍ (کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے) فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیر زمزم کے پانی میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔ اِسْتَطْعَمْتُهٗ فَاَطْعَمَنِیْ: میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾(۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

﴿وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ﴾(۷۶۔۸) اور وہ کھانا کھلاتے ہیں۔

﴿اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْیَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ﴾(۳۶۔۴۷) بھلا ہم

---

❶ اخرجه الائمة الستة فی کتبهم مختصراً مطو لاوذکر الحافظ فی الفتح ان ابن المنذر علی من استدل من هذا الحدیث ان المراد من الطعام الحنطة وقال تفسیر ابن سعید مخالف لهذا الاستدلال ولفظه وقال ابو سعید وکان طعامنا الشعیروالزبیب والا قط والتمروهی ظاهرة فیما قال لکن فی روایة عطف الشعیر علی الطعام وهو یدل علی المغایرة واورد الحافظ هذہ الروایة من ثلاث طرق والله اعلم.

ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا۔
﴿اَلَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ﴾ (۱۰۶۔۴) جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔
﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ (۶۔۱۴) وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔
﴿وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ﴾ (۵۱۔۵۷) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔
اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ ❶ (۲۱)
((اِذَااسْتَطْعَمَكُمُ الْاِمَامُ فَاَطْعِمُوْهُ)) یعنی جب امام (نماز میں) تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتا دو۔ رَجُلٌ طَاعِمٌ: خوش حال آدمی۔ رَجُلٌ مُطْعِمٌ: جس کو وافر رزق ملا ہو۔ مِطْعَمٌ نیک خورندہ۔ مِطْعَامٌ: بہت کھلانے والا، مہمان نواز طُعْمَةٌ کھانے کی چیز، رزق۔

(ط ع ن)

اَلطَّعْنُ: (ف) کے معنی نیزہ، سینگ وغیرہ کسی تیز اور نوکیلی چیز کے ساتھ زخم کرنے کے ہیں۔ تَطَاعَنُوْا وَاطَّعَنُوْا: انہوں نے ایک دوسرے کو نیزہ مارا۔ پھر استعارہ کے طور پر کسی پر الزام لگانے یا اس کی بدگوئی کرنے کے معنی میں بھی طعن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ﴾ (۴۔۴۶) اور دین میں طنز کی راہ سے۔
﴿وَطَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ﴾ (۹۔۱۲) اور تمہارے دین میں وہ طعنے کرنے لگیں۔

(ط غ و) (ی)

طَغَوْتُ وَطَغَيْتُ طَغَوَانًا وَطُغْيَانًا کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور اَطْغَاهُ (افعال) کے معنی ہیں: اسے طغیان، سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنَّهٗ طَغٰى﴾ وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔
﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى﴾ (۹۶۔۶) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے۔
﴿قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى﴾ (۲۰۔۴۵) دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار! ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہو جائے۔
﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِىْ﴾ (۲۰۔۸۱) اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا عذاب نازل ہوگا۔
﴿فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ (۱۸۔۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر بدکردار ہوتا، کہیں ان کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔
﴿فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) کہ بے حد سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔
﴿اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا﴾ (۱۷۔۶۰) بے حد سرکش۔
﴿وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ﴾ (۳۸۔۵۵) اور سرکشوں کے لیے برا ٹھکانا ہے۔
﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ﴾ (۵۰۔۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا۔

---

❶ راجع للحديث الفائق (۲/۴۳) وفيه "انها" والعائد لزمزم واللسان (طعم) وفى الطيالسى عن ابى ذر: وانهاالمباركة راجع الفتح الكبير للنبهانى (۱/۴۴۸). قاله عليؓ راجع النيل (۲/۳۳۹) والفتح الاثر فى الفائق (۲/۴۳) قال وهذا من باب التمثيل.

اَلطَّغْوٰی: (اسم)طغیان۔یعنی بے حد سرکشی اور آیت کریمہ:

﴿کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰاهَا﴾(۹۱۔۱۱) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب پیغمبر ﷺ کو جھٹلایا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ قوم ثمود کو جب ان کی سرکشی کی پاداش سے ڈرایا گیا تو انہوں نے یقین نہ کیا اور آیت کریمہ:

﴿هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی﴾(۵۳۔۵۲) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ سرکشی کسی حالت میں بھی ہلاکت سے نجات نہیں بخش سکتی۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم ان سے بھی زیادہ سرکش تھی لیکن انہیں ہلاک کر دیا گیا اور آیت:

﴿اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَاءُ﴾(۶۹۔۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے............

میں پانی کے حد سے تجاوز کر جانے کو مجازاً اطغیان سے تعبیر فرمایا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ﴾(۶۹۔۵)سو......کڑک سے ہلاک کر دیے گئے۔

میں طَاغِيَةٌ سے طوفان کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت ﴿اِنَّالَمَّاطَغَی الْمَاءُ﴾ میں پایا جاتا ہے۔❶

اَلطَّاغُوْتُ: سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا جاتا ہے اور واحد جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔❷ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾(۲۔۲۵۶) جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(۳۹۔۱۷) اور جنہوں نے بتوں کی پوجا اجتناب کیا۔

﴿اَوْلِيٰٓـءُ هُمُ الطَّاغُوْتُ.........﴾(۲۔۲۵۷) ان کے دوست شیطان ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾(۴۔۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

میں طاغوت سے حدود شکن مراد ہیں اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کی بنا پر ساحر، کاہن، سرکش جن اور ہر وہ چیز جو طریق حق سے پھیرنے والی ہو اسے طَاغُوْتٌ کہا جاتا ہے بعض کے نزدیک یہ فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے جیسے جَبَرُوْتٌ وَمَلَكُوْتٌ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل طَغَوُوْتٌ ہے۔ پھر صَاعِقَةٌ اور صَاقِعَةٌ کی طرح پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا اور پھر واؤ کے متحرک اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے تبدیل کیا گیا۔❸

(ط ف ف)

اَلطَّفِيْفُ: کے معنی حقیر اور تھوڑی سی چیز کے ہیں اسی سے ناقابل اعتناء چیز کو طَفَافَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفَّفَ الْكَيْلَ کے معنی ہیں: اس نے پیمانے کو پورا بھر کر نہیں دیا۔ اس میں کمی کی قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾(۸۳۔۱) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

---

❶ الآیة متعلق بقوم ثمود ولا تعلق له بالآیة: انا لما طغی الماء.

❷ قدیاتی جمعه الی طواغیت کما وروفی الحدیث ((لا تحلفوا اباء کم ولا بالطواغیت)).

❸ نوزنه فعلوتٌ.

(ط ف ق)

طَفِقَ یَفْعَلُ کَذَا: وہ ایسا کرنے لگا یہ اَخَذَ یَفْعَلُ کی طرح (کسی کام کے شروع کرنے کا معنی دیتا) ہے اور ہمیشہ کلام مثبت میں استعمال ہوتا ہے لہٰذا مَاطَفِقَ کَذَا کہنا جائز نہیں ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾(۳۸۔۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

﴿وَطَفِقَا یَخْصِفَانِ﴾(۷۔۱۲۲) اور وہ لگے چپکانے۔

(ط ف ل)

اَلطِّفْلُ: جب تک بچہ نرم ونازک رہے اس وقت تک اسے طِفْلٌ کہا جاتا ہے یہ اصل میں مفرد ہے مگر کبھی بمعنی جمع بھی آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا﴾(۴۰۔۶۷) پھر تم کو نکالتا ہے۔ کہ تم بچے ہوتے ہو۔

﴿اَوِالطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرَاتِ النِّسَآءِ﴾ (۲۴۔۳۱) یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

طِفْلٌ کی جمع اَطْفَالٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْکُمُ الْحُلُمَ﴾(۲۴۔۵۹) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

اور نرم ونازک ہونے کے معنی کی مناسبت سے گداز بدن عورت کو طَفْلَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفِلَتْ طُفُوْلَةً وَطَفَالَةً کے نرم ونازک ہونے کے ہیں اور جس ہرنی کے ساتھ اس کا بچہ ہو اسے مُطْفِلٌ کہا جاتا ہے طَفَلَتِ الشَّمْسُ اس وقت بولا جاتا ہے جب آفتاب نکلنے کو ہو اور ابھی تک اس کی دھوپ اچھی طرح زمین پر نہ پھیلی ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الرمل)

(۲۹۳) وَعَلَی الْاَرْضِ غَیَابَاتُ الطَّفَلِ

اور زمین پر تا حال صبح کا سوجھا کا موجود تھا۔

اور طَفَّلَ جس کے معنی ایسے کھانے میں شریک ہونا کے ہیں جس پر اسے بلایا نہ گیا ہو، کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ طَفَلَ النَّهَارُ سے ماخوذ ہے یعنی اس وقت آنا اور بعض نے کہا ہے کہ طُفَیْلُ الْعَرَائِسِ ایک مشہور آدمی کا نام ہے ❷ جو بلادعوت تقریبات میں شریک ہو جاتا تھا اور اسی سے طَفَّلَ ہے جس کے معنی طفیلی بن کر جانے کے ہیں۔

(ط ل ل)

اَلطَّلُّ کے معنی بہت ہلکی سی بارش کے ہیں جس کا معمولی سا اثر ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾(۲۔۲۶۵) اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی۔

اور طَلَّ الْاَرْضَ فَهِیَ مَطْلُوْلَةٌ کے معنی، زمین پر اوس پڑنے کے ہیں اسی سے جس خون کی پرواہ نہ کی جائے اور اسے اوس کی طرح معمولی سمجھا جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ طَلَّ دَمُ فُلَانٍ یعنی فلاں کا خون باطل کر دیا گیا اور شبنم کا چونکہ ہلکا سا اثر ہوتا ہے اس مناسبت سے گھروں کے باقی ماندہ نشانات کو طَلَلٌ کہہ دیتے ہیں اَطَلَّ فُلَانٌ

---

❶ قاله لبید یصف فرسه وصدره: فتدلیت علیه قافلاً۔ والبیت فی السمط ۸۳۳ ودیوانه (۲: ۱٤) وتهذیب الالفاظ ٤۰۷ والاشتقاق (۸٤۔۱۷۳) وقبله فی العالی (۲: ۲۰۱) ملیح الارض لمحاً فی الندی من مرابیع ریاض ورحل وایضا راجع اللسان (غیا) وغریب ابی عبید (۱: ۹۳).

❷ رجل من اهل الکوفة من بنی عبدالله ابن غطفان (الصحاح).

جھانکنا، دور سے نظر آنا۔

(ط ف ی)

طَفِئَتِ (س) اَلنَّارُ کے معنی آگ بجھ جانے کے ہیں اور اَطْفَأْتُهَا (افعال) کے معنی پھونک سے بجھا دینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَاللّٰهِ﴾ (۹۔۳۲) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَاللّٰهِ﴾ (۶۱۔۸) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے چراغ کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔

اور دونوں آیتوں میں معنوی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے کہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا کے معنی نور الٰہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں مگر لِيُطْفِئُوْا کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو اطفاء نور کا سبب بن سکے۔

(ط ل ب)

اَلطَّلَبُ: (ن) کے معنی کسی شے کے پانے کی تلاش اور جستجو کرنا کے ہیں عام اس سے کہ وہ چیز اعیان واجسام سے تعلق رکھتی ہو یا مقال سے قرآن میں ہے:

﴿فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا﴾ (۱۸۔۴۸) تم اسے تلاش کے باوجود حاصل نہیں کر سکو گے۔

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ (۲۲۔۷۳) طلب کرنے والا اور جس سے طلب کیا جائے (یعنی عابد اور معبود دونوں) کمزور ہیں۔

اَطْلَبْتُ فُلَانًا (۱) کسی کی حاجت روائی کرنا (۲) کسی کو محتاج کرنا اور جو گھاس پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لیے تکلیف اٹھانا پڑے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے اَطْلَبَ الْكَلَاءُ۔

(ط ل ت)

﴿طَالُوْتُ﴾ یہ عجمی لفظ ہے [1] بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جالوت کے مقابلہ کے لیے مقرر فرمایا (۲۔۲۴۷)

(ط ل ح)

اَلطَّلْحُ: (موز) ایک درخت کا نام ہے اس کا واحد طَلْحَةٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۹) اور تہ بتہ کیلوں......اور اِبِلٌ طَلَاحِيٌّ۔ طَلْحَةٌ کی طرف منسوب ہے اور طَلَاحِيٌّ وَطَلْحَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو طلحہ درخت کو کھا کر بیمار ہو گئے ہوں۔ نیز طَلْحٌ وَطَلِيْحُ اَسْفَارٍ محاورہ ہے یعنی کثرت سفر کی وجہ سے دبلی اونٹنی اور اسی سے اَلطَّلَاحُ ہے جو کبھی اَلصَّلَاحُ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔

(ط ل ع)

طَلَعَ (ن) اَلشَّمْسُ طُلُوْعًا وَّمَطْلَعًا کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ﴾ (۲۰۔۱۳۰) اور سورج کے نکلنے سے پہلے تسبیح وتحمید کیا کرو۔

﴿حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۹۷۔۵) طلوع صبح تک۔

اور یہ مَطْلِعٌ کے معنی ہیں "طلوع ہونے کی جگہ" قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ﴾ (۱۸۔۹۰) یہاں تک کہ سورج کے طلوع ہونے کے مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایسے لوگوں پر طلوع کرتا

---

[1] راجع روح المعانی (۲/۴۵۳) والکشاف (۱/۱۰۰) وابن کثیر (۱/۳۰۰-۳۰۳).

ہے......

اسی سے استعارہ کے طور پر طَلَعَ عَلَيْنَا فُلَانٌ وَطَلَّعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے سامنے ظاہر ہونا اور اوپر پہنچ کر نیچے کی طرف جھانکنا قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ فَاطَّلَعَ﴾(۳۷۔۵۴) بھلا خود جھانکے گا۔

﴿فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾(۴۰۔۳۷) پھر اوپر جا کر موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں۔

﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ﴾(۱۹۔۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔

﴿لَعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾(۲۸۔۳۸) تاکہ میں موسیٰ کے خدا کی طرف چڑھ جاؤں۔

اِسْتَطْلَعْتُ رَأْيَهُ: میں نے اس کی رائے معلوم کی۔

اَطْلَعْتُكَ عَلٰى كَذَا میں نے تمہیں فلاں معاملہ سے آگاہ کردیا۔ طَلَعْتُ عَنْهُ: میں اس سے پنہاں ہوگیا۔(اضداد)

اَلطِّلَاعُ: (۱) ہر وہ چیز جس پر سورج طلوع کرتا ہو یا(۲) انسان اس پر اطلاع پائے۔ طَلِيْعَةُ الْجَيْشِ: ہراول دستہ

اِمْرَءَ ةٌ طُلَعَةٌ قُبَعَةٌ: وہ عورت جو بار بار ظاہر اور پوشیدہ ہو اور طلوع آفتاب کی مناسبت سے طَلْعُ النَّخْلِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی خرما کے غلاف کے ہیں جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾(۵۰۔۱۰) جن کا گابھا تہ بتہ ہوتا ہے۔

﴿طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ﴾(۳۷۔۶۵) ان کے شگوفے ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔

﴿وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ﴾(۲۶۔۱۴۸) اور کھجوریں جن کے شگوفے لطیف ونازک ہوتے ہیں۔

اَطْلَعَتِ النَّخْلُ: کھجور کا شگوفے دار ہونا۔

قَوْسٌ طِلَاعُ الْكَفِّ: کمان جس سے مٹھی بھر جائے۔

(ط ل ق)

اَلطَّلَاقُ: دراصل اس کے معنی کسی بندھن سے آزاد کرنے کے ہیں محاورہ ہے۔

اَطْلَقْتُ الْبَعِيْرَ مِنْ عِقَالِهٖ وَطَلَّقْتُهٗ: میں نے اونٹ کا پائے بند کھول دیا طَالِقٌ وَطَلْقٌ: وہ اونٹ جو مقید نہ ہو اسی سے خَلَّيْتُهَا کی طرح طَلَّقْتُ الْمَرْءَ ةَ کا محاورہ مستعار ہے یعنی میں نے اپنی عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد کردیا ایسی عورت کو طَالِقٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾(۶۵۔۱) تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾(۲۔۲۳۰) طلاق صرف دوبار ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ﴾(۳۔۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔ میں طلاق کا لفظ عام ہے جو رجعی اور غیر رجعی دونوں کو شامل ہے۔ لیکن آیت کریمہ:

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾(۲۔۲۲۸) اور ان کے خاوند ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔ میں "واپس لے لینے کا زیادہ حق دار ہونے کا حکم" رجعی طلاق کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ﴾(۲۔۲۳۰) پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دے

دے تو...... اس پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔ میں مِنْ بَعْدُ کے یہ معنی ہیں کہ اگر بینونت یعنی عدت گزر جانے کے بعد پھر (تیسری) طلاق دے۔ تو اس کے لیے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے شوہر سے شادی نہ کرے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ (۲۔۲۳۱) میں طَلَّقَهَا کے معنی یہ ہیں کہ اگر دوسرا خاوند طلاق دے دے اور وہ پہلے خاوند کے نکاح میں آنا چاہے تو ان کے دوبارہ نکاح کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اِنْطَلَقَ فُلَانٌ کے معنی چل پڑنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ﴾ (۶۸۔۲۳) تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔

﴿اِنْطَلِقُوْا اِلٰى مَاكُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ (۷۷۔۲۹) جس چیز کو تم جھٹلایا کرتے تھے اب اس کی طرف چلو۔

اور حلال چیز کو طَلْقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے کھا لینے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔

عَدَا الْفَرَسُ طَلْقًا اَوْ طَلْقَيْنِ: گھوڑے نے آزادی سے ایک دو دوڑیں لگائیں اور فقہ کی اصطلاح میں مُطْلَقٌ اس حکم کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی جزئی مخصوص نہ کی گئی ہو۔

طَلَقَ يَدَهٗ وَاَطْلَقَهَا: اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔

طَلْقُ الْوَجْهِ اَوْ طَلِيْقُ الْوَجْهِ خندہ رو......... ہنس مکھ۔

طُلِقَ السَّلِيْمُ (مجہول) مارگزیدہ کا صحت یاب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۲۹۴) تُطَلِّقُهٗ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ

کہ وہ کبھی درد سے آرام پالیتا ہے اور کبھی وہ درد دوبارہ لوٹ آتا ہے۔

لَيْلَةٌ طَلْقَةٌ: وہ رات جس میں اونٹوں کو پانی پر وارد ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے اپنی مرضی سے چلے جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَطْلَقَ الْاِبِلَ: یعنی اس نے پانی پر وارد ہونے کے لیے اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

(ط م م)

اَلطَّمُّ کے معنی پانی سے بھرے ہوئے سمندر کے ہیں اور ایسے سمندر کو اَلطَّمُّ وَالرَّمُّ کہا جاتا ہے اور طَمَّ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی پر چھا جانے اور اسے ڈھانپ لینا کے ہیں۔ اسی سے قیامت کو طَامَّةٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس کی مصیبت سب پر چھا جائے گی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرٰى﴾ (۷۹۔۳۴) تو جب بڑی آفت کر آئے گی۔

(ط م ث)

اَلطَّمْثُ (ن س) کے معنی (۱) دم حیض اور (۲) کسی عورت کی بکارت کو زائل کرنا کے ہیں اور طَامِثٌ کے معنی حیض والی عورت کے ہیں۔ طَمَثَ الْمَرْئَةَ اس نے عورت کی بکارت زائل کردی قرآن پاک میں ہے:

﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ (۵۵۔۵۶) جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ کسی جن نے۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے، مَاطَمِثَ هٰذِهِ الرَّوْضَةَ اَحَدٌ قَبْلَهَا: یعنی ہم سے قبل اس سبزہ زار میں کوئی

[1] قاله النابغة فی وصف السلیم واوله تناوزها الراقون من سوء سمها۔ والقصیدة طویلة یعتذر فیها الی النعمان بن المنذر وفی دیوانه من سوء سمعها والبیت فی المعانی الکبیر والخزانة (۱: ۴۳۴) وقد مرفی۔۲۹۔

اور وارد نہیں ہوا مَاطَمِثَ النَّاقَةَ جَمَلٌ اس اونٹنی کو کسی اونٹ نے بھی نہیں چھوڑا۔

(ط م س)

اَلطَّمْسُ کے معنی کسی چیز کا نام ونشان مٹا دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِذَاالنُّجُوْمُ طُمِسَتْ﴾(۷۷۔۸) جب ستاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ﴾(۱۰۔۸۵) اے پروردگار! ان کے مال ودولت کو تباہ وبرباد کردے۔یعنی ان کا نام ونشان مٹا دے۔

﴿وَلَوْنَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِهِمْ﴾(۳۶۔۶۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا کر اندھا کر دیں۔یعنی آنکھوں کی روشنی سلب کرلیں اور ان کا نشان مٹا دیں جس طرح کہ کسی نشان کو مٹا دیا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا﴾(۴۔۴۷) قبل اس کے کہ ہم ان کے چہروں کو بگاڑ کر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کے چہروں کو بگاڑنا مراد ہے۔مثلاً ان کے چہروں پر بال اُگا دیں۔ان کی صورتیں بندروں اور کتوں جیسی کردی جائیں۔بعض نے کہا ہے کہ یہ آخرت میں ہوگا جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾(۸۴۔۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے۔میں اشارہ پایا جاتا ہے اور چہروں کو مٹانے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کی آنکھیں گدی پر لگادی جائیں اور یا ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹا دینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ﴾(۴۵۔۲۳) اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہورہا ہے۔(تو) خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی۔

بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے قوم کے اعیان واکابر مراد ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ہم بڑے بڑے سرداروں کو رعیت اور محکوم بنادیں،اس سے بڑھ کر اور کون سی ہلاکت ہوسکتی ہے۔

(ط م ع)

اَلطَّمْعُ کے معنی ہیں: نفس انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان۔

طَمِعَ(س) طَمْعًا وَطَمَاعِیَةً: کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ مائل ہونا۔طَمِعٌ وَطَامِعٌ: اس طرح مائل ہونے والاقرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلَنَا رَبُّنَا﴾(۲۶۔۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا خدا ہمارے گناہ بخش دے گا۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْالَکُمْ﴾(۲۔۷۵)(مومنو) کیا تم آرزو رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے دین کے قائل ہوجائیں گے۔

﴿خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾(۱۳۔۱۲) ڈرانے اور امید دلانے کے لیے۔

اور عموماً چونکہ طمع کی بنا خواہش نفسانی پر ہوتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے:اَلطَّمَعُ طَبْعٌ والطبع تدنس الاھاب کہ طمع بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو انسان کے نفس کو ملوث کرڈالتی ہے۔

(ط م ن)

اَلطَّمَانِیْنَةُ وَالِاطْمِیْنَانُ کے معنی ہیں خلجان کے

بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ﴾(۳۔۱۲۶)یعنی اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو۔
﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾(۲۔۲۶۰)لیکن (میں دیکھنا) اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کرلے۔
اور آیت کریمہ:
﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾(۸۹۔۲۷) میں نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جسے برائی کی طرف کسی طور بھی رغبت نہ ہو۔اور آیت کریمہ:
﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾(۱۳۔۲۸) اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔
میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ معرفت الٰہی اور کثرت عبادت سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔جس قسم کی تسکین کا کہ آیت :﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا۔ارشاد ہے: ﴿وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾(۱۶۔۱۰۶) اور اسکا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔
﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ﴾(۴۔۱۰۳) پھر جب خوف جاتا رہے۔
﴿وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا﴾(۱۰۔۷)
اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے۔
وَاطْمَاَنَّ وَتَطَاْمَنَ، مادہ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

(ط ھ ر)

طَهَرَتِ(ك)الْمَرْاَةُ طُهْرًا وَطَهَارَةً وَطَهُرَتْ (ن) کے معنی عورت کے حیض سے پاک ہونا کے ہیں۔اور اسے فتحہ ھاء کے ساتھ پڑھنا قیاس کے زیادہ مطابق ہے اولاً تو اس لیے کہ یہ طَمَثَتْ کی ضد ہے جس کے معنی حیض آنا کے ہیں اور دوم اس لیے کہ اس سے اسم فاعل طَاهِرَةٌ وَطَاهِرٌ آتا ہے جیسے قَآئِمَةٌ وَقَآئِمٌ وَقَاعِدَةٌ وَقَاعِدٌ۔[1]
طہارت دو قسم پر ہے طہارت (۱) جسمانی اور (۲) طہارت قلبی قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم دونوں قسم کی طہارت مراد ہے، کہا جاتا ہے۔
طَهَّرْتُهٗ فَطَهُرَ وَتَطَهَّرَ وَاطَّهَّرَ فَهُوَ طَاهِرٌ وَمُتَطَهِّرٌ: میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہوگیا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾(۵۔۶) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو یعنی پانی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کرلیا کرو۔اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو، میں دو فعل لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ عورتیں جب تک حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کرلیں اس وقت تک ان سے مقاربت جائز نہیں ہے اور ایک قرأت میں حَتّٰى يَطَّهَّرْنَ ہے جس سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾(۲۔۲۲۲) اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
میں مُتَطَهِّرِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو گناہوں کو ترک کر کے اصلاح نفس میں لگے رہتے ہیں نیز فرمایا:

---

[1] وان كان بضم الطاء فلتكن لصفه منه طهير مثل كريم لكن قال ابن جنى: طاهر من طهر مثل شاعر من شعر فلذانك جمع الشاعر على شعراء لانه على جمع فعيل ۱۲، كذا فى ابى السعود انظر (الفتوحات الا لهية) (۱/ ۳۵۵) ۱۲۔

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾(۹۔۱۰۸) اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔
﴿اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ (۷۔۸۲) ان کے گھر والوں کو اپنے گاؤں سے نکال دو کہ یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾(۹۔۱۰۸) اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔
میں مُطَّهِّرِيْنَ سے پاکیزہ قلب لوگ مراد ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾(۳۔۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ خدا تجھے ان لوگوں سے نکال کر الگ لے جائے گا اور اس بات سے بلند و بالا رکھے گا کہ ان جیسے کام کرو۔ اسی معنی میں فرمایا:
﴿وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾(۳۳۔۳۳) اور تمہیں بالکل صاف کردے۔
﴿وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۳۔۴۲) اور پاک بنایا اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا۔
﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ﴾(۲۔۲۳۲) یہ تمہارے لیے نہایت خوب اور بہت پاکیزہ بات ہے۔
﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ﴾(۳۳۔۵۳) یہ تمہارے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾(۵۶۔۷۹) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک کے حقائق کی معرفت انہی لوگوں کو حاصل ہوسکتی ہے جو اپنے نفوس کو آلودگیوں سے پاک وصاف رکھتے ہیں اور دل و دماغ کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾(۲۷۔۵۶) بطور طنز کہا تھا کیونکہ لوط علیہ السلام نے جب قوم کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ﴿هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ کہا تو انہوں نے طنزاً یہ جواب دیا تھا اور آیت کریمہ:
﴿وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾(۲۔۲۵) اور وہاں ان کے لیے بیبیاں ہوں گی۔
میں مُطَهَّرَةٌ کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں اور نجاستوں (یعنی حیض ونفاس وغیرہ) سے پاک ہوں گی اور بعض نے کہا ہے کہ اخلاق رذیلہ سے پاکیزہ ہونا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں جنتی عورتوں کو ﴿عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۰۔۳۷) شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔
کہا ہے اور قرآن پاک میں فرمایا:
﴿مَرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾(۸۰۔۱۴) جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾(۷۴۔۴) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: یہاں نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے۔ [1] اور آیت کریمہ:
﴿وَطَهِّرْ بَيْتِيَ﴾(۲۲۔۲۶) اور میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔
﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾ (۲۔۱۲۵) اور ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو کہا کہ میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔
میں خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک رکھنے کی ترغیب

[1] ذكره عكرمة عن ابن عباس (ص۵۰۹ الجمل ج۴).

دی گئی ہے بعض علماء نے کہا ہے کہ دل کو پاک وصاف رکھنا مراد ہے حتیٰ کہ اس کے اندر وہ سکون پیدا ہو سکے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۴۸۔۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔ میں پایا جاتا ہے۔

اَلطَّھُوْرُ: یہ کبھی مصدر ہوتا ہے۔❶ جیسا کہ سیبویہ نے اہل عرب سے تَطَھَّرْتُ طَھُوْرًا وَتَوَضَّاْتُ وَضُوْءً کا محاورہ نقل کیا ہے۔ لہٰذا یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ جیسا کہ وَقَدْتُ وَقُوْدًا ہے اور کبھی اسم ہوتا ہے جیسا کہ فَطُوْرٌ، ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے روزہ کھولا جائے اسی طرح وَجُوْرٌ سَقُوْطٌ اور ذَرُوْرٌ ہیں❷ اور کبھی صیغہ صفت ہوتا ہے جیسا کہ رَسُوْلٌ اور اس کے ہم وزن دیگر اسمائے صفت ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿وَسَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا﴾ (۷۶۔۲۱) اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

تو اس میں تنبیہ کی ہے کہ ان کے مشروبات اہل دوزخ کے مشروبات کے خلاف ہوں گے جن کا ذکر کہ آیت:

﴿وَیُسْقٰی مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ﴾ (۱۴۔۱۶) اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَھُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۸) اور ہم آسمان سے پاک اور نتھرا ہوا پانی برساتے ہیں۔

میں اصحاب شافعیؒ طَھُوْرٌ بمعنی مُطَھِّرٌ لیتے ہیں لیکن یہ لفظاً صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اَفْعَلَ وَفَعَّلَ سے فَعُوْلٌ کے وزن پر صیغہ صفت نہیں آتا بلکہ یہ وزن فَعُلَ کے ساتھ خاص ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لفظ طَھُوْرٌ (معنوی) اعتبار سے تطہیر کو چاہتا ہے۔ کیونکہ طاہر (پاکیزہ) دو قسم پر ہوتا ہے ایک وہ جو خود تو پاک ہو مگر دوسری چیز کو پاک کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہو جیسے کپڑا کہ گو یہ پاک ہے مگر دوسری چیز کو پاک نہیں کرسکتا۔ دوم وہ جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے پانی۔ چنانچہ قرآن پاک نے پانی کو طَھُوْرٌ کہہ کر اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(ط و د)

اَلطَّوْدُ: بلند پہاڑ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ﴾ (۲۶۔۶۳) کہ گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اَلطَّوْدُ کے معنی ہی بڑے بلند پہاڑ کے ہیں۔❸ مگر اس کے باوجود اس کے وصف میں عظیم کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پانی بلند پہاڑ کی طرح تھا نہ یہ کہ وہ سب پہاڑوں سے بلند تر تھا۔

(ط و ر)

طَوَارُ الدَّارِ وَطِوَارُہٗ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:

عَدَافُلَانٌ طَوْرَہٗ: فلاں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔

لَااَطُوْرُبِہٖ میں اس کے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔

فَعَلَ كَذَا طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ: اس نے ایک بار کے بعد

---

❶ انظر للبحث اصلاح المنطق ۳۳۲۔۳۳۵ باب فَعُوْلٌ ۱۲.

❷ کما روی فی الحدیث ((الطھور ماء ہ والحل میتتہ)).

❸ قال الزمخشری انہ ماخوذ من البناء المنطادای العالی والفائق (ص۲۶۵ ج۲).

دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ:
﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا﴾(۷۱۔۱۴) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اَطْوَارًا سے ان مختلف منازل ومدارج کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:
﴿خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ﴾(۲۲۔۵) ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتداء میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔
میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت:
﴿وَاخْتِلَافِ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ﴾(۳۰۔۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔
میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو ہر معاشرہ میں نمایا طور پر پایا جاتا ہے۔
اَلطُّوْرُ (ایلہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے) اور بعض نے کہا ہے ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں۔ [1] اور بعض کے نزدیک طور سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو کرہ ارض کو محیط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ﴾(۵۲۔۱،۲) کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔
﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ﴾(۲۸۔۴۶) اور نہ تم اس وقت طور کے کنارے پر تھے۔
﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ﴾(۹۵۔۲) اور طور سینین کی۔
﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾(۱۹۔۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی ذہنی جانب سے پکارا۔
﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ﴾(۲۔۹۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

(ط و ع)

اَلطَّوْعُ کے معنی (بطیب خاطر) تابعدار ہو جانا کے ہیں اس کے بالمقابل کُرْہٌ ہے جس کے معنی ہیں: کسی کام کو ناگواری اور دل کی کراہت سے سرانجام دینا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾(۴۱۔۱۱) آسمان وزمین سے فرمایا: دونوں آؤ دل کی خوشی سے یا ناگواری سے۔
﴿وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾(۳۔۸۳) حالانکہ سب اہل آسمان وزمین بطیب خاطر یا دل کے جبر سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔
یہی معنی اَلطَّاعَةُ کے ہیں لیکن عام طور پر طَاعَةٌ کا لفظ کسی حکم کے بجالانے پر آجاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ﴾(۴۔۸۱) اور یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔
﴿طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾(۴۷۔۲۱)(خوب بات) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کہنا ہے۔
طَاعَ لَهٗ يَطُوْعُ وَاَطَاعَهٗ يُطِيْعُهٗ: کسی کی فرمانبرداری کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾(۴۔۵۹) اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو۔
﴿وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾(۴۔۸۰) جو

[1] وفی البخاری عن مجاهدان الطور اسم سریانی بمعنی الجبل ولکن القرآن اطلقه علی جبل مخصوص واختلف فی تعیینه معجم البلدان للحموی.

شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔

﴿وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ﴾ (۳۳۔۸) اور کافروں کا کہانہ مانو۔

اور حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٌ﴾ (۸۱۔۲۱) سردار اور امانت دار ہے۔

اَلتَّطَوُّعُ: (تفعل) اس کے اصل معنی تو تکلیف اٹھا کر حکم بجالانا کے ہیں۔ مگر عرف میں نوافل کے بجالانے کو تَطَوُّعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ (۲۔۱۸۴) اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو وہ اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔

ایک قرأت میں وَمَنْ يَّطَّوَّعَ خَيْرًا ہے۔

اَلْاِسْتِطَاعَةُ: (استفعال) یہ طوع سے استفعال کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا مگر محققین کے نزدیک اِسْتِطَاعَةٌ نام ہے ان اسباب وذرائع اور صلاحیتوں کا جن کے ذریعہ انسان کو کسی کام کے کرنے پر قدرت ہو جائے اور وہ چار چیزیں ہیں۔(۱) فاعل کا مخصوص ڈھانچہ (۲) فعل کا تصور (۳) مادہ جو فعل کے اثر کو قبول کر سکے (۴) اگر وہ فعل کسی آلہ کا محتاج ہے تو اس آلہ کا فراہم ہونا مثلاً لکھنا کہ کاتب لکھنے کے لیے ان چار چیزوں کا محتاج ہے اور جب کسی شخص کو ان اشیاء میں سے ایک چیز بھی حاصل نہ ہو تو اس کو غیر مستطیع کہا جائے گا۔

اِسْتِطَاعَةٌ کی ضد عَجْزٌ ہے یعنی ان اشیاء میں سے ایک دویا سب کا حاصل نہ ہونا اور جب کسی شخص کو یہ ساری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے مُسْتَطِيْعٌ مطلق کہا جاتا ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی حاصل نہ ہو تو سے عاجز مطلق کہا جائے گا اور جب کچھ حاصل ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوں تو گو ایک اعتبار سے وہ مستطیع ہے مگر دوسرے اعتبار سے وہ عاجز ہے اور اسے عاجز کہنا زیادہ بہتر ہے اور استطاعت قدرت سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۱۔۴۳) وہ نہ تو آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ﴾ (۵۱۔۴۵) پھر وہ نہ تو اٹھنے کی طاقت رکھتے تھے۔

﴿مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۳۔۹۷) جو اس (گھر) تک جانے کا مقدور رکھے۔

یعنی اس کے پاس یہ چار چیزیں مہیا ہو جائیں اور حدیث میں استطاعت حج کی جو تشریح زاد راہ اور سواری سے کی گئی ہے۔❶ (۲۲) تو اس سے صرف ان اسباب وذرائع کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حج کے لیے لازم ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ باقی تینوں چیزوں کا ہونا تو عقلاً ہر کام کے لیے لازم ہے اور شرعاً ان کے بغیر کسی کو مکلّف بنانا ہی جائز نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ﴾ (۹۔۴۲) اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔

میں استطاعت سے سواری، مال اور دیگر ذرائع مراد ہیں اسی طرح آیت کریمہ:

❶ اخرجه الترمذی وابن ماجة من حديث ابی هريرة وابن عباس والحاكم من حديث انس قال فی الكاف اخرجه الدار قطنی باسانيد ضعيفة قال البيهقی والصواب الرواية عن الحسن مرسلاً ولا يثبت مرفوعاً راجع تخريج الكشاف.

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا﴾(۴۔۲۵) اور جو شخص تم میں سے مقدور نہ رکھے۔
﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً﴾(۴۔۹۸) کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں۔
میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔
اور کبھی فُلَانٌ لَا يَسْتَطِيْعُ سے یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ عدم مزاولت کی وجہ سے یہ کام اس پر دشوار ہے یا تو اس لیے کہ جن اسباب وذرائع کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں ہیں اور یا اس لیے کہ اس کام کا تصور یعنی خاکہ اس کے ذہن میں نہیں ہے اس حالت میں انسان کو مکلف بنانا صحیح ہوتا ہے اور اسے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ آیات:
﴿لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾(۱۸۔۶۷) تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کرسکو گے۔"
﴿مَاكَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۰) کیونکہ یہ شدت کفر سے تمہاری بات نہیں سن سکتے اور نہ تم کو دیکھ سکتے تھے۔ اور
﴿وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا﴾(۱۸۔۱۰۱) اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔
میں استطاعت کی نفی سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت کریمہ:
﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا﴾(۴۔۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو ہرگز برابری نہیں کرسکو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے حالانکہ ان تمام آیات میں استطاعت کی نفی کے باوجود انہیں مکلف بنایا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا﴾(۵۔۱۱۲) کیا تمہارا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ ہم پر.........نازل کرے۔
کی تفسیر میں بعض نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے از راہ نادانی یہ بات کہی تھی کیونکہ اس وقت ان کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں استطاعة بمعنی قدرت نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کیا مائدہ کا اتارنا تقاضائے حکمت کے خلاف تو نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں يَسْتَطِيْعُ بمعنی يُطِيْعُ ہے یعنی کیا تمہارا پروردگار ہماری اس عرض کو قبول فرما سکتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:
﴿مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ﴾(۴۰۔۱۸) اور ظالموں کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ سفارشی، جس کی بات قبول کی جائے۔
میں يُطَاعُ بمعنی يُجَابُ ہے یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے۔ اور ایک قرأت میں هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ بھی ہے یعنی کیا تم اپنے پروردگار سے یہ بات منوا سکتے ہو۔ جیسا کہ محاورہ ہے:
هَلْ تَسْتَطِيْعُ الْاَمِيْرَ اَنْ يَّفْعَلَ كَذَا (کہ کیا تم امیر سے یہ بات منوا سکتے ہو) اور آیت کریمہ:
﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ﴾(۵۔۳۰) مگر اس کے نفس نے اسے ترغیب دی۔
میں طَوَّعَتْ کے معنی ہیں کہ نفسانی جذبات نے تسویل سے اسے اس پر آمادہ کرلیا اور وہ اس کام کے کرنے پر راضی ہوگیا اور طَوَّعَتْ کا صیغہ اَطَاعَتْ سے زیادہ بلیغ ہے اور طَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ کا محاورہ تَاَبَّتْ عَنْ كَذَا نَفْسُهٗ کا بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اسے یہ کام کرنا گوارا نہیں ہے اور تَطَوَّعَ كَذَا کے معنی ہیں اس نے رضامندی سے اس کام کے لیے تکلیف اٹھانا گوارا کرلیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾ (۲۔۱۸۵) اور جو کوئی نیک کام کرے تو خدا قدر شناس اور دانا ہے۔
﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۹۔۷۹)

جوذی استطاعت مسلمان دل کھول کر خیرات کرتے ہیں.........

ان پر جو منافق طعن کرتے .... ہیں۔

بعض نے کہا ہے طَاعَتْ وَتَطَوَّعَتْ کے ایک ہی معنی ہیں اور اِسْتَطَاعَ وَاسْطَاعَ بھی ہم معنی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا﴾ (۱۸۔۹۷) پھر ان کو یہ قدرت نہ رہی کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ یہ طاقت رہی کہ اس میں نقب لگا سکیں۔

(ط و ف)

اَلطَّوْفُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے گرد چکر لگانے اور گھومنے کے ہیں۔ اَلطَّائِفُ: چوکیدار جورات کو حفاظت کے لیے چکر لگائے اور پہرہ دے۔ طَافَ بِهٖ يَطُوْفُ کسی چیز کے گرد چکر لگانا، گھومنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۷) نوجوان خدمت گزار، جو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (۲۔۵۸) اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے۔

اور اسی سے بطور استعارہ جن، خیال، حادثہ، وغیرہ کو بھی طَائِفٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ﴾ (۷۔۲۰۱) جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔

میں طائف سے وہ شیطان مراد ہے جو انسان کا شکار کرنے کے لیے اس کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے ایک قرأت میں طَيْفٌ ہے جس کے معنی کسی چیز کا خیال اور اس صورت کے ہیں جو خواب یا بیداری میں نظر آتی ہے اسی سے خیال کو طَيْفٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ﴾ (۶۸۔۱۹) کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے (راتوں) رات اس پر ایک آفت پھر گئی۔

میں طَآئِفٌ سے وہ آفت یا حادثہ مراد ہے جو انہیں پہنچا تھا۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۵) طواف کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔

میں طَائِفِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو (حج یا عمرہ کرنے کے لیے) بیت اللہ کا قصد کرتے اور اس کا طواف کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالطَّوَّافُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۵۸) اور نہ ان پر جو کام کاج کے لیے تمہارے اردگرد پھرتے پھیراتے رہتے ہیں۔

میں طَوَّافُوْنَ سے نوکر چاکر مراد ہیں جنہیں خدمت گذاری کے لیے اندروں خانہ آنا جانا پڑتا ہے اسی بنا پر بلی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ [1] (۲۳) ((اِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِيْنَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ)) کہ یہ بھی ان میں داخل ہے جو تمہارے گرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں۔

اَلطَّائِفَةُ: (۱) لوگوں کی ایک جماعت۔ (۲) کسی چیز کا ایک ٹکڑا۔ اور آیت کریمہ:

[1] انظر لمخارج حدیث الهر الفتح الکبیر للنبهانی (۱/۴۴۸) والقرطبی (۱۲/۳۰۶) والغریب للقتبی (۳۰۷) والفائق (۲/۴۷) والترمذی والبیهقی وزوائد ابن حبان رقم: ۱۲۱ من حدیث ابی قتادة و صححه الائمه واعله ابن منده وعلیه تعقب للحافظ فی الفتح قال فی النیل (۱/۴۷) وفی الباب عن جابر عند ابن شاهین فی الناسخ والمنسوخ.

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ﴾(۹۔۱۲۲) تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین کا علم سیکھتے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَائِفَةٌ کا لفظ ایک فرد پر بھی بولا جاتا ہے۔❶ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾(۴۹۔۹) اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق..........اور آیت کریمہ:

﴿اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْکُمْ﴾(۳۔۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے چھوڑ دینا چاہا۔

طَائِفَةٌ سے ایک فرد بھی مراد ہو سکتا ہے مگر جب طَائِفَةٌ سے جماعت مراد لی جائے تو یہ طَائِفٌ کی جمع ہوگا اور جب اس سے واحد مراد ہو تو اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمع بول کر مفرد سے کنایہ کیا ہو اور یہ بھی کہ رَاوِیَةٌ وَعَلَامَةٌ کی طرح مفرد ہو اور اس میں تا برائے مبالغہ ہو اَلطُّوْفَانُ: وہ مصیبت یا حادثہ جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے اس بنا پر آیت کریمہ:

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمُ الطُّوْفَانَ﴾(۷۔۱۳۳) تو ہم ان پر طوفان وغیرہ کتنی کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں۔ میں طوفان بمعنی سیلاب بھی ہو سکتا ہے کیونکہ نوح علیہ السلام پر جو عذاب آیا تھا وہ پانی کی صورت میں ہی تھا اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَاَخَذَھُمُ الطُّوْفَانُ﴾(۲۹۔۱۴) پھر ان کو طوفان (کے عذاب) نے آ پکڑا۔

طَائِفُ الْقَوْسِ: خانہ کمان جو گوشہ اور ابہر کے درمیان ہوتا ہے۔ اَلطَّوْفُ (کنایہ) پلیدی۔❷

(ط و ق)

اَلطَّوْقُ: اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن کے گرد بنا ہوتا ہے جیسے کبوتری کی گردن میں یا مصنوعی ہو جیسے سونے چاندی کا حلقہ جو گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر بطور توسع کے قَلَّدْتُہٗ کی طرح طَوَّقْتُہٗ کَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں جو مال کے متعلق:

﴿سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ﴾ (۳۔۸۰) وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں (قیامت کے دن) اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔

فرمایا ہے تو یہ بطور تشبیہ کے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے❸ (۲۴) ((یَاْتِیْ اَحَدَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شُجَاعٌ اَقْرَعُ لَہٗ زَبِیْبَتَانِ فَیُتَطَوَّقُ بِہٖ فَیَقُوْلُ اَنَا الزَّکٰوةُ الَّتِیْ مَنَعْتَنِیْ)) کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی ایک کے پاس گنجا سانپ آئے گا۔ اور اس کے گلے میں طوق بن کر پڑ جائے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا خزانہ ہوں جس کی تم نے زکوۃ ادا نہیں کی تھی۔

اَلطَّاقَةُ: اس مقدرت اور قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جا سکے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال

---

❶ عن ابن عباس والحسن ومجاهد و ابراهيم و فى الطبرسى ۱۰۰۹/۵ وهو المروى عن ابى جعفر

❷ وفى الحديث: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن متحدثين على طوفهما وفى الآخر لا يصلين احدكم وهو يدافعه الطوف والبول انظر الفائق (۳۷/۲) والنهاية واللسان (طوف)

❸ اصله فى البخارى من حديث ابى هريرة ورحم ن ه ت۔ عن ابن مسعود و (ن ، ه)عن ابى هريرة و (حم ، ن ، عن ابن عمر) والبزار و ابى خزيمة والرؤيانى (ع، حب ، طب ، خل ، ك ، عن ثوبان راجع كنز العمال ج ۳ ، رقم: (۱۲۱۔۱۲۲: ۱۲۲۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷) الكشاف مع التخريج (۲۳۳/۱).

دیا ہو پس آیت ہے: ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (۲۔۲۸۶) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت نہ ہو بلکہ اس سے ایسے کام مراد ہیں جن کا کرنا ہمارے لیے دشوار ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ﴾ (۷۔۱۵۷) اوران پر سے بوجھ.........اتارتے ہیں۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (۹۴۔۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے ان دشوار عبادات کا بوجھ مراد ہے جن کا ترک، گناہ کا موجب تھا۔ اسی طرح آیت ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ﴾ (۲۔۲۴۹) تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ میں بھی طَاقَةٌ کی نفی سے یہی معنی مراد ہے اور کبھی طَاقَة کی نفی سے قدرت کا انکار مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (۲۔۱۸۴) اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ یہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس پر فدیہ لازم ہے خواہ روزہ رکھے یا نہ رکھے مگر اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ صرف دوسری شروط کے ساتھ فدیہ لازم ہوگا۔ ایک قرأت میں يُطَوَّقُوْنَهٗ ہے یعنی جن پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ بہ مشقت روزہ رکھیں۔

(ط و ل)

اَلطُّوْلُ: یہ اسمائے اضافیہ سے ہے اور اس کے معنی دراز اور لمبا ہونا کے ہیں۔ یہ اَلْقِصَر کے مقابلہ میں آتا ہے اور اعیان واعراض مثلاً زمانہ وغیرہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ﴾ (۵۷۔۱۶) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

﴿سَبْحاً طَوِيْلًا﴾ (۷۳۔۷) بہت لمبے شغل (ہوتے ہیں) طَوِيْلٌ وَطُوَالٌ: جیسے عَرِيْضٌ وَعُرَاضٌ: دراز لمبا اس کی جمع طِوَالٌ آتی ہے۔ اور بعض نے طِيَالٌ بھی کہا ہے اور لمبا ہونے کی مناسبت سے جانور کی پچھاڑی کی رسی کو طِوَلَ کہا جاتا ہے طَوِّلْ فَرَسَكَ: اپنے گھوڑے کی پچھاڑی باندھ دے۔ طِوَالُ الدَّهْرِ: عرصہ دراز۔

تَطَاوَلَ فُلَانٌ دارزی یا وسعت کو ظاہر کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۸۔۴۵) پھر ان پر لمبا عرصہ گزر گیا۔

اور طَوْلٌ کا لفظ خاص کر فضل واحسان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ﴾ (۴۰۔۳) سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿اِسْتَأْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ﴾ (۹۔۸۶) تو جوان میں دولت مند ہیں وہ تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں اُولُوا لطَّوْلِ سے خوش حال طبقہ مراد ہے اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا﴾ (۴۔۲۵) اور جو شخص تم میں سے.........مقدور نہ رکھے۔

میں طَوْلًا کنایہ ہے اس مال سے (جو عورت کو) مہر میں یا نان ونفقہ کے طور پر دینا پڑتا ہے۔

طَالُوتُ: یہ اسم عجمی ہے اور بنی اسرائیل کے ایک با اقبال بادشاہ کا نام تھا۔ (1)

(ط و ی)

طَوَیْتُ الشَّیْءَ طَیًّا: کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح لپیٹ لینا۔ جیسا کہ کپڑے کو اس کی درز پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ﴾ (۲۱۔۱۰۴) جس دن ہم آسمان کو اسی طرح لپیٹ لیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اسی سے طَوَیْتُ الْفَلَاۃَ (جنگل کو قطع کرنا) کا محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی مسافت کو قطع کیا گویا راستوں کو لپیٹ لیا طَوَی اللّٰہُ عُمُرَہٗ: اللہ تعالیٰ نے اسکی عمر ختم کر دی گویا اس کی مدتِ عمر کو لپیٹ دیا۔ شاعر نے کہا ہے (2) (الوافر)

(۲۹۵) طَوَتْکَ خُطُوْبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ

حوادثات زمانہ نے پھیلانے کے بعد تمہیں لپیٹ دیا (یعنی تمہاری عمر ختم کر دی) اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ﴾ (۳۹۔۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ میں مَطْوِیّٰتٌ کا لفظ یا تو طَوَیْتُ الشَّیْءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لپیٹ دینا کے ہیں اور یا طَوَی اللّٰہُ عُمُرَہٗ سے ماخوذ ہوگا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز آسمان کو فنا کر دیا جائے گا اور آیت:

﴿اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی﴾ (۲۰۔۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طوی میں ہو۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طُوًی اسی وادی المقدس کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ چکے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ طوی اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جس سے انہیں اجتباء کے طور پر نوازا گیا تھا اگر وہ اس مرتبہ کو مساعی اور اجتہاد کی راہ سے حاصل کر سکتے تھے وادی نبوت تک پہنچنے کی تمام مسافتیں ان کے لیے لپیٹ دی گئیں پھر اگر اسے اس وادی کا نام قرار دیا جائے تو اسے غیر منصرف بھی پڑھ سکتے ہیں اور منصرف بھی (3) اور اگر اسے طَوَیْتُ کا مصدر مانا جائے تو منصرف ہی پڑھا جائے گا اور ثَنًی و ثِنًی کی طرح فاکلمہ (ط) پر دونوں حرکتیں جائز ہوں گی اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا۔

(ط ی ب)

طَابَ (ض) الشَّیْءُ یَطِیْبُ طَیْبًا فَهُوَ طَیِّبٌ (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں)

---

(1) وقد مرفي (ط ل ت) وقيل ان اسمه بالعبرانية كان شاول بن قيس من اولاد بنيامين بن يعقوبؑ وَلُقِّبَ بطالوت لطوله وكان اطول من كل اَحَدٍ ۱۲۔

(2) قاله ابو العتاهيه (اسماعيل بن القاسم) يرثي على ابن ثابت و تمامه : كذاك خطوبه نشراً وطيا والبيت فى الكامل ۳۵۶ والبيان (۳ : ۱۳۰ / ۱ : ۲۱۶) والزجاجي ۵۹ والاغانى (۳ : ۱۴۲) والصناعتين ۱۱ والو حشيات (الحماسة الصغرى) ۱۳۲ فى ستة ابيات وذيل الامالى ۲ فى خمسة ونسبها الى امرءة والسمط ٤ قال الاستاذ الميمني : والابيات لابى العتاهية حقاً رواها ٤ الليثى و محمد بن يزيد والزجاجي والا صبهانى وابن عبدربه وآخرون يرثى بها على بن ثابت و كان صديقاً له و لهُ فيه ثلاث مراثٍ راجع ادب الدنيا للماوردى بشرح اويس و فا ارزنجانى المعروف بخان زاده ۲۱۶ والمعاهد (۲ / ۱۸۵).

(3) قال فى الفتوحات ليس يريد به طياً بعلاج و انتصاب و ان المراد بذالك الفناء والذهاب (۳ / ۷۴۹). واماصرفه فلانه اسم الواد مذكر واما غيره فللتانيث مع العلمية راجع مجاز القرآن (۲ : ۱۶). يمكن ان يكون معناه ان الوادى قدس مرتين (الكشاف ۳ / ۵۵).

قرآن میں ہے:

﴿فَانْكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ﴾ (۴۔۳) تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں..........ان سے نکاح کرلو۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ﴾ (۴۔۴) ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے..........تم کو چھوڑ دیں۔

اصل میں طَیِّبٌ اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے اَلطَّعَامُ الطَّیِّبُ اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو جائز طریق سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے مطابق لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوں گی اسی بنا پر قرآن پاک طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَارَزَقْنَاكُمْ﴾ (۲۔۱۷۲) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ۔

﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلاً طَيِّباً﴾ (۵۔۸۸) اور جو حلال، طیب روزی خدا نے تمہیں دی ہے اسے کھاؤ۔

﴿لَاتُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَآاَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵۔۸۷) جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔

﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً﴾ (۲۳۔۵۱) پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔ اور یہی معنی آیت:

﴿وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (۷۔۳۲) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ﴾ (۵۔۵) آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طیبات سے وہ جانور مراد ہیں جنہیں ذبح کر کے کھایا جاتا ہے اور آیت: ﴿وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ (۱۶۔۷۲) اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں۔

میں مال غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسانوں سے "طَیِّبٌ" اس انسان کو کہا جاتا ہے جو جہالت، فسق اور قبیح اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال کے زیور سے آراستہ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ﴾ (۱۶۔۳۲) جب فرشتے ان کی جانیں نکالتے ہیں اور یہ (کفر وشرک سے) پاک ہوتے ہیں۔

میں طَیِّبِیْنَ سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں نیز فرمایا: ﴿طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ﴾ (۳۹۔۷۳) تم بہت اچھے رہے اب اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ ﴿مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ (۳۔۳۸) اپنی جناب سے اولاد طیب۔

﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تاکہ خدا، ناپاک سے الگ کردے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ﴾ (۲۴۔۲۶) اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں۔ میں اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ پاکیزہ اعمال پاکیزہ انسانوں سے ہی سرزد ہوتے ہیں۔

چنانچہ مروی ہے ❶: (۲۵) اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهٖ۔ (کہ مومن اپنے عمل کی وجہ

---

❶ قال العلامة القرطبي وهو الصحيح وبذا لك ورد الحديث من عتبة بن عبد النظر روح المعاني (ص ۱۳۵ ج ۱۳).

سے اطیب اور کافر اپنے عمل کی وجہ سے خبیث (گندہ) ہوتا ہے)

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۴۔۲) کے معنی یہ ہیں کہ اچھے اعمال کو چھوڑ کر بداعمالیاں مت اختیار کرو اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ (۱۴۔۲۶) پاک عمل کی مثل شجرۃ طیبہ کی ہے۔

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵۔۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً﴾ (۹۔۷۲) کے معنی یہ ہیں...... مکانات صاف ستھرے اور فرحت بخش ہوں گے اور آیت کریمہ:

﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ﴾ (۳۴۔۱۵) (رہنے کو) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار، میں بعض نے کہا ہے کہ جنت اور رب العزۃ کے جوار کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ (۵۔۶) تو پاک مٹی لو۔ میں طیب سے پاک مٹی مراد ہے یعنی جس میں نجاست کی آمیزش نہ ہو اور اِسْتِنْجَاء کو بھی اِسْتِطَابَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے اور اَلْاَطْيَبَان سے کھانا و نکاح مراد ہے۔ طَعَامٌ مُطَيِّبَةٌ لِلنَّفْسِ: وہ کھانا جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور طَيِّبٌ کو طَابٌ بھی کہا جاتا ہے اور مدینہ طیبہ میں ایک قسم کھجور ہوتی ہے جسے طَابٌ کہا جاتا ہے [1] اور آیت کریمہ: ﴿طُوْبٰى لَهُمْ﴾ (۱۳۔۲۹) ان کے لیے خوشحالی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ طُوْبٰى جنت میں ایک درخت کا نام ہے [2] اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی خوش گواریاں مراد ہیں جو جنت میں حاصل ہوں گی مثلاً بقاء، عزت، غنا وغیرہ جن کے زوال کا اندیشہ نہیں ہوگا۔[3]

(ط ی ر)

اَلطَّائِرُ: ہر پردار جانور جو فضا میں حرکت کرتا ہے۔ طَارَ يَطِيْرُ طَيْرانًا: پرند کا اڑنا۔ اَلطَّيْرُ یہ طَائِرٌ کی جمع ہے۔ جیسے رَاكِبٌ کی جمع رَكْبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶۔۳۸) یا پرند جو اپنے پروں سے اڑتا ہے۔

﴿وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً﴾ (۳۸۔۱۹) اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع رہتے ہیں۔

﴿وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ﴾ (۲۴۔۴۱) اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔

﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے۔

﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ (۲۷۔۲۰) انھوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔

تَطَيَّرَ فُلَانٌ وَاطَّيَّرَ: اس کے اصل معنی تو کسی پرندہ سے شگون لینے کے ہیں پھر یہ ہر اس چیز کے متعلق استعمال

---

[1] رطب ابن طاب۔

[2] قال الزجاج وهذا مروی عن النبی صلى الله عليه وسلم وحمله سيبويه على الدعاء وقال هو فی موضع رفع من هو و معطوفه وحسن مآب.

[3] وبه قال ابو اسحاق ۱۲۔

ہونے لگا ہے جس سے براشگون لیا جائے اور اسے منحوس سمجھا جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ﴾ (۳۶۔۱۸) ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے ❶(۱۸) لَاطَيْرَ اِلَّا طَيْرُكَ کہ نہیں ہے نحوست مگر تیری طرف سے ہے۔قران میں ہے:

﴿اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا﴾ (۷۔۱۳۱) اگر سختی پہنچتی ہے تو............ بدشگونی لیتے ہیں۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام کو باعث نحوست سمجھتے ہیں (چنانچہ ان کے جواب میں فرمایا) ﴿اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ (۷۔۱۳۱) یعنی یہ ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے جو اللہ کے ہاں سے مل رہی ہے۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَاللّٰهِ﴾ (۲۷۔۴۷) وہ کہنے لگے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں کو ہم بدشگون خیال کرتے ہیں (صالح علیہ السلام نے) کہا کہ تمہاری بدشگونی خدا کی طرف سے ہے۔

﴿قَالُوا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ (۳۶۔۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔

اور آیت ہے : ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ (۱۷۔۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے (کیونکہ عمل کے سرزد ہو جانے کے بعد انسان کو یہ اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے گویا وہ) اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے تَطَايَرُوْا وہ نہایت تیزی سے گئے منتشر ہو گئے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۲۹۶) طَارُوْا اِلَيْهِ زَرَا فَاتٍ وَوُحْدَاناً

تو جماعتیں بن کر اور اکیلے اکیلے اس کی طرف اڑتے چلے جاتے ہیں۔

فَجْرٌ مُسْتَطِيْرٌ: منتشر ہونے والی صبح۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا﴾ (۷۶۔۷) اور اس دن سے جس کی سختی پھیل رہی ہوگی، خوف رکھتے ہیں۔

غُبَارٌ مُسْتَطَارٌ: بلند اور منتشر ہونے والا غبار۔ فجر کو فاعل تصور کر کے اس کے متعلق مُسْتَطِيْرٌ اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور غبار کو مفعول تصور کر کے مُسْتَطَارٌ کہتے ہیں۔

فَرَسٌ مُطَارٌ: ہوشیار اور تیز رو گھوڑا۔

خُذْمَاطَارَ مِنْ شَعْرِ رَأْسِكَ: یعنی اپنے سر کے پراگندہ اور لمبے بال کاٹ ڈالو۔❸

(ط ی ن)

اَلطِّيْنُ: پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، گو اس

---

❶ ایضاً فی التاج ومن قولهم وفی الاصل انه مرفوع من روایة عبدالله بن عمر فی حدیث الطیرة وبعده: ولا خیر الاخیرك (راجع عمل الیوم واللیلة لابن سنی ۲۹۲ وتحفة الذاکرین ۲۱۷۔۲۱۸ ومسنداحمد (۲/ ۲۲۰) وفی الطبرانی و مجمع الزوائد من حدیث عبدالله بن عمرو بن العاص وفیه ابن لهیعة ضعیف.

❷ قاله قریط بن انیف العنبری واوله: اذا الشرابدی ناجذ یه لهم.......... کذا فی التبریزی وفی التبیه لابن جنی وقد نروی لابی الغیل الطهوی والشطر من شواهد الکشاف والبیت فی اللسان والمحکم (وحده) والصناعتین ۲۸۵ ومجالس ثعلب ٤٠٥ والعیون(۱ : ۱۸۸)فی تسعة ابیات والسیوطی ۲۵ وهو من اوّل مقطوعة اختارها ابو تمام فی الحماسة (۲۲۔۳۱ مع المرزوقی)فی سبعة وفی روایة التبریزی ثمانیة ۱۲.

❸ قال فی التاج ومنه الحدیث خذما تطایر من شعرك وفی روایة من شعر راسك راجع ایضاً النهایة (طیر).

سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہوجائے اور طِنْتُ کذا وَ طَیَّنْتُہٗ کے معنی دیوار وغیرہ کو گارے سے لیپنے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿مِنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ﴾ (۳۷۔۱۱) چپکنے والی مٹی سے۔
﴿وَخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ (۷۔۱۲) اور اسے مٹی سے بنایا۔
﴿فَاَوْقِدْ لِیْ یَاھَامَانُ عَلَی الطِّیْنِ﴾ (۲۸۔ ۳۸) ہامان! میرے لیے گارے کو آگ لگوا کر (اینٹیں تیار کرواؤ)

❀❀❀

کِتَابُ الظَّاء

(ظ ع ن)

ظَعَنَ (ف) یَظْعَنُ ظَعْناً کے معنی کوچ کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَوْمَ ظَعْنِكُمْ﴾ (۱۶۔۸۰) سفر کے دن۔

اور ظَعِینَۃٌ اس ہودج کو کہتے ہیں جس میں عورت سوار ہو اور کبھی یہ لفظ کنایۃً عورت کے لیے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں ہو یا نہ ہو۔

(ظ ف ر)

الظُّفْرُ: (ناخن) یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کے ناخن پر بھی بولا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿كُلَّ ذِي ظُفُرٍ﴾ (۶۔۱۴۶) تمام ناخن دار جانور۔ میں ذِیْ ظُفُر سے ذِیْ مِخْلَبْ یعنی پنجہ دار شکاری جانور مراد ہیں اور پرند کا ناخن چونکہ اس کا اوزار ہوتا ہے اس مناسبت سے ظُفُرٌ کا لفظ سلاح یعنی ہتھیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَلِيلُ الظُّفُرِ: فلاں کند ہتھیار یعنی کمزور ہے۔ ظَفَرَهٗ فُلَانٌ فلاں نے اس میں اپنے ناخن گاڑ دیئے۔ اَلْاَظْفَرُ: لمبے ناخن والا۔

اَلظَّفَرَةُ (ناخن چشم) ایک قسم کی جھلی جو آنکھ کو ڈھانپ لیتی ہے اور ناخن کی طرح سخت ہوتی ہے۔

ظَفِرَتْ عَيْنُهٗ: اس کی آنکھ پر ناخنہ چھا گیا۔

اَلظَّفَرُ: کامیاب ہونا۔ یہ مفہوم دراصل ظَفَرَهٗ سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ناخن گاڑ دینے کے ہیں۔ اَظْفَرَ: کامیاب کر دینا قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ (۴۸۔۲۴) اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح یاب کر دیا۔

(ظ ل ل)

الظِّلُّ: سایہ۔ یہ اَلْضِّحُّ (دھوپ) کی ضد سے اور فَيْءٌ سے زیادہ عام ہے کیونکہ (مجازاً) اَلظِّلُّ کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے نیز ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلٌّ کہہ دیا جاتا ہے، مگر فَيْءٌ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہوتا اور عزت وحفاظت اور ہر قسم کی خوش حالی کو ظل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ﴾ (۷۷۔۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ پرہیز گار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔

نیز فرمایا:

﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا﴾ (۱۳۔۳۵) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور اس کی خوش گواریاں بھی۔

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ﴾ (۳۶۔۵۶) وہ بھی اور ان کی بیویاں بھی ہر قسم کی خوشحالیوں میں۔

ظَلَّنِيَ الشَّجَرُ وَ اَظَلَّنِيْ: درخت نے مجھ پر سایہ کیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ﴾ (۲۔۵۷) اور ہم نے

بادلوں کا تم پر سایہ کئے رکھا۔

﴿وَاَظَلَّنِیْ فُلَانٌ﴾ اس نے میری حفاظت کی، مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا، مجھے عزت سے رکھا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) جن کے سائے.......... لوٹتے رہتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ سائے کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَظِلٰلُهُمْ﴾ (۱۳۔۱۵)

اور..........خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی۔

کی تفسیر میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (انسان!) تیرا سایہ تو اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے مگر تو کفر پر تلا ہوا ہے ظِلٌّ ظَلِیْلٌ گھنا سایہ۔ مگر آیت کریمہ:

﴿وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا﴾ (۴۔۵۷) اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔ میں ظِلًّا ظَلِیْلًا سے کنایۃً زندگی کی آسائش مراد ہے اور ظُلَّةٌ سایہ فگن بدلی کو کہتے ہیں اور عام طور پر اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ (۷۔۱۷۱) گویا وہ سایہ دار بدلی ہے۔

﴿عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (۲۶۔۱۸۹) ”سائبان کی طرح چھا جانے والے دن کے عذاب نے“ اور آیت کریمہ ہے:

﴿اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ (۲۔۲۱۰) ان پر خدا کا عذاب سایہ دار بادلوں میں نازل ہو۔

میں ظُلَلٌ کا واحد ظُلَّةٌ آتا ہے جیسے غُرْفَةٌ وَغُرَفٌ وَقُرْبَةٌ وَقُرَبٌ اور ایک قرات میں فِیْ ظِلَالٍ مِّنَ الْغَمَامِ بھی ہے۔ اور ظِلَالٌ ظُلَّةٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے جیسے غُلْبَةٌ کی جمع غِلَابٌ وَ حُفْرَةٌ کی جمع حِفَارٌ آجاتی ہے اور ظِلٌّ کی بھی جیسا کہ آیت ہے: ﴿یَتَفَیَّؤُ ظِلَالُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) میں ہے بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ہر بلند ہونے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۲۹۷) لَنَا نَزَلْنَا رَفَعْنَا ظِلَّ اَخْبِیَةٍ

”جب ہم فروکش ہوئے تو خیمے نصب کر دیئے۔“

اور یہ ظاہر ہے کہ ظِلٌّ یعنی سایہ کو تو کوئی شخص بھی نصب نہیں کرتا لہٰذا یہاں ظِلَّ اَخْبِیَةٍ سے مراد خیمے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الطویل)

(۲۹۸) تَتَبَّعُ اَفْیَاءَ الظِّلَالِ عَشِیَّةً

کہ شام کے وقت سایوں کے پیچھے چلتی ہے۔

مگر ان اشعار سے یہ معنی ثابت نہیں ہوتے کیونکہ مصرعہ اول کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے خیمے نصب کئے جن کے ساتھ ان کے سائے بھی بلند ہو گئے اور دوسرے مصرعہ میں الظِّلَالُ عام ہے اور فَیْءٌ کا لفظ خاص۔ لہٰذا اَفْیَاءَ الظِّلَال میں اَلظِّلَالِ کی طرف اَفْیَاءَ کی اضافت ایسے ہی ہے جیسے

---

[1] قاله عبدة بن الطيب المحضرحى وتمامه : وفار للقوم باللحم المراجيل، ولا ميته هذه مفضلية والبيت فى (۱ : ۱۳۹) وفى رواية اللالئى مع السمط (۱ : ۶۹) ورد نا بدل نزلنا وارد ية بدل اخبية وراجع مترجمة الشاعر الاصابة وابن الانبارى ۶۸ والبيت ايضاً فى لبحر (۵ : ۴۹۸) والكامل ۴۹۰ لكن فيهما نصبنا بدل رفعنا والمحاضرات للمولف (۲ : ۶۱۲) والعقد: (۱ : ۱۹۲).

[2] قاله علقمة بن عبدة الفحل والبيت من كلمة مفضيلته (۲ : ۱۹۳) والضمير للناقة وفى المطبوع يتبع بالياء محرف وتمامه: على طرق كانهن سبوب۔ والبيت فى منتهى الطلب والشعراء ومختار الجاهلى (۱ : ۳۲۱) والعقد الثمين ۱۰۶ وايام العرب ۵۶ والشطر ايضاً فى البحر ۵ : ۴۹۸.

خاص کو عام کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے اور اسے اِضَافَةُ الشَّیءِ اِلٰی جِنْسِہٖ کہتے ہیں۔

نیز اَلظُّلَّةُ کا لفظ کینوپی کی مثل ہر چھا جانے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔اس بنا پر آیت کریمہ ہے: ﴿وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ﴾ (۳۱۔۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ جب بادلوں کی طرح سمندر کی بڑی بڑی موجیں انہیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں اور نیچے بھی۔

اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو ظِلٌّ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:

﴿وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ﴾ (۳۵۔۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔

﴿دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا﴾ (۷۶۔۱۴) ان سے......... ان کے سائے قریب ہوں گے۔

اور برے معنوں میں فرمایا: ﴿ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ﴾ (۵۶۔۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ﴾ (۷۷۔۳۰) یعنی تین شاخوں والے سائے کی طرف۔

میں ظِلٌّ۔ ظُلَّةٌ کے ہم معنی ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۹۔۱۶) سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ظُلَّةٌ کی جمع ہے لہٰذا اس کے بعد لَا ظَلِيْلٍ (۷۷۔۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ وہ سایہ دوزخ کی گرمی سے بچانے کا کام نہیں دے گا اور حدیث میں جو آیا ہے: كَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا مَشٰی لَمْ يَكُنْ لَهٗ ظِلٌّ کہ آنحضرت جب چلتے تو آپ کا سایہ نہ ہوتا تھا۔ تو اس کی تفسیر دوسرے موقع پر بیان ہوگی۔

ظَلِلْتُ وَظَلْتُ (ایک لام کے ساتھ) یہ اصل میں تو اس کام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے مگر کبھی بمعنی صِرْتُ "یعنی ہو جانا" بھی آ جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ﴾ (۳۰۔۵۱) تو اس کے بعد وہ ناشکری کرنے لگ جائیں۔

﴿ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۲۰۔۹۷) جس کی عبادت پر جما ہوا تھا۔

(ظ ل م)

اَلظُّلْمَةُ: کے معنی روشنی کا معدوم ہونا ہیں اس کی جمع ظُلُمَاتٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ﴾ (۲۴۔۴۰) یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے۔

﴿ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۲۴۔۴۰) (غرض) اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک چھایا ہوا۔

﴿اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِیْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۲۷۔۶۳) بتاؤ بر و بحر کی تاریکیوں میں تمہاری کون رہنمائی کرتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ﴾ (۶۔۱) اور تاریکیوں اور روشنی بنائی۔

اور کبھی ظُلْمَةٌ کا لفظ بول کر جہالت، شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نُوْرٌ کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ (۲۔۲۵۷) ان کوتاریکیوں سے نکال کرروشنی میں لے جاتا ہے۔
﴿اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ (۱۴۔۵) کہ اپنی قوم کوتاریکیوں سے نکال کرروشنی میں لے جاؤ۔
﴿فَنَادٰی فِی الظُّلُمَاتِ﴾ (۲۱۔۸۷) آخر تاریکیوں میں خدا کو پکارنے لگے۔اورآیت کریمہ:
﴿کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمَاتِ﴾ (۶۔۱۲۲) کہیں اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جواندھیرے میں ہو۔
﴿کَمَنْ هُوَ اَعْمٰی﴾ (۱۳۔۱۹) کے ہم معنی ہے اور آیت سورۃ انعام:
﴿وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکْمٌ فِی الظُّلُمَاتِ﴾ (۶۔۳۹) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے رہتے ہیں، میں فِی الظُّلُمَاتِ کالفظ آیت صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ (۲۔۱۸) میں عُمْیٌ کی جگہ پراستعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ ہے:
﴿فِیْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (۳۹۔۶) تین اندھیروں میں۔
تین تاریکیوں سے مراد پیٹ، رحم، اور بچہ دانی کی تاریکی مراد ہے۔
اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریکی میں ہوجانا قران پاک میں ہے:
﴿فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ﴾ (۳۶۔۳۷) پھر اچانک وہ تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔
اَلظُّلْمُ: اہل لغت اوراکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کواس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی یازیادتی کرکے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔اسی سے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ کامحاورہ ہے جس کے معنی ہیں: مشکیزے میں دودھ جمنے کے لیے رکھا اوردہی بننے سے پہلے ہی پی لیا۔ ❶ اور ایسے دودھ کو............ظَلِیْمٌ کہتے ہیں۔
ظَلَمْتُ الْاَرْضَ: میں نے زمین کوایسے مقام سے کھودا جہاں سے کھودنا نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کی زمین کو "مَظْلُوْمَةٌ" کہا جاتا ہے اوراس سے کھود کر جومٹی نکالی جاتی ہے اس مٹی کو ظَلِیْمٌ کہتے ہیں۔
اور اَلظُّلْم کا لفظ حق سے تجاوز پر بولا جاتا ہے جس کی مثال دائرہ میں مرکزی نقطہ کی ہوتی ہے اور ظلم کا اطلاق چونکہ ہر قسم کے تجاوز پر ہوتا ہے خواہ وہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ابلیس کوظالم کہا ہے اوردوسری طرف آدم علیہ السلام کوان کی غلطی کی بنا پر ظلم کہہ دیا گیا ہے گو دونوں کے ظالم ہونے میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔
بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے ❷ (۱) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں کرتا ہے۔اس کی سب سے بڑی قسم کفروشرک اورنفاق ہے۔چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔
اورآیات:﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ﴾ (۱۱۔۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔
﴿وَالظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا﴾ (۷۶۔۳۱) اور ظالموں کے لیے اس نے دکھ دینے والا عذاب تیار کررکھا ہے۔
﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۳۲) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جوخدا پر جھوٹ بولے۔

---

❶ کذا فی حبل المعاجم ۱۲.
❷ التقسیم ایضاً مروی عن انسؓ (الطیالسی ۱۷ لبزار) راجع کنز العمال ج (۳، رقم: ۲۴۶۱).

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۱۵) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افتراء کرے۔ اور اس نوع کی دیگر آیات میں اسی قسم کا ظلم مراد ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں ظالمین سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔نیز آیت کریمہ: ﴿اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ﴾ (۴۲۔۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔

میں بھی ظلم کے یہی معنی مراد ہیں اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا﴾ (۱۷۔۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے۔

(۳) تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان خود اپنے نفس پر کرتا ہے۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ﴾ (۳۵۔۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

﴿ظَلَمْتُ نَفْسِيْ﴾ (۲۸۔۱۶) میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

﴿اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۶۴) جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھتے تھے۔

﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۷۔۱۹) ورنہ ظالم ہوجاؤ گے۔ یعنی ان لوگوں سے ہوجاؤ گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ (۲۔۲۳۱) اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔

یہ تینوں قسم کا ظلم درحقیقت ظلم علی النفس ہی ہے کیونکہ جب انسان پہلے پہل ظلم کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم کی ابتداء ہمیشہ اپنی ذات سے کرتا ہے اس بنا پر متعدد مقامات پر فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (۱۶۔۵۷) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اور آیت:

﴿وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (۶۔۸۳) اور اپنے ایمان کو (شرک کے ظلم) سے محفوظ نہیں کیا۔کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ظُلْمٌ سے شرک مراد ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:(۲۶) کہ ظلم سے مراد تو شرک ہے جیسا کہ حضرت لقمان علیہ السلام کے قول:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے، سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا﴾ (۱۸۔۳۳) اور اس کی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی۔

لَمْ تَظْلِمْ کے معنی لَمْ تَنْقُصْ کے ہیں یعنی اس کی پیداوار میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی تھی اور آیت:

[1] متفق علیه من حدیث ابن مسعود ۱۲.

﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً﴾ (۳۹۔۴۷) اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب مال ومتاع ہو جو زمین میں ہے۔

میں ظلم کا لفظ تینوں قسم کے ظلم کو شامل ہے کیونکہ جس شخص نے دنیا میں ادنیٰ سا ظلم بھی کیا ہوگا وہ قیامت کے دن دنیا کا سب مال ومتاع فدیہ دے کر رہا ہونے کی کوشش کرے گا۔اور آیت کریمہ ہے:

﴿هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی﴾ (۵۳۔۵۲) وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ ظلم وستم کا انجام برا ہوتا ہے اور ایسے لوگ آخرکار ہلاک ہوجاتے ہیں۔چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اس امر کا شاہد ہے اور قرآن پاک نے ایک موقع پر تو۔﴿وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْماً لِّلْعِبَادِ﴾ (۴۰۔۳۱) اور خدا بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، کہا ہے۔اور دوسرے مقام پر ﴿وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (۵۰۔۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے، فرمایا ہے پس پہلی آیت میں عباد یعنی بندوں سے ارادہ ظلم کی نفی کرنا مقصود ہے اور دوسری آیت میں بندوں پر سے لفظ ظَلَّامٌ (صیغہ مبالغہ) کے ساتھ نفی کی ہے۔ان دونوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے اس کی وضاحت ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔ [1]

ظَلِیْمٌ نر شترمرغ۔کیونکہ عرب لوگ اسے مظلوم جانور خیال کرتے تھے۔

چنانچہ شاعر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے [2] (السریع)

(۲۹۹) فَصِرْتُ کَالْهَیْقِ غَدًا یَبْتَغِیْ
قَرْناً فَلَمْ یَرْجِعْ بِاُذُنَیْنِ

میں شترمرغ کی طرف خائب وخاسر ہوکر لوٹا جو گیا تھا سینگ لینے مگر کھو بیٹھا کان بھی۔

ظَلْمٌ کے معنی دانتوں کی آب وتاب کے ہیں۔خلیل نے کہا ہے [3] لَقِیْتُهٗ اَدْنٰی ظَلَمٍ اَوْ ذِیْ ظَلَمَةٍ: یعنی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی اور میری نظر کو اس نے روکا، وہ فلاں شخص ہے، مگر اس معنی سے فعل مشتق ہوکر استعمال نہیں ہوتا۔

(ظ م ء)

اَلظِّمْءُ دومرتبہ پانی پینے کے درمیان وقفہ اَلظَّمَأُ پیاس جو اس وقفہ میں عارض ہو دراصل یہ ظَمِیءَ یَظْمَأُ فَهُوَ ظَمْآنٌ کا مصدر ہے۔

قرآن پاک میں ہے:﴿وَاَنَّكَ لَاتَظْمَأُ فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی﴾ (۲۰۔۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ۔

﴿یَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئاً﴾ (۲۴۔۳۹) کہ پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

---

[1] راجع لتاویل الآیۃ شرح الدرۃ للخفاجی (۱۳۲۔۱۳۳).

[2] قالہ بشار بن برد الاعمیٰ فی قصیدۃ مطلعھا: شط بسلمیٰ عاجل البین وجاوزت اسد بن القین، وقبلہ: طالبھا قلبی فراغت بہ وامسکت قلبی مع الدین، وفی روایۃ کالھقل بدل الھیق وفکنت بدل فصرت والبیت فی ذیل الامالی ۱۰۷ فی خمسۃ وفی روایتہ فکنت کالھقل۔ والمحاضرات للمؤلف (٤: ۲،٦٧١: ۲: ٦٠۲)والعیون (۳: ۱٤۱)والسمط (۳: ٥) قال الاستاذ المیمنی وفی ب ٥ کالعیر غدا کذا فی العیون وھو المضروب فیہ المثل راجع العیون (۱٤۱/۳) والمیدانی والابیات مع الخبر فی الاغانی (۳: ۲۰٥۔۲۰٦).

[3] راجع للکلمۃ مجالس ثعلب ۸۰ ومعناہ وضح لك ۱۲.

(ظ ن ن)

اَلظَّنُّ: کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اسے ظَنٌّ کہتے ہیں جب یہ علامت قوی ہوتو ان سے علم کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے مگر جب بہت کمزور ہوں تو وہ نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ جب وہ نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کرلے یا اسے علم کے درجہ میں فرض کرلیا جائے تو اس کے بعد اَنْ یا اَنَّ استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اس کے ساتھ (صرف) اَنْ استعمال ہوتا ہے جو کسی قول یا فعل کے عدم کے ساتھ مختص ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ﴾ (۲۔۴۶) جو یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں۔

﴿یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ﴾ (۲۔۲۴۹) جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے۔

﴿وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ﴾ (۷۵۔۲۸) اور اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے۔

میں ظَنٌّ کا لفظ علم ویقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ﴾ (۸۳۔۴) میں ان کی انتہائی مذمت کی ہے اور معنی یہ ہیں کہ موت کے بعد زندہ ہونے کے دلائل نہایت واضح ہیں مگر یہ اس زندگی کا گمان تک نہیں کرتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنَّ اَھْلُھَا اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْھَا﴾ (۱۰۔۲۴) اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔

میں اشارہ ہے کہ زیادہ لالچ اور طمع میں آکر وہ اس امر کا یقین کر بیٹھے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ﴾ (۳۸۔۲۴) میں ظن بمعنی علم ہے اور فتنہ کے یہاں وہی معنی ہیں جو کہ آیت:

﴿وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا﴾ (۲۰۔۴۰) میں ہیں اور آیت: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ﴾ (۲۱۔۸۷) اور ذوالنون (کو یاد کرو) جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہوکر) غصے کی حالت میں چل دیئے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے، میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ظَنَّ بمعنی وہم لینا بہتر ہے یعنی ان کے دل میں یہ وہم گذرا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے اور آیت کریمہ:

﴿وَاسْتَکْبَرَ ھُوَ وَجُنُوْدُہٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ﴾ (۲۸۔۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

میں ظَنَّ کے بعد اَنَّ لایا گیا ہے جو کہ ظَنَّ بمعنی علم کے بعد استعمال ہوتا ہے پس اس سے متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی جگہ پر یقین کرلیا تھا گو یہ یقین بے اصل تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَیَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ﴾ (۳۔۱۵۴) وہ خدا کے بارے میں ناحق زمانہ جاہلیت کے سے گمان کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ

کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کررہے ہیں۔ یعنی وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے ان کے سامنے غلط بیانی کی ہے، اس سے تنبیہ کی ہے کہ منافقین کی یہ بدگمانیاں کفار کی سی ہیں اور وہ اس قسم کی افواہیں پھیلا کر کفار کا کردار ادا کررہے ہیں ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ﴾ (۵۹۔۲) اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے قلعے ان کو......... بچالیں گے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خیال اس قدر پختہ تھا جیسا کہ کسی شخص کو پورا یقین ہوتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۴۱۔۲۲) بلکہ تم یہ خیال کرتے تھے کہ خدا کو تمہارے بہت سے عملوں کی خبر ہی نہیں۔

﴿ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ﴾ (۴۱۔۲۳) اور اسی خیال نے جو تم......... رکھتے تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ (۴۸۔۶) جو خدا کے حق میں برے برے خیال رکھتے ہیں۔ میں ظَنَّ السَّوْءِ کی تفسیر بعد کی آیت:

﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ﴾ (۴۸۔۱۲) بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر......... کبھی لوٹ کر آنے والے ہی نہیں۔ میں بیان کردی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا﴾ (۴۵۔۳۲) ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔

اور ظَنّ چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لیے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا﴾ (۱۰۔۳۶) اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ﴾ (۵۳۔۲۸) اور ظن (یقین کے مقابلے میں) کچھ کام نہیں آتا۔

﴿وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ﴾ (۷۲۔۷) اور یہ کہ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا جس طرح تمہارا۔ اور ایک قراءت میں۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِظَنِيْنٍ﴾ (۸۱۔۲۴) اور وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔

ضَاد کی بجائے ظَاءِ کے ساتھ ہے جس کے معنی متہم کے ہیں۔

(ظ ھ ر)

اَلظَّهْرُ: کے معنی پیٹھ اور پشت کے ہیں اس کی جمع ظُهُوْرٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ﴾ (۸۴۔۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔

﴿مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (۷۔۱۷۲) یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ (۹۴۔۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں گناہوں کو بوجھ کے ساتھ تشبیہ دے کر ظهر کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے (کیونکہ بوجھ عام طور پر پیٹھ پر اٹھایا جاتا ہے) اور کبھی ظهر کا لفظ بطور استعارہ روئے زمین کے معنی میں بھی آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ظَهْرُ الْاَرْضِ زمین کا اوپر کا حصہ اس کے بالمقابل بَطْنُ

الْاَرْضِ: کے معنی ہیں: زمین کا اندرونی حصہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۳۵۔۴۵) روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

رَجُلٌ مُظَهَّرٌ: قوی پشت، مضبوط آدمی۔ ظَهِرَ پیٹھ کا درد کرنا اور ظَهْرٌ سواری کو کہتے ہیں۔ نیز ظَهْرٌ: مددگار، پشت پناہ۔ بَعِيْرٌ ظَهِيْرٌ: قوی اونٹ ظِهْرِيٌّ: وہ فالتو سواری۔ جسے احتیاطا ساتھ رکھ لیا جائے تا کہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جاسکے۔

نیز ظِهْرِيٌّ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے پس پشت ڈال کر بھولی بسری کر دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَآئَكُمْ ظِهْرِيًّا﴾ (۱۱۔۹۲) پیٹھ پیچھے.........

ظَهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: وہ اس پر غالب آ گیا۔ قران پاک میں ہے:

﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں۔

ظَاهَرْتُهٗ: میں نے اس کی مدد کی (اور ظَاهَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَظَاهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ﴾ (۶۰۔۹) اورانہوں نے تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔

﴿وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ﴾ (۶۶۔۴) اور اگر پیغمبر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کروگی۔ ایک قرأت میں تَظَّاهَرَا ہے (یعنی تاء کو ظاء میں ادغام کے ساتھ)

﴿اَلَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ﴾ (۳۳۔۲۶) (اور اہل کتاب میں سے) جنہوں نے ان کی مدد کی۔

﴿وَتَظَاهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۲۔۸۵) تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔

اَلظَّهِيْرُ: مددگار۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ﴾ (۳۴۔۲۲) اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۸۔۸۶) تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾ (۶۶۔۴) اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا﴾ (۲۵۔۵۵) اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بڑا زور مارتا ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ کافر خدائے رحمٰن کی مخالفت میں شیطان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں ظَهِيْرٌ کے معنی ہیں پس پشت ڈالا ہوا۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر کی مثال اس چیز کی سی ہے جسے بے وقعت سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ ظَهَرْتُ بِكَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور درخواعتناء نہ سمجھا۔

اَلظِّهَارُ: کے معنی ہیں خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ کہا جاتا ہے: ظَاهَرَ مِنِ امْرَأَتِهٖ: اس نے اپنی بیوی سے ظہار کرلیا۔ قرآن

---

(1) نسب الطبری (۲۸/۷) القراءة الاولیٰ الی عامة قراء المدینة سوانافع والی عامة قراء الکوفة سوا عاصم والثانیة الی نافع وابو عمرو ۱۲۔

پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗئِهِمْ﴾ (۵۸۔۳) اور جولوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرلیں۔

ایک قرأت میں یَظَّاهَرُوْنَ ہے جواصل میں یَتَظَاهَرُوْنَ ہےاور تاء ظاء میں مدغم ہےاورایک قرأت میں یَظَّهَّرُوْنَ ہے۔❶

ظَهَرَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا زمین کےاوپر اس طرح ظاہر ہونا کہ نمایاں طور پر نظر آئے اس کے بالمقابل بَطَنَ کے معنی ہیں: کسی چیز کا زمین کے اندر غائب ہوجانا پھر ہر وہ چیز جواس طرح پر نمایاں ہو کہ آنکھ یا بصیرت سے اس کا ادراک ہوسکتا ہو،اسے ظَاهِرٌ کہہ دیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ﴾(۴۰۔۲۶)

(۶۔۱۵) ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

﴿اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا﴾ (۱۸۔۲۲) مگر سرسری سی گفتگو۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۳۰۔۷) یہ دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں۔معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ صرف دنیوی امور سے واقفیت رکھتے ہیں اخروی امور سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اَلْعِلْمُ الظَّاهِرُ اور اَلْبَاطِنُ سے کبھی جلی اور خفی علوم مراد ہوتے ہیں اور کبھی دنیوی اور اخروی۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ (۵۷۔۱۳) جواس کی جانب اندرونی ہے اس میں تو رحمت ہے اور جو جانب بیرونی ہے اس طرف عذاب۔

اور آیت کریمہ:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۳۰۔۱۴) خشکی اورتری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔

میں ظَهَرَ کے معنی ہیں: زیادہ ہوگیا اور پھیل گیا اور آیت ہے:

﴿وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾ (۳۱۔۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں۔

میں ظَاهِرَةً سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکتی ہیں۔اور بَاطِنَةً سے وہ جو ہمارے علم سے بالاتر ہیں چنانچہ اسی معنی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۱۴۔۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کرسکو۔

اور آیت کریمہ:

﴿قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (۳۴۔۱۸) کے عام معنی تو یہی ہیں کہ وہ بستیاں سامنے نظر آتی تھیں مگر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور مثال کے انسانی احوال کی طرف اشارہ ہو جس کی تصریح اس کتاب کے بعد (دوسری کتاب میں) بیان کریں گے۔انشاءاللہ

اَظْهَرَهٗ عَلَیْهِ❶ اسے اس پر مطلع کردیا۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا﴾ (۷۲۔۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے غائب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا

اور آیت کریمہ:

﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (۹۔۳۳) میں یُظْهِرُ

---

❶ وایضاً ظهر علیه اطلع علیه کما فی قوله تعالیٰ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴ : ۳۱).

کے معنی نمایاں کرنا بھی ہو سکتے ہیں اور معاونت اور غلبہ کے بھی یعنی تمام ادیان پر اسے غالب کرے۔ چنانچہ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿اِنْ یَّظْهَرُوْا عَلَیْکُمْ یَرْجُمُوْکُمْ﴾ (۱۸۔۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

﴿یٰقَوْمِ لَکُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظَاهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۴۰۔۲۹) اے قوم! آج تمہاری ہی بادشاہت ہے اور تم ہی ملک میں غالب ہو۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ﴾ (۱۸۔۹۷) پھر ان میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس کے اوپر چڑھ سکیں۔

صَلَاةُ الظُّهْرِ: ظہر کی نماز۔ ظَهِیْرَةٌ: ظہر کا وقت۔ اَظْهَرَ فُلَانٌ فلاں ظہر کے وقت میں داخل ہو گیا۔ جیسا کہ اَصْبَحَ وَ اَمْسٰی: صبح و شام میں داخل ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ (۳۰۔۱۸) اور آسمان وزمین میں اسی کے لیے تعریف ہے اور سہ پہر کے وقت بھی اور جب تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔

❀❀❀

كِتَابُ الْعَين

(ع ب أ)

مَاعَبَأْتُ بِہٖ: مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔اصل میں اَلْعِبْءُ کے معنی ثقل اور بوجھ کے ہیں۔لہٰذا مَاعَبَأْتُ بِہٖ کے معنی ہوں گے میرے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں یا میری نگاہ میں اس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ مَايَعْبَؤُبِكُمْ رَبِّیْ﴾ (۲۵۔۷۷) کہہ دو کہ میرے پروردگار کی نگاہوں میں تمہاری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں۔

بعض کے نزدیک آیت کریمہ میں یَعْبَؤُا کا لفظ عَبَأْتُ الطِّیْبَ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''میں نے خوشبو کو باقی رکھا'' پس آیت کے معنی یہ ہیں'' اگر تم اللہ کو پکارتے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں باقی نہ چھوڑتا۔''

عَبَأْتُ الْجَیْشَ وَعَبَّأْتُہٗ میں نے لشکر کو تیار کیا عَبَاءَۃُ الْجَاھِلِیَّۃِ: زمانہ جاہلیت کی نحوست جوان کے دلوں میں رچ چکی تھی اور جسے قرآن پاک نے آیت: ﴿فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ﴾ (۴۸۔۲۶) ان کے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت ہے، میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت سے تعبیر کیا ہے۔

(ع ب ث)

اَلْعَبْثُ: دراصل اس کے معنی ہیں، کسی کام کے ساتھ کھیل کود کو ملا دینا اور یہ عَبَثْتُ الْاَقِطَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پنیر کے ساتھ اور چیز کو ملا دیا اور اَلْعَبْثُ وہ کھانا جو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط کیا گیا ہو۔اسی اعتبار سے کھجور، گھی اور ستو کے آمیزہ کو عَوْبَثَانِیٌّ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۲۸) تم ہر بلند مقام پر بے مقصد بڑی عمارتیں تعمیر کرتے ہو۔ نیز اَلْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ (۲۳۔۱۵) کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے۔

(ع ب د)

اَلْعُبُوْدِیَّۃُ: کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا۔مگر اَلْعِبَادَۃُ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے اَلْعِبَادَۃُ کا لفظ اَلْعُبُوْدِیَّۃُ سے زیادہ بلیغ ہے لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحب افضال وانعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الٰہی ہی ہے۔اسی لیے فرمایا:

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ (۱۷۔۲۳) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عِبَادَۃٌ: دو قسم پر ہے (۱) عبادت بِالتَّسْخِیْرِ۔ جسے ہم سجود کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔(۲) عبادت بالاختیار۔ اس

کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱) اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ (۴۔۳۶) اور خدا ہی کی عبادت کرو۔

میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے [1] اَلْعَبْدُ (بندہ، غلام) کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔(۱) اَلْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کو خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ (۲۔۱۷۸) اور غلام کے بدلے غلام۔

﴿وَعَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ (۱۶۔۷۵) ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔

میں عَبْدٌ کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) اَلْعَبْدُ بِالْاِيْجَادِ: یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیۃ اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (۱۹۔۹۳) تمام شخص جو آسمان اور زمین میں ہیں خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) عَبْدٌ وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے [2] اس لحاظ سے جن پر عَبْدٌ کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ﴾ (۳۸۔۴۰) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا﴾ (۱۷۔۳) بے شک نوح علیہ السلام ہمارے شکر گزار بندے تھے۔

﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ﴾ (۲۵۔۱) جس نے اپنے بندے پر قرآن پاک نازل فرمایا:

﴿عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ (۱۸۔۱) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ کتاب نازل کی۔

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (۱۷۔۶۵) جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

﴿كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ﴾ (۳۔۷۹) کہ...... میرے بندے ہو جاؤ۔

﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۱۵۔۴۰) ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

﴿وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (۱۹۔۶۱) جس کا خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

﴿اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا﴾ (۲۰۔۷۷) ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

---

[1] انظر لتفصیلہ لباب التاؤیل (ص۱۹، ج۱) و تاج العروس للزبیدی والمهمائمی (ص۲۴ ج۱) وتفسیر ام الکتاب مولانا ابو الکلام آزاد (ص ۳۵۸۔۲۶۸).

[2] ای قدیاتی عَبَدَ بمعنی خدم کما جاء فی تفسیر قولہ تعالیٰ، ﴿وقومهما لنا عابدون﴾ ان العابدون هٰهنا بمعنی الخادم (الروح ۳۳/۱۸) و ایضاً عَبَدَ بمعنی انف کما فی قولہ تعالیٰ ﴿فانا اوّل العابدین﴾ (۴۳۔۸۱) معناہ مستنکفین (راجع الصحیح ۲/۷۱۳).

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا﴾ (۱۸۔۶۵) (وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔

(۲) دوسرے اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ❶: (۲۷) ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ ۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ)) درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو) عَبْدٌ کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لَيْسَ كُلُّ اِنْسَان عَبْدَاللّٰهِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے۔ یعنی بندۂ مخلص نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں عَبْدٌ کے معنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عَبْدٌ عَابِدٌ سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِبَادُ اللّٰهِ کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہ حکم ہے۔ بعض عبد بالتسخیر ہیں اور بعض عبد بالاختیار اور جب عَبْدٌ کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عَبِيْدٌ یا عِبِدٌّ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اس کی جمع عِبَادٌ آئے گی لہٰذا جب عَبِيدٌ کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عِبَادٌ سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ آیت:

﴿وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (۵۰۔۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔ میں عَبِيْدٌ سے ظلم کی نفی کر کے تنبیہ کی ہے کہ وہ کسی بندے پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ عبد الشمس یا عبد اللات ہونے کا مدعی ہو۔

طَرِيْقٌ مُّعَبَّدٌ: ہموار راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بَعِيْرٌ مُعَبَّدٌ: جس پر تارکول مل کر اسے خوب بدصورت کر دیا گیا ہو۔ عَبَّدْتَ فُلَانًا: میں نے اسے مطیع کر لیا محکوم بنالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ﴾ (۲۶۔۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

(ع ب ر)

اَلْعَبْرُ: دراصل اس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا مگر اَلْعُبُوْرُ کا لفظ خاص کر پانی عبور کرنے پر استعمال ہوتا ہے عام اس سے کہ تیر کر عبور کیا جائے یا کشتی، اونٹ اور پل کے ذریعہ سے۔ اسی سے عَبْرُ النَّهْرِ ہے جس کے معنی نہر کے اس کنارہ کے ہیں جہاں سے پانی میں اتر کر اسے عبور کیا جاتا ہے یا دوسری جانب سے عبور کر کے وہاں سے ہوا جاتا ہے۔ اسی سے عَبْرُ الْعَيْنِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی ہیں: آنکھ سے آنسو جاری ہونا۔ اَلْعَبْرَةُ: آنسو اور مسافر کو عَابِرُ سَبِيلٍ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ﴾ (۴۔۴۳) ہاں اگر بحالت سفر رستے چلے جا رہے ہوں۔

نَاقَةٌ عَبْرُ اَسْفَارٍ: مضبوط اونٹنی جو ہر قسم کی زمین میں سفر کر سکے عَبَرَ الْقَوْمُ: لوگ مر گئے۔ گویا انہوں نے دنیاوی زندگی کے پل کو عبور کر لیا اس اعتبار سے عِبَارَةٌ خاص کر اس کلام کو کہتے ہیں جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان تک پہنچ جائے اور اَلْعَبْرَةُ

❶ الحديث في الفائق (۱/۷۱) وفي البخاري وابن ماجه عن ابي هريرة وفي رواية الترمذي لُعِنَ بدل تعس راجع كنز العمال (۳/رقم ۱۰۰۲ و ۱۰۴۳) وتخريج الاحياء للعراقي (۳/۴۴ و ۳۳۵).

وَالْاِعْتِبَارُ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دیکھی ہوئی چیز کی وساطت سے ان دیکھے نتائج تک پہنچا جائے۔ ❶

قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً﴾ (۳۔۱۳) اس واقعہ میں بڑی عزت ہے۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ (۵۹۔۲) اے اصحاب بصیرت اس سے عبرت حاصل کرو۔

اور تَعْبِیْرٌ کے معنی ہیں: خواب کا انجام بتانا گویا تاویل بتانے والا اس کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ کُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۳) اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو۔

اور تَعْبِیْرٌ کا لفظ تاویل سے خاص ہے کیونکہ تَاْوِیْلٌ کے معنی مطلق کسی بات کا انجام بیان کرنے کے ہیں خواہ وہ خواب ہو یا خواب نہ ہو۔ ❷

اور اَلشِّعْرَی الْعَبُوْرُ: ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ وہ بھی اپنے فلک میں مسافت طے کرتا رہتا ہے اَلْعَبَرِیُّ: گھاس جو نہر کے کنارے پر اُگ آتی ہے۔ اور شَطٌّ مَعْبَرٌ: نہر کا وہ کنارہ جہاں پر عبری گھاس اُگی ہوئی ہو۔

(ع ب س)

اَلْعَبُوْسُ: (ض) کے معنی سینہ کی تنگی سے چہرہ پر شکن پڑنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی﴾ (۸۰۔۱) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے۔

﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ﴾ (۷۴۔۲۲) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔

اور اسی سے یَوْمٌ عَبُوْسٌ ہے۔ جسکے معنی سخت اور بھیانک دن کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا﴾ (۷۶۔۱۰) اس دن سے جو (چہروں کو) شکن آلود اور (دلوں کو) سخت مضطر کر دینے والا ہے۔

اور اسی اعتبار سے اَلْعَبَسُ اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے بالوں کے ساتھ لگ کر خشک ہو جاتا ہے عَبَسَ الْوَسَخُ عَلٰی وَجْھِہٖ: اس کے چہرہ پر میل کچیل جم گئی۔

(ع ب ق ر)

عَبْقَرٌ: بعض نے کہا ہے، جنوں کی آبادی کا نام ہے۔ عرب لوگ جب کسی انسان، حیوان یا کپڑے وغیرہ میں نادرہ کاری دیکھتے تو اسے اس کی طرف نسبت کر دیتے اسی بنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ❸ (۲۷)

((لَمْ اَرَ عَبْقَرِیًّا مِثْلَہٗ)) کہ میں نے اس جیسا نادر الشال شخص نہیں دیکھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ﴾ (۵۵۔۷۶) اور نفیس مسندوں پر۔

---

❶ قال الخلیل اَلْعِبْرَۃُ وَالْاِعْتِبَارُ معناہ التذکر منْ الحوادث السالفۃ ۱۲.

❷ قال الشاعر وقد غابت الشعریٰ وقد طلع النسر راجع التنبیہ للبکری (۳۸ والاغانی ۱۶/ ۴۵).

❸ راجع للحدیث اللسان (فری) والنھایۃ (۳/ ۷۰ و ۲۱۵) والاضداد ابی الطیب ۵۶۳ والبخاری مع الفتح فضائل اصحاب النبی و تعبیر و توحید والمسلم فضائل الصحابہ والترمذی (رؤیا) والحاکم (۲/ ۲۸) (۵/ ۴۵۵) الفائق (۲/ ۲۲۰) وغریب ابی عبید (۱/ ۸۷) وکما قال لبید: ومن فاومن اخوانھم وبینھم کھول وشبان کجِلۃ عبقری راجع التاج (عبقر).

میں عَبۡقَرِیٌّ کے معنی ایک قسم کے عمدہ فرش کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے جنت کے فروش کے لیے ضرب المثل کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

(ع ت ب)

اَلۡعَتَبُ: ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جو وہاں اترنے والے کے لیے ساز گار نہ ہو۔ نیز دروازہ کی چوکھٹ اور سیڑھی کو بھی عَتَبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بیوی سے جو فرمایا تھا۔ ((قُوۡلِیۡ لِزَوۡجِكِ غَیِّرۡ عَتَبَةَ بَابِكَ)) اپنے خاوند سے کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر لے تو یہاں عَتَبَۃٌ کے معنی بطور کنایہ عورت کے ہیں اور استعارہ کے طور پر عَتَبٌ وَمَعۡتَبَۃٌ کے معنی اس ناراضگی یا سختی کے بھی آ جاتے ہیں جو انسان کے دل میں دوسرے کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی اصل میں اَلۡعَتَبُ ہی سے ہے اسی کے مطابق خَشُنۡتُ بِصَدۡرِ فُلَانٍ وَوَجَدۡتُ فِیۡ صَدۡرِهٖ غِلۡظَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اسی سے کہا گیا ہے۔ حُمِلَ فُلَانٌ عَلٰی عَتَبَةٍ صَعۡبَةٍ فلاں کو ناگوار حالت پر مجبور کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [2] (خفیف)

(۳۰۰) وَحَمَلۡنَاهُمۡ عَلٰی صَعۡبَةٍ زَوۡ
زَاءَ یَعۡلُوۡنَهَا بِغَیۡرِ وَطَاءِ

ہم نے انہیں نہایت ٹیڑھی حالت پر سوار کیا چنانچہ وہ بغیر نمدہ کے اس پر سوار ہیں۔

اَعۡتَبۡتُ فُلَانًا (۱) ناراضگی ظاہر کرنا (۲) ناراضگی پر ابھارنا (۳) میں نے اس کی ناراضگی دور کر دی یعنی راضی کر لیا جیسا کہ اَشۡکَیۡتُهٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کی شکایت دور کر دی (یعنی سلب ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں) قرآن میں ہے:

﴿فَمَا هُمۡ مِنَ الۡمُعۡتَبِیۡنَ﴾ (۴۱۔۲۴) ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔

اَلۡاِسۡتِعۡتَابُ: (رضامندی چاہنا) کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنے عتاب کو دور کر دے تاکہ راضی ہو جائے کہا جاتا ہے: اِسۡتَعۡتَبَ فُلَانٌ کسی سے عتاب کو دور کرنے کی خواہش کی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا هُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ﴾ (۱۶۔۸۴) اور نہ ان کی معذرت قبول کر کے ان سے عتاب کو دور کیا جائے گا۔

لَكَ الۡعُتۡبٰی: تیرے لیے رضامندی ہے۔ بَیۡنَهُمۡ اُعۡتُوۡبَةٌ: وہ باہم کشیدہ ہیں۔

عَتَبَ عَتۡبًا: آدمی کا ایک پاؤں پر کود کر چلنا جیسے اوپر چڑھنے والا سیڑھیوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہے۔

(ع ت د)

اَلۡعَتَادُ: ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا اور یہی معنی اِعۡدَادٌ کے ہیں۔ عَتِیۡدٌ: (اسم فاعل) تیار کرنے والا (اسم مفعول) تیار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ﴾ (۵۰۔۲۳) یہ (اعمال نامہ) میرے سامنے حاضر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ﴾ (۵۰۔۱۸) میں عَتِیۡدٌ کے معنی ہیں وہ

---

[1] التفصیل فی البدایہ والنہایہ ج ۱ ص .

[2] قال ابو زبید الطائی والبیت فی النقائض ۱۶۰.

فرشتہ لوگوں کے اعمال لکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا﴾ (۴۔۱۸) ان کے لیے دردانگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ اَعۡتَدۡنَا کا لفظ عَتَادٌ سے فعل ماضی اَفۡعَلۡنَا کے وزن پر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اَعۡدَدۡنَا ہے جس میں ایک ''دال'' کو ''ت'' سے تبدیل کردیا گیا ہے۔

فَرَسٌ عَتِیۡدٌ وَعَتِدٌ: گھوڑا، جو ہر وقت دوڑ کے لیے تیار ہو اَلۡعَتُوۡدُ: بکری کا یکسالہ بچہ جمع اَعۡتِدَۃٌ وَعِدَّانٌ (ت کے دال میں ادغام کے ساتھ)

(ع ت ق)

اَلۡعَتِیۡقُ کے معنی المتقدم یعنی پیش رو کے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار ہو، خواہ مکان یا رتبہ کے اعتبار سے۔ اس لحاظ سے اَلۡعَتِیۡقُ کے معنی کہنہ، نجیب اور آزاد شدہ غلام بھی آجاتے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ:

﴿وَلۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ﴾ (۲۲۔۲۹) اور خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔ میں خانہ کعبہ کو اَلۡعَتِیۡقُ کہنے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ جابرۃ کے پنجہ ستم سے ہمیشہ آزاد رہا ہے اور جابر سے جابر بادشاہ بھی اس کے مرتبہ کو پست نہیں کرسکا اَلۡعَاتِقَان: دونوں طرف سے کندھوں اور گردن کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں کیونکہ بدن کا یہ حصہ بھی باقی جسم سے بلند ہوتا ہے نیز عَاتِقٌ اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جو حبالہ نکاح سے آزاد ہو۔ کیونکہ شادی شدہ عورت ایک طرح سے خاوند کی ملک میں ہوتی ہے عَتَقَ الۡفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں آگے بڑھ جانا۔ عَتَقَ مِنِّیۡ یَمِیۡنٌ: قسم کا واجب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۳۰۱) عَلَیَّ اَلِیَّۃٌ عَتَقَتۡ قَدِیۡمًا
وَلَیۡسَ لَهَا وَاِنۡ طَلَبَتۡ مَرَامٗ

مجھ پر عرصہ قدیم سے قسم واجب ہوچکی ہے اور اسے پورا کرنے سے چارہ کار نہیں ہے۔

(ع ت ل)

اَلۡعَتۡلُ: کسی چیز کو اس جگہ سے پکڑنا جہاں اس کے سارے سرے جمع ہوتے ہوں اور اسے بزور گھسیٹنا جس طرح کہ اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے نہایت بیدردی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاعۡتِلُوۡهُ اِلٰی سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ﴾ (۴۴۔۴۷) اور اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔

اَلۡعُتُلُّ: بسیار خور اور مال کو روک کر رکھنے والا۔ جو کسی چیز کو نہایت بے دردی سے گھسیٹتا ہو (سخت گیر) قرآن پاک میں ہے:

﴿عُتُلٍّ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِیۡمٍ﴾ (۶۸۔۱۳) سخت گیر اور اس کے علاوہ بدذات بھی۔

(ع ت و)

عَتَا۔یَعۡتُوۡ۔عُتُوًّا وَعِتِیًّا: حکم عدولی کرنا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهِمۡ﴾ (۵۱۔۴۴) تو انہوں نے

---

[1] قال اوس بن حجر انظر دیوانہ ۴۶ رقم ۳۴ وفیہ فلیس بدل ولیس واللسان (عتق) والسمط ۹۰ ومجاز القرآن رقم ۸۹ والاقتضاب واصلاح یعقوب ۲۳۴ واوردہ العلماء فی الباب التمثیل وقیل: ان امراء القیس اول من ابتکرہٗ ولم یات املح منہ ۱۲۔

اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔

﴿وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا﴾ (۲۵۔۲۱) اور (اسی بنا پر) بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔

﴿عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا﴾ (۶۵۔۸) اپنے پروردگار کے امر سے سرکشی کی۔

﴿بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ﴾ (۶۷۔۲۱) لیکن یہ سرکش اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾ (۱۹۔۸) کے معنی یہ ہیں کہ میں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ گیا ہوں جہاں اصلاح اور مداوا کی کوئی سبیل نہیں رہتی یا عمر کے اس درجہ میں کہ جس میں ریاضت بھی بیکار ہوتی ہے اور لفظ ریاضت سے وہی معنی مراد ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔ [1]

(الکامل)

(۳۰۲) وَمِنَ الْعَنَاءِ رِيَاضَةُ الْهَرِمِ

اور انتہائی بڑھاپے میں ریاضت دینا سراسر تکلیف دہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ (۱۹۔۶۹) جو خدا سے سخت سرکشی کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ عِتِيًّا مصدر اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عَاتٍ کی جمع ہے اور اَلْعَاتِيْ کے معنی سنگ دل اور اجڈ بھی آتے ہیں۔

(ع ث ر)

عَثَرَ۔ يَعْثُرُ۔ عِثَارًا وَعُثُوْرًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں۔ مجازاً اَعْثَرَ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانا بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنْ عُثِرَ عَلٰى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا اِثْمًا﴾ (۵۔۱۰۷) پھر اگر معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

اَعْثَرَهٗ عَلٰى كَذَا: اس نے فلاں کو اس چیز سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۸۔۲۱) اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے باخبر کر دیا۔ یعنی لوگوں کے قصد کے بغیر ہی ہم نے ان کے حال پر مطلع کر دیا۔

(ع ث ی)

اَلْعَيْثُ وَالْعِثِيُّ: (سخت فساد پیدا کرنا) بھی جَذَبَ اور جَبَذَ کی طرح تقریباً ہم معنی ہی ہیں۔ لیکن عَيْثٌ کا لفظ زیادہ تر فساد حسی کے لیے بولا جاتا ہے اور اَلْعِثِيُّ کا حکمی یعنی ذہنی اور فکری فساد کے لیے آتا ہے کہا جاتا ہے عَثِيَ يَعْثٰى عِثِيًّا۔ چنانچہ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (۲۔۶۰) اور ملک میں فساد اور انتشار پیدا نہ کرو۔

---

[1] وصدرہٗ: أنروض عرسك بعد ماهرمت...... والبيت في السمط: (۱: ۱۰۶) والبيان (۱: ۶۶) والبحتری ۳۴۰ والعيون (۲: ۳۶۹) والعقد (۲: ۴۳۵) وفيه وتروض والحيوان (۱/ ۴۱-۳/ ۱۰۲) وفيه وتلوم بدل أتروض ومجموعة المعانی ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف (۱: ۴۸) والحصری (۲: ۲۵۹) وتاريخ الطبری (۶: ۱۵۸) بغير عزو فيه قاله اعرابی انظر الخبر والشطر فی طيلسنات الحمدونی والحمدونی هو اسماعيل اعلم الناس شعراً وعامة شعره فی طيلسان ابن حرب راجع طبقات ابن المعتز (۳۷۱-۳۷۲).

اور عَشَا یَعْشُوْا عُشُوًّا: (باب نَصَرَ سے) بھی آتا ہے اور اَلْاَعْشٰی: سیاہی مائل اور ست۔ نیز احمق آدمی کو بھی اَعْشٰی کہا جاتا ہے۔

(ع ج ب)

اَلْعَجَبُ اور اَلتَّعَجُّبُ: اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے اسی بنا پر حکماء نے کہا ہے کہ عَجَبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جس کا سبب معلوم نہ ہو اس لیے اللہ تعالیٰ پر تعجب کا اطلاق جائز نہیں ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ہے۔ اس بنا پر کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ عَجِبْتُ عَجَبًا: (س) میں نے تعجب کیا۔ عَجَبٌ: ہر وہ بات جس سے تعجب پیدا ہو اور جس قسم کی چیز عام طور نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِیْبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَا﴾ (۱۰۔۲) کیا لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے وحی بھیجی۔

میں تنبیہ کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف وحی بھیجنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ لوگ پہلے سے سلسلہ وحی کو جانتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ﴾ (۵۰۔۲) بلکہ ان لوگوں نے تعجب کیا ہے کہ انہی میں سے ایک ہدایت کرنے والا ان کے پاس آیا۔

﴿وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُھُمْ﴾ (۱۳۔۵) اور اگر تم عجیب بات سننی چاہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا﴾ (۱۸۔۹) کہ وہ ہماری نشانیوں سے عجیب تھے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب کہف قدرت کے عجائبات سے نہ تھے بلکہ ہماری قدرت کے نشانات ایسے بھی ہیں جو ان سے بڑھ کر اور زیادہ عجیب ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ (۷۲۔۱) (کہنے لگے) کہ ہم نے ایک عجیب قرآن پاک سنا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن (وحی) کا نہ تو سبب ہی معلوم ہے اور نہ اس جیسا قرآن پاک پہلے دیکھا ہے اور بطور استعارہ یہ لفظ ہر بھلی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

اَعْجَبَنِیْ کَذَا: یعنی مجھے فلاں چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ﴾ (۲۔۲۰۴) اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو...... تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے۔

﴿وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ﴾ (۹۔۵۸) اور ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کرنا۔

﴿وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ﴾ (۹۔۲۵) اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرت پر غرور تھا۔

﴿اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ﴾ (۵۷۔۲۰) اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۲) ہاں تم تو تعجب کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونے پر پختہ یقین ہونے کی وجہ سے تمہیں ان کے انکار پر تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ

ازراہ نادانی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ آپ کو ان کے انکار وحی پر تعجب ہوتا ہے ایک قرات میں بَلْ عَجِبْتُ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ نے تعجب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ان چیزوں سے ہے جن پر عَجِبْتُ بمعنی اَنْکَرْتُ ہو جیسا کہ فرمایا:

﴿اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۷۳) انہوں نے کہا: تم خدا کی قدرت سے انکار کرتی ہو۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ (۳۸۔۵) یہ تو بڑی منکر بات ہے۔

هُوَ مُعْجَبٌ بِنَفْسِهٖ: وہ غرور اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔

اَلْعَجَبُ: جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

(ع ج ز)

عَجُزُ الْاِنْسَان۔ انسان کا پچھلا حصہ تشبیہ کے طور پر ہر چیز کے پچھلے حصہ کو عَجُزٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ ❶ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (۵۴۔۲۰) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

عَجْزٌ کے اصل معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانا یا اسکے ایسے وقت میں حاصل ہونا کے ہیں جب کہ اسکا وقت نکل چکا ہو۔ جیسا کہ لفظ اَلدُّبُرُ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ اَلْقُدْرَةُ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ﴾ (۵۔۳۱) اے ہے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں............

اَعْجَزْتُ فُلَانًا وَعَجَّزْتُهٗ وَعَاجَزْتُهٗ کے معنی کسی کو عاجز کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ﴾ (۹۔۲) اور جان رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے۔

﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (۴۲۔۳۱) اور تم زمین میں خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔

﴿وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ﴾ (۳۴۔۵) اور جنہوں نے ہماری آیتوں میں کوشش کی کہ ہمیں ہرا دیں گے۔

ایک قرأت میں مُعَجِّزِيْنَ ہے۔ مُعَاجِزِيْنَ کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے: وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ ہمیں بے بس کر دیں گے کیونکہ وہ یہ گمان کر چکے ہیں کہ حشر و نشر نہیں ہے کہ اعمال پر جزا و سزا مرتب ہو لہٰذا یہ باعتبار معنی آیت کریمہ:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا﴾ (۲۹۔۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔

کے مترادف ہوگا اور اگر مُعَجِّزِيْنَ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے متبعین کی طرف عجز کی نسبت کرتے ہیں۔ جیسے جَهَّلْتُهٗ وَفَسَّقْتُهٗ کے معنی کسی کی طرف جہالت یا فسق کی نسبت کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مُعَجِّزِيْنَ بمعنی مُثَبِّطِيْنَ ہے۔ یعنی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی اتباع سے روکتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۷۔۴۵) جو

---

❶ وفي الفائق (۲ / ۱۶۰)۔العجز لهما والعجيزة للمرأة خاصة.

خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

اور بڑھیا کو عَجُوْزٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اکثر امور سے عاجز ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

﴿ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ﴾ (۱۱۔۷۲) اے ہے میرے ہاں بچہ ہوگا؟ اور میں تو بڑھیا ہوں۔

(ع ج ف)

اَعْجَفُ: (صفت) کے معنی انتہائی لاغر اور دبلا کے ہیں اس کی مؤنث عَجْفَاءُ ہے اور جمع عِجَافٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَبْعٌ عِجَافٌ﴾ (۱۲۔۴۳) سات دبلی۔

دراصل یہ نَصْلٌ اَعْجَفُ سے مشتق ہے جس کے معنی پتلے اور باریک تیر کے ہیں۔ اَعْجَفَ الرَّجُلُ: اس کے مویشی دبلے ہوگئے۔ عَجَفْتُ نَفْسِیْ عَنِ الطَّعَامِ: میری طبیعت کھانے سے اچاٹ ہوگئی۔ عَنْ فُلَانٍ: اس سے دل برداشتہ ہوگئی۔

(ع ج ل)

اَلْعَجَلَۃُ: کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اس کا تعلق چونکہ خواہش نفسانی سے ہوتا ہے اس لیے عام طور پر قرآن پاک میں اس کی مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:[1] (۲۹) ((اَلْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ)) (کہ جلد بازی شیطان سے ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿سَاُرِیْکُمْ آیَاتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ﴾ (۲۱۔۳۷) میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا لہٰذا اس کے لیے جلدی نہ کرو۔

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ﴾ (۲۰۔۱۱۴) قرآن پاک کی تلاوت کے لیے جلدی نہ کیا کرو۔

﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ﴾ (۲۰۔۸۳) تو تم نے اپنی قوم سے آگے چلے آنے میں کیوں جلدی کی؟ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی﴾ (۲۰۔۸۴) اور تیری طرف آنے میں اس لیے جلدی کی کہ تم خوش ہو جاؤ۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی ہے کہ جلد بازی گو مذموم ہے مگر میں نے اچھے مقصد کے پیش نظر یہ اقدام کیا ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کی طلب۔

﴿اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (۱۶۔۱) خدا کا حکم یعنی عذاب گویا آ ہی پہنچا (کافرو) اس کے لیے جلدی مت کرو۔

﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ﴾ (۱۳۔۶) اور یہ تجھ سے برائی کے جلد خواستگار ہیں یعنی طالب عذاب۔

﴿لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ (۳۔۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو۔

﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾ (۲۲۔۴۷) اور لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔

[1] الفائق (۱ : ٦٧) رواہ الترمذی عن سھل بن سعد (وھب عن انس) کنزالعمال ۳/ ۵۴۷۔۵۴۸ وعن الحسن مرسلا (ابن ابی الدنیا فی ذم الغضب) (الخرائطی فی مکارم الاخلاق) راجع احیاء العلوم بتخریج العراقی۔

﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ﴾ (۱۰۔۱۱) اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (۲۱۔۳۷) انسان جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے۔

میں بعض نے عَجَلٌ کے معنی مٹی کئے ہیں ❶ مگر یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ اس سے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے جیسا کہ دوسری آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ (۱۷۔۱۱) انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ (۱۷۔۱۸) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں۔

میں اَلْعَاجِلَةَ سے دنیوی ساز وسامان مراد ہے۔یعنی جو شخص دنیوی ساز وسامان چاہتا ہے اسے ہم جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔

﴿عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸۔۱۶) ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔

﴿فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ﴾ (۴۸۔۲۰) سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔

اَلْعُجَالَةُ: کھانا جو اصل کھانے سے پہلے یوں ہی کھایا جائے۔جیسے لُهْنَةٌ اور عَجِلْتُهُمْ وَلَهَنْتُهُمْ کے معنی عُجَالَة یا لُهْنَة پیش کرنے کے ہیں۔

اَلْعِجْلَةُ: چھوٹا سا لوٹا جو جلدی میں رفع حاجت کے وقت ساتھ لے جایا جاتا ہے اَلْعَجَلَةُ: کنویں کی گھرنی (چرخی) جس کے ذریعہ ڈول کھینچا جاتا ہے۔

اور بیل گاڑی کو بھی عَجَلَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سرعت سے چلتی ہے۔

اَلْعِجْلُ: بچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿عِجْلًا جَسَدًا﴾ (۷۔۱۴۸) ایک بچھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا۔

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا بچھڑا ہو اسے مُعْجِلٌ کہا جاتا ہے۔

(ع ج م)

اَلْعُجْمَةُ: (کے معنی ابہام اور خفا کے ہیں اور) یہ اَلْاِبَانَةُ کی ضد ہے جس کے معنی واضح اور بیان کر دینا کے ہیں اور اِعْجَامٌ کے معنی ہیں مبہم کرنا اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ: گھر سونا ہو گیا۔اور اس میں جواب دینے والا کوئی نہ رہا اسی بنا پر کسی عربی نے آباد شہروں سے کنایہ کرتے ہوئے کہا خَرَجْتُ عَنْ بِلَادٍ تَنْطِقُ: میں شہروں سے نکلا جو آباد تھے۔اَلْعَجَمُ: غیر عرب کو کہتے ہیں اور اَلْعَجَمِيُّ: اس کی طرف منسوب ہے اَلْاَعْجَمُ: وہ آدمی جس کی زبان فصیح نہ ہو خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو

❶ نسبه صاحب التاج الى ابن الاعرابي قال ابو عبيدة العجل بمعنى الحمائي لسان حمير وقال الزمخشري والله اعلم بصحة هذا القول (۱۱۷/۳)، كذا قال الفراء وقال ابو اسحاق و ابن جني وهذ هوا الصحيح.

کیونکہ عرب لوگ عجمی کی گفتگو بہت کم سمجھتے تھے اور اَلْاَعْجَمِیُّ اس کی طرف منسوب ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۸)......اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔ میں تخفیف کے لیے یا نسبت کو حذف کر دیا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهٗ ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ﴾ (۴۱۔۴۴) اور اگر ہم اس قرآن کو غیر (زبان) عربی میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں (ہماری زبان میں) کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں کیا (خوب کہ قرآن پاک تو) عجمی اور مخاطب عربی۔

﴿وَلِسَانُ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ﴾ (۱۶۔۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے۔

اسی سے بَهِيْمَةٌ (چوپایہ) کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ناطق کی طرح الفاظ کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کر سکتا۔

حدیث میں ہے۔❶ (۳۰) ((جُرْحُ الْعَجْمَاءِ جُبَارٌ)) (چوپایہ اگر کسی کو زخمی کر دے تو مالک پر اس کی دیت نہیں ہے) اور دن کی نماز کو عَجْمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی اَعْجَمْتُ الْكَلَامَ: میں نے بات مبہم رکھی یہ اَعْرَبْتُ کی ضد ہے کبھی اَعْجَمْتُ الْكَلَامَ کے معنی کلام سے ابہام کو دور کرنا بھی آجاتے ہیں۔❷ جیسا کہ اَشْكَيْتُهٗ: (شکایت زائل کرنا) خلیل سے مروی ہے کہ حروف مقطعہ کو حروف معجمہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اعجمی یعنی گونگے ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ خلیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ حروف مفرد ہونے کی صورت میں ان معانی پر دلالت نہیں کرتے جن پر کہ مرکب ہونے کی حالت میں دلالت کرتے ہیں۔❸ بَابٌ مُعْجَمٌ بند دروازہ۔ اَلْعَجَمُ: کھجور کی گٹھلی۔ مفرد عَجَمَةٌ اور گٹھلی کو عَجَمَةٌ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گودا کے اندر مخفی ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ اس کا چبانا مشکل ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ کھاتے وقت اسے بھی منہ میں ڈال لیا جاتا ہے اور وہ منہ میں مخفی ہو جاتی ہے اور اَلْعَجْمُ کے معنی چبانے کے ہیں محاورہ ہے:

فُلَانٌ صُلْبُ الْعَجْمِ: یعنی وہ آزمائش میں سخت ہے۔

(ع د د)

اَلْعَدَدُ: (گنتی) آحاد مرکبہ کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ''ترکیب آحاد'' یعنی آحاد کو ترکیب دینا بھی کیے ہیں مگر ان دونوں معنی کا مرجع ایک ہی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (۱۰۔۵) برسوں کا شمار اور (کاموں) کا حساب............اور آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱) ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے

---

❶ ولفظه والعجماء جرحها جبار فی حدیث طویل (عم، وابو عوانه) طب، عن عبادة بن الصامت والفائق ۲/ ۵۹ واللسان والنهاية (عجم).

❷ ای تکون الهمزة فیه للسلب کما قال ابن جنی وقال فی المحکم وهذا اسد واصوب.

❸ وانظر بحث حروف المعجم المحکم لابن سیده (۱: ۲۰۷۔ ۲۰۹).

کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ کے لفظ سے کثرت تعداد کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْعَدُّ کے معنی گنتی اور شمار کرنے کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ (۱۹۔۹۴) اس نے ان سب کا اپنے علم سے احاطہ اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَاسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۳) کے معنی یہ ہیں کہ حساب دانوں سے پوچھ دیکھو۔
﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۲) زمین میں کتنے برس رہے۔
﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (۲۲۔۴۷) بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کی رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔
اور مجازاً اَعَدٌّ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) شَیْءٌ مَعْدُوْدٌ اَوْ مَحْصُوْرٌ: تھوڑی سی چیز۔ اس صورت میں یہ اس چیز کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جو بے شمار ہو جس کی طرف قرآن پاک نے بغیر حساب کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (۲۔۸۰) چند روز کے سوا میں مَعْدُوْدَةً کے معنی چند دنوں کے ہیں کیونکہ یہود یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں تو صرف چند دن عذاب ہوگا جتنے دن کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔
اور کبھی اس کے برعکس کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: جَيْشٌ عَدِيْدٌ: کثیر تعداد لشکر اِنَّهُمْ لَذُوْ عَدَدٍ: وہ بے شمار ہیں۔ اس کے بالمقابل قلیل چیز کو جسے گننے کی ضرورت نہ ہو، شَیْءٌ غَيْرُ مَعْدُوْدٍ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فِی الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۱) غار میں کئی سال، میں عَدَدًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اور اسی سے هٰذَا غَيْرُ مُعْتَدٍّ بِهٖ کا محاورہ ہے یعنی یہ چیز شمار کے قابل نہایت حقیر ہے وَلَهٗ عُدَّةٌ: اس کے پاس مال و دولت اور اسلحہ وغیرہ بہت سا ساز و سامان تیار رکھا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً﴾ (۹۔۴۶) تو اس کے لیے سامان تیار کرتے۔
اور مَاءٌ عِدٌّ کے معنی بہت زیادہ پانی کے ہیں جس کا ذخیرہ نہ ہو۔ [1] اور اَلْعِدَّةُ شمار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ﴾ (۷۴۔۳۱) اور ان کا شمار مقرر نہیں کیا۔
﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (۲۔۱۸۴) تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرے۔
یعنی جتنے دن ماہ رمضان سے فوت ہو گئے ہوں ان کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے۔
﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ﴾ (۹۔۳۶) (خدا کے نزدیک) مہینے گنتی ہیں۔
اور اَلْعِدَّةُ: کا لفظ عورت کی عدت پر بھی بولا جاتا ہے یعنی وہ مدت جس کے اندر عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔

---

[1] وفی الحدیث قال صلی اللہ علیہ وسلم رجل یا رسول اللہ انما اقطعت له الماء العدّ فی قصه استقطاع ابیض بن حمال المازنی انظر الفائق (۲/ ۶۱)۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ (۳۳۔۴۹) تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کراؤ۔

﴿وَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ (۶۵۔۱) تو ان کو عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو۔

اَلْاِعْدَادُ: تیار کرنا، مہیا کرنا۔ یہ عَدٌّ سے ہے جیسے سَقْیٌ سے اِسْقَاءٌ اور اَعْدَدْتُّ ھٰذَالَكَ کے معنی ہیں کہ یہ چیز میں نے تمہارے لیے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے، ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمیعت سے)......ان کے (مقابلے کے لیے) مستعد رہو۔

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۴) جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

﴿وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (۹۔۱۰۰) اور اس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (۴۔۱۸) ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ﴾ (۲۵۔۱۱) اور ہم نے جھٹلانے والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً﴾ (۱۲۔۳۱) اور ان کے لیے ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدَتْ بھی اسی (عَدٌّ) سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (۲۔۱۸۵) تم روزوں کا شمار پورا کر لو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کر لو۔ اور ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ (۲۔۱۸۴) گنتی کے چند روز...... میں، ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ (۲۔۲۰۳) اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں "يَوْمُ النَّحْرِ" بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

اَلْعِدَادُ: اس مقررہ وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [1] (۳۱) مَازَالَتْ اُكْلَةُ خَيْبَرَ تُعَادُّنِيْ: کہ خیبر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے۔ عِدَّانُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ

---

[1] وتمام الحديث فهذا اوان قطعت ابهرى (غريب ابى عبيد (۷۳/۱) والحديث رواه البزار وابو نعيم فى الطب وابن عدى فى الكامل من حديث ابى هريره والحاكم وابو داود ومرسلاً والطبرى من حديث بريدة وفيه سمت له امرأة يهودية بخيبر والحديث باختلاف القرآن للقتبى ۱۸ او الفائق (۳۸/۱) اللسان (عدد) والاضداد لابن الانبارى ۹۰ والمخصص ۸۸/۵ وتاويل مختلف الحديث والروض للسهيلى قاله صلى الله عليه وسلم فى مرضه الذى مات فيه والحديث يدل على انه مات شهيدًا والحديث فى النهاية (۱۵/۱) وفيه تعاودنى بدل تعادنى. ۱۲

کے ہیں۔

(ع د س)

اَلْعَدَسُ :مسور کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا﴾ (۲۔۶۱) اور مسور اور پیاز۔اور عَدَسَةٌ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عدس (اسم صوت) خچر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی سے عَدَسَ فِي الْاَرْضِ وَهُوَ عَدُوْسٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

(ع د ل)

اَلْعَدَالَةُ وَالْمُعَادَلَةُ کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے۔یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہونا اور عَدْلٌ وَعِدْلٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عَدْلٌ کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔
﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (۵۔۹۵) یا اس کے برابر روزے رکھنا۔
اور عِدْلٌ وَعَدِيْلٌ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بولے جاتے ہیں جن کا ادراک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ ،تول یا وزن سے ہوتا ہے، پس عَدْلٌ کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں۔چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے (۳۷) بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (کہ عدل ہی سے آسمان و زمین قائم ہیں) یعنی اگر عناصر اربعہ جن سے کائنات نے ترکیب پائی ہے، میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا۔
اَلْعَدْلُ: دو قسم پر ہے اول عدل مطلق: جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے۔مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔
دوم: عدل شرعی: جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قِصَاص ، جَنَايَات کی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ۔چنانچہ آیات:
﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُم فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ (۲۔۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔
﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا﴾ (۴۲۔۴۰) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔
میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ (۱۶۔۹۰)
خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا......حکم دیتا ہے۔
میں عدل کے یہی معنی مراد ہیں کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عَدلٌ ہے یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامحت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے: رَجُلٌ عَدْلٌ وَرِجَالٌ عَدْلٌ نے کہا ہے۔[1] (الطّویل)

---

[1] قطعة من بيت لزهير في قصيده له في مدح هدم بن سنان والحارث بن عوف المريين والقصيدة في ديوانه ۹۶۔۱۵۵ وتكملة ←

(۳۰۳) فَهُمْ رِضًا وَهُمْ عَدْلٌ
وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔
دراصل عَدْلٌ کا لفظ مصدر ہے، چنانچہ آیت:۔
﴿وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۶۵۔۲) اور اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ بنالو۔
میں عَدْلٌ کے معنی عَدَالَةٌ ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (۴۲۔۱۵) اور مجھے حکم ہوا کہ تم میں انصاف کروں۔
﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا﴾ (۵۔۸)......اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو اور آیت کریمہ۔
﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ﴾ (۴۔۱۲۹) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکو گے۔
میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بیویوں سے برابر درجہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر ہے۔اور آیت کریمہ۔
﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ (۴۔۳) اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔
میں عدل سے نان ونفقہ اور ازدواجی تعلقات میں برابری مراد ہے۔اور آیت کریمہ۔
﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (۵۔۹۵) اس کے برابر روزے رکھنا۔
میں عَدْل سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں تو اسے بھی عَدْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔❶ اور (۳۳) لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ عَدْلٌ کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں اور صَرْفٌ کا لفظ نَافِلَةٌ سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہٰذا یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل ہیں اور لَا يُقْبَلُ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس کسی قسم کی نیکی نہیں ہوگی جو قبول کی جائے اور یہ آیت۔
﴿بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ (۶۔۱۵) کے معنی ہیں کہ وہ دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ آیت۔
﴿وَهُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۰۰) کے ہم معنی ہوگی۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ افعال الٰہیہ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔اور آیت کریمہ۔
﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ﴾ (۲۷۔۶۰) بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

← البيت: حتىٰ يشتجر قوم يقل سرواتهم ـهم بيننا...... والبيت فی ديوانه ۱۰۷ والاضداد للسجستانی ۷۵ ومجاز القرآن ۱۷۶ رقم ۲۰۹ ومختار الشعر الجاهلی (۱/ ۱۶۱) والعقد الثمين ۹۰ وشرح السبع لابن الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطيب ۳۴ قال وهذا (ای اطلاق المصدر علی الواحد والجمع مشهور فی المصادر خاصه)

❶ متفق عليه من حديث علی رضی الله عنه وفی مسند عبدالرزاق العدل الفريضه ومن حديث انس رضی الله عنه وابی هريره رواه مسلم والبخاری وفی ابی داود من حديث ابی هريره راجع الانصاف ۷ واللسان (صرف) والنهاية (۲/ ۳۶۰) والغريب للقتبی ۳۱۱

بھی اسی کے معنی پر محمول ہوسکتی ہے یعنی اس کے معنی یَعْدِلُوْنَ بِهٖ کے ہیں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عَدَلَ عَنِ الْحَقِّ سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔

اَیَّامٌ مُعْتَدِلاتٌ: معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔

عَادَلَ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا۔ عَادَلَ الْاَمْرَ: کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا۔ اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ وُضِعَ عَلٰی یَدَیْ عَدْلٍ: یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ❶

(ع د ن)

عَدْنٌ: (ن ض) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

عَدَنَ بِمَکَانِ کَذَا: یعنی اس نے فلاں جگہ قیام کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (۱۳۔۲۴) یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات۔ اسی سے اَلْمَعْدِنُ (کان ہے) ہے کیونکہ کان بھی جواہرات کے ٹھہرنے اور پائے جانے کی جگہ ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔ ❷ (۳۴) ((اَلْمَعْدِنُ جُبَارٌ)) کہ اگر کوئی شخص کان میں گر کر مر جائے تو کان کن پر اس کی دیت نہیں ہے۔

(ع د و)

اَلْعَدْوُ: کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا کے ہیں۔ اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عَدَاوَۃٌ اور مُعَادَاۃٌ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عَدْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر عدل وانصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدْوَانٌ اور عَدْوٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ ﴿فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶۔۱۰۸) کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھے برا نہ کہہ بیٹھیں۔

اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عَدْوَاءُ کہہ دیتے ہیں، جیسے، مَکَانٌ ذُوْعَدْوَاءَ: ناہموار مقام۔ چنانچہ مُعَادَۃٌ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رَجُلٌ عَدُوٌّ وَقَوْمٌ عَدُوٌّ۔ اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۷۔۲۴) (اب سے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

مگر کبھی اس کی جمع عِدًی وَاَعْدَاءٌ بنا لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ﴾ (۴۱۔۱۹) جس روز خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے۔

اَلْعَدُوُّ: دو قسم پر ہے ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو قصد وارادہ سے دشمنی کرتا ہے جیسے فرمایا۔

﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ......﴾ (۴۔۹۲)

---

❶ قال ابن الکلبی! ھو العدل بن جزء بن سعد العشیرۃ و کان ولی شرطۃ لتبع و کان تبع اذا اراد وقتل رجل دفعہ الیہ فقال الناس وضع علی یدی عدل ثم قیل لکل شیء قد یئس منہ انظر للکلمۃ ادب الکاتب ۴۳ واساس البلاغہ واللسان (عدل) والمیدانی

❷ راجع لتخریج الحدیث (ع ج م)

اور اگر مقتول تمھارے دشمنوں کی جماعت سے ہو۔

﴿جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ......﴾ (۲۵۔۳۱) ہم نے گنہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا۔

اور دوسری آیت میں ہے۔

﴿عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ (۶۔۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔

اور دوسرا دشمن وہ ہے جو قصد وارادہ سے تو دشمنی نہیں کرتا لیکن اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جس سے انسان کو ایسے ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے دشمن سے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے

﴿فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (۲۶۔۷۷) وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے۔)

اور انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا۔

﴿عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ......﴾ (۶۴۔۱۴) تمھارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

اور عَدْوٌ (دوڑنا) کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۳۰۴) فَعَادٰى عِدَاءً بَيْنَ ثَوْرٍ وَنَعْجَةٍ: اس نے ایک ہی دوڑ میں وحشی بیل اور نیل گائے کا شکار کرلیا۔

تَعَادَتِ الْمَوَاشِيْ: مویشی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے۔ رَأَيْتُ عِدَاءَ الْقَوْمِ: میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں دوڑتے ہوئے دیکھا۔

اَلْاِعْتِدَاءُ کے معنی حق سے تجاوز کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ (۲۔۲۳۱) اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انھیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ﴾ (۴۔۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرررہ کردہ حدود سے آگے بڑھے گا۔

﴿اِعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ (۲۔۶۵) جو تم میں سے ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔یعنی انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار حلال سمجھ کر حد سے تجاوز کیا۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ (۲۔۲۲۹) یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۲۳۔۷) وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ (۲۔۱۷۸) جس نے اس کے بعد زیادتی کی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ﴾ (۲۶۔۱۶۶) میں عَادُوْنَ کے معنی ہیں (۱) حد سے تجاوز کرنے والے

---

[1] قاله امرؤالقيس وآخره: وراكا ولم ينضح بماء فيغسل ۔اى انه ادركهما سريعا وعقرهما قبل ان يعرق والبيت فى اللسان (عدد) وديوانه ۱۰۳ (صنعة السند وبى) ومختار الشعر الجاهلى ۱۳ والبيت من ابيات المعانى راجع الماعانى للقتبى (۱۲۔۱۳) وفى مختار الشعراء الجاهلى واللسان ايضاً لعلقمة فى بائيته راجع ديوانه ۶۶ وتمامه: وتيس شبوب كالهشيمه قريب وفى رواية فى محموعة لامية العرب ۸۲ والجمهرة ۱۰۲ والعقد الثمين ۴۹ والسيوطى ۳۴ والقالى (۲: ۲۲۶) شرح السبع لابن الانبارى ۹۶ ويروى ايضاً فعاديت منه ...... وكان عدائى ان ركبت على بالى ۔وفيه صنعة التبليغ انظر التبريزى على العشر ۴۶

اور یا (۲) دشمنی رکھنے والے اور یا (۳) اپنے مرتبہ سے تجاوز کرنے والے اس تیسری صورت میں یہ عَدَیٰ طَوْرَہٗ (اس نے اپنے مرتبہ سے تجاوز کیا) کے محاورہ سے مشتق ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿ وَلاَ تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴾ (۲۔۱۹) مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

میں ابتداء ظلم و زیادتی کرنا مراد ہے نہ کہ کسی سے بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کرنا۔ جس کا ذکر کہ آیت کریمہ۔

﴿فَمَنِ اعْتَدَیٰ عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَیٰ عَلَیْکُم ﴾ (۲۔۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ میں پایا جاتا ہے یعنی اس کی زیادتی کے مطابق بدلہ دو اور ظلم و زیادتی میں پہل کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵۔۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔

اور عدوان یعنی زیادتی کا بدلہ لینے کو بھی قرآن پاک نے عدوان کہا ہے حالانکہ یہ جائز ہے جیسے فرمایا۔

﴿فَلاَ عُدْوَانَ اِلاَّ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ (۲۔۱۹۳) تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا﴾ (۴۔۳۰) اور جو تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلاَ عَادٍ﴾ (۲۔۱۷۳) ہاں جو نا چار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے۔

میں بَاغٍ سے وہ شخص مراد ہے جو لذت اندوزی کے لیے مردار کا گوشت کھانے کی خواہش کرتا ہے اور عَادٍ سے مراد وہ شخص ہے جو قدر کفایت سے تجاوز کرتا ہے بعض نے بَاغٍ کے معنی خلیفۂ وقت کا باغی اور عَادٍ سے وہ شخص مراد لیا ہے جو عجز و نیاز کرنے والوں کے طریق سے تجاوز کرنے والا ہو ❶۔ اور یہ عَدَیٰ طَوْرَہٗ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اپنے رتبہ سے تجاوز کرنے والا اور اسی سے تَعْدِیَةٌ فِی الْفِعلِ ہے اور علم نحو میں فعل کو تَعْدِیَة سے مراد ہوتا ہے: فعل کا اپنے فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچ جانا۔ اور مَاعَدَا کا لفظ استثناء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی ﴾ (۸۔۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔ میں عُدْوَةُ الدُّنْیَا سے مدینہ کی جانب کا کنارہ مراد ہے جو حد قریب سے کچھ دور تھا۔

(ع ذ ب)

مَاءٌ عَذْبٌ کے معنی خوش گوار اور ٹھنڈا پانی کے ہیں۔

---

❶ ذکر ابو حیان فی بحرہ (۱/۴۸۱۔۴۸۴) تسعة اقوال فی تفسیر الآیة والسید المرتضی فی امالیه (۱/۲۱۵۔۲۱۹) خمسة اقوال وراجع الطبری القول الثانی (۲:۳۱۳)

قرآن پاک میں ہے۔

﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵۔۵۳) ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار ہے۔

اَعْذَبَ الْقَوْمُ: لوگوں کو شیریں پانی ملنے لگا۔

اَلْعَذَابُ: سخت تکلیف دینا۔ عَذَّبَهٗ تَعْذِیْبًا: اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا﴾ (۲۷۔۲۱) میں اسے سخت سزا دوں گا۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (۸۔۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دے۔ یعنی بذریعہ عذاب کے ان کا استیصال نہیں کرے گا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَا لَهُمْ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ﴾ (۸۔۳۴) اور اب ان کے لیے کون سی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عذاب نہ دے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اب انھیں تہ تیغ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور فرمایا۔

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ﴾ (۱۷۔۱۵) اور ہم...... عذاب نہیں دیا کرتے۔

﴿وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۳۸) اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ (۳۷۔۱۰) اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (۲۔۱۰) اور...... ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ (۱۵۔۵) اور یہ کہ میرا عذاب بھی درد دینے والا عذاب ہے۔

لفظ عَذَابٌ کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عَذَبَ (ض) الرَّجُلُ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پیاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عَاذِبٌ وَعَذُوْبٌ کہا جاتا ہے لہٰذا تَعْذِیْبٌ کے اصلی معنی ہیں، کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا اور بعض کے نزدیک یہ عَذْبٌ (شیریں) سے مشتق ہے لہٰذا عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کر دیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ (میں نے اس سے مرض کو دور کیا) اور قَذَّیْتُهٗ میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکالا۔

بعض نے کہا ہے کہ دراصل اَلتَّعْذِیْبُ کے معنی ہیں کسی کو کوڑے کے (عَذْبَه) یعنی سرکے ساتھ متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعْذِیْبٌ کے معنی ہی مارنا لکھے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَاءٌ عَذَبٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی مکدر پانی جس کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہو۔ اس بنا پر عَذَّبْتُهٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کی زندگی کے چشمۂ صافی کو مکدر کر دیا اس سے زندگی کی راحت دور کر دی۔ عَذْبَةُ السَّوْطِ: کوڑے کا سرا۔ عَذْبَةُ اللِّسَانِ: زبان کا سرا عَذْبَةُ الشَّجَرِ: درخت کا سرا۔

(ع ذ ر)

اَلْعُذْرُ: ایسی کوشش جس سے انسان اپنے گناہوں کو مٹا

دینا چاہیے اس میں اَلْعُذْرُ اور اَلْعُذُرُ دولغت ہیں اور عُذْرٌ کی تین صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ کسی جرم کے ارتکاب سے قطعاً انکار کردے۔ دوم یہ کہ ارتکاب جرم کی ایسی وجہ بیان کرے جس سے اس کی براءت ثابت ہوتی ہو۔ سوم یہ کہ اقرار جرم کے بعد آئندہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرنے کا وعدہ کرلے۔ عذر کی اس تیسری صورت کا نام توبہ ہے جس سے ثابت ہوا کہ توبہ عذر کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا ہر توبہ کو عُذْرٌ کہہ سکتے ہیں مگر ہر عذر کو توبہ نہیں کہہ سکتے اِعْتَذَرْتُ اِلَيْهِ: میں نے اس کے سامنے عذر بیان کیا عَذَرْتُهٗ: میں نے اس کا عذر قبول کرلیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ﴾ (۹۔۹۴) تو تم سے عذر کریں گے۔ ﴿قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا﴾ (۹۔۹۴) ان سے کہہ دو کہ عذر مت کرو۔

اَلْمُعْذِر: جو اپنے آپ کو معذور سمجھے مگر دراصل وہ معذور نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ﴾ (۹۔۹۰) عذر کرتے ہوئے (تمھارے پاس آئے۔)

ایک قراءت میں مُعْذِرُوْنَ ہے یعنی عذر پیش کرنے والے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ❶ کا قول ہے۔

(لَعَنَ اللّٰهُ الْمُعَذِّرِيْنَ وَرَحِمَ الْمُعْذَرِيْنَ) یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو اور جو واقعی معذور ہیں ان پر رحم فرمائے اور آیت کریمہ۔

﴿مَعْذِرَةٌ اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ (۷۔۱۶۴) تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کرسکیں۔

میں مَعْذِرَةٌ عَذَرْتُ کا مصدر ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا عذر قبول فرمائے اَعْذَرَ: اس نے عذر خواہی کی اپنے آپ کو معذور ثابت کردیا۔ کہا گیا ہے ❶ اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ: یعنی جس نے ڈرسنا دیا وہ معذور ہے بعض نے کہا ہے کہ عُذْر اصل میں عَذِرَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نجاست اور گندگی کے ہیں ❷ اور اسی سے جو چمڑا ختنہ میں کاٹا جاتا ہے اسے عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے ❸ اور عَذَرْتُ الصَّبِيَّ کے معنی ہیں: میں نے لڑکے کا ختنہ کردیا گویا اسے ختنہ کی نجاست سے پاک کردیا اسی طرح عَذَرْتُ فُلَانًا کے معنی: ہیں میں نے اسے معافی دے کر اس سے گناہ کی نجاست کو دور کردیا جیسا کہ غَفَرْتُ لَهٗ کے معنی ہیں: میں نے اس کا گناہ چھپادیا اور لڑکے کے ختنہ کے ساتھ تشبیہ دے کر لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اور عَذَرْتُهَا کے معنی ہیں: میں نے اس کے پردہ بکارت کو زائل کردیا اور بچے کے حلق کے درد کو بھی عُذْرَةٌ کہا جاتا ہے اسی سے عُذِرَ الصَّبِيُّ ہے جس کے معنی بچہ کے درد حلق میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❹

---

❶ انظر للكلمة الميداني رقم ٢٤٩٦

❷ ومنه قيل للغناء العذرة لالقاء النحاسة فيها وفي الحديث ((مالكم لاتنظغون عذراتكم)) وفي الحديث ايضاً ((اليهود انتن خلق الله عزره)) الفائق (٢/ ٦٢)

❸ وفي الحديث ((ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم معذوراً)) قال في الفائق (٢/ ٦٣) اى مسروراً من قطعت سرته

❹ قاله جرير وصدرهٗ: غمزابن مرة يافرزدق كينها ۔ والبيت فى حل المعاجم (عذر كين ۔ نفع) وديوانه ٣٠٦ والاقتضاب ٣٤١ والاشتقاق ٥٣٩ والخزانة (١/ ٤٨١) وفى المطبوع نغانع (بالمهملة) مصحف

(۳۰۵) غَمْزَ الطَّبِيْبِ نِعَائِعِ الْمَعْذُوْرِ

جیسا کہ طبیب درد حلق میں مبتلا بچے کا گلا دباتا ہے۔

اور مُعْتَذِرٌ عذرخواہی کرنے والے کی مناسبت سے۔ اِعْتَذَرَتِ الْمِيَاهُ: پانی کے سرچشمے منقطع ہو گئے اور اِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ: مکانوں کے نشانات مٹ گئے۔ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں اور عَذِرَةٌ (یعنی نجات سے اعتبار) سے کہا جاتا ہے۔

اَلْعَاذِرَةُ وہ عورت جسے استحاضہ کا خون آرہا ہو۔ عَذُوَّرٌ: بدخلق آدمی۔ دراصل عَذِرَةٌ کے معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہے اسکے بعد اس نجاست کو عَذِرَة کہنے لگے ہیں جو اس میدان میں پھینکی جاتی ہے۔

(ع ر ر)

اَلْمُعْتَرُّ: وہ ہے جو کچھ لینے کے لیے تمھارے سامنے آئے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَطْعِمُوْا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

عَرَّهُ يَعُرُّهُ کے معنی ہیں: بخشش طلب کرنے کے لیے کسی کے سامنے آنا۔

اِعْتَرَرْتُ بِكَ حَاجَتِيْ: میں نے اپنی ضرورت تمہارے سامنے پیش کی۔ اَلْعَرُّ وَالْعُرُّ: خارش کی بیماری کو کہتے ہیں جو بدن کو عارض ہو جاتی ہے اس مناسبت سے مَعَرَّةٌ کا لفظ ہر قسم کی مضرت پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۴۸۔۲۶) مبادا انہیں ان کی طرف سے بے خبری میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔

اَلْعِرَارُ: اس سنسناہٹ کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر تشبیہاً نر شتر مرغ کی آواز کو بھی عِرارٌ کہا جاتا ہے۔ عَارَّ الظَّلِيْمُ: شتر مرغ نے آواز کی۔ اَلْعَرْعَرُ (شمشاد کی قسم کا) ایک درخت جو ہوا کے چلنے سے گونجتا ہے۔ عَرْعَارِ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل (جس میں وہ یہ کلمہ بولتے ہیں تا کہ دوسرے بچے اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر نکل آئیں۔)

(ع ر ب)

اَلْعَرَبُ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں

اَلْاَعْرَابُ: دراصل یہ عَرَبٌ کی جمع ہے مگر یہ لفظ بادیہ نشین لوگوں کے ساتھ مختص ہو چکا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا﴾ (۴۹۔۱۴) بادیہ نشین نے آکر کہا: ہم ایمان لے آئے۔

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں۔

﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (۹۔۹۹) اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اَعْرَابٌ کی جمع اَعَارِيْبُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔[1] (الوافر)

(۳۰۶) اَعَارِيْبُ ذَوُوْ فَخْرٍ بِاُفُكٍ
وَاَلْسِنَةٍ لِطَافٍ فِى الْمَقَالِ

اعرابی جو جھوٹے فخر کے مدعی ہیں اور گفتگو میں نرم زبان

[1] البیت فی الحماسة مع آخر بغیر عزو راجع المرزوقی ۶۴۸

رکھتے ہیں۔

اَلْاَعْرَابِیُّ: یہ اَعْرَابٌ کا مفرد ہے اور عرف میں بادیہ نشین پر بولا جاتا ہے اَلْعَرَبِیُّ: فصیح وضاحت سے بیان کرنے والا۔ اَلْاِعْرَابُ: کسی بات کو واضح کر دیا۔ اَعْرَبَ عَنْ نَفْسِہٖ: اس نے اپنی بات کو وضاحت سے بیان کر دیا حدیث میں ہے۔ ❶ (۳۵) ((اَلثَّیِّبُ تُعْرِبُ عَنْ نَفْسِھَا)) کہ ثیب اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر سکتی ہے۔ اِعْرَابُ الْکَلَامِ کلام کی فصاحت کو واضح کرنا۔ علمائے نحو کی اصطلاح میں اِعْرَابٌ کا لفظ ان حرکات وسکنات پر بولا جاتا ہے جو کلموں کے آخر میں یکے بعد دیگرے (حسب عوامل) بدلتے رہتے ہیں۔ اَلْعَرَبِیُّ: واضح اور فصیح کلام کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا﴾ (۱۲۔۲) واضح اور فصیح قرآن (نازل کیا) ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ﴾ (۲۶۔۱۹۵) فصیح عربی زبان میں..........۔

﴿فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا﴾ (۴۱۔۳) جس کی آیات کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ یعنی واضح قرآن۔

مَابِالدَّارِ عَرِیْبٌ: گھر میں کوئی نہیں ہے اِمْرَءَۃٌ عَرُوْبَۃٌ: وہ عورت جو اپنے خاوند سے محبت اور پاک بازی کو ظاہر کرنے والی ہو۔ اس کی جمع عُرُوْبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عُرُبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۶۔۳۸) (اور شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔

اور عَرَّبْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی کو اس کی غلطی بتانے کے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے (۳۶) عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ: (امام قرأت میں غلطی کرے تو اسے بتادو) اَلْمُعْرِبُ: عربی گھوڑے کا مالک، جیسا کہ خارش زدہ کو مُجْرِبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿حُکْمًا عَرَبِیًّا﴾ (۱۳۔۳۷) کے معنی واضح اور فصیح کتاب کے ہیں جو حق کو ثابت اور باطل کو غلط ثابت کر دکھائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کریم اور بلند مرتبہ کے ہیں اور یہ عُرُبًا اَتْرَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو کہ کِتَابٌ کَرِیْمٌ کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَرَبِیًّا بمعنی مُعْرِبٌ ہے اور یہ عَرِّبُوْا عَلَی الْاِمَامِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں پہلی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عربی نبی کی طرف منسوب ہے اور عَرَبِیٌّ کی طرف نسبت کے وقت بھی عَرَبِیٌّ ہی کہا جائے گا یعنی تلفظ میں منسوب اور منسوب الیہ ایک ہی ہیں۔ یَعْرُبُ اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے سریانی زبان کو عربی میں منتقل کیا اس لیے اس کا نام ہی یعرب مشہور ہو گیا۔

(ع ر ج)

اَلْعُرُوْجُ کے معنی اوپر چڑھنا کے ہیں ❷ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ﴾ (۷۰۔۴) جس

---

❶ انظر للحدیث الفائق (۲/۶۵) تخفیف الراء وتشدید ھا راجع غریب ابی عبید (۱: ۱۶۲۔۱۶۳) وفی (حہ) فی النکاح والحاکم (۴/۱۹۲)

❷ قد ذکرہ ابو الطیب الحلبی فی الاضداد (۲: ۴۹۸۔۴۹۹)

کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔

﴿فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ﴾ (۱۵۔۱۴) اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں۔

اور مَعَارِجُ کے معنی سیڑھیوں کے ہیں اس کا مفرد مَعْرَجٌ (اورمعراج) ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰۔۳) سیڑھیوں والے خدا کی طرف سے (نازل ہوگا۔)

اورشب معراج کو بھی لَيْلَةُ الْمِعْرَاجِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵۔۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔

میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

عَرَجَ عُرُوْجًا وَعَرَجَانًا: (ہموار زمین پر) ایسے چلنا جیسے کوئی شخص سیڑھیاں چڑھ رہا ہو جیسا کہ دَرَجَ کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دَرَجٌ یعنی سیڑھی پر چڑھنے والے کی طرح چلے۔ عَرِجَ (س) مستقل طور پر لنگڑا ہونا اور ضَبُعٌ (گفتار) کو عَرْجَاءُ کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ خِلْقَةً لنگڑا ہوتا ہے اور تَعَارَجَ کے معنی بتکلف لنگڑا کر چلنے کے ہیں جیسا کہ تَضَالَعَ کے معنی بتکلف سیری ظاہر کرنا کے ہوتے ہیں اسی سے استعارتًا شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۳۲۷) عَرِّجْ قَلِيْلاً عَنْ مَدَى غَلْوَائِكُمَا

اَلْعَرَجُ: اونٹوں کا بڑا گلہ گویا وہ اپنی کثرت کے اعتبار سے اوپر چڑھ چکا ہے۔

(ع ر ج ن)

اَلْعُرْجُوْنُ: کھجور کے خوشے کی ڈنڈی جو خشک ہوکر خمیدہ ہو جاتی ہے۔[2] قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ (۳۶۔۳۹) یہاں تک کہ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔

(ع ر ش)

اَلْعَرْشُ: اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں اس کی جمع عُرُوْشٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ (۲۔۲۵۹) اور اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گرے پڑے تھے۔

اسی سے عَرَشْتُ (ن) اَلْكَرْمَ وَعَرَّشْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگور کی بیلوں کے لیے بانس وغیرہ کی ٹٹیاں بنانا کے ہیں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیل کو مُعَرَّشٌ بھی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَعْرُوْشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوْشَاتٍ﴾ (۶۔۱۴۱) ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے ہوئے۔

---

[1] قاله ابراهيم بن العباس الصولي وصدره : اباجعفر خف بنوة بعدصولةٍ وفي روايةٍ قصر بدل عرج والبيت في الشعراء ٢٤ والصداقة٣٥ والاغاني (٩/ ٢١) والادباء (١ : ٢٢٤) ونزهة الجليس (٢ : ٢٦٧) والوفيات (٢ : ٥٦) والطرائف ١٦١ شعر ابراهيم رقم ١٢٤ والعقد(٢ : ٣٥٦) وفيه البيت : اباجعفر عرج على خلطائكا واقصر قليلاًعن مدى غلوائكا والمحاضرات للمؤلف (١٧٥) وفيه دولة بعد صولة وابن عبر نسبه الى على بن الجهم انه كتب الى ابن الزيادوفي رواية العيون (١ /٢٧٣) والعقدالفريد اباجعفر عرج على خلطائكا ۔واقصر قليلامن مدعى غلوائكا

[2] فنونه اصلية و وزنه فعول كذافي القاموس قال الزجاج وزنه فعلون ونونه زائدة راجع الروح (٢٣/ ٢٠)

﴿وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ﴾ (۱۶۔۶۸) اور درختوں میں اور ان سے جنہیں ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں۔
﴿وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۷) جو ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔
ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یَعْرِشُوْنَ کے معنی یَبْنُوْنَ ہیں یعنی جو وہ عمارتیں بناتے تھے ❶ اِعْتَرَشَ الْعِنَبَ: انگور کی بیل کے لیے بانس وغیرہ کی ٹٹی بنائی۔ اَلْعَرِيْشُ: چھولداری۔ جس کی ہیئت انگور کی ٹٹی سے ملتی جلتی ہے۔اسی سے عَرَّشْتُ الْبِئْرَ ہے جس کے معنی کنوئیں کے اوپر چھولداری سی بنانا کے ہیں۔بادشاہ کے تخت کو بھی اس کی بلندی کی وجہ سے عَرْش کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔
﴿اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِیْ بِعَرْشِهَا﴾ (۲۷۔۳۸) کوئی تم میں سے ایسا ہے..... کہ ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے۔
﴿نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ (۲۷۔۴۱) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔
﴿اَهٰكَذَا عَرْشُكِ﴾ (۲۷۔۴۱) کہ آپ کا تخت بھی اسی طرح کا ہے۔
اور بطور کنایہ عَرْش کا لفظ عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ثُلَّ عَرْشُهٗ: (یعنی فلاں کی عزت جاتی رہی) مروی ہے (۳۱۸) کہ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا کہ پروردگار نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اگر خدا اپنی رحمت سے میری دستگیری نہ کرتا "لَثُلَّ عَرْشِیْ" تو میں ذلیل ہو جاتا۔
اور عرش الٰہی سے صرف نام کی حد تک ہم واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں تو عرش باری تعالیٰ کا حامل قرار پائے گا نہ کہ محمول، حالانکہ ذات الٰہی اس سے بالاتر ہے (کہ کوئی چیز اسے اٹھائے) جیسا کہ خود قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ﴾ (۳۵۔۴۱) خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے۔
بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ عَرْش سے فَلَكُ الْاَعْلٰى (فلک الافلاک) اور كُرْسِی سے فلک الکواکب یعنی آٹھواں آسمان مراد ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ ❷ (۳۶) ((مَا السَّمٰوٰت السبع وَالْاَرْضُوْنَ السبع فی جنب الكرسی الا كحلقة ملقاة فِی اَرْضٍ فَلَاةٍ)) کہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی ہو اور یہی حیثیت عرش کے مقابلہ میں کرسی کی ہے۔اور آیت کریمہ۔
﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ﴾ (۱۱۔۷) اور (اس

---

❶ راجع مجازه (۱/۲۲۷)
❷ سياتی فی (كرسی) وهناك الموعد لتخريجه انشاء الله تعالىٰ

وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔
میں متنبہ کیا ہے کہ عرش جب سے وجود میں آیا ہے پانی کے اوپر ہی رہا ہے۔ اور آیات۔
﴿ذُوالْعَرْشِ الْمَجِيْدِ﴾ (۸۵۔۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا۔
﴿رَفِيْعُ الدَّرَجَاتِ ذُوالْعَرْشِ﴾ (۴۰۔۱۵) مالک درجات عالی اور صاحب عرش ہے۔ اور ان کے ہم معنی دیگر آیات میں بعض نے کہا ہے کہ ان سے حق تعالیٰ کی سلطنت اور حکومت کی طرف اشارہ ہے ورنہ ان کے یہ معنی نہیں ہے کہ عرش باری تعالیٰ کا ٹھکانا اور مسکن ہے۔

(ع ر ض)

اَلْعَرْضُ: (کسی چیز کی چوڑائی) یہ اَلطُّوْلِ کی ضد ہے اصل میں اس کا استعمال اجسام کے متعلق ہوتا ہے اس کے بعد غیر اجسام کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَذُوْدُعَاءٍ عَرِيْضٍ﴾ (۴۱۔۵۱) تو لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔
اور عَرْضٌ خاص کر ایک جانب اور کنارہ کو کہتے ہیں عَرَضَ الشَّیْءُ: اس کی ایک جانب ظاہر ہوگئی۔
عَرَضْتُ الْعُوْدَ عَلَی الْاِنَاءِ: برتن پر لکڑی کو چوڑی جانب سے رکھا۔
اِعْتَرَضَ الشَّیْءُ فِی حَلْقِهٖ: وہ چیز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اِعْتَرَضَ الْفَرْسُ فِی مَشْيِهٖ: گھوڑا اپنے سر اور سینے کو ایک جانب ٹیڑھا کر کے چلا۔ فِيْهِ عُرْضِيَّةٌ اس میں منہ زوری ہے۔
عَرَضْتُ الشَّیْءَ عَلَی الْبَيْعِ: میں نے اسے فروخت کے لیے پیش کیا۔ عَرَضْتُ الشَّیْءَ عَلٰی فُلَانٍ اَوْلِفُلَانٍ میں نے فلاں کے سامنے وہ چیز پیش کی۔ چنانچہ فرمایا۔
﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ (۲۔۳۱) پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔
﴿وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا﴾ (۱۸۔۴۸) اور سب تمہارے پروردگار کے سامنے صف باندھ کر لائے جائیں گے۔
﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ (۳۳۔۷۲) ہم نے (بار) امانت کو پیش کیا۔
﴿وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا﴾ (۱۸۔۱۰۰) اور اس روز جہنم کافروں کے سامنے لائیں گے۔
﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ﴾ (۴۶۔۲۰) اور جس روز کافر دوزخ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔
عَرَضْتُ الْجُنْدَ: لشکر کا جائزہ لیا۔
اَلْعَارِضُ: وہ چیز جو تمہارے سامنے آئے خاص طور پر بادل (جو افق پر پھیلا ہوا ہو) جیسے فرمایا۔
﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (۴۶۔۲۴) یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر رہے گا۔
نیز اَلْعَارِضُ کا لفظ عارضہ مرض پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے: بِهٖ عَارِضٌ مِّنَ الْمَرَضِ: اسے بیماری کا عارضہ ہے۔ اور کبھی بمعنی رخسار آجاتا ہے۔ جیسے اَخَذَ مِنْ عَارِضَيْهِ: (اس نے اس کے رخسار پکڑ لیے) اور کبھی بمعنی دانت، اسی سے ان دانتوں کو جو ہنستے وقت ظاہر

ہوتے ہیں اَلْعَوَارِضُ کہا جاتا ہے۔اور کنایہ کے طور پر عمدہ گواور فصیح شخص کو فُلَانٌ شَدِیْدُ الْعَارِضَۃ کہا جاتا ہے بَعِیْرٌ عَرُوْضٌ: اونٹ جو منہ میں دونوں طرف سے کانٹے چبا کر کھاتا ہو۔

اَلْعُرْضَۃُ: جو کسی چیز کے سامنے آکر آڑ بن جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ﴾ (۲۔۲۲۴) اور خدا کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ۔

بَعِیْرٌ عُرْضَۃٌ لِلسَّفَرِ: وہ اونٹ جو سفر کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اَعْرَضَ لِیْ کَذَا کسی چیز کا اس طرح سامنے آنا کہ اس کے پکڑنے پر قدرت ہو جائے۔ اَعْرَضَ عَنِّیْ: اس نے مجھ سے روگردانی کی، اعراض کیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْھَا﴾ (۳۲۔۲۲) تو وہ ان سے منہ پھیرے۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَعِظْھُمْ﴾ (۴۔۶۳) تم ان سے اعراض برتو اور نصیحت کرتے رہو۔

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ﴾ (۷۔۱۹۹) اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ﴾ (۲۰۔۱۲۴) اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا۔

﴿وَھُمْ عَنْ اٰیٰتِھَا مُعْرِضُوْنَ﴾ (۲۱۔۳۲) اس پر بھی وہ ہماری نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔

اور کبھی قرائن کی بنا پر اس کے بعد عَنْ کو حذف کر دیتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۲۴۔۴۸) ان میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۳۔۲۳) تو ایک فریق ان میں سے کج ادائی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ﴾ (۳۴۔۱۶) تو انہوں نے شکر گزاری سے منہ پھیر لیا۔پس ہم نے ان پر.........چھوڑ دیا۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (۳۔۱۳۲) اور بہشت ......جس کا عرض ارض وسماء کے برابر ہے۔کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلطُّوْلُ کی ضد ہے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ عالم آخرت میں جنت کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنی کہ اس عالم میں آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے کیونکہ عالم آخرت کی صفت میں تو قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (۱۴۔۴۸) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان۔

اور یہ عین ممکن ہے کہ عالم آخرت کے ارض وسماء اس دنیا کے ارض وسماء سے وسیع اور کشادہ ہوں چنانچہ مروی ہے۔

(۳۸) ((اِنَّ یَھُوْدِیًّا سَأَلَ عُمَرَ عَنْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ فَقَالَ فَاَیْنَ النَّارُ؟ فقال عمرؓ: اذا جاء الَّیْلُ فَاَیْنَ النَّھَارُ)) کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا اور کہا (کہ اگر جنت ہی اتنی وسیع ہوگی) تو دوزخ کس جگہ پر ہوگی؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً پوچھا ''جب رات آجاتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے۔'' اور بعض نے کہا ہے: عرض سے مراد وسعت

ہے اور یہ وسعت پیائش کے اعتبار سے مراد نہیں ہے بلکہ مسرت اور خوشی کے اعتبار سے ہے جس طرح کہ اس کے برعکس دنیا کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اَلدُّنْیَا عَلٰی فُلَانٍ حَلْقَةُ خَاتَمٍ وَکَفَّةُ حَابِلٍ (کہ فلاں پر تو دنیا انگشتری کے حلقہ اور شکاری کے پھندے کی طرح تنگ ہوگئی ہے اسی طرح ایک اور محاورہ ہے۔

سَعَةُ هٰذِهِ الدَّارِ کَسَعَةِ الْاَرْضِ: (کہ اس گھر کی وسعت روئے زمین کی وسعت کے برابر ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْضٌ کا لفظ اَلْعَرَضُ لِلْبَیْعِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے چنانچہ جب کوئی چیز کسی قسم کے سامان کے عوض بیچ دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے: بِیْعَ کَذَا (کہ یہ چیز اتنے) سامان کے عوض فروخت کی گئی۔ لہٰذا آیت میں بھی عَرْضُهَا کے معنی عوض اور بدلہ کے ہیں جیسے محاورہ ہے۔ عَرْضُ هٰذَا الثَّوْبِ کَذَا وَکَذَا (کہ اس کپڑے کی قمت اتنی اور اتنی ہے)۔

اَلْعَرَضُ: ہر وہ چیز جسے ثبات نہ ہو۔ [2] اسی اعتبار سے علمائے کلام کی اصطلاح میں اَلْعَرَض کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو جَوْهَرٌ کے بغیر قائم نہ رہ سکے۔ جیسے رنگ ذائقہ وغیرہ اور دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اَلدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ (کہ دنیا تو پیش افتادہ ساز و سامان کا نام ہے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ (۸۔۶۷) تم لوگ پیش افتادہ ساز و سامان کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔

﴿یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی﴾ (۷۔۱۶۹) اس دنیا کی مال و دولت لیتے ہیں۔

﴿وَاِنْ یَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۷۔۱۶۹) اگر ان کے سامنے (بھی) ویسا ہی مال آجاتا......اور آیت کریمہ۔

﴿لَوْ کَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا﴾ (۹۔۴۲) کے معنی یہ ہیں اگر کوئی فائدہ آسانی سے حاصل ہونے کی توقع ہوتی۔

اَلتَّعْرِیْضُ: پہلو دار بات کرنا جو سچ جھوٹ اور ظاہر و باطن دونوں معنی پر محمول ہوسکتی ہو۔ اور آیت۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ (۲۔۲۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو......تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ نکاح کے پیغام میں تعریض کی صورت یہ ہے کہ عورت سے مثلاً کہا جائے تم بہت خوبصورت ہو پسندیدہ نظر ہو وغیرہ۔

(ع ر ف)

اَلْمَعْرِفَةُ وَالْعِرْفَانُ کے معنی ہیں: کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر کرکے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ علم سے اخص یعنی کم درجہ رکھتا ہے اور یہ اَلْاِنْکَار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یہی وجہ ہے فُلَانٌ یَعْرِفُ اللّٰهَ تو کہا جاتا ہے مگر تعدیہ بیک مفعول کی صورت میں فُلَانٌ یَعْلَمُ اللّٰهَ استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذات الٰہی کا علم حاصل

---

[1] رواه ابن جرير بثلاثة طرف وفيه ان ناس من اليهود وفي مسند احمد روى مرفوعاً وايضاً في ابن جرير وايضاً اجاب به ابن عباس وفي مسند البزار مرفوعاً عن ابن جرير (ابن جرير)

[2] قال ابو عبيدة يقال جمع متاع الدنيا عرض بفتح الراء واما العرض بسكون الراء فهو ماسوى الدنانير والدراهم راجع الجمل لابن فارس (ماخوذ من فتح القدير للشوكاني ۱/ ۵۰۱)

نہیں کر سکتا البتہ کائنات اور آثار قدرت پر غور وفکر کر کے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسی طرح اللہ یَعْرِفُ کَذَا نہیں کہتے کیونکہ مَعْرِفَۃ کا درجہ علم سے کم تر ہوتا ہے اور لفظ معرفت اس ادراک پر بولا جاتا ہے جو غور وفکر کے بعد حاصل ہوتا ہے جس سے ذات باری تعالیٰ بلند وبرتر ہے۔ دراصل معرفت کا لفظ عَرَفْتُ کَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اس کی بو پالی اور یا اَصَبْتُ عَرْفَہٗ: (میں نے اس کے رخسار پر مارا) سے یہ لفظ پہچاننے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ﴾ (۲۔۸۹) پھر جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہوگئے۔

﴿فَعَرَفَھُمْ وَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ﴾ (۱۲۔۵۸) تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

﴿فَلَعَرَفْتَھُمْ بِسِیْمٰھُمْ﴾ (۴۷۔۳۰) اور تم ان کے چہروں سے ہی پہچان لیتے۔

﴿یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ﴾ (۲۔۱۴۶) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں۔

مَعْرِفَۃ کے مقابلہ میں اِنْکَارٌ اور عِلْمٌ کے مقابلہ میں لفظ جَھَالَۃٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا﴾ (۱۶۔۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں مگر (واقف ہو کر) ان سے انکار کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ (یعنی صوفیہ کرام) کی اصطلاح میں عَارِفٌ کا لفظ خاص کر اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے عالم ملکوت اور ذات الٰہی اور اس کے ساتھ حسن معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔ عَرَّفَہٗ کَذَا: فلاں نے اسے اس چیز کا تعارف کروادیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ﴾ (۶۶۔۳) تو پیغمبر علیہ السلام نے کچھ بات تو بتادی اور کچھ نہ بتائی۔

تَعَارَفُوْا: انہوں نے باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِتَعَارَفُوْا﴾ (۴۹۔۱۳) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

﴿یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ﴾ (۱۰۔۴۵) آپس میں ایک دوسرے کو پہچان بھی لیں گے۔

عَرَّفَہٗ کسی چیز کو خوشبودار کر دیا، معطر بنادیا۔ چنانچہ جنت کے بارے میں ﴿عَرَّفَھَا لَھُمْ﴾ (۴۷۔۶) فرمایا ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے اور ان کے لیے آراستہ کر رکھا ہے اور بعض نے اس کے معنی توصیف کرنا، شوق دلانا اور اس کی طرف رہنمائی کرنا بھی بیان کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفٰتٍ﴾ (۲۔۱۹۸) جب تم میدان عرفات سے واپس ہونے لگو۔

میں ''عرفات'' سے میدان عرفات مراد ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میدان میں آدم علیہ السلام اور حوا کا باہم (دنیا میں پہلی دفعہ) تعارف ہوا تھا اس لیے عرفات کہا جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میدان میں دعا اور عبادت کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل

کرتے ہیں اس لیے اسے عرفات کہا جاتا ہے۔
اَلْمَعْرُوْفُ: ہراس قول یا فعل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے ثابت ہو اور مُنْکَرٌ ہر اس بات کو کہا جائے گا جو عقل و شریعت کی رو سے بری سمجھی جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (۳۔۱۱۴) اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے۔
﴿وَقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوْفًا﴾ (۳۳۔۳۲) اور دستور کے مطابق ان سے بات کیا کرو۔
یہی وجہ ہے کہ جُوْدٌ (سخاوت) میں اعتدال اختیار کرنے کو بھی مَعْرُوْفٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اعتدال عقل و شریعت کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمَنْ کَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْکُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۴۔۶) اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر یعنی بقدر خدمت کچھ لے لے۔
﴿اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْمَعْرُوْفٍ﴾ (۴۔۱۱۴) ہاں (اس شخص کی مشاورت اچھی ہوسکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات...... کہے۔
﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۴۱) اور مطلقہ کو بھی دستور کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہیے۔
یعنی اعتدال اور احسان کے ساتھ نیز فرمایا۔
﴿فَاَمْسِکُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ تو یا تو ان کو اچھی طرح سے زوجیت میں رہنے دو یا اچھی طرح سے علیحدہ کردو۔
﴿قَوْلٌ مَعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ (۲۔۱۳۔۲) نرم بات اور درگزر کرنا صدقہ سے بہتر ہے۔
یعنی نرم جواب دے کر لوٹا دینا اور فقیر کے لیے دعا کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس پر احسان جتلایا جائے۔
اَلْعُرْفُ: وہ نیک بات جس کی اچھائی کو سب تسلیم کرتے ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ (۷۔۱۹۹) اور نیک کام کرنے کا حکم دو۔
عُرْفُ الْفَرَسِ: گھوڑے کی ایال۔ عُرْفُ الدِّیْكِ: مرغ کی کلغی جَاءَ الْقَطَاعُرْفًا: قطا جانور آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آئے اسی سے قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَالْمُرْسَلاَتِ عُرْفًا﴾ (۷۷۔۱) ہواؤں کی قسم جو متواتر چلتی ہیں۔
اَلْعَرَّافُ: یہ کَاهِنٌ کے ہم معنی ہے مگر عَرَّافٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی باتوں کی خبر دے اور کَاهِنٌ اسے کہتے ہیں جو گذشتہ واقعات کے متعلق اطلاع دے اَلْعَرِیْفُ اسے کہتے ہیں جو لوگوں کو جانتا پہچانتا اور انکا تعارف کراتا ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الکامل)

(۳۰۸) بَعَثُوْا اِلَیَّ عَرِیْفَهُمْ یَتَوَسَّمُ
وہ میرے پاس اپنا عریف بھیجیں گے جو پہچان کرلے گا۔

---

[1] اولہ : او کلما وردت عکاظ قبیله ...... والبیت فی اللسان والمحکم والتاج (عرف) ونسبه الی طریف بن مالك العنبری وقیل طریف بن عمرو کمافی الاقتضاب ٤٦٣ والاشباه (٤ : ١٠١) والبحر (٥/ ٤٦٣) والکتاب (٢/ ٢١٥) والشنتمری وعزاه لطریف بن تمیم العنبری

اور عَـرُفَ فُلَانٌ عَرَافَةً کے معنی عریف بننے کے ہیں اس لیے عَرِیْفٌ مشہور سردار کو کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے۔❶ (البسیط)

(۳۰۹) بَلْ کُلُّ قَوْمٍ وَاِنْ عَزُّوْا وَاِنْ کَثُرُوْا
عَرِیْفُهُمْ بِاَثَافِی الشَّرِّ مَرْجُوْمُ

ہر قوم خواہ کتنی ہی باعزت اور تعداد میں زیادہ کیوں نہ ہو مگر ان کے سردار بھی شرور زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

یَوْمُ عَرَفَةَ: جس روز حجاج میدان عرفہ میں وقوف کرتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَـى الْاَعْـرَافِ رِجَـالٌ﴾ (۷۔۴۶) اور اعراف پر کچھ آدمی ہوں گے۔

میں اَلْاَعْـــرَافُ: سے وہ دیوار مراد ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہے۔

اَلْاِعْتِرَافُ (افتعال) کے معنی اقرار کے ہیں اصل میں اس کے معنی گناہ کا اعتراف کرنے کے ہیں۔اس کی ضد جُحُوْدٌ یعنی انکار کرنا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْبِهِمْ﴾ (۶۷۔۱۱) پس وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے۔

﴿فَـاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا﴾ (۴۰۔۱۱) ہم کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔

(ع ر م)

اَلْـــعَـرَامَةُ کے معنی مزاج کی تندی اور درشتی کے ہیں۔ جس کا اثر انسان کے عمل پر ظاہر ہو، کہا جاتا ہے: عَـــرَمَ فُــلَانٌ فلاں سخت مزاج ہوگیا چنانچہ ایسے شخص کو عَارِمٌ کہا جاتا ہے۔

اسی سے عُرَامُ الْجَیْشِ ہے،جس کے معنی لشکر کی تندی و تیزی اور کثرت کے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ﴾ (۳۴۔۱۶) کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم نے ان پر سخت سیلاب بھیجا اور بعض نے اَلْـعَـرِمِ کے معنی بند کیئے ہیں اور بعض نے اَلْـعَرِمِ سے جنگلی چوہا مراد لیا ہے اور اس سیلاب کو اس کی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ چوہوں نے اس بند میں نقاب ڈالے تھے اور وہ بند ٹوٹ گیا تھا۔

(ع ر و ی)

عَـرِیَ مِنْ ثَوْبِهٖ یَعْرٰی: ننگا ہونا چنانچہ، برہنہ اور ننگے شخص کو عَـارٍ وَعُـرْیَانٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی﴾ (۲۰۔۱۱۸) یہاں تم نہ بھوکے رہوگے اور نہ ننگے۔

هُوَ عَرُوٌّ مِنَ الذَّنْبِ: وہ گناہ سے عاری ہے۔ اَخَذَهٗ عُـــرَوَاءُ: برہنگی کی وجہ سے اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔اور انسان کے ان اعضاء کو جو عام طور پر ننگے رہتے ہیں۔جیسے چہرہ ہاتھ اور پاؤں کو اَلْـمَـعَـارِیْ کہا جاتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔ فُـلَانٌ حَسَنُ الْمَعْرٰی: فلاں کے ننگے

---

❶ قـالـه عـلـقـمـه بـن عبدة الفحل وفي اللسان (عرف) كل حي بدل كل قومٌ وان كرموای بدل ان كثروا والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۱۹۷) وفي منتهى الطلب (۱/۲۷۔۲۹) والشعراء (۴۹۸۔۲۰۵) ومختار الشعراء الجاهلي (۱: ۳۲۷) وديوانه ۱۲۹ والصناعتين ۳۰۰ والحيوان (۷: ۱۴۹) والمحاضرات للمؤلف (۴/۴۹) وفي رواية وكل قوم بدل كل قوم وكرموا بدل كثروا ذكرهٔ العسكري في امثله روى الاستعارة

اعضاء خوبصورت ہیں۔جیسا کہ حَسَنُ الْمَحْسَرِ والْمُجَرَّدِ: کا محاورہ ہے اَلْعَرَاءُ: کھلی جگہ، جہاں کوئی چیز آڑ کے لیے نہ ہو جیسے فرمایا۔

﴿فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ﴾ (۳۷۔۱۴۵) پھر ہم نے اسے جبکہ وہ بیمار تھے کھلے میدان میں ڈال دیا۔

اَلْعَرٰی: (اسم مقصور) کنارہ اور جانب کو کہتے ہیں اور عَرَاهُ واعْتَرَاهُ: اس کے سامنے آیا، اس کی جانب قصد کیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ﴾ (۱۱۔۵۴) کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر مصیبت ڈال دی ہے۔

اَلْعُرْوَةُ: ہر وہ چیز جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے اور آیت کریمہ۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (۲۔۲۵۶) تو اس نے مضبوط حلقہ ہاتھ میں پکڑا۔

میں (ایمان باللہ کو) بطور تمثیل کے ''مضبوط حلقہ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔نیز عُرْوَة یا عَلْقَه ایک قسم (کی) خاردار جھاڑی یا پیلو کی قسم کے درخت کو بھی کہتے ہیں جو اونٹوں کے لیے آخری سہارا ہوتا ہے۔ اَلْعَرِیُّ وَالْعَرِيَّةُ: سرد ہوا جو انسان کو لگ جاتی ہے۔نیز اَلْعَرِيَّةُ کھجور کا وہ درخت جو بیع سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔بعض کہتے ہیں کہ عَرِيَّةٌ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھل اس کے مالک نے کسی محتاج کو ہبہ کر دیا ہو، شرعاً اس درخت کے پھل کو خشک کھجوروں کے عوض بیچنا جائز ہے بعض کہتے ہیں کہ عَرِيَّة کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی آدمی کے باغ میں دوسرے کی ملکیت ہو اور اس کے آنے جانے سے باغ کے مالک کو تکلیف ہوتی ہو تو شریعت نے خشک کھجوروں کے عوض اس کا پھل خریدنے کی اجازت دی ہے۔اس کی جمع عَرَايَا ہے اور آنحضرت ﷺ نے بیع عَرَايَا کی رخصت دی ہے۔[1] (۳۹)

(ع ز ز)

اَلْعِزَّةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔یہ اَرْضٌ عَزَازٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں۔ تَعَزَّزَ اللَّحْمُ: گوشت سخت ہو گیا اور گتھ گیا گویا وہ سخت زمین میں پڑا ہے جس تک رسائی مشکل ہے۔جیسا کہ تَظَلَّفَ کے معنی ظَلِفٌ یعنی سخت زمین میں چلے جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا﴾ (۴۔۱۳۹) کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔عزت تو سب خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۶۳۔۸) حالانکہ عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول ﷺ کی اور مومنوں کی۔

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ......﴾ (۳۷۔۱۸۰) تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے اس سے پاک ہے۔

اَلْعِزَّةُ: کبھی باعث مدح ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی باعث مذمت جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا۔

﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ﴾ (۳۸۔۲)

---

[1] والحديث اختلاف الفاظه ايضاً في الموطا (۲/۱۲۵) والرسالة للشافعي رقم (۹۰۹) وتحته التخريج لاحمد شاكر مصري واختلاف الحديث ۲۱۹ واصحاب الكتب الستة راجع ذخائر المواريث رقم (۱۹۶۱)

مگر جو کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عزت اللہ، رسول اور مسلمانوں کو حاصل ہے وہ دائماً باقی رہنے والی ہے اور یہی عزت حقیقی ہے مگر کفار کو عزت حقیقی حاصل نہیں ہے بلکہ وہ بتکلف اپنے آپ کو قوی اور غالب ظاہر کررہے ہیں جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ (۴۰) جو عزت اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ ہو وہ سراسر ذلت ہے۔اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا﴾ (۱۹۔۸۱) یعنی اللہ کے سوا انھوں نے معبود بنا رکھے ہیں کہ ان کے ذریعہ عذاب سے محفوظ رہ سکیں اور آیت کریمہ۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا﴾ (۳۵۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص معزز بننا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عزت حاصل کرے کیونکہ ہر قسم کی عزت خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے کبھی عزت کا لفظ حمیت اور غلط خودداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (۲۔۲۰۶) تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔میں عزت کے معنی حمیت کے ہیں۔

اَلْعَزِيْزُ: وہ ہے جو غالب ہو اور مغلوب نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (۲۹۔۲۶) بے شک وہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ﴾ (۱۲۔۸۸) اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

اَعَزَّهٗ: (افعال) کے معنی کسی کو عزت بخشنے کے ہیں)۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶) جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کردے۔

عَزَّ عَلَیَّ كَذَا مجھ پر یہ بات نہایت ہی گراں گذری۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹۔۱۲۸) تمہاری تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے۔

اور عَزَّهٗ كَذَا: کے معنی ہیں: فلاں اس پر غالب آگیا چنانچہ مثل مشہور ہے۔ مَنْ عَزَّبَزَّ: (جس کی لاٹھی اسی کی بھینس) قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ﴾ (۳۸۔۲۳) اور گفتگو میں مجھ پر غالب آگیا ہے۔

بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ گفتگو اور جھگڑا کرنے میں مجھ سے زیادہ باعزت بن بیٹھا ہے۔

عَزَّ الْمَطَرُ الْاَرْضَ: بارش زمین پر غالب آگئی۔

عَزَّ الشَّیْءُ: کسی چیز کا نادر اور کمیاب ہونا۔چنانچہ اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔

كُلُّ مَوْجُوْدٍ مَمْلُوْلٌ وَكُلُّ مَفْقُوْدٍ مَطْلُوْبٌ

کہ ہر موجود چیز سے انسان اکتا جاتا ہے اور ہر نایاب چیز کی تلاش کی جاتی ہے۔ شَاةٌ عَزُوْزٌ: بکری کا دودھ کم ہو گیا اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ﴾ (۴۱۔۴۱) یہ تو ایک عالی رتبہ

کتاب ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اس جیسی کتاب کا کہیں سے حاصل کرنا اور پایا جانا نہایت دشوار ہے۔
اَلْعُزّٰی: ایک بت کا نام ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَفَرَئَیْتُمُ اللّٰتَ الْعُزّٰی﴾ (۵۳۔۱۹) بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔
وَاسْتُعِزَّ بِفُلَانٍ: فلاں مرض یا موت سے مغلوب ہوگیا۔

(ع ز ب)

اَلْعَارِبُ: وہ آدمی جو گھاس کی تلاش میں اپنے اہل وعیال سے دور نکل جائے۔ عَزَبَ یَعْزِبُ وَیَعْزُبُ (ض ن) دور نکل جانا، پوشیدہ ہوجانا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّۃٍ﴾ (۱۰۔۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔
﴿لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔
رَجُلٌ عَزَبٌ: کنوارا، بے زن مرد۔
عَزَبَ عَنْهُ حِلْمُهٗ: اس کی عقل جاتی رہی۔
عَزَبَ طُهُوْرُهَا: اس کا خاوند غائب ہوگیا۔
قَوْمٌ مُعَزِّبُوْنَ: وہ لوگ جن کے اونٹ چرنے کے لیے دور نکل گئے ہوں۔
ایک حدیث میں ہے۔[1] (۴۱) ((مَنْ قَرَءَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا فَقَدْ عَزَبَ)) کہ جس نے چالیس دن میں قرآن پاک ختم کیا اس نے بہت دیر کی۔

(ع ز ر)

اَلتَّعْزِیْرُ: اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم کے ساتھ ہو قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَتُعَزِّرُوْهُ﴾ (۴۸۔۹) اور اس کی مدد کرو۔
﴿وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ (۵۔۱۲) اور ان کی مدد کرو گے۔
اَلتَّعْزِیْرُ: (ایضًا) کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا یہ بھی دراصل پہلے معنی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کیونکہ تادیبی سزا بھی درحقیقت اس شخص کی اصلاح کے لیے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ پہلے معنی کا تعلق کسی مضر چیز کو روکنے سے ہوتا ہے اور تادیب میں کسی شخص کو مضر چیز سے روکا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کو مضر چیز سے روک دینا بھی اس کی مدد میں شامل ہے۔[2]
اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔[3] (۱۴۳)
((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کے ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد

---

[1] قال فی الفائق (۲: ۷۳) ومعناه فقد ابعد العهد با و له وابطأ فی تلاوته والحدیث فی الترمذی عن ابن عمر و وابن عمرو لفظه ((اقرا القرآن فی اربعین)) انظر کنز العمال ج (۱ رقم ۲۷۷٤ و ۲۸۱۸)

[2] ذهب ابوا لطیب فی اضداده (۵۰۹) انه من الاضداد ویاتی بمعنی التعظیم والتعذیب عن الفراء انه یاتی بمعنی التعلیم ومنه قول سعد بن ابی وقاص ثم هولاء اهل الکوفة یعز روننی اللسان (عزر) والنهایة ۳/ ۱۰٤

[3] متفق علیه من حدیث انس وذکره ابن حبان فی زوائده ۸٤۷ من حدیث ابن عمرو الدارمی وابن عساکر عن جابر والمستدرک والترمذی عن انس (راجع الفتح الکبیر للنبهانی (۱/ ۲۸۰۔۲۸۱)

کرنے کے کیا معنی ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسے ظلم سے روک کر۔ آیت کریمہ۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۰) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیز علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ میں عزیر علیہ السلام ایک پیغمبر کا نام ہے۔

(ع ز ل)

اَلْاِعْتِزَالُ کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہو جانا عام اس سے کہ وہ چیز کوئی پیشہ ہو یا کوئی بات وغیرہ ہو جس سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جائے نیز وہ علیحدگی بذریعہ بدن کے ہو یا بذریعہ دل کے دونوں قسم کی علیحدگی پر بولا جاتا ہے۔ عَزَلْتُهٗ وَاعْتَزَلْتُهٗ وَتَعَزَّلْتُهٗ میں نے اس کو علیحدہ کیا فَاعْتَزَلَ چنانچہ وہ علیحدہ ہو گیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۱۸۔۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کر لیا۔

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ﴾ (۴۔۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

﴿وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۱۹۔۴۸) اور میں تم سے اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔

﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ﴾ (۲۔۲۲۲) سو...... عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ شاعر نے کہا۔[1] (الکامل)

(۳۱۰) یَـابَیْتَ عَاتِكَةَ الَّتِي اَتَعَزَّلُ اى بيت عاتکہ جس میں کنارہ کش رہتا ہوں۔ اور آیت کریمہ۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶۔۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات سے) الگ کر دیے گئے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ گو اس سے پہلے شیاطین آسمان سے باتیں سن لیا کرتے تھے مگر اب انہیں سننے سے روک دیا گیا ہے۔

اَلْاَعْزَلُ (۱) غیر مسلح (۲) چوپایہ جس کی دم ایک جانب جھکی ہوئی ہو (۳) بادل بغیر بارش کے۔

اَلسِّمَاكُ الْاَعْزَلُ ستارہ جو اکیلا طلوع کرتا ہے جیسا کہ غیر مسلح شخص ہوتا ہے مگر اس کے بالمقابل اَلسِّمَاكُ الْاَعْزَلُ ستارہ جو اکیلا طلوع کرتا ہے جیسا کہ غیر مسلح شخص ہوتا ہے مگر اس کے بالمقابل اَلسِّمَاكُ الرَّامِحُ اس ستارہ کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ دوسرا ستارہ ہوتا ہے جو اس کے لیے بمنزلہ نیزہ کے ہے۔

---

[1] قاله الاحوص بن محمد بن عاصم بن ابى الفلح حمى الدبر الانصارى فى قصيده له يمدح فيها عمر بن عبدالعزيز وتمامه خدر العدى وبه الفواد موكل وفى المطبوع بنت علكمه محرفو فى اللسان والمحكم وعزل اتعزل بدل اتغزل والروايتين لهما محمل والبيت فى الاغانى (۱۸/۱۹۶) اللالى مع السمط ۲۵۹ والخزاز (۱ : ۲۴۸) والثمار ۲۵۳ والوفيات (۱ : ۱۸۵) وكنايات الجرجانى ۸۳ والشنتمرى (۱ : ۱۹) والعقد الفريد (۴ : ۳۶۳) والعيون (۱ : ۵۱) والمرزوقى (۳۵۹) واختلف فى عاتكة هذا اشيع الكلام عليه الاستاذ الميمنى فى السمط واجادو القصه فى المعارف ۱۷۸ ويتعلق بالبيت قصة المعدل مع المنصور راجع المعاهد والبيت تمثل به ابن المقفع وقد مر بيت نار للمجوس فحر مقتله راجع الامالى للمرتضى (۱۰ : ۱۳۵) ومحاضرات الادباء (۳ : ۷۲) والخزانه (۱ : ۲۴۸/۳ : ۴۵۹ والحصرى (۱ : ۲۴۶) وانشده ايضا يحى بن خالد كمافى الثمار (۲۵۳) وابو العلاء وماليه ۱۵۳ـ۱۵۴)

(ع ز م)

اَلْعَزْمُ وَالْعَزِیْمَۃُ: کسی کام کو قطعی اور حتمی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا۔ عَزَمْتُ الْاَمْرَ وَعَزَمْتُ عَلَیْہِ وَاعْتَزَمْتُ: میں نے اس کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کرلیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۳۔۱۵۹) جب کسی کام کا عزم مصمم کرلو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ﴾ (۲۔۲۳۵) اور ....نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ (۲۔۲۲۷) اور اگر طلاق کا ارادہ کرلیں

﴿اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (۳۱۔۱۷) بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

﴿وَلَمْ نَجِدْلَہٗ عَزْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۵) اور ہم نے ان میں صبر وثبات نہ پایا۔

یعنی جس بات کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے اور اسے بجالانے میں ثابت قدم نہ پایا۔

اَلْعَزِیْمَۃُ: ایک قسم کا گنڈہ اور تعویذ جس میں اس خیال سے گرہیں لگائی جاتی تھیں کہ گویا شیطان کو ایذا رسانی سے روک دیا گیا ہے۔ عَزِیْمَۃٌ کی جمع عَزَائِمُ آتی ہے۔

(ع ز و)

اَلْعِزَۃُ: گروہ جماعت۔ اس کی جمع حالت رفعی میں عِزُوْنَ اور حالت نصبی اور جری میں عِزِیْنَ (۷۰۔۳۷) آتی ہے اور اس کے معنی ہیں ''جماعتیں جو متفرق ہوں'' اصل میں یہ عَزَوْتُہٗ فَاعْتَزَیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں، میں نے اسے منسوب کیا۔ چنانچہ وہ منسوب ہوگیا گویا عِزَۃٌ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بلحاظ نسب یا بلحاظ مدد کے ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی سے اَلْاِعْتِزَاءُ فِی الْحَرْبِ ہے، جس کے معنی کسی شخص کا لڑائی میں اپنا نسب بیان کرنا اور اَنَا ابْنُ فُلَانَ وَصَاحِبُ فُلَانَ کہنا یعنی یہ کہ میں فلاں کا بیٹا یا اس کا ساتھی ہوں۔ مروی ہے۔[1] (۴۳) کہ مَنْ تَعَزَّی بِعَزَاءِ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَعِضُّوْهُ بِهَنِ اَبِیْهِ یعنی جو شخص اہل جاہلیت کی طرح اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرے اسے کہو کہ اپنے باپ کا مقام ستر کاٹ کھائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عِزِیْنَ کا لفظ عَزَا عَزَاءً فَهُوَ عِزَ سے مشتق ہے جس کے معنی صبر وتسلی حاصل کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے عِزَۃٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے سے تسلی حاصل لیتے ہوں۔

(ع س س)

اَلْعَسْعَسَۃُ وَالْعِسَاسُ کے معنی تاریکی ہلکی ہونے کے ہیں۔ یہ کیفیت رات کے دونوں اطراف میں ہوتی ہے یعنی جب رات آنے والی ہو یا جانے والی ہو۔ اس لیے آیت کریمہ۔

﴿وَاللَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ﴾ (۸۱۔۱۷) میں عَسْعَسَ کے معنی رات کے آنے اور جانے دونوں ہو سکتے ہیں۔

---

[1] رواہ الحاکم فی المستدرك وابن حبان فی زوائدہ ۷۳۶ بحذف لفظ "بھن ابیہ" والطبرانی والضیاء والترمذی عن ابی والرؤیانی فی الافراد راجع کنز العمال ج (۱ رقم ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۳۰۰٤) وغریب ابی عبید (۱/۳۰۱) والاحادیث فی ذم التفاخر بالآثار کثیرۃ

اَلْعَسُّ وَالْعَسَسُ: رات کے وقت مشتبہ لوگوں کی تلاش میں پھرنا کے ہیں اور رات کے وقت پہرہ دینے والے آدمی کو عَاسٌّ یا عَسَّاسٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع عُسَسٌ ہے مثل مشہور ہے۔[1] ( )

کَلْبٌ عَسَّ خَیْرٌ مِنْ اَسَدٍ رَبَضَ: یعنی رات کے وقت شکار کی تلاش کرنے والا کتا، بیٹھ رہنے والے شیر سے بہتر ہے۔

اَلْعَسُوْسُ: وہ عورت جو رات کو بدمعاشی کے لیے پھرتی رہتی ہو۔ اَلْعَسُّ: بڑا پیالہ۔ جمع عِسَاسٌ۔

(ع س ر)

اَلْعُسْرُ: کے معنی تنگی اور سختی کے ہیں۔ یہ یُسْرٌ (آسانی، فارغ البالی) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾ (۹۴۔۵،۶) یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اَلْعُسْرَۃُ: تنگ دستی، تنگ حالی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِی سَاعَۃِ الْعُسْرَۃِ﴾ (۹۔۱۱۷) مشکل کی گھڑی میں ﴿وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ﴾ (۲۔۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو۔

اور اَضَاقَ فُلَانٌ کی طرح اَعْسَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں، وہ مفلس اور تنگ حال ہو گیا۔ تَعَاسَرَ الْقَوْمُ: لوگوں نے معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی، قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَہٗ اُخْرٰی﴾ (۶۵۔۶) اور اگر باہم ضد (اور نا اتفاقی) کرو گے تو (بچے) کو اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔

یَوْمٌ عَسِیْرٌ: سخت دن۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکَافِرِیْنَ عَسِیْرًا﴾ (۲۵۔۲۶) اور وہ دن کافروں پر (سخت) مشکل ہوگا۔

﴿یَوْمٌ عَسِیْرٌ عَلَی الْکَافِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ﴾ (۷۴۔۹،۱۰) مشکل کا دن (یعنی) کافروں پر آسان نہ ہوگا۔

عَسَّرَ الرَّجُلُ: تنگدستی کے وقت کسی چیز کا مطالبہ کرنا۔

(ع س ل)

اَلْعَسَلُ: شہد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی﴾ (۴۷۔۱۵) صاف کردہ شہد کی...... اور کنایہ کے طور پر جماع کو عُسَیْلَۃٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔[2] (۴۴) ((حَتّٰی تَذُوْقِی عُسَیْلَتَہٗ وَیَذُوْقَ عُسَیْلَتَکِ)) جب تک تم دونوں ایک دوسرے سے جماع کی لذت حاصل نہ کرلو (اس وقت تک پہلے خاوند سے نکاح کی اجازت نہیں ہے) اَلْعَسَلَانُ: نیزے کا مضبوط ہونا، دوڑتے وقت اعضا کا ہلنا عام طور پر اَلْعَسَلَانُ: کا لفظ

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۳۰۴۴ والاتباع لابی الطیب ۶۷ وفیہ من کلب بدل من اسدو المثل یقال للحث علی الکسب۔

[2] قالہ صلی اللہ علیہ وسلم لامسرۃ رفاعہ حین طلقھا ثلاثہ ونکحت عبدالرحمن بن الزبیر والحدیث فی الستۃ وایضاً الشافعی فی الرسالۃ رقم ۴۹۴ بتحقیق احمد شاکر والام ۵/۲۲۹ واختلاف الحدیث ۳۱۴ علی ھامش الجزء السابع من الام وایضاً المجازات النبویہ للشریف الرضی (۲۸۲۔۲۸۳)

بھیڑیے کی تیز روی کے لیے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: مَرَّ يَعْسِلُ وَيَنْسِلُ بھیڑیا تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔

(ع س ی)

عَسٰی [1] کے معنی توقع اور امید ظاہر کرنا کے ہیں۔ اکثر مفسرین نے قرآن پاک میں اس کی تفسیر لازم معنی یعنی یقین سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں طمع اور رجا کا استعمال صحیح نہیں ہے مگر یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں قرآن پاک میں عسیٰ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لہٰذا آیت کریمہ۔

﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ﴾ (۔ ۱۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھو کہ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اسی طرح فرمایا۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ﴾ (۵۔۵۲) تو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔

﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ﴾ (۶۶۔۵) اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ انکا پروردگار......

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ﴾ (۴۷۔۲۲) تم سے عجب نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ۔

﴿هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ......﴾ (۲۔۲۴۶) کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں......۔

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ (۴۔۱۹) اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کردے۔

اَلْمُعْسِيَانُ: شتر مادہ جس کا دودھ منقطع ہوگیا ہو اور اس کے لوٹ آنے کی امید ہو۔

عَسَى الشَّيْءُ يَعْسُوْ کسی چیز کا سخت ہو جانا۔

عَسَى اللَّيْلُ يَعْسُوْ رات کا تاریک ہو جانا۔

(ع ش ر)

اَلْعَشْرَةُ دس۔ اَلْعُشْرُ: دسواں حصہ اَلْعِشْرُوْنَ: بیس اور اَلْعِشْرُ: (مویشیوں کا دسویں دن پانی پر وارد ہونا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (۲۔۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔ ﴿عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ﴾ (۸۔۶۵) بیس آدمی ثابت قدم۔

﴿تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ (۷۴۔۳۰) انیس (داروغے) عَشَرْتُهُمْ اَعْشِرُهُمْ: میں ان میں دسواں بن گیا۔ عَشَرْهُمْ: ان سے عُشْر: یعنی مال کا دسواں حصہ وصول کیا۔

عَشَّرْتُهُمْ: میں نے ان کے مویشی دس بنا دیئے یعنی

---

[1] کلمة عسى عده العلماء من الاضداد وقال ابن عباس هى واجبة من الله انظر اضداد ابى الطيب ٤٨٧ وليعلم ايضاً ان كل ما فى القرآن من عسىٰ على موحد الخبر فهو وخد على تاويل عسى الامر كذا وما كان على الاستفهام فانه يجمع كما فى الايات ثم الافصح ان يكون بعدها "ان" وربما لم يكن على عكس كل وفانه الافصح يد عدم كون "ان" راجع للبحث الصاحى ١٥٧ وابن هشام) ١٦٢۔١٦٥

پہلے نو تھے ان میں ایک اور شامل کر کے دس بنا دیا مِعْشَارُ الشَّیْءِ دسواں حصہ۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَا اٰتَیْنٰھُمْ﴾ (۳۴۔۴۵) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے۔

نَاقَةٌ عَشْرَاءُ: دس ماہ کی حاملہ اونٹنی اس کی جمع عِشَارٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾ (۸۱۔۴) اور جب دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔

جَاؤُا عُشَارَیٰ وہ دس دس افراد پر مشتمل ٹولیاں بن کر آئے۔

اَلْعُشَارِیُّ: ہر وہ چیز جو دس ہاتھ لمبی ہو۔

اَلْعِشْرُ اونٹوں کو پانی نہ پلانے کی مدت (نو دن)۔اِبِلٌ عَوَاشِرُ: نو دن کے پیاسے اونٹ۔

قَدْحٌ اِعْشَارٌ: ٹوٹا ہوا پیالہ۔دراصل اَعْشَارٌ کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو ٹوٹ کر دس ٹکڑے ہو گیا ہو اسی سے شاعر نے بطور استعارہ کہا ہے۔[1] (الطّویل)

(۳۱۱) بِسَھْمَیْكِ فِیْ اَعْشَارِ قَلْبٍ مُّقَتَّلِ

تم اپنی (نگاہوں) کے دونوں تیر میرے شکستہ دل کے ٹکڑوں پر (مارنا چاہتی ہو۔)

اَلْعَشْوَرُ: کے معنی گدھے کی آواز کے ہیں کیونکہ گدھا جب آواز کرتا ہے تو دس مرتبہ آواز کرتا ہے۔ اَلْعَشِیْرَۃُ انسان کے باپ کی طرف سے قریبی رشتہ دار پر مشتمل جماعت۔کیونکہ ان سے انسان کثرت عدد حاصل کرتا ہے۔گویا کہ وہ اس کے لیے بمنزلہ عدد کامل کے ہیں کیونکہ عَشَرَۃٌ کا عدد ہی کامل ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ﴾ (۹۔۲۴) اور عورتیں اور خاندان کے آدمی۔

لہٰذا عَشِیْرَۃٌ انسان کے رشتہ داروں کی اس جماعت کا نام ہے جن سے انسان کثرت (قوت) حاصل کرتا ہے۔

عَاشَرْتُهٗ کے معنی ہیں کہ میں رشتہ دامادی میں اس کے لیے بمنزلہ عَشَرَۃ کے ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۴۔۱۹) اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔

اَلْعَشِیْرُ: مل جل کر رہنے والا خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی۔

(ع ش و ری)

اَلْعَشِیُّ: زوال آفتاب سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت۔قرآن مجید میں ہے۔

﴿اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰھَا﴾ (۷۹۔۴۶) گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے تھے۔

اَلْعِشَآءُ: (ممدود) مغرب سے عشا کے وقت تک اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو اَلْعِشَآءَانِ کہا جاتا ہے اور اَلْعِشَا (رتوندی)، تاریکی جو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ رَجُلٌ اَعْشٰی: جسے رتوندی کی بیماری ہو اس کی

---

[1] قاله امرء القيس فی لامیته المشهورة صدره ـ وماذرفت عیناك الا لتضربی ـ شرح المعلقات لابن الانباری رقم ۲۲ والتبریزی ۲۳ واللسان والمحکم (عشر قتل) والمحاضرات ۲۹۱ ودیوانه ۲٦ والعقد الثمین ۱٤۷ وایضا عتین ۳٥٦ ومختار الشعرا لجاهلی اوالجمهرة للقرشی (٤٥٠) والعمدة (۱ : ۲۷۷) وفیه لتقدحی بدل لتضربی فی باب التمثیل وقیل ان امرء القیس اول من ابتکره ولم یات اعلم منه .

مونث عَشْوَاءُ آتی ہے۔مثل مشہور ہے۔ ❶ (   ) هُوَ يَخْبِطُ خَبْطَ عَشْوَاءَ: وہ اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔یعنی بلا سوچے سمجھے معاملات سرانجام دیتا ہے۔ عَشَوْتُ النَّارَ: میں نے رات کو آگ کا قصد کیا۔ عُشْوَةٌ (بروزن شُعْلَةٌ) آگ کا شعلہ جو رات کے وقت دور سے دکھائی دے۔ عَشِيَ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔اندھا ہو جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ﴾ (۴۳۔۳۶) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کرے۔

اَلْعَوَاشِيُّ: رات کو چرنے والے اونٹ۔اور اس کا واحد عَاشِيَةٌ ہے اسی سے کہا گیا ہے۔ ❷ (مثل) اَلْعَاشِيَةُ تُهَيِّجُ الْآبِيَةَ کہ رات کو چرنے والا اونٹ نہ چرنے والے کو رغبت دلاتا ہے یعنی جو اونٹ چارہ نہ کھاتا ہو وہ بھی اسے دیکھ کر چرنے لگ جاتا ہے۔

اَلْعَشَاءُ: شام کا کھانا۔ اَلْعِشَآءُ (بکسر العین) عشاء کی نماز۔ وَقَدْ عَشِيْتُ: میں نے رات کا کھانا کھایا۔ میں اسے رات کا کھانا کھلایا مشہور ہے۔ عِشْ وَلَا تَغْتَرَّ: یعنی رات کو اپنے اونٹ چرواؤ اور غافل نہ رہو۔

(ع ص ب)

اَلْعَصَبُ کے معنی بدن کے پٹھے جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ لَحْمٌ عَصِبٌ: بہت پٹھوں والا گوشت۔

اَلْمَعْصُوْبُ: دراصل لوہے کو کہتے ہیں جو پٹھے (کی تانت) کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ پھر عام مضبوطی کے ساتھ باندھنے پر عَصْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے اہل عرب کہتے ہیں۔ ❸

لَاَعْصِبَنَّكُمْ عَصْبَ السَّلِمَةِ: میں تمہیں سلمہ درخت کی طرح باندھ کر چھوڑوں گا۔

فُلَانٌ شَدِيْدُ الْعَصَبِ مَعْصُوْبُ الْخَلْقِ: فلان کے جوڑ بند مضبوط ہیں۔ يَوْمٌ عَصِيْبٌ: سخت دن۔ یہاں عَصِيْبٌ کے معنی ہیں: سخت۔ یہ بمعنی فاعل بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مفعول (مَعْصُوْبٌ) بھی۔ گویا اس کے بدن کے اطراف کو یک جا کر کے رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ سخت دن کو كَفَّةُ حَابِلٍ یا حَلْقَةُ خَاتَمٍ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلْعُصْبَةُ: وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ﴾ (۲۸۔۷۶) ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔ ﴿وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾ (۱۲۔۸) حالانکہ ہم جماعت (کی جماعت) ہیں۔ یعنی ہم باہم متفق ہیں اور ایک دوسرے کے یار و مددگار۔ اِعْصَوْصَبَ الْقَوْمُ: لوگ مجتمع ہو گئے۔ عَصَبُوْا بِهٖ

---

❶ یضرب المثل للمتهافت فی اشیء المیدانی (۲: ۴۱۴)

❷ قاله یزید وبن رویم الشیبانی انظر للمثل والخبر المیدانی رقم (۱۱۷، ۲۲۱۱، ۲۴۰۹) وفیه خبر طویل والحیوان (۵: ۲۱۲) وعیون الاخبار (۳: ۲۲۵) واللسان (ابا) والجمهرة للعسکری ۱۴۵ ومعناه اذارأت الآبیة التی تتعشیٰ اهاجتها للرعی فرعت معها

❸ قاله الحجاج حین خطب الناس بالکوفة اللسان (عصب) وفی المیدانی (۲/۹) قاله یزید بن رویم الشیبانی وفیه خبر طویل قال المیدانی (۲/۱۷) یضرب للبخیل یستخرج منه الشئی علی کره وفی الکامل (۷۶۔۳۳۴) لاخرم منکم حزم السلمة وایضاً راجع ابی الطیب (۲: ۵۰) والعقد الفرید (۴/۱۱۹) عیون الاخبار (۲/۱۴۲) وصبح الاعشی والخطبة بطولها فی البیان والتبیین (۲/۳۰۸۔۳۱۰)

۔ اس کا احاطہ کرلیا۔

عَصَبَ الرِّیْقُ بِفَمِهٖ: اس کے منہ میں تھوک خشک ہو گئی اور بول نہ سکا گویا اس کی زبان کو تانت کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔

عَصْبٌ: ایک قسم کی یمنی منقش چادر۔

اَلْعِصَابَۃُ: کے معنی پٹی یا پگڑی کے ہیں۔ تَعَمَّمَ کی طرح اِعْتَصَبَ کے معنی بھی پگڑی باندھنا آتے ہیں۔

اَلْمَعْصُوْبُ: اونٹنی کہ جب تک اس کے پاؤں باندھ کر اسے نہ دوہا جائے دودھ نہ دے۔

اَلْعَصِیْبُ: پھیپھڑا۔ کیونکہ وہ بھی انتڑیوں کے ساتھ لپٹا ہوتا ہے۔

(ع ص ر)

اَلْعَصْرُ: یہ عَصَرْتُ الشَّیْءَ کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: نچوڑنا اَلْمَعْصُوْرُ: وہ چیز جسے نچوڑا گیا ہو اَلْعُصَارَۃُ: شیرہ جو نچوڑ کر نکال لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

اِنِّیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا (دیکھتا کیا ہوں) کہ شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں۔

﴿وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ﴾ (۱۲۔۴۹) اور لوگ اس میں رس نچوڑیں گے۔

یعنی اس میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔ ایک قرأت میں یُعْصَرُوْنَ ہے یعنی اس سال خوب بارش ہوگی

اِعْتَصَرْتُ مِنْ کَذَا کے معنی کسی چیز سے خیر و برکت حاصل کرنا کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔❶ (السریع)

(۳۱۲) وَاِنَّمَا الْعَیْشُ بِرُبَّانِهٖ
وَاَنْتَ مِنْ اَمَانِهٖ مُعْتَصِرْ

زندگی کا لطف تو اٹھتی جوانی کے ساتھ ہے جب کہ تم اس کی شاخوں سے رس نچوڑتے ہو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔

میں مُعْصِرَات سے مراد بادل ہیں جو پانی نچوڑتے، یعنی گراتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مُعْصِرَاتِ ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جو اِعْصَارٌ کے ساتھ آتے ہیں اور اِعْصَار کے معنی ہیں: گرد و غبار والی تند ہوا۔ قرآن پاک میں ہے۔

فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ (۲۔۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر.......بگولا چلے۔

اَلْاِعْتِصَارُ کے معنی کسی چیز کو دبا کر اس سے رس نچوڑنے کے ہیں۔ اسی سے عُصْرٌ وَعَصَرٌ ہے۔ جس کے معنی جائے پناہ کے ہیں۔ اَلْعَصْرُ وَالْعِصْرُ وقت اور زمانہ۔ اس کی جمع عُصُوْرٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳۔۱،۲)

زمانہ کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔

اَلْعَصْرُ کے معنی اَلْعَشِیُّ بھی آتے ہیں، یعنی زوال

---

❶ قاله ابن احمرو فی القالی والجمحی واللسان وغیرها مقتفر بدل معتصر وربان العیش حدثانه واوائله والبیت فی اللسان (ربب) والحکم (عصر) والجمحی (۱۲۹) والمعانی للقبتی (۶۶۷) والسمط (۵۵۵) والقالی (۱: ۲٤۲) وابن درید (۱: ۲۷۷) وخصائص ابن جنی (۱: ٤۲۲) قال البکری معناه انما الصبا والعیش باوله وحدته ازمان انت معتصر من افنانه وقبله وهو اول الشعر: قد بکرت عاذلتی بکرة تزعم انی بالصباء مشتهر ۱۲

آفتاب سے غروب شمس تک کا زمانہ، اسی سے صَلاۃَ الْعَصْرِ (نماز عصر) ہے۔ اَلْعَصْرَان صبح شام، رات دن اور یہ اَلْقَمْرَان: کی طرح ہے جس کے معنی ہیں، چاند اور سورج۔ اَلْمُعَصِرُ: وہ عورت جسے حیض آجائے اور جوانی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔❶

(ع ص ف)

اَلْعَصْفُ وَالْعَصِيْفَةُ: کھیتی کے پتے جو کاٹ لیے جاتے ہیں نیز خشک نباتات جو ٹوٹ کر چورہ چورہ ہو جائے ۔قرآن میں ہے۔

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ﴾ (۵۵۔۱۱) اور اناج چھلکے کے اندر ہوتا ہے۔

﴿كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ﴾ (۱۰۵۔۵) جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔

رِيْحٌ عَاصِفٌ وَعَاصِفَةٌ وَمُعْصِفَةٌ: تند ہوا جو ہر چیز کو توڑ کر بھس کی طرح بنا دے اور مجازاً عَصَفَتْ بِهِمُ الرِّيْحُ کے معنی ہیں: وہ ہلاک اور برباد ہو گئے۔

(ع ص م)

اَلْعَصْمُ کے معنی روکنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۱۔۴۳) آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ۔بعض نے لَا عَاصِمَ کے معنی لَا مَعْصُوْمَ بھی کیے ہیں❷ یعنی آج اللہ کے حکم سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔اس سے یہ ہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عربی زبان میں عَاصِم بمعنی مَعْصُوم آجاتا ہے۔بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عَاصِم اور مَعْصُوْمٌ لازم ملزوم ہیں۔یعنی ایک کا حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم ہے۔اس لیے لفظ عاصم بول کر معصوم مراد لیا گیا ہے۔

﴿مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾ (۱۰۔۲۷) اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ گا۔

اَلْاِعْتِصَامُ: کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (۳۔۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ﴾ (۳۔۱۰۱) اور جس نے خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑ لیا۔

اِسْتَعْصَمَ: وہ باز رہا، گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ذریعہ برائی کے ارتکاب سے بچ جائے لہٰذا ﴿فَاسْتَعْصَمَ﴾ (۱۲۔۳۲) کے معنی ہیں: اس نے ایسی چیز تلاش کی جو برائی کے، ارتکاب سے اس کی حفاظت کرے بچالے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (۶۰۔۱۰) میں عِصَمٌ کا واحد عِصْمَةٌ ہے اور عِصْمَةٌ کے معنی عقد نکاح کے ہیں۔پس آیت کے معنی یہ ہیں۔

جو عورتیں مسلمان نہیں ہونا چاہتیں انہیں مت روکو بلکہ عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

اَلْعِصَامُ: مشک کی رسی یا تسمہ جس کے ساتھ اس کا منہ

---

❶ وفی الفائق (۲/ ۷۹) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کان دحیۃ اذقدم لم تبق معصر الاخرجت الیہ لانہ کان مفرط الجمال؟

❷ وقد عدہ العلماء من الاضداد (۵۰۶)

باندھا جاتا ہے اور عِصْمَةُ الْاَنْبِیَاءِ کے معنی انبیاء کی حفاظت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انبیاء کی حفاظت کی ہے۔ اول یہ کہ ان کو صاف شفاف جوہر سے پیدا کیا۔ دوم: انہیں جسمانی اور روحانی فضائل سے آراستہ کیا سوم: ان کی مدد کی، انہیں استقلال بخشا ان پر اپنی طرف سے سکینت نازل کی ان کے دلوں کی حفاظت کی اور انہیں اپنی توفیق خاص سے نوازا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (۵۔۶۷) اور خدا تم کو لوگوں سے بچا رکھے گا۔

اَلْعِصْمَةُ: بازوبند کے مثل ایک قسم کا حلقہ اَلْعِصْمُ: کلائی اور بازو بند کی مناسبت سے جانور کی کلائی کی سفیدی کو بھی عِصْمَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اس کے پاؤں کی سفیدی کو اَلتَّحْجِیْل کہہ دیا جاتا ہے اسی معنی کے لحاظ سے بز کوہی کو غُرَابٌ اَعْصَمُ کہتے ہیں۔ ❶ کیونکہ اس کے پہنچے سفید ہوتے ہیں اور باقی تمام بدن سیاہ یا سرخ ہوتا ہے۔

(ع ص و ر ی)

اَلْعَصَا: (لاٹھی) یہ اصل میں ناقص واوی ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عَصَوَان اور جمع عِصِیٌّ آتی ہے، عَصَوْتُهٗ: میں نے اسے لاٹھی سے مارا عَصَیْتُ بِالسَّیْفِ: تلوار کو لاٹھی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلْقِ عَصَاكَ﴾ (۲۷۔۱۰) اپنی لاٹھی ڈال دو۔

﴿فَاَلْقٰى عَصَاهُ﴾ (۷۔۱۰۷) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دی۔

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ﴾ (۱۰۔۱۸) انہوں نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے۔

﴿فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ﴾ (۱۰۔۲۶) تو انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں۔

اَلْقٰى فُلَانٌ عَصَاهُ: کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاٹھی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

(۳۱۳) وَاَلْقَتْ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّ بِهَا النَّوٰی

(فراق نے اپنی لاٹھی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا۔)

عَصٰی عِصْیَانًا کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں دراصل اس کے معنی ہیں: اس نے لاٹھی (عصا) سے اپنا بچاؤ کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ وفی الحدیث (فی المختالات المتبرجات) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ((لایدخل الجنۃ منھن الامثل الغراب الاعصم ای القلیل النادر وفی آخرہ المرأۃ الصالحۃ مثل الغراب الاعصم راجع الفائق والنھایۃ (عصم)

❷ قالہ معقر بن اوس بن حمار البارقی وتمامہ: کماقرّ عیناًبالایاب المسافر وفی المطبوع واستقرت والتصویب من المراجع والبیت فی التاج والصحاح والمحکم (عصی) من قصیدتہ المختارۃ وراجع للبیت المحاضرات للمولف (۱۴۸/۴: ۴۱۹) والموتلف (۱۲۸) ورأیت فی طراز المجالس للخفاجی (۱۱۳) البیت بواشد بن عبدربہ قال وکان من شعراء الصحابہ ومن شعرہ قصیدۃ لہ اولھا: صحاالقلب عن سلمی واقصرشاؤہ ۔ وردت علیہ مانفتہ تماضر۔ تم فی الکتاب نفسہ ۱۴۸ نسبہ الخفاجی الی معقر بن الحارث البارقی وکذا فی العقد (۲: ۳۰۳، ۵۲) البیت معزوالی راشد والصواب انہ للمعقر راجع العقد (۳: ۶۴۔۶۵) والاشتقاق ۴۸۱ والبیت ایضاً فی تاریخ الطبری (۴: ۱۱۵/۲: ۲۶۲) وقال ان عائشۃ تمثلت بہ عند مابلغھا قتل علی رضی اللہ عنہ (المعجم) وتمثل بہ المنصور حینمابلغہ خبر ھزیمۃ ابراھیم وفی المیدانی (۲۸۷۲) لمابویع لابی العباس الفلاح تمام خطیبافسقط القضیب من یدہ فقام رجل فَاَخَذَا القضیب ودفعہ الیہ وانشدالبیت وترجمہ الشاعر فی الخزانۃ (۲: ۲۹۱)

﴿وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی﴾ (۲۰۔۱۲۱) اور آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ (۴۔۱۴) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔

﴿آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ﴾ (۱۰۔۹۱) (جواب ملا کہ) اب؟ (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا۔ اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے، کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ شَقَّ الْعَصَا۔

(ع ض ض)

اَلْعَضُّ: کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا یا کاٹنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ﴾ (۳۔۱۱۹) تم پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ﴾ (۲۵۔۲۷) اور جس دن ناعاقبت اندیش ظالم اپنے ہی ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا۔ میں ندامت سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام پر انتہا درجہ پشیمان ہوتا ہے تو دانت سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔

اَلْعُضُّ: کھجور کی گٹھلی، خاردار جھاڑی، جسے اونٹ کھاتے ہیں۔

اَلْعِضَاضُ: جانوروں کا ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنا۔ رَجُلٌ مُعِضٌّ: اپنے کام میں نہایت کوشش کرنے والا آدمی۔ گویا وہ اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی یہ لفظ بطور تعریف استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مذمت۔

ھُوَ عِضُّ سَفَرٍ: وہ سفر پر بہت قدرت رکھتا ہے۔

ھُوَ عِضٌّ فِی الْخُصُوْمَةِ: وہ جھگڑنے میں نہایت فصیح اور سخنور ہے۔

زَمَنٌ عَضُوْضٌ: خشک سال۔

اَلتَّعْضُوْضُ: ایک قسم کی کھجور جو دشواری کے ساتھ چبا کر کھائی جاتی ہے۔

(ع ض د)

اَلْعَضُدُ: (بازو) کا کہنی سے لے کر کندھے تک کا حصہ

عَضَدْتُہٗ: میں نے اس کے بازو پر مارا اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

عَضَدْتُ الشَّجَرَ بِالْمِعْضَدِ: میں نے اہنسیا سے درخت کو کاٹا۔ جَمَلٌ عَاضِدٌ: نر شتر جو مادہ کے بازو کو پکڑ کو جفتی کرنے کے لیے اسے بٹھا لیتا ہے اور عَضَّدْتُہٗ کے معنی کسی کا بازو پکڑنے اور اسے سہارا دینے کے ہیں اور یَدٌ کی طرح بطور استعارہ عَضُدٌ کا لفظ بھی مددگار کے معنی میں آجاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا﴾ (۱۸۔۵۱) اور میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو مددگار بناتا۔

رَجُلٌ اَعْضَدُ: پتلے بازو کا آدمی۔ عُضِدَ: بازو کے درد میں مبتلا ہونا۔ مُعَضَّدٌ: وہ آدمی جس کے بازو پر نشان ہو ایسے نشان کو عِضَادٌ کہا جاتا ہے اور مِعْضَدٌ کے معنی بازو بند کے ہیں۔ اَعْضَادُ الْحَوْضِ: حوض کے جوانب (میں جو پشتہ اس کی حفاظت کے لیے بنا دیا جاتا

ہے) جو اس کے لیے بازو کا کام دیتے ہیں۔

(ع ض ل)

اَلْعَضَلَۃُ: پٹھا جس کے ساتھ سخت گوشت ہو۔ رَجُلٌ عَضِلٌ: وہ شخص جو گوشت سے گٹھا ہوا ہو۔ عَضَلْتُہٗ: میں نے اسے عَضَلٌ یعنی پٹھے کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جیسا کہ عَصَبْتُہٗ: اس کے بعد مجازاً یہ لفظ "سختی سے روک دینا" کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ (۲۔۲۳۲) تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ ...... نکاح کرنے سے مت روکو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب ان کے پہلے خاوند ہیں اور بعض نے اولیاء یعنی سر پرست مراد لیے ہیں۔ اور سختی میں عَضَلَۃ کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ عَضَّلَتِ الدَّجَاجَۃُ بِبَیْضِهَا: مرغی پر انڈہ دینا دشوار ہو گیا۔ عَضَّلَتِ الْمَرْئَۃُ بِوَلَدِهَا: عورت زچہ کی تکلیف میں مبتلا ہو گئی۔ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الطویل)

(۳۱۴) تَرَی الْاَرْضَ مِنَّا بِالْفَضَاءِ مَرِیْضَۃً
مُعَضِّلَۃً مِنَّا بِجَمْعٍ عَرَمْرَمٍ

زمین ہمارے لشکر جرار کی وجہ سے اس عورت کی طرح بے چین نظر آتی ہے، جو زچگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

دَاءٌ عُضَالٌ: لاعلاج مرض جس سے شفایاب ہونا مشکل ہو اَلْعَضَلَۃُ: بڑی مصیبت۔

(ع ض ہ ر و)

اَلْعِضَۃُ: کے معنی چیز کا ٹکڑا کے ہیں اس کی جمع عِضُوْنَ وَعِضِیْنَ ہے جیسا کہ ثُبَۃٌ اور ظُبَۃٌ کی جمع ثُبُوْنَ وَظُبُوْنَ آتی ہے۔❷ اسی سے اَلْعُضْوُ وَالْعِضْوُ ہے جس کے معنی بدن کا ایک حصہ یا ٹکڑا کے ہیں اور عَضَّیْتُہٗ تَعْضِیَۃً کے معنی ہیں: ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اعضا کو کاٹ کر الگ الگ کر دینا۔ الکسائی فرماتے ہیں کہ عِضَۃٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضَۃٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِضَۃٌ بھی۔ جس کے معنی جادو کے ہیں۔❸ لہٰذا بعض کے نزدیک عِضَۃٌ کی اصل بھی عِضَہَۃٌ ہے کیونکہ اسکی تصغیر عُضَیْھَۃ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسکی اصل عضوۃ ہے کیونکہ اس کا تثنیہ عِضَوَان آتا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔❹ (۴۲) لَا تَعْضِیَۃَ فِی الْمِیْرَاثِ کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت ایسی چیز کو کاٹ کر تقسیم نہ کیا جائے جس کے کاٹنے سے وارثوں کو نقصان پہنچتا ہو مثلاً تلوار وغیرہ کہ اسے کاٹ کر دو ٹکڑے نہ کیے جائیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ﴾ (۱۵۔۹۱) جنھوں نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کو ڈالا، یعنی کسی نے کہا کہ جادو

---

❶ قالہ اوس بن حجر والبیت فی اللسان والحکم (عضل) والسمط ۴۸۱ والمیدانی (۲: ۲۳) والمعانی للقبتی۔ (۸۹) والشعراء ۱۰۱ والخزانۃ (۳: ۴۹۵) والبیت ایضاً من کلمۃ فی دیوانہ (۲۷) ومجموعۃ المعانی (۸۶) وتھذیب الالفاظ (۴۹، ۴۴۳)

❷ وکذابرۃ جمعہ بُرین (الطبری ۱۴/ ۶۵)

❸ ومنہ فی الحدیث لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العاضھۃ والمسعضۃ اللسان (عضہ)

❹ راجع للحدیث الفائق (۲/ ۸۱) والنہایۃ (عضی) وتمامہ الاماحمل القسم رواہ البیھقی عن ابی بکر بن حزم یرسلا راجع کنز العمال (ج ۱۱ رقم ۳۳) وبمعنی الحدیث غریب ابی عبید

ہے بعض نے اسے پہلے لوگوں کی کہانیاں اور قصے وغیرہ کہا۔❶ بعض مفسرین نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انھوں نے بعض باتیں مان لیں اور بعض کا انکار کردیا جس کی طرف کہ آیت:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (۲۔۸۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے❷ کہ الکتاب کے کچھ حصہ کو مانتے ہو اور اس کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو چنانچہ ایسے لوگوں کے بالمقابل مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتَابِ کُلِّهٖ﴾ (۳۔۱۱۹) کہ تم مکمل کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔

(ع ط ف)

اَلْعَطْفُ: (ن) کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے کی طرف موڑ دیا جائے مثلاً رسی، درخت کی ٹہنی وغیرہ کو دوہرا کرنے کو عَطْفٌ کہا جاتا ہے اور عِطَافٌ کے معنی دو تہوں والی چادر کے ہیں۔

عِطْفَا الْاِنْسَان: انسان کے دونوں پہلو یعنی سر سے لے کر سرین تک کے دونوں جانب۔ کیونکہ بدن کے اس حصہ کو آسانی سے موڑا جاسکتا ہے ثَنٰـى عِطْفَهٗ کے معنی ہیں اعراض کرنا اور دور ہونا❸ جیسا کہ نَاٰی بِجَانِبِهٖ وَصَعَّرَ بِخَدِّهٖ وغیرہ محاورات ہیں۔ جب یہ لفظ عَلٰی کے واسطہ سے متعدی ہو تو اس کے معنی کسی پر مائل ہونے اور شفقت کرنا کے آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: عَطَفَ عَلَيْهِ وَثَنَاهُ عَاطِفَةُ رَحْمٍ ظَبْيَةٌ عَاطِفَةٌ عَلٰى وَلَدِهَا وَنَاقَةٌ عَطُوْفٌ عَلٰى بَوِّهَا وغیرہ اور جب تعدیہ بواسطہ عن ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور دور ہونا ہوتے، ہیں جیسے عَطَفْتُ عَنْ فُلَانٍ میں نے فلاں سے اعراض کیا۔

(ع ط ل)

اَلْعَطْلُ: (س) زیور سے خالی ہونا یا مزدور کا بیکار رہنا کہا جاتا ہے: عَطِلَتِ الْمَرْءَةُ عورت زیور سے خالی ہوگئی ایسی عورت کو عُطْل اور عَاطِلٌ کہا جاتا ہے اسی سے قَوْسٌ عُطُلٌ ہے یعنی وہ کمان جس پر تانت نہ ہو عَطَّلْتُهٗ مِنَ الْحُلِيِّ اَوِالْعَمَلِ: میں نے اسے زیور یا کام سے خالی کردیا، فَتَعَطَّلَ چنانچہ وہ خالی ہوگیا، بیکار ہوگیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَبِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے کنویں بیکار پڑے ہیں۔

اور جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جہاں کا کوئی صانع نہیں ہے جس نے اسے محکم اور آراستہ کیا ہے، انہیں مُعَطِّلَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَطَّلَ الدَّارَ گھر کو ویران کردیا۔ عَطَّلَ الْاِبِلَ: اونٹ بغیر محافظ کے چھوڑ دیئے ان کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔❹

(ع ط و)

اَلْعَطْوُ (ن) کے معنی ہیں لینا، پکڑنا۔ اور اَلْمُعَاطَاةُ: باہم

---

❶ ذکره القبتی فی غریبه ۲۳۹ وابو عبیده فی مجازه واختار الطبری (۶۶/۱۴) وقال وذالك اولی التاویلات ۱۲

❷ نسبه الطبری الی ابن عباس وسعیدبن جبیر وغیره ذلك (۶۴/۱۔۶۶) وابن کثیر (۵۵۸/۲)

❸ وفی القرآن ثانیَ عِطفه (۲۲۔۹)

❹ وفی القران اذاالعشارُ عُطلت (۸۱۔۴) وایضا اناعطینك الکوثر (۱۰۸:۱)

لینا دینا۔ اَلْاِعْطَاءُ: (افعال) قرآن پاک میں ہے۔ ❶

﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ......جزیہ دیں۔

اور اَلْعَطِیَّۃُ وَالْعَطَاءُ: خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو محض تفضلاً دی جائے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿ھٰذَا عَطَآءُنَا﴾ (۳۸۔۹) یہ ہماری بخشش ہے۔

﴿فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْھَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ یُعْطَوْا مِنْھَآ﴾ (۹۔۵۸) اگر ان کو اس میں سے (خاطر خواہ) مل جائے تو خوش رہیں اور اگر اس قدر نہ ملے۔

اَعْطَی الْبَعِیْرُ: اونٹ مطیع ہوگیا۔ دراصل اس کے معنی ہیں اونٹ نے منہ زوری اور سرتابی چھوڑ دی اور اپنا سر سوار کے سامنے جھکا دیا۔

ظَبْیٌ عَطُوٌّ وَّعَاطٍ: وہ ہرن جو درخت کے پتے کھانے کے لیے اپنا سر اوپر اٹھائے ہوئے ہو۔ ❷

(ع ظ م)

اَلْعَظْمُ کے معنی ہڈی کے ہیں۔ اس کی جمع عِظَامٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا......﴾ (۲۳۔۱۴) ہڈیاں (بنائیں) پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا۔

ایک قراءت میں دونوں جگہ عَظْمٌ ہے اور اسی سے عَظْمَۃُ الذِّرَاعِ ہے جس کے معنی بازو کا موٹا حصہ کے ہیں عَظْمُ الرَّحْلِ: بغیر تنگ کے پالان کی لکڑی عَظُمَ الشَّیْءُ کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے ہیں۔ مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ (۲۶۔۱۸۹) بڑے (سخت) دن کا عذاب تھا۔

﴿قُلْ ھُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ﴾ (۳۸۔۶۷) کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ﴾ (۷۸۔۱) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں کیا بڑے حادثہ کی نسبت؟

﴿عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ﴾ (۴۳۔۳۱) ان دو بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر......۔

اور عظیم کا لفظ جب اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو ایسے جسم کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے اجزاء متصل ہوں مگر اس کے بالمقابل کثیر کا لفظ افراد پر بولا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مگر کبھی عظیم کا لفظ بھی افراد کثیرہ پر بولا جاتا ہے جیسے: جَیْشٌ عَظِیْمٌ بھاری لشکر۔ مَالٌ عَظِیْمٌ: زیادہ مال۔ اس صورت میں عَظِیْمٌ کے معنی کَثِیْرٌ ہوتے ہیں۔ اور بڑے حادثہ کو عَظِیْمَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْاِعْظَامَۃُ وَالْعِظَامَۃُ گدے کی مثل ایک چیز جسے عورت اپنے سرین بڑے ظاہر کرنے کے لیے ان پر باندھ لیتی ہے۔

---

❶ وایضا التعاطی الاخذبغیر حق کماقال فی قاتل ناقۃصالحؑ ﴿فتعاطیٰ فعقر﴾ (۵۴۔۲۹)

(ع ف ف)

اَلْعِفَّۃُ: نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہو جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے۔ اَلْمُتَعَفِّفُ: زبردستی سے اپنے اندر ایسی حالت پیدا کرنے والا۔ اصل میں اس کے معنی تھوڑی سی چیز پر قناعت کرنے کے ہیں۔ جو بمنزلہ عُفَافَۃ یا عُفَّۃ یعنی بچی کھچی چیز کے ہو یا بمنزلہ عَفْعَفٌ یعنی پیلوں کے ہو۔ اَلْاِسْتِعْفَافُ عفت طلب کرنا، کسی چیز سے پرہیز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ (۴۔۶) اور جو شخص آسودہ حال ہو اس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز رکھنا چاہیے۔

﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ (۲۴۔۳۳) اور جو نکاح کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

(ع ف ر)

اَلْعِفْرِيْتُ: جنوں میں سے عفریت، اس جن کو کہا جاتا ہے جو نہایت موذی اور شریر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ (۲۷۔۳۹) جنات میں سے ایک موذی اور شریر جن نے کہا۔

پھر جس طرح کبھی شریر انسان کو شیطان کہہ دیا جاتا ہے اس طرح استعارۃً انسان کو عِفْرِيْتٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ عِفْرِيْتٌ نِفْرِيْتٌ کا محاورہ ہے (نفریت تابع مہمل ہے) ابن قتیبہ کہتے ہیں[2] کہ اَلْعِفْرِيْتُ کے معنی قوی ہیکل کے ہیں۔

اصل میں عِفْرِيْتٌ کا لفظ اَلْعَفَرَ سے ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں اور عَافَرَہٗ کے معنی ہیں: اسے پچھاڑ کر مٹی میں لت پت کر دیا اور رَجُلٌ شِرٌّ وَشِمْرٌ کی طرح رَجُلٌ عِفْرٌ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں: چالاک اور شریر آدمی۔ لَيْثُ عِفْرِيْنٌ: گرگٹ کی شکل کا ایک جانور ہے سوار پر حملہ کر کے اسے نیچے گرا لیتا ہے۔ عِفْرِيَۃُ الدِّيْكِ اَوِ الْحُبَارٰى: مرغ یا حباری کے سر کے بال، (کلغی)۔

(ع ف و)

اَلْعَفْوُ: کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

عَفَاہُ وَاعْتَفَاہُ: کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا۔ عَفَتِ الرِّيْحُ الدَّارَ: ہوا نے گھر کے نشانات مٹا دیئے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے۔[3]

(۳۱۵) اَخَذَ الْبَلٰى اٰيَاتِهَا

بوسیدگی نے اس کے نشانات مٹا ڈالے۔

عَفَتِ الدَّارُ: گھر کے نشانات مٹ گئے۔ گویا ان آثار نے از خود مٹ جانے کا قصد کیا۔ عَفَا النَّبْتُ وَالشَّجَرُ نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ اَخَذَ النَّبْتُ فِي الزِّيَادَۃِ کا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔

عَفَوْتُ عَنْهُ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے

---

[1] انظر للكلمة الاتباع لابی الطيب (۹۸) والفالی (۲/۲۱۷) والمخصص (۱۴/۳۷) والمزهر (۱/۴۱۸)

[2] ابو جعفر احمد بن عبدالله بن مسلم قتيبه المتوفی ۳۲۲ھ معجم الادباء (۲/۱۶۰)

[3] لم اجده ويرجیٰ

ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا لہٰذا یہاں اصل میں اس کا مفعول ترک کردیا گیا ہے اور عَنْ کا متعلق مخذوف ہے۔ ای قَصَدْتُ اِزَالَةَ ذَنْبِهٖ صَارِفًا عَنْهُ پس عَفْوٌ کے معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ﴾ (۴۲۔۴۰) مگر جو درگزر کرے اور معاملے کو درست کرلے۔

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (۲۔۲۳۷) اور اگر تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ (۲۔۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کردیا۔

﴿اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ﴾ (۹۔۶۶) اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کردیں۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ (۵۔۱۳) تو ان کی خطائیں معاف کردو۔اور آیت کریمہ۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ (۸۔۱۹۹) (اے محمد) عفو اختیار کرو۔ میں اَلْعَفْوَ ہر اس چیز کو کہا گیا ہے جس کا قصد کرنا اور لینا آسان ہو۔اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں: درگزر کیجیے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (۲۔۲۱۹) (اے محمد ﷺ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو چاہو خرچ کرو۔ میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو اور اَعْطٰی عَفْوًا اس نے اسے بے مانگے دے دیا۔یہاں عفوٌا مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرتے وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔❶ (الطّویل)

(۳۱۶) كَاَنَّكَ تُعْطِيْهِ الَّذِيْ اَنْتَ سَائِلُهٗ

یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے رہے ہو۔

اور دعائے ماثورہ میں ہے۔❷ (۴۳) اَسْـَٔلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ: یعنی اے اللہ! تجھ سے عفو اور تندرستی طلب کرتا ہوں اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو عَفُوٌّ کہا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾ (۴۔۴۳) بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے❸ (۴۴) ((مَا اَكَلَتِ الْعَافِيَةُ فَهُوَ صَدَقَةٌ)) یعنی کھیتی سے جو کچھ پرند، چرند اور

---

❶ وصدره: تواه اذاماحسبته متهللاً تراه اذا ماجبسته متهلا اوالبيت فى اللسان (هلل) غير منسوب قال احد مصححيه فى الحامشية وفى شواهد الكشاف انه لزهير بن ابى سلمىٰ يمدح حصن بن ابى حذيفه ويعلم من رواية انه وصف لمعنى بن زائدة وفى المختارات ٦٥ يمدح هرمافى ٢٣ بيتاً وفى مختارالشعر الحاهلى(١ : ٦٩)فى ٤٢ بيتاً ونقد الشعر٢١ فى ثلاثة ابيات معزوالى زهير كذافى البحر (٢ : ٥) والعمدة (٢ : ٣١، ٤٠)والعقد الثمين ٩٣ والحصرى (٣ : ١٣٣) وخاص الخاص للثعالبى (٣١٨) قال وهوامدح بيت قالته العرب والعقد (١ : ٣٣٧)ورسائل البلغاء (٢٧٨) والعيون (١ : ٣/٣٤١ : ٥٣) والسيوطى (٩٤)

❷ ابن ماجة عن ابى هريره وفى رواية الحاكم والترمذى عن ابى بكر : سلواالله العفو والعافية والفائق (٢ : ٨٠)

❸ المستدرك (٣ : ٣١٣) وابو داود (بيوع) وغريب ابى عبيد(١ : ١٤٨) وفى رواية "اصابت"انظر للحديث الفائق (٢/٨٣) قال والعافية جماعة ويقال للواحد عافٍ ١٢

ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ صدقہ ہے۔

اَعْفَیْتُ کَذَا: یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا۔اسی سے "اُعْفُوا اللِّحٰی" ہے۔ ❶ (۴۵) یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔

اَلْعِفَاءُ: اون یا پرند کے پر جو بڑھ جائیں اور کسی سے دیگ مستعار لینے والا۔ جو شوربہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شوربہ کو اَلْمَعَافِیْ کہا جاتا ہے۔

(ع ق ب)

اَلْعَقِبُ وَالْعَقْبُ: پاؤں کا پچھلا حصہ یعنی ایڑی اس کی جمع اَعْقَابٌ ہے۔حدیث میں ہے۔ ❷ (۴۵) ((وَیْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ)) کہ (وضو میں خشک رہنے والی) ایڑیوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور بطور استعارہ عَقِبٌ کا لفظ بیٹے پوتے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ﴾ (۴۳۔۲۸) اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔

جَآءَ فِیْ عَقِبِ الشَّهْرِ: مہینے کے آخری دنوں میں آیا۔ رَجَعَ عَلٰی عَقِبِهٖ: الٹے پاؤں واپس لوٹا۔

اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَيْهِ: وہ الٹے پاؤں واپس لوٹا۔جیسے: رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ: کا محاورہ ہے اور جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) تو وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔ نیز کہا جاتا ہے۔

رَجَعَ عَوْدُهٗ عَلٰی بَدْئِهٖ: یعنی جس راستہ پر گیا تھا اسی راستہ سے واپس لوٹ آیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا﴾ (۶۔۷۱) تو کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔

﴿اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۳۔۱۴۴) تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا۔

﴿نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۸۔۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

﴿فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۶) اور تم الٹے پاؤں پھر جاتے تھے۔

عَقَبَهٗ: وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا، اس کا جانشین ہوا۔جیسا کہ دَبَرَهٗ وَقَفَاهُ کا محاورہ ہے۔

اَلْعَقَبُ وَالْعُقْبٰی: خاص کر ثواب۔یعنی اچھے بدلے پر بولے جاتے ہیں۔جیسے فرمایا۔

﴿خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا﴾ (۱۸۔۴۴) اس کا صلہ بہتر اور (اس کا) بدلہ اچھا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (۱۳۔۲۲) یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔

---

❶ کلمة من الحدیث رواه النسائی والمسلم (طهارة) والبخاری (اللباس) وابوداود (ترجل) والترمذی (آدب) والمستدرك (۲/۱٦) والحدیث فی النهایة (۳/۲٦) والاضداد لابی الطیب (۲/۴۸۳) وعده من الاضداد

❷ اصل الحدیث متفق علیه من حدیث عبدالله بن عمرو رضی الله عنه باختلاف الفاظه ابن ماجه والنسائی وغیرهامن کتب الحدیث راجع لتخریجه الکاف الشاف لابن حجر رحمه الله ص ۵۲ رقم ۴۴۰۔۴۴۲

اور عَاقِبَۃٌ کا لفظ بھی ثواب کے لیے مخصوص ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۲۸۔۸۳) اور انجام نیک تو پرہیز گاروں ہی کا ہے۔

مگر یہ اضافت کی صورت میں کبھی عُقُوْبَۃٌ کے معنی میں بھی آجاتا ہے، جیسے فرمایا۔

﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُ وا السُّوْءٰٓى﴾ (۳۰۔۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا اَنَّهُمَا فِي النَّارِ﴾ (۵۹۔۱۷) تو دونوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں داخل ہوئے۔ میں عَاقِبَۃ کا لفظ استعارتاً عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۹۔۳۴) ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے ساتھ بشارت کا لفظ لایا گیا ہے اور عِقَاب ، عُقُوْبَۃٌ اور مَعَاقَبَۃٌ عذاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَحَقَّ عِقَابِ﴾ (۳۸۔۱۴) تو سخت عذاب کرنے والا۔

﴿فَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ (۱۶۔۱۲۶) اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے۔

﴿وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَاعُوْقِبَ بِهٖ﴾ (۲۲۔۶۰) جو شخص کسی کو اتنی ہی سزا دے جتنی سزا کہ اس کو دی گئی ہے۔

اَلتَّعْقِيْبُ: ایک چیز کے بعد دوسری لانا۔

عَقَّبَ الْفَرَسُ فِيْ عَدْوِهٖ: گھوڑے نے ایک دوڑ کے بعد دوسری دوڑ لگائی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ﴾ (۱۳۔۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ (۱۳۔۴۱) کے معنی ہیں کہ اللہ کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا اور نہ اس پر بحث کرسکتا ہے۔یہ عَقَّبَ الْحَاكِمُ عَلٰى حُكْمِ مَنْ قَبْلَهٗ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی حاکم نے اپنے پیشتر و حاکم کے خلاف فیصلہ دیا۔شاعر نے کہا ہے۔[1]

(۳۱۷) وَمَا بَعْدَ حُكْمِ اللّٰهِ تَعْقِيْبُ

اللہ کے فیصلہ کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں لوگوں کو اللہ کے حکم اور اس کی مخفی حکمتوں میں خوض کرنے سے منع فرمایا گیا ہو۔جیسا کہ قضا و قدر کے اسرار میں غور و خوض سے منع کیا گیا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ﴾ (۲۷۔۱۰) میں لَمْ يُعَقِّبْ کے معنی ہیں اس نے مڑکر پیچھے کو نہ دیکھا۔

اَلْاِعْتِقَابُ کے معنی ایک چیز کے بعد دوسری آنے کے ہیں۔جیسے شب و روز کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔اسی سے اَلْعُقْبَۃُ ہے یعنی دو مسافروں کا یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہونا۔ عُقْبَةُ الطَّائِرِ:

[1] لم اجده في المراجع

پرند کا کبھی اوپر چھڑھنا اور کبھی نیچے اترنا۔ اَعْـقَبَـهُ كَذَا: کسی چیز کا وارث بنا دینا ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو اس کا جانشین بنانا ۔ قرآن پاک میں ہے ۔ ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا﴾ (۹۔۷۷) تو خدا نے......ان کے (دلوں میں) نفاق ڈال دیا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الطّویل)

(۳۱۸) لَهٗ طَائِفَةٌ مِنْ جِنَّةٍ غَيْرُ مُعْقِبِ یعنی اسے جنون کا دورہ پڑتا ہے جس کے بعد افاقہ نہیں ہوتا۔

فُلَانٌ لَمْ يُعْقِبْ: اس نے اولاد نہیں چھوڑی اور اَعْقَابُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کی اولاد کے ہیں اہل لغت کا قول ہے کہ اس کے تحت لڑکی کی اولاد نہیں آتی کیونکہ وہ نسبًا اس کی جانشین نہیں ہوتی لیکن ذُرِّيَّةٌ کے لفظ میں لڑکی کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے۔ اِمْرَءَ ةٌ مِعْقَابٌ: وہ عورت جو ایک بار لڑکا اور دوسری بار لڑکی جنے عَقَبْتُ الرُّمْحَ کے معنی نیزے کو عقب یعنی پالان کے پچھلے حصہ کے ساتھ باندھ دیا۔ جیسے عَصَبْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عَصَبٌ یعنی تانت سے باندھ دیا اَلْعَقَبَةُ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ اس کی جمع عُقَبٌ وَعِقَابٌ ہے اور شاہین کو بھی عُقَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ شکار کا تعاقب کرتا ہے اور تشبیہ کے طور پر عِقَابٌ کا لفظ (۱) جھنڈے (۲) کنوئیں کے پتھر جس پر پانی پلانے والا کھڑا ہوتا ہے اور (۳) کان کی بالی کے دھاگے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اَلْيَعْقُوْبُ: مذکر چکور۔ کیونکہ اس کی عادت یہ ہے کہ ایک مرتبہ دوڑنے کے بعد ٹھہر جاتا ہے اور پھر دوسری بار دوڑتا ہے۔

(ع ق د)

اَلْعَقْدُ کے معنی کسی چیز کے اطراف کو جمع کر دینے یعنی گرہ باندھنے کے ہیں یہ اصل میں تو سخت اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے، عَقْدُ الْحَبْلِ (رسی کی گرہ باندھنا) عَقْدُ الْبَنَاءِ وغیرہ محاورات ہیں۔ پھر بطور استعارہ معانی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے عَقْدُ الْبَيْعِ سودے کو پختہ کرنا۔ عَقْدُ الْعَهْدِ: محکم عہد باندھنا وغیرہ، چنانچہ کہا جاتا ہے۔

عَاقَدْتُهٗ وَعَقَدْتُهٗ وَتَعَاقَدْنَا وَعَقَدْتُ يَمِيْنَهٗ میں نے اس سے پختہ عہد و پیمان باندھا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿عَاقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۴۔۳۳) جن لوگوں سے تم نے پختہ عہد باندھ رکھے ہوں۔

ایک قراءت میں عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ ہے۔ نیز فرمایا۔ ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ (۵۔۸۹) پختہ قسموں پر ایک قراءت میں عَقَدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ہے۔ اسی سے لِفُلَانٍ عَقِيدَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی پختہ یقین کے ہیں اَلْعِقْدُ (گلے کا ہار) اور اَلْعَقْدُ یہ اصل میں مصدر ہیں اور بطور اسم کے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی جمع عُقُودٌ آتی ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (۵۔۱) اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ اَلْعُقْدَةُ: نکاح، عہد و پیمان وغیرہ جو پختہ کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ (۲۔۲۳۵) اور

---

❶ قاله امراء القيس يصف فرساً واوله يحضلفى الآرىّ حتى كانه ۔ والبيت فى اللسان(عقب) وفى رواية الديوان ۸ وصنعة السندوبى به عشرة اوطائف غير معقب والبيت فى العقد الثمين (۱۸) او الفائق (۱/۱۷۶) و كتاب الخيل لابى عبيدة (۱۳۸) وفى رواية كانمابدل كانه

......نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

عُقِدَلِسَانُهٗ: اس کی زبان پر گرہ لگ گئی۔ فِیْ لِسَانِهٖ عُقْدَةٌ اس کی زبان میں لکنت ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳۔۴) اور گرہوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ میں عُقَدٌ عُقْدَةٌ کی جمع ہے یعنی وہ گرہیں جو جادوگر عورتیں لگاتی ہیں۔ دراصل اس کے معنی عَزِیْمَة کے ہیں اس لیے اس پر عُقْدَة اور عَزِیْمَة دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور جادوگر کو مُعْقِدٌ بھی کہا جاتا ہے۔

لَهٗ عُقْدَةُ مُلْكٍ: اس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔

نَاقَةٌ عَاقِدَةٌ وَعَاقِدٌ: وہ اونٹنی جس کی دم گرہ دار ہو جائے اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ نر سے جفتی کی خواہش مند ہے۔

تَیْسٌ وَکَلْبٌ اَعْقَدُ: نر سانڈ یا کتا جس کی دم لپٹی ہوئی ہو۔

تَعَاقَدَتِ الْکِلَابُ: کتوں کا آپس میں جفتی کرنا۔

(ع ق ر)

اَلْعُقْرُ کے معنی حوض یا مکان کے اصل اور وسط کے ہیں اور اسے عَقْرٌ بھی کہتے ہیں حدیث میں ہے۔[2] (۴۶)

مَاغُزِیَ قَوْمٌ فِیْ عَقْرِ دَارِهِمْ قَطُّ اِلَّا ذَلُّوْا کہ کسی قوم پر ان کے گھروں کے وسط میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہو جاتی ہیں اور قَصْرٌ یعنی محل کو عُقْرَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَرْتُهٗ اس کی عُقْرُ یعنی جڑ پر مارا۔ جیسا کہ رَأَسْتُهٗ کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے سر پر مارا۔ اسی سے عَقَرْتُ النَّخْلَ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دیا۔ عَقَرْتُ الْبَعِیْرَ: اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں، اسے ہلاک کر دیا۔ عَقَرْتُ ظَهْرَ الْبَعِیْرِ: اونٹ کی پشت کو زخمی کر دیا اِنْعَقَرَ ظَهْرُهٗ: اس کی پیٹھ زخمی ہوگئی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِکُمْ﴾ (۱۱۔۶۵) مگر انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو صالح علیہ السلام نے کہا کہ اپنے گھروں میں......فائدہ اٹھالو۔

﴿فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ﴾ (۵۴۔۲۹) تو اس نے جسارت کر کے اونٹنی کو پکڑا اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

سَرْجٌ مُعْقِرٌ: زخمی کر دینے والی زین۔

کَلْبٌ عَقُوْرٌ: کاٹ کھانے والا کتا، درندہ جانور رَجُلٌ عَاقِرٌ: بانجھ مرد۔

اِمْرَءَةٌ عَاقِرٌ: بانجھ عورت۔ گویا وہ مرد کے نطفہ کو قطع کر دیتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] فالمراد من النفاثات السواحر كذا ذكره القبتى فى المشكل وغريبه وسائر اصحاب التفاسير (۳۰/۳۵۳)

[2] قاله على رضى الله عنه فى خطبة خطبها فى نخيلة جالساً على السدة حين بلغه ان خيلالمعامية رضى الله عنه قتل عامله حسان بن حسان البكرى وكان على الانبار فقتله سفيان بن عوف الاسدى فى غارة (بيان والتبيين) (۲/۲۵) والكامل للمبرد ۰(۲۔۲۱) والعقد الفريد (۴/۶۹۔۷۰) كذافى الاغانى (۱۵: ۴۵) والصحيح ان اسمه اشرس بن حسان البكرى كمافى الطبرى وخطبته هذه مشهورة ۱۲

﴿وَامْرَءَتِیْ عَاقِرٌ﴾ (۳۔۴) اور میری بیوی بانجھ ہے۔
﴿وَكَانَتِ امْرَءَتِیْ عَاقِرًا﴾ (۱۹۔۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔
قَدْ عَقِرَتْ: وہ بانجھ ہوگئی۔ اَلْعَقْرُ: آخری بچہ بَیْضَةُ الْعُقْرِ: آخری انڈا۔ عِقَارٌ: (پرانی) شراب۔ کیونکہ وہ عقل کو قطع کر دیتی ہے۔ اَلْمُعَاقَرَةُ کے معنی ہیں: شراب نوشی کا عادی ہونا اور قَصْرٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر بکریوں کی ٹکڑی کو بھی عُقْرٌ کہا جاتا ہے۔
رَفَعَ فُلَانٌ عَقِيْرَتَهٗ: فلاں نے آواز بلند کی مروی ہے کہ ایک آدمی کی ٹانگ کٹ گئی وہ چلایا تو اس وقت سے بطور استعارہ عَقْرٌ کا لفظ بلند آواز کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ عَقَاقِيْرُ جڑی بوٹیاں۔ اس کا واحد عَقَّارٌ ہے۔

(ع ق ل)

اَلْعَقْلُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے لیے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ❶ (ہزج)
(۳۱۹) (۱) اَلْعَقْلُ عَقْلَانِ۔ مُطْبُوْعٌ مَسْمُوْعٌ
(۲) وَلَا يَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ۔ اِذَالَمْ يَكُ مَطْبُوْعٌ۔
(۳) كَمَا لَا يَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَيْنِ مَمْنُوْعٌ کہ عقل دو قسم پر ہے۔ (۱) عقل طبعی یعنی جو طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور (۲) عقل سمعی یعنی وہ جو لوگوں سے باتیں سن کر حاصل ہوتی ہے۔
(۲) اگر کوئی شخص فطرۃً عقل سے کورا ہو تو سن کر حاصل کی ہوئی عقل اسے کچھ فائدہ نہیں بخشتی۔
(۳) جیسا کہ سورج کی روشنی اندھے آدمی کے لیے بے فائدہ ہوتی ہے۔
عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ❷ (۴۷)
مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَقْلِ
(اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو)۔ اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ ❸ (۴۷) ((مَا كَسَبَ اَحَدٌ شَيْئًا اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ يَهْدِيْهِ اِلٰى هُدًى اَوْيَرُدُّهٗ عَنْ رَدًى)) کہ کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے۔

---

❶ کذافی الاحیاء (۱۶/۳) وفی ادب الدنیا والدین للماوردی (۱۳۱) ایضاً معزوة لعلی رضی الله عنه والابیات فی روضة العقلاء للبستی بغیر عزو وفی روایة رأیت العقل نوعین وتقسیم العقل من کلام سیابور بن اردشیر وفیه فاخذه بعض الشعراء فقال الخ وامانسبة لابیات الی علی رضی الله عنه علم احققها

❷ الحدیث اخرجه الترمذی الحکیم فی نوادره باسناد ضعیف والاحیاء (۱۶/۳) بتخریج العراقی وباختلاف عن امامة (الطبرانی) وابو نعیم من حدیث عائشة وفی روایة ابن عساکر عن معاذ قل من العقل بدل اکرم انظر کنز العمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۲) وفی الالی (ج ۱ ص ۱۲۹۔۱۳۲) بطرق ماخلقت خلقا احسن منك ولا اکرم

❸ والحدیث بالفاظه (هب عن عمر) الاابن ماا کتسب مکان ماکسب کنزالعمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۰) وفی تخریج العراقی اخرجه المحرفی العقل

چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ (۲۹۔۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

میں اسی معنی کے اعتبار سے عقل کی نفی کی گئی ہے۔ اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لاَ يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً، صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لاَ يَعْقِلُوْنَ﴾ (۲۔۱۷۱) جو کافر ہیں، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے، بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں کفار سے عقل کی نفی کی گئی ہے اور جس مقام پر عقل نہ ہونے پر انسان کو غیر مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ وہاں عقل کے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

دراصل اَلْعَقْلُ کے معنی روکنا اور منع کرنا ہیں جیسے عِقَالٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ کہتے ہیں۔ عَقَلَتِ الْمَرْءَةُ شَعْرَهَا عورت نے اپنے بال باندھ لیے۔ عَقَلَ لِسَانَهٗ: اس نے اپنی زبان روک لی اسی سے حصین یعنی قلعہ کو مَعْقِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَعَاقِلُ ہے اور عَقْلُ الْبَعِيْرِ سے عَقَلْتُ الْمَقْتُوْلَ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: مقتول کی دیت ادا کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَقَلْتُ الْمَقْتُوْلَ کے اصل معنی ہیں ولی الدم یعنی مقتول کے وارثوں کے گھر کے صحن میں اونٹ باندھنا مگر بعض کہتے ہیں: نہیں بلکہ اس کے معنی خونریزی روکنے کے ہیں۔ پھر مطلق خون بہا کو عَقْلٌ کہا جانے لگا ہے خواہ کوئی چیز دی جائے اور جو رشتے دار قاتل کی طرف سے دیت کا بوجھ اٹھاتے ہیں، انہیں عَاقِلَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَلْتُ عَنْهُ: کسی کی طرف سے خون بہا ادا کرنا۔ دَمُهٗ مُعْقَلَةٌ عَلٰى قَوْمِهٖ: [1] اس کے خون بہا کا تاوان اس کی قوم پر ہے۔ اِعْتَقَلَهٗ بِالشَّغْرِ بِيَّةِ اسے پیچا لگا کر پچھاڑ دیا۔ اِعْتَقَلَ رُمْحَهٗ بَيْنَ رِكَابِهٖ وَسَاقِهٖ: اس نے نیزے کو اپنی رکاب اور پنڈلی کے درمیان رکھ لیا بعض نے کہا ہے کہ اَلْعِقَالُ کے معنی ایک سال کے صدقہ کے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے [2] (۴۸) لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِقَالاً لَقَاتَلْتُهُمْ: کہ اگر وہ ہمیں ایک سال کا صدقہ بھی نہ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا اور جب کوئی شخص اونٹ نہ لے اور ان کی بجائے نقدی وصول کرے تو عرب کہتے ہیں: اَخَذَ النَّقْدَ وَلَمْ يَأْخُذِ الْعِقَالَ مگر جب عِقَال کا لفظ صَدَقَة کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ یا تو عِقَالٌ بمعنی پائے بند بول کر کنایتًا اونٹ مراد لیے جاتے ہیں اور یا اونٹ بمعہ ان کی رسیوں کے مراد ہوتے ہیں اور یا یہ عَقَلْتُهٗ عَقْلاً

---

[1] وفی المطبوع دیة مصحف والتصویب من المعاجم

[2] کلمة من الحدیث فی قتال ابی بکر اصحاب الرِّدَّة رواه اصحاب السنة والحدیث فی الفائق ۷۸۷۲

وَعِقَالاً کا مصدر ہوتا ہے جس کے معنی باندھنا کے ہیں، جیسے کِتَابٌ کہ اصل میں کَتَبْتَ کا مصدر ہے مگر کبھی بمعنی مکتوب آ جاتا ہے۔اسی طرح عِقَال بول کر مَعْقُوْل مراد لیتے ہیں یعنی وہ جانور جو زکوۃ میں وصول کیا جائے۔

اَلْعَقِیْلَۃُ :وہ (خوبصورت) عورت یا موتی جسے حفاظت سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔جیسا کہ اعلیٰ درجہ کی چیز کو عِلْقُ مُضِنَّۃ کہا جاتا ہے۔ اَلْمَعْقِلُ: (پناہ گاہ) پہاڑ یا قلعہ جس میں پناہ لی جاتی ہے اَلْعُقَّالُ: ایک بیماری جو گھوڑے کے پاؤں میں پیدا ہو جاتی ہے اَلْعَقْلُ کے معنی چلتے وقت پاؤں کا باہم ٹکرانا کے ہیں۔

(ع ق م)

اَلْعُقْمُ: اصل میں اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے سے مانع ہو۔چنانچہ محاورہ ہے۔ عَقِمَتْ مَفَاصِلُہٗ :(اس کے جوڑ بند خشک ہو گئے) دَاءٌ عُقَامٌ لاعلاج مرض۔ اَلْعَقِیْمُ: (بانجھ)وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے۔چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عَقِمَتِ الْمَرْئَۃُ اَوِالرَّحِمُ :عورت بانجھ ہوگئی یا رحم خشک ہو گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ﴾ (۵۱۔۲۹) اور اپنا منہ لپیٹ کر کہنے لگی کہ (اے ہے ایک تو بڑھیا (دوسرے) بانجھ۔

اور رِیْحٌ عَقِیْمٌ (خشک ہوا) میں یہ بھی ہو سکتا کہ فعیل بمعنی فاعل ہو۔یعنی وہ ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا درخت کو باردار نہیں کرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فعیل بمعنی مفعول ہو جیسا کہ اَلْعَجُوْزُ الْعَقِیْمُ میں ہے اس صورت میں رِیْحٌ عَقِیْمٌ: کے معنی ہوں گے وہ ہوا جو کسی چیز کا اثر اپنے اندر نہ رکھتی ہو چونکہ ایسی ہوا نہ کسی چیز کے اثر کو قبول کرتی ہے اور نہ کسی سے متاثر ہوتی ہے اس لیے نہ وہ کچھ دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ (۵۱۔۴۱) جب ہم نے ان پر خشک ہوا چلائی۔

یَوْمٌ عَقِیْمٌ سخت دن، جس میں کسی قسم کا سامانِ فرحت نہ ہو۔[1]

(ع ک ف)

اَلْعَکُوْفُ: کے معنی ہیں۔تعظیماً کسی چیز پر متوجہ ہونا اور اس سے وابستہ رہنا۔ اور اصطلاح شریعت میں اَلْاِعْتِکَافُ کے معنی ہیں:عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ (۲۔۱۸۷) جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو۔

﴿سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲۔۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

﴿وَالْعَاكِفِينَ﴾ (۲۔۱۲۵) اور اعتکاف کرنے والوں۔

﴿فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ﴾ (۲۶۔۷۱) اور اس کی پوجا پر قائم رہیں۔

عَکَفْتُہٗ عَلٰی کَذَا: کسی چیز پر روک رکھنا۔

﴿يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَامٍ لَهُمْ﴾ (۷۔۱۳۸) یہ اپنے

[1] راجع الآیة (۲۲۔۵۵)

بتوں کی عبادت کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔

﴿ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۲۰۔۹۷) جس معبود کی پوجا پر تو قائم اور معتکف تھا۔

﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا﴾ (۴۸۔۲۵) اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ روک دیئے گئے ہیں۔

(ع ل ق)

اَلْعَلَقُ کے معنی کسی چیز میں پھنس جانے کے ہیں کہا جاتا ہے عَلِقَ الصَّيْدُ فِي الْحُبَالَةِ: شکار جال میں پھنس گیا اور جب کسی کے جال میں شکار پھنس جائے تو کہا جاتا ہے اَعْلَقَ الصَّائِدُ۔ اَلْمِعْلَقُ وَالْمِعْلاقُ: ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے اسی طرح عِلَاقَةُ السَّوْطِ وَعَلَقُ الْقِرْبَةِ: اس رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جس سے کوڑے کو یا مشک کا منہ باندھ کر اسے لٹکا دیا جاتا ہے۔ عَلَقُ الْبَكْرَةِ: وہ لکڑی وغیرہ جس پر کنویں کی چرخی لگی رہتی ہے۔ اسی سے اَلْعُلْقَةُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے سہارا کے لیے پکڑا جاتا ہے۔ عَلِقَ دَمُ فُلَانٍ بِزَيْدٍ فلاں کا خون زید کے ساتھ چمٹ گیا یعنی زید اس کا قاتل ہے۔

اَلْعَلَقُ: (جونک) ایک قسم کا کیڑا جو حلق کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ نیز جما ہوا خون، اسی سے لوتھڑے کی قسم کے خون کو عَلَقَه کہا جاتا ہے جس سے بچہ بنتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (۹۶۔۲) جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ﴾ () کے آخر میں فرمایا۔

﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ (۲۳۔۱۴) پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی۔

اَلْعِلْقُ: اس عمدہ چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مالک کا دل چمٹا ہوا ہو اور اس کی محبت دل سے اترتی نہ ہو اَلْعَلِيْقُ: جو وغیرہ جو سفر میں جانور کے کھانے کے لیے اس پر باندھ دیتے ہیں اور اَلْعَلِيْقَةُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ بھیجا جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (رجز)

(۳۲۰) اَرْسَلَهَا عَلِيْقَةً وَقَدْ عَلِمْ
اَنَّ الْعَلِيْقَاتِ يُلَاقِيْنَ الرَّقِمْ

اس نے غلہ لینے کے لیے لوگوں کے ساتھ اپنا اونٹ بھیج دیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ دوسروں کے ساتھ بھیجے ہوئے اونٹ تکالیف سے دوچار ہوتے ہیں۔

اَلْعَلُوْقُ: وہ اونٹنی جو اپنے بچے پر مہربان ہو اور اس سے لپٹی رہے اور موت کو بھی عَلُوْقٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْعَلْقٰی: درخت جس میں انسان الجھ جائے تو اس سے نکلنا مشکل ہو عَلِقَتِ الْمَرْءَةُ: عورت حاملہ ہو گئی۔

رَجُلٌ مِعْلاقٌ: جھگڑالو آدمی جو اپنے مخالف کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے چمٹا رہے۔

(ع ل م)

اَلْعِلْمُ: کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔ اور یہ دو قسم پر ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کر لینا: دوم ایک چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے

---

[1] قاله الراجز والرقم الداهية والمصيبة الذيل للقالي ٦٣ مبحث اسماء الدابية) والرجز ايضاًفي اصلاح المنطق ٣٤٣، ٣٤٧ والمحكم واللسان (علق)

لیے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (۸۔۶۰) جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے۔

اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ﴾ (۶۰۔۱۰) اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔

اور آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ﴾ کے آخر میں۔ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ (۵۔۱۰۹) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش وحواس قائم نہیں رہیں گے۔ ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں (۱) نظری (۲) عملی۔ نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے جیسے وہ علم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عملی وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عقلی، یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل و سماعت کے حاصل کیا جائے دراصل ہوسکے (۲) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل أَعْلَمْتُهٗ وَعَلَّمْتُهٗ کے ایک معنی ہیں مگر اِعْلَامٌ جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تَعْلِيْمٌ کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتی کہ متعلّم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَعْلِيْم کے معنی تصور کے لیے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تَعَلُّمٌ کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تَعْلِيْمٌ کا لفظ اِعْلَامٌ کی جگہ آتا ہے کہ جب اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔

﴿اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ﴾ (۴۹۔۱۶) کیا تم خدا کو اپنی دینداری جتلاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تَعْلِيْمٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾ (۵۵۔۱،۲) خدا جو نہایت مہربان، اس نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔

﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶۔۴) قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا۔

﴿وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْا﴾ (۶۔۹۲) اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے......۔

﴿عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۶) ہمیں خدا کی طرف سے جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۳۔۱۶۴) اور خدا کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (۲۔۳۱) اور اس نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔

میں آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے اندر بولنے کی صلاحیت اور استعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہر چیز کے لیے ایک نام وضع کر لیا یعنی اس کے دل میں القا کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھا دیئے ہیں جسے وہ سرانجام

دیتے رہتے ہیں اور آواز دی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ، قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ (۱۸_۶۵_۲۲۷) اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ جو علم خدا کی طرف سے آپ کو سکھلایا گیا ہے اگر آپ مجھے اس میں سے کچھ رشد و ہدایت (کی باتیں) سکھا دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایک خاص علم مراد ہے جس پر انسان از خود واقف نہیں ہوسکتا اور جب تک اللہ تعالیٰ اس پر واقف نہ فرمائے لوگ اسے قابل انکار سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر کے ساتھ چلے تو جب تک انھوں نے ان واقعات کی حقیقت سے موسیٰ علیہ السلام کو باخبر نہیں کر دیا وہ ان باتوں کا انکار ہی کرتے رہے اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ۔

﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (۳۰_۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بھی علم کے یہی معنی مراد ہیں یعنی جسے علم خصوصی حاصل تھا اور آیت۔

﴿وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ (۵۸_۱۱) اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مراتب علم کے اعتبار سے علماء کے بھی مختلف درجے اور مرتبے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾ (۱۲_۷۶) اور ہر علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔ میں عَلِيْمٌ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ علم و فضل کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ عَلِيْمٌ صیغۂ مبالغہ لا کر اس علمی فضیلت کو بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سے کم درجہ کے اعتبار سے عَلِيْمٌ ہے گو اپنے سے بلند درجہ عالم کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عَلِيْمٌ سے ذات باری تعالیٰ مراد ہو گو یہ لفظ نکرہ ہے کیونکہ درحقیقت اس صفت کے ساتھ موصوف ہونے کی اہل تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے اس صورت میں كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ سے جملہ اہل علم بحیثیت مجموعی مراد ہوں گے اور ہر ایک بحیثیت انفرادی مراد نہیں ہوگا جیسا کہ پہلی صورت میں تھا۔اور آیت کریمہ۔

﴿عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۳۴_۴۸) اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے اور کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (۷۲_۲۶،۲۷) وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے ۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنے علم خصوصی سے صرف انہیں کو نوازتے ہیں جو اس کے اولیاء کی صف میں داخل ہوں اور اَلْعَالِمُ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس پر

کوئی چیز بھی مخفی نہ ہو۔جیسے فرمایا۔

﴿لَا یَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَۃٌ﴾ (۶۹۔۱۸) اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہیں رہے گی۔

اور یہ مفہوم صرف ذات باری تعالیٰ کے حق میں ہی صحیح ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو اس معنی کے ساتھ متصف کرنا صحیح نہیں ہے۔

اَلْعَلَمُ: ایسا نشان جس سے کوئی شے پہچانی جا سکے جیسے عَلَمُ الطَّرِیْقِ: اس نشان کو کہتے ہیں جو راستہ کی پہچان کے لیے اس میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور فوج کے جھنڈے کو عَلَمُ الْجَیْشِ کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے فوج کی پہچان ہو جاتی ہے۔چنانچہ ایک قراءت (میں عیسیٰ علیہ السلام) کو ﴿وَاِنَّہٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَۃِ﴾ (۴۳۔۶۱) کہا گیا ہے یعنی وہ قیامت کی نشانی ہیں۔اور اس معنی کے اعتبار سے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع اَعْلَامٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ﴾ (۴۲۔۳۲) اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا۔

﴿وَلَہُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَامِ﴾ (۵۵۔۲۴) اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔نیز اوپر کے ہونٹ کے شگاف اور کپڑے کے نقش و نگار کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے۔فُلَانٌ عَلَمٌ فلاں مشہور و معروف ہے جھنڈے کے ساتھ تشبیہ کے اعتبار سے یہ معنی مراد ہوتا ہے۔

اَعْلَمْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز پر نشان لگانا کے ہیں۔اور مَعَالِمُ الطَّرِیْقِ اَوِالدِّیْنِ میں مَعَالِمُ کا واحد مَعْلَمٌ ہے اور مَعْلَمٌ اس نشان کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی پہچان ہو سکے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ مَعْلَمٌ لِلْخَیْرِ: فلاں خیر و برکت کا نشان ہے۔

اَلْعُلَّامُ: مہندی۔ اَلْعَالَمُ: فلک الافلاک اور جن جواہر و اعراض پر وہ حاوی ہے سب کو اَلْعَالَمُ: کہا جاتا ہے دراصل یہ فَاعَلٌ کے وزن پر ہے جو اسم آلہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے طَابَعٌ۔ مَایُطْبَعُ بِہٖ۔ مَایَخْتَمُ بِہٖ وغیرہ اسی طرح عَالَمٌ بھی ہے جس کے معنی ہیں مَا عُلِمَ بِہٖ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لیے جملہ کائنات اَلْعَالَمُ کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انھوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔

اور اَلْعَالَمُ کی جمع (اَلْعَالَمُوْنَ) اس لیے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت رکھتی ہے۔مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ، عَالَمُ الْمَاءِ وَعَالَمُ النَّارِ وغیرہ۔نیز ایک روایت میں ہے۔[1] (۴۹)

((ان لِلّٰہِ بِضْعَۃَ عَشَرَ اَلْفَ عَلَمٍ)) کہ اللہ تعالیٰ

[1] عن وھب بن منبہ وفی القرطبی ثمانیۃ عشر اقوال۔

نے دس ہزار سے کچھ اوپر عالم پیدا کیے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ (واؤ نون کے ساتھ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عَـالَمٌ میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لیے اس کی جمع، جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہوتو تغلیبًا اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ بنالیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عَـالَمٌ سے خلائق کی خاص قسم یعنی فرشتے، جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ [1] اس لیے اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی ہے۔ امام جعفر رضی اللہ عنہ بن محمد کا قول ہے [2] کہ عَالَمِيْنَ سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عَـالَم قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔ نیز انھوں نے کہا ہے کہ عَالَمٌ دو قسم پر ہے۔ (۱) اَلْعَـالَمُ الْكَبِيْـرُ: یعنی فلک و مافیہ (۲) اَلْعَـالَمُ الصَّـغِيْرُ: یعنی انسان، کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عَـالَمٌ کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۵۔۷۰) کیا ہم نے تم کو سارے جہاں (کی حمایت وطرفداری سے) منع نہیں کیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۔۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۲) کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہمعصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلاء مراد لیے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الٰہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عَالَمٌ سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ (۱۶۔۱۲۰) ''بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے۔'' میں حضرت علیہ السلام ابراہیم کو اُمَّةٌ کہا ہے۔

(ع ل ن)

اَلْعَلَانِيَةُ: ظاہر اور آشکارا۔ یہ سِرٌّ کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات کے ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے۔ عَلَنَ كَذَا کے معنی ہیں: فلاں بات ظاہر اور آشکارا ہوگئی اور اَعْلَنْتُهٗ اَنَا: میں نے اسے آشکارا کردیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ﴾ (۷۱۔۹) میں انہیں برملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔

﴿مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ (۲۸۔۶۹) جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں۔

عِلْوَانُ الْكِتَابِ: جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ عَلَنٌ سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لیے اسے عِلْوَانٌ کہہ دیا گیا ہو۔

---

[1] الفتح للشوکانی (۱/۲۱) وعن الفراء وابو عبیدالعالم عباده عمن یعقل وھم اربعة اسم الانس والجن والملائکة والشیاطین

[2] ھو ابو عبدالله جعفر الصادق بن محمد الباقر سیدھاشم فی زمنه وقد الف تلمیذه جابر بن حیان الصوفی کتاباً منتظم رسائله وھی خمسمائة رسالة توفی ۱۴۸ھ راجع شذرات ۱/ ۲۲۰

(ع ل و)

اَلْعُلُوُّ: کسی چیز کا بلند ترین حصہ۔ یہ سُفُلٌ کی ضد ہے ان کی طرف نسبت کے وقت عُلْوِیٌّ وَسُفْلِیٌّ کہا جاتا ہے اور اَلْعُلُوٌّ بلند ہونا۔ عَالٍ صفت فاعلی، بلند عَلِیَ یَعْلٰی عَلاً عَلِیٌّ مگر عَلاَ (فَعَلَ) کا استعمال زیادہ تر کسی جگہ کے یا جسم کے بلند ہونے پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَالِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ﴾ (۷۶۔۲۱) ان کے بدنوں پر دیبا کے کپڑے ہوں گے۔

بعض نے عَلاَ اور عَلِیَ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ عَلاَ (ن) محمود اور مذموم دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن عَلِیَ (س) صرف مستحسن معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۴) فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا۔

﴿لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ﴾ (۱۰۔۸۳) (اور فرعون) ملک میں متکبر اور متغلب اور (کبر و کفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔

﴿فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ﴾ (۲۳۔۴۶) تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔

﴿أَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ﴾ (۳۸۔۷۵) کیا تو غرور میں آ گیا یا اونچے درجے والوں میں تھا۔

﴿لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۸۳) جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔

﴿وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (۲۳۔۹۱) اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا۔

﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ﴾ (۲۷۔۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔

﴿وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۴) اور بڑی سرکشی کرو گے۔

﴿وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ (۲۷۔۱۴) اور بے انصافی اور غرور سے (ان کا انکار کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔

اَلْعَلِیُّ کے معنی بلند اور برتر کے ہیں یہ عَلِیَ (بکسر اللام) سے مشتق ہے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو، جیسے۔

﴿وَهُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ﴾ (۳۴۔۲۳)

﴿اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا﴾ (۴۔۳۴) تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات اس سے بلند و بالاتر ہے کہ کوئی شخص اس کا وصف بیان کر سکے بلکہ عارفین کا علم بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿تَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (۲۷۔۶۳) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔

اور یہاں تَعَالٰی باب تفاعل سے ہے جس کے معنی ہیں ''نہایت ہی بلند'' ورنہ یہاں تکلف کے معنی مقصود نہیں ہیں جیسا کہ جب یہ لفظ انسان کے متعلق استعمال ہو تو یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۴۳) اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔

میں لفظ عُلُوًّا فعل تَعَالٰی کا مصدر نہیں ہے۔جیسا کہ آیت۔
﴿اَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾(۷۱۔۱۷)اور
﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (۷۳۔۸)میں نَبَاتًا اور تَبْتِيْلًا مصدر(مِنْ غَيْرِ بَابِهٖ واقع ہوئے) ہیں۔
اَلْاَعْلٰی۔ سب سے بلند اور اشرف۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (۷۹۔۲۴) کہ تمھارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔
اَلِاسْتِعْلَاءُ: (استفعال) کبھی یہ مذموم غلبہ کی طلب کے لیے آتا ہے اور کبھی اس کے معنی طلب رفعت کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ۔
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾(۲۰۔۶۴)اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہے۔
میں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔
﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ (۸۷۔۱)(اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل القدر کے نام کی تسبیح کرو۔
پروردگار کے اَلْاَعْلٰی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اس بات سے بلند ہے کہ کسی مخلوق کو اس پر قیاس کیا جائے یا اسے دوسروں کی طرح سمجھا جائے ۔ اور آیت کریمہ۔
﴿وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى﴾ (۲۰۔۴)اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔
عُلٰی عُلْيَا کی جمع ہے اور عُلْيَا اَعْلٰی کی تانیث ہے اور معنی یہ ہیں کہ آسمان اس دنیا سے اشرف و افضل ہیں جیسے فرمایا:
﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا﴾(۷۹۔۲۷) بھلا تمھارا بنانا آسان ہے یا آسمان کا ؟ اسی نے اس کو بنایا۔اور آیت کریمہ۔
﴿لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ﴾ (۸۳۔۱۸)علیین میں ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ عِلِّيِّيْنَ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام کا نام ہے جس طرح کہ سجین دوزخ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ طبقہ کا نام ہے ۔اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل اس کا اطلاق جنتی لوگوں پر ہوتا ہے اور قواعد عربی کے لحاظ سے یہی معنی اَقْرَبُ اِلَى الصَّوَابِ معلوم ہوتے ہیں ۔کیونکہ یہ جمع (جمع سالم) ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے اور یہ عِلِّيٌّ بروزن بِطِّيْخٌ کی جمع ہے اور معنی ہیں کہ ابرار بھی عِلِّيِّيْن لوگوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔جیسے فرمایا۔
﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ﴾(۴۔۶۹) آلایۃ وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین الخ ....اور معنی عُلُوٌّ کے لحاظ سے بلند مقام کو اور بلندی کو عَلْيَاء کہا جاتا ہے اور عُلَيَّةٌ اصل میں تو عَالِيَةٌ کی تصغیر ہے لیکن عرف میں بالا خانہ کو عُلِّيَّة کہا جاتا ہے اس کی جمع عَلَالِيٌّ بروزن فَعَالِيْلُ ہے تَعَالَى النَّهَارُ دن بلند ہوگیا۔ عَالِيَةُ الرُّمْعِ سِنَانٌ (بڑے نیزے) سے چھوٹا نیزہ۔
عَالِيَةُ الْمَدِيْنَةِ: مدینہ کی اعلیٰ جانب اس کی جمع عَوَال ہے اسی سے کہا گیا ہے۔
بُعِثَ اِلٰى اَهْلِ الْعَوَالِيْ کہ اہل عوالی کو بلا بھیجا اور

عَـالِیَةٌ کی طرف نسبت کے وقت عُـلْوِیٌّ کہا جائے گا اور عَلَاةٌ کے معنی سَنْدَان یعنی نہائی کے ہیں ❶ عام اس سے کہ وہ لوہے کی ہو یا پتھر کی۔ اَلْـعِـلْیَـانُ بڑا جسیم اونٹ۔

عَلَاوَةُ الشَّیْءِ: کسی چیز کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں اسی سے سر اور گردن کو عِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد بوجھ رکھا جائے اسے بھی عِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ ❷ عِلَاوَةُ الرِّیْحِ: جو ہوا اوپر سے آئے۔ اس کی ضد سِفَالَةٌ ہے۔ اَلْمُعَلّٰی قمار بازی کا ساتواں تیر جو سب سے اشرف اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اُعْـلُ عَـنِّیْ: مجھ سے دور ہو جا۔

تَـعَـالَ: اس کے اصل معنی کسی کو بلند جگہ کی طرف بلانے کے ہیں۔ پھر عام بلانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں عُـلُـوٌّ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں لہٰذا جب کوئی شخص دوسرے کو تَـعَـال کہہ کر بلاتا ہے تو گویا وہ کسی رفعت کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ مخاطب کا شرف ظاہر کرنے کے لیے اِفْـعَلْ کَذَا غَیْرَ صَاغِرٍ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا﴾ (۳۔۶۱) تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں......کو بلائیں۔

﴿ تَـعَـالَـوْا اِلٰـی کَلِمَةٍ﴾ (۳۔۶۴) (جو) بات (یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی) طرف آؤ۔

﴿تَـعَـالَـوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ (۴۔۶۱) جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو۔ اور ......آؤ۔

﴿اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ ﴾ (۲۷۔۳۱) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔

﴿تَـعَـالَـوْا اَتْـلُ ﴾ (۶۔۱۵۱) کہہ کہ (لوگو) آؤ میں (تمھیں) پڑھ کر سناؤں۔

تَعَلّٰی: بلندی پر چڑھ گیا۔ دور چلا گیا۔

کہا جاتا ہے عَـلَّیْتُهٗ فَـتَـعَلّٰی: میں نے اسے بلند کیا، چنانچہ وہ بلند ہو گیا۔

عَلٰی

عَلٰی: یہ حروف جارہ سے ہے مگر کبھی بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے جیسے عَـدَتْ مِـنْ عَلَیْهِ: اس پر اوپر کی جانب سے حملہ کیا۔

(ع م م)

اَلْـعَـمُّ: (چچا) باپ کا بھائی (جمع اَعْـمَامٌ) اَلْـعَـمَّةُ (پھوپھی) باپ کی بہن (جمع عَـمَّـات) قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْبُیُـوْتِ اَعْـمَـامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ ﴾ (۲۴۔۶۱) یا اپنے چچاؤں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے۔

رَجُـلٌ مُـعِـمٌّ مُخْوِلٌ وہ شخص جس کے چچا اور ماموں ہوں یعنی نہیال اور دودھیال کی طرف قوی ہو۔

اِسْتَـعَـمَّ عَـمًّـا وَ تَعَمَّمَهٗ کسی کو چچا بنانا دراصل یہ

---

❶ وفی الفائق (۲/ ۹۲) عطاء فی مهبط آدم قال : هبط معه بعلاة (فعلة من العلو)۔

❷ وذکر ابن ابی الدنیا فی الغزار وابن المندرك ق: انه لمانزلت الذین اذااصابتهم مصیبة الآیة ـقال عمر رضی الله عنه نعم العدلان ای الصلوت ورحمة ونعم الصلاة ای اولائك هم المهتدون ـ

عُمُوْم سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہیں اور یہ شامل ہونا باعتبار کثرت کے ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔ عَمَّهُمْ كَذَا وَعَمَّهُمْ بِكَذَا عَمًّا وَعُمُوْمًا۔ یعنی وہ چیز عام ہوگئی اور پبلک کو اَلْعَامَّة کہا جاتا ہے کیونکہ شہر میں عامی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے اور معنی شمول یعنی لپیٹنے کے اعتبار سے پگڑی کو اَلْعِمَامَة کہا جاتا ہے اور تَعَمَّمَ کے معنی سر پر پگڑی لپیٹنے کے ہیں جس طرح کہ تَقَنَّعَ وَتَقَمَّصَ کے معنی چہرہ پر پردہ ڈالنا یا قمیص پہننا کے آتے ہیں۔ عَمَّمْتُهٗ: میں نے اسے عمامہ پہنایا۔اور کنایۃً اس کے معنی کسی کو سردار بنانا بھی آتے ہیں۔

شَاةٌ مُعَمَّمَةٌ: سفید سر والی بکری۔گویا اس کے سر پر عمامہ بندھا ہوا ہے۔اور یہ مُقَنَّعَةٌ وَمُخَمَّرَةٌ کی طرح استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۳۲۱) يَاعَامِرَ بْنَ مَالِكٍ يَاعَمَّا
اَفْنَيْتَ عَما وَجَبَرْتَ عَمَّا

اے میرے چچا عامر بن مالک! تو نے بہت سے لوگوں کو فنا کیا اور بہت سے لوگوں پر بخشش کی۔اور آیت کریمہ۔

عَمَّ يَتَسَآءَ لُوْنَ (۷۸۔۱) (یہ) لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔

میں عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔اور یہ اس باب (ع م م) سے نہیں ہے۔

(ع م د)

اَلْعَمَدُ کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اس پر ٹیک لگانا کے ہیں اور اَلْعِمَادُ وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے یا بھروسہ کیا جائے۔چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ (۸۹۔۷) جوارم (کہلاتے تھے اتنے) دراز قد۔

میں اَلْعِمَاد سے وہ چیزیں مراد ہیں جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا۔محاورہ ہے: عَمَّدْتُ الشَّیْءَ: کسی چیز کو سہارا دے کر کھڑا کرنا۔ عَمَّدْتُ الْحَائِطَ: سہارا دیوار کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اَلْعَمُوْدُ اس لکڑی (بلی) کو کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔اس کی جمع عُمُدٌ وَعَمَدٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ (۱۰۴۔۹) (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔

اور ایک قراءت میں فِیْ عُمُدٍ ہے نیز فرمایا۔

﴿بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳۔۲) ستونوں کے بغیر......جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔

نیز اَلْعُمُوْدُ ہر اس لکڑی یا لوہے کو کہتے ہیں جس پر سہارا لگا کر انسان کھڑا ہوتا ہے۔ عُمُوْدُ الصُّبْحِ: صبح کی ابتدائی روشنی کیونکہ یہ بھی ایک دم ستون کی طرح اوپر کو اٹھتی ہے۔عرف میں اَلْعَمَدُ وَالتَّعَمُّدُ کے معنی قصداً کوئی کام کرنا آتے ہیں اور یہ سَهْوٌ کی ضد ہے۔[1] قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا﴾ (۴۔۹۳) اور جو کوئی شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔

﴿وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۳۳۔۵) لیکن جو قصد دل سے کرو۔اور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَفِيْعُ الْعِمَادِ: یعنی وہ دراز قامت ہے۔ اَلْعَمَدَةُ: ہر اس مال وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس پر اعتماد کیا

---

[1] وقد جاء في القران في مقابلة الخطاء كمافي (٤/٩٢-٩٣/٤-٥/٣٣)

جائے اس کی جمع عُمُدٌ ہے اور عَمِیْدٌ وہ سردار جس پر معاملات میں لوگ بھروسہ کرتے ہوں اور عَمِیْدٌ: کے معنی حزین بھی آتے ہیں گویا کہ وہ غم کا مقصود ہے جس طرح بیمار کو سَقِیْم کہتے ہیں کہ وہ بیماری کا مقصود بنا ہوا ہوتا ہے۔ وَقَدْ عَمَدَ: اس نے حزن و ملال، غصہ یا بیماری کی وجہ سے درد و کرب کا اظہار کیا۔ عَمَدَ الْبَعِیْرُ: پیٹھ کے زخمی ہونے کی وجہ سے اونٹ کراہنے لگا۔

(ع م ر)

اَلْعِمَارَۃُ: یہ خَرَابٌ کی ضد ہے۔ عَمَرَ اَرْضَہٗ یَعْمُرُھَا عِمَارَۃً: اس نے اپنی زمین آباد کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۹۔۱۹) اور مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا۔

کہا جاتا ہے، عَمَّرْتُہٗ: میں نے اسے آباد کیا۔ فَعَمَّرَ: چنانچہ وہ آباد ہوگئی اور آباد کی ہوئی جگہ کو مَعْمُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَعَمَرُوْھَا اَکْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْھَا﴾ (۳۰۔۹) اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا تھا جو انھوں نے آباد کیا۔

﴿وَالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ﴾ (۵۲۔۴) اور آباد کیے ہوئے گھر کی۔

اَعْمَرْتُہُ الْاَرْضَ وَاسْتَعْمَرْتُہٗ: میں نے اسے آباد کرنے کے لیے زمین دی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْھَا﴾ (۱۱۔۶۱) اور اس میں آباد کیا۔

اور اَلْعَمْرُ وَالْعُمْرُ: اس مدت کو کہتے ہیں جس میں بدن زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور یہ بقا سے فروتر ہے چنانچہ طَالَ عُمُرُہٗ کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کا بدن روح سے آباد رہے۔ لیکن طَالَ بَقَاءُہٗ اس مفہوم کا متقضی نہیں ہے۔ کیونکہ اَلْبَقَاءَ تو فَنَاء کی ضد ہے اور چونکہ بقاء کو عُمُر پر فضیلت ہے اس لیے حق تعالیٰ بقاء کے ساتھ تو موصوف ہوتا ہے مگر عُمُر کے ساتھ بہت کم متصف ہوتا ہے۔

اَلتَّعْمِیْرُ کے معنی ہیں: بالفعل عمر بڑھانا یا زبان کے ساتھ عَمَّرَكَ اللّٰہُ کہنا۔ یعنی خدا تیری عمر دراز کرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیْہِ مَنْ تَذَکَّرَ﴾ (۳۵۔۳۷) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا۔

﴿وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖ﴾ (۳۵۔۱۱) اور نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔

﴿وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِہٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ﴾ (۲۔۹۶) اگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی۔ اور آیت۔

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْہُ نُنَکِّسْہُ فِی الْخَلْقِ﴾ (۳۶۔۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خِلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

﴿حَتّٰی طَالَ عَلَیْھِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۱۔۴۴) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ان کی عمریں بسر ہوگئیں۔

﴿وَلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۸) اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر کی۔

اَلْعُمُرُ وَالْعَمْرُ کے ایک ہی معنی ہیں۔لیکن قسم کے موقعہ پر خاص کر اَلْعَمْر کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ عُمُر کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے فرمایا۔

﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ﴾ (۱۵۔۷۲) تمھاری زندگی کی قسم وہ اپنی مستی میں...... عَمَّرَكَ اللّٰهُ خدا تمھاری عمر دراز کرے یہاں بھی چونکہ قسم کی طرح تاکید مراد ہے اس لیے لفظ عَمَّر کو خاص کیا ہے۔

اَلْاِعْتِمَارُ وَالْعُمْرَةُ کے معنی ملاقات کے ہیں کیونکہ ملاقات سے بھی محبت اور دوستی کا خانہ آباد ہوتا ہے اصطلاح شریعت میں حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت اور طواف وسعی کرنے کو عُمْرَة کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ﴾ (۱۹۔۱۸) خدا کی مسجدوں کو تو......آباد کرتے ہیں۔

میں يَعْمُرُ کا لفظ یا تو اَلْعِمَارة سے ہے، جس کے معنی آباد اور حفاظت کرنا ہیں اور یا اَلْعُمْرَةُ سے جس کے معنی زیارت کے ہیں اور یا عَمَرْتُ بِمَكَان كَذَا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں کیونکہ عَمَرْتُ الْمَكَانَ وَعَمَرْتُ بِالْمَكَان دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اَلْعِمَارَةُ کے معنی مخصوص خاندان کے ہیں اور یہ لفظ اَلْقَبِيْلَة سے اخص ہے یہ اصل میں انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جس سے مکان کی آبادی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الطّویل)

(۳۲۲) لِكُلِّ أُنَاسٍ مِنْ مَّعَدٍّ عِمَارَةٌ

تمام لوگوں کا سلسلہ نسب بنی معد سے ملتا ہے۔ اَلْعَمَارُ: عمامہ یا پھول جو قوم کا سردار اپنی سرداری کی علامت اور اس کی حفاظت کے لیے سر پر رکھتا ہے اور بطور استعارة صرف پھولوں کو بھی عَمَارٌ کہا جاتا ہے گو بطور علامت نہ ہوں۔

اَلْمَعْمَرُ: رہائشی مکان کو کہتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی آباد ہو اور اَلْعَرَمْرَمَةُ رفقاء کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو جب کسی مقام پر فروکش ہو تو مقام آباد نظر آئے۔

اَلْعُمْرٰی: وہ عطیہ جو اس شرط پر دیا جائے کہ جب تک میری یا تمھاری زندگی ہے اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھالو اس کے بعد واپس لے لیا جائے گا۔ جیسا کہ اَلرُّقْبٰی میں ہوتا ہے اور ایسے عطیہ کو عُمْرٰی کہنے سے اس کے مستعار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْعَمْرُ: مسوڑھوں کا گوشت۔ کیونکہ اس سے دانتوں کی درمیانی خلا پر اور آباد رہتی ہے۔ اس کی جمع عُمُوْرٌ ہے أُمُّ عَامِرٍ۔ گفتار۔ لگڑ بگڑ اَبُوْ عَمْرَة: مفلسی۔

(ع م ق)

اَلْعُمْقُ: دراصل اس کے معنی نیچے کی طرف دوری یعنی گہرائی کے ہیں اس لیے بہت گہرے کنویں کو بِئْرٌ عَمِيْقٌ کہا جاتا ہے۔ راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دور دراز راستہ کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ (۲۲۔۲۷) دور دراز راستے سے۔

---

❶ قاله الاخنس بن شهاب التغلبي الجاهلي وتمامه ......عروض اليهايلحوون وجانب الشطرفى اللسان (عمر) والمحكم (عرض) والبيت من كلمة مفضلية ۲۷ بيتاً برقم ٤١ معظمهافي الحماسة مع المرزوقي رقم ۲٤۸ وبعضها في المعجم البكري ٥٠٦ والبلدان (اسم: قضه) والبخلاء ۸٤ او البيت في جزيرة العرب للهمداني والسمط ۸٦۸

(ع م ل)

اَلْعَمَلُ: ہراس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃً صادر ہو یہ فِعْل سے اخص ہے کیونکہ فِعْل کا لفظ کبھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف اَلْبَقَرُ العوامِلُ: ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (1) نیز عَمَل کا لفظ اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (۲۔۲۷۷) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے......

﴿وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ﴾ (۱۰۔۱۱۲) اور جو نیک کام کرے گا۔

﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ (۴۔۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا، اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ﴾ (۶۶۔۱۱) اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشتہ مال) سے نجات بخشیں۔

﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ﴾ (۱۱۔۴۶) وہ تو ناشائستہ افعال ہے۔

﴿وَالَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ﴾ (۳۵۔۱۰) اور جو برے برے مکر کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا﴾ (۹۔۱۶۰) اور کارکنان صدقات کا حق ہے۔ میں عَامِلِیْنَ سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے پر مقرر ہوتے ہیں اور ان کی اجرت کو عُمَالَة کہا جاتا ہے۔

عَامِلُ الرُّمْحِ: نیزے کا وہ حصہ جو سنان (بھالا) سے متصل ہوتا ہے۔

اَلْیَعْمَلَةُ کے معنی تیز رو اونٹنی کے ہیں یہ بھی اَلْعَمَل سے مشتق ہے۔

(ع م ہ)

اَلْعَمَهُ کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں

عَمِهَ (س) صیغہ صفت فاعلی عَمِهٌ وَعَامِهٌ اور عَامِهٌ کی جمع عُمَّهٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) وہ اپنی شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۷۔۴) ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے آراستہ کر دیئے تو وہ سرگرداں ہو رہے ہیں۔

(ع م ی)

اَلْعَمٰی: یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لیے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لیے صرف اَعْمٰی اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لیے اَعْمٰی وعَمٍ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی﴾ (۸۰۔۲) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔

میں اَلْاَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں

(1) ویقال للناقة السریعة ناقة عملة و و یعملة کماقال عبدالله بن رواحة : ع یازید الیعمالات الذبل

کہیں قرآن پاک نے اَلْعَمٰی کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی بصیرت کا اندھا پن مراد لیا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (۲۔۱۸) یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔

﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا﴾ (۵۔۷۱) تو وہ اندھے اور بہرے ہوگئے۔

بلکہ بصیرت کے اندھاپن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھاپن۔ قرآن پاک کی نظر میں اندھاپن ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ﴾ (۱۸۔۱۰۱) جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے اور کور بصری کے متعلق فرمایا۔

﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ﴾ (۲۴۔۶۱) نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے۔

اور اَعْمٰی کی جمع عُمْيٌ وَعُمْيَانٌ آتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (۲۔۱۸) گونگے اور اندھے ہیں۔

﴿صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ (۲۵۔۷۳) اندھے اور بہرے ہوکر...... اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ (۱۷۔۷۲) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور (نجات کے) رستے سے بہت دور۔

میں پہلا اَعْمٰی صیغہ صفت مشبہ ہے اور ثانی کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی صیغہ صفت مشبہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَفْعَلُ مِنْ كَذَا سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے کیونکہ یہ اس اَلْعَمٰی سے مشتق ہے جس کے معنی فقدان بصیرت کے ہیں اس لیے اس میں مَا اَفْعَلَهٗ وَاَفْعَلُ مِنْ كَذَا دونوں طرح کہنا صحیح ہے مگر اس کے برعکس بعض نے آیت مذکور میں پہلے اَعْمٰی کو بصیرت کے اندھاپن اور دوسرے کو بصر کے اندھاپن پر محمول کیا ہے۔ یہ ابوعمرو کا قول ہے۔ اس لیے وہ پہلے اَعْمٰی میں امالہ کا قائل ہے کیونکہ یہ عَمَى الْقَلْبِ سے ہے اور دوسرے میں امالہ کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اسم ہے وَالْاِسْمُ اَبْعَدُ مِنَ الْاِمَالَةِ یعنی اسم میں امالہ جائز نہیں ہے۔ [1] نیز فرمایا۔

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى﴾ (۴۱۔۴۴) اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہرہ پن) ہے یہ ان کے حق میں (موجب) نابینائی ہے۔

---

[1] قال الزمخشری وقد جوزوان یکون الثانی بمعنی التفضیل: من ثم قرء ابو عمرو الاول ممالا (ای بالامالة) والثانی مفخماً ای بدون الاماله لان افعل التفضیل لما کان تامة بمن کانت الفه فی حکم الواقعة فی وسط الکلام کقولك اعمالکم واما الاول فلم یتعلق به شئی فکانت الفه واقعة فی الطرف معترضة للامالة انظر الکشاف (ص ۶۸۳ ج ۲) طبع الاستقامة القاهره (۱۳۶۵ھ ۱۲)

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ﴾ (۷-۶۴) کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا﴾ (۱۷-۹) اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ، اندھے، گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے۔

میں بصر کا اندھا پن بھی مراد ہوسکتا ہے اور دل کی بصیرت کا زائل ہونا بھی عَمِيَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس پر فلاں معاملہ اس طرح غیر واضح اور مشتبہ ہوگیا کہ گویا وہ اس سے اندھا ہے (اور وہ اسے سجھائی نہیں دیتا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ﴾ (۲۸-۶۶) تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہوجائیں گے۔

﴿وَاٰتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ﴾ (۱۱-۲۸) اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت بخشی ہے جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اَلْعَمَاءُ: بادل، جہالت۔ بعض نے کہا ہے کہ روایت [1]:
((اِنَّهٗ قِيْلَ اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ خَلَقَ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ قَالَ عَمَاءٍ تَحْتَهٗ عَمَاءٌ وَفَوْقَهٗ عَمَاءٌ)) آپ سے پوچھا گیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا۔ فرمایا اَلْعَمَاء میں جس کے نیچے بھی عَمَاءٌ تھی اور اوپر بھی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا علم حاصل نہیں ہوسکتا اور عَمِيَّةٌ کے معنی جہالت کے ہیں اور اَلْمَعَامِيْ مَعْمَاةٌ کی جمع ہے) اس ریگستان کو کہتے ہیں جس میں کوئی نشانِ راہ نہ ہو۔

(عن) (حرف)

عن: یہ حرف جار ہے اور اپنے مجرور سے تجاوز کو چاہتا ہے جیسے حَدَّثْتُكَ عَنْ فُلَانَ (میں فلاں سے تمہارے سامنے بیان کر چکا ہوں) وَاَطْعَمْتُهٗ عَنْ جُوْعٍ (میں نے اسے بھوک سے کھلایا) ابومحمد البصری نے کہا ہے کہ عَنْ بلحاظ استعمال کے عَلٰی سے عام ہے کیونکہ یہ جہات، ستہ میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی عَلٰی بھی اس کی بجائے آجاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(۳۲۳) اِذَا رَضِيَتْ عَلَيَّ بَنُوْ قُشَيْرٍ

جب بنوقشیر مجھ سے راضی ہوں۔

اسی طرح اَطْعَمْتُهٗ عَلٰی جُوْعٍ وَكَسَوْتُهٗ عَلٰی عُرًی میں اگر عَنْ کی بجائے عَلٰی کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

(ع ن ب)

اَلْعِنَبُ: (انگور) یہ انگور کے پھل اور اس کے درخت کے لیے بھی بولا جاتا ہے اس کا واحد عِنَبَةٌ ہے اور جمع اَعْنَابٌ قرآن میں ہے۔

---

[1] وفي الفائق (۲/۹۲) وزوائد ابن حبان رقم (۹۳) تحته هواء فوقه هواء كذافي ابن جرير والطبراني وابي الشيخ في العظمة عن ابي رزين راجع كنزالعمال رقم ۱۸۶ فلفظة الهواء اكثر ۱۲

[2] قاله القحيف بن سليم العقيلي من كلمة يمدح فيهماحكيم بن المسيب القشيري وتمامه: لعمرالله اعجبني رضاها۔ وبعده ولا تنبو سيوف بني قشير ولاتمضي الاسنة في صفاها والبيت في اللسان (رضي) والاقتضاب ۴۳۲ والكامل ۸۲۴،۵۸۳ وادب الكتاب ۴۵ او الفرائد للآلوسي ۱۳۷ والبحر (۴۶۲/۵) والخزانة (۴: ۲۳۷) وابن عقيل ۲۰۶ وابن هشام (۱: ۱۵۳) وامالي ابن الشجري (۲: ۲۶۹) والسيوطي (۴۲) او مجاز القران رقم ۶۳۵ ونوادر ابي زيد والعيني (۳: ۲۸۲) ۱۲

﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

﴿جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ﴾ (۱۷۔۹۱) کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔

﴿وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ﴾ (۱۳۔۴) اور انگوروں کے باغ۔

﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ (۷۸۔۳۲) یعنی باغ اور انگور۔

﴿وَعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا﴾ (۸۰۔۲۷۔۲۸) اور انگور، ترکاری اور زیتون۔

﴿جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ﴾ (۱۸۔۳۲) انگور کے دو باغ۔

اور عِنَبَۃٌ کے معنی پھنسی کے بھی آتے ہیں، جو شکل میں انگور کے دانہ کے مشابہ ہوتی ہے۔

(ع ن ت)

اَلْمُعَانَتَۃُ: یہ مُعَانَدَۃ کے ہم معنی ہے یعنی باہم عناد اور دشمنی سے کام لینا لیکن مُعَانَتَۃ اس سے بلیغ تر ہے کیونکہ مَعَانَتَۃٌ ایسے عناد کو کہتے ہیں جس میں خوف اور ہلاکت کا پہلو بھی ہو۔ چنانچہ عَنَتَ فُلَانٌ۔ یَعْنَتُ عَنَتًا اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ﴾ (۴۔۲۵) اس شخص کو ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳۔۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ (جس طرح ہو) تمھیں تکلیف پہنچے۔

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹۔۱۲۸) (۳۔۱۰۷) تمھاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ (۲۰۔۱۱۱) اور سب (کے) چہرے اس زندہ و قائم کے رو برو جھک جائیں گے۔

میں عَنَتْ کے معنی ذلیل اور عاجز ہو جانے کے ہیں اور اَعْنَتَہٗ کے معنی تکلیف میں مبتلا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ (۲۔۲۲۰) اور اگر خدا چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا۔

اور جس ہڈی کو جوڑا گیا ہو اگر اسے کوئی صدمہ پہنچے اور وہ دوبارہ ٹوٹ جائے تو ایسے موقع پر بھی اَعْنَتَہٗ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ع ن د)

اَلْعَنِيْدُ کے معنی اَلْمُعْجِبُ بِمَا عِنْدَہٗ کے ہیں یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اترانے والا۔

اور مُعَانِدٌ اسے کہتے ہیں جسے جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر فخر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ (۵۰۔۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا﴾ (۷۴۔۱۶) یہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے۔

بعض کے نزدیک اَلْعَنُوْد کے بھی یہی معنی ہیں صرف ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عَنِيْدٌ اسے کہتے ہیں جو (حق سے) عناد رکھے اور (اس کی) مخالفت کرے اور عَنُوْدٌ وہ ہے جو صحیح راہ سے ہٹ جائے اس لیے بَعِيْرٌ عَنُوْدٌ (وہ اونٹ جو صحیح راہ سے ہٹ کر چلے) تو بولتے ہیں مگر

عَنِیْدٌ نہیں کہتے اور عُنَّدٌ عَانِدٌ کی جمع ہے اور عَنُوْدٌ کی جمع عِنْدَۃٌ اور عَنِیْدٌ کی جمع عِنْدٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْعُنُوْدُ کے معنی راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ لیکن عَنُوْدٌ خاص کر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی راستہ سے ہٹ جائے اور عَنِیْدٌ وہ ہے جو کسی راہ سے ہٹا ہوا ہو عَنَدَ عَنِ الطَّرِیْقِ: اس نے راستہ سے عدول کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَانَدَ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا بھی آتے ہیں اور اس سے الگ ہونا بھی۔ اور یہ دونوں دو مختلف اعتبار سے مشتق ہیں جیسا کہ اَلْبَیْنُ کا لفظ دو مختلف اعتباروں سے وصل کے معنی بھی دیتا ہے اور جدائی کے بھی۔

(عِنْدَ (ظرف))

عِنْدَ: یہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عِنْدِیْ کَذَا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۳۔۱۶۹) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۷۔۲۰۹) جو لوگ تمھارے پروردگار کے پاس ہیں وہ ......وہ گردن کشی نہیں کرتے۔

﴿فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۴۱۔۳۸) جو (فرشتے) تمھارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ﴾ (۶۶۔۱۱) اے میرے پروردگار میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

اور اسی معنی میں اَلْمَلَآئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے مقرب فرشتے) کا محاورہ ہے۔

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی﴾ (۴۲۔۳۶) اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔

﴿وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۴۳۔۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

﴿وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ (۱۳۔۴۳) اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ﴾ (۲۴۔۱۳) تو خدا کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

﴿وَیَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ﴾ (۲۴۔۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

اور آیت کریمہ۔

﴿اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ (۸۔۳۲) اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے۔ میں عِنْدَ بمعنی حکم ہے۔

(ع ن ق)

اَلْعُنُقُ: گردن۔ جمع اَعْنَاقٌ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ﴾ (۱۷۔۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔

﴿مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳) ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے (لگے)۔

﴿اِذِا لْاَ غْلاَلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰۔۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے ۔ اور آیت کریمہ ۔
﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ (۸۔۱۲) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سروں پر مارو اور اسی سے دراز گردن آدمی کو رَجُلٌ اَعْنَقُ کہا جاتا ہے اِمْرَءَۃٌ عَنْقَاءُ دراز گردن عورت ۔ کَلْبٌ اَعْنَقُ: سفید گردن کتا ۔
اَعْنَقْتُهٗ کَذَا: میں نے اس کی گردن میں فلاں چیز ڈال دی اس سے بطور استعارہ اِعْتَنَقَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: کسی بات کی ذمہ داری اٹھا لینا ۔ کسی مسلک کو قبول کر لینا ۔ اَلْاَعْنَاقُ کے معنی رؤسائے قوم کے ہیں ۔ چنانچہ آیت کریمہ ۔
﴿فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِیْنَ﴾ (۲۶۔۴) پھر ان کے اکابر عاجز و درماندہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں ۔
میں اَعْنَاق سے رؤساء و اکابرین قوم مراد ہیں ۔ تَعَنَّقَ الْاَرْنَبُ: خرگوش نے گردن اٹھا کر دیکھا ۔ اَلْعَنَاقُ بکری کا مادہ بچہ ۔
عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ: بعض نے کہا ہے کہ ایک خیالی پرند کا نام ہے جس کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا ۔

(ع ن و)

﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ﴾ (۲۰۔۱۱۱) اور چہرے اس زندہ و قائم کے سامنے جھک جائیں گے ۔ یعنی مصیبت میں گرفتار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائیں گے اور عَنَیْتُهٗ کے معنی کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے ہیں اور عَنِیَ کے معنی مصیبت میں مبتلا ہونا یا قیدی بننا کے آتے ہیں اسی سے قیدی کو اَلْعَانِیْ کہا جاتا ہے (اس کی مونث عَانِیَۃٌ ہے اور عَانِیَۃٌ کی جمع عَوان آتی ہے)
آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ (۵۰) ((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا فَاِنَّهُنَّ عِنْدَکُمْ عَوَانٍ)) کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو ۔ بے شک وہ تمھارے پاس ایک طرح سے قیدی ہیں ۔ محاورہ ہے: عُنِیَ بِحَاجَتِهٖ فَهُوَ مَعْنِیٌّ بِهَا (کسی حاجت میں مبتلا ہونا) بعض نے عُنِیَ فَهُوَ عَانٍ کہا ہے اور آیت کریمہ ۔
﴿لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ﴾ (۸۰۔۳۷) میں ایک قراءت یَعْنِیْهِ بھی ہے یعنی اسے مصروف رکھے گی ۔
اَلْعَنِیَّۃُ: ایک دوا جو خارشی ہونٹ پر ملی جاتی ہے ۔ مثل مشہور ہے ۔ ❷
عَنِیَّۃٌ تَشْفِی الْجَرَبَ: درحق مرد نیک رای گویند کہ بفکر خود امور را نیک انجام وہد ۔
اَلْمَعْنٰی: مفہوم یا مقصود جو لفظ سے ظاہر ہوتا ہے ہو ۔ یہ عَنَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ کے محاورہ سے مشتق ہے ۔

---

❶ وفی الکشاف فانهن عوان فی ایدیکم الحدیث (۱/۲۵۸) وفی الترمذی والنسائی وابن ماجه من حدیث عمرو بن الاحوص فی خطبة حجة الوداع وفیها فانهن عوان عندکم روی ابو یعلی والبزار والطبری من روایة موسی بن عبیدة الزندی (واحد الضعفاء) عن ابن عمرؓ مرفوعا: النساء عوان فی ایدیکم انظر تخریج احادیث الکشاف (ص ۴۰ ـ ۴۱) رقم ۳۳۵ وتخریج العراقی (ص ۴۲ ج ۲) ورواه مسلم من حدیث جابر الطویل ۔
❷ قال المیدانی (۲/ ۱۸) العنینة بول البعیر یطلی به الاجرب والمثل یضرب للرجل الجید الرأی لیستشفیٰ برایه فیما ینوب انظر للمثل الفائق (۲/۹۷)

جس کے معنی ہیں: زمین نے پودے نمودار کیے۔
عَـنَـتِ الْـقِـرْبَـةُ مشک سے پانی بہہ پڑا۔اور جولوگ عِـنْـوَانُ الْكِتَابِ کو عُـنِـيَ سے مشتق مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ بھی عَـنَـتِ الْقِرْبَةُ سے ماخوذ ہے اور لفظ اَلْـمَعْنٰى اور التفسير کا تقریباً ایک ہی مفہوم ہے گوان میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔

(ع ھ د)

اَلْـعَهْدُ (ض) کے معنی ہیں: کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور خبر گیری کرنا۔اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عَـهْـدٌ کہا جاتا ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاَوْفُـوْا بِـالْـعَـهْـدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً﴾ (۱۷۔۳۴) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔
﴿لاَ يَـنَـالُ عَهْـدِى الظّٰـالِمِيْنَ﴾ (۲۔۱۲۴) کہ ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی۔
﴿وَمَـنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۹۔۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔
عَهِــدَ فُلاَنٌ اِلٰـى فُلاَنٍ: کسی سے عہد و پیمان لے کر اسے اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنا۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰى اٰدَمَ﴾ (۲۰۔۱۱۵) اور ہم نے...... آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا۔
﴿اَلَـمْ اَعْـهَـدْ اِلَيْكُمْ﴾ (۳۶۔۶۰) ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا؟......
﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَا﴾ (۳۔۱۸۳) جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم سے عہد لے رکھا ہے۔
﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ﴾ (۲۔۱۲۵) اور ابراہیم علیہ السلام ......کو کہا اور عَهْـدُ اللّٰهِ (خدائی عہد) سے مراد کبھی تو وہ صلاحیت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری عقلوں میں راسخ کر دی ہے اور کبھی اس سے مراد وہ احکام ہوتے ہیں، جن کا کہ پیغمبروں نے کتاب وسنت کے ذریعہ حکم دیا ہے اور کبھی اس سے مراد وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جن کی بجا آوری شرعاً واجب نہ ہو بلکہ ہم اپنی طرف سے اسے اپنے اوپر لازم کریں، جیسے نذر وغیرہ، چنانچہ آیات۔
﴿وَمِـنْهُـمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ﴾ (۹۔۷۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے خدا سے عہد کیا تھا۔
﴿اَوَكُـلَّـمَـا عَاهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ (۲۔۱۱۰) ان لوگوں نے (جب خدا سے) عہدِ واثق کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس کو پھینک دیا۔
﴿وَلَـقَـدْ كَـانُـوْا عَـاهَـدُوا اللّٰـهَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۳۔۱۵) حالانکہ پہلے اللہ سے اقرار کر چکے تھے۔
میں یہی معنی مراد ہیں اور کفار میں سے جو شخص معاہدہ کے وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوا سے مُعَاهِدٌ یا ذو عہد کہا جاتا ہے۔حدیث میں ہے۔[1] (۵۱) ((لاَ يُـقْـتَـلُ مُؤْمِنٌ بِـكَـافِرٍ وَلاَ ذُوْعَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ)) کہ کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی معاہد کو مدت عہد کے اندر مارا جائے اور حفاظت اور پابندی کے اعتبار سے اس وثیقہ کو بھی عُـهْـدَةٌ کہا جاتا ہے جو فریقین عہد و پیمان کے وقت باہم لکھ لیتے ہیں اور محاورہ ہے۔
فِــيْ هٰـذَا الْاَمْـرِ عُـهْـدَةٌ یعنی وہ معاملہ ہے جس کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہو اور دیکھ بھال کے اعتبار سے بارش کو بھی

[1] متفق عليه من حديث معقل بن يسار و رواه ابن ماجة۔ عن ابن عباسؓ ۱۲

عَهْدٌ وَعِهَادٌ کہا جاتا ہےاور رَوْضَةٌ مَعْهُوْدَةٌ کے معنی ہیں: وہ باغ جس پر بارش ہوئی ہو۔

(ع ھ ن)

اَلْعِهْنُ کے معنی رنگین اون کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (۱۰۔۵) دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح۔

یہاں صرف رنگ کے اعتبار سے پہاڑوں کو رنگدار اون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵۔۵۷) تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بیان ہو چکا ہے۔

رَمٰى بِالْكَلَامِ عَلٰى عَوَاهِنِهٖ: بے سوچے سمجھے بات کرنا فکر وغور کیے بغیر بات کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے: اَوْرَدَ كَلَامَهٗ غَيْرَ مُفَسَّرٍ: کہ اس نے اپنی بات کی وضاحت نہیں کی۔

(ع و ج)

اَلْعَوْجُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑا ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانا کے ہیں۔جیسے عُجْتُ الْبَعِيْرَ بِزَمَامِهٖ: میں نے اونٹ کو اس کی مہار کے ذریعہ ایک طرف موڑ دیا۔ فُلَانٌ مَا يَعُوْجُ عَنْ شَيْءٍ يَهُمُّ بِهٖ یعنی فلاں اپنے ارادے سے باز نہیں آتا۔

اَلْعَوْجُ: اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے بسہولت دیکھا جاسکے جیسے کھڑی چیز میں ہوتا ہے مثلاً لکڑی وغیرہ اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے دیکھا جاسکے جیسے صاف میدان کی ناہمواری کو غور وفکر کے بغیر اس کا ادراک نہیں ہوسکتا یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ عقل وبصیرت سے ہی ان کا ادراک ہوسکتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ (۳۹۔۲۸) (یہ) قرآن عربی (ہے) جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے۔

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (۱۸۔۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی (اور پیچیدگی) نہ رکھی۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ (۷۔۴۵) جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں......

اور کنایہ کے طور پر کج خلق آدمی کو بھی اَعْوَجُ کہا جاتا ہے۔ اَلْاَعْوَجِيَّةُ یہ اَعْوَج گھوڑے کی طرف منسوب ہے جو جاہلی عرب میں مشہور تھا۔

(ع و د)

اَلْعَوْدُ: (ن) کسی کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف پلٹنے کو عَوْدٌ کہا جاتا ہے خواہ وہ پلٹنا بذاتہٖ ہو یا قول وعزم سے ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰۷) اے پروردگار! ہم کو اس میں سے نکال دے اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (۶۔۲۸) اگر یہ (دنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں) سے ان کو منع کیا گیا تھا وہی کرنے لگیں۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ﴾ (۵۔۹۵) اور جو پھر (ایسا کام) کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا۔

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَأُالْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ (۳۰۔۲۷) اور وہی تو ہے جو خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (۲۔۲۷۵) اور جو پھر (سود) لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔

﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ (۱۷۔۸) اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے۔

﴿وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ﴾ (۸۔۱۹) اور اگر پھر (نافرمانی) کرو گے تو ہم بھی پھر (تمھیں عذاب) کریں گے۔

﴿اَوْلَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾ (۷۔۸۸) یا تم ہمارے مذہب میں آجاؤ۔

﴿اِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰۷) اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

﴿اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ﴾ (۷۔۸۹) اگر ہم...... تمھارے مذہب میں لوٹ جائیں۔

﴿وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا﴾ (۷۔۸۹) اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ (۵۸۔۳) اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں، پھر اپنے قول سے رجوع کریں۔

میں اہل ظاہر کہتے ہیں کہ يَعُوْدُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ عورت سے ایک مرتبہ ظہار کرنے کے بعد اگر دوبارہ اسے وہی کلمہ کہے۔ تب اس پر کفارۂ ظہار لازم آتا ہے [1] لہٰذا ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ کا جملہ فَاِنْ فَآءُوْا کی طرح ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عَوْدٌ فِي الظِّهَارِ یہ ہے کہ ظہار کے بعد عورت سے جماع کرے [2] اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک یہاں عَوْدٌ کے معنی ہیں ظہار کے بعد عورت کو اتنی مدت تک روک رکھنا جس میں اسے طلاق دے سکتا ہو، لیکن طلاق نہ دے۔ [3] بعض متاخرین نے کہا ہے کہ ظہار بھی ایک طرح کی قسم ہے اور اس کے معنی ہیں کہ خاوند کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو میری بیوی میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پشت، پھر اس کے بعد اگر وہ اس کام کا ارتکاب کرے تو وہ حانث ہو جائے گا اور آیت ظہار میں بیان کردہ کفارہ کا ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔ لہٰذا آیت۔

﴿ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ (۵۸۔۳) کے معنی یہ ہوں گے کہ جس کام کے نہ کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی اس کی طرف پلٹیں یعنی اپنی قسم توڑنا چاہیں اور یہ ایسے

---

[1] قال في الطبرسی ۷/۲۸ وعن ابی العالیه وبکیر بن عبدالله الاشج و هو مذهب اهل الظاهر لان لفظ العودیدل علی تکریر القول وَرَدَّه ابو علی الفارسی راجع الفتح للشوکانی والمحلیٰ

[2] العزم علی وطئها کما اروی عن قتادة وهو المشهور عن الحنیفة والیه ذهب مالك وائمة البیتؑ راجع الطبرسی وروح المعانی (۷/۲۸)۔

[3] لان السکوت الی زمان یمکنه، ان یطلق فیه ندم منه علی ما ابتداء وهو یعود علی ماابتداء ه والحاصل ان العود بمعنی الندم کما قال ابن عباس راجع الطبرسی والروح۔

ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: فُلَانٌ حَلَفَ ثُمَّ عَادَ یعنی اس نے وہ کام کیا جس کے نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ❶ اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لِمَا قَالُوْا کا تعلق فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ سے ہے اس سے بھی اس آخری قول کی تائید ہوتی ہے نیز اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس قسم کو توڑنے کے بعد اس پر کفارہ لازم ہوگا جیسا کہ اللہ کی قسم اٹھانے کے بعد اس پر کفارہ لازم آتا ہے ❷ جو کہ آیت کریمہ۔
﴿فَكَفَّارَتُهٗ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ﴾ (۵۔۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔ میں مذکورہ ہے۔

اَلْاِعَادَةُ کے معنی لوٹانا کے ہیں، مثلاً بات وغیرہ کو لوٹانا جیسے فرمایا۔
﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى﴾ (۲۰۔۲۱) ہم اس کو (بھی) اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔
﴿اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ﴾ (۱۸۔۲۰) یا پھر اپنے مذہب میں داخل کرلیں گے۔

اَلْعَادَةُ: کسی فعل یا انفعال کو بار بار کرنا حتی کہ وہ طبعی فعل کی طرح سہولت سے انجام پا سکے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ عَادَة طبیعت ثانیہ کا نام ہے۔ اَلْعِيْدُ: وہ ہے جو بار بار لوٹ کر آئے۔ اصطلاح شریعت میں یہ لفظ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ پر بولا جاتا ہے۔ چونکہ شرعی طور پر یہ دن خوشی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ❸ (۵۲) ((اَيَّامُ اَكْلٍ وَشُرْبٍ وَبِعَالٍ)) کہ عید کے دن کھانے پینے اور جماع سے لطف اندوز ہونے کے دن ہیں اس لیے ہر وہ دن جس میں کوئی شادمانی حاصل ہو اس پر عید کا لفظ بولا جانے لگا ہے چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل فرما۔ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے۔ میں عِيْدٌ سے شادمانی کا دن ہی مراد ہے اور اَلْعِيْدُ اصل میں (خوشی یا غم کی) اس حالت کو کہتے ہیں جو بار بار انسان پر لوٹ کر آئے اور اَلْعَائِدَةُ ہر اس منفعت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی چیز سے حاصل ہو۔

اَلْمَعَادُ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور لوٹنے کی جگہ یا زمانہ کو بھی اَلْمَعَادُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔
﴿اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ (۲۸۔۱۰۵) (اے پیغمبر) جس (اللہ) نے تم پر قرآن پاک (کے احکام) کو فرض کیا وہ تمھیں بازگشت کی جگہ لوٹا دے گا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مَعَاد سے مکہ مکرمہ مراد ہے مگر اس کے صحیح معنی وہ ہیں جن کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ذکر کیے

❶ ذکرہ اصحاب الفروع فی ذیل تعلیق الظهار وهو یصح عند الشافعیه وکذا فی بعض الصور عند الحنفیة۔

❷ ففی الآیة تقدیم وتاخیر وهو کثیر فی التنزیل الطبرسی (۷/۲۸) والروح (۹/۲۸)

❸ الفائق (۱/۵۵) والحدیث باختلاف الفاظ فی مسلم واحمد عن کعب بن مالك والدارقطنی عن انس وعبدالله بن حذافة السهمی والنسائی عن ابن مسعود بن الحکم عن امه ومعناه النهی فی ایام التشریق عن صیامها وفی روایة قوله صلی الله علیه وسلم فی یوم العید خاصة الا ان المؤلف فهم ان وزانها وزان یومی عید فاطلق الحدیث والله اعلم۔

ہیں کہ اس سے جنت مراد ہے۔ جس میں آنحضرت ﷺ کو بالقوہ اس وقت پیدا کیا تھا جب کہ آپ ﷺ صلب آدم علیہ السلام میں تھے پھر وہاں سے عالم دنیا میں لاکر آنحضرت ﷺ کو دنیا پر جلوہ گر کیا گیا۔ جیسا کہ آیت۔ ﴿وَاِذْاَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیٓ اٰدَمَ﴾ (۷۔۱۷۲) الآیۃ میں مذکور ہے۔

اور اَلْعَوْدُ: عمر رسیدہ اونٹ کو عَوْدٌ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سیر وعمل کا تکرار کر چکا ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر متواتر سالہا سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ پہلی توجیہ کے لحاظ سے اَلْعَوْدُ (مصدر) بمعنی فاعل ہوگا۔ اور دوسرے اعتبار سے بمعنی مفعول نیز عَوْد پرانے راستہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر بار بار سفر ہو چکا ہوتا ہے اور عَوْدٌ سے ہی عِیَادَۃُ الْمَرِیْضِ مشتق ہے جس کے معنی تیمارداری کے ہیں۔

عِیْدِیَّۃٌ: وہ اونٹ جو عِیْدٌ نامی سانڈ کی نسل سے ہوں۔

اَلْعُوْدُ: بعض نے کہا ہے کہ عُوْد اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اگر کاٹ دیا جائے تو اس میں دوبارہ بڑھنے کی قوت ہو، پھر یہ لفظ خاص کر مزمار یعنی ستار یا اس لکڑی پر بولا جانے لگا ہے جس سے دھونی دی جائے۔

(ع و ذ)

اَلْعَوْذُ (ن) کے معنی ہیں: کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ محاورہ ہے:

عَاذَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ: فلاں نے اس کی پناہ لی۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ﴾ (۲۔۶۷) کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

﴿وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ﴾ (۴۴۔۲۰) اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (۱۱۳۔۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ﴾ (۱۹۔۱۸) میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

اور اَعَذْتُہٗ بِاللّٰہِ اُعِیْذُہٗ کے معنی دوسرے کو اللہ کی پناہ میں دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنِّیْ اُعِیْذُھَابِكَ﴾ (۳۔۳۶) میں اس کو...... تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿مَعَاذَ اللّٰہِ﴾ (۱۲۔۲۳) (کہ خدا پناہ میں رکھے۔) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں اور اس قسم کے برے کام سے بچنے کے لیے اس سے مدد مانگتے ہیں کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے جس کے ارتکاب سے ہمیں کنارہ کش رہنا چاہیے۔

اَلْعَوْذَۃُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی چیز سے بچاؤ حاصل کیا جائے، اسی سے تَمِیْمَۃ یعنی تعویذ اور رُقْیَۃ یعنی دم جھاڑ کو عَوْذَۃٌ کہا جاتا ہے اور عَوَّذَہٗ کے معنی کسی کو (خطرہ سے) بچانے کے ہیں اور ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو اسے سات دن تک عَائِذٌ کہا جاتا ہے۔

(ع و ر)

اَلْعَوْرَۃُ: انسان کے مقام ستر کو کہتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کنائی ہیں اصل میں یہ عار سے مشتق ہے اور مقام ستر کے کھلنے سے بھی چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لیے اسے عَوْرَۃ

کہا جاتا ہے اور عورت کو بھی عورت اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بے ستر رہنے کو باعث عار سمجھا جاتا ہے اسی سے بری بات کو عوراء کہا جاتا ہے۔

عَوِرَتْ عَيْنُهُ عَوَرًا وَعَارَتْ عَيْنُهُ عَوْرًا: اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ عَوَّرْتُهَا: میں نے اسے بھینگا کر دیا۔ اسی سے بطور استعارہ عَوَّرْتُ الْبِئْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: مٹی ڈال ڈال کر کنوئیں کا پانی خشک کر دینا اور مجازاً نظر کی تیزی کی وجہ سے کوے کو اَلْاَعْوَر کہا جاتا ہے جیسے کسی لفظ کو اس کی ضد میں استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (الخفیف)

(٣٢٤) وَصِحَاحُ الْعُيُوْنِ يُدْعَيْنَ عُوْرًا

تندرست آنکھوں والے آدمیوں کو بھینگا کہا جاتا ہے۔

اَلْعَوَارُ وَالْعَوْرَةُ کے معنی کپڑے یا مکان وغیرہ میں شگاف کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَّمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ﴾ (۳۳-۱۳) کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔ یعنی ان میں جگہ جگہ رخنے پڑے ہوئے ہیں جن میں سے جو چاہے ان کے اندر گھس سکتا ہے اسی سے محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يَحْفَظُ عَوْرَتَهٗ کہ فلاں اپنے خلل کی حفاظت کرتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ﴾ (۲۴-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے کے ہیں۔

میں ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ سے پردہ کے تین اوقات مراد ہیں یعنی دوپہر کے وقت۔ عشاء کی نماز کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ (۲۴-۳۱) (یا ایسے لڑکوں سے) جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

سے مراد نابالغ لڑکے ہیں جن میں ہنوز جنسیات کے متعلق باتوں کا شعور پیدا نہ ہوا ہو۔ سَهْمٌ عَائِرٌ وہ تیر جو نامعلوم طرف سے آئے لِفُلَانٍ عَائِرَةٌ مِنَ الْمَالِ فلاں کے پاس اتنا زیادہ مال ہے کہ اس کی فراوانی آنکھ کو حیرت زدہ اور خیرہ کر دیتی ہے۔ ❷ اَلْمُعَاوَرَةُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی مستعار لینے کے ہیں اور اسی سے عَارِيَّةٌ بروزن فَعْلِيَّةٌ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے، تَعَاوَرُوا الْعَوَارِيَّ: استعمال کی چیزیں باہم لینا دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عار سے مشتق ہے چونکہ کوئی چیز مستعار دیگر اس کا واپس لینا بھی موجب عار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے عَارِيَّةٌ کہا جاتا ہے مثل مشہور ہے کہ عَارِيَّةٌ (مستعار لی ہوئی چیز) سے کسی نے دریافت کیا کہ کدھر جا رہی ہو تو اس نے کہا: میں اپنے اہل کے لیے مذمت اور عار لینے جا رہی ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَارِيَّةٌ کا مادہ وادی ہے جیسا کہ تَعَاوَرْنَا کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اور عَارٌ کا مادہ یائی ہے۔ جیسا کہ

---

❶ قاله الكميت وصدره، والحوار التمام ذالسر منهـ ن...... وفي المطبوع يدعون مصحف والتصويب من المراجع والبيت في المحاضرات للمؤلف۔ (٤: ٦٧٣) والمعاني للقبتي ٢٥٨ والعجز في اللسان والتاج (عور) بغير عزو و قبله: نطعم الجيال اللهيدمن الكوم ولم ندع من يشيط الجزورا۔

❷ انظر للمثل الميداني ٢/٧ وفي تاويله اختلاف اختر نامنه تاويل ابي حاتم ١٢

عَيَّرْتُهٗ بِكَذَا کے محاورہ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ع و ق)

اَلْعَائِقُ: وہ جو لوگوں کو خیر اور بھلائی سے روکنے والا ہو لوگوں کو ان کے مقاصد سے روک کر اپنی طرف متوجہ کر لیں اور عَاقَهٗ عَوَّقَهٗ وَاعْتَاقَهٗ: اس نے اسے روک دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ﴾ (۳۳۔۱۸) خدا تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کو منع کرتے ہیں۔

یعنی جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکتے اور منع کرتے ہیں۔ رَجُلٌ عَوْقٌ وَعَوْقَةٌ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے۔

﴿يَعُوْقُ﴾ (۷۱۔۲۳) قبیلہ بنی کنانہ اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے) ایک بت کا نام (تھا)۔

(ع و ل)

عَالَهٗ وَغَالَهٗ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن اَلْغَوْلُ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔جو انسان کو ہلاک کر ڈالے اور اَلْعَوْلُ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو انسان کو گرانبار کر دے اور اس کے بوجھ تلے وہ دب جائے۔محاورہ ہے۔

مَاعَالَكَ فَهُوَ عَائِلِيْ: کہ جو چیز تجھ پر بار ہے وہ مجھ پر بھی گراں بار ہے اور اسی سے عَوْلٌ ہے۔جس کے معنی حق استحقاق سے زیادہ لے کر بے انصافی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا﴾ (۴۔۳) اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔ ❶

اور اسی سے عَالَتِ الْفَرِيْضَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ترکہ کی تقسیم کے وقت وارثوں کے مقررہ حصے دینے کے بعد کچھ مال بچ جانے کے ہیں۔ اَلتَّعْوِيْلُ کے معنی کسی مشکل کام میں دوسروں پر اعتماد کرنے کے ہیں اسی سے عَوْلٌ ہے جس کے معنی بھاری مصیبت کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَيْلَهٗ وَعَوْلَهٗ: ہائے اس کی مصیبت۔اور اسی سے اَلْعَيَالُ یعنی وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو جن کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہو اس کا مفرد عَيِّلٌ ہے عَالَهٗ اس نے فلاں کے اخراجات کا بوجھ اٹھایا۔اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔❷ (۵۳) ((اِبْدَءْ بِنَفْسِكَ ثُمَّ بِمَنْ تَعُوْلُ)) کہ پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو اور پھر ان پر جن کے اخراجات تمھارے ذمہ ہیں۔ اَعَالَ الرَّجُلُ وہ آدمی کثیر العیال ہوگیا۔

(ع و م)

اَلْعَامُ (سال) اور السَّنة کے ایک ہی معنی ہیں۔لیکن اَلسَّنَةُ کا لفظ عموماً اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں

---

❶ من العول المقابل للعدل يقال عال الحاكم اذا جار وعال الميزان اذا مال من جانب الى جانب وايضاً عال الرجل اذا كثرت عياله وبه قال الشافعي في تفسير الآية والنقد عليه من الحريري في درته من سوء الادب فان الشافعي اعلم باللغة منه ومن اضرابه راجع الجمل (١/ ٤٦٢) وروح المعاني (٤/١٧٥) وشرح الدرة الخفاجي (٢٠٥-٢٠٦)۔

❷ والخبر في الدرة للحريري قال الخفاجي في شرح ٢٠٥ وهو بعض حديث رواه الطبراني والحديث في الاصل متفق امالفظ "اِبْدَ ابنفسك" فرواه في (هب ، ن عن جابر) وفي رواية عنه فليبدأ بنفسه (حم، م، د، ت) ولم يروه الاجابر واما لفظة ((وابد أبمن تعول)) فور وفي حديث "اليد العليا خير" وفي "خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى" اور وهما لجميع الطرق على المتقي في كنز (٩ ج ٦ رقم ٢١٦- ٢٢١)۔

تکلیف یا خشک سالی ہو اس بنا پر قحط سالی کو سَنَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور عَامٌ اس سال کو کہا جاتا ہے جس میں وسعت اور فراوانی ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ﴾ (۱۲۔۴۹) اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں نچوڑیں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔ میں لفظ سَنَة کو مستثنیٰ منہ اور لفظ عَامُ کو مستثنیٰ لانے میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ اور عَوْمٌ (ن) کے معنی پانی میں تیرنا بھی آتے ہیں چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ سال کو بھی عَامٌ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں سورج اپنے تمام برجوں میں تیر لیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (۳۶۔۴۰) سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔ میں يَسْبَحُونَ کے لفظ سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

(ع و ن)

اَلْعَوْنُ (کے معنی کسی کی مدد اور پشت پناہی کرنا کے ہیں (نیز عَوْنٌ مددگار) کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ عَوْنِي یعنی فلاں میرا مددگار ہے قَدْ أَعَنْتُهُ (افعال) میں نے اس کی مدد کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ (۱۸۔۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

﴿وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ﴾ (۲۵۔۴) اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی۔

اَلتَّعَاوُنُ: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵۔۲) نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔

اَلْاِسْتِعَانَةُ: مدد طلب کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (۲۔۳) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

اَلْعَوَانُ: ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں۔ قرآن مین ہے۔

﴿عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾ (۲۔۶۸) بلکہ ان کے بین بین یعنی ادھیڑ عمر کی۔

اور کبھی بطور کنایہ کے عمر رسیدہ عورت کو بھی عَوَانٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (البسیط)

(۳۲۵) فَإِنْ أَتَوْكَ فَقَالُوا إِنَّهَا نَصَفٌ
فَإِنَّ أَمْثَلَ نِصْفَيْهَا الَّذِي ذَهَبَا

اگر تمھارے پاس آ کر کہیں کہ ادھیڑ عمر ہے تو تم کہو اس کی عمر کا بہترین حصہ تو گزر چکا ہے۔

اور استعارۃً جو جنگ کئی سال تک جاری ہے اور پرانی ہو

---

[1] البیت فی اللسان والتاج بغیر عزو وفی روایة اطیب بدل امثل وغیر ابدل ذهبا والبیت ایضاً فی المحاضرات للمولف (۳: ۲۰۳) والحماسة مع المرزوقی رقم ۸۷۰ مع آخر وفی التبریزی "وان" بدل فان واختلف فی قرینه ففی الحماسة قبله: لاتنکحن عجوزا وان اتوك بها واخلع ثیابك منه معنا هربا۔ وفی اللسان وفیه اقواء: لا تنکحن عجوزا او مطلقة ولا یسوقنهافی حبلك القدر ۱۲۔

جائے اسے بھی عَـوَانٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پرانی کھجور کو بھی عَوَانَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَلْعَانَۃُ: گورخر اس کی جمع عَانَاتٌ وَعَوْنٌ ہے اَلْعَانَۃُ موئے زہار۔ اس کی تصغیر عُوَیْنَۃٌ ہے۔

(ع ی ب)

اَلْعَیْب وَالْعَاب: نقص اور خرابی، ہر وہ حالت جس سے کسی چیز میں نقص پیدا ہو جائے اور عِبْتُـہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے عیب دار کر دیا، جیسے فرمایا۔

﴿فَـاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَـا﴾ (۱۸۔۷۹) تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کردوں۔

نیز عِبْتُـہٗ کسی چیز کی مذمت کرنے اور اس کا عیب ظاہر کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے عِبْتُ فُـلَانًا (میں نے اس کی مذمت کی)۔

اور عَیْبَۃٌ (بیگ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز چھپا کر رکھی جائے اسی سے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ (۵۴)❶

((اَلْاَنْـصَـارُ کَرْشِیْ وَعَیْبَتِیْ)) کہ انصار میرے مخزن اسرار ہیں۔

(ع ی ر)

اَلْعِیْرُ: قافلہ جو غذائی سامان لاد کر لاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ غلہ بردار اونٹوں اور ان کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں ان کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے مگر کبھی اس کا استعمال صرف ان اونٹوں پر ہوتا ہے جو غذائی سامان اٹھا کر لاتے ہیں اور کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہیں سے غذائی سامان لاتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿فَـلَـمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ﴾ (۱۲۔۹۴) جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا۔

﴿اَیَّتُھَـا الْـعِیْـرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۷۰) کہ قافلے والو! تم چور ہو۔

﴿وَالْـعِیْـرَ الَّتِـیْ اَقْبَـلْنَا فِیْھَا﴾ (۱۲۔۸۲) اور جس قافلے میں ہم آئے۔

اور عَیْـــرٌ کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) گورخر (۲) پاؤں کی پشت پر ابھری ہوئی ہڈی (۳) آنکھوں کی پتلی (۴) کان کی پچھلی طرف ابھری ہوئی نرم ہڈی (۵) خس و خاشاک جو پانی کے اوپر جمع ہو جاتا ہے (۶) میخ (۷) تیر کے پھل کا درمیانی حصہ جو اوپر ابھرا ہوا ہوتا ہے الغرض گو عَیْـرٌ کا لفظ ان سب معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر ان معانی میں باہم مناسبت بیان کرنا تکلف اور تعسف سے خالی نہیں۔

اَلْمِعْیَارُ: ناپ یا تول جانچنے کا معیار۔ اسی سے محاورہ ہے: عَیَّرْتُ الدَّنَانِیْرَ: اشرفیوں کو کسوٹی پر پرکھنا عَیَّرْتُہٗ: میں نے اس کی مذمت کی۔ یہ عَارٌ سے مشتق ہے۔ تَـعَـایَرَ بَـــنُـــوْ فُلَانَ انھوں نے ایک دوسرے کو عار دلائی یا ایک دوسرے کے عیب بیان کیے۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل تَـعَـایَرَ کے معنی ہیں: گورخر کی طرح ایک دوسرے سے دور بھاگنا اور بدکنا اور اسی سے عَـارَتِ الدَّابَّۃُ تَعِیْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں جانور کا بدک کر بھاگ جانا۔ کہا جاتا ہے فُـــلَانٌ عَیَّـارٌ: فلاں آوارہ گرد یا غنڈہ ہے۔

---

❶ کلمۃ من حدیث فی الفائق (۲/۱۹۷) رواہ النسائی عن اسید بن حضیر وانس والترمذی والبخاری و مسلم عن انس بن مالک وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح وتتمتہ: ((ولولا الھجرۃ لکنت امرء من الانصار)) راجع غریب ابی عبید (۱/۱۳۷)

(ع ی س)

﴿عِیْسٰی﴾ (۳۔۴۴۔۵۴) یہ ایک پیغمبر کا نام اور اسم علم ہے اگر یہ لفظ عربی الاصل مان لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ یہ اس عِیْسٌ سے ماخوذ ہو جو کہ اَعْیَسُ کی جمع ہے اور اس کی مونث عَیْسَاءُ ہے اور عِیْسٌ کے معنی ہیں سفید اونٹ جن کی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے عَیْسٌ سے مشتق ہو جس کے معنی سانڈ کے مادہ منویہ کے ہیں اور بَعِیْرٌ اَعْیَسُ وَنَاقَةٌ عَیْسَاءُ (جمع عِیْسٌ اور عَاسَهَا یَعِیْسُهَا کے معنی ہیں: نر کا مادہ سے جفتی کھانا۔

(ع ی ش)

اَلْعَیْشُ: خاص کر اس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان میں پائی جاتی ہے اور یہ لفظ اَلْحَیَاة سے اخص ہے کیونکہ اَلْحَیَاة کا لفظ حیوان، باری تعالیٰ اور ملائکہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اَلْعَیْشُ سے لفظ اَلْمَعِیْشَةُ ہے جس کے معنی ہیں: سامان زیست کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۴۳۔۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

﴿مَعِیْشَةً ضَنْكًا﴾ (۲۰۔۱۲۴) اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ﴾ (۱۵۔۲۰) اور ہم ہی نے تمھارے لیے اس میں زیست کے سامان پیدا کر دیئے۔

﴿لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ﴾ (۷۔۱۰) تمھارے لیے اس میں سامان زیست۔

اور اہل جنت کے متعلق فرمایا۔

﴿فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ﴾ (۱۰۱۔۷) وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ [1] (۵۵) ((لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَةِ)) کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔

(ع ی ل)

اَلْعَیْلَةُ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً﴾ (۹۔۲۸) اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو۔

عَالَ الرَّجُلُ یَعِیْلُ: وہ آدمی محتاج اور ضرورت مند ہوگیا۔ عَائِلٌ: محتاج، ضرورت مند۔ مگر اَعَالَ (افعال) جس کے معنی کثیر العیال ہونے کے ہیں اجوف وادی (ع ول) سے ہے۔ اور آیت۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰی﴾ (۹۳۔۸) اور تجھے ضرورت مند پایا تو غنی کر دیا۔

میں عَائِلًا کے معنی ہیں: تجھ سے فقر نفس کو دور کر کے تجھے غنائے اکبر عطا کی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس غنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ [2] (۵۶) ((اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ)) (کہ اصل غنی تو نفس کی بے نیازی ہے)

---

[1] الحدیث صدر البیت الذی تمثل به رسول الله ﷺ یوم الخندق الا ان فی الصحیحین: الاهم ان العیش عیش الآخرة۔ فارحم الانصار والمهاجره والرجز لرجل من المسلمین وروی: اللهم لاخیر اِلَّا خَیْرَ الْاٰخِرة فانصر الانصار والمهاجره وفی روایة فاغفر وفی روایة فاغفر روایة فاکرم انظر تخریج العراقی (۲/ ۲۷۴) وایضاً فی حجة الوداع رواه الشافعی مرسلا والحاکم متصلا (تخریج العراقی (۴/۱۰۳)

[2] واصل الحدیث متفق علیه ورواه الترمذی من حدیث ابی هریرة وقال حسن صحیح (۲/ ۶۰) وابن حبان فی زوائده (۲۵۲۰)

کہا جاتا ہے۔
مَاعَالَ مُقْتَصِدٌ: اعتدال سے خرچ کرنے والا کبھی فقیر نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے آیت کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنی رحمت اور عفو کا محتاج پا کر تمھارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے اور تجھے اپنی مغفرت سے بہرہ وافر عطا فرما کر غنی کر دیا۔

(ع ی ن)

اَلْعَیْنُ کے معنی آنکھ کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
﴿اَلْعَیْنَ بِالْعَیْنِ﴾ (۵۔۴۵) آنکھ کے بدلے آنکھ۔
﴿لَطَمَسْنَا عَلٰی اَعْیُنِهِمْ﴾ (۳۶۔۶۶) ان کی آنکھوں کو مٹا (کر اندھا) کر دیں۔
﴿وَاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵۔۸۳) ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔
﴿قُرَّةُ عَیْنٍ لِّیْ وَلَكَ﴾ (۲۸۔۹) (یہ) میری اور تمھاری (دونوں کی) آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
﴿كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا﴾ (۲۰۔۴۰) تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اور عَیْنٌ کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ کے بھی آتے ہیں اور فُلَانٌ بِعَیْنِیْ کے معنی ہیں۔ فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے۔ جیسا کہ هُوَ بِمَرْأًی مِّنِّیْ وَمَسْمَعٍ کا محاورہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا﴾ (۵۲۔۴۸) تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔
﴿تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا﴾ (۵۴۔۱۴) وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔
﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ﴾ (۲۰۔۳۹) اور اس لیے کہ تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔
اور اسی سے عَیْنُ اللّٰهِ عَلَیْكَ ہے جس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے۔ یا اللہ تعالیٰ تم پر اپنے نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمھاری حفاظت کریں اور اَعْیُنٌ وَعُیُوْنٌ دونوں عین کی جمع ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ﴾ (۱۱۔۳۱) اور نہ ان کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں کہ۔
﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔
اور استعارہ کے طور پر عَیْنٌ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔
(۱) مشکیزہ کے سوراخ کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر اس سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔
سِقَاءٌ عَیِّنٌ وَمُعِیْنٌ: پانی کی مشک جس سے پانی ٹپکتا ہو عَیِّنْ قِرْبَتَكَ: اپنی نئی مشک میں پانی ڈالو تاکہ تر ہو۔ کر اس میں سلائی کے سوراخ بھر جائیں۔
(۲) جاسوس کو عَیْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فَرْجٌ اور سواری کو ظَهْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ یَمْلِكُ كَذَا فَرْجًا وَكَذَا ظَهْرًا (فلاں کے پاس) اس قدر لونڈیاں

اوراتنی سواریاں ہیں۔(۳) عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ یہ جواہر میں افضل سمجھا جاتا ہے۔جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اسی سے افاضل قوم کو اَعْیَانٌ کہا جاتا ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اَعْیَانُ الْاِخْوَۃِ کہا جاتا ہے۔

(۴) بعض نے کہا ہے کہ عَیْنٌ کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کُلُّ مَالِہٖ عَیْنٌ تو یہ معنی مجازی ہوگا، جیسا کہ غلام کو رَقَبَۃٌ (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فَرْجٌ (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود ہی یہی جگہ ہوتی ہے۔

(۵) پانی کے چشمہ کو بھی عَیْنٌ کہا جاتا ہے۔کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عَیْنُ الْمَاءِ سے مَاءٌ مَعِیْنٌ کا محاورہ لیا گیا ہے۔جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے اور عَیْنٌ کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿عَیْنًا فِیْھَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا﴾ (۷۶۔۱۸) یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔

﴿وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا﴾ (۵۴۔۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیے۔

﴿فِیْھِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ﴾ (۵۵۔۵۰) ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

﴿عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾ (۵۵۔۶۶) دو چشمے ابل رہے ہیں۔

﴿وَاَسَلْنَا لَہٗ عَیْنَ الْقِطْرِ﴾ (۳۴۔۱۲) اور ان کے لیے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

﴿فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ﴾ (۱۵۔۴۵) باغ اور چشموں میں۔

﴿مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ﴾ (۴۴۔۲۵،۲۶) باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں: میں نے اس کی آنکھ پر مارا۔جیسے رَأَسْتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے سر پر مارا اور فَأَدْتُہٗ: میں نے اس کے دل پر مارا نیز عِنْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے نظر بد لگادی جیسے سَفْتُہٗ کے معنی ہیں: میں نے اسے تلوار سے مارا، یہ اس لیے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سِفْتُہٗ وَرَمَحْتُہٗ۔ چنانچہ یَدَیْتُہٗ کا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عِنْتُ الْبِئْرَ کے معنی ہیں: کنواں کھودتے کھودتے اس کے پانی کے چشمہ تک پہنچ گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ﴾ (۲۳۔۵۰) ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور نتھرا ہوا پانی جاری تھا۔

﴿فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَاءٍ مَّعِیْنٍ﴾ (۶۷۔۳۰) تو (سوائے خدا کے) کون ہے جو تمھارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہالائے۔

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْنٌ میں لفظ میم حروف اصلیہ سے ہے اور یہ مَعَنْتُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور عَیْن کا لفظ بطور استعارہ ترازو کے جھکاؤ پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی

خوب صورتی کی وجہ سے اَعْیَنُ وَعَیْنَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع عِیْـنٌ ہے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عِیْـنٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَـاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ ﴾ (۳۷۔۴۸) جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

﴿وَحُـوْرٌ عِیْـنٌ ﴾ (۵۶۔۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

(ع ی ی)

اَلْاِعْیَـاءُ کے معنی اس درماندگی اور تکان کے ہیں جو چلنے سے پیدا ہو جاتی ہے اور عِـیٌّ کے معنی کسی کام یا بات کو نہ کر سکنا کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَـعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ﴾ (۵۰۔۱۵) کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے ہیں۔

﴿وَلَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ ﴾ (۴۶۔۳۳) اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں اور اسی سے ہے: عَیَّ فِیْ مَنْطِقِهٖ عَیًّـا فَهُوَعَـیٌّ۔ جس کے معنی سخن سے عاجز ہونے کے ہیں۔ رَجُـلٌ عَیَایَاءُ طِبَاقَاءُ: مرد جو سخن اور کام کرنے سے عاجز ہو دَاءٌ عَیَاءٌ لا علاج مرض۔

❀❀❀

کِتَابُ الْغَیْن

(غ ب ر)

اَلْغَابِرُ: اسے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۷۱) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: غَابِرِیْنَ سے عمر رسیدہ لوگ مراد ہیں اور بعض نے اس سے پیغمبر کے مخالفین لوگ مراد لیے ہیں جو (سدوم میں) پیچھے رہ گئے تھے اور لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں گئے تھے بعض نے عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے والے لوگ مراد لیے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مقام پر۔

﴿اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِیْنَ﴾ (۲۹۔۳۳) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ اور دوسرے مقام پر:

﴿قَدَّرْنَا اِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِیْنَ﴾ (۱۵۔۶۰) اس کے لیے ہم نے ٹھہرا دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائے گی۔

فرمایا ہے اور اسی سے غُبْرَةٌ ہے جس کے معنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ کے ہیں۔ اس کی جمع اَغْبَارٌ آتی ہے غُبَّرُ اللَّیْلِ: رات کا بقیہ۔ غُبَّرُ الْحَیْضِ: حیض کا بقیہ۔

اَلْغُبَارُ (مٹی اڑنے کے بعد جو گرد و غبار (فضا میں) باقی رہ جاتا ہے، اسے غبار کہا جاتا ہے۔ یہ دُخَانٌ اور عُثَارٌ وغیرہما (فعال) کے وزن پر ہے جو کہ بقیہ شے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور غَبَرَ الْغُبَارُ کے معنی ہیں گرد و غبار بلند ہونا اور اُڑنا کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ غَابِرٌ: کا لفظ ماضی اور باقی (مستقبل) دونوں پر بولا جاتا ہے اس قول کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ غبار بھی چونکہ زمین سے اٹھ کر اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی ماضی آجاتا ہے اور دوڑتے ہوئے چونکہ غبار پیچھے باقی رہ جاتا ہے اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی باقی یعنی مستقبل آجاتا ہے۔ اور غبار سے غَبْرَةٌ مشتق ہے اور اس کے معنی یا تو اس گرد و غبار کے ہیں جو کسی چیز پر جم جاتا ہے اور خاکستری رنگ کی چیز کو بھی غَبَرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت۔

﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ عَلَیْهَا غَبَرَةٌ﴾ (۸۰۔۴۰) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوئی ہوگی۔

میں بطور کنایہ حسرت آگیں چہرے سے مراد ہیں جو غم کے باعث افسردہ نظر آئیں گے جس طرح کہ ﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ (۱۶۔۵۸) میں چہرہ کے سیاہ پڑنے سے غمناک ہونا مراد ہے کہا جاتا ہے۔ غَبَرَ، غَبْرَةً وَاغْبَرَّ وَاغْبَارَّ: غبار آلود ہونا اور طرفہ کے شعر ❶ (الطّویل)

(۳۲۶) رَأَیْتُ بَنِیْ غَبْرَاءَ لَا یُنْكِرُوْنَنِیْ

---

❶ وفی اضدا وابی الطیب ۵۲۷ یاتی بمعنی الباقی والماضی والاول اکثر واعرف وعده العلماء من الاضداد۔

فقراء اور مہمان مجھے اجنبی خیال نہیں کرتے ہیں اور نہ اغنیاء مجھ سے ناواقف ہیں۔

میں بَنِیْ غَبْرَاءَ سے ریگستانوں میں رہنے والے لوگ مراد ہیں۔ ❶ جو ہر وقت غبار آلود رہتے ہیں جیسا کہ بنو السبیل سے مراد مسافر ہوتے ہیں۔ اور دَاهِيَةٌ غَبْـرَاء (بڑی مصیبت کا) محاورہ یا تو غَبَرَ الشَّیْءُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی غبار میں واقع ہونے کے ہیں گویا مصیبت بھی انسان کو غبر آلود کر دیتی ہے اور ہوش سنبھالنے نہیں دیتی اور یا یہ غَبْـرٌ سے مشتق ہے جس کے باقی رہنے کے ہیں اس اعتبار سے غَبْرَآءُ اس مصیت کو کہا جائے گا جو باقی رہے اور گزرنے نہ پائے اور یا یہ غَبَـرَةُ اللَّوْن سے مشتق ہے جس طرح کہ دَاهِيَةٌ زَبَاء کا محاورہ ہے اور یا غَبَرَةُ اللبن سے جس کے معنی تھنوں میں بقیہ دودھ کے ہیں۔ اور ان سب اشتقاقات کے اعتبار سے غَبْـرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائے گا جو گزر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے اور یا یہ عِـرْقٌ غَبِـرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیہم تڑپنے والی رگ کے ہیں چنانچہ جاتا ہے (غَبِرَ الْعِرْقُ) رگ پھڑکی۔ اَلْـغُبَيْرَاءُ نوع از گیاہ ریگستانی، ثمرہ گیاہ جو غبار کے رنگ پر ہوتا ہے۔

(غ ب ن)

اَلْـغَبْـنُ (ض) کے معنی باہمی معاملہ میں پوشیدہ طور پر اپنے ساتھی کا حق مارنے کے ہیں ❷ اگر یہ کسی مال وغیرہ میں ہو تو غَبَــنَ فُلَانٌ کہا جاتا ہے اور اگر رائے وغیرہ میں ہو تو غَبِنَ کہتے ہیں اور غَبَنْتُ كَذَا غَبْنًا کے معنی کسی چیز سے غفلت برتنے کو خسارا خیال کرنے کے ہیں اور قرآن پاک میں ﴿يَـوْمُ التَّـغَـابُنْ﴾ (۶۴۔۹) نقصان اٹھانے کا دن سے يَـوْمُ الْقِيَامَةِ مراد ہے کیونکہ قیامت کے روز اس مبایعت (معاملہ) میں جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَمِـنَ الـنَّـاسِ مَـنْ يَشْـرِىْ نَفْسَـهُ ابْتِغَـآءَ مَـرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹۔۱۱) آلایۃ خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں۔

﴿اَلَّـذِيْـنَ يَشْتَـرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَـلِيْلاً﴾ (۳۔۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں کو (بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

میں اشارہ فرمایا ہے نقصان ظاہر ہوگا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اس معاملہ کو جو انھوں نے اپنے اللہ

---

❶ وتمامه ولا اهل، بذلك الطراف الممدد ۔ والبيت من معلقته المشهورة التى مطلعها: لخولة اطلال ببرقة ثهمد۔ تلوح كباقى الوشم فى ظاهر اليد قال المبردارا د ببنى غبراء لـلصوص والمشهور المرادمنه الفقراء والاضياف بالبيت فى الخزانة (۴: ۲۲۸) والـلسـان وشـرح ابـن الانبـارى (۱۹۲) والـمعانى للقتبى ۲۴۸ والعشر للتبريزى۔ ۸ ومختار الشعرا الجاهلى (۱/۲۳۱) والعينى (۱: ۴۱۰) والفائق (۲: ۸۰) والجمهرة ۵۵ والعقد الثمين ۵۷ والانبارى ۴۸۰۔

❷ قـال الـحريرى الغبن باسكان الباء فى المال وبفتحها يقع فى العقل و الرأى قـال الخفاجى وهذا ماذهب اليه بعض اهل اللغة وليس المتعين ۱۲۔

کے ساتھ کیا تھا، چھوڑ کر اس کی بجائے متاع دنیا حاصل کر کے انھوں نے کس قدر نقصان اٹھایا ہے کسی سے دریافت کیا گیا کہ قرآن پاک میں قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ کیوں کہا گیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کیونکہ وہاں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف اشیاء کا ظہور ہو گا جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگایا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل میں غَبْنٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبَنُ (بفتح الباء) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے اور دلیل میں یہ شعر پیش کیا ہے۔ [1] (المنسرح)

(۳۲۷) وَلَمْ اَرَ مِثْلَ الْفِتْيَانِ فِیْ غَبَنِ
الرَّأْيِ يُنْسٰى عَوَاقِبُهَا

اس رائے کے چھپانے میں نوجوانوں جیسا کوئی نہیں دیکھا جس کے نتائج کو بھلا دیا جائے۔

چنانچہ مڑنے والے اعضاء جیسے بغل اور کنج ران وغیرہ کو مغابن کہا جاتا ہے کیونکہ اعضاء کے یہ حصے بھی پوشیدہ رہتے ہیں اور (نفاست پسند) عورت کو طَيِّبَةُ الْمَغَابِنِ کہا جاتا ہے۔

(غ ث و)

اَلْغُثَاءُ: ہانڈی کے جھاگ اور اس کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے ضرب المثل ہے جسے (بوجہ بے سود ہونے کے) ضائع ہونے دیا جائے [2] اور اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جائے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ غَثَا الْوَادِیْ (ن) غَثْوًا: یعنی وادی میں کوڑا کرکٹ زیادہ ہو گیا۔ غَثَتْ (ض) نَفْسُهٗ تَغْثِیْ غِثْيَانًا اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔

(غ د ر)

اَلْغَدْرُ (ض) اس کے اصل معنی کسی چیز میں خلل واقع کرنے اور اسے چھوڑ دینے کے ہیں اور تَرْكَ الْعَهْدِ یعنی بے وفائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے فُلَانٌ غَادِرٌ (بے وفا) کا محاورہ ہے۔ غَادِرٌ کی جمع غَدَرَةٌ ہے۔ اور بہت بڑے بے وفا اور عہد شکن کو غَدَّارٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْغَدَرُ وَالْغَدِيْرُ اس پانی کو کہتے ہیں جو سیلاب کسی جوہڑ میں چھوڑ جائے غَدِيْرٌ کی جمع غُدْرَانٌ وَغُدُرٌ آتی ہے اور اِسْتَغْدَرَ الْغَدِيْرُ کے معنی ہیں: تالاب میں پانی جمع ہو گیا۔

غَدِيْرَةٌ: لمبے بال، گیسو بافتہ اس کی جمع اَلْغَدَائِرُ ہے اور غَادَرَهٗ کے معنی ہیں اس نے اسے چھوڑ دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا﴾ (۱۸۔۴۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔

﴿فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا﴾ (۱۸۔۴۷) تو ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔

غَدَرَتِ الشَّاةُ (عَنِ الْغَنَمِ) کے معنی بکری کے

[1] قاله عدی بن زید مناة والبيت فی امالی ابن الشجری وشرح الدرة للخفاجی ۲۔۳ وفی روایتها...... فی غبن الله ایام ينسون ماعواقبها والبيت فی الشعراء ۵۲ والعمدة (۱: ۱۰۴) والاغانی (۱۴۸/۲) والمعانی الكبير للقبتی ۱۲۷۰ قال وغبن الايام ما يغبن منهما فينقضى ان عملوا فيه لآخرتهم وبعده: ما يغفلوا لايكن لهم يتم فی كل صرف تسعی ماربها ولم ارفی المراجع من رواه برواية المؤلف فاخشی ان تكون الرواية محرفة۔

[2] وفی القرآن فجعلتهم غثاء (۲۳۔۴۱)

دوسری بکریوں سے پیچھے رہ جاتا ہے ہیں اس سے صیغہ (صفت فاعلی) غَدِرَۃ ہےاور غَدِرٌ اس سنگ زار زمین کو کہتے ہیں جس میں عرصہ دراز تک ویران پڑا رہنے کی وجہ سے، سوراخ پڑ گئے ہوں اور اس میں اونٹ یا گھوڑا چلے تو لنگڑا ہو جائے اسی سے محاورہ ہے: مَـــا اَثْبَـــتَ غَـدَرَهٰـذَا الْفَرَسِ کہ یہ گھوڑا کس قدر ثابت قدم ہے مَـا اَثْبَـتَ غَدَرَهٗ وہ کس قدر ثابت قدم ہے یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو لغزش کے موقعہ پر ثابت قدم رہے۔

(غ د ق)

اَلْـــغَـدَقُ: کے معنی بہت زیادہ اور وافر کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا﴾ (۷۲-۱۶) تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے۔

اور اسی سے غَـدِقَـتْ عَيْنُهٗ تَغْدَقُ ہے جس کے معنی آنکھ سے خوب پانی بہنا کے ہیں اور غَيْدَاقٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو وافر اور زیادہ ہو عام اس سے کہ پانی ہو یا گفتگو اور یا دوڑ ہو۔

(غ د و)

اَلْغُدْوَةُ وَالْغَدَاةُ کے معنی دن کا ابتدائی حصہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں غُدُوٌّ (غُدْوَة کی جمع) کے مقابلہ میں اٰصَالٌ استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿بِـالْـغُـدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۷-۲۰۵) صبح وشام (یاد کرتے رہو۔)

(اور غُدُوٌّ (مصدر) رَوَاحٌ کے مقابلہ میں) جیسے فرمایا:

﴿غُـدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ﴾ (۳۴-۱۲) اس کا صبح کا جانا ایک مہینہ کی راہ ہوتی ہے اور شام کا جانا بھی ایک مہینے کی۔

اور غَدَاةٌ کے مقابلہ میں عَشِيٌّ جیسے فرمایا۔

﴿بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ﴾ (۶-۵۲) صبح وشام۔

اَلْـغَادِيَةُ: صبح کا بادل۔ اَلْغَدَآءُ: کھانا جو دن کے ابتدائی حصہ میں کھالیا جائے غَـدَوْتُ اَغْدُوْ کے معنی ہیں: صبح سویرے روانہ ہونا یا کسی جگہ پہنچ جانا ہیں۔قرآن میں ہے۔

﴿اَنِ اغْـدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ﴾ (۶۸-۲۲) اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔

غَدٌ: کل آئندہ۔جیسا کہ آیت

﴿سَيَـعْلَمُوْنَ غَدًا﴾ (۵۴-۲۶) ان کو کل معلوم ہو جائے گا۔اور دیگر آیات میں مذکور ہے۔[1]

(غ ر ر)

غَرَرْتُ (ن) فُلَانًا (فریب دینا) کسی کو غافل پا کر اس سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ غِـــرَّةٌ: بیداری کی حالت میں غفلت۔ غِرَارٌ: اونگھ کے ساتھ غفلت، اصل میں یہ غُرٌّ سے ہے جس کے معنی کسی شے پر ظاہری نشان کے ہیں۔ اسی سے غُرَّةُ الْفَرَسِ (گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) ہے اور غِـــرَارُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں۔

غَرُّ الثَّوْبِ: کپڑے کی تہ۔اسی سے محاورہ ہے۔

اِطْوِهٖ عَـلٰـى غَرِّهٖ: کپڑے کو اس کی تہ پر لپیٹ دو یعنی اس معاملہ کو جوں کا توں رہنے دو۔ غَـرَّهٗ كَذَا غُرُوْرًا: اسے فریب دیا۔گویا اسے اس کی تہ پر لپیٹ دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ (۸۲-۶) اے انسان!

---

[1] راجع الآيات (۵۹-۱۸) (۱۸-۲۳) (۳۱-۳٤)

تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا۔

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ (۳۔۱۹۶) (اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمھیں دھوکا نہ دے۔

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۴) اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے سب دھوکا ہے۔

﴿بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۰) بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں محض فریب ہے۔

﴿يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶۔۱۱۳) وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (۳۔۱۸۵) اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (۶۔۷۰) اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۳۳۔۱۲) کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکے کا وعدہ کیا تھا۔

﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (۳۱۔۳۳) اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمھیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔

پس غرور سے مال و جاہ، خواہش نفسانی، شیطان اور ہر وہ چیز مراد ہے جو انسان کو فریب میں مبتلا کر دے بعض نے غُرُوْرٌ سے مراد صرف شیطان لیا ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، شیطان ان سب سے زیادہ خبیث ہے اور بعض نے اس کی تفسیر دنیا سے کی ہے کیونکہ دنیا بھی انسان سے فریب کھیلتی ہے دھوکا دیتی ہے نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

اَلْغُرُوْرُ: دھوکا۔ یہ غَرٌّ سے ہے اور (حدیث میں) بیع اَلْغَرَرِ سے منع کیا گیا ہے۔❶ (۵۷) اَلْغِرِيْرُ: اچھا خلق۔ کیونکہ وہ بھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ (بوڑھے شخص کے متعلق محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَدْبَرَ غَرِيْرُهٗ وَاَقْبَلَ هَرِيْرُهٗ (اس سے حسن خلق جاتا رہا اور چڑ چڑا پن آگیا) اور غُرَّةُ الْفَرَسِ سے تشبیہ کے طور پر مشہور معروف آدمی کو اَغَرّ کہا جاتا ہے اور مہینے کی ابتدائی تین راتوں کو غُرَرٌ کہتے ہیں کیونکہ مہینہ میں ان کی حیثیت غُرَّةُ الْفَرَسِ کی ہوتی ہے غِرَارُ السَّيْفِ: تلوار کی دھار اور غِرَارٌ کے معنی تھوڑا سا دودھ کے بھی آتے ہیں اور غَارَّتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہو گیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اس کا دودھ کم ہو جائے گا گویا کہ اس اونٹنی نے مالک کو دھوکا دیا۔

(غ ر ب)

اَلْغَرْبُ: (ن) سورج کا غائب ہو جانا۔ غَرَبَتْ تَغْرُبُ غَرْبًا وَغُرُوْبًا سورج غروب ہو گیا اور مَغْرِبُ الشَّمْسِ وَمُغَيْرِبُهَا (مصغر) کے معنی آفتاب غروب ہونے کی جگہ یا وقت کے ہیں۔❷ قرآن میں ہے۔

❶ رواه الجماعة الا البخاری من حديث ابی هريرة و احمد من حديث ابن عمرو ابن ماجة من حديث ابن عباس وعن سهل عند الطبرانی والبيع الغرر صور (راجع النيل (۵: ۱۵۶۔۱۵۷) ومنه المثل الغرة تجلب الدرة (الميدانی ۲/ ۶۲)

❷ تصغير مغربان

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷۳۔۹) (وہی) مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔
﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۵۵۔۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔
﴿بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ (۷۰۔۴۰) مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔
ان کے تثنیہ اور جمع لانے کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ ❶ نیز فرمایا۔
﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ (۲۴۔۳۴) کہ نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف۔
﴿حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ﴾ (۱۸۔۸۶) یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا۔
اور ہر اجنبی کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی ہم جنس چیزوں میں بے نظیر اور انوکھی ہو اسے بھی غَرِيْبٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ❷ (۵۸) اَلْاِسْلَامُ بَدَءَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَابَدَءَ کہ اسلام ابتداء میں غریب تھا اور آخر زمانہ میں پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا اور جہلاء کی کثرت اور اہل علم کی قلت کی وجہ سے علماء کو غرباء کہا گیا ہے۔ اور کوّے کو غُرَاب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بھی دور تک چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ﴾ (۵۔۳۱) اب اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کرید نے لگا۔
اور غَارِبُ السَّنَامِ کے معنی کوہان کی بلندی کے ہیں کیونکہ (بلندی کی وجہ سے) اس تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور غَرْبُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں کیونکہ تلوار بھی جسے ماری جائے اس میں چھپ جاتی ہے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ پھر جس طرح زبان کو تلوار کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اسی طرح زبان کی تیزی کو بھی تلوار کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ غَرْبُ اللِّسَانِ (فلاں تیز زبان ہے) کہا جاتا ہے اور کنویں میں بُعد مسافت کے معنی کا تصور کر کے ڈول کو بھی غَرْبٌ کہہ دیا جاتا ہے اور اَغْرَبَ السَّاقِيْ کے معنی ہیں: پانی پلانے والے نے ڈول پکڑا۔ اور غَرْبٌ کے معنی سونا بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی دوسری معدنیات سے قیمتی ہوتا ہے اور اسی سے سَهْمٌ غَرْبٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ تیر جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کدھر سے آیا ہے۔ اور بلا ارادہ کسی طرف دیکھنے کو نَظَرٌ غَرْبٌ کہا جاتا ہے اور غَرْبٌ کا لفظ بے پھل درخت پر بھی بولا جاتا ہے گویا وہ ثمرات سے دور ہے۔
بیان کیا جاتا ہے کہ عَنْقَاء جانور ایک لڑکی کو اٹھا کر دور دراز لے گیا تھا۔ اس وقت سے اس کا نام عَنْقَاءُ مُغْرِبٌ اَوْعَنْقَاءُ مُغْرِبٍ (اضافت کے ساتھ) پڑ گیا۔
اَلْغُرَابَانِ: سرینوں کے اوپر دونوں جانب کے گڑھے جو

---

❷ راجع (ش ر ق)
❸ الحديث باختلاف الفاظه فى (م،ه) عن ابى هريرة رضى الله عنه وابن مسعود وانس بن مالك رضى الله عنه وفى (طب) عن سلمان وسهل بن سعد وابن عباس وبمعناه فى الترمذى عن عمر بن عوف المزنى وابو نصرالسجزى فى الايانة عن عبدالرحمان بن سنة ونعيم بن حماد فى الفتن عن مجاهد والحاكم عن سعد بن ابى وقاص (انظر كنزالعمال رقم ۱۱۹۳ ـ ۱۱۹۵ و رقم ۱۱۹۹ : ۱۲۰۲۔

ہیئت میں کوے کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اَلْمُغْرَبُ گھوڑا جس کا کرانۂ چشم سفید ہو کیونکہ اس کی آنکھ اس سفیدی میں عجیب وغریب نظر آتی ہے۔اور آیت کریمہ۔ ﴿غَرَابِیْبُ سُوْدٌ﴾ (۳۵-۲۷) کالے سیاہ ہیں۔میں بعض نے کہا ہے کہ غَرَابِیْبُ کا واحد غِرْبِیْبٌ ہے اور اس کے معنی کوے کی طرح بہت زیادہ سیاہ کے ہیں جس طرح کہ اَسْوَدُ کَحَلَكِ الْغُرَابِ کا محاورہ ہے۔ (یعنی صفت تاکیدی ہے اور اس میں قلب پایا جاتا ہے اصل میں سُوْدٌ غَرَابِیْبُ ہے۔[1]

(غ ر ض)

اَلْغَرْضُ کے اصل معنی نشانہ کے ہیں پھر ہر اس غایت کو جہاں پہنچنا مقصود ہو، غَرْضٌ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع اَغْرَاضٌ آتی ہے۔

غرض دو قسم پر ہے۔غرض ناقص جو بالذات مقصود نہ ہو بلکہ اس سے کوئی دوسری چیز مقصود ہو جیسے تونگری یا ریاست یا اس قسم کی دوسری اغراض جن کے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں (۲) غرض تام: جس کے بعد کسی اور چیز کا اشتیاق باقی نہ رہے۔جیسے جنت۔[2]

(غ ر ف)

اَلْغَرْفُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اٹھانے اور پکڑنے کے ہیں جیسے: غَرَفْتُ الْمَاءَ اَوِالْمَرَقَ (میں نے پانی یا شوربہ لیا) اور غُرْفَةٌ: کے معنی چلو بھر پانی کے ہیں اور اَلْغُرْفَةُ ایک مرتبہ چلو سے پانی نکالنا اَلْمِغْرَفَةُ: چمچ غیرہ جس سے شوربہ وغیرہ نکال کر برتن میں ڈالا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ﴾ (۲-۲۴۹) ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر)۔

اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔ غَرَفْتُ عَرَفَ الْفَرَسِ: میں گھوڑے کی پیشانی کے بال کاٹ ڈالے۔ غَرَفْتُ الشَّجَرَةَ: میں نے درخت کی ٹہنیوں کو کاٹ ڈالا۔

اَلْغَرَفُ: ایک قسم کا پودا (جس سے چمڑے کو دباغت دی جاتی ہے) غَرَفَتِ الْاِبِلُ: اونٹ غرف کھا کر بیمار ہو گئے۔ اَلْغُرْفَةُ: بالا خانہ (جمع غُرَفٌ وَغُرَفَاتٌ) قرآن میں جنت کے منازل اور درجات کو اَلْغُرَفُ کہا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۲۵-۷۵) ان صفات کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔

﴿لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا﴾ (۲۹-۵۸) ان کو ہم بہشت کے اونچے اونچے محلوں میں جگہ دیں گے۔

﴿وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (۳۴-۳۷) اور وہ خاطر جمع سے بالا خانوں میں بیٹھے ہوں گے۔

(غ ر ق)

اَلْغَرْقُ: پانی میں تہ نشین ہو جانا، کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔غَرِقَ (س) فُلَانٌ يَغْرَقُ غَرَقًا: فلاں پانی میں ڈوب گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰-۹۰) یہاں تک کہ

---

[1] كذا قال النسفي راجع معجم القرآن لعبد الرؤف مصري ۱۲۔

[2] وليس في القرآن من هذا المادة۔ ۱۲

جب اسے غرقابی نے آلیا۔

اَغْرَقَهٗ (افعال) اس نے اسے ڈبویا غرق کردیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ﴾ (۲۔۵۰) اور ہم نے آل فرعون کو غرق کردیا۔

﴿فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا﴾ (۱۷۔۱۰۳) تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے،سب کو ڈبودیا۔

﴿ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۲) پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو ڈبودیا۔

﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ﴾ (۳۶۔۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کردیں۔

﴿اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا﴾ (۷۱۔۲۵) غرقاب کر دیے گئے پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ (۱۱۔۴۳) اور وہ ڈوب گیا

اور تشبیہ کے طور پر زیر بار احسان ہونے کے لیے بھی اَلْغَرْق کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔جیسے:

فُلَانٌ غَرِقٌ فِیْ نِعْمَةِ فُلَانٍ: فلاں اس کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ❶

(غ ر م)

اَلْغُرْمُ (مفت کا تاوان یا جرمانہ) وہ مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جنایت (جرم) کا ارتکاب کیے بغیر انسان کو اٹھانا پڑے غَرِمَ كَذَا غُرْمًا وَمَغْرَمًا فلاں نے نقصان اٹھایا اُغْرِمَ فُلَانٌ غَرَامَةً اس پر تاوان پڑ گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۶) (کہ ہائے) ہم مفت تاوان میں پھنس گئے۔

﴿فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ (۵۲۔۴۰) کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

﴿يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾ (۹۔۹۸) کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں۔

اور غَرِيْمٌ کا لفظ مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لیے آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالْغٰرِمِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۶۰) اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) کے لیے اور خدا کی راہ میں۔

اور جو تکلیف یا مصیبت انسان کو پہنچتی ہے اسے غَرَامٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (۲۵۔۶۵) کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے۔

یہ هُوَ مُغْرَمٌ بِالنِّسَآءِ (وہ عورتوں کا دلدادہ ہے) کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ شخص جو غَرِيْمٌ (قرض خواہ) کی طرح عورتوں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہو۔حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ❷ كُلُّ غَرِيْمٍ مُفَارِقٌ غَرِيْمَهٗ اِلَّا النَّارُ یعنی ہر قرض خواہ اپنے مقروض کو چھوڑ سکتا ہے۔لیکن آگ اپنے غُرَمَاءُ کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے عذاب جہنم کو غرام کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ

---

❶ وجاء بمعنى المبالغة في الشيء كما في الآية والنازعات غرقا (۷۹۔۱) معناه النزع بالمبالغة والقوة التامة (راجع، الكشاف ۳۰۸/۳) ج ۳۔

❷ راجع لقول الحسنؓ

وہ عذاب ان کا اسی طرح پیچھا کرے گا یا وہ انہیں ہلاک کرنے پر شیفتہ ہے۔

(غ ر و)

غَرِیَ بِکَذَا کے معنی کسی کے ساتھ چمٹ جانا ہیں اصل میں یہ غَرَاءٌ سے ہے اور غِرَاءٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری کے ساتھ پیوست کیا جائے اور اسی سے اَغْرَیْتُ فُلَانًا بِکَذا کے معنی ہیں: میں نے فلاں کو اس پر شیفتہ کر دیا، اس پر ابھارا اور اکسایا اس کے پیچھے لگا دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَغْرَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (۵۔۱۴) تو ہم نے ان کے باہم، قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال دیا۔

﴿لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ﴾ (۳۳۔۶۰) تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

(غ ز ل)

اَلْغَزْلُ: (ض) کاتے ہوئے سوت کو کہتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا﴾ (۱۶۔۹۲) اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے اپنا کاتا ہوا سوت ادھیڑ دیا۔

غَزَلَتْ غَزْلاً: سوت کاتنا اور ہرنی کے بچہ کو غَزَالٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْغَزَالَۃُ: سورج کی ٹکیہ اور کنایہ کے طور پر غَزَلٌ (س) اور مُغَازَلَۃٌ کے معنی غزال یعنی ہرنوٹے جیسی خوبصورت عورتوں کے ساتھ عشق ومحبت اور دلبستگی کی باتیں کرنا آتے ہیں۔

غَزِلَ الْکَلْبُ غَزَالاً کتے کا ہرن کو پاکر اس سے پیچھے ہٹ جانا۔

(غ ز و)

اَلْغَزْوُ کے معنی دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلنا ہیں۔ غَزَا یَغْزُوْ غَزْوًا: وہ دشمن سے جنگ کے ارادہ سے نکلا ایسے شخص کو اَلْغَازِیْ کہا جاتا ہے۔اس کی جمع غَزَاۃٌ وَغُزًّ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ کَانُوْا غُزًّی﴾ (۳۔۱۵۶) یا وہ جہاد کررہے ہوں۔

(غ س ق)

غَسَقُ اللَّیْلِ کے معنی (ابتدائے) شب کی سخت تاریکی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ﴾ (۱۷۔۷۸) رات کی تاریکی تک۔

اَلْغَاسِقُ: تاریک رات۔ ❶ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳۔۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کی تاریکی چھا جائے۔اور اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں۔جیسے طَارِقٌ (رات کے وقت آنے والا) بعض نے کہا ہے کہ ❷ غَاسِقٌ چاند کو کہتے ہیں جب کہ وہ

---

❶ کذا فسرہ القبتی فی غریبہ وفی الفخر ۱۹۴/۳۲ : وھذا قول الفراء وابی عبیدۃ وقال الزجاج الغاسق فی اللغۃ البارد وسمی اللیل غاسقاً لانہ ابردمن النھار (القرطبی ۲۵۶/۲۰) وھو قول ابن عباس وغیرہ روی مرفوعاً

❷ وھذا ایضا حکاء القتبی فی غریبہ ۵۴۳ وقد نقلہ القرطبی (۲۵۷/۲ والبحر (۵۳۱/۸) والفخر (۱۹۵/۳۲) واللسان (غسق او قدروی مرفوعا (راجع النھایہ (۱۶۱/۳) والطبری (۳۵۲/۳۰) والکشاف (۵۶۸/٤) والدر (٤۱۸) والشوکانی (۵۰۶) راجع کنزالعمال عن عائشۃ (ج۲ رقم ۷۳)

گہن لگ کر سیاہ ہو جائے۔ اَلْغَسَّاقُ دوزخیوں کے جسموں سے بہنے والا لہو یا پیپ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا﴾ (۷۸۔۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

(غ س ل)

غَسَلْتُ الشَّیْءَ غُسْلاً: کے معنی کسی چیز پر پانی بہا کر اسے میل کچیل سے پاک کرنے کے ہیں۔ اسی سے غُسْلٌ اسم ہے اور غِسْلٌ وہ چیز ہے جس کے ساتھ کپڑے کو دھویا یا نہایا جاتا ہے (جیسے صابن وغیرہ) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اَلاٰيَة﴾ (۵۔۶) تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔

اَلْاِغْتِسَالُ (افتعال) کے معنی نہانے اور تمام بدن کو دھونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ (۴۔۴۳) جب تک کہ غسل نہ کر لو۔

اَلْمُغْتَسَلُ: نہانے کی جگہ یا نہانے کا پانی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ﴾ (۳۸۔۴۲) یہ چشمہ نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو شیریں ہے۔

اَلْغِسْلِيْنُ کے معنی دوزخیوں کے اجسام کا غسالہ (پیپ) کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ﴾ (۶۹۔۳۶) اور نہ پیپ کے سوا ان کے لیے کھانا ہے۔

(غ ش و)

غَشِيَهُ، غِشَاوَةً وَغِشَاءً: اس کے پاس اس چیز کی طرح آیا جو اسے چھپائے۔ غِشَاوَة: (اسم) پردہ جس سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً﴾ (۴۵۔۲۳) اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

﴿وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (۲۔۷) اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

محاورہ ہے: غَشِيَهٗ، تَغَشَّاهُ وَغَشِيْتَهٗ: اسے چھپا لیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ﴾ (۳۱۔۳۲) اور جب ان پر لہریں چھا جاتی ہیں۔

﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ﴾ (۲۰۔۷۸) تو دریا (کی موجوں) نے ان پر چڑھ کر انہیں ڈھانپ لیا (یعنی ڈبو دیا۔)

﴿وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى﴾ (۵۳۔۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ (۹۲۔۱) رات کی قسم جو (دن کو) چھپا لے۔

﴿اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ﴾ (۸۔۱۱) جب اس نے ...... تمہیں نیند (کی چادر) اڑھا دی۔

غَشِيْتُ مَوْضِعَ كَذَا: میں فلاں جگہ پر آیا اور کنایۃً عورت سے مجامعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ غَشَّاهَا وَتَغَشَّاهَا کے معنی ہیں: میں نے عورت سے مجامعت کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ﴾ (۷۔۱۱۹) سو جب وہ اس سے ہم بستری کرتا ہے تو اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔

یہی معنی اَلْغِشْیَانِ کے ہیں۔ اَلْغَاشِیَۃُ: ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز کو چھپایا جائے۔مثلاً غَاشِیَۃُ السَّرْجِ: چمڑا جو زین کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿اَنْ تَاْتِیَھُمْ غَاشِیَۃٌ﴾ (۱۲۔۱۰۷) کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے، میں غَاشِیَۃٌ سے مراد وہ مصیبت ہے جو چاروں طرف سے ان پر چھا جائے اور گھوڑے کے جھول کی طرح انہیں ڈھانپ لے بعض نے کہا کہ لفظ غَاشِیَۃٌ اصل میں اچھی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے مگر یہاں بطور استعارہ عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح آیت کریمہ۔

﴿لَھُمْ مِّنْ جَھَنَّمَ مِھَادٌ وَّمِنْ فَوْقِھِمْ غَوَاشٍ﴾ (۷۔۴۱) ایسے لوگوں کے لیے (نیچے) بچھانا بھی (آتش) جہنم کا ہوگا اور اوپر سے اوڑھنا بھی۔

میں ہے کہ (یہاں مِھَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے جس سے جہنم کا عذاب مراد ہے۔)

اور آیت کریمہ۔

﴿ھَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ﴾ (۸۸۔۱) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہے۔ میں اَلْغَاشِیَۃ سے مراد قیامت ہے اور اس کی جمع غَوَاشٍ ہے غُشِیَ عَلٰی فُلَانٍ اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (۳۳:۱۹) جیسے کسی پر موت سے غشی طاری ہو۔ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷۔۲۰) جس طرح کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو رہی ہو۔ اَغْشَاہُ اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ (۳۶۔۹) ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔

﴿کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ﴾ (۱۰۔۲۷) ان کے مونہوں (کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر) گویا پردے اڑھا دیئے گئے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَھُمْ﴾ (۷۱۔۷) کے معنی ہیں کہ انھوں نے کپڑں سے اپنے کان بند کر لیے اور یہ کسی کی بات پر توجہ نہ دینے سے کنایہ ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دور بھاگ جانا ہے جس طرح کہ شَمَّرَ ذَیْلَہٗ اَلْقٰی ثَوْبَہٗ ہے کہ اس کے معنی کسی کام کی تیاری کے آتے ہیں۔ غَشَّیْتُہٗ سَوْطًا اَوْسَیْفًا: میں نے اسے کوڑے یا تلوار سے مارا۔جس طرح کہ کَسَوْتُہٗ وَعَمَّمْتُہٗ کے معنی کسی کو کِسَاءَ (کمبل) پہنانے اور عمامہ باندھنے کے آتے ہیں۔

(غ ص ص)

اَلْغُصَّۃُ: اس ہڈی کو کہتے ہیں جو حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَطَعَامًا ذَاغُصَّۃٍ﴾ (۷۳۔۱۳) اور گلوگیر کھانا ہے۔

(غ ض ض)

اَلْغَضُّ: (ن) کے معنی کمی کرنے کے ہیں خواہ نظر اور صورت میں ہو یا کسی برتن میں سے کچھ کم کرنے کی صورت میں ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ﴾ (۲۴۔۳۰) مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ﴾ (۲۴۔۳۱) اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو (کہ اپنی نگاہیں) نیچی رکھا کریں۔

﴿وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ (۳۱۔۱۹) اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا۔

اور شاعر کے قول [1] (الوافر)

(۳۲۸) فَغُضَّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ (نگاہ نیچی رکھ تو بنی نمیر سے ہے۔)

میں غَضَّ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے۔ غَضَضْتُ السِّقَاءَ: میں نے مشک سے پانی کم کر دیا۔ اور غَضٌّ ایسی تر اور تازہ چیز کو کہتے ہیں جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔

(غ ض ب)

اَلْغَضَبُ: انتقام کے لیے دل میں خون کا جوش مارنا۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [2] (۵۹) ((اتقوا الغضب فانه جمرة توقد فی قلب ابن اٰدم الم تروا الی انتفاخ اوداجه وحمرة عینیه۔)) کہ غصہ سے بچو بے شک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھولنے اور آنکھوں کے سرخ ہو جانے کو نہیں دیکھتے۔ لیکن غضب الٰہی سے مراد انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ (۲۔۹۰) تو وہ (اس کے) غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۶۱) اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

﴿وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ﴾ (۲۰۔۸۱) اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ﴾ (۴۔۹۳) اور خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۔۷) نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں۔ [3] اور غَضْبَةٌ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔

اَلْغَضُوْبُ: بہت زیادہ غصے ہونے والا۔ یہ سانپ اور تندمزاج اونٹنی پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فُلَانٌ غَضْبَةٌ کے معنی ہیں: فلاں بہت جلد غصے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غَضِبْتُ لِفُلَانٍ کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غَضِبْتُ بِهٖ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لیے غضب ناک ہونا۔

(غ ط ش)

﴿وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا﴾ (۷۹۔۲۹) اور اس نے رات کو تاریک بنایا۔

---

[1] قاله جریری من کلمته طویلة فی النقائض (٤٤٦) یهجوبها عبیدالله بن الحصین الراعی النمیری فی قصیدته، المشهورة التی تسمیٰ الفاضحه وسما هاجریر الدماغة وتمامه: فلا کعبا بلغت ولا کلابا۔ راجع دیوانه (٥٧) وتفسیر الطبری (٢١ : ١٢٠) واللسان (غضض) والحکم (حد) والسمط ٨٦١ والاقتضاب ٥٠ والکامل ٢٩٤ وامالی المرتضیٰ (٢٨٩/١) والفاضل (١٠٩) وکنایات الجرجانی ٧٤ والعقد الفرید (٢ : ٤٦٨) والجمحی (١٣١۔١٤٥) والبحر (٦ : ٤٤٣) والکتاب (٢ : ١٦٠) والمعاهد (٢ : ١٩٩) والعمدة (١ : ٥٠/٢ : ١٧٠) والحصری (٥٦) والماوردی ٦١ ومحاضرات الادبار (٣، ١١٤/١ : ٨٩) والجمهرة (٥٦) والتنبیه (٢٢) والاغانی (٧ : ٣٩، ٥٠، ٥١/٢٠، ١٦٩) والحیوان (١ : ٢٥٩) والسیوطی (١٧)۔

[2] رواه الترمذی عن ابی سعید الخذری فی حدیث طویل راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ١٧٤/٣

[3] قد ثبت مرفوعا عن ابی ذر وعن الناس من اصحاب النبی ﷺ (راجع ابن کثیر ١ : ٣٠)

یہ اصل میں رَجُلٌ اَغْطَشُ سے ہے جس کے معنی کمزور نظر اور چندھے آدمی کے ہیں۔

فُلَاۃٌ غَطْشٰی: اس صحرا کو کہتے ہیں جس میں راستہ نہ ملتا ہو۔ اَلتَّغَاطُشُ کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔ غفلت برتنا۔

(غ ط و)

اَلْغِطَآءُ کے اصل معنی طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کے ہیں جو کسی چیز پر بطور سرپوش کے رکھی جائے جیسا کہ غِشَاءٌ لباس وغیرہ کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈالا جائے اور بطور استعارہ غِطَاءٌ کا لفظ (پردہ) جہالت وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَکَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَ كَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ﴾ (۵۰۔۲۲) ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھادیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

(غ ف ر)

اَلْغَفْرَ (ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے۔ اسی سے محاورہ ہے۔

اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِی الْوِعَاءِ: اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ میں ڈال کر چھپادو۔

اِصْبَغْ ثَوْبَكَ فَاِنَّهٗ اَغْفَرُ لِلْوَسَخِ: کپڑے کو رنگ لو کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے۔ اللہ کی طرف سے مَغْفِرَۃٌ یا غُفْرَانٌ کے معنی ہوتے ہیں بندے کو عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ (۲۔۲۸۵) اے پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں۔

﴿اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۳۔۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔

﴿وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۳۔۱۳۵) اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔

اور کبھی غَفَرَلَهٗ کے معنی کسی کو ظاہری طور پر معاف کر دینا آتے ہیں، خواہ دل سے معاف نہ کیا ہو یعنی درگزر کرنا۔ جیسے فرمایا۔

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ﴾ (۴۵۔۱۴) مومنوں سے کہہ دو کہ جو لوگ خدا کے دنوں کی (جو اعمال کے بدلے کے لیے مقرر ہیں) توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں۔

اور اِسْتِغْفَارٌ کے معنی قول اور عمل سے مغفرت طلب کرنا کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ۔

﴿اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾ (۷۱۔۱۰) اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، میں صرف زبان کے ساتھ مغفرت مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ زبان اور عمل دونوں کے ساتھ معافی طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ صرف زبان سے بخشش طلب کرنا کذاب آدمیوں کا کام ہے۔ اور یہی معنی آیت کریمہ۔

﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۴۰۔۶۰) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ (۹۔۸۰) ان کے لیے بخشش مانگو یا نہ مانگو۔

﴿وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۰۔۷) اور مومنوں کے لیے بخشش مانگتے رہتے ہیں۔

اور اَلْغَافِرُ وَالْغَفُوْرُ اسمائے حسنیٰ سے ہیں [1] اوران کے معنی گناہوں کا بخشنے والا ہیں، چنانچہ فرمایا۔

﴿غَافِرِ الذَّنْبِ﴾ (۴۰۔۳) جو گناہ بخشنے والا ہے۔

﴿اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ (۳۵۔۳۰) وہ تو بخشنے والا قدر دان ہے۔

﴿وَهُوَا لْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (۱۰۔۱۰۷) اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور غَفِيْرَةٌ بمعنی غُفْرَانَ ہے، اسی سے فرمایا۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ﴾ (۱۴۔۴۱) اے پروردگارا! (حساب کتاب کے دن) مجھے اور میرے ماں باپ......کو بخش دیجیو۔

﴿اَنْ يَّغْفِرَلِیْ خَطِيْئَتِیْ﴾ (۲۶۔۸۲) میرے گناہ بخش دے گا۔

﴿وَاغْفِرْلَنَا﴾ (۲۔۲۸۶) اور ہمارے گناہ بخش دے۔

بعض نے کہا ہے کہ اِغْفِرُوْا هٰذَاالْاَمْرَ بِغَفْرَتِهٖ: کے معنی ہیں کہ اس معاملہ کو اس طرح چھپاؤ جس طرح چھپانے کا حق ہے۔ [2] اَلْمِغْفَرُ: لوہے کا خود۔ اَلْغِفَارَةُ: اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جسے عورت اپنے دوپٹہ کو تیل سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں نیز غِفَارَةٌ اس بادل کو کہتے ہیں جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا، ہو نیز اس ٹکڑے کو بھی جس سے کمان کے گوشہ کو لپیٹتے ہیں۔

(غ ف ل)

اَلْغَفْلَةُ: اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت تحفظ واحتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے۔ غَفَلَ: (ن) اس نے غفلت سے کام لیا۔ چنانچہ ایسے شخص کو غَافِلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ (۵۰۔۲۲) بے شک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔

﴿وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (۲۱۔۱) اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔

﴿وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰی حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (۲۸۔۱۵) اور وہ ایسے وقت شہر میں آداخل ہوئے کہ وہاں کے باشندے بے خبر ہو رہے تھے۔

﴿وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُوْنَ﴾ (۴۶۔۵) اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔

﴿لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ......﴾ (۱۲۔۳) بے خبر تھے۔

﴿فَهُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (۳۰۔۷) (اور آخرت کی طرف سے) غافل ہیں۔

﴿بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۲۔۱۴۰) جو کچھ یہ کر رہے ہیں خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

﴿لَوْتَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ۔

﴿فَهُمْ غَافِلُوْنَ﴾ (۳۶۔۶) وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْهَا غَافِلِيْنَ﴾ (۷۔۱۳۶) ان سے لاپرواہی کرتے تھے۔

اَرْضٌ غُفْلٌ: وہ زمین جس پر نشان راہ نہ ہو اور ناتجربہ

---

[1] وایضاً غفارٌ کما فی الآیات (۷۱۔۱۰) (۲۰۔۸۲) (۳۸۔۶۶) (۳۹۔۵) (۴۰۔۴۲) و راجع لمعناہ الغریب للقتبی (۱۴۔۵)۔

[2] انظر للکلمة المیدانی رقم (۲۴۸۳)

کار آدمی کو بھی غُفْلٌ کہا جاتا ہے اور اِغْفَالُ الْکِتَابِ کے معنی کتاب کو (نقطے) اور اعراب لگائے بغیر چھوڑ دینے کے ہیں۔پس آیت کریمہ۔

﴿مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) کے معنی یہ ہیں کہ جس کے دل کو ہم نے یوں ہی چھوڑ دیا ہے اور اس میں ایمان کا نقش نہیں بٹھایا جس طرح کہ اس کے برعکس مومنین کے دلوں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ﴾ (۵۸۔۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ کے معنی دل کو حقائق کی معرفت سے غافل کر دینا کے ہیں۔

(غ ل ل)

اَلْغَلَلُ کے اصل معنی کسی چیز کو اوپر اوڑھنے یا اس کے درمیان میں چلے جانے کے ہیں اسی سے غَلَلٌ اس پانی کو کہا جاتا ہے جو درختوں کے درمیان سے بہہ رہا ہو اور کبھی ایسے پانی کو غِیْلٌ بھی کہہ دیتے ہیں اور اِنْغَلَّ کے معنی درختوں کے درمیان میں داخل ہونے کے ہیں لہٰذا غُلٌّ (طوق) خاص کر اس چیز کو کہا جاتا ہے۔جس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔اس کی جمع اَغْلَالٌ آتی ہے۔اور غُلَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں اسے طوق سے باندھ دیا گیا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ﴾ (۶۹۔۳۱) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰۔۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق...... ہوں گے۔

﴿وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ (۷۔۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اور طوق، جو ان (کے سر) پر (اور) گلے میں) تھے، اتارتے ہیں۔

اور (کنایہ کے طور پر) کنجوس شخص کو مَغْلُوْلُ الْیَدْ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ﴾ (۱۷۔۲۹) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ کر لو)۔

﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ (۵۔۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر بخل کا الزام لگاتے ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ جب انھوں نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا فیصلہ کر دیا ہے تو کہنے لگے پھر تو اللہ کا ہاتھ مقید ہے یعنی فارغ ہونے کی وجہ سے مقید کے حکم میں ہے۔تو یہ آیت نازل ہوئی اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا﴾ (۳۶۔۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انہیں ہر قسم کی خبر سے محروم کر رکھا ہے جس طرح کہ ان کے قلوب پر مہر لگانا اور آنکھ و کان پر پردہ ڈالنا ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں جَعَلْنَا اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن یہ اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں انہیں دی جائے گی۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

﴿وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (۳۴۔۳۳) اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔

اَلْغُلَالَةُ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دو کپڑوں کے درمیان میں پہنا جاتا ہے۔ چنانچہ شِعَارٌ وہ کپڑا ہے جو غلالہ کے نیچے پہنا جائے مگر کبھی بطور استعارہ غُلَالَةٌ کا لفظ درع پر بھی بولا جاتا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ کا لفظ مجازاً اغلالۃ کے معنی میں آجاتا ہے۔ اور غِلٌّ کے معنی (کینہ و پوشیدہ) دشمنی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۷۔۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (۵۹۔۱۰) اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے۔

غَلَّ یَغِلُّ کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا اور اَلْغُلُوْلُ کے معنی ہیں خیانت کرنا اور یہ غَلَّ یَغُلُّ: سے ہے جس کے معنی ہیں: خیانت کرنا اور اَغَلَّ (افعال) کے معنی خیانت کے ساتھ متصف ہونے کے ہیں اور اَغْلَلْتُ فُلَانًا کے معنی دوسرے کو خیانت کے ساتھ متہم کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ﴾ (۳۔۱۶۱) اور کبھی نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر (خدا) خیانت کریں۔

ایک قراءت میں اَنْ یُّغَلَّ ہے جو کہ اَغْلَلْتُهٗ سے ہے یعنی اسے خیانت کے ساتھ متہم کیا جائے۔

﴿وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۳۔۱۶۱) اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز (خدا کے روبرو) حاضر کرنا ہوگی۔

ایک روایت میں ہے۔ ❶ (۶۰) لَااِغْلَالَ وَلَا اِسْلَالَ یعنی خیانت اور چوری نہیں ہے اور حدیث میں ہے۔ ❷ (۶۲) ثَلَاثٌ لَا یَغِلُّ عَلَیْهِنَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ یعنی تین باتوں پر مومن کا دل کینہ وری سے کام نہیں لیتا۔

اور ایک روایت میں ((لَا یُغِلُّ)) ہے یعنی خیانت نہیں کرتا اَغَلَّ الْجَازِرُ وَالسَّالِخُ: قصاب کا کھال کے ساتھ کچھ گوشت چھوڑ دینا۔ یہ اِغْلَالٌ بمعنی خیانت سے ہے گویا قصاب نے کھال کے ساتھ گوشت چھوڑ کر خیانت کی تاکہ وہ گوشت لے جائے۔

اَلْغُلَّةُ وَالْغَلِیْلُ: پیاس، غصہ یا محبت کی سوزش شَفَا فُلَانٌ غَلِیْلَهٗ: فلاں نے اپنا غصہ نکال لیا اَلْغَلَّةُ: زمین کی پیداوار۔ اسی سے اَغَلَّتْ ضَیْعَتُهٗ ہے جس کے معنی ہیں۔ زمین نے پیداوار دی اور مُغْلَغَلَةٌ اس

---

❶ قال ابن حجر اخرجه ابوداؤد و احمد من رواية الزهری عن المسور ومروان فی حديث ورواه الدارمی والطبرانی وابن عدی من رواية كثير بن عبدالله ورواه ابن زنجويه فی الاموال وابراهيم الحربی فی الغريب راجع الكاف ۳۳۔

❷ انظر للحديث الفائق (۲/۱۱٤) والنهاية (غلل) ورواه الشافعی فی رسالته رقم (۲۔۱۱) والبيهقی فی المدخل وابن ماجة والدارمی عن زيد بن ثابت راجع شرح الترمذی (۳/۳۷۲) والمستدرك (۱/۸٦۔۸۸) والترغيب (۱/٦۳۔٦٤) ومجمع الزوائد (۱/۱۳۷۔۱۳۹) ونسبه الحافظ فی تخريجه علی الكشاف الی ابن عدی وابی داؤد والاموال لابن زنجويه والغريب لابراهيم الحربی انظر رقم ۲۷۳) والفتح للنبهانی (۳/۳۰۹)۔

پیغام یا خط کو کہا جاتا ہے جو شہر بشہر پہنچایا جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الوافر)

(۳۲۹) تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ
وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُوْرٌ

اس کی محبت وہاں پہنچ گئی ہے جہاں شراب اور غم و سرور کا بھی گزر نہیں ہوسکتا۔

(غ ل ب)

اَلْغَلْبَةُ: کے معنی قہر اور بالا دستی کے ہیں۔ غَلَبْتُهٗ (ض) غَلْبًا وَغَلْبَةً: میں اس پر مستولی اور غالب ہوگیا۔ اسی سے صیغہ صفت فاعلی غَالِبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۱) الم (اہل) روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۴۹) کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔

﴿يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (۸۔۶۶) دو سو پر غالب رہیں گے

﴿يَغْلِبُوْٓا اَلْفًا﴾ (۸۔۶۵) وہ ہزار پر غالب رہیں گے۔

﴿لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (۵۸۔۲۱) کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ﴾ (۸۔۴۸) کہ آج کے دن ......کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔

﴿اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ﴾ (۷۔۱۱۳) اگر ہم جیت گئے۔

﴿اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۴۴) ہم ضرور غالب رہیں گے۔

﴿فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ......﴾ (۷۔۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

﴿اَفَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۲۱۔۴۴) کیا یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں۔

﴿سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ﴾ (۳۔۱۲) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں جہنم کی طرف) ہانکے جاؤ گے۔

﴿ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ﴾ (۸۔۳۶) اور وہ مغلوب ہو جائیں گے۔ غَلَبَ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر مستولی ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳۔۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔

بعض نے کہا ہے کہ اصل میں غَلَبْتُ کے معنی کسی کی گردن کے موٹے حصہ کو پکڑنے یا اس پر مارنے کے ہیں اور موٹی گردن والے شخص کو اَغْلَبُ کہا جاتا ہے۔ اس کی مونث غَلْبَاءُ ہے اور هَضْبَةٌ غَلْبَاءُ کے معنی بلند ٹیلہ کے ہیں جیسا کہ اس معنی میں هَضْبَةٌ رَقْبَاءُ وَعَنْقَاءُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔❷ غَلْبَاءُ کی جمع غُلْبٌ ہے

---

❶ قاله عبيدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود، احد فقهاء السبعة يشبب بعتمة امراته وقبله: تغلغل حب عثمة في فوادي۔ فباديه مع الخافي يسير والبيت في تاريخ الخطيب (۸/۴۷۰) والمصارع (۲۰۱) والاصابة (۴۹۵۴) ونسبه ابن كثير (۱: ۱۲۶) الى النابغة في زوجته عثمة وحكاه عن القرطبي والله اعلم وقد مر في (شرب) رقم ۲۵۹۔

❷ وفي الاصول حديقة غلباء وهو نسب لقوله تعالى: وحدائق غلبا (۶۰۔۳۰)

(جس کے معنی گھنے باغات کے ہیں، جیسے فرمایا۔

﴿وحَدَآئِقَ غُلْبًا﴾ (۸۰۔۳۰) اور گھنے گھنے باغ۔

(غ ل ظ)

اَلْـغِـلْـظَةُ: (غین کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کے معنی موٹاپا یا گاڑھاپن کے ہیں۔ یہ رِقَّةٌ کی ضد ہے اصل میں یہ اجسام کی صفت ہے۔ لیکن کَبِیْرٌ وَکَثِیْرٌ کی طرح بطور استعارہ معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً﴾ (۹۔۱۲۳) چاہیے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں۔

میں غِلْظَةٌ کے معنی سخت مزاجی کے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿ثُـمَّ نَضْطَرُّ هُمْ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیْظٍ﴾ (۳۱۔۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔

﴿مِنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ﴾ (۱۱۔۵۸) عذاب شدید سے۔

﴿جَاهِدِالْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ (۹۔۷۳) کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔

اِسْتَـغْـلَظَ کے معنی موٹا اور سخت ہونے کو تیار ہو جانا ہیں اور کبھی موٹا اور سخت ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ﴾ (۴۸۔۲۹) پھر موٹی ہوئی اور اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

(غ ل ف)

آیت کریمہ۔ ﴿قُـلُـوْبُـنَا غُلْفٌ﴾ (۲۔۸۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ یعنی (غُـلْفٌ) اَغْلَفُ کی جمع ہے (اور اَغْـلَـفُ اس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف میں بند ہو۔) چنانچہ سَیْفٌ اَغْـلَـفُ: کے معنی ہیں تلوار، جو غلاف یعنی نیام میں بند ہو اور غیر مختون لڑکے کو غُلَامٌ اغْـلَفُ کہا جاتا ہے اور جو چمڑہ ختم کرتے وقت کاٹ دیا جاتا ہے اسے غُـلْفَةٌ کہتے ہیں۔ غَـلَّـفْـتُ السَّیْفَ: تلوار کو نیام میں بند کر دیا۔ غَـلَّـفْـتُ الْـقَارُوْرَةُ: شیشے کے اوپر غلاف چڑھا دیا۔ غَـلَّفْتُ الـرَّحْلَ اَوِالسَّرْجَ: پالان یا زین پر چمڑا مڑھ دیا۔ اسی طرح غَلَّفْتُ لِحْیَتَهٗ بِالْحِنَّاءِ کے معنی کسی کی داڑھی کو مہندی سے چھپا دینے کے ہیں اور تَـغَـلَّفَ (تفعل) بمعنی تَـخَـضَّبَ ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں [illegible] لیے قرآن کریم کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں [illegible] یہ آیت کریمہ۔

﴿قُـلُـوْبُنَافِیٓ اَکِنَّةٍ﴾ (۴۱۔۵) اور فِـیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۵۰۔۲۲) کے ہم معنی ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ (غُـلْفٌ) اصل میں غُـلُـفٌ بـضـم اللام ہے جیسا کہ ایک قراءت میں ہے۔ اور یہ اَغْلَفُ کی نہیں بلکہ غِلَافٌ کی جمع ہے جیسا کہ کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے گنجینے اور مخزن ہیں اور ان علوم کی موجودگی میں ہم دوسروں کے علوم سے بے نیاز ہیں لہٰذا تم سے کسی قسم کے استفادہ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

(غ ل ق)

اَلْغَلْقُ وَالْمِغْلَاقُ: قفل وغیرہ، جس کے ساتھ دروازہ بند کیا جاتا ہے اور بعض نے وہ چیز مراد لی ہے جس کے ساتھ اسے کھولا جاتا ہے۔ لیکن اگر معنی بندش کا لحاظ کیا قد

جائے تو اسے مِغْلَقٌ وَمِغْلَاقٌ کہا جائے گا اور کھولنے کے اعتبار سے مِفْتَحٌ یا مِفْتَاحٌ کہا جاتا ہے اور اَغْلَقْتُ الْبَابَ کے معنی دروازہ بند کرنے کے ہیں اور غَلَّقْتُہٗ میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی بہت سے دروازوں کو بند کرنا یا ایک ہی دروازے کو احکام یعنی بڑی مضبوطی سے بند کرنا اس بنا پر آیت کریمہ۔

﴿وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ﴾ (۱۲۔۲۳) اور دروازے بند کر کے، میں ابواب کے ساتھ فعل غَلَّقَ لایا گیا ہے اور تشبیہ کے طور پر غَلَّقَ الرِّھْنَ غَلُوْقًا کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی گروی چیز کو روک لینے کے ہیں۔ ❶ غَلِقَ ظَھْرُہٗ دَبَرًا اونٹ کی پیٹھ کا زخم بھر گیا اور قمار بازی کے ساتویں تیر کو مِغْلَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جوئے کے باقی ماندہ تمام حصوں کو روک لیتا ہے۔ نَخْلَۃٌ غَلِقَۃٌ وہ کھجور جس کی جڑیں خشک ہوگئی ہوں اور وہ پھل دینے سے رک جائے اور غَلِقَۃٌ زہریلی قسم کے ایک کڑوے درخت کا نام ہے۔

(غ ل م)

اَلْغُلَامُ: اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی مسیں بھیگ چکی ہوں محاورہ ہے غُلَامٌ بَیِّنُ الْغُلُوْمَۃِ وَالْغُلُوْمِیَّۃِ: لڑکا، جو بھرپور جوانی کی عمر میں ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ﴾ (۱۹۔۲۰) میرے ہاں لڑکا کیونکر ہوگا۔

﴿وَاَمَّا الْغُلَامُ فَکَانَ اَبَوَاہُ مُؤْمِنَیْنِ﴾ (۱۸۔۸۱) اور وہ لڑکا تھا جس کے ماں باپ دونوں مومن تھے۔

﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَکَانَ لِغُلَامَیْنِ﴾ (۱۸۔۸۲) اور جو دیوار تھی سو وہ دو لڑکوں کی تھی۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔

﴿ھٰذَا غُلَامٌ﴾ (۱۲۔۱۹) یہ تو (نہایت حسین) لڑکا ہے۔ غُلَامٌ کی جمع غِلْمَۃٌ وَغِلْمَانٌ آتی ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْغُلَامُ کے معنی ہیں: لڑکا بالغ ہوگیا۔ عام طور پر چونکہ اس عمر میں جنسی خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لیے غُلْمَۃٌ کا لفظ جنسی خواہش کی شدت پر بولا جاتا ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الْفَحْلُ کے معنی ہیں سانڈ جنسی خواہش سے مغلوب ہوگیا۔

(غ ل و ی)

اَلْغُلُوُّ کے معنی کسی چیز کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اگر یہ (حد سے تجاوز) اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلَاءٌ (گرانی) کہا جاتا ہے اور قدر ومنزلت میں ہو تو اسے غُلُوٌّ کہتے ہیں اور اگر تیر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو غَلْوٌ مگر ان ہر سہ اشیاء کے متعلق فعل غَلَا یَغْلُوْ (ن) ہی استعمال ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَاتَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ﴾ (۴۔۱۷۱) اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔

اور ہنڈیا کے ابال اور جوش کھانے کو غَلْیٌ وَغَلَیَانٌ (باب ضرب) کہتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ ارشاد ہے۔

﴿طَعَامُ الْاَثِیْمِ۔ کَالْمُھْلِ ، یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ﴾ (۴۴۔۴۵۔۴۶) گنہگار کا کھانا ہے جیسے پگھلا ہوا تانبا۔ پیٹوں میں اس طرح کھولے گا جس

❶ وفی الحدیث لایغلق الرھن ای لا یستحقہ المرتھن اذا لم یرد الراھن مارھنہ فیہ و کان ھذا من فعل الجاھلیۃ فابطلہ الاسلام راجع للحدیث کنزالعمال (٤ : رقم ١١٦٢ و ١١٦٦) ولمعناہ الزرقانی (٤ : ٥۔٦)

طرح گرم پانی کھولتا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر غصہ اور لڑائی کے بھڑک اٹھنے کو بھی غَلَيَان کہہ دیتے ہیں۔ تَغَالِي النَّبْتِ: گھاس کا زیادہ ہونا اور بڑھ جانا۔ غَـلْيٌ اور غُـلُوٌّ یعنی: واوی اور یائی دونوں سے آتا ہے اور غُـلَـوَاء کے معنی خودسری میں حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اور اسی سے بطور تشبیہ جوش جوانی کو غُلْوَاءُ الشَّبَابِ کہا جاتا ہے۔

(غ م م)

اَلْـغَـمُّ: (ن) کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپا لینے کے ہیں اسی سے اَلْـغُـمّٰی ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے ہیں۔نیز اَلْغُمّٰی جنگ کی شدت کو کہتے ہیں جو قوم پر چھا جائے اس طرح بادل کو اَلْغَمَام کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنْ يَّـاْتِيَهُـمُ اللّٰـهُ فِـيْ ظُـلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ (۲۔۱۰) کہ خدا کا عذاب بادلوں کے سائبانوں میں آنازل ہو۔اسی سے غُـمَّ الْهِلَالُ (چاند ابر کے نیچے آ گیا اور دیکھا نہ جاسکا) وَيَـوْمٌ غَـمٌّ (سخت گرم دن وَلَيْلَةٌ غَمَّةٌ وَغُمّٰی (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہا محاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے۔❶ (رجز)

(۳۲۹) لَيْلَةٌ غُمّٰی طَامِسٌ هَلَالُهَا

تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

اور غُـمَّةُ الْاَمْرِ کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُـمَّ لَا يَـكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾ (۱۰۔۱۷) پھر تمھارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمھارے لیے قلق و اضطراب کا موجب نہ ہو اور غَمٌّ وَغُمَّةٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن و کرب جیسے کَـرْبٌ وَكُرْبَةٌ اور غَـمَامَةٌ اس چیتھڑے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے (تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے) اور نَـاصِيَةٌ غَـمَّاءُ پیشانی کے لمبے بال جو چہرے کو چھپا لیں۔

(غ م ر)

اَلْـغَـمْـرُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینے کے ہیں۔اسی سے غَـمْرٌ غَامِرٌ اس زیادہ پانی کو کہتے ہیں جس کا سیلاب ہر قسم کے اثرات کو (چھپا کر زائل کر دے شاعر نے کہا ہے۔❶ (المتقارب)

(۳۳۰) وَالْمَاءُ غَامِرٌ خِدَادَهَا

اور پانی اپنے گڑھوں کو چھپانے والا تھا۔

اسی مناسبت سے فیاض آدمی اور تیز رو گھوڑے کو بھی غَمْرٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ تشبیہ کے طور پر اسے بَحْرٌ کہہ دیا جاتا ہے اور غَـمْـرَةٌ اس پانی کثیر کو کہتے ہیں جس کی اتھاہ نظر نہ آئے۔اور یہ اس جہالت کے لیے ضرب المثل ہے جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔اور قرآن پاک نے فَاَغْشَيْنَاهُمْ وغیرہ الفاظ سے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا

---

❶ قاله الزّاجر وتمامه او غلتها ومكره ايغالها راجع اللسان والصحاح (غم) واصلاح يعقوب ۲۸۲۔

❶ لم اجده بهذا اللفظ وفى مجالس ثعلب (۱: ۲۲۲) والاقتضاب (۴۲۳) والمعانى للقبتى (۴۴۲): والليل غامر جدادها۔ كذافى اللسان (جدد) والمعرب للحواليقى (بكر) وهذا البيت لا عشىٰ يصف خمارا طرقه، لابتياع الخمر فاوقد سراجا والليل قد غمراى ستر جداد الخباء اى الخيوط المعقدة او اسفلها واوله: اضاء مظلمته بالسراج۔ وبعده: وواهمنا كلها جيدة۔ فلا تحبسنها بتنقادها والقصيده فى ديوانه (۵۷۔۶۱) فاخشى ان يكون البيت مصحفانى المطبوع۔

ہے۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَذَرْهُمْ فِیْ غَمْرَتِهِمْ﴾ (۲۳۔۵۴) تو ان کو .... ان کی غفلت ہی میں رہنے دو۔
﴿اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۱) جو بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔
اور غَمَرَات کے معنی شدائد کے ہیں (کیونکہ وہ بھی انسان پر ہجوم کر کے اسے بدحواس کر دیتے) ہیں فرمایا:
﴿فِیْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ﴾ (۶۔۹۳) (جب) موت کی سختی میں۔
اور ناتجربہ کار آدمی کو بھی غُمْرٌ کہا جاتا ہے۔
وَالْجَمْعُ اَغْمَارٌ نیز غِمْرٌ کے معنی پوشیدہ کینہ کے بھی آتے ہیں۔ وَالْجَمْعُ غُمُوْرٌ اور غَمَرٌ کے معنی چربی کی بدبو کے آتے ہیں جو تمام چیزوں کی بو پر غالب آجاتی ہے غَمِرَتْ يَدُهٗ: اس کا ہاتھ میلا ہوگیا۔ غَمِرَ عِرْضُهٗ اس کی عزت پر بٹہ لگ گیا۔محاورہ ہے۔
دَخَلَ فِیْ غُمَارِ النَّاسِ وَخُمَارِهِمْ: وہ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہوگیا۔
اَلْغُمْرَةُ: زعفران سے تیار کیا ہوا طلا جو چہرے پر ملتے ہیں۔ تَغَمَّرْتُ بِالطِّیْبِ: میں نے (اپنے چہرہ پر) زعفرانی خوشبو ملی اور پانی پینے کے چھوٹے پیالے کو غُمْرٌ کہا جاتا ہے اسی سے تَغَمَّرْتُ ہے جس کے معنی تھوڑا سا پانی پینے کے ہیں اور کسی شخص کو مُغَامِرٌ اس وقت کہتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو لڑائی کی آگ میں جھونک دے اور یہ یا تو دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ فُلَانٌ يَخُوْضُ الْحَرْبَ کا محاورہ ہے اور یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور اس صورت میں اسے مُغَامِرٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اناڑی آدمی کو هَوْجٌ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

(غ م ز)

اَلْغَمْزُ (س) کے اصل معنی کسی کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا پلک سے اشارہ کرنے کے ہیں اور اسی سے مَا فِیْ فُلَانٍ غَمِیْزَةٌ ہے.....یعنی اس میں کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور غَمِیْزَةٌ کی جمع غَمَائِزُ آتی ہے (اَلتَّغَامُزُ) باہم کسی کے عیوب کی طرف ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارہ کرنا) قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو حقارت سے اشارہ کرتے ہیں۔
اصل میں یہ غَمَزْتُ الْكَبْشَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مینڈھے کے بدن کو دبا کر دیکھنے کے ہیں کہ اس میں چربی ہے یا نہیں جس طرح کہ عَبَطْتُهٗ کا محاورہ ہے۔

(غ م ض)

اَلْغَمْضُ (ض) کے اصل معنی نیند کے جھونکا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ مَا ذُقْتُ غَمْضًا وَلَا غِمَاضًا (یعنی چشم من یکدم نخفتہ) اسی مناسبت سے نرم اور نشیبی زمین کو غَامِضَةٌ وَغَمْضَةٌ کہا جاتا ہے اور دَارٌ غَامِضَةٌ اس سرائے کو کہتے ہیں جو شارع عام پر نہ ہو۔
غَمَضَ عَيْنَهٗ وَاَغْمَضَهَا کے معنی آنکھ کو بند کر لینے کے ہیں اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل برتنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ (۲۔۲۶۷) تو بجز اس کے کہ لیتے وقت آنکھیں بند کرلو ان کو کبھی نہ لو۔

(غ ن م)

اَلْغَنَمُ: بکریاں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا﴾ (۶۔۶) اور گائیوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر دی تھی۔

اَلْغَنَمُ کے اصل معنی کہیں سے بکریوں کا ہاتھ لگنا۔اوران کو حاصل کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ ہراس چیز پر بولا جانے لگا ہے۔جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو۔قرآن میں ہے۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ (۸۔۴۱) اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ۔

﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (۸۔۶۹) جو مال غنیمت تم کو ملا ہے اسے کھاؤ کہ تمھارے لیے حلال طیب ہے۔

اَلْمَغْنَمُ: مال غنیمت۔اس کی جمع مَغَانِمُ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ﴾ (۴۔۹۴) سو خدا کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔

(غ ن ی)

اَلْغِنٰی (تونگری) بے نیازی،یہ کئی قسم پر ہے کلی طور پر بے نیاز ہو جانا،اس قسم کی غناء سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (۲۲۔۲۴) اور بے شک خدا بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔

﴿اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ......﴾ (۳۵۔۱۵) تم سب خدا کے محتاج ہو اور خدا بے پرواہ منزہ اور حمد وثنا والا ہے۔میں بھی اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے سے یہی معنی مراد ہیں۔

قدرے محتاج ہونا اور ماتیسر پر قانع رہنا۔چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ (۹۳۔۸) اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔

میں اَغْنٰی سے اس قسم کی غنا مراد ہے اور اس قسم کی غنا (یعنی قناعت کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔[1] (۶۲) ((الغنٰی غِنی النفس)) کہ غنی درحقیقت قناعت نفس کا نام ہے اور غنٰی کے تیسرے معنی کثرت ذخائر کے ہیں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اس کے مختلف درجات ہیں۔جیسے فرمایا۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ (۴۔۶) جو شخص آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا چاہیے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ﴾ (۹۔۹۳) جو دولت مند ہیں اور پھر تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ (۱۳۔۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں۔خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں۔

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] رواہ مسلم (۱/۳۳۶) طبعۃ انصاری ھندو الترمذی من حدیث ابی ہریرۃ وقال حدیث حسن صحیح ص(۶۰ ج ۱۲)۔

آیت کریمہ۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲۔۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے۔ نازل فرما کران سے صدقات وخیرات کا مطالبہ کیا اور آیت کریمہ۔

﴿یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۔۲۷۳) کہ نا مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ بظاہر قانع اور بے نیاز رہتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنے کی وجہ سے ناواقف لوگ انہیں تونگر خیال کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا:❶ (۶۳) ((خُذْ مِنْ اَغْنِیَآءِ ھِمْ وَ رُدَّفِیْ فُقَرَآءِ ھِمْ)) کہ ان کے اغنیاء سے صدقات وصول کرکے وہاں کے فقراء میں تقسیم کرو (اور حقیقت یہ ہے کہ نفس قانع نہ ہو تو مال و دولت کے باوجود بھی انسان فقیر ہی رہتا ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❷

(۳۳۱) وَقَدْ یَکْثُرُ الْمَالُ وَالْاِنْسَانُ مُفْتَقِرٌ اور کبھی مال کی فراوانی کے باوجود انسان محتاج ہی نظر آتا ہے۔محاورہ ہے۔

غَنَیْتُ بِکَذَا غِنْیَانًا وَغِنَاءً وَاسْتَغْنَیْتُ وَتَغَنَّیْتُ وَتَغَانَیْتُ: مال دار یا بے نیاز ہونا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَغْنَی اللّٰہُ، وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ﴾ (۶۴۔۶) اور خدا نے بھی بے پروائی کی اور خدا بے پرواہ (اور سزاوارِ حمد (وثنا) ہے۔

اور اَغْنَانِیْ کَذَا وَاَغْنٰی عَنْہُ کَذَا: کسی چیز کا کافی ہونا اور فائدہ بخشنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَہْ﴾ (۶۹۔۲۸) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔

﴿مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ﴾ (۱۱۱۔۲) نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا............

﴿لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا﴾ (۳۔۹) نہ تو ان کا مال ہی خدا کے عذاب سے انہیں بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی۔

﴿مَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ مَّاکَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۰۷) تو جو فائدے یہ اٹھا رہے ہیں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔

﴿لَا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُھُمْ﴾ (۳۶۔۲۳) ان کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی۔

﴿وَلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ﴾ (۷۷۔۳۱) اور نہ لپٹ سے بچاؤ۔

اور اَلْغَانِیَۃُ: اس عورت کو کہا جاتا ہے جو اپنے خاوند کے سبب زینت سے بے نیاز ہو۔بعض نے کہا ہے کہ غَانِیَۃ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زیبائش وآرائش سے بے نیاز ہو۔ غَنِیَ فِیْ مَکَانٍ کَذَا: کسی جگہ مدت دراز تک اقامت کرنا گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا﴾ (۷۔۹۲) گویا وہ ان میں کبھی

---

❶ رواہ الشیخان والترمذی والنسائی من حدیث عبداللہ بن عباس نظر الصحیح (ص۱۹۶ ج۱) والترمذی (ص ۸۰ ج ۱) و مسلم (ص۳٦ ج ۱) و النسائی (ص۲۵۸ ج۱)۔

❷ انظر ایضاً فی المحاضرات للمؤلف (۲ : ۵۲۱) بغیر عزو۔

آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔

اَلْمَغْنٰی: یہ اسم مصدر اور ظرف مکان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

غَنّٰی ، اُغْنِيَّةٌ ، وَغِنَاءٌ (تَغَنّٰی) گیت گانا۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی (تَغَنّٰی) بمعنی اِسْتَغْنٰی بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ فرمان نبوی ❶ (۶۴) ((مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰن)) (جو شخص قرآن کے ساتھ اکتفانہ کرے) میں لَمْ يَتَغَنَّ بمعنی لَمْ يَسْتَغْنِ ہی ہے۔ یعنی جو شخص قرآن پاک کے ساتھ دوسروں سے بے نیاز نہ رہے۔

(غ و ث (غ ی ث)

اَلْغَوْثُ کے معنی مدد اور اَلْغَيْثُ کے معنی بارش کے ہیں اور اِسْتَغَثْتُهٗ: (استفعال) کے معنی کسی کو مدد کے لیے پکارنے یا اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنا آتے ہیں جب کہ اس کے معنی مدد طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع اَغَاثَنِيْ آئے گا مگر جب اس کے معنی بارش طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع غَاثَنِيْ آتا ہے اور غَوَّثْتُ: میں نے اس کی مدد کی یہ بھی غَوْثٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مدد ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ﴾ (۸۔۹) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے۔

﴿فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ﴾ (۲۸۔۱۵) تو جو شخص ان کی قوم میں سے تھا اس نے دوسرے شخص کے مقابلے میں جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ﴾ (۱۸۔۲۹) اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے کھولتے ہوئے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح گرم ہوگا۔

میں يَسْتَغِيْثُوْا غَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہوسکتا ہے۔ اور غَيْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی۔ اسی طرح يُغَاثُوْا (فعل مجہول) کے بھی دونوں معنی ہوسکتے ہیں (پہلی صورت میں یہ اَغَاثَ یعنی (باب افعال) سے ہوگا دوسری صورت میں غَاثَ ، يَغِيْثُ سے اور آیت کریمہ۔

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ (۵۷۔۲۰) جیسے بارش کہ اس سے کھیتی اگتی اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔ میں غَيْثٌ کے معنی بارش ہیں، چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ❷

---

❶ واختار هذا المعنى ابو عبيد القاسم بن سلام وراجع غريبه) والحديث من رواية عبدالله بن نهيك وفي معناه بحث راجع امالي المرتضىٰ (١ : ٣١-٣٦) ولتخريج (الحديث انظر الكنز للمتقى (رقم ٢٧٧٠) ثم في (رقم ٢٧٩٨) وتخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم (٢٤٢) والفتح الكبير للنبهاني (٧٦٧/٣) قال البيهقي في سننه الكبرى من كتاب الشهادات عن الشافعي معناه يقرء ه تحزينا وليس معناه الاستغناء على ما قالوا وقد كره بعض الفقهاء التحدث لهذا الحديث كراهة ان يتاول بالحان مكروهة (راجع المحاضرات للمؤلف (٤٣٧/٤)۔

❷ قاله ذوالرمة في مدح بلال بن ابي بردة والصيدح اسم ناقته والبيت في اللسان (غيث) والمحكم (صدح) و الكامل (٣٩٦) وشواهد الكشاف ٨٨ الدئة للخفاجي ٢٣٥ وطراز المجالس ٥٨ وفي البيت شاهدان فعل السمع يتعدى الى مفعولين ويدخل على المبتداء والخبر مثل علم وروى برفع الناس على الحكاية اى مقول فيهم كذا وبنصبه على المفعولية والمبحث في المطولات ونظيره وجدت الناس اخبرنقله بهاء السكتة۔

(۳۳۲) سَمِعْتُ النَّاسَ يَنْتَجِعُوْنَ غَيْثًا
فَقُلْتُ لِصَيْدَحَ انْتَجِعِيْ بِلَالًا
میں نے سنا ہے کہ لوگ بارش کے مواضع تلاش کرتے ہیں تو میں نے اپنی اونٹنی صیدح سے کہا تم بلال کی تلاش کرو۔

(غ و ر)

اَلْغَوْرُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں۔محاورہ ہے۔ غَارَالرَّجُلُ وَاَغَارَ: نشیبی زمین میں چلا جانا۔ غَارَتْ عَيْنُهٗ غَوْرًا وَغُوُوْرًا: آنکھ کا اندر گھس جانا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَآءُكُمْ غَوْرًا﴾ (۶۷۔۳۰) تمھارا پانی بہت زیادہ زمین کے نیچے اتر جائے۔

﴿اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا﴾ (۱۸۔۴۱) یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے۔

اَلْغَارُ کے معنی غار کے ہیں۔ج (اَغْوَار وَغِيْرَانٌ) قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْهُمَا فِى الْغَارِ﴾ (۹۔۴۰) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔

اور کنایہ کے طور پر فرج وبطن یعنی پیٹ اور شرمگاہ کو غَارَان (تثنیہ) کہا جاتا ہے اور مَغَارٌ کا لفظ غَوْرٌ کی طرح اسم مکان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (جمع مَغَارَاتٍ) قرآن میں ہے۔

﴿لَوْيَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْمَغٰرٰتٍ اَوْمُدَّخَلًا﴾ (۹۔۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر) گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اور غَارَتِ الشَّمْسُ غِيَارًا کے معنی سورج غروب ہو جانے کے ہیں۔کسی شاعر نے کہا ہے۔[1] (الطویل)

(۳۳۳) هَلِ الدَّهْرُ اِلَّا لَيْلَةٌ وَنَهَارُهَا
وَاِلَّا طُلُوْعُ الشَّمْسِ ثُمَّ غِيَارُهَا
(زمانہ دن رات کی گردش اور سورج کے طلوع وغروب ہونے کا نام ہے۔)

غَوَّرَ کے معنی پست زمین میں چلے جانے کے ہیں۔ وَاَغَارَ عَلَى الْعَدُوِّ اِغَارَةً وَغَارَةً کے معنی دشمن پر لوٹ مارنے کے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا﴾ (۱۰۰۔۳) پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔

اور اس سے مراد گھوڑے ہیں (جو صبح کو دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں۔)

(غ و ص)

اَلْغَوْصُ کے معنی پانی میں غوطہ لگا کر کوئی چیز نکال لانے کے ہیں اور جو شخص کسی پیچیدہ مسئلہ کی تہ تک پہنچ جائے یا نیچے کی تہ سے کوئی چیز نکال لائے اسے غَائِصٌ کہا جاتا ہے اسی سے غَوَّاص صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی غوطہ خور کے ہیں۔

﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ﴾ (۳۸۔۳۷) اور شیاطین کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) وہ سب عمارتیں بنانے والے اور غوطہ مارنے والے تھے۔

﴿وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ﴾ (۲۱۔۸۲) اور شیاطین (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ

---

[1] البيت من مطلع قصيدة لابى ذؤيب الهذلى فى ديوانه،۲ وانظرا للسان (غور) والاقتضاب ۱۷۸ وابن عقيل رقم ۱۶۸ ومجالس ثعلب ۵۸۳۔

ان) میں سے بعض ان کے لیے غوطے مارتے تھے۔ میں پانی کے اندر سے موتی نکالنے والے غوطہ خور ہی مراد نہیں ہیں بلکہ نادر کام کرنے والے اور عجیب وغریب صنعتیں ایجاد کرنے والے بھی ان میں داخل ہیں۔

(غ و ل)

اَلْغَوْلُ: کسی کو اس طرح ہلاک کر دینا کہ اس کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ غَالَ یَغُوْلُ غَوْلاً وَاغْتَالَهُ اغْتِیَالاً: اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ اسی سے سِعْلاَةٌ (چڑیل) کو غَوْلٌ کہا جاتا ہے (غَوْل دردسر سے مستی) قرآن پاک نے جنت کی شراب کی صفت بیان کرتے ہوئے لاَفِیْهَا غَوْلٌ (۳۷۔۴۷) نہ اس سے دردسر ہوگا۔

کہہ کر اس سے ہر اس عیب کی نفی کر دی ہے جس کی طرف آیت۔

﴿وَاِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲۔۲۱۹) (ان میں نقصان بڑے ہیں۔) اور آیت۔

﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ (۵۔۹۰) ناپاک اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا۔

(غ و ی)

اَلْغَیُّ: اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو۔ کیونکہ جہالت کبھی تو کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی عقیدہ کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی جہالت کا نام غَیٌّ (گمراہی ہے۔) قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی﴾ (۵۳۔۲) کہ تمھارے رفیق (محمدؐ) نہ رستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔

﴿وَاِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ﴾ (۷۔۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچتے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا﴾ (۹۔۵۹) سو عنقریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی۔

میں غَیٌّ سے عذاب مراد ہے عَذَاب کو غَیٌّ اس لیے کہا ہے کہ گمراہی عذاب کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا عذاب کو غَیٌّ کہنا مجازی ہے یعنی کسی شے کو اس کے سبب نام سے موسوم کر دینا جیسا کہ نبات کو ندّی (طراوت) کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ یہ لوگ عنقریب ہی اپنی گمراہی کا نتیجہ اور ثمرہ پالیں گے مگر مآل کے لحاظ سے دونوں معنی ایک ہی ہیں غَاوٍ: بھٹک جانے والا، گمراہ۔ جمع غَاوُوْنَ وَغَاوِیْنَ جیسے فرمایا۔

﴿وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغَاوِیْنَ﴾ (۲۶۔۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائی گی۔

﴿وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اَلْغَوِیُّ: گمراہ، غلط رو۔ جیسے فرمایا۔

﴿اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (۲۸۔۱۸) کہ تو تو صریح گمراہ ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ (۲۰۔۱۲۱) اور آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا (تو وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

میں غَوٰی کے معنی یہ ہیں کہ آدم نے جہالت کا ارتکاب کیا اور بعض نے اس کے معنی خَابَ کیے ہیں یعنی انھوں

نے سراسر نقصان اٹھایا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الطّویل)

(٣٣٤) وَمَنْ يَغْوِ لاَ يَعْدَمْ عَلَى الْغَيِّ لاَئِمًا

اور اگر ناکام ہو جائے تو ناکامی پر بھی ملامت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

بعض نے غَوٰی کے معنی فَسَدَ عَيْشُهٗ کیے ہیں یعنی اس کی زندگی تباہ ہوگئی اور یہ غَوِيَ الْفَصِيْلُ وَغَوٰی جیسے هَوِيَ وَهَوٰی: سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بدہضمی ہوگئی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ (١١۔٣٤) اور اگر اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے۔

میں يُغْوِيَكُمْ سے مراد گمراہی کی سزا دینے کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی گمراہی کا حکم لگانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ، اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ﴾ (٢٨۔٦٣) (تو جن لوگوں پر) عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا اور جس طرح ہم خود گمراہ تھے اسی طرح انہیں گمراہ کیا تھا۔

میں بتایا گیا ہے کہ کفار قیامت کے دن اعلان کریں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ انتہائی مخلصانہ سلوک کیا تھا جو کہ ایک انسان اپنے دوست سے کر سکتا ہے کیونکہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم نے انہیں اپنی طرف سے فائدہ پہنچایا اور انہیں اپنے جیسا سمجھا تھا اور یہی معنی آیت۔

﴿فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ﴾ (٣٧۔٣٢) ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا (اور) ہم خود بھی گمراہ تھے، کے ہیں۔

﴿فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ......﴾ (١٥۔٣٩) جیسا کہ تم نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور ان کو بہکاؤں گا۔

(غ ی ب)

اَلْغَيْبُ: (ض) غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَيْرُهَا کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

غَابَ عَنِّي كَذَا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ﴾ (٢٧۔٢٠) کیا کہیں غائب ہو گیا ہے۔

---

[1] وفي المعجم للمرزباني ٥: البيت للمرقش الاصغر (ربيعة بن سليمان بن سعد بن مالك) وهو ابن اخى المرقش الاكبر وعم طرفة بن العبد اوله: فمن يلق خيرا يحمد الناس امره...... انظر اللسان (غوى) والمفضليات (١١٨) والبيت من شواهد الطبرى (١٦: ١٠١) والخزانة (١: ١٦٤) والاغانى (٥: ١٨٥) والشعرو الشعراء (١٠٧) والحماسة للبحترى (٢٣٦) والمرزبانى (١٠٢) وشعراء الجاهلية (٣٢٩) والانصاف (١١٨) والمرتضىٰ (١: ٣٦١/٢: ٤٦) والبحر (٦: ٢٠١-٢: ٣٢٦) واصلاح يعقوب (٢٠٣) وقبله: امن حلم اصبحت تنكث واجما وقد تعترى الاحلام من كان نائما و البيت ايضاً فى الحصرى (٣: ١١) والعقد الفريد (٢: ١٨٦) والسيوطى ١٥٩ والفائق (٢: ١٠١)

اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے یعنی غیب بمعنی غائب ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۲۷۔۷۵) اور آسمانوں اور نہ زمین میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے مگر (وہ) کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

اور کسی چیز کو غَیْبٌ یا غَائِبٌ لوگوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ باری تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ لہٰذا آیت کریمہ۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۶۔۷۳) وہی پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا ہے۔

میں اَلْغَيْبُ وَالشَّهَادَةُ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے علم و حواس سے پوشیدہ ہیں اور جو اس کے سامنے موجود ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۲۔۳) غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

میں الغیب سے وہ تمام اشیاء اور حقائق مراد ہیں جو انسانی حواس سے ماوراء ہیں اور بداہت عقل سے ان کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہی ان کا علم ہوتا ہے اور انہیں نہ ماننے کی وجہ سے انسان ملحد ہو جاتا ہے ❶ اور جن لوگوں نے غیب سے قرآن یا تقدیر مراد لی ہے۔ تو انھوں نے اس کے جزوی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے معنی یہ کیے ہیں کہ ''تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ ایمان لاتے ہیں، ❷ یعنی وہ ان منافقوں کی طرح نہیں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ:

﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ، قَالُوْآ اِنَّا مَعَكُمْ ، اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُوْنَ﴾ (۲۔۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ہم (پیروان محمدؐ سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۵۔۱۸) جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ...... ہیں۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۵۰۔۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

وغیرہا میں بھی غیب کے معنی خلوت اور تنہائی کے ہیں۔

﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۶۔۷۷) اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے۔

﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ﴾ (۱۹۔۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا﴾ (۷۲۔۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔

﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ

---

❶ وھو قول جمھور المفسرین کما فی الروح۔
❷ وھوا اختیار ابی مسلم الاصفھانی فعلیٰ ھذا قولہ (بالغیب) صفة المومنین (راجع الفخر ۲/۲۷)

اِلَّا اللّٰهُ﴾ (۲۷۔۶۵) کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ﴾ (۱۱۔۴۹) یہ (حالات) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ (۳۔۱۷۹) اور اللہ تم کو غیب کی باتوں سے مطلع نہیں کرے گا۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۵۔۱۱۶) بے شک تو عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۳۴۔۴۸) میرا پروردگار اوپر سے حق اتارتا ہے (اور وہ) غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

اَغَابَتِ الْمَرْءَةُ: وہ عورت جس کا خاوند اس کے پاس موجود نہ ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (۴۔۳۴) اور ان کے پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خاوندوں کی عدم موجودگی میں وہ کام نہیں کرتیں جسے وہ برا سمجھتے ہوں۔

اَلْغِيْبَةُ: کے معنی کسی انسان کی عدم موجودگی میں اس کے اس عیب کو بیان کرنے کے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اس پر ناگوار گزرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (۴۹۔۱۲) اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔

اَلْغِيَابَةُ: کے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور اسی سے گھنے جنگل کو غَابَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فِىْ غِيَابَةِ الْجُبِّ﴾ (۱۲۔۱۰) کسی کنویں کی گہرائی میں......۔ ایک محاورہ ہے۔

هُمْ يَشْهَدُوْنَ اَحْيَانًا وَيَتَغَايَبُوْنَ اَحْيَانًا کہ وہ کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ کے معنی یہ ہیں کہ............۔ (وہ یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور نگاہ و بصیرت سے اس کا ادراک نہیں کرتے۔ ❶

(غ ی ر)

غَيْرٌ۔ کا لفظ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ا۔ محض نفی کے لیے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا جیسے، مَرَرْتُ بِرَجُلٍ غَيْرِ قَائِمٍ: یعنی میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۸۔۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

﴿وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (۴۳۔۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

۲۔ بمعنی اِلَّا جو مستثنٰی کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے مَرَرْتُ بِقَوْمٍ غَيْرِ زَيْدٍ: یعنی میں زید کے علاوہ دوسری قوم کے پاس سے گزرا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ﴾ (۲۸۔۳۸) میں تمھارا اپنے سوا کسی کو اللہ نہیں جانتا۔

❶ راجع للغيث (غوث)

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ (۷۔۶۵) اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ (۳۵۔۳) کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق) ہے۔

۳۔ کسی چیز سے صرف اس کی صورت یعنی وصف کی نفی کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے اَلْمَاءُ اِذَا كَانَ حَارًّا غَيْرُهٗ اِذَا كَانَ بَارِدًا۔ کہ پانی گرم ہونے کی حالت میں ٹھنڈے کا غیر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو اور کھالیں بدل دیں گے۔

۴۔ یہ کہ وہ نفی ذات کو بھی شامل ہو۔ جیسے فرمایا۔

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (۶۔۹۳) آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ یعنی باطل بہتان بندیاں کرتے تھے۔

﴿وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۲۸۔۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے تھے۔

﴿اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا﴾ (۶۔۱۶۴) کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔

﴿وَيَسْتَبْدِلْ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷۔۳۸) اور تمھاری جگہ اور لوگ پیدا کرے گا۔ [1]

﴿اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا﴾ (۱۰۔۱۵) (یا تو) اس کے سوا کوئی قرآن (بنا) لاؤ۔

اور تَغْيِيْر کا لفظ بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک صرف کسی چیز کی صورت کو بدلنا جیسے غَيَّرْتُ دَارِيْ یعنی میں نے اپنے گھر کی شکل و صورت بدل دی۔ دوم کسی دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے: غَيَّرْتُ غُلَامِيْ وَدَابَّتِيْ یعنی میں نے اپنا غلام یا جانور دوسرے سے تبدیل کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (۱۳۔۱۱) خدا اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

اور لفظ غَيْرٌ اور مُخْتَلِفٌ میں معنوی لحاظ سے فرق یہ ہے کہ غیر کا مفہوم لفظ مختلف سے زیادہ عام ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز دوسری کی غیر ہے تو ان دونوں چیزوں کا بلحاظ جوہر کے مختلف ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ تغایر فی الوصف کی صورت بھی میں ایک دوسری کا غیر کہا جا سکتا ہے مگر ایک چیز کو دوسری سے مختلف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ ان دونوں میں تغایر بلحاظ جوہر کے پایا جائے۔ بس اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جگہ مختلفین کو متغائرین تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر موقعہ پر متغایرین کو مختلفین نہیں کہہ سکتے۔

(غ ی ض)

غَاضَ (ض) اَلشَّيْءُ غَيْضًا وَغَاضَهٗ غَيْرُهٗ: یہ نَقَصَ کی طرح لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا اس کے از خود کم ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَغِيْضَ الْمَاءُ﴾ (۱۱۔۴۴) تو پانی خشک ہو گیا۔

[1] كذا الاية في الاصل وانما هوزة من المصحح دون لفظ ربي انما جاء في (۱۱۔۵۷) لكن هناك يستخلف بدل يستبدل

﴿وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ﴾ (۱۳۔۸) اور پیٹ کے سکڑنے۔یعنی وہ نطفہ جسے بگاڑ کر رحم اس پانی کی طرح ضائع کر دیتے ہیں جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے (اور وہ پینے کے کام نہیں آتا۔)

اَلْغَيْضَةُ: وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرے اور زمین اسے اپنے اندر جذب کر لے لَيْلَةٌ غَائِضَةٌ: تاریک رات۔

(غ ی ظ)

اَلْغَيْظُ کے معنی سخت غصہ کے ہیں۔یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون کے تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ (۳۔۱۱۹) کہہ دو کہ (بدبختو) غصے میں مر جاؤ۔ غَاظَهٗ (کسی کو غصہ دلانا)۔

﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

اور اللہ تعالیٰ نے سخت غصہ کے وقت نفس کو روکنے کا حکم دیا ہے اور جو لوگ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں ان کی تحسین فرمائی ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ (۳۔۱۳۴) اور غصے کو روکتے ہیں۔

اور اگر غیظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے انتقام لینا مراد ہوتا ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۵) اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں۔

یعنی وہ اپنی مخالفانہ حرکتوں سے ہمیں انتقام پر آمادہ کر رہے ہیں۔اور تَغَيُّظٌ کے معنی اظہار غیظ کے ہیں جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے، جیسے فرمایا۔

﴿سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾ (۲۵۔۱۲) تو اس کے جوش غضب اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔

❀❀❀

کتَابُ الْفَاء

(ف ء د)

اَلْفُؤَادُ کے معنی قلب یعنی دل کے ہیں مگر قلب کو فُؤاد کہنا معنی تَفَوُّدٌ یعنی روشن ہونے کے لحاظ سے ہے محاورہ ہے فَادْتُ اللَّحْمَ: گوشت کو آگ پر بھون لینا۔ لَحْمٌ فَئِیْدٌ آگ میں بھنا ہوا گوشت۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاکَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی﴾ (۵۳۔۱۱) جو کچھ انھوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ (۱۷۔۳۶) کہ کان آنکھ اور دل ....۔

فُؤَادٌ کی جمع اَفْئِدَۃٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیَ اِلَیْھِمْ﴾ (۱۴۔۳۷) لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف جھکے رہیں۔

وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔

﴿وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَاءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔

﴿نَارُاللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ﴾ (۱۰۴۔۶۔۷) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر جا لپٹے گی۔

اَفْئِدَۃَ کی تخصیص سے اس کی شدت تاثیر پر تنبیہ کی ہے جس کی وضاحت اس کے بعد علوم قرآن پر کتابوں میں سے کسی کتاب میں بیان کی جائے گی۔

(ف ت ء)

مَافَتَأْتُ وَمَا فَتِئْتُ اَفْعَلُ کَذَا (بمعنی مَازِلْتُ) میں اس کام کو برابر کرتا رہا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿تَفْتَؤُا تَذْکُرُیُوْسُفَ﴾ (۱۲۔۸۵) آپ یوسف کو اسی طرح یاد کرتے ہی رہو گے۔

(ف ت ح)

اَلْفَتْحُ کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فَتْحُ الْبَابِ (دروازہ کھولنا) اور فَتْحُ الْقُفْلِ (قفل کھولنا) اور فَتْحُ الْمَتَاعِ (اسباب کھولنا۔قرآن پاک میں ہے۔)

﴿وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَھُمْ﴾ (۱۲۔۶۵) اور جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا۔

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۱۵۔۱۴) اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔دوم جس کا ادراک بصیرت سے ہو۔جیسے:

فَتْحُ الْھَمِّ: (یعنی ازالہ غم) اس کی چند قسمیں ہیں (۱) وہ جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ دے کر غم و اندوہ اور فقر و احتیاج کو زائل کر دینا۔جیسے فرمایا۔

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُکِّرُوْا بِہٖ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ

كُلِّ شَيْءٍ﴾ (٦۔۴۴) پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی، فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا۔

﴿لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔ (۲) علوم و معارف کے دروازے کھولنا جیسے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ فَتَحَ مِنَ الْعِلْمِ بَابًا مُّغْلَقًا: فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شبہات کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ (۴۸۔۱) (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو فتح دی اور فتح بھی صریح و صاف۔ میں بعض نے کہا ہے یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم و معارف اور ان ہدایات کے دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے لیے غفران ذنوب کا سبب بنے۔ [1]

اَلْفَاتِحَة: ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فَاتِحَةُ الْكِتَاب کہا جاتا ہے۔ اَفْتَحَ فُلَانٌ كَذَا فلاں نے یہ کام شروع کیا۔ فَتَحَ عَلَيْهِ كَذَا: کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ (۲۔۷۶) جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو...... بتائے دیتے ہو۔

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ﴾ (۳۵۔۲) جو لوگوں کے لیے ......کھولدے۔ فَتَحَ الْقَضِيَّةَ فَتَاحًا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ﴾ (۷۔۸۹) اے ہمارے پروردگار! ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اسی سے ﴿اَلْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ﴾ (۳۴۔۲۶) ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ [2] (الوافر)

(۳۳۵) وَاِنِّيْ مِنْ فَتَاحَتِكُمْ غَنِيٌّ

[1] وهذا هوا المناسب لقوله تعالىٰ بعده ليغفرلك الله الآية۔

[2] والصحيح بانى بدل وانى وادله: الا ابلغ بنى عصم رسولا...... وفى رواية بنى عمرو بدل بنى عصم وفى رواية المحكم (فتح) صدره: به الامن مبلغ عمرا رسولا۔ وفى الاساس۔ الا ابلغ بنى وهب رسولا۔ وفى رواية اللسان غنى بدل فنى وفى رواية القالى فانى عن "بدل" وانى من" والبيت كماترى اختلافافى روايته ايضا مما اختلف فى غزوه فنسبه صاحب اللسان الى الاسعر الجعفى وفى زيادات الجمهرة(٢ : ٤) منسوب لاعشى قيس لكن الاعشى مصحف من الاسعر تسبه ابن السيرافى الى شويعرالجعفى وفى الحماسة الصغرى لابى تمام (٤٦) ان البيت لمحمد بن حمران' ابى حمران وابو حمران اسمه مرثد بن حمران ولعل محمد مصحف والبيت فى اصلاح المنطق ١١٢ و تهذيبه (١ :٨٨) والبحر(٤ : ٣٤٤) وذيل مجازات ←

اور میں تمھارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔
بعض کے نزدیک فُتَاحَةٌ فا کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے۔ ❶ اور آیت کریمہ۔
﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ (۱۱۰۔۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح حاصل ہوگئی۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَلْفَتْحُ سے نصرت، کامیابی اور حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم و معارف کے دروازے کھول دینا مراد ہو۔ اسی معنی میں فرمایا۔
﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ (۶۱۔۱۳) (یعنی تمھیں) خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح عنقریب (ہوگی)۔
﴿فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ﴾ (۵۔۵۲) تو قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔
﴿وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ (۳۲۔۲۸) اور کہتے ہیں ...... یہ فیصلہ کب ہوگا۔
﴿قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ﴾ (۳۲۔۲۹) کہہ دو کہ فیصلے کے دن ......
یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ اَلْفَتْحِ سے قیامت بپا کرکے ان کے شک وشبہ کو زائل کرنے کا دن مراد ہے بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا کرتے تھے۔
اَلِاسْتِفْتَاحُ کے معنی غلبہ یا فیصلہ طلب کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَإِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ﴾ (۸۔۱۹) (کافرو) اگر تم محمد ﷺ پر فتح چاہتے ہو تو تمھارے پاس فتح آچکی۔
یعنی اگر تم کامیابی یا فیصلہ کرتے ہو تو وہ آچکا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ اگر تم مبدءِ خیرات طلب کرتے ہو تو آنحضرت ﷺ کی بعثت سے تمھیں مل چکا ہے اور آیت کریمہ۔
﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۔۸۹) اور وہ پہلے ہمیشہ کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔
میں يَسْتَفْتِحُونَ کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔ (۱) آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے فتح طلب کرتے تھے (۲) وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے متعلق کبھی لوگوں سے دریافت کرتے تھے اور کبھی کتب سماویہ سے اس پر استدلال کرتے تھے (۳) وہ آنحضرت ﷺ کے ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے (۴) وہ کہا کرتے تھے کہ آنحضرت کے ذریعہ ہمیں بت پرستوں پر غلبہ حاصل ہوگا۔
اَلْمِفْتَحُ وَالْمِفْتَاحُ: (کنجی) وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو کھولا جائے اس کی جمع مَفَاتِحُ وَمَفَاتِيْحُ آتی ہے اور آیت ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ (۶۔۵۹) اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ میں مَفَاتِحُ سے وہ وسائل مراد ہیں جن کے ذریعہ اس غیب تک رسائی ہوتی ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ

← القرآن لشریف الرضی والطبری (۹:۲) والسمط ۹۲۷ والقرطبی (۱۳: ۹۴) واللسان والتاج (فتح، فتا) و محاز القرآن لابی عبیدة (۱: ۲۲۰/۲: ۸۷) وشواهد الکشاف ۵ وفی روایته: الاابلغ بنی حمران انی عن عوادتکم نهی فی ۹ ابیات راجع السمط

❶ والصحیح بالضمة والکسرة فانه فی اصلاح یعقوب ۱۲: فی باب الفُعانه والفِعالة

اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (۷۲۔۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ میں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ﴾ (۲۸۔۷۶) اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔

میں مَفَاتِحَ سے بعض کے نزدیک خزانوں کی چابیاں مراد ہیں اور بعض نے خزانے ہی مراد لیے ہیں۔

عام طور پر بَابٌ فَتْحٌ کے معنی مَفْتُوْحٌ کے آتے ہیں اور یہ غَلْقٌ کی ضد ہے۔ایک روایت میں ہے۔

﴿مَنْ وَّجَدَ بَابًا غَلْقًا وَجَدَ اِلٰی جَنْبِهٖ بَابًا فَتْحًا﴾ کہ جس سے ایک دروازہ بند ہو جائے تو اس کے لیے دوسرا دروازہ کھلا ہے اور بعض کے نزدیک فَتْحٌ بمعنی وَاسِعٌ ہے۔

(ف ت ر)

اَلْفُتُوْرُ: کے معنی تیزی کے بعد ٹھہرنے، سختی کے بعد نرم اور قوت کے بعد کمزور پڑ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ (۵۔۱۹) اے اہل کتاب! پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جو ایک عرصے تک منقطع رہا تو اب تمھارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں۔

یعنی سلسلۂ رسالت کے منقطع اور ماند پڑ جانے کے بعد آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔آیت کریمہ۔

﴿لَا یَفْتُرُوْنَ﴾ (۲۱۔۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور کبھی سست نہیں پڑتے اور ایک روایت میں ہے۔

((اِنَّ لِكُلِّ عَالِمٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَمَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِیْ فَقَدْ نَجَا وَ اِلَّا فَقَدْ هَلَكَ)) کہ ہر عالم میں تیزی ہوتی ہے اور ہر تیزی کے بعد فترۃ یعنی سکون ہوتا ہے تو جو شخص میری سنت سے سکون حاصل کرے گا وہ نجات یافتہ ہے ورنہ وہ ہلاک ہو گا۔ پس لِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باطل میں پہلے پہل تو جوش ہوتا ہے مگر جلد ہی مضمحل ہو جاتا ہے اور حق کی سلطنت کبھی ذلیل یا کمزور نہیں ہوتی۔اور مَنْ فَتَرَ اِلٰی سُنَّتِی کے معنی سنت نبوی کی پناہ میں سکون حاصل کرنے کے ہیں۔

اَلطَّرْفُ الْفَاتِرُ: نگاہ مست اور یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اَلْفِتْرُ: انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان کا فاصلہ اور شَبَرْتُهٗ بِشِبْرِی کی طرح فَتَرْتُهٗ بِفِتْرِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی انگوٹھا اور انگشت شہادت کے ساتھ کسی چیز کو ناپنے کے ہیں۔

(ف ت ق)

اَلْفَتْقُ (ض) کے معنی دو متصل چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں اور یہ رَتْقٌ کی ضد ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ (۲۱۔۳۰) آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔

اَلْفَتْقُ وَالْفَتِیْقُ صبح کو کہتے ہیں (کیونکہ وہ تاریکی سے نمودار ہوتی ہے۔

اَفْتَقَ الْقَمَرُ: چاند کا بادل سے ظاہر ہونا۔

نَصْلٌ فَتِيْقُ الشَّفْرَتَيْنِ: بھالا جس کی دو شاخیں ہوں۔گویا ایک کو دوسری سے پھاڑ کر بنایا گیا ہے۔
جَمَلٌ فَتِيْقٌ: اونٹ جس کا چمڑا موٹاپے کی وجہ سے پھٹ گیا ہو اور یہ فَتِيقَ (س لازم) فَتْقًا سے ہے۔

(ف ت ل)

فَتَلْتُ الْحَبْلَ فَتْلًا کے معنی رسی کو بل دینے کے ہیں اور بٹی ہوئی رسی کو مَفْتُوْلٌ کہا جاتا ہے اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو باریک سا ڈورا ہوتا ہے اسے بھی فَتِيْلٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رسی کی شکل وصورت پر ہوتا ہے (عربی زبان میں یہ حقیر شے کے لیے ضرب المثل ہے) جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾ (۴۔۴۹) اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔
فَتِيْلٌ اصل میں اس دھاگے یا میل کو کہتے ہیں جو دو انگلیوں میں پکڑ کر بٹی جاتی ہے اور یہ حقیر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔
نَاقَةٌ فَتْلَاءُ الذِّرَاعَيْنِ: مضبوط بازوؤں والی اونٹنی۔

(ف ت ن)

اَلْفَتْنُ: [1] دراصل فَتَنَ کے معنی سونے کو آگ میں پگلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے اس لحاظ سے کسی انسان کو آگ میں ڈالنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے: ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۳) جب ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا۔اور اس کا اطلاق نفس عذاب پر بھی ہوتا ہے۔جیسے فرمایا:
﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ﴾ (۵۱۔۱۴) اپنی شرارت کا مزہ چکھو۔یعنی عذاب کا مزہ چکھو۔جیسے آیت کریمہ:
﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔
میں لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا﴾ (۴۰۔۴۶) یعنی آتش جہنم پر پیش کیے جاتے ہیں۔
میں اسی عذاب کو عرض علی النار کہا ہے۔
اور کبھی فتنہ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو عذاب کا باعث بنتی ہو جیسے فرمایا:
﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) دیکھو! یہ آفت میں پڑ گئے ہیں۔
اور کبھی اس کے معنی امتحان اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔جیسے فرمایا:
﴿وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ (۲۰۔۴۰) اور ہم نے تمہاری کئی بار آزمائش کی۔
اور بلاء کی طرح فتنہ کا لفظ بھی تکلیف اور آزمائش دونوں قسم کی حالت پر بولا جاتا ہے۔جن میں انسان کو مبتلا کر کے اس کی آزمائش کی جاتی ہے (اور اس کے صبر وشکر کا امتحان کیا جاتا ہے)
لیکن شدت کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ظاہر اور اکثر ہے چنانچہ قرآن پاک نے دونوں قسم کے فتنہ کے متعلق فرمایا ہے۔
﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ (۲۱۔۳۵) اور

[1] انظر للفظ الفتنة ومعانيها المختلفة فی القرآن۔ الفتح الباری (۱۶/۱۱۸)

ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

اور تکلیف کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۰۲) ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۲۔۱۹۱) اور (دین سے گمراہ کرنے کا) فساد قتل وخون ریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو حتیٰ کہ فساد نابود ہو جائے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (۹۔۴۹) اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجیے اور آفت میں نہ ڈالیے دیکھو یہ آفت میں پڑے ہیں۔

یعنی مجھے بلا اور تکلیف میں نہ ڈالئے حالانکہ وہ بات کہنے کی وجہ سے مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہو رہے ہیں۔

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ﴾ (۱۰۔۸۳) تو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم میں سے چند لڑکے اور وہ بھی فرعون اور اس کے اہل دربار سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ ان کو آفت میں نہ پھنسا دے۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ انہیں مصیبت اور عذاب میں ڈال دے۔

﴿وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ﴾ (۵۔۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ...... یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ (۱۷۔۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچلا دیں۔

یعنی تجھے وحی کے احکام سے برگشتہ کر کے مصیبت اور شدت میں مبتلا نہ کر دیں۔

﴿فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۵۷۔۱۴) تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا۔

یعنی اپنے آپ کو بلا اور عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (۸۔۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

میں اموال واولاد کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ ان کے سبب سے انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۶۴۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

میں بعض ازواج اور اولاد کو دشمن قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات ان سے اس طرح اذیت پہنچتی ہے جس طرح کہ دشمن سے پہنچتی ہے اور آیت کریمہ:﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ (۳۔۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے...... بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں عورتوں اور بیٹوں کو زینت قرار دیا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو باعث زینت خیال کرتے ہیں نیز قرآن پاک میں

ہے:
﴿الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ﴾ (۲۹۔۱) کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ چھوڑ دیئے جائیں گے اور انکی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ یعنی انہیں آزمائش میں ڈال کر اچھے اور برے کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تا کہ خدا، ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ:
﴿اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾ (۹۔۱۲۶) کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار بلا میں پھنسا دیے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

میں اس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ (۲۔۱۵۵) الآیۃ اور ہم کسی قدر خوف...... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ میں پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۵۔۷۱) اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آئے گی۔
میں بھی فِتْنَةٌ اسی معنی پر محمول ہے۔
فِتْنَةٌ کا لفظ بلا، مصیبت قتل اور عذاب وغیرہ، افعال کریہہ پر بولا جاتا ہے اور یہ ان افعال سے ہے جن کا اسناد، اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقتضائے حکمت کے مطابق آزمائش و امتحان مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کا اسناد انسان کی طرف ہو تو اس کے برعکس معنی مراد ہوتے ہیں اس لیے مختلف انواع کے فتنوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جابجا انسان کی مذمت کی ہے چنانچہ فرمایا:۔
﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۲۔۱۹۱) اور (دین سے گمراہ کرنے کا فساد) قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔
﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۸۵۔۱۰) جن لوگوں نے مومن مردوں......کو تکلیفیں دیں۔
﴿مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِيْنَ﴾ (۳۷۔۱۶۲) خدا کے خلاف بہکا نہیں سکتے۔
یعنی گمراہ کرنے والے نہیں ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ﴾ (۶۸۔۶) کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔
میں بقول اخفش مَفْتُوْنَ بمعنی فتنہ ہے جس طرح کہ لَيْسَ لَهٗ مَعْقُوْلٌ وَخُذْ مَيْسُوْرَهٗ وَدَعْ مَعْسُوْرَهٗ میں معقول مَيْسُوْرٌ و مَعْسُوْرٌ بمعنی عقل، یُسر اور عُسر ہیں تو آیت کی اصل بِاَيِّكُمُ الْفُتُوْنُ ہے۔
بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ بِاَيِّكُم میں باءُ زائد ہے جیسا کہ آیت وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا میں ہے لہٰذا یہ اصل میں اَيُّكُمُ الْمُفْتُوْنُ ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾ (۵۔۴۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا دیں۔
میں اَنْ يَّفْتِنُوْكَ کے معنی ہیں: خَدَعُوْكَ اس لیے عَنْ (صلہ) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

(ف ت ی)

اَلْفَتٰی کے معنی نوجوان کے ہیں اس کی مؤنث فَتَاۃٌ اور مصدر فَتَاءٌ ہے بعدہ کنایہ کے طور پر دونوں لفظ (فَتٰی اور فَتَاۃٌ) غلام اور لونڈی کے معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُرَاوِدُ فَتٰھَا عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ (۱۲۔۳۰) اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔

جس طرح نوجوان آدمی کو فَتٰی کہا جاتا ہے۔اسی طرح نوجوان اونٹ پر فِتیٌّ (فعیل) بولا جاتا ہے فَتٰی کی جمع فِتْیَۃٌ وَفِتْیَانٌ اور فَتَاۃٌ کی جمع فَتَیَاتٌ آتی ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿مِنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (۴۔۲۵) تو مومن لونڈیوں میں سے......

﴿وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (۲۴۔۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔﴿وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ﴾ (۱۲۔۶۲) اور یوسف علیہ السلام نے اپنے خدام سے کہا۔

﴿اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ﴾ (۱۸۔۱۰) جب وہ جوان غار میں جا رہے۔

﴿اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ﴾ (۱۸۔۱۳) وہ کئی نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔

اور کسی مشکل مسئلہ کے جواب کو فُتْیَا وَفَتْوٰی کہا جاتا ہے۔ اِسْتَفْتَاہُ کے معنی فتوی طلب کرنے اور اَفْتَاہُ (افعال) کے معنی فتوی دینے کے ہیں جیسے فرمایا:﴿وَیَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِیْھِنَّ﴾ (اے پیغمبر) لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔کہہ دو کہ خدا تم کو ان کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں فتویٰ (اجازت) دیتا ہے۔ (۴۔۱۲۷)

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ﴾ (۳۷۔۱۱) تو ان سے پوچھو......

﴿اَفْتُوْنِیْ فِیْٓ اَمْرِیْ﴾ (۲۷۔۳۲) میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

(ف ج ج)

اَلْفَجُّ: دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی کو کہتے ہیں اس کے بعد وسیع راستہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔اس کی جمع فِجَاجٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ﴾ (۲۲۔۲۷) دور (دراز) راستوں سے۔

﴿فِیْھَا فِجَاجًا سُبُلًا﴾ (۲۱۔۳۱) اس میں کشادہ رستے اَلْفَجَجُ انسان کے دونوں گھٹنوں کے درمیان کشادگی ہونا اور ایسے آدمی کو جس کے گھٹنوں میں کشادگی ہو اَفَجُّ کہتے ہیں۔

اسی سے حَافِرٌ مُفَجَّجٌ ہے۔یعنی وہ گھوڑا جس کی ٹانگوں کے درمیان کشادگی ہو اور خام زخم کو جُوْجٌ فِجٌّ کہا جاتا ہے۔

(ف ج ر)

اَلْفَجْرُ کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کردینے کے ہیں۔جیسے محاورہ ہے، فَجَرَ الْاِنْسَانُ السِّکْرَ: اس نے بند میں وسیع شگاف ڈال دیا۔فَجَرْتُهٗ فَانْفَجَرَ: میں نے پانی کو پھاڑ کر بہایا تو وہ بہہ گیا فَجَّرْتُهٗ فَتَفَجَّرَ: شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہایا۔قرآن

پاک میں ہے۔

﴿وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا﴾ (۵۴۔۱۲)اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے۔

﴿وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا﴾ (۱۸۔۳۳)اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ ﴿فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا﴾ (۱۷۔۱۹)اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔

﴿تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا﴾ (۱۷۔۹۰) جب تک کہ ہمارے لیے زمین میں سے چشمہ جاری (نہ) کردو۔

اور ایک قرأت میں تُفَجِّرَ (بصیغہ تفعیل) ہے۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا﴾ (۲۔۶۰)تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور اسی سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَالْفَجْرِ وَلَیَالٍ عَشْرٍ﴾ (۸۹۔۲۸) فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔

﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (۱۷۔۷۸) کیونکہ صبح کے وقت قرآن پاک پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔ بعض نے کہا کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیے کی دم کی طرح (سیدھی روشنی سی نمودار ہوتی ہے) دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے احکام تعلق رکھتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ﴾ (۲۔۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔

اَلْفُجُوْرُ کے معنی دین کی پردہ دری یعنی نافرمانی کرنے کے ہیں۔ اس کا باب فَجَرَ یَفْجُرُ فُجُوْرًا فَهُوَ فَاجِرٌ (بدکار) ہے۔ اور فَاجِرٌ کی جمع فُجَّارٌ وَ فَجَرَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَلَّا اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ﴾ (۸۳۔۷) سن رکھو کہ بدکاروں کے اعمال سجین میں ہیں۔ ﴿اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ﴾ (۸۲۔۱۴)اور بدکار دوزخ میں۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (یہ کفار بدکردار ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ﴾ (مگر انسان چاہتا ہے کہ آگے کو خود سری کرتا جائے۔ یعنی وہ زندگی اس لیے چاہتا ہے کہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرے۔ بعض نے اس کے معنی لِیُذْنِبَ فِیْهَا (تا کہ اس میں گناہ کرے) کیے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ انسان گناہ کرتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ کل توبہ کرلوں گا۔ لیکن پھر تائب نہیں ہوتا تو یہ سراسر فجور ہے کیونکہ وہ عہد کر کے اسے توڑ ڈالتا ہے اور کاذب کو فاجر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کذب بیانی بھی فجور کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں ہے۔[1] (۶۵) وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ یعنی جو تجھے جھٹلاتا ہے اسے ہم ترک کرتے ہیں۔ بعض نے

[1] کلمة في قنوت الوتر عن عبدالرحمن بن العزى قال صليت خلف عمر بن الخطاب الصبح الحديث وفي آخر ←

مَنْ يَفْجُرُكَ کے معنی مَنْ يَتَبَاعَدُ عَنْكَ کیے ہیں یعنی جو تجھ سے علیحدہ اور دور ہوتا ہے۔

ایام الفجار: خانہ جنگی کے ایام جو عربوں میں واقع ہوئی۔

(ف ج و)

اَلْفَجْوَةُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ کھلی جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ (۱۸۔۱۷) اور وہ اس کے میدان میں تھے۔

یعنی وسیع میدان میں تھے۔ اس سے قَوْسٌ فَجَاءٌ وَفَجْوَاءُ ہے یعنی کمان جو کھینچی ہوئی حالت میں ہو۔

رَجُلٌ اَفْجٰی: جس کے دونوں پنڈلیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔

(ف ح ش)

اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَاءُ وَالْفَاحِشَةُ: اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (۷۔۲۸) کہ خدا بے حیائی کے کام کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔

﴿وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۹۰) اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

﴿مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (۳۳۔۳۰) تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ (الفاظ کہہ کر رسول اللہ کو ایذا دینے کی) حرکت کرے گی۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ (۲۴۔۱۹) اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر پھیلے)۔

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ﴾ (۷۔۳۳) کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو...... حرام کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ (۴۔۱۹) ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں۔

میں فاحشہ مبینۃ سے مراد زنا ہے اسی طرح آیت کریمہ ﴿وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ﴾ (۴۔۱۵) عورتوں میں جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ میں بھی فاحشہ سے مراد بدکاری ہے۔ فَحُشَ فُلَانٌ برا ہونا۔ اسی سے شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

← حدیث دزعم عبید انهما سورتان من القرآن فی مصحف عبدالله بن مسعود ایضاً قنت بهولاء الکلمات عثمان و علی رضی الله عنهما (راجع کنز العمال ۸/۵۲) و ایضا المروزی فی الصلاة والطبرانی فی الدعا: ان علی بن ابی طالب حدثنی انه من القرآن

[1] قاله طرفة بن العبد البکری فی معلقته المشهور مطلعها: لخولة اطلال...... وصدرالبیت: اری الموت یعتام الکرام ویصطفیٰ۔ والبیت فی الطبری (۳۰: ۲۷۹) واللسان (عوم) لکن فی روایة مال الباخل بدل مال الفاحش؟ والنفوس بدل الکرام والبیت فی مختار الشعر الجاهلی (۱: ۲۳۲) ومجاز القرآن لابی عبیدة (۲/۲۰۸) رقم (۹۴۶) و ذیل الامالی للمرتضی (۱: ۳۸۲) و ذیل المشکل للقبتی (۵۸) محولا علی الطبری واللسان والتاج (عدم' فحش) والمحکم (عیم) والکامل (۳۱۴) وشواهد الکشاف (۳۹) وتاریخ الطبری (۵: ۳۸) فی خمسة ابیات والبحر (۲/۲۱۹/۸: ۵۰۵) واضداد ابی الطیب (۷۰۰) والمعلقة فی دیوانه (۲۱۔۳۲) والبیت فی ۳۱ والجمهرة للقرشی (۱۴۹۔ ۱۶۰) و البیت فی (۱۵۶) والعقد الثمین (۵۸) وابن الانباری (۲۰۰) وابن الشجری فی امالیه (۱: ۲۱۱) والسیوطی (۲۷۱) وشرح العشر للتبریزی (۸۵)

(۲۳۶) عَقِیْلَۃَ مَالِ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ یعنی سخت بخیل آدمی کے نفیس مال کو (منتخب کر کے) فنا کرتی ہے تو فاحش متشدد سے بخل میں حد سے بڑھا ہوا شخص مراد ہے۔

اور بہت زیادہ فحش کام کرنے والے کو مُفْتَحِشٌ کہا جاتا ہے۔

(ف خ ر)

اَلْفَخْرُ: (ن) کے معنی ان چیزوں پر اترانے کے ہیں جو انسان کے ذاتی جوہر سے خارج ہوں مثلاً مال وجاہ وغیرہ اور اسے فَخَرٌ (بفتح الخا) بھی کہتے ہیں اور فخر کرنے والے کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے اور فَخُوْرٌ وَفِخِّیْرٌ صیغہ مبالغہ ہیں یعنی بہت زیادہ اترانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (۳۱۔۱۸) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔ فَخَرْتُ فُلَانًا عَلٰی صَاحِبِہٖ اَفْخَرُہٗ فَخْرًا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا اور ہر نفیس چیز کو فَاخِرٌ کہا جاتا ہے۔ ثَوْبٌ فَاخِرٌ: قیمتی کپڑا اور جس اونٹنی کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم دے اسے فخور کہتے ہیں۔ [1] اَلْفَخَّارُ: مٹکوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی بہت زیادہ فخر کر رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ﴾ (ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے......

(ف د ی)

اَلْفِدٰی وَالْفِدَاءُ کے معنی کسی کی جانب سے کچھ دیکر اسے مصیبت سے بچالینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً﴾ (۴۷۔۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔ یا کچھ مال لے کر۔ چنانچہ محاورہ ہے: فَدَیْتُہٗ بِمَالٍ۔ میں نے کچھ خرچ کر کے اسے مصیبت سے بچالیا فَدَیْتُہٗ بِنَفْسِیْ: میں نے اپنی جان کے عوض اسے چھڑالیا فَادَاہُ بِکَذَا۔ اس نے کچھ دے کر اسے چھڑالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ﴾ (۲۔۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر انہیں چھڑا بھی لیتے ہو۔

تَفَادٰی فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ: کسی کا فدیہ دے کر اس کو چھڑالینا۔

﴿وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ﴾ (۳۷۔۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

اِفْتَدٰی کے معنی خود اپنے کو مال کے عوض چھڑانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ﴾ (۲۔۲۲۹) رہائی پانے کے بدلے میں......

﴿وَّمِثْلَہٗ مَعَہٗ لَافْتَدَوْا بِہٖ﴾ (۱۳۔۱۸) (تو وہ سب کے سب) اور ان کے ساتھ ہی اتنے اور (نجات کے) بدلے میں صرف کر ڈالیں۔

﴿لَافْتَدَتْ بِہٖ﴾ (۱۰۔۵۴) تو (عذاب سے بچنے کے) لیے (سب) دے ڈالے۔

﴿لِیَفْتَدُوْا بِہٖ﴾ (۵۔۳۶) (تاکہ...... بدلہ دیں......

[1] وفی المطبوع کثیرۃ الدر والتصوب من المراجع۔

﴿وَلَوِ افْتَدٰی بِهٖ﴾ (۳۔۹۱) اگر...... بدلے میں...... دیں ﴿لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْهِ﴾ (۷۰۔۱۱) کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے ڈالے یعنی بیٹے......۔

اور جو مال کسی عبادت میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے خرچ کرکے انسان خود اپنے آپ کو گناہ سے بچاتا ہے اسے بھی فِدْیَۃٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ کفارہ یمین اور صوم کے متعلق فرمایا:

﴿فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ (۲۔۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ﴾ (۲۔۱۸۴) روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

(ف ر ر)

اَلْفَرُّ وَالْفِرَارُ، اس کے اصل معنی ہیں: جانور کی عمر معلوم کرنے کے لیے اس کے دانتوں کو کھولنا۔ اسی سے فَرَّ الدَّھْرُ جَذَعًا کا محاورہ ہے یعنی زمانہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ اور اسی سے اِفْتِرَارٌ ہے جس کے معنی ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا کے ہیں۔ فَرَّ مِنَ الْحَرْبِ فِرَارًا میدان کارزار چھوڑ دینا۔ لڑائی سے فرار ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ﴾ (۲۶۔۲۱) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ (یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا﴾ (۷۱۔۶) لیکن میرے بلانے سے اور زیادہ گریز کرتے رہے۔ ﴿لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ﴾ (۳۳۔۱۶) (کہہ دو) کہ اگر تم...... بھاگتے ہو تو بھاگنا تم کو فائدہ نہ دے گا۔

﴿فَفِرُّوْۤا اِلَی اللّٰهِ﴾ (۵۱۔۵۰) تو تم خدا کی طرف بھاگ چلو۔

اَفْرَرْتُهٗ: کسی کو بھگا دینا۔

رَجُلٌ فَرٌّ وَفَارٌّ: بھاگنے والا۔

اَلْمَفَرُّ: (مصدر) کے معنی بھاگنا (ظرف مکان) جائے فرار (ظرف زمان) بھاگنے کا وقت چنانچہ آیت:

﴿اَیْنَ الْمَفَرُّ﴾ (۷۵۔۱۰) کہ (اب) کہاں بھاگ جاؤں۔ کے معنی تینوں طرح ہو سکتے ہیں۔

(ف ر ت)

اَلْفُرَاتُ کے معنی شیریں یا نہایت شیریں پانی کے ہیں اور یہ واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّاَسْقَیْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴾ (۷۷۔۲۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

﴿ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵۔۵۳) ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا۔

(ف ر ث)

اَلْفَرْثُ: جو کچھ جانور کی اوجھڑی کے اندر ہوتا ہے اسے فرث کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا﴾ (۱۶۔۶۶) گوبر اور لہو میں سے کس طرح خالص دودھ...... فَرَثْتُ كَبِدَهٗ: میں نے اس کے جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ اَفْرَثَ فُلَانٌ اَصْحَابَهٗ: فلاں نے اپنے ساتھیوں کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جو بمنزلہ فَرْث کے تھی (یعنی ریزہ ریزہ کر دینے والی)۔

(ف ر ج)

اَلْفُرْجُ وَالْفُرْجَةُ کے معنی دو چیزوں کے درمیان

شگاف کے ہیں۔ جیسے دیوار میں شگاف یا دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی اور کنایہ کے طے طور پر فرج کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حقیقی معنی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّتِیٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (۲۱۔۹۱) اور ان (مریم علیہا السلام) کو (بھی یاد کرو) جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ ﴿لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ﴾ (۲۳۔۵) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴۔۳۱) (اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں)۔

اور استعارے کے طور پر سرحد اور ہر خطرہ کی جگہ کو فرج کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں فَرْجَانِ کا لفظ ترک اور سوڈان پر بولا جاتا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ﴾ (۵۰۔۶) اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں۔

میں فروج بمعنی شگاف ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ﴾ (۷۷۔۹) اور جب آسمان پھٹ جائے۔

میں فُرِجَتْ بمعنی انْشَقَّتْ ہے یعنی جب آسمان شق ہو جائے گا۔

اَلْفَرَجُ کے معنی غم دور ہونے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْكَ: اللہ تجھ سے غم کو دور کرے اور قَوْسٌ فَرْجٌ اس کمان کو کہتے ہیں جس کے دونوں گوشے کشادہ ہوں۔ جیسا کہ تانت سے علیحدہ ہونے کی حالت میں اور جو شخص اپنا بھید نہ چھپائے اس کو فَرْج کہا جاتا ہے اور فَرَجٌ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی شرمگاہ پر ستر یعنی پردہ نہ ہو۔

فَرَارِیْجُ الدَّجَاجِ: مرغی کے چوزے۔ کیونکہ وہ انڈوں سے نکلتے ہیں اور چوزوں والی مرغی کو مُفْرِجٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْمُفْرَجُ: وہ قتیل جس سے لوگ دور ہو جائیں اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو سکے۔

(ف ر ح)

اَلْفَرْحُ کے معنی کسی فوری یا دنیوی لذت پر انشراح صدر کے ہیں۔ عموماً اس کا اطلاق جسمانی لذتوں پر خوش ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمْ﴾ (۵۷۔۲۳) اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (۱۳۔۲۶) اور (کافر) لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں۔

﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ (۴۰۔۷۵) یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم...... خوش ہوا کرتے تھے۔

﴿حَتّٰٓی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْا﴾ (۶۔۴۴) یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئی تھی خوب خوش ہو گئے۔

﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (۴۰۔۸۳) تو جو علم (اپنے خیال میں) ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ﴾ (۲۸۔۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور قرآن پاک میں صرف دو آیتیں یعنی...... ﴿فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا﴾ (۱۰۔۵۸) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ ﴿وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۳۰۔۴) اور اس

روز مومن خوش ہو جائیں گے۔
ایسی ہیں جن میں فرح کا لفظ پسندیدہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مِفْرَاحٌ: بہت زیادہ اترانے والا۔شاعر نے کہا ❶ (الطویل)

(۳۳۷) وَلَسْتُ بِمِفْرَاحٍ اِذَا الْخَیْرُ مَسَّنِیْ
وَلَا جَازِعٍ مِنْ صَرْفِهِ الْمُتَقَلِّبِ

نہ تو میں خیر حاصل ہونے سے اتراتا ہوں اور نہ ہی زمانہ کے حوادثات پر جزع فزع کرتا ہوں۔

محاورہ ہے۔ مَا یَسُرُّنِیْ بِهٰذَا الْاَمْرِ مِفْرَحٌ اَوْ مَفْرُوْحٌ به: مجھے اس امر سے کچھ بھی خوشی نہیں۔ رَجُلٌ مُفْرَحٌ: وہ آدمی جو قرض کے نیچے دب گیا ہو۔ حدیث میں ہے ❷ (۲۶) ((لَا یُتْرَكُ فِی الْاِسْلَامِ مُفْرَحٌ)) یعنی اسلام میں کسی کو مُفْرَحٌ یعنی مقروض نہیں چھوڑا جائے گا۔ گویا اِفْرَاحٌ کا لفظ فرحت کے حاصل ہونے اور زائل کرنے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اِشْکَاءٌ کا لفظ جلب شکوٰی وازالہ آں کے معنی میں آتا ہے اور مقروض سے بھی چونکہ اس کی خوشی زائل ہو جاتی ہے اس لیے اسے مفرح کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: لَا غَمَّ اِلَّا غَمُّ الدَّیْنِ کہ اصل غم تو قرض کا غم ہے۔

(ف ر د)

اَلْفَرْدُ: (اکیلا) اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دوسری نہ ملائی گئی ہو یہ لفظ وِتْر (طاق) سے عام اور وَاحِدٌ سے خاص ہے اس کی جمع فُرَادٰی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا﴾ (۲۱-۸۹) پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ۔

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق فرد کا لفظ بولنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ تنہا ہے اس کے برعکس باقی اشیاء جوڑا جوڑا پیدا کی گئی ہیں جس پر کہ آیت ﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾ (۵۱-۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے فرد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں سے بے نیاز ہے جیسا کہ آیت:

﴿غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ......﴾ (۳-۹۷) اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

میں اس پر تنبیہ کی ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنی وحدانیت میں منفرد ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی ترکیب اور مجانست سے مبرّا ہے اور جملہ موجودات کے برعکس ہے۔ اور فرید کے معنی واحد یعنی اکیلا اور تنہا کے ہیں۔ اس کی جمع فُرَادٰی آتی ہے جیسے اَسِیْرٌ کی جمع اُسَارٰی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی﴾ (۶-۹۴) اور جیسا ہم

---

❶ قاله هدبة العذری انظر العقد (۱/۱۱۶) وفی روایة سرّنی بدل مسنی وفی العیون (۱/۲۷۶) البیت اللبعیث واخری فیه: (۱: ۲۸۱) انه لتابط شرا انظر المیسر ۴۹ والمعانی للقبتی (۱۱۵۱)۔

❷ الحدیث فی النهایة (فرح) والحدیث اخرجه الطبرانی فی الکبیر راجع کنز العمال رقم (۴۳۸) عن کثیر بن عبدالله عن ابیه عن جده وفی مجمع بحار الانوار مفرج یا لجیم و معنا ومن لا عشیرة له والفائق (۲/۱۲۶) ولفظه المفرج ذکره العلماء فی الاضداد و معناه المسرور رد ایضاً المثقل بالدین۔ (اضد اد ابی الطیب ۵۶۶ وابن الانباری ۱۹۷) ولمعناه انظر غریب ابی عبید ۱۲۔

نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے ہمارے پاس آئے۔

(ف ر ش)

اَلْفَرْشُ: (ن ض) کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم کے ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فِرَاش کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲۔۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا...... بنایا۔ یعنی قابل رہائش بنایا اور اسے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت ناممکن ہو اور اَلْفِرَاش کی جمع فُرُشٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ﴾ (۵۶۔۳۴) اور اونچے اونچے فرشوں میں۔

﴿فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ﴾ (۵۵۔۵۴) ایسے بچھونوں پر جن کے استر اطلس کے ہیں.....اور فـــرش سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا۔

﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا﴾ (۶۔۱۴۲) چوپایوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر کے جو بار برداری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔

اور کنایہ کے طور پر فراش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا۔ [1] (۶۷)((اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ)) کہ بچہ خاوند کا ہے۔

اور محاورہ ہے۔فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَفَارِشِ: یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔

اَفْرَشَ الرَّجُلُ صَاحِبَهٗ: اس نے اپنے ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔اَفْرَشَ عَنْهُ: کسی چیز سے رک جانا (اَلْفَرَاشَةُ پروانہ تتلی وغیرہ) اس کی جمع اَلْفَرَاش آتی ہے قرآن پاک میں ہے:﴿کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ﴾ (۱۰۱۔۴) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کنڈے کو بھی فَرَاشَةُ الْقُفْلِ کہا جاتا ہے نیز فَـــرَاشَة کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے ہیں۔

(ف ر ض)

اَلْفَرْضُ: (ض) کے معنی سخت چیز کو کاٹنے اور اس میں نشان ڈالنے کے ہیں۔مثلاً فَرْضُ الْحَدِیْدِ: لوہے کو کاٹنا فَرْضُ الْقَوْسِ: کمان کا چلہ فَرْضُ الزَّنْدِ: چقماق کا ٹکڑا اور فُرْضَةُ الْمَاءِ کے معنی دریا کا دھانہ کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ (۴۔۱۱۸) میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوا کر) مال کا ایک مقرر حصہ لے لیا کروں گا۔میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں مفروض کے معنی معین کے ہیں اور بعض نے کاٹ کر الگ کیا ہوا مراد لیا ہے۔اور فَرَضَ بمعنی ایجاب (واجب کرنا) آتا ہے مگر واجب کے معنی کسی چیز کے بلحاظ وقوع اور ثبات کے قطعی ہونے کے ہیں اور فرض کے معنی بلحاظ حکم

---

[1] وتمام الحدیث ((وللعاهر الحجر)) انظر للحدیث النهایة (۱/۳۳۵) والفائق (۲/۲۰۱) واللسان (حجر' عهد) والجملة الثانیه فقط فی اضداد ابی الطیب (۱۱۷) واصل الحدیث متفق علیه ورواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة عن عائشة انظر للتفصیل کنز العمال (٦ ج رقم ۷۲۰) و زوائد ابن حبان رقم (۱۳۳٦) عن ابن مسعود والفتح الکبیر للنبهانی (۳۔۳۰۸)

کے قطعی ہونے کے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنَاهَا﴾ (۲۴۔۱) (یہ ایک) سورۃ ہے جس کو ہم نے نازل کیا اور اس (کے احکام) کو فرض کردیا ہے۔

یعنی اس پر عمل کرنا فرض کردیا ❶۔ نیز فرمایا:۔

﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ﴾ (۲۸۔۸۵) (اے پیغمبر) جس نے تم پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا ہے......۔

یعنی اس پر عمل کرنا تجھ پر واجب کیا ہے اور اسی سے جو نفقہ وغیرہ، حاکم کسی کے لیے مقرر کردیتا ہے اسے بھی فرض کہا جاتا ہے اور ہر وہ مقام جہاں قرآن پاک میں فَرَضَ عَلٰی (علی) کے ساتھ آیا ہے۔اس کے معنی کسی چیز کے واجب اور ضروری قرار دینے کے ہیں اور جہاں۔فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ (لام کے ساتھ) آیا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بندش کو دور کرنے اور اسے مباح کردینے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿مَا كَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ﴾ (۳۳۔۳۸) پیغمبر پر اس کام میں کچھ تنگی نہیں جو خدا نے ان کے لیے مقرر کردیا۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ﴾ (۶۶۔۲) خدا نے تم لوگوں کے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کردیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً﴾ (۲۔۲۳۷) لیکن مہر مقرر کرچکے ہو۔

کے معنی یہ ہیں چونکہ تم ان کے لیے مہر مقرر اور اپنے اوپر لازم کرچکے ہو اور یہی معنی فَرَضَ لَهٗ فِی الْعَطَاءِ کے ہیں (یعنی کسی کے لیے عطا سے حصہ مقرر کردینا) اسی بنا پر عطیہ اور قرض کو بھی فرض کہا جاتا ہے اور فَرَائِضُ اللّٰهِ سے مراد وہ احکام ہیں جن کے متعلق قطعی حکم دیا گیا ہے اور جو شخص علم فرائض کا ماہر ہو اسے فَارِضٌ وَفَرَضِیٌّ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ (۲۔۱۹۷) تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط رکھے نہ کوئی برا کام کرے اور کسی سے جھگڑے۔یعنی جس نے فریضہ حج کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہو اور اس کی پختہ نیت کرلی ہو۔یہاں پر فرض کی نسبت انسان کی طرف کرنے میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس وقت مقرر کرنا انسان کا کام ہے (کہ میں امسال حج کروں گا یا آئندہ سال) اور زکوۃ میں جو چیز وصول کی جاتی ہے اس پر بھی فریضہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اِلٰی قَوْلِهٖ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۹۔۶۰) صدقات (یعنی زکوۃ و خیرات) تو مفلسوں ...... کا حق ہے (یہ) خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں۔

اسی بنا پر مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل کی طرف خط لکھا اور اس میں ارقام فرمایا ❷ (۶۷)

---

❶ وعن عکرمة قدرنا فیها الحدود وفی قراءة بالتشدید عن ابن کثیر وابی عمرو (مجمع البیان للطبرسی (۶/۵)

❷ وکتاب ابی بکر الصدیق فی الصدقات مروی عن انسؓ (حم، واموال ابی عبید) خ، و، ن وابن جریر وابن الجار ود وابن خزیمة والطحاوی راجع کنز العمال (۶ ج رقم ۲۲۶۱)۔

((هٰذِهِ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ)) کہ یہ یعنی جو مقادیر لکھی جا رہی ہیں فریضہ زکوۃ ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔

اَلْفَارِضُ: عمر رسیدہ گائے یا بیل۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ﴾ (۲۔۶۸) نہ بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔

بعض نے کہا ہے کہ بیل کو فارض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو پھاڑتا یعنی جوتتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر سخت کاموں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور یا اس لیے کہ گائے کی زکوۃ میں تبیع اور مُسِنَّة لیا جاتا ہے اور تبیع کا لینا تو بعض حالتوں میں جائز ہوتا ہے اور بعض احوال میں ناجائز لیکن مُسِنَّة کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے اس لیے مُسِنَّة کو فَارِضَةٌ کہا گیا ہے اس توجیہ کی بنا پر فَارِضٌ کا لفظ مصطلحات اسلامیہ سے ہوگا۔

(ف ر ط)

فَرَطَ يَفْرُطُ (ن) کے معنی قَصْدًا آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اسی سے فَارِطٌ ہے جس کے معنی ڈول وغیرہ درست کرنے کے لیے قافلہ سے پہلے پانی پر جانے والا کے ہیں اور اسے فَرَطٌ بھی کہا جاتا ہے اسی سے آنحضرت نے فرمایا:❶ (۶۸) ((اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ)) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔

اور چھوٹے بچے پر جنازہ کی دعا میں کہا جاتا ہے۔ ❷ (۶۹) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا اے اللہ! اسے ہمارے لیے میر سامان بنا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا﴾ (۲۰۔۴۵) کہ وہ کہیں ہم سے زیادتی نہ کرے۔

فَرَسٌ فَرَطٌ: تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے۔

اَلْاِفْرَاطُ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں❸ اور تَفْرِيْطٌ کے معنی فرط یعنی تقدم میں کوتاہی کرنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: مَا فَرَّطْتُ فِيْ كَذَا: میں نے فلاں معاملہ میں کوتاہی نہیں کی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ﴾ (۶۔۳۸) ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ میں) کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی۔

﴿مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۵۶) اس تقصیر پر (افسوس ہے) جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ﴾ (۱۲۔۸۰) تم یوسفؑ کے بارے میں قصور کر چکے ہو۔

اَفْرَطْتُ الْقِرْبَةَ: مشکیزہ کو پانی سے خوب بھر دیا۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ (۱۸۔۲۸) اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا۔

---

❶ الحديث في الفائق (۱/۲۵۶) والنهاية (۳/۲۱۱) وغريب ابی عبید (۱ : ۴۴) وابن حبان فی زوائده رقم (۱۸۵۸) من حديث قيس بن ابی حازم مرسلا والحديث فی البخاری (فتن' رقاق' طهارة' فضائل راجع الفتح الكبير (۱ : ۳۷۵)

❷ ای فی الصلوة علی المولود درواه البيهقی من حديث ابی هريرة انظر النيل (۴/۶۹) و غريب ابی عبيد واللسان والتاج (فرط)

❸ وفی القرآن وانهم مفرطون (۶۲-۶)

یعنی افراط وتفریط میں حد سے بڑھا ہوا ہے۔

(ف ر ع)

فَرْعُ الشَّجْرِ: کے معنی درخت کی شاخ کے ہیں اس کی جمع فُرُوْعٌ آتی ہے۔اور آیت کریمہ ﴿وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ (۱۴۔۲۴) اور شاخیں آسمان میں۔ میں فَرْعُهَا کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بلحاظ طول کے اسے فِي السَّمَآءِ کہا ہو، جیسے محاورہ ہے: فَرَعَ كَذَا (یعنی لمبا ہو جانا) اور سر کے بالوں کو بلندی اور طول کی وجہ سے فَرْعٌ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ اَفْرَعُ: گھنے اور لمبے بالوں والا اس کی مونث فَرْعَاءُ اور جمع فُرْعٌ آتی ہے اور کہا جاتا ہے۔

فَرَعْتُ الْجَبَلَ: پہاڑ کی چوٹی پر چلا جانا۔

فَرَّعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّيْفِ: اس کا سر تلوار سے قلم کر دیا۔

تَفَرَّعْتُ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ: میں نے ان کے اونچے خاندان میں شادی کر لی۔ دوم یہ کہ عرض یعنی پھیلاؤ کے لحاظ سے اسے فِي السَّمَآءِ کہا ہو اور یہ تَفَرَّعَ كَذَا سے ہو جس کے معنی پھیل جانے کے ہیں اور مسئلہ کی جزئیات کو فروع کہا جاتا ہے۔اور فُرُوْعُ الرَّجُلِ کے معنی اولاد کے بھی ہیں۔

(ف ر ع ن)

فِرْعَوْنُ: یہ علم عجمی ہے اور اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرْعَنَ فُلَانٌ کہ فلاں فرعون بنا ہو ہے۔جس طرح کہ ابلیس سے اَبْلَسَ وَتَبَلَّسَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اسی سے سرکشوں کو فَرَاعِنَةٌ (جمع فرعون کی) اور اَبَالِسَةٌ (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

(ف ر غ)

اَلْفَرَاغُ: یہ شُغل کی ضد ہے۔اور فَرَغَ (ن) فُرُوْغًا خالی ہونا۔ فَارِغٌ: خالی۔قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ (۲۸۔۱۰) اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا۔

یعنی خوف کی وجہ سے گویا عقل سے خالی ہو چکا تھا...... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۳۳۸) کَاَنَّ.......... جُؤْ جُؤَهٗ هَوَاءُ

گویا......اس کا سینہ ہوا ہو رہا تھا

اور بعض نے فَارِغًا کے معنی موسیٰ علیہ السلام کے خیال سے خالی ہونا کیے ہیں یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا خیال ان کے دل سے بھلا دیا حتیٰ کہ وہ مطمئن ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا انہوں نے گوارا کر لیا بعض نے فارغا کا معنی اس کی یاد کے سوا باقی چیزوں سے خالی ہونا بھی کیے ہیں۔جیسا کہ اس کے بعد کی آیت:

﴿وَاِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْ لَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ (۲۸۔۱۰) اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصے کو ظاہر کر دیں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور اسی سے فرمایا:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (۹۴۔۷) تو جب فارغ ہوا کرو تو عبادت میں محنت کیا کرو۔

﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ﴾ (۵۵۔۳۱) اے دونوں جماعتو! ہم عنقریب تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

---

[1] قطعة من كلمة لزهير والبيت بتمامه: كان الرحل منهافوق صعل من الظلمان جؤ جؤه هواءٌ۔ والبيت فى اللسان (هوا) والكامل (۲۸۷) ومختار الشعر الجاهلى (۱ : ۱۹۳) والبحر (۵ : ۴۳) وغريب القرآن للقبتى و ديوانه ۶۳ والحيوان (۴ : ۳۹۸) والعقد الثمين (۷۶) والعيون (۲ : ۶۹) والمعانى للقبتى (۳۳۵)۔

اور اَفْرَغْتُ الدَّلْوَ کے معنی ڈول سے پانی بہا کر اسے خالی کر دینا کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ (۲۔۲۵۰) ہم پر صبر کے دہانے کھول دے، بھی اسی سے مستعار ہے۔ ذَهَبَ دَمُهٗ فَرْغًا۔ اس کا خون رائیگاں گیا۔ فَرَسٌ فَرِيْغٌ: وسیع قدم اور تیز رفتار گھوڑا گویا وہ دوڑ کر پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔
ضَرْبَةٌ فَرِيْغَةٌ: وسیع زخم جس سے خون زور سے بہہ رہا ہو۔

(ف ر ق)

اَلْفَرْقُ وَالْفَلْقُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی انشقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فَلَقٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفصال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فَرْقٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ (۲۔۵۰) اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔
اور اَلْفِرْقُ (۲۶۔۲۴) کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑہ کے ہیں۔ اسی سے فِرْقَةٌ (۹۔۱۲۲) ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فَرَقٌ اور فلق دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾ (۲۶۔۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا (کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔
اور فریق اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ﴾ (۳۔۷۸) اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب تورات کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں۔ ﴿فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (۵۔۷۰) ایک جماعت کو جھٹلا دیتے اور ایک جماعت کو قتل کر دیتے تھے۔
﴿فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ﴾ (۴۲۔۷) ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔
﴿اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِىْ﴾ (۲۳۔۱۰۹) میرے بندوں میں ایک گروہ تھا...... ﴿اَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ﴾ (۱۹۔۷۳) دونوں فریق میں سے...... کس کے۔
﴿وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ (۲۔۸۵) اور اپنے میں سے بعض لوگوں کو...... وطن سے نکال بھی دیتے ہو۔
﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ (۲۔۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو...... چھپا رہا ہے۔
اور فَرَقْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں خواہ وہ علیحدگی نظر سے محسوس ہو رہی ہو یا اس کا تعلق بصیرت سے ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (۵۔۲۵) تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔
﴿فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا﴾ (۷۷۔۴) پھر وہ (اشیاء کے درمیان) فرق کر دیتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اشیاء کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ (۴۴۔۴) اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے جاتے ہیں، میں بھی يُفْرَقُ اسی معنی پر محمول ہے اور حضرت عمرؓ کو فاروق

اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرنے والے تھے اور آیت کریمہ: ﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے۔ کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن پاک میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور بعض نے فَرَقْنٰهُ کے معنی مفرق طور پر نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔

اَلتَّفْرِيْقُ اصل میں تکثیر کے لیے ہے اور کسی چیز کے شیرازہ اور اتحاد کو زائل کر دینے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾ (۲۔۱۰۲) جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ﴿فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (۲۰۔۹۴) کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (۲۔۲۸۵) اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ نیز آیت: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۳۔۸۴) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ میں احد کا لفظ چونکہ حرف نفی کے تحت واقع ہونے کی وجہ سے جمع کے معنی میں ہے لہٰذا تفریق کی نسبت اس کی طرف جائز ہے اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ﴾ (۶۔۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین میں بہت سے رستے نکالے۔ میں ایک قرأت فَارَقُوْا ہے اور فَرْقٌ وَ مُفَارَقَةٌ کا لفظ عام طور پر اجسام کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ﴾ (۱۸۔۷۸) اب مجھ میں اور تجھ میں علیحدگی۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ (۷۵۔۲۸) اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے، کے معنی یہ ہیں کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب دنیا سے مفارقت کا وقت قریب آ پہنچا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ﴾ (۴۔۱۵۰) اور خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۴۔۱۵۲) اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔

اَلْفُرْقَانُ: یہ فَرْقٌ سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رَجُلٌ قُنْعَانٌ (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور فَرْقٌ کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لیے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (۸۔۲۹) مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے امر فارق پیدا کر دے گا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ میں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دے گا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینۃ اور

روح کے الفاظ ہیں اور قرآن پاک نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:۔

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (۸۔۴۱) اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن نازل فرمائی۔ میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔

اور کلام الہٰی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور اچھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لیے قرآن کریم، تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرمایا گیا ہے چنانچہ توراۃ کے متعلق فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۱۔۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی...... عطا کی۔

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ﴾ (۲۵۔۱) وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا: ﴿وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۔۵۳) ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ﴾ (۲۔۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔

اَلْفَرَقُ کے معنی خوف کی وجہ سے دل کے پراگندہ ہو جانے کے ہیں اور دل کے متعلق اس کا استعمال ایسے ہی ہے جس طرح کہ صَدْعٌ و شَقٌّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ یَّفْرَقُوْنَ﴾ (۹۔۵۶) اصل یہ ہے کہ یہ ڈرپوک لوگ ہے۔

اور فَرُوْقٌ وَ فَرُوْقَةٌ کے معنی ڈرپوک مرد یا عورت کے ہیں (وَیَسْتَوِیْ فِیْهِ التَّذْكِیْرُ وَالتَّاْنِیْثُ) اور اسی سے اس اونٹنی کو جو درندہ کی وجہ سے بدک کر دور بھاگ جائے۔ فَارِقٌ یَا فَارِقَةٌ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر اس بدلی کو بھی فَارِقٌ کہا جاتا ہے۔ جو دوسری بدلیوں سے علیحدہ ہو۔

اَلْاَفْرَقُ: (۱) وہ مرغ جس کی کلغی شاخ در شاخ ہو۔ (۲) وہ گھوڑا جس کا ایک سرین دوسرے سے اونچا ہو۔

اَلْفَرِیْقَةُ: دودھ میں پکائی ہوئی کھجور۔

اَلْفَرُوْقَةُ گردوں کی چربی۔

(ف ر ہ)

اَلْفَرِہُ: (صفت مشبہ) اترانے والا۔ اور نَاقَةٌ مُفْرِهَةٌ: اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو چست اور پھرتیلے بچے دے (اس سے اسم فاعل فَارِهٌ ہے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

(1) وفی المطبوع الکتاب مصحف والالتکررت آلایة واللہ اعلم۔ ۱۲

میں فَارِھِیْنَ کے معنی حَاذِقِیْنَ (یعنی ماہر اور ہنر مند) کے ہیں اور فَرِہٌ کی جمع فُرَّہٌ ہے یہ انسان اور دیگر حیوانات کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک قرأت میں فَرِھِیْنَ ہے جو فَارِھِیْنَ کے ہم معنی ہے اور بعض نے (دونوں) کے معنی اَشِرِیْنَ (اترانے والے) بھی کیے ہیں۔

(ف ر ی)

اَلْفَرْیُ (ن) کے معنی چمڑے کو سینے اور درست کرنے کے لیے اسے کاٹنے کے ہیں اور اِفْرَاءٌ (افعال) کے معنی اسے خراب کرنے کے لیے کاٹنے کے۔

اِفْتِرَاءٌ (افتعال) کا لفظ اصلاح اور فساد دونوں کے لیے آتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر استعمال افساد ہی کے معنوں میں ہوتا ہے اسی لیے قرآن پاک میں جھوٹ' شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا﴾ (۴۔۴۸) جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا۔

﴿اُنْظُرْ كَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (۴۔۵۰) دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں۔

اور کذب کے متعلق فرمایا:

﴿افْتِرَآءً عَلَی اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا﴾ (۶۔۱۴۰) اور خدا پر افتراء کرکے...... وہ بے شبہ گمراہ ہیں۔

﴿وَّلٰكِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (۵۔۱۰۳) بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ﴾ (۱۱۔۳۵) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے قرآن پاک اپنے دل سے بنا لیا ہے۔

﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ (۱۰۔۶۰) اور جو لوگ خدا پر افتراء کرتے ہیں وہ...... کیا خیال رکھتے ہیں؟۔

﴿اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۱۰۔۳۷) کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ﴾ (۱۱۔۵۰) تم (شرک کرکے خدا پر) محض بہتان باندھتے ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا﴾ (۹۔۲۷) یہ تم نے برا کام کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ فَرِیًّا کے معنی عظیم بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عجیب بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی من گھڑت اور بنائی ہوئی بات کے ہیں لیکن مآل کے اعتبار سے یہ تمام اقوال ایک ہی ہیں۔

(ف ز ز)

اَلْاِسْتِفْزَازُ۔ ہلکا سمجھنا گھبرا دینا اور جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ﴾ (۱۷۔۶۴) اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکاتا رہ۔

﴿فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۱۷۔۱۰۳) تو اس نے چاہا کہ انہیں گڑ بڑا کر سرزمین (مصر) میں سے نکال دے۔

اور فَزَّنِیْ فُلَانٌ کے معنی ہیں: اس نے مجھے پریشان...... کرکے میری جگہ سے ہٹا دیا اور گائے کے بچہ کو فَزٌّ کہا جاتا

ہے کیونکہ اس میں خفت یعنی ہلکی پائی جاتی ہے جس طرح کہ اس میں عجلت (جلد بازی) کا تصور کر کے اسے عِجلٌ کہا جاتا ہے۔

(ف ز ع)

اَلْفَزَعُ: انقباض اور وحشت کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک امر کی وجہ سے انسان پر طاری ہو جاتی ہے یہ جَزَعٌ کی ایک قسم ہے اور خِفْتُ مِنَ اللّٰہِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن فَزَعْتُ مِنْہُ کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿لا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ﴾ (۲۱۔۱۰۳) ان کو (اس دن کا) بڑا بھاری غم غمگیں نہیں کرے گا۔

میں فَزَعٌ اَکْبَرُ سے دوزخ میں داخل ہونے کا خوف مراد ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۷۔۸۷) اور ایسے لوگ (اس روز) گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے۔

﴿حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِھِمْ﴾ (۳۴۔۲۳) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے گا۔

یعنی ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی فَزِعَ اِلَیْہِ کے معنی گھبراہٹ کے وقت کسی سے فریاد کرنے اور مدد مانگنے کے ہیں اور فَزِعَ لَہٗ کے معنی مدد کرنے کے۔

❶ شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۳۳۹) وَکُنَّا اِذَا مَا اَتَانَا صَارِخٌ فَزِعٌ۔

یعنی جب کوئی فریاد چاہنے والا گھبرا کر ہمارے پاس آتا۔

بعض نے فَزِعٌ کے معنی مستغیث کیے ہیں تو یہ لفظ فزع کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ معنی مقصود کی تشریح ہے۔

(ف س ح)

اَلْفُسْحُ وَالْفَسِیْحُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور تَفَسَّحَ کے معنی وسیع ہونے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فَسَّحْتُ مَجْلِسَہٗ میں نے اس کے لیے محفل میں جگہ کر دی تو وہ اس میں کھل کر بیٹھ گیا۔ قرآن میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ﴾ (۵۸۔۱۱) اے مومنو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھ جایا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

اسی سے فَسَّحْتُ لِفُلَانٍ اَنْ یَفْعَلَ کَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی وَسَّعْتُ لَہٗ کے ہیں ھُوَ فِیْ فُسْحَۃٍ مِنْ ھٰذَا الْاَمْرِ وہ اس معاملہ میں آزاد ہے۔

(ف س د)

اَلْفَسَادُ یہ فَسَدَ (ن) اَلشَّیْئُ فَھُوَ فَاسِدٌ کا

---

❶ ومنه قوله ﷺ للانصار: انکم تقلون عند الطمع وتکثرون عند الفزع انظر للکلمة الکامل للمبرد ٤ واضداد ابی الطیب (٥٤١_٥٤٤) وعده العلماء من الاضداد۔

❷ قاله سلامة بن الجندل وتمامه: ...... کان الصراخ له قرع الظنابیب والبیت من قصیده' مفضلیة (١١٧_١٢٢) والشعراء النصرانیة (٤٨٦_٤٩٠) راجع للبیت اضداد الاصمعی (٥٤) وابن السکیت (٢٠٨) واللسان (طنب) واضداد ابی الطیب (٤٣١، ٥٤٠) والمعانی للقبتی (٩٤٣) و دیوانه ١١ والسمط ٤٧ والمرزوقی (١: ١٣٠) و المیدانی (٢: ٩٣) والبحر (٥: ٤١٤) والکامل ٤: ویشتق من هذا المعنی ان یقع مفزع فی معنی اغاث فاللفظ من الاضداد۔

مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز کر جانا کے ہیں۔عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ یہ اصل میں صلاح کی ضد ہے اور نفس' بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالت استقامت سے نکل چکی ہو اور اَفْسَدَہٗ کے معنی کسی چیز کا توازن بگاڑنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ (۲۳۔۷۱) تو آسمان و زمین......سب درہم برہم ہو جائیں۔﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (۲۱۔۲۲) اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ﴾ (۳۰۔۴۱) خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ (۲۔۱۲) دیکھو! یہ بلاشبہ مفسد ہیں۔

﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔

﴿اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا﴾ (۲۷۔۳۴) کہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۱۰۔۸۱) بے شک خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔

﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ (۲۔۲۲۰) اور خدا خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔

(ف س ر)

اَلْفَسْرُ (ض ن) کے معنی کسی چیز کی معنوی صفت کو ظاہر کرنے کے ہیں اسی سے "تَفْسِرَةٌ" ہے۔جس کے معنی قارورہ کی تشخیص کے ہیں اور (مجازا) قارورۃ (پیشاب کی بوتل) کو تفسرۃ کہہ دیتے ہیں۔التفسیر بھی الفسر کے ہم معنی ہے۔مگر اس میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں اور (عرف میں) تفسیر کا لفظ کبھی تو مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح اور وضاحت پر بولا جاتا ہے اور کبھی خاص کر تاویل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تَاْوِيْلُ الرؤيا (خواب کی تعبیر) کی بجائے تَفْسِيْرُ الرؤيا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ (۲۵۔۳۳) اور خوب مشرح۔ میں بھی تفسیر بمعنی تاویل استعمال ہوا ہے۔

(ف س ق)

فَسَقَ فُلَانٌ کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت سے نکل جانے کے ہیں یہ فَسَقَ الرُّطَبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی گدری کھجور کے اپنے چھلکے سے باہر نکل آنا کے ہیں (شرعا) فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں

کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فَاسِقٌ کا لفظ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا التزام اور اقرار کرنے کے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف ورزی کرے اور کافر حقیقی پر فاسق کا لفظ اس لیے بولا جاتا ہے کہ وہ حکم، عقل یا فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ﴾ (۱۸۔۵۰) تو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا۔

﴿فَفَسَقُوْا فِیْھَا﴾ (۱۷۔۱۶) تو وہ نافرمانیاں کرتے ہیں۔﴿وَ اَکْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۳۔۱۱۰) اور اکثر نافرمان ہیں۔

﴿اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا﴾ (۳۲۔۱۸) بھلا جو مومن ہے، اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو نافرمان ہے؟

﴿وَّمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۲۴۔۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکار ہیں۔

یعنی جو نعمت الٰہی کی ناشکری کرے گا وہ دائرہ طاعت سے خارج سمجھا جائے گا۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰھُمُ النَّارُ﴾ (۳۲۔۲۰) اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لیے دوزخ ہے۔

﴿وَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّھُمُ الْعَذَابُ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ﴾ (۶۔۴۹) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھلایا ان کی نافرمانیوں کے سبب انہیں عذاب ہوگا۔

﴿وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (۹۔۲۴) اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۹۔۶۷) بے شک منافق نافرمان ہیں۔

﴿کَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ فَسَقُوْٓا﴾ (۱۰۔۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد نافرمانوں کے حق میں ثابت ہوکر رہا۔

﴿اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا﴾ (۳۲۔۱۸) بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح وہ سکتا ہے۔جو نافرمان ہو۔

یہاں فسق کا لفظ ایمان کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے فاسق کافر سے اعم ہے مگر ظالم فاسق سے بھی عام ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ اِلٰی قَوْلہ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۲۴۔۴) اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں...... اور یہی بدکار ہیں۔

اور چوہیا کو اس کی خباثت اور شرارت کی بنا پر فویسقہ کہا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس کے بار بار اپنے بل سے باہر نکلنے کی وجہ سے اسے فُوَیْسِقَہ کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ❶ (۷۰) ((اُقْتُلُوا الْفُوَیْسِقَۃَ۔ فَاِنَّھَا تُوْھِی السِّقَاءَ وَتُضْرِمُ الْبَیْتَ عَلٰی اَھْلِہٖ)) کہ چوہیا کو مار ڈالو کیونکہ وہ پانی کی مشک میں سوراخ کرڈالتی ہے اور گھروں میں آگ لگادیتی ہے۔

ابن العربی کا قول ہے کہ فساق کا لفظ صرف قرآن کریم نے انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ جاہلیت میں یہ لفظ انسانوں کے لیے اس معنی میں نہیں بولا جاتا تھا بلکہ

گدڑی کھجور کے متعلق فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کا محاورہ استعمال ہوتا تھا۔

(ف ش ل)

اَلْفَشَلُ: (س) کے معنی کمزوری کے ساتھ بزدلی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (۳۔۱۵۲) یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔
﴿فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ (۸۔۴۶) تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔ ﴿لَفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ﴾ (۸۔۴۳) تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور (جو) معاملہ (درپیش تھا اس) میں جھگڑنے لگتے۔
تَفَشَّلَ الْمَآءُ: پانی بہہ پڑا۔

(ف ص ح)

اَلْفُصْحُ کے معنی کسی چیز کے ہر قسم کی امیزش سے پاک ہونے کے ہیں اصل میں اس کا استعمال دودھ کے خالص ہونے پر ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔
فَصَحَ اللَّبَنُ وَاَفْصَحَ کے معنی دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لینے کے ہیں اور جس دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لیا جائے اسے مُفْصِحٌ یا فَصِیْحٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مروی [1] ہے۔ (الوافر)
(۳۴۰) وَتَحْتَ الرَّغْوَةِ اللَّبَنُ الْفَصِیْحُ
جھاگ کے نیچے خالص دودھ ہوتا ہے۔
اور اسی سے فَصُحَ الرَّجُلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کسی شخص کے خوش گفتار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ کے معنی خالص عربی زبان میں گفتگو کرنے کے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے بعض نے کہا ہے کہ فَصِیْحٌ نَاطِقٌ (یعنی انسان فرشتے وغیرہ) کو کہتے ہیں اور اَعْجَمِیٌّ کے معنی غیر ناطق (یعنی چوپایہ وغیرہ) کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاَخِیْ هٰرُوْنَ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا﴾ (۲۸۔۳۴) اور ہارون جو میرا بھائی ہے اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔
اسی سے اَفْصَحَ الصُّبْحُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی صبح کے روشن اور نمودار ہونے کے ہیں اور اَفْصَحَ النَّصَارٰی معنی عیسائیوں کے ایسٹر کی عید (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کا تہوار) منانے کے ہیں۔

(ف ص ل)

اَلْفَصْلُ کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اسی طرح علیحدہ کر دینے کے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اسی سے مَفَاصِلُ (جمع مَفْصِلٌ) ہے جس کے معنی جسم کے جوڑ کے ہیں اور فَصَلَتِ الشَّاةَ کے معنی بکری کے جوڑ کاٹ کر الگ الگ کر دینے کے ہیں۔
فَصَلَ الْقَوْمُ عَنْ مَكَانِ كَذَا: قوم کا کسی جگہ سے روانہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ﴾ (۱۲۔۹۴) اور جب قافلہ

---

[1] قاله النضلة السلمي في يوم غول واوله: ولم يخيشوا مصالته عليهم وفي رواية الصريح بدل الفصيح والبيت في الكامل ۸۱ في خمسة واللسان (فصح) وفي مجالس ثعلب ۸ لرجل من بني سليم وفي البيان للجاحظ (۳: ۳۲۸) لابي محجن السلمي وفي مجموعة المعاني (۱۵۵) الفضله السهمي وفيه بسالة بدل مصالته۔

(مصر سے) روانہ ہوا۔
اور یہ اقوال اور اعمال دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ﴾ (۴۴۔۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن سب کے اٹھنے کا دن ہے۔
﴿هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ﴾ (۷۷۔۳۸) یہی فیصلے کا دن ہے۔ یعنی آج اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے الگ کر دے گا اور لوگوں کے درمیان (انصاف سے) فیصلہ کر دیا جائے گا چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:
یَـفْـصِلُ بَیْنَهُمْ...... (۱۲۔۱۷) ان (سب) میں...... فیصلہ کر دے گا۔
﴿وَ هُـوَ خَیْـرُ الْـفٰصِلِیْنَ﴾ (۶۔۵۷) اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
اور فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۸۔۲۰) کے معنی فیصلہ کن بات کے ہیں اور یہی معنی حُـكْمٌ فَیْصَلٌ وَّ لِسَانٌ مِفْصَلٌ کے ہیں۔
اَلتَّفْصِیْلُ: واضح کر دینا کھول کر بیان کر دینا چنانچہ فرمایا:
﴿وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا﴾ (۱۷۔۱۲) اور ہم نے ہر چیز (بخوبی) تفصیل کر دی ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَـكِیْمٍ خَبِیْرٍ﴾ (۱۱۔۱) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔

میں آیت کریمہ:
﴿تِبْیَـانًـا لِّـكُـلِّ شَـیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً﴾ (۱۶۔۸۹) کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت...... ہے۔
کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔
فَـصِیْلَةُ الرَّجُلِ: آدمی کا خاندان جو اس سے الگ ہوتا ہے جیسے اولاد وغیرہ۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَفَـصِیْـلَتِـهِ الَّتِـیْ تُؤْوِیْـهِ﴾ (۷۰۔۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔
اَلْـفِـصَـالُ کے معنی بچے کا دودھ چھڑانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿فَـاِنْ اَرَادَا فِـصَـالًا عَـنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا﴾ (۲۔۲۳۳) اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضا مندی...... سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہئیں۔
﴿وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ﴾ (اور (آخر کار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔
اسی سے اَلْفَصِیْلُ (یعنی دودھ چھڑایا ہوا بچہ) ہے لیکن یہ خاص کر اونٹ کے بچہ پر بولا جاتا ہے۔ اَلْـفَـصَّلِ قرآن پاک کی آخری منزل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتوں میں تمام قصے الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ اَلْفَوَاصِلُ: اواخر آیات۔
اور فَـوَاصِلُ الْقِلَادَةِ: ان بڑے موتیوں کو کہا جاتا ہے جو ہار کے اندر چھوٹے موتیوں کے درمیان فاصلہ کے لیے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ [1] (۷۱)

[1] انظر للحدیث الصحاح للجوهری (فصل) وفی (حم' ع والشاشی) من عبیدة بن الجراح رضی اللہ عنه فاضلة بالضا و المعجمة انظر کنز العمال (٦: رقم ٢٣٩٨)۔

((مَنْ اَنْفَقَ نَفْقَةً فَاصِلَةً فَلَهٗ مِنَ الْاَجْرِ کَذَا)) یعنی جس نے اتنا زیادہ خرچ کیا جس سے حق و باطل کے درمیان فاصلہ ہوجائے تو اس کے لیے اتنا اور اتنا اجر ہے۔

(ف ض ض)

اَلْفَضُّ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں جیسے، فَضَّ خَتْمَ الْکِتَابِ: خط کی مہر کو توڑنا۔ اسی سے اَنْفَضَ الْقَوْمُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی متفق اور منتشر ہوجانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَنِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا﴾ (۶۲۔۱۱) اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۳۔۱۵۹) تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

﴿اَلْفِضَّةُ﴾ (۳۔۱۴) چاندی یعنی وہ ادنی جوہر جس کے ذریعہ لین دین کیا جاتا ہے۔

دِرْعٌ فَضْفَاضَةٌ وَفَضْفَاضٌ: فراخ زرہ۔

(ف ض ل)

اَلْفَضْلُ کے معنی کسی چیز کے اقتصاد (متوسط درجہ) سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے (۱) محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی (۲) مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا۔ لیکن عام طور اَلْفَضْلُ اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اَلْفُضُوْلُ بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) برتری بلحاظ جنس کے، جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(۲) برتری بلحاظ نوع کے، جیسے نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ .... وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (۱۷۔۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ...... اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(۳) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کرسکتا۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کرسکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لیے اس کا اکتساب عین ممکن ہے چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ (۱۶۔۷۱) اور خدا نے رزق (و دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

﴿لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۱۷۔۱۲) تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔ میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ﴾ (۴۔۳۴) اس لیے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے، میں انسان کے ان ذاتی امتیازات کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اسے خاص طور پر نوازا جاتا ہے مثلاً مال و جاہ عزت اور قوت وغیرہ نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ﴾ (۱۷۔۵۵) اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت

بخشی ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ﴾ (۴۔۹۴) خدا نے...... جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔

اور ہر اس عطیہ کو جو دینے والے پر لازم نہیں ہوتا وہ فضل کہلاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴۔۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ﴾ (۵۔۵۴) یہ خدا کا فضل ہے۔

﴿ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (۳۔۷۴) بڑے فضل کا مالک ہے۔اور اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۱۰۔۵۸) کہدو کہ (یہ کتاب) خدا کے فضل سے ہے۔

﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ﴾ (۴۔۸۳) اور اگر...... خدا کا فضل نہ ہوتا۔

(ف ض ی)

اَلْفَضَاءُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور اسی سے اَفْضٰی بِيَدِهٖ اِلٰى كَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر ہاتھ پہنچ جانے کے ہیں اور اَفْضٰی اِلَى امْرَءَتِهٖ: عورت سے جماع کرنے سے کنایہ ہوتا ہے اور یہ خَلَا بِهَا کے محاورہ سے زیادہ صریح ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ (۴۔۲۱) تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو۔

شاعر نے کہا ہے: [1] (الطّویل)

(۳۴۱) طَعَامُهُمْ فَوْضٰى فَضًا فِىْ رِحَالِهِمْ

ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔

(ف ط ر)

اَلْفَطْرُ: (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو (پہلی مرتبہ) طول میں پھاڑنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فَطَرَ فُلَانٌ كَذَا فَطْرًا کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا۔اَفْطَرَ هُوَ فُطُوْرًا: روزہ افطار کرنا: اِنْفَطَرَ اِنْفِطَارًا: پھٹ جانا اور آیت کریمہ۔

﴿هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ (۶۷۔۳) بھلا تجھ کو کوئی شگاف نظر آتا ہے۔

میں فُطُوْرٌ کے معنی خلل اور شگاف کے ہیں اور یہ پھاڑنا کبھی کسی چیز کو بگاڑنے اور کبھی مبنی بر مصلحت ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا﴾ (۷۳۔۱۸) اور جس سے آسمان پھٹ جائے گا، یہ اس کا وعدہ (پورا) ہو کر رہے گا۔

فَطَرْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو دو انگلیوں سے دوہا۔

فَطَرْتُ الْعَجِيْنَ: آٹا گوندھ کر فوراً روٹی پکانا۔اسی سے فطرة ہے جس کے معنی تخلیق کے ہیں اور فَطَرَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے پس آیت کریمہ:

---

[1] قاله المعذل بن عبدالله البكرى احد بنى قيس بن ثعلبة (المعجم للمرزبانی (۳۸۸) والشعراء (۲۹، ۸۳) یمدح العتیك رهط نهس بن ربیعة العتكى فى خمسة ابيات وعجزه اولا يحسنون السرّالاتنا ديا وفى اللسان (فضاء فوض) ولا يحسبون السوء...... والبيت فى الحماسة بشرح المرزوقى رقم ۷۹۱ فى خمسة وابن ولاد ۹۵۔

﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾ (۳۰۔۱۰) اور خدا کی فطرت کو، جس پر لوگوں کو پیدا کیا (اختیار کیے رہو۔

میں اس مغفرت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے لہٰذا فطرۃ اللہ سے معرفت الٰہی کی استعداد مراد ہے۔ جو انسان کی جبلت میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (۴۳۔۸۷) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔

میں اسی قوت معرفت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۳۵۔۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

﴿اَلَّذِیْ فَطَرَهُنَّ﴾ (۲۱۔۵۶) جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ﴾ (۷۳۔۱۸) اور جس سے آسمان پھٹ جائے۔

میں ہو سکتا ہے کہ انفطار سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ہوگا۔ وہ اسے قبول کر لے گا۔

الفطر: روزہ افطار کرنا۔ کہا جاتا ہے۔

فَطَرْتُهٗ وَاَفْطَرْتُهٗ وَاَفْطَرَ هُوَ: یعنی لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور کَمْاَۃٌ (کھمبی) کو فُطْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔

(ف ظ ظ)

اَلْفَظُّ کے معنی بدمزاج کے ہیں اور یہ اس فظ سے مستعار ہے جس کے معنی اونٹ کے اوجھر میں جمع رہنے والا پانی کے ہیں جو سخت ضرورت کے وقت بادل نخواستہ پیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ﴾ (۳۔۱۵۸) اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے۔

(ف ع ل)

اَلْفِعْلُ کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عمدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عمدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسرے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو۔ یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔ مگر لفظ صُنْع ان دونوں سے اخص ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے [1]۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۹۷) اور جو نیک کام تم کرو گے خدا کو معلوم ہو جائے گا۔ ﴿وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا﴾ (۴۔۳۰) اور جو تعدی و ظلم سے ایسا کرے گا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (۵۔۶۷) اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔

یعنی اگر تم نے یہ حکم نہ پہنچایا تو گویا تم نے تبلیغ کی ہی نہیں۔

[1] راجع (ص ن ع م) (ع م ل)۔

اور جس پر فاعل اپنا فعل کرتا ہے اسے منفعل اور مفعول کہا جاتا ہے۔
بعض نے مفعول اور منفعل میں یہ فرق کیا ہے کہ فاعل کے فعل کے اعتبار سے اسے مفعول کہا جاتا ہے اور فعل کا اثر......قبول کر لینے کے لحاظ سے اسے منفعل کہا جاتا ہے پس مفعول منفعل سے اعم ہے کیونکہ منفعل تو اس اثر کو بھی کہا جاتا ہے جو فاعل سے صادر تو ہو مگر اس نے اس کے ایجاد کا ارادہ نہ کیا ہو جیسے خجالت کی سرخی جو کسی انسان کو دیکھ کر عارض ہو جاتی ہے اور طرب جو رقص وسرود کے سننے سے حاصل ہوتا ہے یا عاشق اپنے معشوق کو دیکھ کر بلا اختیار وجد میں آ جاتا ہے۔اس اعتبار سے ہر فعل کو انفعال کہہ سکتے ہیں۔بجز ابداع کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہوتا ہے کیونکہ ابداع کے معنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں اور یہ کسی جوہر یا عرض پر عمل کا نام نہیں ہے بلکہ جوہر کو وجود میں لانے کا نام ہے۔

(ف ق د)

اَلْفَقْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا......اور یہ عَـدَمٌ سے اخص ہے کیونکہ عَـدَمٌ فَقَدٌ کو بھی کہتے ہیں۔اور کسی چیز کے سرے سے موجود نہ ہونے کو بھی۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿مَّـاذَا تَـفْقِدُوْنَ ـ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ (۱۲۔۷۱۔۷۲) تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہیں؟ وہ بولے کہ بادشاہ کے پانی پینے کا گلاس کھویا گیا۔اور تَـفَقُّدٌ کے معنی تعہد یعنی کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے ہیں لیکن اصل میں تَـفَـقُّدٌ کے معنی کسی چیز کے گم ہونے کو معلوم کر لینے کے ہیں اور تَـعَـهُّدٌ کے معنی عہد متقدم (پرانی ملاقات) کو پہچان لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَتَـفَـقَّدَ الطَّيْرَ﴾ (۲۷۔۲۰) انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔
اور فَـاقِدٌ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا لڑکا یا خاوند فوت ہو گیا ہو۔

(ف ق ر)

اَلْفَقْرُ: کا لفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
(۱) زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا۔اس اعتبار سے انسان کیا کائنات کی ہر شئے فقیر (محتاج) ہے۔چنانچہ اس معنی میں فرمایا:
﴿يٰـاَيُّهَـا الـنَّـاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰـهِ﴾ (۳۵۔۱۵) لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو۔
اور الانسان میں اسی قسم کے احتیاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:
﴿وَمَـا جَـعَـلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ﴾ (۲۱۔۸) اور ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھائیں۔
(۲) ضروریات زندگی کا کما حقہ پورا نہ ہونا۔چنانچہ اس معنی میں فرمایا:
﴿لِـلْـفُـقَـرَآءِ الَّـذِيْـنَ اُحْـصِـرُوْا .... مِنَ التَّـعَـفُّفِ﴾ (۲۔۲۷۳) تو ان حاجت مندوں کے لیے جو خدا کے راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔
﴿اِنْ يَّـكُـوْنُـوْا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۲۴۔۳۲) اگر وہ مفلس ہونگے تو خدا ان کو اپنے فضل سے خوشحال کر دے گا۔
﴿اِنَّـمَـا الـصَّـدَقٰـتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ﴾

(۹۔۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں...... کا حق ہے۔

(۳) فَقْرُ النَّفْسِ: یعنی مال کی ہوس۔ چنانچہ فقر کے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا❶ (۷۲)

کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا: کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر کی حد تک پہنچا دے اس کے بالمقابل غنی کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ کہ غنا تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ اور اسی معنی میں حکماء نے کہا ہے۔

مَنْ عَدِمَ الْقَنَاعَةَ لَمْ یُفِدْهُ الْمَالُ: غنًی جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہوا اسے مالداری کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج جس کی طرف آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا❷ (۷۳)

((اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْكَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ)) (اے اللہ۔ مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا) اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ (۲۸۔۲۴) کہ پروردگار میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

اس معنی میں شاعر نے کہا ہے❸ ( )

(۳۴۲) وَیُعْجِبُنِیْ فَقْرِیْ اِلَیْكَ وَلَمْ یَكُنْ
لَیُعْجِبَنِیْ لَوْلَا مُحَبَّتُكَ الْفَقْرُ

(مجھے تمہارا محتاج رہنا اچھا لگتا ہے اگر تمہاری محبت نہ ہوتی تو یہ بھلا معلوم نہ ہوتا)

اور اس معنی میں اِفْتَقَرَ فَهُوَ مُفْتَقِرٌ وَفَقِیْرٌ استعمال ہوتا ہے اور فَقَرَ کا لفظ اگرچہ قیاس کے مطابق ہے۔ لیکن لغت میں مستعمل نہیں ہوتا۔ اَلْفَقِیْرُ دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے: فَقَرَتْهُ فَاقِرَةٌ: یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی اَفْقَرَكَ الصَّیْدُ فَارْمِهٖ: یعنی شکار نے تجھے اپنی کمر پر قدرت دی ہے لہٰذا تیر ماریئے بعض نے کہا ہے کہ یہ افقر سے ہے جس کے معنی حُفْرَةٌ یعنی گڑھے کے ہیں اور اسی سے فقیر ہر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔

فَقَرْتُ لِلْفَسِیْلَ: میں نے پودا لگانے کے لیے گڑھا کھودا شاعر نے کہا ہے❹ (الرجز)

---

❶ اخرجه ابو مسلم الكشي في سننه والبيهقي في الشعب من رواية يزيد الرقاشي عن انسؓ مرفوعًا ويزيد ضعيف و تمام الحديث وكا د الحسد يغلب القدر رواه ابن عدى في الكامل ورواه والطبراني في الاوسط بلفظ وكادت الحاجة ان يكون كفرا وفيه ايضا ضعف نعم ورد في النسائي عن ابي سعيد الخدري انه صلى الله عليه وسلم كان يقول ((اللهم انى اعوذبك من الكفر والفقر)) الحديث راجع تخريج العراقي على الاحياء (۱/ ۲۳٤) و (۷۸/۳) والمقاصد للسخاوى رقم (۷۸۹)۔

❷ متفق عليه من حديث ابي هريرة والديلمي بلا سند رفعه عن انس ((الغنى غنى النفس والفقر فقر النفس)) ورواه العسكرى من حديث ابي ذر ولكن فيه القلب بدل النفس وفي معناه اشعار ليعقوب الكندى نقل السخاوى في المقاصد رقم (۷۳۲)۔

❸ لم اجده المراجع ۱۲۔

❹ قاله الراجز وابعده: مجنونة تودى بروح الانسان وفي الفائق (۲ : ۱٤۳) يعقل الانسان والرجز في اللسان والصحاح

(۳۴۳) مَا لَيْلَةُ الْفَقِيْرِ اِلَّا شَيْطَانٌ

کہ فقیر میں رات بھی شیطان کی مثل ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں الفقیر ایک کنویں کا نام ہے۔

فَقَرْتُ الْخَرَزَ: میں نے منکوں میں سوراخ کیا اَفْقَرْتُ الْبَعِيْرَ: اونٹ کی ناک چھید کر اس میں مہار ڈالنا۔

(ف ق ع)

اَصْفَرُ فَاقِعٌ کے معنی گہرے زرد رنگ کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح اَسْوَدُ حَالِكٌ میں حَالِكٌ کا لفظ اَسْوَدُ کی تاکید بن کر استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفْرَاءُ فَاقِعٌ﴾ (۲۔۶۹) گہرا زرد رنگ۔

فَقْعٌ: ایک قسم کی کھمبی ہے جس کے ساتھ ذلیل آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ هُوَ اَذَلُّ مِنْ فَقَعٍ بِقَاعٍ: وہ جنگل کی کھمبی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ خلیلؒ نے کہا ہے کہ شراب کو فُقَّاع اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبلے کو بھی فَقَاقِيْعُ الْمَاءِ بولتے ہیں۔

(ف ق ہ)

اَلْفِقْهُ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنے کے ہیں اور یہ علم سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ﴾ (۱۷۔۴۴) لیکن تم...... نہیں سمجھتے۔

عِلْمُ الْفِقْهِ: احکام شریعت جاننے کا نام ہے۔ فَقِهَ الرَّجُلُ فَقَاهَةً: فقیہ بن جانا۔ فَقِهَ فَقْهًا وَفِقْهًا: کسی چیز کو سمجھ لینا۔

تَفَقَّهَ: علم فقہ حاصل کر کے اس میں تخصیص حاصل کر لینا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ﴾ (۹۔۱۲۲) تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے۔

(ف ک ک)

اَلْفَكُّ: اس کے اصل معنی جدا کر دینے کے ہیں جیسے۔ فَكُّ الرِّهْنِ گروی چیز کو چھڑانا ﴿فَكُّ الرَّقَبَةِ﴾ گردن کا آزاد کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۳) کسی کی گردن کا چھڑانا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ غلام کو آزاد کرانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات طیبہ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسان کا آپنے آپ اور دوسروں کو عذاب الٰہی سے آزاد کرانا مراد ہے۔ لیکن دوسروں کو جبھی آزاد کرا سکتا ہے جب پہلے اپنے آپ کو رہا کروا لے ورنہ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہیں ہے وہ دوسروں کو کب ہدایت کر سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "مکارم الشریعہ" میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اَلْفَلَكُ کے معنی کمزوری کی وجہ سے شانہ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور دونوں جبڑوں کے ملنے کی جگہ کو فَكَّان کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ﴾ (۹۸۔۱) جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے۔

میں مُنْفَكِّيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ اَلْبَيِّنَه کے آنے تک ان میں اختلاف نہیں تھا بلکہ سب گمراہی پر متفق تھے۔ جیسے

(فقرا و الظمآن ۲۴۸ وفی البلدان (فقر) وعجزہ : توذی قریح الاسنان۔

دوسرے مقام پر فرمایا:﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (۲۔۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا۔ مَا انْفَكَّ يَفْعَلُ كَذَا: وہ برابر ایسے کرتا رہا۔

(ف ک ر)

اَلْفِكْرَةُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور تَفَكُّرٌ کے معنی نظر عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے ہیں۔ اور غور وفکر کی استعداد صرف انسان کو دی گئی ہے دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں اور تَفَكَّرَ فِيْهِ کا لفظ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کا تصور دل (ذہن) میں حاصل ہوسکتا ہو اسی لیے مروی❶ ہے (۴۷) ((تَفَكَّرُوْا فِیْ آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِی اللّٰهِ)) کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں پر تو غور کیا کرو لیکن خدا کی ذات میں کبھی غور نہ کرو (کہ وہ کیسی ہے) کیونکہ اس کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا اور وہ صورت کے ساتھ متصف ہونے سے منزہ ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ﴾ (۳۰۔۸) کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو...... پیدا کیا ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا سکتہ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ ط﴾ (۷۔۱۸۴) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو کسی طرح کا بھی جنون نہیں ہے۔ ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (۳۰۔۲۱) جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ فِی الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ (۲۔۲۱۹،۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں۔

رَجُلٌ فِكِّيْرٌ: (بہت زیادہ غور وفکر کرنے والا) بعض ادباء کا خیال ہے کہ لفظ فِكْرٌ دراصل فَرْكٌ سے مقلوب ہے لیکن فکر کا لفظ معانی کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں۔

(ف ک ہ)

اَلْفَاكِهَةُ: بعض نے کہا ہے کہ فَاكِهَةٌ کا لفظ ہر قسم کے میوہ جات پر بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ انگور اور انار کے علاوہ باقی میوہ جات کو فَاكِهَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ان دونوں کو اس لیے مستثنیٰ کیا ہے کہ (قرآن پاک میں) ان دونوں کو فاکہہ پر عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فاکہہ کے غیر ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ﴾ (۵۶۔۲۰) اور میوے جس طرح کے ان کو پسند ہوں۔

﴿وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ﴾ (۵۶۔۲۰) اور میوہ ہائے کثیرہ (کے

---

❶ الحديث فی اللسان (الا) و (ابو الشيخ طس عدهب عن ابن عمر وفيه الفرازع بن نافع متروك وقد مرفی ال ٥) وفی رواية عن ابن عباس :۔((تفكر وافي خلق الله ولا تفكر وافی الله فانكم لا تقدرون قدرهٗ)) رواه فی الحلية باسناد ضعيف والا صبهانی فی الترغيب والترهيب منه وجه آخر اصح من وفی ابن ابی شيبة فی كل شیء بدل فی آلاء الله قال السخاوی فی المقاصد رقم (٣٤٢) او اسانيد هاضعيفة لكن احتماعهما يكتسب قوة والمعنى صحيح (راجع ايضاً تخريج العراقی

باغوں) میں۔

﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (۸۱۔۳۱) اور میوے اور چارہ۔

﴿فَوَاكِهُ وَهُمْ مُكْرَمُوْنَ﴾ (۳۷۔۴۲) (یعنی) میوے اور ان کا اعزاز کیا جائے گا۔

﴿وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ (۷۷۔۴۲) اور میووں میں جو ان کو مرغوب ہوں۔

اَلْفَكَاهَةُ: خوش طبعی کی باتیں، خوش گپی۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ (۵۶۔۶۵) اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ گے۔

میں بعض نے تَفَكَّهُوْنَ کے معنی خوش طبعی کی باتیں بنانا لکھے ہیں اور بعض نے فروٹ تناول کرنا۔

اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿فَاكِهِيْنَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ﴾ (۵۲۔۱۸) جو کچھ ان کے پروردگار نے ان کو بخشا اس کی وجہ سے خوش حال......۔

میں فَاكِهِيْنَ کی تفسیر میں بھی دونوں قول منقول ہیں۔

(ف ل ح)

اَلْفَلْحُ کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے اَلْحَدِيْدُ بِالْحَدِيْدِ يُفْلَحُ: لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس لیے فَلَّاحٌ کسان کو کہتے ہیں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے) اور فلاح کے معنی کامیابی اور مطلب وری کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے دنیوی اور اخروی' فلاح دنیوی ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن سے دنیوی زندگی خوشگوار بنتی ہو یعنی بقاء مال اور عزت و دولت۔ چنانچہ شاعر نے اسی معنی کے مدنظر کہا ہے ❶ (مخلع البسیط)

(۳۴۴) اَفْلِحْ بِمَا شِئْتَ فَقَدْ يُدْرَكُ بِالضَّعْفِ وَقَدْ يُخَدَّعُ الْاَرِيْبُ

جس طریقہ سے چاہو خوش عیشی کرو کبھی کمزور کامیاب ہو جاتا ہے اور چالاک دھوکا کھا جاتا ہے۔

اور فلاح اخروی چار چیزوں کے حاصل ہو جانے کا نام ہے [۱]بقا بلا فنا، غنا بلا فقر'[۳] عزت بلا ذلت'[۴] علم بلا جہل' اسی لیے کہا گیا ہے ❷ (۷۵) ((لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْاٰخِرَةِ)) کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے اور اسی فلاح کے متعلق فرمایا۔

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۲۹۔۶۴) اور زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے۔

﴿اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۵۸۔۲۲) (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

علی الاحیاء (٤: ٤٣٤)۔

❶ واولہ: حتی تری جماجما تطرح وھو فی الصحاح والتاج (فلح) والقرطبی (١٥٨/١) وقد ذھب مثلاً انظر المیدانی رقم (١٣) والفرائد (١٨/١) وشرح المعلقات لابن الانباری (١٨١) وفیہ اولہ: قد علمت خیلك این الصحیح ولم اراحدٌ انسبہ۔ قالہ عبید بن الابرص فی قصیدۃ من الھجز والبسیط فی ٤٨ بیتا وکثیر منھا جاء علی مخلع وکثیر منھا مختلفۃ الوزن والشاعر لایحسن القریض قال فیہ المعری: وقد یخطیء الرأی امرؤ و ھو حازم۔ کما اختل فی وزن القریض عبید۔ والبیت فی الجمھرۃ ١٧٤ والشعر والشعراء ل (١: ٢٢٦) والغریب للقتبی (٣٩) ومجاز القرآن (١: ٣٠) والقرطبی (١: ١٥٨) والطبری (١: ١٠٨) واللسان والمحکم (فلح) وفیھا بالنوك بدل بالضعف وابن خالویہ فی اعرابہ (١٠٠) والحیوان (٣: ٨٩) فی خمسۃ ابیات وفی روایۃ فقد یبلغ بدل یدرك ١٢۔

❷ رواہ الشیخان عن انسؓ وفی الباب عن سھل وقد مر

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (۸۷۔۱۴) بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (۹۱۔۹) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۲۳۔۱) بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۲۴۔۳۱) تاکہ تم فلاح پاؤ۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۱۷) کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۷۔۸) وہ تو نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾ (۲۰۔۶۴) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔

میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنی (بلحاظ قرائن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔

اور سَحُوْرٌ یعنی طعام سحر کو بھی فَلَاحٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے معنی یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھی ہے اور حدیث [1] (۶۷) حَتّٰی خِفْنَا اَنْ يَفُوْتَنَا الْفَلَاحُ (حتی کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فَلَاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا ادا کرنے کی وجہ سے ہمارے لیے مقدر کی گئی ہے۔

(ف ل ق)

اَلْفَلْقُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔

فَلَقْتُهٗ میں اسے پھاڑ دیا فَانْفَلَقَ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ: (۶۔۹۶) وہی رات کے اندھرے سے) صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾ (۶۔۹۵) بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اگاتا ہے۔

﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾ (۲۶۔۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اور دو ٹیلوں کے درمیان پست جگہ کو بھی فلق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (۱۱۳۔۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

میں فَلَقٌ سے مراد صبح ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے نہریں مراد ہیں جن کا کہ آیت:

﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا﴾ (۲۷۔۶۱) بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں۔

میں تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور بعض نے وہ کلمہ مراد لیا ہے

[1] انظر للحديث الفائق (۲/۱۴۷) واصحاب السنن ۱۲۔

جس کی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دی تھی اور انہوں نے اس کی برکت سے سمندر پھاڑ دیا تھا اور فَلْقٌ بمعنی مَفْلُوْقٌ ہے جس طرح کہ نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور نِكْثٌ بمعنی مَنْكُوْثٌ آتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ فِلْق اور فَيْلَقٌ کے معنی تعجب کے ہیں اور دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو فَلِيْقٌ وَ فَالِقٌ کہا جاتا ہے اور اونٹ کی دو کہان کے درمیانی حصہ کو بھی فَلِيْقٌ وَ فَالِقٌ کہتے ہیں۔

(ف ل ک)

اَلْفُلْكُ کے معنی سفینہ یعنی کشتی کے ہیں۔اور یہ واحد وجمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لیکن دونوں میں اصل کے لحاظ سے اختلاف ہے فُلْكٌ اگر مفرد کے لیے ہو تو یہ بروزن قُفْلٌ ہوگا۔اور اگر بمعنی جمع ہو تو حُمْرٌ کی طرح ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ﴾ (۱۰۔۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو۔

﴿وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ﴾ (۲۔۱۶۴) اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں......رواں ہیں۔

﴿وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ﴾ (۱۶۔۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ﴾ (۴۳۔۱۲) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔اور فلک کے معنی ستاروں کا مدار (مَجْرٰی) کے ہیں اور اسے فلک یعنی کشتی نما ہونے کی وجہ سے فلک کہا جاتا ہے۔قرآن میں ہے:

﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ﴾ (۳۶۔۴۰) سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

اور فَلْكَةُ الْمِغْزَلِ کے معنی چرخے کا دم کڑہ کے ہیں اور اسی سے فَلَكَ ثَدْيُ الْمَرْءَةِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عورت کی چھاتی کے دم کڑہ کی طرح ابھر آنے کے ہیں اور فَلَقْتُ الْجَدْيَ کے معنی بکری کے بچے کی زبان پھاڑ کر اس میں پھرکی سی ڈال دینے کے ہیں۔تاکہ وہ اپنی ماں کے پستانوں سے دودھ نہ چوس سکے۔

(ف ل ن)

فُلَانٌ وَ فُلَانَةٌ انسانوں کے ناموں کے لیے بطور کنایہ بولا جاتا ہے اور اَلْفُلَانُ وَالْفُلَا (یعنی الف لام کے ساتھ) انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۸) ہائے شامت کاش میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص باطل پرستی میں اپنے دوستوں اور آشناؤں کا ساتھ دینے پر اظہار ندامت کرے گا اور کہے گا کاش! میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا لہٰذا یہ اس آیت کے ہم معنی ہے۔

﴿اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۴۳۔۶۷) جو آپس میں دوست ہیں اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔مگر پرہیزگار لوگ باہم دوست ہی رہیں گے۔

---

[1] کذا ذکرہ صاحب التاج والمحیط وانظر ایضاً الکشاف ۱۲۔

(ف ن ن)

اَلْفَنَانُ۔ کے معنی اس شاخ کے ہیں جس پر تروتازہ پتے ہوں اس کی جمع اَفْنَانٌ آتی ہے۔

پس آیت کریمہ:۔

﴿ذَوَاتَـا اَفْنَانٍ﴾ (۵۵۔۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی) قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں۔ کے معنی ہری بھری شاخوں والے درختوں کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے انواع و اقسام کے درخت مراد ہوں۔

(ف ن د)

اَلْـفَنَدُ کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں اس سے اَلتَّـفْنِيْدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی کسی کو کمزور رائے یا فاتر العقل بتانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿لَـوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ (۱۲۔۹۴) اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے۔

بعض نے اس کے معنی تَـلُوْمُوْنِيْ یعنی ملامت لکھے ہیں لیکن اس کا اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں اور اَلْاِفْـنَـادُ (افعال) کے معنی بہکی بہکی باتیں کرنے کے ہیں۔ اور فَـنَدٌ اصل میں پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور اسی سے بوڑھے کھوسٹ کو فَـنَدٌ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ بھی عمر کی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا ہے)۔

(ف ھ م)

اَلْفَهْمُ: انسان کی اس ذہنی قوت کا نام جس سے وہ مطالب کو بہتری اور عمدگی کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے اور فَهِـمْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ﴾ (۲۱۔۷۹) ہم نے فیصلہ کرنے کا طریقہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا۔

میں تفہیم کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت فہم میں اضافہ کر دیا جس کے ذریعہ انہوں نے نزاع کی حقیقت کو پالیا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کی حقیقت ان کے قلب پر القا کر دی۔

اَفْهَمْتُهٗ کے معنی کسی کو کچھ سمجھا دینے کے ہیں اور استفہام کے معنی کسی چیز کے سمجھنے کی طلب کے ہیں۔

(ف و ت)

اَلْـفَـوْتُ: (ن) (ہاتھ سے نکل جانا) کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لیے دشوار ہو۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِنْ فَـاتَـكُـمْ شَـيْءٌ مِّـنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَـى الْكُفَّارِ﴾ (۶۰۔۱۱) اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے۔

﴿لِـكَيْلَا تَـاْسَـوْا عَـلٰى مَا فَاتَكُمْ﴾ (۵۷۔۲۳) تاکہ جو مطلب تم سے فوت ہوگیا ہے۔ اس کا غم نہ کھایا کرو۔

﴿وَلَـوْ تَـرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ﴾ (۳۴۔۵۰) اور کاش تم دیکھو جب یہ گھبرا جائیں گے تو (عذاب سے) بچ نہیں سکیں گے۔

یعنی جس عذاب سے وہ گھبرائیں گے اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ محاورہ ہے۔

هُـوَ مِـنِّيْ فَوْتَ الرُّمْحِ: وہ میرے نیزے کی دسترس

سے باہر ہے۔

جَعَلَ اللّٰہُ رِزْقَهٗ فَوْتَ فَمِهٖ (اللہ اس کا رزق اس کی دسترس سے باہر کر دے) یعنی رزق سامنے نظر آئے لیکن منہ تک نہ پہنچ سکے (بددعا)

اسی سے اِفْتِیَاتٌ (افتعال) ہے اور اس کے معنی کسی ایسے شخص سے مشورہ کے بغیر کوئی کام کرنے کے ہیں جس سے مشورہ ضروری ہو۔

اَلتَّفَاوُتُ: (تفاعل) کے معنی دو چیزوں کے اوصاف مختلف ہونے کے ہیں گویا ایک کا وصف دوسری کو یا ہر ایک کا وصف دوسری کو فوت کر رہا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ﴾ (۶۷۔۳) کیا تو (خدا) رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ یعنی اس میں کوئی بات بھی حکمت کے خلاف نہیں ہے۔

(ف و ج)

اَلْفَوْجُ کے معنی تیزی سے گزرنے والی جماعت کے ہیں اس کی جمع افواج ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ﴾ (۶۷۔۸) جب اس میں ان کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔

﴿فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸۔۵۹) (یہ) ایک فوج (ہے تمہارے ساتھ) داخل ہوگی۔

﴿فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ (۱۱۰۔۲) غول کے غول خدا کے دین میں......۔

(ف و ر)

اَلْفَوْرُ کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں یہ لفظ آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ہنڈیا اور غصہ کے جوش کھانے پر بھی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهِیَ تَفُوْرُ﴾ (۶۷۔۷) اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔

﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ (۱۱۔۴۰) اور تنور جوش مارنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے [1] (المتقارب)

(۳۴۵) وَلَا الْعِرْقُ فَارَا

اور نہ اس کی رگوں میں گرہ یا نفخ ظاہر ہوتا ہے۔

محاورہ ہے:

فَارَ فُلَانٌ مِنَ الْحُمّٰی یَفُوْرُ: فلاں کو زور کا بخار ہے اور ہنڈیا کے ابال کو فَوَّارَة کہا جاتا ہے پھر تشبیہ کے طور پر پانی کے ابلتے ہوئے چشمہ کو بھی فَوَّارَةُ الْمَاءِ کہتے ہیں۔

ایک محاورہ ہے:

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ فَوْرِیْ: میں نے جوش میں ایسا کیا یعنی سکون امر سے قبل یہ کام کیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ (۳۔۱۲۵) اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کر دیں۔

اَلْفَأْرُ: چوہیا اس کی جمع فِیْرَان آتی ہے پھر شکل میں مشابہت کی وجہ سے نافہ مشک کو بھی فَأْرَةُ الْمِسْكِ کہا جاتا ہے۔

مَكَانٌ فَئِرٌ: بہت چوہوں والی زمین۔

---

[1] قطعة من قول العوف بن عطية بن الخرع يصف فرسا والبيت بتمامه' لها رسغ ايد مكرب فلا العظم واه ولا العرق فارا ومعناه اى لا يظهر بعرقه نفخ او عقد يقال: فارت عروقه' تفور فورا وذايكره من الفرس وفى المعانى للقبتى اى لم يكن بها داء فتووج فيفور الدم وقطع الودج كا القصد للانسان والبيت فى اللسان (فور) وكتاب الخيل لابى عبيد (۹۱ و ۱۵۰) والمعانى الكبير للقبتى (۱ : ۱٦۳)۔

(ف و ز)

اَلْفَوْزُ کے معنی سلامتی کے ساتھ خیر حاصل کر لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْكَبِيْرُ﴾ (۸۵۔۱۱) یہی بڑی کامیابی ہے۔

﴿فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (۳۳۔۷۱) تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ﴾ (۴۵۔۳۰) یہی صریح کامیابی ہے۔

دوسری جگہ پر العظیم ہے (۴۴۔۵۷)

﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (۹۔۲۰) اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

اَلْمَفَازَةُ: تفائل کے طور پر ریگستان کو مَفَازَة کہا جاتا ہے۔نیز کامیابی کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے بھی بیابان کا مَفَازَة کہتے ہیں۔ [1] کیونکہ بیابان جس طرح ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح کبھی کامیابی کا بھی سبب بنتا ہے لہٰذا ان دونوں معنی کے لحاظ سے اسے کبھی قَفْرٌ اور کبھی مَفَازَةٌ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ مَفَازَة فَوَزَا الرَّجُلُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہو جانے کے ہیں۔اگر یہ مان لیا جائے کہ لغت میں فَوَزَ بمعنی هَلَكَ آتا ہے تو یہ بھی معنی فَوَزَ کے لحاظ سے ہے کیونکہ مرنے کے بعد انسان دنیا کے پھندے سے نجات پا لیتا ہے لہٰذا موت اگر ایک لحاظ سے ہلاکت ہے تو دوسرے لحاظ سے باعث نجات بھی ہے۔اسی بنا پر مثل مشہور ہے۔مَا اَحَدٌ اِلَّا وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لَّهٗ کہ موت ہر ایک کے لیے بہتر ہے۔یہ دنیا کے اعتبار سے ہے۔لیکن اگر اخروی نعمتوں سے ہم آغوش ہونے کا لحاظ کیا جائے تو موت بہت بڑی کامیابی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (۳۔۱۸۵) تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ﴾ (۳۔۱۸۸) ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے۔

میں مَفَازَةٌ فَازَ کا مصدر ہے اور فَوْزٌ اسم ہے یعنی یہ مت سمجھو کہ یہ عذاب سے رہائی حاصل کر لیں گے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا﴾ (۷۸۔۳۱) بے شک پرہیز گاروں کے لیے کامیابی ہے۔

میں مَفَازًا فَوْزٌ سے اسم ظرف ہے یعنی متقین کے لیے کامیابی کا مقام ہے پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا﴾ الآیۃ (۷۸۔۳۲) (یعنی) باغ اور انگور وغیرہ۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ (۳۳۔۷۱) تو بے شک بڑی مراد

---

[1] وقد عدا العلماء لفظ "المفازة" من الاضداد لکن المؤلف حمله علی المجاز والاستعارة الاضداد لابی الطیب (۵۵۷۔۵۶۰)

پائے گا۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیوی ساز وسامان کی حرص کرتے ہیں اور غنیمت وغیرہ حاصل کر لینے کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

(ف و ض)

فَـوَّضَ: (الی) کے معنی کوئی معاملہ کسی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۴۰۔۴۴) اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں اصل میں یہ مَـالُهُمْ فَوْضٰی بَیْنَهُمْ کے محاورہ سے مشتق ہے (یعنی ان کا مال سب میں مشترکہ ہے) شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)
(۳۴۶) طَعَامُهُمْ فَوْضٰی فَضًا فِیْ رِحَالِهِمْ۔
ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔ اور اسی سے شِـرْكَةُ مُفَاوَضَةٍ ہے یعنی کمپنی جس میں سب کے حصص مساوی ہوں۔

(ف و ق)

فَوْقٌ: یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے اوپر (۱) جیسے فرمایا:
﴿وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (۲۔۶۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔
﴿مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۹۔۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔
﴿وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا﴾ (۴۱۔۱۰) اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔
اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:
﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ (۶۔۶۵) کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔
(۲) صعود: یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۳۳۔۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔
(۳) کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا:
﴿فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ﴾ (۴۔۱۱) اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔
(۴) جسمانیت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔
﴿مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲۔۲۶) مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی، مکڑی) کی مثال بیان فرمائے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ فَـمَـا فَوْقَهَا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر

[1] قد مر تخریجه فی (ف ض ی)

مَـادونهـا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فَــوق بمعنی دون بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے اضداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔

(۵) بلحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ﴾ اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَ الَّـذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۲۔۲۱۲) لیکن جو پرہیز گار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر فائق ہوں گے۔

﴿فَـوْقَ الَّـذِيْـنَ كَـفَـرُوْا﴾ (۳۔۵۵) کافروں پر فائق۔

(۶) فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:

﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (۶۔۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

﴿مِنْ قَـوْمِ فِـرْعَـوْنَ وَ اِنَّــا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۲۷) فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

اور فَوْقٌ کے لفظ سے فَـاقَ فُــلَان غَيْرَهٗ يَفُوْقُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دوسرے پر بازی لے جانے کے ہیں لہٰذا یہ فوق بمعنی فضیلت سے مشتق ہے۔ اور فوق سے فَـوْقُ السَّهْمِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی سوفار تیر کے ہیں اور سَهْـمٌ اَفْوَقُ کے معنی پر شکستہ سوفار کے ہیں۔

اَلْاِفَـاقَةُ: (افعال) کے معنی نشہ یا غش کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد کمزوری سے قوت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں نیز اِفَاقَةٌ کے معنی دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا بھی آتے ہیں اور جو دودھ تھنوں میں لوٹتا ہے اسے فُــوْقَةٌ کہا جاتا ہے اور ایک دفعہ تھنوں سے دودھ دوہنے کے بعد پھر ان میں دودھ لوٹنے تک جو وقفہ ہوتا ہے اسے فواق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿مَّـا لَهَـا مِنْ فَوَاقٍ﴾ (۳۸۔۱۵) جس میں (شروع ہوئے پیچھے) کچھ وقفہ نہیں ہوگا۔

جس کے معنی راحت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے [1] کہ اگر فُـوَاقٍ بضم الفاء پڑھا جائے تو یہ فُوَاقُ النَّاقَةَ کے محاورہ سے مشتق ہوگا اور بعض نے کہا کہ فتحہ اور ضمہ فاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں [2] جیسے جَـمَــامٌ وَ جُـمَـامٌ اور بعض نے کہا ہے کہ اِسْتَـفِقْ نَاقَتَكَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اونٹنی کو چھوڑ دو تاکہ اس کے تھنوں میں دودھ اتر آئے اور فَـوق فَصِيْلَكَ کے معنی ہیں کہ اونٹ کے بچہ کو کچھ وقفہ کے بعد دودھ پلاؤ۔ ظَـلَّ يَتَفَوَّقُ الْمَحْضَ وہ دن بھر وقفوں کے ساتھ دودھ بلوتا رہا۔ شاعر نے کہا [3] (البسیط)

---

[1] انظر مجازہ (۲/۷۹)

[2] کمـا یـفهم من تفسیر الفراء حیث قال: مالها من راحة وافاقة قرء الحسن وعاصم واهل المدینة فواق بالفتح وهی لغة جیدة وبالضمه حمزه والاعمش والکسائی (راجع الطبری)۔

[3] قـالـه الا عشـی بـن میـمـون فی قصیدة یمدح فیها هوذة بن علی الحنفی۔ لم یلبس التاج معدی غیره والبیت ال ۲۳ من قصیدة وتمامه: جاء ت لترضع شق النفس لورضعا والبیت من شواهد الطبری (۲۳/۳۳)

(۳۴۷)حَتّٰی اِذَا فِیْقَةٌ فِیْ ضَرْعِهَا اجْتَمَعَتْ حتیٰ کہ جب اس کے تھنوں میں دودھ دوبارہ جمع ہوگیا۔

(ف و م)

اَلْفُوْمُ: گیہوں۔اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل میں ثوم ہی ہے (یعنی فاء ثاء سے بدل دی گئی ہے) جیسا کہ جدث وجدف میں ہے اور اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا﴾ (۲۔۶۱) اور گیہوں اور مسور۔

(ف و ہ)

اَفْوَاہٌ: فَمٌ کی جمع ہے اور فم اصل میں فَوْہٌ ہے اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قول کی نسبت فم یعنی منہ کی طرف کی گئی ہے۔وہاں دروغ گوئی کی طرف اشارہ ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں ان کے اندرون اس کے خلاف ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ﴾ (۳۳۔۴) یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔

﴿كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۸۔۵) بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۸) یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں۔لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴۔۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیے (کہ خاموش رہو)۔

﴿مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۵۔۴۱) کچھ تو ان میں سے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔لیکن ان کے دل مومن نہیں ہیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳۔۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

اور اسی سے فَمُ النَّهْرِ کی طرح فُوْهَةُ النَّهْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی نہر کے دہانہ کے ہیں اور اَفْوَاهُ الطِّيْبِ۔ ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو خوشبو کے لیے ڈالی جائیں۔اس کا واحد فُوْهٌ ہے۔

(ف ی ء)

اَلْفَيْئُ وَالْفَيْئَةُ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ﴾ (۴۹۔۹) یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔پس جب وہ رجوع لائے۔

﴿فَاِنْ فَآءُوْ﴾ (۲۔۲۲۶) اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کرلیں۔

اور اسی سے فَاءَ الظِّلُّ ہے جس کے معنی سایہ کے (زوال کے بعد) لوٹ کرآتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ﴾ (۱۶۔۴۸) جن کے سائے...... لوٹتے ہیں۔اور جو مال غنیمت بلا مشقت حاصل ہو جائے اسے بھی فیئی کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ﴾ (۵۹۔۷) جو مال خدا نے اپنے پیغمبر کو......دلوایا۔

﴿مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ (۳۳۔۵۰) جو خدا نے تمہیں (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مال غنیمت کو فیئی بمعنی سایہ کے

ساتھ تشبیہ دے کرنے کہنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیا کا بہترین سامان بھی بمنزلہ ظل زائل کے ہے شاعر نے کہا ہے ❶ (الطویل)

(۳۴۸) اَمَادِيَّ الْمَالُ اَفْيَاءُ الظِّلَالِ عَشِيَّةً

اے مادی مال شام کے ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح ہے۔

دوسرے شاعر نے کہا ❷

(۳۴۹) اِنَّمَا الدُّنْيَا كَظِلٍّ زَائِلٍ

کہ دنیا زائل ہونے والے سایہ کی طرح ہے۔

اَلْفِئَةُ: اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد تعاون اور تعاضد کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آئیں ❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ (۸-۴۵) جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً﴾ (۲-۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے...... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ (۳-۱۳) دو گروہوں میں جو (جنگ بدر میں) آپس میں بھڑ گئے۔

﴿فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ﴾ (۴-۸۸) کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ۔

مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوْنَهٗ: کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی۔ (۲۸-۸۱)

﴿فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ﴾ (۸-۴۸) جب یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوئیں۔

(ف ی ض)

فَاضَ الْمَاءُ کے معنی کسی جگہ سے پانی اچھل کر بہ نکلنا ہیں (اور آنسوں کے بہنے کے لیے بھی آتا ہے) چنانچہ فرمایا۔

﴿تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵-۸۳) تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اور اَفَاضَ اَنَاءَهٗ کے معنی برتن کو لبالب بھر دینے کے ہیں حتیٰ کہ پانی اس سے نیچے گرنے لگے اور اَفَضْتُهٗ کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ﴾ (۷-۵۰) کہ کسی قدر ہم پر پانی بہاؤ۔

اسی سے فَاضَ صَدْرُهٗ بِالسِّرِّ، جس کے معنی بھید ظاہر کرنے کے ہیں اور سخی آدمی کو فَيَّاضٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَفَاضُوْا فِي الْحَدِيْثِ کا محاورہ مستعار ہے۔ جس کے معنی باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَفَضْتُمْ فِيْهِ﴾ (۲۴-۱۴) تو جس بات کا تم چرچا کرتے تھے اس کی وجہ سے تم پر............ نازل ہوتا۔

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾ (۴۶-۸) وہ اس گفتگو کو خوب جانتا ہے جو تم اس کے بارے میں کرتے ہو۔

﴿اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ﴾ (۱۰-۶۱) جب اس میں مصروف ہوتے ہو۔

اور حَدِيْثٌ مُسْتَفِيْضٌ کے معنی منتشر یعنی عام پھیلی

❶ قاله حاتم الطائى وقد مرفى (اوى)

❷ لم اجده

❸ ذكر اصحاب المعاجم ايضاً لفظة "الفئة" فى رف ء۔

ہوئی بات کے ہیں اور فَیْض کے معنی کثیر پانی کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ۔

اَعْطَاہُ غَیْضًا مِّنْ فَیْضٍ: یعنی اسے زیادہ مال میں سے تھوڑا سا دیا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ (۲۔۱۹۸) اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (۲۔۱۹۹) پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو۔

میں اِفَاضَۃٌ کے معنی مجمع کثیر کے یکبارگی لوٹنے کے ہیں اور یہ فیضان الماء یعنی (پانی کا زور سے بہہ نکلنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

اَفَاضَ بِالْقِدَاحِ: تیر گھمانا۔

اَفَاضَ الْبَعِیْرُ بِجَرَّتِہٖ: اونٹ کا جگال پھینکنا۔ دِرْعٌ مُفَاضَۃٌ: کشادہ زرہ۔ گویا پہننے والے پر اسے بہا دیا گیا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ مَسْنُوْنَۃٌ کے معنی بھی وسیع زرہ کے ہیں جو کہ سَنَنْتُ بمعنی صَبَبْتُ سے مشتق ہے۔

(ف ی ل)

اَلْفِیْلُ: ہاتھی جمع۔ فِیَلَۃٌ وَ فُیُوْلٌ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ﴾ (۱۰۵۔۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

رَجُلٌ فِیْلُ الرَّأْیِ وَفَالُ الرَّأْیِ: کمزور رائے آدمی۔

اَلْمُفَایَلَۃُ: ایک قسم کا کھیل جس میں بچے کوئی چیز مٹی میں چھپا دیتے ہیں پھر اس مٹی کو مٹھیاں بھر بھر کر تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس کے حصہ میں آتی ہے اور فَائِلٌ، سرین کے گڑھے یا گوشت کے نیچے ایک رگ کا نام ہے۔

❀❀❀

کتابُ القَاف

(ق ب ح)

اَلْـقَبِیْـحُ: اس چیز کو کہتے ہیں جس کے دیکھنے سے آنکھ کو نفرت ہو اور اعمال و احوال میں سے اس عمل اور حالت کو کہتے ہیں جس سے طبیعت کو کراہت ہو، کہا جاتا ہے۔

قَبُـحَ قَبَـاحَةً (ک) فَهُـوَ قَبِیْحٌ۔ اور آیت کریمہ:

﴿مِّـنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ﴾ (۲۸۔۴۲) میں مقبوحین سے بد حال لوگ مراد ہیں اور اس سے کفار کی صفات ذمیمہ کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں وہ پلید اور گندے رہتے ہیں اور آخرت میں سیاہ رو گربہ چشم ہوں گے اور اغلال و سلاسل میں جکڑ کر انہیں گھسیٹا جائے گا۔ الغرض اس قسم کی مذموم صفات مراد ہیں (جن کے ساتھ قیامت کے دن متصف ہوں گے)

قَبَّـحَـهُ الـلّٰهُ عَنِ الْخَیْرِ: اللہ اسے خیر سے دور کرے

الـقبیـح: بازو کی ہڈی جس کا نصف کہنی کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

(ق ب ر)

اَلْـقَبْـرُ کے معنی میت کو دفن کرنے کی جگہ کے ہیں اگر یہ قَبَرْتُهٗ (ضرب ونصر) کا مصدر ہو تو اس کے معنی میت کو قبر میں دفن کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اَقْبَرْتُهٗ کے معنی کسی کے لیے قبر مہیا کرنے کے ہیں تاکہ اس میں دفن کیا جائے۔ جیسے اَسْقَیْتُهٗ: کے معنی پینے کے لیے پانی مہیا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ (۸۰۔۲۱) پھر اس کو موت دی۔ پھر قبر میں دفن کرایا۔

بعض نے اَقْبَـرَهٗ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسے الہام کر دیا کہ کس طرح میت کو دفن کیا جائے۔ اَلْمَقْبُرَةُ وَالْمَقْبَرَةُ (قبرستان) جمع مقابر قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتّٰـی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (۱۰۲۔۲) (یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔

یہ موت سے کنایہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِذَا بُـعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ﴾ (۱۰۰۔۹) کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے۔ میں حیات بعد الممات یعنی موت کے بعد زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دلوں کے اسرار ظاہر کر دینے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب تک انسان دنیا میں رہتا ہے اس کے بھید مستور رہتے ہیں گویا قبر میں مدفون ہیں۔ تو یہاں قبور سے مجازاً دل مراد ہیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ جب موت کی وجہ سے جہالت کا پردہ اٹھ جائے گا گویا کافر اور جاہل جب تک دنیا میں رہتے ہیں جہالت کی قبروں میں مدفون رہتے ہیں۔ چونکہ مرنے کے بعد وہ جہالت دور ہو جاتی ہے۔ تو گیا وہ قبر جہالت سے دوبارہ زندہ کر کے نکالے گئے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے اَلْاِنْسَـانُ نَـائِمٌ فَاِذَا مَاتَ انْتَبَهَ: کہ انسان دنیا میں سویا رہتا ہے جب موت آ کر دستک دیتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرمایا۔

﴿مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ (۳۵۔۲۲) اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔یعنی جو (لوگ جہالت کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے) مردوں کے حکم میں ہیں۔

(ق ب س)

اَلْقَبَسُ: آگ (کا شعلہ یا اس کی چنگاری) جو شعلہ سے لی جائے قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ آتِیْکُمْ بِشِھَابٍ قَبَسٍ﴾ (۲۷۔۷) یا سلگتا ہوا انگارہ تمہارے پاس لاتا ہوں۔

اور اَلْقَبْسُ (مصدر) وَالْاِقْتِبَاسُ کے معنی بڑی آگ سے کچھ آگ لینے کے ہیں۔مجازاً علم و ہدایت کی طلب پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

اَقْبَسْتُہٗ نَارًا اَوْ عِلْمًا: میں نے اسے آگ دی یا علم سکھایا۔

اَلْقَبِیْسُ: وہ سانڈھ جو تیزی کے ساتھ مادہ کو حاملہ کر دے گویا سرعت میں وہ شعلہ کی طرح ہے۔

(ق ب ص)

اَلْمَقْبَصُ: (ص) کے معنی چٹکی سے کوئی چیز لینے کے ہیں اور جو چیز چٹکی سے لی گئی ہو اسے قَبْصٌ وَ قَبِیْصَۃٌ کہا جاتا ہے۔اس لیے قبیص، حقیر چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور آیت: ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً﴾ (۲۰۔۹۶) تو میں نے ایک مٹھی بھر لی۔میں ایک قرأت فَقَبَصْتَ قَبْصَۃً (صاد مہملہ) کے ساتھ بھی ہے۔

قَبُوْصٌ: سبک رفتار اور چست گھوڑا جو دوڑتے وقت صرف سم ہی زمین پر لگائے۔اور تیز رفتار گھوڑے پر اس کا اطلاق مجازی ہے جیسا کہ مجازاً سرعت رفتاری کے لیے قَبْصٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ض)

اَلْقَبْضُ کے معنی کسی چیز کو پورے پنجے کے ساتھ پکڑنے کے ہیں جیسے قَبَضَ السَّیْفَ وغیرہ تلوار کو پکڑنا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ﴾ (۲۰۔۹۶) تو میں نے فرشتے کے نقش پا سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی۔

قَبْضُ الْیَدِ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی مٹھی میں لے لینے کے ہیں اور قَبْضُھَا عَنِ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے سے ہاتھ سکیڑ لینے کے ہیں۔اسی مفہوم کے لحاظ سے مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ یَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَھُمْ﴾ (۹۔۶۷) اور (خرچ کرنے سے) ہاتھ بند کیے رہتے ہیں۔

یعنی خرچ نہیں کرتے۔اور استعارہ کے طور پر کسی چیز کے حاصل کر لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے اگرچہ اسے ہاتھ سے نہ پکڑا جائے جیسے محاورہ ہے۔قَبَضْتُ الدَّارَ مِنْ فُلَانٍ یعنی اسے اپنے تصرف میں لے لیا۔قرآن پاک میں ہے۔[1]

---

[1] قال فی الکشاف (۲/۴۴۵) وھی قراءۃ الحسن راجع ایضا ابدال ابی الطیب (۲/۲۴۶) وعلماء اللغۃ فرقوا بینھما راجع غریب ابی عبید (۱/۳۶) وکما فی قولہ تعالیٰ: فرھان مقبوضۃ (۲/۲۸۳)

﴿وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۳۹۔۶۷) اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔یعنی اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہوگی اور کسی کا ملک نہیں ہوگا۔اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا﴾ (۲۵۔۴۶) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

میں سورج کے سایہ کو نقل کرنے کی طرف اشارہ ہے اور استعارہ کے طور پر قبض کے معنی تیز دوڑنے کے بھی آتے ہیں اس لحاظ سے کہ گویا دوڑنے والا زمین سے کسی چیز کو پکڑتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿یَقْبِضُ وَ یَبْصُطُ﴾ (۲۔۲۴۵) (اور خدا ہی روزی کو) تنگ کرتا اور اسے وہی کشادہ کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی چھین لیتا ہے اور کبھی عطا کر دیتا ہے۔یا ایک قوم سے چھین لیتا ہے اور دوسری کو عطا کر دیتا ہے۔یا یہ کہ وہ کبھی جمع کرتا ہے اور کبھی بکھیر دیتا ہے اور یا اس کے معنی زندہ کرنے اور مارنے کے ہیں۔کیونکہ کبھی قبض موت سے کنایہ ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔قَبَضَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اس معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۷۷) ((مَا مِنْ آدَمِیٍّ اِلَّا وَقَلْبُهٗ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنَ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ)) کہ ہر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے یعنی انسان کے سب سے اشرف جزء پر اللہ تعالیٰ کو تصرف حاصل ہے تو دوسرے اعضاء پر بالاولیٰ تصرف حاصل ہوگا۔رَاعِیْ قُبْضَةٍ: منتظم چرواہا۔

اَلْاِنْقِبَاضُ کے معنی اطراف یعنی ہاتھ پاؤں سمیٹ لینے کے ہیں اور ترک تبسط یعنی بے تکلفی چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(ق ب ل)

قَبْلُ: یہ تقدم متصل اور منفصل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی ضد بَعْدُ ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں تقدم متصل کے لیے آتے ہیں اور ان کا ضد دُبْرٌ و دُبُرٌ ہے۔یہ اس کے اصل معنی ہیں اگرچہ مجازاً ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے پس قَبْل چار طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) تقدم مکانی: یعنی کسی مقام کا دوران سفر میں پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے اصفہان سے مکہ کی طرف جاتے وقت بغداد کوفہ سے پہلے آتا ہے لیکن مکہ سے اصفہان کو جاتے وقت کوفہ بغداد سے پہلے آتا ہے۔

(۲) تقدم زمانی: جیسے عَبْدُالْمَلِكِ قَبْلَ الْمَنْصُوْرِ کہ عبدالملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ......﴾ (۲۔۹۱) تو خدا کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں قتل کیا کرتے۔

(۳) تقدم بلحاظ مرتبہ: جیسے عَبْدُالْمَلِكِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبدالملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔

(۴) تقدم صناعی: یعنی ترتیب تعلیمی اور فنی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے۔ تَعَلُّمُ الْهِجَاءِ قَبْلَ تَعَلُّمِ الْخَطِّ کہ حروف ہجا کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْیَةٍ﴾ (۲۱۔۶) ان سے

[1] وبمعناه فی (حم ہ ك) عن النواس (الفتح الكبير (للنبهانی) (۷۲۵ ج۳)

پہلے جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی تھیں۔

﴿قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ (۲۰۔۱۳۰) سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔

﴿قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ﴾ (۲۷۔۳۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۵۷۔۱۶) (ان سے) پہلے کتابیں دی گئی تھیں۔

ان تمام آیات میں تقدم زمانی مراد ہے اور کنایہ کے طور پر قُبُلٌ وَدُبُرٌ کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور استقبال کی طرح اقبال کے معنی بھی کسی کے روبرو اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ (۶۸۔۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔ ﴿وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۲۔۷۱) اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر......

﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ﴾ (۵۱۔۲۹) ابراہیم علیہ السلام کی بیوی چلاتی ہوئی آئی۔

اور جو شخص ڈول کی طرف منہ کر کے اسے کنویں سے پکڑتا ہے۔ اسے قابل اور دائی کو قابلہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ولادت کے وقت بچے کو پکڑتی ہے قَبِلْتُ عُذْرَهٗ وَتَوْبَتَهٗ وغیرہ وَتَقَبَّلْتُهٗ: میں نے اس کا عذر اور توبہ وغیرہ قبول کر لی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ (۲۔۱۲۳) اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے۔

﴿وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ (۴۰۔۳) اور توبہ قبول کرنے والا۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ﴾ (۴۲۔۲۵) اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا...... ہے۔ اور تَقَبُّلٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح قبول کرنے کے ہیں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ (۴۶۔۱۶) یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے۔

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (۵۔۲۷) کہ خدا پرہیز گاروں ہی کی نیاز قبول فرمایا کرتا...... ہے۔ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر عبادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے۔ فرمایا:

﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ﴾ (۳۔۳۵) تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔ كَفَالَةٌ کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ كَفَالَةَ کے معنی مؤکد طور پر کسی چیز کو قبول کر لینے کے ہیں تو آیت ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ﴾ میں کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قُبَالَہ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ (۳۔۳۷) پروردگار نے اسے پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَقَبَّلَهَا کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَكَفَّلَهَا کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا ہے اور پھر آیت کریمہ میں بِتَقَبُّلٍ کی بجائے بِقَبُوْلٍ حسن فرمایا ہے تاکہ اس میں دونوں امر جمع ہو جائیں یعنی تقبل جو قبولیت کا اعلیٰ درجہ ہے اور قبول کرنا جو کہ رضا اور

ثواب کا مقتضی ہوتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ قَبُوْلٌ کا لفظ فُلَانٌ عَلَيْهِ قَبُوْلٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جو اسے دیکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور آیت کریمہ ﴿كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا﴾ (۶۔۱۱۱) سب چیزوں کو...... سامنے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قُبُلٌ قَابِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی سامنے کے ہیں۔ مجاہدؒ نے اس کے معنی جماعت در جماعت کیے ہیں اس صورت میں یہ قبیل کی جمع ہوگی۔ اس طرح آیت کریمہ: ﴿أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾ (۱۸۔۵۵) یا ان پر عذاب سامنے آموجود ہو۔ میں بھی قُبُلًا کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے قَبَلًا پڑھا ہے جس کے معنی عِيَانًا یعنی سامنے کے ہیں۔

اَلْقَبِيْلُ: یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی وہ جماعت جو ایک دوسرے پر متوجہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ﴾ (۴۹۔۱۳) تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا﴾ (۱۷۔۹۲) اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لے آؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَبِيْلٌ بمعنی كَفِيْلٌ یعنی ضامن کے ہے اور یہ قَبِلْتُ فُلَانًا وَتَقَبَّلْتُ بِهٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ضامن بننے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی مقابلہ یعنی معائنہ کیے ہیں۔ مثل مشہور ہے۔

فُلَانٌ لَا يَعْرِفُ قَبِيْلًا مِّنْ دَبِيْرٍ: وہ عورت کے اگلے اور پچھلے سوت میں تمیز نہیں کرسکتا یعنی بیوقوف ہے۔

اَلْمُقَابَلَةُ وَالتَّقَابُلُ کے معنی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں خواہ وہ توجہ بذریعہ ذات کے ہو یا بذریعہ عنایت اور مودت کے ہو۔قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مُتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِيْنَ﴾ (۵۶۔۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

﴿إِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ (۱۵۔۴۷) بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔

لِيْ قِبَلَ فُلَانٍ كَذَا کے معنی ہیں: میرے فلاں کی جانب اتنے ہیں اور یہ عِنْدَهٗ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ﴾ (۶۹۔۹) اور فرعون اور جو لوگ اس سے پہلے تھے سب...... کرتے تھے۔

﴿فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ﴾ (۷۰۔۳۶) تو ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ تمہاری طرف دوڑتے چلے آتے ہیں۔

اور استعارہ کے طور پر قوت اور قدرت علی القابلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

لَا قِبَلَ لِيْ بِكَذَا: میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (۲۷۔۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہ ہوگی۔

یعنی ان کے سامنے ہونے اور مدافعت کرنے کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔

اَلْقِبْلَةُ: اصل میں بالمقابل آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے جیسے جِلْسَةٌ وَقِعْدَةٌ اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (۲۔۱۴۴) سو ہم تم کو ایسے قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو متوجہ ہونے کا حکم دیں گے۔

اور قَبُوْلٌ کے معنی پُروا کی ہوا کے ہیں اور اسے قَبُوْلٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قبلہ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور سر کی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ کو قَبِیْلَۃٌ کہا جاتا ہے اور مُقَابَلَۃٌ اس بکری کو کہا جاتا ہے جس کا کان سامنے کی جانب سے کٹا ہوا ہو۔ اور قِبَالُ النَّعْلِ کے معنی جوتے کا تسمہ کے ہیں قَابَلْتُ النَّعْلَ: جوتے کو تسمہ لگانا۔

اَلْقَبَلُ: پاؤں کے پنجہ کا اندر کی جانب مڑا ہوا ہونا اَلْقَبَلَۃُ: ایک قسم کا منکا جس کے متعلق ساحروں کا خیال ہے کہ وہ باہم محبت کا کام دیتا ہے اسی سے قُبْلَۃٌ ہے جس کے معنی بوسہ کے ہیں اس کی جمع قُبل آتی ہے۔ اور قَبَّلْتُہٗ تَقْبِیْلًا کے معنی بوسہ دینے کے ہیں۔ [1]

(ق ت ر)

اَلْقَتْرُ: (ن) کے معنی بہت ہی کم خرچ کرنے اور بخل کرنے کے ہیں۔ یہ اِسْرَافٌ کی ضد ہے۔ اور یہ دونوں صفات مذمومہ سے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾ (۲۵۔۶۷) بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اسی سے صفت مشبہ کا صیغہ قَتُوْرٌ وَ مُقْتِرٌ آتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَ کَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان فطرۃً کنجوس واقع ہوا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴۔۱۲۸) اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

قَتَرْتُ الشَّیْءَ وَاَقْتَرْتُہٗ وَقَتَّرْتُہٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں اور مُقْتِرٌ بمعنی فقیر ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ﴾ (۲۔۲۳۶) اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

اصل میں یہ قُتَارٌ وَقَتَرٌ سے ہے جس کے معنی اس دھواں کے ہیں جو کسی چیز کے بھوننے یا لکڑی کے جلنے سے اٹھتا ہے گویا مُقْتِرٌ اور مُقَتِّرٌ بھی ہر چیز سے دھوئیں کی طرح لیتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ﴾ (۸۰۔۴۱) (اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔

میں قَتَرَۃٌ غَبَرَۃٌ کی طرح ہے مراد دھوئیں کی طرح سیاہی اور افسردگی ہے جو جھوٹ کی وجہ سے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔

اَلْقُتْرَۃُ: شکاری کی کمین گاہ جو انسان کی بو کو بھی شکار تک نہیں پہنچنے دیتی۔ کیونکہ شکاری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بو بھی شکار تک نہ پہنچے تاکہ شکار بھاگ نہ جائے۔

رَجُلٌ قَاتِرٌ: کمزور آدمی۔ گویا وہ ضعف میں دھوئیں کی طرح ہے جیسا کہ کمزور آدمی کو ھُوَ ھَبَاءٌ کہا جاتا ہے۔

اِبْنُ قَتَرَۃٍ: ایک باریک اور چھوٹا سا سانپ۔ اَلْقَتِیْرُ: زرہ کی میخوں کے سرے۔

(ق ت ل)

اَلْقَتْلُ: (ن) الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرانجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا

[1] انظر فی القبلۃ لطائف و طرائف (محاضرات الادباء (۳/۱۲۰۔۱۲۲)

ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾ (۳۔۱۴۴) بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں۔

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ (۸۔۱۷) تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا۔

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ﴾ (۸۰۔۱۷) انسان ہلاک ہو جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۰) اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بددعا کے لیے ہے اور قتل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ایجاد قتل کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲۔۵۴) اور اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو۔

کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو اور بعض نے خواہشات نفسانی کا قلع قمع کر دینا مراد لیا ہے۔ اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالْمَاءِ: میں نے شراب میں پانی ملا دیا (جس سے اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا)

قَتَلْتُ فُلَانًا وَقَتَّلْتُهٗ: میں نے اسے ذلیل کر دیا۔

شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۳۵۰) كَاَنَّ عَيْنَيَّ فِيْ غَرْبَيْ مُقَتَّلَةٍ

گویا میری دونوں آنکھیں بھرے ہوئے ڈول میں رکھی ہوئی ہیں۔

قَتَلْتُ كَذَا عِلْمًا: میں نے اچھی طرح جان لیا۔ اور آیت کریمہ

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا یقین نہیں ہے۔ [2]

اَلْمُقَاتَلَةُ کے معنی جنگ کرنے اور کسی کے درپے قتل ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ (۲۔۱۹۳) اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

﴿وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا﴾ (۵۹۔۱۲) اور اگر ان سے جنگ ہوئی۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ (۹۔۱۲۳) (اپنے نزدیک کے رہنے والے) کافروں سے جنگ کرو۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ﴾ (۴۔۷۴) اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ قتل کے معنی دشمن اور ہمسر کے ہیں مگر اسکے اصل معنی مقاتل یعنی لڑنے والا کے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ﴾ (۹۔۳) خدا ان کو ہلاک کرے۔

بعض کے نزدیک جملہ دعائیہ ہے کہ اللہ ان پر لعنت کرے اور بعض نے اس کے معنی قتل کر دینا کے لکھے ہیں۔ لیکن

---

[1] وتمامة: من النواضح تسقى جنة سحقا۔ قاله زهير وقد مر تخريجه (جن) والبيت ايضا فى المحكم (سحق)

[2] راجع (ى ق ن) ۱۲

اصل میں یہ باب مفاعلہ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لڑائی کے درپے ہو رہے ہیں اور جو اللہ سے جنگ کرے گا وہ مغلوب ہوگا جیسے فرمایا:

﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۳۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ﴾ (۶-۱۵۲) اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ عَــــزْل کے ذریعہ نطفے کو ضائع کرنے اور اسے بے محل ڈالنے سے منع فرمایا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میں اولاد کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنے سے منع کیا ہے جوان کو حصول علم اور ایسے کاموں میں کوشش کرنے سے روک رکھیں جو ابدی زندگی کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ جاہل اور غافل لوگ آخرت سے مردوں کی طرح بے خبر رہتے ہیں اسی بنا پر آیت:

﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ﴾ (۱۶-۲۱) وہ لاشیں ہیں بے جان۔ میں انہیں مردے کہا ہے اور یہی معنی آیت: ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۴-۲۹) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کے ہیں کیونکہ اس کے بعد:

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا﴾ (اور جو تعدی وظلم سے ایسا کرے گا) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ (۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا، اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو (یا اس کا) بدلہ (دے) اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چارپایہ۔ میں ذبح کی بجائے لفظ قتل اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ سب الفاظ سے اعم ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کی جان لینا بہمہ وجوہ ممنوع ہے۔

اَقْتَلْتُ فُلَانًا میں نے اسے قتل کے لیے پیش کیا۔ اِقْتَتَلَهُ الْجِنُّ وَالْعِشْقُ: اسے عشق یا جن نے قتل کر ڈالا۔ اور یہ لفظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا اور اِقْتِتَال بمعنی مُقَاتَلَة بھی آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا﴾ (۴۹-۹) مومنوں میں سے...... آپس میں لڑ پڑیں۔

(ق ح م)

اَلْاِقْتِحَامُ کے معنی کسی خوف ناک جگہ میں گھس جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۹۰-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔

﴿هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸-۵۹) یہ ایک فوج ہے جو...... داخل ہوگی۔

قَحَّمَ الْفَرَسُ فَارِسَهٗ: گھوڑا اپنے سوار کو لے کر خطرناک جگہ میں جا گھسا۔

قَحَّمَ فُلَانٌ نَفْسَهٗ فِيْ كَذَا اس نے اپنے تئیں بے سوچے سمجھے خطرہ میں ڈال دیا۔

مَقَاحِيْمُ: (واحد مِقْحَامٌ) بے خطر کسی (خوف ناک) امر میں گھس جانے والے۔ شاعر نے کہا ہے۔[1]

[1] لم اجد قائله والبيت في المحاضرات

(۳۵۱) مَقَاحِيْمُ فِي الْاَمْرِ الَّذِیْ يُتَجَنَّبُ وہ قابل اجتناب یعنی خوفناک امور میں بے دھڑک گھسنے والے ہیں...... ایک روایت میں يَتَهَيَّبُ ہے۔

(ق د د)

اَلْــقَـدُّ کے معنی کسی چیز کو طول میں قطع کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

﴿وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

اَلْـقِدُّ: بمعنی مَقْدُوْدٌ ہے اور اسی سے انسان کے قدو قامت کو قَدٌّ کہا جاتا ہے جیسا کہ۔ تَقْطِيْعُ الْاِنْسَانِ (انسان کا قد وقامت) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

قَدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارچے بنانے کے ہیں اور کٹے ہوئے گوشت کو قَدِيْدٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْقِدَدُ اس کا واحد قِدَّةٌ ہے اور اس کے معنی مختلف طرق اور مذاہب کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا﴾ (۷۲۔۱۱) ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں۔

اور قَـدَّةٌ کے معنی لوگوں کی بولی اور گروہ کے بھی آتے ہیں جیسے قِطْعَةٌ اِقْتَدَّ الْاَمْرَ: کسی کام کی تدبیر کرنا جیسا کہ: فَصَلَ وَحَزَمَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے۔

(قد)

یہ حرف تحقیق ہے اور فعل کے ساتھ مخصوص ہے علماء نحو کے نزدیک یہ حرف توقع ہے اور اصل میں جب یہ فعل ماضی پر آئے تو تجدد اور حدوث کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا:

﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ (۱۲۔۹۰) خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَيْنِ﴾ (۳۔۱۳) تمہارے لیے دو گروہوں میں...... (قدرت خدا کی عظیم الشان) نشانی تھی۔

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ﴾ (۵۸۔۱) خدا نے...... سن لی۔

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۱۸) (اے پیغمبر)...... تو خدا ان سے خوش ہوا۔

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ﴾ (۹۔۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی۔

اور چونکہ یہ فعل ماضی پر تجدد کے لیے آتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے اوصاف ذاتیہ کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ لہٰذا قَدْ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔" کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت:

﴿قَدْ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى﴾ (۷۳۔۲۰) اس نے جانا کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوتے ہیں۔

میں قَدْ لَفْظًا اگرچہ علم پر داخل ہوا ہے لیکن معنوی طور پر اس کا تعلق مرض کے ساتھ ہے جیسا کہ "مَا عَلِمَ اللّٰهُ زَيْدًا يَخْرُجُ" میں نفی کا تعلق خروج کے ساتھ ہے۔ اور اس کی تقدیر یوں ہے: قَدْ يَمْرُضُوْنَ فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ" وَمَا يَخْرُجُ زَيْدٌ فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ اگر "قَدْ" فعل مستقبل پر داخل ہو تو تقلیل کا فائدہ دیتا ہے یعنی کبھی وہ فعل واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴۔۶۳) خدا کو یہ لوگ معلوم ہیں جو تم میں سے آنکھ بچا

کرچل دیتے ہیں۔
کی تقدیر یوں ہے قَدْ يَتَسَلَّلُوْنَ اَحْيَانًا فِيْمَا عَلِمَ اللّٰهُ ...... تو یہ آیت بھی ماسبق کی طرح موؤل ہوگی اور قد کا تعلق تسلل کے ساتھ ہوگا۔
قَدْ وَقَطْ یہ دونوں اسم فعل بمعنی حَسْبُ کے آتے ہیں جیسے محاورہ ہے: قَدْنِيْ كَذَا وَقَطْنِيْ كَذَا اور قَدِيْ (بدون نون وقایہ) کا محاورہ بھی حکایت کیا گیا ہے فراء نے قَدْنِيْ اور قَدْكَ پر قیاس کرکے قَدْ زَيْدًا بھی حکایت کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ قَدْ (اسم فعل) اسم ظاہر کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا بلکہ صرف اسم مضمر کے ساتھ آتا ہے۔

(ق د ر)

اَلْقُدْرَةُ: (قدرت) اگر یہ انسان کی صفت ہو تو اس سے مراد وہ قوت ہوتی ہے جس سے انسان کوئی کام کرسکتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاجز نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی معنوی طور پر قدرت کاملہ کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتی اگرچہ لفظی طور پر ان کی طرف نسبت ہوسکتی ہے اس لیے انسان کو مطلقا هُوَ قَادِرٌ کہنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تقیید کے ساتھ هُوَ قَادِرٌ عَلٰى كَذَا کہا جائے گا لہٰذا اللہ کے سوا ہر چیز قدرت اور عجز دونوں کے ساتھ متصف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو ہر لحاظ سے عجز سے پاک ہے۔
اَلْقَدِيْرُ: اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کرسکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہٰذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَّهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ﴾ (۴۲۔۲۹) اور وہ جب چاہے ان کے جمع کرلینے پر...... قادر ہے۔
اور یہی معنی تقریبا مُقْتَدِر کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔
﴿فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۲) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔
لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہوجاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلیف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے۔
قَدَرْتُ عَلٰى كَذَا قُدْرَةً کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کرلی۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ (۲۔۲۶۴) (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔
اَلْقَدْرُ وَالتَّقْدِيْرُ کے معنی کسی چیز کی کمیت کو بیان کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ قَدَرْتُهٗ وَقَدَّرْتُهٗ اور قَدَّرَهٗ (تفعیل) کے معنی کسی کو قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں محاورہ ہے۔
قَدَّرَنِيَ اللّٰهُ عَلٰى كَذَا وَقَوَّانِيْ عَلَيْهِ: اللہ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمائی پس ''تقدیر الٰہی'' کی دو صورتیں ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو قدرت بخشنا (۲) یا اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرز مخصوص پر بنانا جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس لیے کہ فعل الٰہی دو قسم پر ہے اول

ایجاد بالفعل یعنی ابتداء ہی سے کسی چیز کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیت الٰہی اس کے فنا یا تبدیل کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے اجرام سماویہ اور و ما فیہا کی تخلیق (کہ ان میں تا قیامت کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا) دوم یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوۃ وجود عطا فرمانا اور ان کو اس انداز ہ کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کی خلاف ظہور پذیر نہ ہوسکیں جیسا کہ خرما کی گٹھلی کے متعلق تقدیر الٰہی یہ ہے کہ اس سے خرما کا درخت ہی اگتا ہے اور سیب یا زیتون کا درخت نہیں اگ سکتا اسی طرح انسان کی منی سے انسان ہی پیدا ہوتا ہے دوسرے جانور پیدا نہیں ہو سکتے۔ پس تقدیر الٰہی کے دو معنی ہوئے ایک یہ کہ کسی چیز کے متعلق نفی یا اثبات کا حکم لگانا کہ یوں ہوگا اور یوں نہیں ہوگا۔ عام اس سے کہ وہ حکم بر سبیل وجوب ہو یا بر سبیل امکان چنانچہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵۔۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

میں یہی معنی مراد ہیں دوم، کسی چیز پر قدرت عطا کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ﴾ (۷۷۔۲۳) پھر اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ کا ہر حکم قابل ستائش ہے۔ اور یہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵۔۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

کے ہم معنی ہے اور اس میں ایک قرأت فَقَدَّرْنَا (تشدید دال) کے ساتھ بھی ہے اور اس کے معنی یا تو حکم کرنے کے ہیں اور یا اعطاء قدرت کے اور آیت کریمہ:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ موت مقدر کرنے والا چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے یہ بھی عین حکمت کے مطابق ہے اور مجوس کا یہ زعم غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور ابلیس مارتا ہے۔ اور آیت کریمہ ﴿إِنَّآ أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ہم نے اس (قرآن پاک) کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔

میں لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے خاص رات مراد ہے جسے امور مخصوصہ کی انجام دہی کے لیے اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴۔۴۹) ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ (۷۳۔۲۰) اور خدا تو رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔

میں سلسلہ لیل و نہار کے اجراء کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ان کے اوقات کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اوقات معینہ، میں حق عبادات ادا کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ﴾ (۸۰۔۱۹) نطفے سے بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

میں ان قوی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نطفہ میں

بالقوۃ ودیعت کر رکھے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً صورت کا لباس پہن کر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔اور آیت کریمہ۔
﴿وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ (۳۳۔۳۸) اور خدا کا حکم ٹھہر چکا ہے۔
میں قدر کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں جن کی طرف کہ آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:❶ (۷۸)
((فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْخَلْقِ وَالْاَجَلِ وَالرِّزْقِ)) کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خلق، عمر اور رزق سے فارغ ہو چکا ہے اور مقدور کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جو وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔جن کی طرف کہ آیت:
﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔میں اشارہ فرمایا ہے اسی معنی میں فرمایا۔
﴿وَ مَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۱۵۔۲۱) اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔
ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ قَدَرٌ وَ قَدْرٌ (بفتح الدال و سکونہا) دونوں طرح بولا جاتا ہے چنانچہ محاورہ خُذْ بِقَدَرِ كَذَا وَقَدْرِ كَذَا (کہ اتنی مقدار میں لے لو) فُلَانٌ يُخَاصِمُ بَقَدَرٍ وَقَدْرٍ اور آیت کریمہ: ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ (۲۔۲۳۶) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق میں قدر کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنی مقدور کے مطابق اخراجات ادا کرے۔اور آیت کریمہ ﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ (۸۷۔۳) اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرا دیا (پھر اس کو) رستہ بتایا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وہ کچھ عطا فرما دیا جس میں اس کی مصلحت ہے اور اسے تعلیمی یا تسخیری طور پر ان چیزوں کی طرف ہدایت کر دی ہے جن میں اس کی نجات مضمر ہے جیسے فرمایا ﴿الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر راہ دکھائی۔
جب ''تقدیر'' کا فاعل انسان ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تقدیر محمود یعنی عقل وفکر کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرنا اور پھر اس فارمولا کے مطابق کسی کام کو سرانجام دینا۔دوم تقدیر مذموم کہ انسان اپنی تمنا اور خواہش کے پیمانہ کے مطابق کسی امر پر غور وفکر کرے اور عقل وفکر سے کام نہ لے جیسے فرمایا:
﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ﴾ (۷۴۔۱۸۔۱۹) اس نے فکر کیا اور تجویز کی یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔
اور استعارہ کے طور پر قدرۃ اور مقدور کے معنی حالت اور وسعت مالی کے بھی آتے ہیں اور قدر کے معنی اس معین وقت یا مقام کے بھی ہوتے ہیں جو کسی کام کے لیے مقرر ہو چکا ہو چنانچہ فرمایا
﴿اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۷۷۔۲۲) ایک معین وقت تک۔نیز فرمایا:

❶ وفي رواية ابن عساكر عن انس مرفوعاً فرغ الله عن اربع من الخلق الخ وفي رواية الطبراني عن ابي الدرداء ((من خمس من اجله ورزقه و اثره مضجعه وشقي او رسعيد)) (راجع كنز العمال رقم ٤٩٤۔٤٩٦) والفتح الكبير للنبهاني (٢/٢٦٦)

﴿فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔ یعنی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلتے ہیں ایک قرأت میں بِقَدْرِهَا ہے جو بمعنی تقدیر یعنی اندازہ...... کے ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ﴾ (اور کوشش کے ساتھ) سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔ میں قادرین کے معنی قاصدین کے ہیں یعنی جو وقت انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ اندازہ کرتے ہوئے اس وقت پر وہاں جا پہنچے اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ﴾ (۵۴۔۱۲) تو پانی ایک کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا۔

میں مراد ہیں۔ اور قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ کے معنی کسی پر تنگی کر دینے کے ہیں گویا وہ چیز اسے معین مقدار کے ساتھ دی گئی ہے اس کے بالمقابل بغیر حساب (یعنی بے اندازہ) آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ﴾ (۶۵۔۷) اور جس کے رزق میں تنگی ہو۔

یعنی جس پر اس کی روزی تنگ کر دی گئی ہو۔ نیز فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ (۱۳۔۲۶) خدا جس پر چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

﴿فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ (۲۱۔۸۷) اور خیال کیا کہ ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔

اور ایک قرأت میں لن نقدر علیہ ہے اور اسی سے لفظ اقدر مشتق ہے جس کے معنی کوتاہ گردن آدمی کے ہیں اور اقدر اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے دوڑتے وقت پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اگلے پاؤں پڑے تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (۳۹۔۶۷) ان لوگوں نے اللہ کی قدرشناسی جیسے کرنا چاہیے تھی نہیں کی۔ یعنی یہ لوگ اس کی حقیقت کو نہیں پا سکے اور پھر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اس کی کنہہ کا ادراک بھی کیسے کر سکتے ہیں جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ ﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۳۹۔۶۷) اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ (۳۴۔۱۱) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑ دو۔

میں قَدِّرْ فِي السَّرْدِ کے معنی یہ ہیں کہ مضبوط اور محکم زرہیں بناؤ۔

اور مِقْدَارُ الشَّيْءِ، اس وقت یا زمانہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۷۰۔۴) اور اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۵۷۔۲۶) (یہ باتیں) اس لیے (بیان کی گئی ہیں) کہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔

پر بحث تاویل کے ساتھ مختص ہے (یعنی اس میں تاویل

سے چارہ نہیں ہے)

اَلْـقِـدْرُ: (دیگ) برتن جس میں گوشت پکایا جاتا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾ (۳۴-۱۳) اور دیگیں جو ایک ہی جگہ رکھی ہیں۔

اور قَـدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی ہنڈیا میں گوشت پکانے کے ہیں اور ہنڈیا میں پکائے ہوئے گوشت کو قَدِيْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْقُدَارُ: (قصاب) وہ شخص جو اونٹ کو نحر (ذبح) کر کے دیگ میں اس کا گوشت پکاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ (الکامل)

(۳۵۱) ضَرْبَ الْقُدَارِ نَقِيْعَةَ الْقُدَّامِ

جیسا کہ قصاب سفر سے آنے والے کی خوشی میں دعوت کے لیے گوشت کاٹتا ہے۔

(ق د س)

اَلتَّـقْدِيْـسُ کے معنی اس تطہیر الٰہی کے ہیں جو کہ آیت وَ يُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳-۳۳) اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالۂ نجاست محسوسہ کے نہیں اور آیت کریمہ ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ (۲-۳۰) اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک وصاف کرتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی۔ نَـصِـفُكَ بِـالتَّـقْدِيْسِ بھی لکھے ہیں۔ یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ (۱۶-۱۰۲) کہہ دو کہ اس کو روح القدس...... لے کر نازل ہوئے ہیں، میں روح القدس سے مراد حضرت جبریل عَلَيْهِ السَّلَامُ ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن پاک حکمت اور فیض الٰہی لے کر نازل ہوتے تھے جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک صاف ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵-۲۱) تو بھائیو! تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) میں جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ داخل ہو۔

میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔ اور حَظِيْرَةُ الْقُدْسِ سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ کیونکہ شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

---

❶ قالہ مهلهل بن ربیعہ واولہ: وانا لنضرب بالصوارم ها مهاونى رواية بالسيوف رؤسهم بدل بالصوارم هامها راجع للبيت الامالى للمرتضىٰ (۱: ۳۵۶/۲: ۲۸) وتهذيب الالفاظ (۲۶۵) والبخلاء (۲۱۵) والفاخر (۹۸) والمخصص (٤: ۱۲۰) واللسان (قدر، نقع، قدم) والاشتقاق (۳۲۳) والمقاليس (۵: ۶۶، ٤۷۲) والمرز وقى (۲۵)۔ اونظام الغريب (۲٤۲) والمعانى للقتبى (۳۷۷) و البيت ثالث ثلاثة فى ديوانه (۷۰-۷۱) وراجع لمعناه المرزوقى والاشتقاق وكتاب النوادر لابى مسهل (۱: ۳۷-۳۹) والشاعر اسمه امرؤ القيس اوعدى بن ربيعه جاهلى ترجمة فى الشعراء (۲۵۶-۲۵۹) والمرز بانى (۲٤۸) (۱۱) والآمدى اوالاغانى (٤: ۱٤۰-۱۵۱) واللالى (۲۶-۲۷-۱۱۱-۱۱۲) والعينى (٤: ۲۱۱-۲۱۲) و شواهد المغنى (۲۲۵)

(ق د م)

اَلْقَدَمُ: انسان کا پاؤں۔جمع اَقْدَامٌ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ﴾ (۸۔۱۱) اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے۔

اسی سے تقدم کا لفظ لیا گیا ہے جو کہ تاخر کی ضد ہے اور تقدم چار قسم پر ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ [1] اور قدیم، حدیث کی ضد ہے اور اس کے معنی پرانی چیز کے ہیں (یہ تقدم زمانی سے ہے) اور کبھی تقدم بلحاظ مرتبہ کے ہوتا ہے جیسے فُلَانٌ مُتَقَدِّمٌ عَلٰی فُلَانٍ۔ یعنی فلاں اس سے اشرف ہے۔ اور کبھی متقدم اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر دوسری چیز کا وجود موقوف ہو جیسے اَلْوَاحِدُ مُتَقَدِّمٌ عَلَی الْعَدَدِ کہ واحد عدد پر متقدم ہے کیونکہ واحد کے بغیر عدد کا وجود ناممکن ہے۔ اَلْقِدَمُ کے معنی کسی چیز کے زمانہ ماضی میں موجود ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل بقاء ہے جس کے معنی زمانہ مستقبل میں موجود رہنے کے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وصف میں یاقَدِیْمَ الْاِحْسَانِ تو آیا ہے۔ لیکن کہیں بھی قرآن پاک اور آثار صحیحہ سے قَدِیْم کے لفظ کا اسمائے حسنٰی سے ہونا ثابت نہیں ہے البتہ علمائے متکلمین اسے بطور صفت الٰہی کے استعمال کرتے ہیں عموماً اَلْقَدِیْم کا لفظ قدم باعتبار زمانہ یعنی پرانی چیز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ﴾ (۳۶۔۳۹) کھجور کی پرانی شاخ کی طرح۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰۔۲) ان کے پروردگار کے ہاں) ان کا سچا درجہ ہے۔

میں قَدَمَ صِدْقٍ سے سابقہ فضیلت مراد ہے اور یہ اسم مصدر ہے اور قَدَّمْتُ کَذَا کے معنی پہلے سے کوئی کام کر چکنے یا بھیجنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقٰتٍ﴾ (۵۸۔۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو، ڈر گئے ہو۔

﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۵۔۸۰) انہوں نے جو کچھ اپنے واسطے آگے بھیجا، ہے برا ہے ﴿بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ (۲۔۹۵) جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔

اور قَدَّمْتُ فُلَانًا اَقْدُمُهٗ کے معنی کسی کے آگے آگے جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۱۱۔۹۸) وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (۴۹۔۱) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بمعنی لَا تَتَقَدَّمُوْا کے ہیں اور اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ قول و حکم میں پیغمبر سے سبقت نہ کرو بلکہ وہی کام کرو جس کا تمہیں حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے مکرم بندوں یعنی فرشتوں کا کردار بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ (۲۱۔۲۷) اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے۔

[1] راجع (اخ ر)

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (۱۶۔۶۱) ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ تقدم و تاخر کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ﴾ (۳۶۔۱۲) جو کچھ وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو ان کے پیچھے نشان (رہ گئے) ہیں ہم ان کو قلم بند کر لیتے ہیں۔

میں مَا قَدَّمُوْا سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے کر چکے ہیں۔

قَدَّمْتُ اِلَيْهِ بِكَذَا: پہلے سے کسی چیز کے متعلق کہہ رکھنا اور قَدَّمْتُ بِهٖ: وقت حاجت سے پہلے کسی کام کے متعلق آگاہ کرنا۔ اور اسی سے آیت کریمہ: ﴿قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ﴾ (۵۰۔۲۸) ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔

ہے اور قُدَّامٌ خَلْفٌ کی ضد ہے اس کی تصغیر قُدَيْمَةٌ آتی ہے۔

رَكِبَ فُلَانٌ مَقَادِيْمَهٗ: وہ سیدھا چلا گیا۔ یعنی ادھر ادھر مڑ کر نہیں دیکھا۔

قَادِمَةُ الرَّحْلِ: کجاوہ کا اگلا حصہ قَادِمَةُ الْاِطْبَاعِ: (جانور کا اگلا پستان یا پستان کا سرا) قَادِمَةُ الْجَنَاحِ: پرندے کے بازو کا اگلا حصہ۔ مُقَدَّمَةُ الْجَيْشِ: لشکر کا اگلا حصہ (ہراول دستہ)۔

اَلْقَدُوْمُ: دیر سے آگے بڑھنے والا آدمی، تیشہ۔ ان تمام الفاظ میں معنی تقدم معتبر ہے۔

(ق ذ ف)

اَلْقَذْفُ: (ض) کے معنی دور پھینکنا کے ہیں پھر معنی بُعد کے اعتبار سے دور دراز منزل کو منزل قذف و قذیف کہا جاتا ہے اسی طرح دور دراز شہر کو بَلْدَةٌ قَذِيْفَةٌ بول لیتے ہیں...... اور آیت کریمہ:

﴿فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ﴾ (۲۰۔۳۹) پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دو۔

کے معنی دریا میں پھینک دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا ﴿وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۳۳۔۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ (۲۱۔۱۸) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں۔

﴿يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ (۳۴۔۴۸) وہ اوپر سے حق اتارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

﴿وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ﴾ (۳۷۔۸) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی) وہاں سے نکال دینے کو۔

اور رَمْیٌ کی طرح قَذْفٌ کا لفظ بھی بطور استعارہ گالی دینے اور عیب لگانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[1]

(ق ر ر)

قَرَّ فِيْ مَكَانِهٖ يَقِرُّ قَرَارًا: (ض) کے معنی کسی جگہ ٹھہر جانے کے ہیں اصل میں یہ قُرٌّ سے ہے جس کے معنی سردی کے ہیں جو کہ سکون کو چاہتی ہے جیسا کہ اس

---

[1] فقذف المحصنات معناه رميهن بالزنا الا ان فی القرآن يرمون (۲۴۔٤)

کے برعکس حَرٌّ (گرمی) حرکت کو چاہتی ہے۔اور آیت کریمہ۔

﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (۳۳۔۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔

میں ایک قرأت وَقِرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اقررن ہے ایک راء کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت: فَظَلْتُم تَفَکَّھُوْنَ میں ظَلْتُمْ اصل میں ظَلَلْتُمْ ہے (اور ایک لام کو تخفیفا حذف کر دیا گیا ہے)

اَلْقَرَارُ (اسم) (ٹھہرنے کی جگہ) قرآن میں ہے۔

﴿جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (۴۰۔۶۴) (جس نے) زمین کو قرار گاہ بنایا۔

اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ﴾ (۲۳۔۵۰) جو رہنے کے لائق اور جہاں نتھرا ہوا پانی جاری تھا (پناہ دی) اور جہنم کے متعلق فرمایا:

﴿وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ (۱۴۔۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَھَا مِنْ قَرَارٍ﴾ (۱۴۔۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔اس کو ذرا بھی قرار نہیں۔میں......قرار کے معنی ثبات کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے۔ [1]

(۳۵۲) وَلَا قَرَارَ عَلٰی زَاْرٍ مِنَ الْاَسَدِ

یعنی شیر کے دھاڑنے پر امن (چین) حاصل نہیں ہوسکتا۔

اور یَوْمَ النَّحْرِ سے بعد کے دن کو یَوْمَ الْقِرِّ کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس روز منیٰ میں ٹھہرے رہتے ہیں۔

اِسْتَقَرَّ فُلَانٌ قرار پکڑنے کا قصد کرنا۔اور کبھی یہ بمعنی قَرَّ (قرار پکڑنا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا: ﴿خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا﴾ (۲۵۔۲۴) ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا اور جہنم کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّھَا سَآئَتْ مُسْتَقَرًّا﴾ (۲۵۔۶۶) اور دوزخ، ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ﴾ (۶۔۹۸) تمہارے لیے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی میں، ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مستودع سے مراد قبریں ہیں۔ابن عباسؓ کا قول ہے کہ مستقر سے مراد تو زمین ہی ہے لیکن مستودع سے مراد دنیا ہے۔الحاصل ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مستقر تام نہیں ہوسکتا۔

اَلْاِقْرَارُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو ٹھہرا دینے کے ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی﴾ (۲۲۔۵) اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔

اور کبھی اس کے معنی ثابت کرنا بھی آجاتے اور اقرار کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ان دونوں

---

[1] قاله النابغة فی الیته وصدره فبثت ان ابا قابوس اوعدنی...... والبیت فی دیوانه واللسان (قیس) وخاص الخاص ثعالبی ۷۶ والعشر للتبریزی (۳۰۲) والسیوطی (۲۸، ۷۸۵)

سے۔توحید اور دیگر ایمانیات کے بارے میں صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ دل سے بھی اقرار نہ کرے۔اقرار کی ضد انکار آتی ہے اور جحو د صرف زبان سے انکار کر دینے پر بولا جاتا ہے خواہ دل سے اسے تسلیم ہی کیوں نہ کرتا ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے [1]۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ (۲۔۸۴) پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم اس بات کے گواہ ہو۔

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا﴾ (۳۔۸۱) پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے۔تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اقرار پر میرا ذمہ لیا۔انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا۔

قَرَّتْ لَيْلَتُنَا تَقِرُّ: رات کا ٹھنڈا ہونا۔

يَوْمٌ قَرٌّ: (ٹھنڈا دن) لَيْلَةٌ قِرَّةٌ: (ٹھنڈی رات) قُرَّ فُلَانٌ فلاں کو سردی لگ گئی اور مَقْرُوْرٌ کے معنی ٹھنڈ زدہ آدمی کے ہیں۔مثل مشہور ہے۔[2] حِرَّةٌ تَحْتَ قِرَّةٍ یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو اپنے ضمیر کے خلاف بات کرے۔

قَرَرْتُ الْقِدْرَ اَقُرُّهَا: میں نے ہنڈیا میں ٹھنڈا پانی ڈالا۔اور اس پانی کو قَرَارَة یا قَرِره کہا جاتا ہے۔اِقْتَرَّ فُلَانٌ اِقْتِرَارًا: یہ تَبَرَّدَ کی طرح ہے۔جس کے معنی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے ہیں۔قَرَّتْ عَيْنُهٗ تَقَرُّ: آنکھ کا ٹھنڈا ہونا۔مراد خوشی حاصل ہونا ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا﴾ (۲۰۔۴۰) تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

اور جسے دیکھ کر انسان کو خوشی حاصل ہو اسے قُرَّةُ عَيْنٍ کہا جاتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ﴾ (۲۸۔۹) یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قُرٌّ بمعنی سردی سے ہے لہٰذا قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی آنکھ کے ٹھنڈا ہو کر خوش ہو جانے کے ہیں بعض نے کہا ہے۔کہ قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی خوش ہونا اس لیے آتے ہیں کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو چونکہ گرم ہوتے ہیں اس لیے بددعا کے وقت اَسْخَنَ اللّٰهُ عَيْنَهٗ کہا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ قرار سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز بخشے جس سے اس کی آنکھ کو سکون حاصل ہو یعنی اسے دوسری چیز کی حرص نہ رہے۔

اَقَرَّ بِالْحَقِّ: حق کا اعتراف کرنا۔تَقَرَّ الْاَمْرُ عَلٰى كَذَا: کسی امر کا حاصل ہو جانا۔

---

[1] راجع (ج ح د)

[2] اللسان (حر، قر) قال وإنما كسر والحرة مكان القرة والمثل ايضا في الحيوان (۵/۱۰۶) والميدانی ۱۲

اَلْقَارُوْرَۃُ: شیشہ جمع قَوَارِیْرُ...... قرآن پاک میں ہے:
﴿قَوَارِیْرَ مِنْ فِضَّۃٍ﴾ (۷۶۔۱۶) اور شیشے بھی چاندی کے۔ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ: یہ ایسا محل ہے جس میں (نیچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں (۲۷۔۴۴) یعنی شیشے کا بنا ہوا ہے۔

(ق ر ء)

قَرَءَتِ الْمَرْءَۃُ وَقَرَءَتِ الدَّمَ وَاَقْرَءَتْ:
عورت کو حیض آنا اور قَرَءَتُ الْجَارِیَّۃَ: استبراء رحم کرنا۔
القرء کے اصل معنی طہر سے حیض میں داخل ہونے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ طہر اور حیض دونوں کا جامع ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم دو چیزوں کے لیے بحیثیت مجموعی وضع کیا گیا ہو وہ ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جا سکتا ہے [1] مثلاً لفظ مَائِدَۃ کہ دستر خوان اور کھانا دونوں کے مجموعہ کے لیے وضع کیا گیا ہے مگر ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے لہٰذا قَرْءٌ نہ صرف حیض کا نام ہے اور نہ صرف طہر کا (بلکہ دونوں کے لیے وضع کیا گیا ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ جس عورت کو حیض نہ آتا ہو اسے ذَاتُ قَرْءٍ نہیں کہا جاتا اور ایسے ہی حائض، جسے متواتر خون آ رہا ہو اور نُفَسَاءُ (صاحب نفاس) کو بھی ذَاتُ قُرْءٍ نہیں کہتے اور آیت کریمہ:
﴿یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَۃَ قُرُوْءٍ﴾ (۲۔۲۲۸)
تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔
میں ثَلَاثَۃَ قُرُوْءٍ کے معنی تین مرتبہ طہر سے حالت حیض کی طرف منتقل ہونے کے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۸۱)
((اُقْعُدِیْ عَنِ الصَّلٰوۃِ اَیَّامَ اَقْرَائِكِ)) کہ حیض کے دنوں میں نماز ترک کر دے۔
یہ محاورہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے: اِفْعَلْ كَذَا اَیَّامَ وُرُوْدِ فُلَانٍ کہ فلاں آدمی کی آمد کے دنوں یہ اور یہ کام کرو تو یہاں بھی ایام کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ ورود تو ایک ساعت میں ہو جاتا ہے۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ قرء کا لفظ قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ تو انہوں نے زمانہ طہر اور زمانہ حیض کو جمع کرنے کے معنی کا اعتبار کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ زمانہ طہر میں خون رحم میں جمع ہوتا رہتا ہے۔
اَلْقِرَاءَۃُ کے معنی حرف وکلمات کو ترتیل میں جمع کرنے کے ہیں کیونکہ ایک حروف کے بولنے کو قراءت نہیں کہا جاتا اور نہ یہ عام ہر چیز کے جمع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اَجْمَعْتُ الْقَوْمَ کی بجائے قَرَءْتُ الْقَوْمَ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اَلْقُرْاٰنُ: یہ اصل میں کفران ورجحان کی طرح مصدر ہے چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ (۷۵۔۱۷۔۱۸) اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔
حضرت ابن عباسؓ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب ہم

---

[1] وعلی هذا الاطلاق کلاهما مجاز اوقد عده العلماء من الاضداد (اضداد ابی الطیب (۵۷۱۔۵۷۶)
[2] قاله صلی الله علیه وسلم لام حبیبة بنت جحش او فاطمة بنت ابی حبیش وکلا الحدیثین باختلاف الفاظهما اخرجهما اصحاب السنن (راجع العون (۱۱۔۱۲۲) اوالزرقانی علی الموطا (۲۱۔۲۴) انظر للبحث عن لفظ القرآن محازا ابی عبیدة من ۱۔۳ وعلیه سلك البخاری فی صحیحه فتح الباری (۸: ۳۴۰۔۳۳۹)

قرآن تیرے سینہ میں جمع کر دیں تو اس پر عمل کرو لیکن عرف میں یہ اس کتاب الٰہی کا نام ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل کی گئی اور یہ اس کتاب کے لیے بمنزلہ علم بن چکا ہے جیسا کہ توراۃ اس کتاب الٰہی کو کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ پر نازل کی گئی بعض علماء نے قرآن پاک کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ قرآن پاک چونکہ تمام کتب سماویہ کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس لیے اس کا نام قرآن پاک رکھا گیا ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۲۔۱۱۱) اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والا۔اور آیت کریمہ:

﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۶۔۸۹) کہ اس میں ہر چیز کا بیان مفصل ہے۔

میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔نیز فرمایا: ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ (۳۹۔۲۸) یہ قرآن پاک عربی ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں۔ ﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو جزو کر کے نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔

﴿فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (۱۷۔۴۱) اس قرآن پاک میں......اور آیت کریمہ:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷۔۷۸) اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو میں قرآن پاک کے معنی تلاوت قرآن کے ہیں۔

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (۵۶۔۷۷) یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے۔

اَقْرَءْتُ فُلَانًا كَذَا کے معنی کسی کو کچھ پڑھانے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ (۸۷۔۶) (ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ فراموش نہ کرو گے۔

اور تَقَرَّءْتُ بمعنی تَفَهَّمْتُ ہے۔(یعنی میں نے اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا)

قَارَأْتُهٗ: (مفاعلة) باہم مذاکرہ کرنا یا کتاب کا سبق دہرانا۔

(ق ر ب)

اَلْقُرْبُ وَالْبُعْدُ: یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔محاورہ ہے۔قَرُبْتُ مِنْهُ اَقْرُبُ وَقَرَبْتُهٗ اَقْرَبُهٗ قُرْبًا وَقُرْبَانًا: کسی کے قریب جانا اور مکان، زمان، نسبی تعلق، مرتبہ حفاظت اور قدرت سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ (۶۔۱۵۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى﴾ (۱۷۔۳۲) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ (۹۔۲۸) تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ ......﴾ (۲۔۲۲۲) ان سے

مقاربت نہ کرو۔ میں جماع سے کنایہ ہے۔

﴿فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ﴾ (۵۱۔۲۷) اور (کھانے کے لیے) ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱۔۱) لوگوں کے حساب (اعمال) کا وقت نزدیک پہنچا۔

﴿اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۰۹) اور مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ عنقریب آنے والی ہے یا اس کا وقت دور ہے۔

اور قرب نسبی کے متعلق فرمایا:

﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی﴾ (۴۔۸) اور جب میراث کی تقسیم کے وقت ...... غیر وارث) رشتے دار آ جائیں۔

﴿وَ لَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی﴾ (۶۔۱۵۲) گو وہ تمہارے رشتے دار ہی ہوں۔

﴿وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ (۸۔۴۱) اور اہل قرابت کا۔

﴿وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ (۴۔۳۶) اور رشتے دار ہمسایوں ﴿یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ (۹۰۔۱۵) یتیم رشتے دار کو...... اور قرب بمعنی رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا کے متعلق فرمایا:

﴿وَ لَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۴۔۱۷۲) اور نہ مقرب فرشتے (عار) رکھتے ہیں۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۳۔۴۵) (اور جو) دنیا اور آخرت میں آبرو والا اور (خدا کے) خاصوں میں سے ہوگا۔

﴿عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (۸۳۔۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

﴿فَاَمَّاۤ اِنْ کَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۵۶۔۸۸) پھر اگر وہ خدا کے مقربوں میں سے ہے۔

﴿قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّکُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ﴾ (۷۔۱۱۴) (فرعون نے) کہا: ہاں (ضرور) اور اس کے علاوہ تم مقربوں میں داخل کر لیے جاؤ گے۔

﴿وَقَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا﴾ (۱۹۔۲) اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔

اور اَلْقُرْبَةُ کے معنی قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کے بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ﴾ (۹۔۹۹) دیکھو وہ بے شبہ ان کے لیے (موجب) قربت ہے۔

﴿تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی﴾ (۳۴۔۳۷) کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں۔

اور رعایت ونگہبانی کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (۷۔۵۶) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔

﴿فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (۲۔۱۸۶) میں تو تمہارے پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا پکارتا ہے تو میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں اور قرب معنی قدرۃ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب

ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ﴾ (۵۶۔۸۵) اور ہم اس مرنے والے کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

میں بھی یہ ممکن ہے کہ قرب بلحاظ قدرت مراد ہو۔

اَلْقُرْبَانَ: (نیاز) ہر وہ چیز جس سے اللہ کی قرب جوئی کی جائے اور عرف میں قربان بمعنی نَسِيكَةُ یعنی ذَبِيحَةٌ آتا ہے اس کی جمع قَرَابِيْنُ ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ (۵۔۲۷) جب ان دونوں نے خدا کی جناب میں کچھ نیازیں چڑھائیں۔

﴿حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ﴾ (۳۔۱۸۳) جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی نیاز نہ لے کر آئے...... اور آیت کریمہ:

﴿قُرْبَانًا آلِهَةً﴾ (۴۶۔۲۸) تقرب خدا کے سوا معبود (بنایا تھا)

میں قُرْبَان کا لفظ قُرْبَانُ الْمَلِكِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بادشاہ کا ہم نشین اور ندیم خاص کے ہیں اور یہ واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے اور یہاں چونکہ جمع کے معنی میں ہے اس لیے اٰلِهَةً بلفظ جمع لایا گیا ہے۔

اَلتَّقَرُّبُ: ایسی چیز کا قصد کرنا جس سے دوسرے کے ہاں قدر و منزلت حاصل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کے قریب ہو جانا باعتبار مکان کے نہیں ہوتا بلکہ اس پر فضل و کرم اور فیض (خاص) جاری کرنا مراد ہوتا ہے۔اس لیے مروی ہے (۷۹) کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ باری تعالیٰ! کیا تو قریب ہے کہ میں تجھ سے مناجات کروں یا دور ہے کہ میں تمہیں پکاروں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر میں تیرے لیے دوری معین کردوں تو وہاں تک پہنچ نہیں سکے گا اور اگر قرب معین کردوں تو تجھے اس پر قدرت نہیں ہوگی۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔اور کسی بندہ کے مقرب الٰہی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت سی ایسی صفات اپنے اندر پیدا کرلے...... جن کے ساتھ ذات الٰہی متصف ہوتی ہے گو وہ صفات انسان میں اس درجہ نہ پائی جائیں جس درجہ میں کہ ذات الٰہی میں وہ صفات متحقق ہوتی ہیں۔مثلاً انسان، علم و حکمت حلم و رحمت اور بے نیازی جیسی صفات اپنے اندر پیدا کرلے اور یہ ان کے اضداد یعنی جہالت...... طیش و غضب اور احتیاج نفسانی کی میل کچیل سے پاک ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور یہ قرب جسمانی کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ قرب روحانی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶۔(۸۰)

((مَنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا)) کہ جو شخص بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ذراع یعنی ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور نیز ایک روایت میں ہے کہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعہ میرا قرب

---

❶ متفق علیه من حدیث ابی هريرة والحديث باختلاف الفاظه في المستدرك وابن ماجة عن ابی هريرة وانس وابی ذرو ابی سعيد والطبرافی عن سلمان وابی زر وابو نعيم عنه وابن شاهين في الترغيب عن ابن عباس (راجع كنز العمال ٤(١١٣۔١١٣٨) و(١١٧٨۔١١٨٤) وتخريج العراقی علی الاحياء (٩/٣)۔

حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔......اور آیت کریمہ:

﴿وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ﴾ (۶۔۱۵۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

میں لَا تَقْرَبُوْا کے لفظ میں جو بلاغت پائی جاتی ہے وہ تَنَاوَلُوْا کے لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی! کیوں کہ کسی چیز کو لینے سے منع کرنے کی بنسبت اس کے قریب جانے سے منع کرنے میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اسی لیے فرمایا ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ (۲۔۲۲۲) اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ میں قرب جماع سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:

﴿لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰی﴾ (۱۷۔۳) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

اَلْــقِــرَابُ: (مصدر) بمعنی مقابت ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۳۵۳) فَاِنَّ قِرَابَ الْبَطْنِ یَكْفِیْكَ مِلْؤُهٗ قَدَحٌ

قَرْبَانُ: تقریباً بھرا ہوا پیالہ۔

اور قِرْبَانُ الْمَرْءَةِ: عورت سے مجامعت کرنا۔ تَقْرِیْبُ الْــفَــرَسِ: گھوڑے کا دُلکی دوڑنا ایک رفتار جو دوڑ کے قریب ہوتی ہے)۔ اَلْقُرَاب: قریب۔

فَرَسٌ لَا حِقُ الْاَقْرَابِ: گھوڑا جس کی تہی گاہیں پچکی ہوئی ہوں۔

اَلْقِرَابُ: تلوار کی نیام بعض کا قول ہے کہ قِراب نیام کو نہیں کہتے بلکہ نیام کے اوپر کے چمڑے کو کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُبٌ ہے اور قَرَبْتُ السَّیْفَ وَاَقْرَبْتُهٗ کے معنی تلوار کو نیام کے اندر بند کرنے کے ہیں۔

رَجُلٌ قَارِبٌ: آدمی جو پانی کے قریب پہنچ جائے۔ لَیْلَةُ الْقُرْبِ: عرب لوگ اونٹ چراتے چراتے پانی کی طرف چلے جاتے جب ان کے اور پانی کے درمیان ایک شب کا سفر باقی رہ جاتا تو عجلت سے سفر کرتے لہٰذا اس رات کو لَیْلَةُ الْقُرْبِ کہتے چنانچہ اسی سے اَقْرَبُوْا اِبِلَهُمْ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی لَیْلَةُ الْقُرْبِ میں اونٹوں کو پانی کی طرف ہنکانے کے ہیں۔

اَلْمُقْرِبُ: حاملہ عورت جو قریب الولادت ہو۔

(ق ر ح)

اَلْــقَــرْحُ: (بفتح القاف) کسی خارجی اثر سے ہونے والے زخم کو قَــرْح کہا جاتا ہے اور اندرونی طور پر ہونے والے زخم (جیسے پھنسی وغیرہ کا زخم) کو قُــرْحٌ۔ قَرَحْتُهٗ (ف) کے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔ مگر کبھی لازم بھی آتا ہے جیسے قَرِحَ قَلْبُهٗ: (اس کا دل زخمی ہو گیا)

---

[1] قاله هلال بن خثعم وتمامه: ويكفيك عورات الامور احتنا بها والبيت فی امالی المرتضی (۱ : ۳۷۹) والحيوان (۱ : ۳۸۲) فی اربعة والبخلا (۲۰۲) ويروى لقيس بن خطيم وفی العيون (۳ : ۱۸٤) البشار بن بشر ولكنه مجهول ولم يعرف لهذا الاسم ای شاعر وفی حماسة البحری (طبعه اروبا البيت لزياد بن منقذ التميمی وفی مجموعة المعانی رافع بن خميصه وفی رواية لسوء ات الامور كما فی الاحيا للغزالی (۳ : ۲٤۰) فی ثلاثة ابيات وفيه قصه ابی محمد اليزيدی مع هارون وفی الحماسة لابن الشجری والمعانی للقبتی والامالی "ملاه" بالنصب علی التميز وهو الصواب وفی المطبوع يكفيك بالموحدة مصحف ۱۲۔

وَاَقْرَحْتُہٗ: اسے زخمی کیا وقَرِحَ (س) زخمی ہو جانا۔
کبھی قَرْحٌ کا لفظ زخم اور قُرْحٌ اس درد والم پر بولا جاتا ہے جو زخم کی وجہ سے ہو قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳۔۱۷۲) باوجود زخم کھانے کے۔
﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۳۔۱۴۰) اگر تمہیں زخم (شکست) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے۔
ایک قراءت میں قُرْحٌ بضمہ قاف ہے۔
اَلْقَرْحَانُ: وہ شخص جو کبھی چیچک وطاعون، جدری وغیرہ بیماری میں مبتلا نہ ہوا ہو۔
فَرَسٌ قَارِحٌ: گھوڑا جس کے ناب (دانت) جو سب دانتوں سے آخر میں نکلتے ہیں ظاہر ہو گئے ہوں مونث قَارِحَةٌ اَقْرَحُ: گھوڑا جس کی پیشانی میں سفید نشان ہو۔
رَوْضَةٌ قَرْحَاءُ: سبزہ زار جس کے وسط میں سفید پھول ہو گویا وہ اَقْرَحُ: گھوڑے کے مشابہ ہے اِقْتَرَحْتُ الْجَمَلَ: کسی اونٹ پر پہلے پہل سواری کرنا اِقْتَرَحْتُ كَذَا عَلٰی فُلَانٍ کسی کے سامنے پہلی مرتبہ کسی رائے کا اظہار کرنا۔ اِقْتَرَحْتُ بِئْرًا: میں نے کنوئیں سے خالص پانی نکالا اَرْضٌ قَرَاحٌ اور سرزمین جس میں نہ گھاس ہو اور نہ پانی۔ اَلْقَرِيْحَةُ: پہلا پانی جو کنوئیں سے نکالا جاتا ہے اور اسی سے قَرِيْحَةُ الْاِنْسَانَ مستعار ہے جس کے معنی انسان کی طبیعت کے ہیں۔

(ق ر د)

اَلْقِرْدُ: بندر اس کی جمع قُرُوْدٌ وقِرَدَةٌ ہے۔
اور آیات کریمہ۔
﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ (۲۔۶۵) ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔
﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ﴾ (۵۔۶۰) اور جن کو ان میں سے بندر...... بنا دیا۔
کو بعض نے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے یعنی انہیں سچ مچ بندر بنا دیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ انکے اخلاق واطوار بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ مچ بندر بنا دیے گئے تھے۔ [1]
اَلْقُرَادُ چیچڑی۔ جمع قِرْدَانٌ۔
صُوْفٌ قَرِدٌ: الجھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جا سکے) اسی سے تہ بر تہ چھائے ہوئے بادل کو سَحَابٌ قِرَدٌ کہا جاتا ہے۔
اَقْرَدُ: چیچڑی کی طرح زمین کے ساتھ چمٹ جانا۔ قَرِدَ چیچڑی کی طرح ساکن ہو جانا۔ اور قَرَّدْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنے کے ہیں۔ (ازالہ ماخذ) جیسے قَذَّيْتُ وَمَرَّضْتُ کا محاورہ ہے۔ اور استعارہ کے طور پر قَرَّدَ کے معنی چاپلوسی کے ذریعہ کسی کو دھوکا دینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يُقَرِّدُ فُلَانًا۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قُرَادٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل بھی چیچڑ جیسی ہوتی ہے۔

(ق ر ض)

اَلْقَرْضِ: (کرتا) یہ قطع کی ایک قسم ہے پھر جس طرح کسی جگہ سے گزرنے اور تجاوز کرنے لیے قَطَعَ الْمَكَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس طرح قَرَضَ

[1] کذا قال مجاهد المعنی الاول ذهب الیه ابن عباس وغیره راجع انوار التنزیل واسرار التاویل للبیضاوی۔

اَلْمَکَانَ بھی کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُھُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (۱۸۔۱۷) اور جب غروب ہوتو اس سے بائیں طرف کترا جائے۔
یعنی غروب کے وقت انہیں ایک جانب چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔
اور قرض اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو (اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے) دیا جائے اس شرط پر کہ وہ واپس مل جائے گا۔قرآن پاک میں ہے:﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲۔۲۴۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے؟
اور شعر گوئی کو بھی مُقَارَضَۃٌ کہا جاتا ہے اور شعر کو بطور استعارہ قَرِیْضٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ نَسْجٌ اور حَوْكٌ کے الفاظ اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ق ر ط س)

اَلْقِرْطَاسُ: ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ﴾ (۶۔۷) اور اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب نازل کرتے۔
﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ﴾ (۶۔۹۱) کہو کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (میں نقل) کر رکھا ہے۔

(ق ر ع)

اَلْقَرْعُ: (ف) کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنے کے ہیں اسی سے قَرَعَتَهٗ بِالْمِقْرَعَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کوڑے سے سرزنش کرنے کے ہیں (اور قیامت کے حادثہ کو قَارِعَۃٌ کہا گیا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ﴾ (۶۹۔۴) (وہی) کھڑکھڑانے والی (جس کو ثمود اور عاد (دونوں نے جھٹلایا)۔
﴿اَلْقَارِعَةُ ۔ مَا الْقَارِعَةُ﴾ (۱۰۱۔۱،۲) کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔

(ق ر ف)

اَلْقَرْفُ وَالْاِقْتِرَافُ کے اصل معنی کریدنے کے ہیں اور جو چھال یا چھلکا اتارا جاتا ہے۔اسے قرف کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ اِقْتَرَفَ (افعال) کمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ وہ سب اچھا ہو یا برا، جیسے فرمایا﴿سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۲۰) وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔
﴿وَ لِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۱۳) اور جو کام وہ کرتے تھے وہی کرنے لگیں۔
﴿وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا﴾ (۹۔۲۴) اور مال جو تم کماتے ہو۔
لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے پر ہوتا ہے اسی بنا پر محاورہ ہے اَلْاَعْتِرَافُ مُزِیْلُ الْاِقْتِرَافِ کہ اعتراف جرم، جرم کو مٹا دیتا ہے قَرَفْتُ فُلَانًا بِكَذَا میں نے فلاں پر تہمت لگائی اور آیت کریمہ:﴿وَ لِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ (۶۔۱۱۳) کو بھی بعض نے اسی معنی پر محمول کیا ہے۔فَلَانٌ قَرَفَنِیْ: فلان نے مجھ پر تہمت لگائی۔

رَجُلٌ مُقْرِفٌ: دوغلا آدمی۔ قَارَفَ فُلَانٌ اَمْرًا اس نے برے کام کا ارتکاب کیا۔

(ق ر ن)

اَلْاِقْتِرَانُ۔ اِزْدِوَاجٌ کی طرح اِقْتِرَانٌ کے معنی بھی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے کسی معنی میں باہم مجتمع ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ﴾ (۴۳۔۵۳) یا یہ ہوتا کہ فرشتے جمع ہو کر اس کے ساتھ آتے۔

قَرَنْتُ الْبَعِيْرَ مَعَ الْبَعِيْرِ: دو اونٹوں کو ایک رسی کے ساتھ باندھ دینا اور جس رسی کے ساتھ ان کو باندھا جاتا ہے اسے قَرَنٌ کہا جاتا ہے اور قَرَّنْتُهٗ (تفعیل) میں مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ﴾ (۳۸۔۳۸) اور اوروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور وہ آدمی جو دوسرے کا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور دیگر اوصاف میں اس کا ہم پلہ ہو اسے اس کا قرن کہا جاتا ہے اور ہم پلہ یا ہم سر کو قریب بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ قِرْنُ فُلَانٍ اَوْ قَرِيْنُهٗ: فلاں اس کا ہم عمر یا ہم سر ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ﴾ (۳۷۔۵۱) کہ میرا ایک ہم نشین تھا۔

﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَىَّ عَتِيْدٌ﴾ (۵۰۔۲۳) اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا یہ (اعمال نامہ) میرے پاس تیار ہے۔

یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے دوسری جگہ شہید (گواہ) کہا ہے۔

﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ﴾ (۵۰۔۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا۔

﴿فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ (۴۳۔۳۶) تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

قَرِيْنٌ کی جمع قُرَنَآءَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ﴾ (۴۱۔۲۵) اور ہم نے شیطان کو ان کا ہم نشین مقرر کر دیا۔

ایک زمانہ کے لوگ یا امت کو قَرْنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع قُرُوْنٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۱۰۔۱۳) اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو...... ہلاک کر چکے ہیں۔

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ﴾ (۱۷۔۱۷) اور ہم نے...... بہت امتوں کو ہلاک کر ڈالا۔

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (۱۹۔۷۴، ۹۸) اور ہم نے ان سے پہلے بہت امتیں ہلاک کر دیں۔

﴿وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا﴾ (۲۵۔۳۸) اور ان کے درمیان اور بہت سی جماعتوں کو بھی...... ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ﴾ (۲۳۔۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔ ﴿قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ﴾ (۲۳۔۴۲) اور جماعتیں...... اَلْقُرُوْنُ (بفتح القاف) کے معنی نفس کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے نیز قَرُوْنٌ وہ اونٹ ہے جو چلتے وقت پچھلے پاؤں اگلے پاؤں کی جگہ پر رکھے گویا وہ ان کو باہم ملا رہا ہے۔

قَرَنٌ: ترکش جب کہ کمان کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ نَاقَةٌ قَــرُوْنٌ: وہ اونٹنی جس کے پچھلے تھن باہم ملے ہوئے ہوں۔

اَلْـقِرَانُ ...... حج اور عمرہ کو جمع کرنا اور مطلق دو چیزوں کے جمع کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قَرْنٌ: جانور کا سینگ۔ کَبْشٌ اَقْرَنُ: سینگوں والا مینڈھا مؤنث قرناء تشبیہ کے طور پر عورت کے عَـفْلَة کو بھی قَرْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سینگ کی شکل کا ایک مادہ ہوتا ہے جس سے مرد کے عضو مخصوص کو مجامعت کے وقت اس طرح تکلیف محسوس ہوتی ہے گویا اسے سینگ چبھ رہا ہے۔ قَـرَنُ الْجَبَلِ: پہاڑ کا ابھرا ہوا حصہ۔ قَـرْنُ الْـمَرْءَ ةِ عورت کے گیسو قَرْنُ الْمِرْاٰةِ: آئینے کا فریم۔

قَرْنُ الْفَلَاةِ: جنگل کا کنارہ۔ قَرْنُ الشَّمْسِ: آفتاب کا کنارہ۔ قَـرْنُ الشَّیْطَانِ: شیطان کے سینگ الغرض ان تمام محاوروں میں قرن کا لفظ بطور تشبیہ کے استعمال ہوا ہے۔ اور ذُوْالْقَرْنَیْنِ ایک مشہور بادشاہ کا لقب تھا (جس کا قصہ سورہ کہف ۸۳تا۹۸ میں مذکور ہے)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا [1] (۸۱)((اِنَّ لَكَ بَیْتًـا فِـی الْـجَـنَّةِ وَاِنَّكَ لَـذُوْ قَرِیْنِهَا)) کہ جنت میں تمہارے لیے ایک مکان مخصوص ہے اور تم اس امت کے ذوالقرنین ہو یعنی بلحاظ مرتبہ کے اس امت میں ذوالقرنین کی مثل ہو۔

(ق ر ی)

اَلْــقَـرْیَةُ: وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ پر انفراداً بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاسْــئَلِ الْـقَـرْیَةَ﴾ (۱۲۔۸۲) اور...... بستی سے دریافت کر لیجیے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کا لفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لیے ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قَرْیَةٌ کے معنی ہی باشندوں کے ہیں (لہٰذا اہل کا لفظ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں) چنانچہ اسی معنی میں فرمایا ﴿وَضَـرَبَ الـلّٰــهُ مَثَــلًا قَـرْیَةً كَـانَتْ اٰمِنَةً مُّـطْـمَـئِنَّةً﴾ (۱۶۔۱۱۲) اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی ﴿وَكَـاَیِّنْ مِـنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِكَ﴾ (۴۷۔۱۳) اور بہت سی بستیاں تمہاری بستی سے...... زور و قوت میں کہیں بڑھ کر تھیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَـا كَانَ رَبُّكَ لِیُهْلِكَ الْقُرٰی﴾ (۱۱۔۱۱۷) اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو...... تباہ کر دے۔

میں القری ایک خاص شہر کا نام ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَ مَـآ اَرْسَـلْـنَـا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْ اِلَیْهِـمْ مِّـنْ اَهْلِ الْقُرٰی﴾ (۱۲۔۱۰۹) اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں مرد ہی بھیجے تھے۔ جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

میں بھی القریٰ شہر کا نام ہے۔ نیز فرمایا:

[1] الحدیث فی الفائق (۲/۳۲۷) وغریب ابی عبید (۳/۷۸) والضمیر فی قرنیها یعود الی الامة والعود الی المضمر اکثر فی القرآن وکلام العرب ۱۲۔

﴿رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ (۴۔۷۵) اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس شہر سے، جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا۔

حکایت کی گئی ہے کہ ایک قاضی، علی بن حسینؒ کے پاس آیا علی بن حسینؒ نے اس سے دریافت کیا کہ آیت ﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (۳۴۔۱۸) اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی، ایک دوسرے کے متصل دیہات بنائے تھے۔

کے متعلق تمہارے علماء کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ القریٰ سے مکہ مراد لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: کہ تم نہیں جانتے کہ اس سے وہاں کے لوگ مراد ہیں تو میں (قاضی) نے کہا کہ کتاب اللہ میں اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ جہاں قریۃ سے مراد لوگ ہوں اس پر انہوں نے فرمایا کہ تم نے آیت کریمہ ﴿وَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ﴾ (۶۵۔۸) اور بہت سی بستیوں کے رہنے والوں نے اپنے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے احکام کی سرکشی کی۔

نہیں پڑھی (یعنی یہاں قریۃ سے لوگ مراد ہیں)

﴿وَ تِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ (۱۸۔۵۹) اور یہ بستیاں (جو ویران پڑی ہیں) جب انہوں نے (کفر سے) ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (۲۔۵۸) اور جب ہم نے ان سے کہا اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ

قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ: میں نے حوض میں پانی جمع کیا............

قَرَيْتُ الضَّيْفَ قِرًى: میں نے مہمان کی مہمانی کی

قَرَى الشَّيْءَ فِيْ فَمِهٖ مِنْهُ: منہ میں کوئی چیز جمع کرنا۔

قَرَيَانُ الْمَاءِ: پانی جمع ہونے کی جگہ۔

(ق س س)

اَلْقِسُّ وَالْقِسِّيْسُ کے معنی رؤسائے نصاریٰ میں سے خدا پرست عالم کے ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا﴾ (۵۔۸۲) یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی۔

اصل میں قُسٌّ کے معنی رات کے وقت کسی چیز کی جستجو کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

تَقَسَّسْتُ اَصْوَاتَهُمْ بِاللَّيْلِ: میں نے رات کے وقت ان کی آوازوں کی جستجو کی۔

اَلْقَسْقَاسُ وَالْقَسْقَسُ کے معنی رات کے وقت رہنمائی کرنے والے کے ہیں۔

(ق س ر)

اَلْقَسْرُ (ن) کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔

قَسَرْتُهٗ وَاقْتَسَرْتُهٗ: میں نے اسے مجبور کیا۔

اسی سے اَلْقَسْوَرَةُ ہے جس کے معنی شیر کے ہیں نیز تیر انداز اور شکاری کو بھی قسورۃ کہتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ (۷۵۔۵۱) یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ قَسْوَرَة سے مراد شیر ہے اور بعض نے تیر انداز اور بعض نے شکاری مراد لیا ہے [1]۔

---

[1] وفی الطبری ذهب الی الاول: ابوهريرة وابن عباس وزيد بن السلم الی الثانی: عكرمة ومجاهد والی الثالث: سعيد بن جبير (انظر انظری ۲۹/۱۶۹)

(ق س ط)

اَلْقِسْط (اسم) تَصْفٌ ونَصَفَةٌ کی طرح قِسْط بھی بمعنی بر عدل حصہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ﴾ (۱۰۔۴) تاکہ ایمان والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔

اور قسط کے معنی دوسرے کا حق مارنا بھی آتے ہیں اس لیے یہ ظلم اور جور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اَلْقَسْطُ: پاؤں میں ٹیڑھا پن یہ اَفْجَحُ کی ضد ہے جس کے معنی پاؤں کے اگلے حصہ کی جانب سے ان کے نزدیک اور ایڑیوں کی جانب سے دور ہونے کے ہیں اَلْاِقْسَاطُ: اس کے اصل معنی کسی کو اس کا حق دینے کے ہیں اسی چیز کا نام انصاف ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ قَسَطَ الرَّجُلُ (فَهُوَ قَاسِط) کے معنی ظلم کرنے اور اَقْسَطَ کے معنی انصاف کرنے کے ہیں۔ [1] قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (۷۲۔۱۵) اور گنہگار ہوئے وہ دوزخ کا ایندھن بنے۔

﴿وَاَقْسِطُوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (۴۹۔۹) اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تَقَسَّطْنَا بَيْنَنَا: ہم نے (کسی چیز کو) آپس میں برابر تقسیم کرلیا۔

چنانچہ اَلْقِسْطَاس، ترازو کو کہتے ہیں اور لفظ میزان کی طرح اس سے بھی عدل وانصاف کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ (۱۷۔۳۵) اور جب تول کر دو۔ تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔

(ق س م)

اَلْقَسْمُ وَالْقِسْمَةُ (ض) کے معنی کسی چیز کے حصے کرنے اور بانٹ دینے کے ہیں۔ مثلاً قِسْمَةُ الْمِيْرَاثِ: ترکہ کو وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا۔ قِسْمَةُ الْغَنِيْمَةِ: مال غنیمت تقسیم کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴾ (۱۵۔۴۴) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے جماعتیں تقسیم کردی گئیں ہیں۔

﴿وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ﴾ (۵۴۔۲۸) اور ان کو آگاہ کردو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کردی گئی ہے۔

اِسْتَقْسَمْتُهٗ کے معنی کسی سے تقسیم چاہنا ہیں اور کبھی یہ بمعنی قسم (تقسیم کرنا) بھی آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ (۵۔۳) اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

رَجُلٌ مُنْقَسِمُ الْقَلْبِ: وہ آدمی جس کا دل تفکرات سے پریشان ہو گویا تفکرات نے اس کے دل کو تقسیم کرلیا ہے۔ یہ مُتَوَزَّعُ الْخَاطِرِ وَمُشْتَرِكُ اللُّبِّ کی طرح کا محاورہ ہے۔

اَقْسَمَ (افعال) کے معنی حلف اٹھانے کے ہیں یہ دراصل

---

[1] وبه صرح ابن السكيت فی الاقتضاب وابوعبيدة فی اضداده البحر المحيط (۲/۳۵۱۔۳۵۲)

قَسَامَةٌ سے مشتق ہے اور قَسَامَة ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو اولیائے مقتول پر تقسیم کی جاتی ہیں پھر مطلق قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے ❶ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (۱۶۔۱۳۸)

اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿أَهٰٓؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ﴾ (۷۔۴۹) کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے۔

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۷۵۔۲،۱) ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی۔

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ (۷۰۔۴۰) ہمیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ﴾ (۶۸۔۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم صبح ہوتے اس کا میوہ توڑ لیں گے۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ﴾ (۵۔۱۰۶) اور دونوں خدا کی قسمیں کھائیں۔

قَاسَمْتُهٗ وَتَقَاسَمَا: باہم قسمیں اٹھانا قرآن پاک میں ہے۔﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (۷۔۲۱) اور ان کو قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ (۲۷۔۴۶) کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ۔

فَلَانٌ مُقَسَّمُ الْوَجْهِ اَوْ قَسِيْمُ الْوَجْهِ کے معنی خوبرو کے ہیں اور اَلْقَسَامَةُ بمعنی حسن۔اصل میں یہ قِسْمَةٌ سے ہے گویا ہر عضو کو اس کے مناسب حال حسن سے بہرہ ور کیا ہے۔اس لیے ان میں یگانگت پیدا ہوگئی ہے اور عدم تناسب نظر نہیں آتا بعض نے کہا ہے کہ خوب رو کو مُقَسَّمٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حسن سے نظر کو تقسیم کر لیتا ہے یعنی نظر جسم کے کسی ایک حصہ پر جم کر نہیں رہ جاتی (بلکہ ہر عضو کی طرف بار بار منتقل ہوتی رہتی ہے) اور آیت کریمہ:

﴿كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ﴾ (۱۵۔۹۰) جس طرح ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے تقسیم کر دیا۔ میں مُقْتَسِمِيْن سے وہ لوگ مراد ہیں جو مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔تاکہ نو وارد لوگوں کو اسلام سے روکیں اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے نہ دیں۔بعض کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے پر قسمیں کھائی تھیں۔❷

(ق س و)

اَلْقَسْوَةُ کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حَجَرٌ قَاسٍ سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔

اَلْمُقَاسَاةُ: سختی جھیلنا۔قرآن پاک میں ہے:﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (۲۔۷۴) پھر..... تمہارے دل سخت ہو گئے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

---

❶ وایضاً قسم یطلق علی الدلیل والشھاوۃ کما فی قولہ تعالیٰ وانّہٗ لقسم لو تعلمون عظیم (۵۶۔۷۶)۔

❷ وبہ قال مقاتل والفراء واختارہ البیضاوی وقال ابن عباس وعکرمۃ المرادبہ اھل الکتاب وقال زید بن اسلم المراد منہ قوم صالح تقاسموا علی قتلہ قسموا مقتسمین والتفصیل فی الطبری والقرطبی۔

(۳۹۔۲۲) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔

﴿وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (۲۲۔۵۳) اور جن کے دل سخت ہیں۔

﴿وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَسِيَةً﴾ (۵۔۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرأت میں قَسِيَّةً ہے [1] یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ دِرْهَمٌ قَسِيٌّ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھوٹے درہم کے ہیں جس میں (سکہ کی) ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)

(۳۵۴) صَاحَ الْقَسِيَّاتُ فِيْ اَيْدِيْ الصَّيَارِيْفِ

کھوٹے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

(ق ش ع ر)

اَلْقَشْعَرَةُ: رونگٹے کھڑے ہونا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ (۳۹۔۲۳) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ اس سے ان کے بدنوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

(ق ص ص)

اَلْقَصُّ کے معنی نشان قدم پر چلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ قَصَصْتُ اَثَرَهٗ: یعنی میں اس کے نقش قدم پر چلا اور قصص کے معنی نشان کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸۔۶۴) تو وہ اپنے اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔

﴿وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ﴾ (۲۸۔۱۱) اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔

اسی سے قَصِيْصٌ ہے جس کے معنی اس باقی ماندہ گھاس کے ہیں جس سے کھوج لگایا جا سکے۔

قَصَصْتُ ظُفْرَهٗ: میں نے اس کے ناخن تراشے۔

اَلْقَصَصُ کے معنی اخبار متتبعہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ﴾ (۳۔۶۱) یہ تمام بیانات صحیح ہیں۔

﴿فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ﴾ (۱۲۔۱۱۱) ان کے قصے میں...... عبرت ہے۔

﴿وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ﴾ (۲۸۔۲۵) اور ان سے اپنا ماجرا بیان کیا۔

﴿نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (۱۲۔۲) تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ﴾ (۷۔۷) پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے۔

﴿يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ﴾ (۲۷۔۷۶) بنی اسرائیل کے سامنے...... بیان کر دیتا ہے۔

﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ﴾ (۷۔۱۷۶) تو ان سے یہ قصہ بیان کر دو۔

اَلْقِصَاصُ کے معنی خون کا بدلہ دینے کے ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ (۲۔۱۷۹) حکم

---

[1] وھی قراءۃ اھل الکوفۃ ۱۲۔

[2] قالہ ابو زبید الطائی فی قصیدۃ یرثی بھا عثمان بن عفان الخلیفہ۔ وصدرھا لھا صو اھل فی صم السلام کما۔ والسلام معناہ الصخر والبیت من شواھد الطبری (۶: ۱۵۵) واللسان (قسا) والا مالی (۱: ۲۷) اللالی (۱: ۱۲۸) والبحر (۳: ۴۴۵) والمعانی (۴۔۱۲) وبعض الابیات من الرثاء ایضا فی اللسان (۰امر) راجع السمط (۹۴۱) ۱۲

قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ (۵۔۴۵) سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔

محاورہ ہے: قَصَّ فُلَانٌ فُلَانًا وَضَرَبَهٗ ضَرْبًا فَاَقَصَّهٗ: فلاں کو (مار مار کر) مرنے کے قریب کر دیا۔

القص کے معنی چونہ کے ہیں۔ حدیث میں ہے [1] (۱۸۱) ((نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَقْصِيْصِ الْقُبُوْرِ)) کہ رسول اللہ نے قبروں کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

(ق ص د)

اَلْقَصْدُ: (ض) راستہ کا سیدھا ہونا۔ محاورہ ہے قَصَدْتُ قَصْدَهٗ: میں اس کی طرف سیدھا گیا۔ اسی سے اِقْتِصَادٌ ہے اور اِقْتِصَاد دو قسم پر ہے (ق) محمود على الاطلاق: جو افراط وتفریط کے درمیان میں ہو جیسے سخاوت، جو اسراف اور بخل کے مابین کو کہتے ہیں اور شجاعت جو لا پرواہی اور بزدلی کے درمیانی درجہ کا نام ہے چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ (۳۱۔۱۹) اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا۔

اور اقتصاد کی اسی نوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا...... الاية﴾ (۲۵۔۶۷) یعنی اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔

(۲) قصد کا لفظ کنایہ کے طور پر ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جس کے محمود اور مذموم ہونے میں شبہ ہو یعنی جو نہ بالکل محمود ہو اور نہ بالکل مذموم بلکہ ان کے درمیان میں ہو۔ مثلاً ایک چیز عدل وجور کے مابین ہو چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ (۳۵۔۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں۔

اسی طرح درمیانی مسافت پر بھی قصد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت ﴿وَسَفَرًا قَاصِدًا﴾ (۹۔۴۲) اور سفر بھی ہلکا سا ہوتا۔ میں قاصدا کے معنی معتدل سفر کے ہیں جو زیادہ دور کا نہ ہو اور بعض نے اس کا معنی سفر قریب لکھا ہے۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں۔ اَقْصَدَ السَّهْمُ: تیر کا لگ کر فوراً ہلاک کر دینا۔ گویا اس نے اپنے قصد کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے [2] (الکامل)

(۳۵۵) فَاَصَابَ قَلْبَكَ غَيْرَ اَنْ لَمْ يُقْصِدِ وہ تیرے دل پر لگا لیکن اس نے قتل نہیں کیا۔ اِنْقَصَدَ الرُّمْحُ کے معنی نیزہ ٹوٹ جانے کے ہیں اور تَقَصَّدٌ بمعنی تَكَسُّرٌ کے ہیں۔

قَصَدَ الرُّمْحَ: نیزہ توڑ دیا۔

نَاقَةٌ قَصِيْدٌ: گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی۔ اَلْقَصِيْدُ کم از کم سات اشعار کی نظم۔

(ق ص ر)

اَلْقِصَرُ: یہ طول کی ضد ہے اور یہ دونوں اسمائے نسبتی سے ہیں جو ایک دوسرے پر قیاس کے ذریعہ سمجھے

---

[1] رواه احمد فی مسنده (۷۸/۸) من رواية ام سلمة وفی معناه روايات فی السنن (مجمع الزوائد ۶۱/۳)

[2] قاله النابغة فی قصيدة فی وصف المجردة امرءة نعمان مطلعها امن آل ميته رائح او مغتدی۔ عجلان ذا زاد وغير مزود وصدر البيت: فی اثر غانية امتك بسهمها والقصيدة فی ديوانه (۳۴۔۳۹) والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (۲: ۱۱) واللسان قصد والعقد الثمين ۹ فی ۳۳۔بيتا والعينی (۱: ۸۲)

جاتے ہیں۔
قَصَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو کوتاہ کرنے کے ہیں اور تقصیر کے معنی کوتاہی اور سستی کے ہیں اور قَصَرْتُ كَذَا کے معنی سکیڑنے اور کسی چیز کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ملانا کے بھی آتے ہیں۔اسی سے قَصْر بمعنی محل ہے اس کی جمع قُصُوْرٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ﴾ (۲۲۔۴۵) اور بہت سے محل۔
﴿وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا﴾ (۲۵۔۱۰) نیز تمہارے لیے محل بناوے گا۔
﴿اِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ﴾ (۷۷۔۳۲) اس سے آگ کی اتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں اٹھتی ہیں جیسے محل۔
بعض نے کہا ہے کہ قصر جمع ہے اور اس کے معنی درخت کی جڑوں کے ہیں۔اس کا واحد قصرۃ ہے جیسے جَمْرَةٌ وَجَمْرٌ اور ان شراروں کو قصر کے ساتھ تشبیہ دینا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ان کو۔
﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷۔۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔
کہا ہے اور قَصَرْتُهٗ کے معنی محل میں داخل کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد الٰہی ہے۔
﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ (۵۵۔۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔
قَصَرَ الصَّلٰوةَ: بموجب رخصت شرعی کے نماز کے بعض ارکان کو ترک کر کے اسے کم کر کے پڑھنا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾ (۴۔۱۰۱) تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو۔قَصَرْتُ اللِّقْحَةَ عَلٰى فَرَسِيْ: اونٹنی کا دودھ اپنی گھوڑی کے لیے مخصوص کر دیا۔
قَصَرَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ: تیر کا نشانے تک نہ پہنچنا۔
اِمْرَءَةٌ قَاصِرَةُ الطَّرْفِ وہ عورت جو نا جائز نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ (۳۷۔۴۸) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں۔
قَصَّرَ شَعْرَهٗ: بال کتروانا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ﴾ (۴۸۔۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور بال کتروا کر۔
قَصَرَ فِيْ كَذَا: کسی کام میں سستی کرنا۔قَصَرَ عَنْهُ: کسی کام میں سستی کرنا۔قَصَرَ عنه: باوجود قدرت کے کوئی کام کرنے سے باز رہنا[1]۔
اِقْتَصَرَ عَلٰى كَذَا: تھوڑی چیز پر اکتفا کرنا۔
اِقْتَصَرَتِ الشَّاةُ: بوڑھا ہونے کی وجہ سے بکری کے دانتوں کے اطراف کا کوتاہ ہو جانا۔
اَقْصَرَتِ الْمَرْءَةُ: چھوٹے قد کی اولاد جننا۔تِقْصَارٌ چھوٹا سا ہار۔
اَلْقَوْصَرَةُ: کھجور ڈالنے کی زنبیل جو کھجور کے پتوں یا نرکل کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

(ق ص ف)

اَلْقَاصِفُ: (بادسخت شکنندہ) تیز اور سخت ہوا۔جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی ہوئی چلی جائے۔

---

[1] ومنه قوله تعالىٰ ﴿ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ﴾ (۷۔۲۰۲)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ﴾ پھر تم پر تیز ہوا چلائی۔

رَعْدٌ قَاصِفٌ: بڑے زور کی گرج۔جس کی آواز میں تکرار ہو۔اسی سے معازف یعنی آلات موسیقی کی آواز کو قَصْفٌ کہا جاتا ہے اور مجازا ہر قسم کے لہو کو قَصَفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ق ص م)

اَلْقَصْمُ: (ض) کے معنی ہلاک کرنے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ (۲۱۔۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر مارا۔

یعنی انہیں توڑ مروڑ کر ریزہ ریزہ اور ہلاک کر دیا۔ اور ہلاکت کو قَاصِمَةُ الظَّهْرِ کہا جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى﴾ (۲۸۔۵۹) اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے۔

اَلْقُصَمُ: وہ آدمی جو ہر مقاومت کرنے والے کو توڑ ڈالے۔

(ق ص و)

اَلْقَصْى کے معنی بُعد یعنی دوری کے ہیں اور قَصِيٌّ بعید کو کہا جاتا ہے [1] محاورہ ہے۔

قَصَوْتُ عَنْهُ: میں اس سے دور ہوا۔اَقْصَيْتُهٗ: میں نے اسے دور کر دیا۔اَلْمَكَانُ الْاَقْصٰى: دور دراز جگہ۔اَلنَّاحِيَةُ الْقُصْوٰى دور یا کنارہ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى﴾ (۲۸۔۲۰) اور ایک شخص شہر کی پرلی طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔﴿اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ (۱۷۔۱) مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک۔

میں المسجد الاقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے اور اسے اَلْاَقْصٰی مخاطبین یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے مقام سکونت کے اعتبار سے کہا ہے۔کیونکہ وہ مدینہ سے دور تھی۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ (۸۔۴۲) جس وقت تم (مدینے سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

قَصَوْتُ الْبَعِيْرَ: کے معنی اونٹ کا کان قطع کرنے کے ہیں اور کان کٹی اونٹنی کو نَاقَةٌ قَصْوَاءُ کہا جاتا ہے اور اس معنی میں بَعِيْرٌ اَقْصٰى کا محاورہ بھی منقول ہے قَصِيَّةٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو کام کاج سے دور رکھی گئی ہو (اصیل اونٹنی)

(ق ض ض)

قَضَضْتُهٗ فَانْقَضَّ: میں نے اسے گرایا تو وہ گر پڑا۔

اِنْقَضَّ الْحَائِطُ دیوار گر پڑی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ﴾ (۱۸۔۷۷) وہ (جھک کر) گرا چاہتی تھی (حضرؑ نے) اس کو سیدھا کر دیا۔

اَقَضَّ عَلَيْهِ مَضْجَعُهٗ: خواب گاہ کا کنکر آلود ہونا (بے چینی کی وجہ سے نیند نہ آنا)

(ق ض ب)

اَلْقَضْبُ: (اسم) کے معنی لمبے اور پھیلے ہوئے

[1] کما فی قولہ تعالیٰ: مکاناً قَصِيًّا (۱۹۔۲۲)

درخت کے ہیں۔مگر آیت کریمہ:

﴿فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَّقَضْبًا﴾ (۸۱۔۲۷۔۲۸) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری۔ میں قضب سے مراد تازہ گھاس اور ترکاریاں ہیں ❶

اَلْمَقَاضِبُ: وہ زمین جہاں ساگ پات وغیرہ اگتا ہو۔

اَلْقَضِیْبُ: بمعنی قضب ہے لیکن درخت کی تروتازہ شاخوں کو قَضِیْبٌ اور سبزی ترکاری وغیرہ کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے۔ نیز اَلْقَضْبُ (مصدر) کے معنی سبزی ترکاری اور تروتازہ شاخوں کو قطع کرنا بھی آتے ہیں ایک روایت میں ہے ❷ (۸۲) اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَاٰی فِیْ ثَوْبٍ تَصْلِیْبًا قَضَبَهٗ کہ آنحضرت ﷺ جب کسی کپڑے میں صلیب کے نشانات دیکھتے تو اسے قطع کر دیتے۔

سَیْفٌ قَاضِبٌ وَقَضِیْبٌ: قاطع تلوار۔

یہ فعیل بمعنی فاعل ہے اور اس سے پہلی مثال میں بمعنی مفعول اس طرح نَاقَةٌ قَضِیْبٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اونٹوں سے الگ کر لی گئی ہو اور قضیب ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کاٹ کر جدا کر دی گئی ہو اور جو چیز غیر مہذب یعنی کانٹ چھانٹ کر درست نہ کی گئی ہو اسے مقتضب کہا جاتا ہے اور اسی سے اقتضب حدیثا کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی فی البدیہہ بات کہنے کے ہیں۔

(ق ض ی)

اَلْقَضَاءُ کے معنی قولا یا عملا کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں اور قضاء قولی و عملی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں ❸ قضا الٰہی اور قضاء بشری چنانچہ قضا الٰہی کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ﴾ (۱۷۔۲۳) اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

﴿وَقَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ﴾ (۱۷۔۴) اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا...... یہاں قضاء سے مراد قطعی طور پر اطلاع دینے اور حکماً فیصلہ کر دینے کے ہیں۔ یعنی ہم نے انہیں اطلاع دے دی اور وحی کے ذریعہ قطعی طور پر حکم دے دیا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقَضَیْنَاۤ اِلَیْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) اور ہم نے لوط علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

فعلا قضاء الٰہی کے متعلق فرمایا:

---

❶ قال فی الکشاف والقضب الرطبة وفی الصحاح القضبة والقضب الرطب قال بعض الفضلاء القضب هو المسمی فی مصر بالبر سیم الحجازی (الکشاف وذیله، (۴/۷۰۴)

❷ الحدیث فی الفائق (۲/۱۷۵) و غریب ابی عبید (۱: ۳۲) و باختلاف الفاظه فی ابی داود وعن عائشة راجع کنز العمال (۴: رقم ۲۹۴)

❸ ذکر الفخر (۱۲: ۱۵۳) للفظ القضاء ثلاثة معان (۱) بمعنی الحکم والامر کمافی (۱۷۔۲۳) بمعنی الخبر والاعلام (۱۷۔۴) و (۳) بمعنی صفة الفعل اذا تم کما فی (۴۱۔۱۲) کذا فی البخاری۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ﴾ (۴۰۔۲۰) اور خدا سچائی کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی حکم نہیں دے سکتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ (۴۱۔۱۲)

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے......

میں اللہ تعالیٰ کی ایجاد ابداعی اور اس سے فارغ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسے فرمایا:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۔۱۱۷) وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اور آیت کریمہ: ❶

﴿اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۲۔۱۴)

اگر ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں قُضِيَ بمعنی فُصِلَ ہے یعنی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور قضا بشری بذریعہ قول، جیسے قَضَى الْحَاكِمُ بِكَذَا: حاکم نے فلاں فیصلہ کیا۔

کیونکہ حاکم ہمیشہ زبان کے ساتھ فیصلہ دیتا ہے اور قضا بشری بذریعہ فعل کے متعلق فرمایا۔ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ (۲۔۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ﴾ (۲۸۔۲۸) مجھ میں اور آپ میں یہ عہد پختہ ہوا کہ میں جونسی مدت چاہوں پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ (۳۳۔۳۷) پھر جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی۔ ﴿ثُمَّ اقْضُوْا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنَ﴾ (۱۰۔۷۱) پھر وہ کام میرے حق میں کر گزرو۔

یعنی تم میرے متعلق اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا لو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ (۲۰۔۷۲) تو آپ کو جو حکم دینا ہووے دیجیے اور آپ جو حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں دے سکتے ہیں۔ اور اسی طرح شعر ❷ (الطّویل)

---

❶ زلة من المصحح والصواب الى اجل بدل لولا اجل ۱۲۔

❷ قاله شاعر فی رثاء عمرؓ وتمامه بوائج فی اکما مهالم تفتق وفی روایة بوائق بدل بوائج والشعرمما اختلف فی قائله فنسبه، ابو تمام للشماخ بن ضرار و تابع الحصری فی زهره (٤: ١١٥) وابن دریدفی اشتقاقه (١٩٩) و کذافی اللسان والصحاح (بوج) والبیت لیس فی دیوان شماخ ونسبه الجاحظ فی البیان (٤: ٣٦٤) وابو الطیب فی ابداله (١: ٢٤١) لمزربن زرار الغطفانی اخو الشماخ الاکبر (٦٣١١٠م) وفی الاغانی (٨: ١٠٢) والفائق (١: ٦٢) الی الجن والبیت فی الطبری (١: ٥٠٩) والمشکل للقبتی (٣٤٣) والبحر (١: ٣٥٥) بغیر عز وقال فی ذیل الابدال والصحیح انه لجزء اخی الشماخ راجع المرزوقی رقم (٣٨٨) والیه نسب ابن درید فی الاشتقاق فی ٢٨٦ وشماخ هذا اسمه معقل بن ضرار راجع لترجمته (الاغانی (٨: ٩٧-١٠٤) والمؤتلف (١٣٨) و اللالی (٥٨-٥٩) والخزانة (١: ٥١٦) والشعراء ٢٨٤ والاشتقاق ١٧٤۔

(۳۵۶)قَضَيْتَ اُمُوْرًا ثُمَّ غَادَرْتَ بَعْدَهَا
تم نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے امور سرانجام دیئے۔ پھر اس کے بعد...... چھوڑ دیئے ہیں میں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔
یعنی قضاء قولی بھی اور قضا فعلی بھی۔
اور کبھی قضا سے موت مراد ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ قَضٰی نَحْبَهٗ: یعنی اس نے اپنے دنیاوی امور جو اس کے ساتھ مخصوص تھے پورے کر لیے یعنی فوت ہو گیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ (۳۳۔۲۳) تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔
کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ انہوں نے اپنی نذر پوری کر لی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ وہ جان قربان کر دیں گے اور کبھی بھی دشمنوں سے شکست کھا کر نہیں بھاگیں گے مگر بعض نے اس کے معنی فوت ہو جانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ﴾ (۶۔۲) پھر مرنے کا ایک وقت مقرر کر دیا اور ایک مدت اس کے ہاں اور مقرر ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ اجل اول سے دنیاوی زندگی مراد ہے اور ثانی سے موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا مراد ہے اور ارشاد الٰہی:
﴿یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ﴾ (۶۹۔۲۷) اے کاش موت (ابدالاباد کے لیے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔
﴿وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ﴾ (۴۳۔۷۷) اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔
میں بھی موت سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:
﴿فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ﴾ (۳۴۔۱۴) پھر جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے قَضَی الدَّیْنَ قرض ادا کرنا۔
اور اقتضاء کے معنی قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے ہیں۔
اور اسی سے هٰذَا یَقْتَضِی كَذَا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ﴾ (۱۰۔۱۱) تو ان کی عمر کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔
کے معنی یہ ہیں کہ ان کی دنیاوی زندگی کی میعاد پوری کر دی جاتی۔
قضاء الٰہی قدر (تقدیر) سے اخص ہے۔ کیونکہ قضاء کے معنی تقدیر کو قطعی کر دینے کے ہیں لہٰذا قدر بمعنی تقدیر ہے اور قضاء اس کا فیصلہ کرنے کا نام ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قدر (بمنزلہ اس چیز کے ہے جو ماپ کے لیے تیار کی گئی ہو) اور قضاء بمنزلہ اپنے کے ہے جیسا کہ مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ملک شام سے بوجہ طاعون کے واپسی کا ارادہ کیا تو ابوعبیدہؓ نے کہا[1] (۸۳) اَتَفِرُّ مِنَ الْقَضَاءِ (کیا تم قضاالٰہی سے بھاگ رہے ہو) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اَفِرُّ مِنْ قَضَآءِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ

---

[1] رواه البخاری (۲: ۸۵۳) (طبعه هند) من حدیث عبدالله بن عباس وعبدالله بن عامر لكن لفظه نفر من قدر الله الی قدر الله واصل الحدیث متفق علیه۔

اللّٰہِ کہ میں قضا الٰہی سے تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔تو اس میں تنبیہ ہے کہ تقدیر جب تک قضا کے مرحلہ میں داخل نہ ہو۔ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے (دعا وغیرہ کے وسیلہ سے) روک دے لیکن جب اللہ تعالیٰ قضا یعنی قطعی فیصلہ کر دے تو کسی حیلہ سے اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿وَکَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا﴾ (۱۰۔۳۱) اور یہ کام مقرر ہو چکا ہے۔

﴿کَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا﴾ (۱۹۔۷۱) یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔

اور اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَقُضِیَ الْاَمْرُ﴾ (۱۱۔۴۴) اور کام تمام کر دیا گیا۔میں قُضِیَ کے معنی فُصِلَ کے ہیں یعنی قطعی فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کی تلافی نہیں ہوسکتی اسی طرح فرمایا: ﴿وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا﴾ (۲۔۱۱۷) اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔

اور ہر وہ قول جس میں نفع یا اثبات قطعی کا حکم پایا جائے اسے قضیۃ کہا جاتا ہے اسی لیے یہ صدق و کذب کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے کہ تجربہ خطرناک امر ہے اور قضاء مشکل یعنی کسی چیز کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے نہایت ہی مشکل امر ہے حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[1] (۸۴) ((عَلِیٌّ اَقْضَاکُمْ)) کہ علیؓ تم سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

(ق ط ط)

اَلْقِطُّ: حصہ۔حساب کا رجسٹر قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸۔۱۶) اور کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔اَلْقِطُّ اصل میں صحیفہ کو کہتے ہیں پھر جو چیز (یعنی حکم وغیرہ) لکھا گیا ہو اور جس چیز میں لکھا گیا ہو دونوں کو قِطٌّ کہنے لگے ہیں اور کبھی صرف اس فیصلہ وغیرہ کو قِطٌّ کہا جاتا ہے جو (کسی چیز پر) لکھا گیا ہو جیسا کہ کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ وہ لکھی ہوئی نہ ہو۔[2]

اصل میں قِطٌّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو عرض میں قطع کی گئی ہو جیسا کہ (اس کے بالمقابل) قِدٌّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو طول میں قطع کی گئی ہو۔پھر (محاورہ میں) اس معین حصہ کو (بھی) قط کہا جاتا ہے جو کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ میں یہی معنی مراد لیے ہیں۔مَارَأَیْتُهٗ قَطُّ: میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تو قَطُّ سے خاص زمانہ مراد ہے۔

قَطْنِیْ (اسم فعل) مجھے کافی ہے[3]

(ق ط ر)

اَلْقُطْرِ کے معنی جانب اور طرف کے ہیں اس

---

[1] عن ابن عباس فی حدیث مرفوع وفی عبدالرزاق عن قتادة مرسلا وعن انس اخرجه البغوی فی شرح السنة والمصابیح وفی معناه احادیث رواها اصحاب السنن (المقاصد رقم ۱۴۲) وایضا قال عمر فیه رضی الله تعالیٰ عنه علی اقضا نا وابیٌّ اقرؤنا (المستدرك ۳/۳۰۵)

[2] وعند اکثر اهل التفسیر المراد منه صحیفة الاعمال وقال قتادة المراد منه نصیب العذاب وعن سعید بن جبیر نصیب من الجنة (راجع الطبری ۲۳/۱۳۵۔۱۳۴)

[3] قال فی التنبیه ۶۱۔۶۲: تاتی قط بمعنی حسب و کفی تقول: قط عبدالله درهم وقطنی درهم وعند اهل البصرة تکون مضافا الی مابعدها تقول قط عبدالله درهم وحینئذ تکون مخففة ومثقلة واما فی الزمان والعدد فلاتاتی الامثقلة ۱۲۔

کی جمع اقطار ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۵۵۔۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔ ﴿وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا﴾ (۳۳۔۱۴) اور اگر فوجیں اطراف مدینہ سے ان پر آ داخل ہوں۔ قَطَرْتُهٗ: کسی کو پہلو پر گرا دینا۔
اسی سے قَطَرَ الْمَطَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بارش برسنے کے ہیں اور اسی وجہ سے بارش کو قطر کہا جاتا ہے۔
تَقَاطَرَ الْقَوْمُ: لوگ بارش کے قطروں کی طرح پیہم آئے۔ اسی سے اونٹوں کی قطر کو قطار کہا جاتا ہے مثل مشہور ❶ ہے۔
اَلنِّقَاضُ یُقَطِّرُ الْجَلَبَ: یعنی توشہ ختم ہو جائے تو عمدہ اونٹ بھی فروخت کے لیے منڈی میں لائے جاتے ہیں۔
اَلْقَطِرَانُ کے معنی پگھلی ہوئی رال یا گندھک کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔
﴿سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ (۱۴۔۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔
ایک قرأت میں قِطْرآن ہے جس کے معنی پگھلے ہوئے گرم تانبے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا﴾ (۱۸۔۹۶) (اب) میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں یہاں قِطْرًا کے معنی پگھلا ہوا تانبا کے ہیں۔

(ق ط ع)

اَلْقَطْعُ کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ اس کا تعلق حاسۂ بصر سے ہو جیسے اجسام وغیرہ یا بصیرت سے ہو۔ جیسے معنوی چیزیں چنانچہ اسی سے اعضاء کا قطع کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ (۷۔۱۲۴) میں (پہلے تو) تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے پاؤں کٹوادوں گا۔ ﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا﴾ (۵۔۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔
﴿وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ (۴۷۔۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو انکی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔
اور اسی سے قطع ثوب ہے جیسے فرمایا:
﴿فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ جو کافر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے (۲۲۔۱۹)
اور قطع طریق کے دو معنی آتے ہیں (۱) راستہ طے کرنا (۲) رہزنی کرنا۔ جیسے فرمایا:
﴿اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ﴾ (۲۹۔۲۹) تم کیوں (لذت کے ارادے سے) لڑکوں کی طرف مائل ہوتے اور مسافروں کی رہزنی کرتے ہو۔

---

❶ وفی المطبوع الانفاض والتصویب من الاصول راجع للمثل (جلب) والمشکل للقبتی ٦٦ ومجمع الامثال (٤٢١٨) ومعناه اصلح بالك قبل ان یتطرق الافساد۔ قال فی اللسان (نفض) و کان ثعلب یفتح النون ویقول معناه الجدب لکن فی محاصبه ٣٢٤: قال والنقاض بفتح النون وضمها ١٢۔

یہاں قطع سبیل کے وہی معنی ہیں جس کی طرف کہ آیت ﴿الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (۱۱۔۱۹) جو خدا کے رستے سے روکتے ہیں۔اور آیت:

﴿فَصَدَّھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ﴾ (۲۹۔۳۸) اوران کو سیدھے رستے سے روک دیا۔

میں اشارہ فرمایا ہے اور راہ گیروں کو لوٹنے پر قطع اس لیے بولا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ راہ چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔تو گویا یہ راستہ کو قطع کرنا ہے قَطْعُ الْمَآءِ بِالسَّبَاحَۃِ: پیراکی کے ذریعہ پانی عبور کرنا۔قَطْعُ الْوَصْلِ: تعلق قطع کرلینا۔قَطْعُ الرَّحِمِ: رشتہ کاٹ لینا یا احسان کو روک لینا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ﴾ (۴۷۔۲۲) اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔

﴿وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ (۲۔۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑ رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو قطع کر ڈالتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ﴾ (۲۲۔۱۵) پھر اس سے اپنا گلا گھونٹ لے پھر دیکھے......

کے معنی بعض نے رسی کاٹ دینا کیے ہیں تاکہ وہ زمین پر گر پڑے اور بعض نے کہا ہے کہ گلے میں پھانسی ڈال کر زندگی کو قطع کر دینا مراد ہے اور یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔

قَطْعُ الْاَمْرِ: کے معنی کسی کام کا فیصلہ کرنے کے ہیں اسی سے فرمایا:

﴿مَا کُنْتُ قَاطِعَۃً اَمْرًا﴾ (۲۷۔۳۲) میں کسی کام کو فیصل کرنے والی نہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿لِیَقْطَعَ طَرَفًا﴾ (یہ خدا نے) اس لیے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک...... کر دے۔

کے معنی کفار کی ایک جماعت کو ہلاک کردینے کے ہیں قَطَعَ دَابِرَ الْاِنْسَانِ کے معنی نوع انسانی کو فنا کر دینے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۶۔۴۵) غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

﴿اَنَّ دَابِرَ ھٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ﴾ (۱۵۔۶۶) تو ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۹۔۱۱۰) مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں۔

میں تقطع قلوب سے مر جانا مراد ہے اور یا اس سے مراد ایسی توبہ کرنے کے ہیں کہ اپنی کوتاہیوں پر ندامت کی وجہ سے انسان کا دل پارہ پارہ ہو جائے۔قِطْعٌ مِّنَ اللَّیْلِ کے معنی رات کے ایک حصہ کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَسْرِ بِاَھْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّیْلِ﴾ (۱۱۔۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

اَلْقَطِیْعُ: بکریوں کا ریوڑ۔جمع قُطْعَانٌ۔

یہ معنی قطع سے مشتق ہے جیسا صِرْمَۃٌ اور فِرْقَۃٌ وغیرہ الفاظ کے معنی جماعت کے آتے ہیں اور ان میں قطع کا معنی پایا جاتا ہے۔

اَلْقَطِیْعُ کے معنی کوڑا بھی آتے ہیں۔محاورہ ہے: اَصَابَ بِئْرَھُمْ قُطْعٌ: (گرمی کی وجہ سے) ان کے

کنویں کا پانی ختم ہوگیا۔
مَقَاطِعُ الْاَوْدِيَةِ: وادیوں کے سرے۔

(ق ط ف)

قَطَفْتُ (ض) اَلثَّمْرَةَ قَطْفًا کے معنی پھل چننا کے ہیں اور درخت سے توڑے ہوئے پھل کو قِطْفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع قُطُوْفٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ﴾ (۶۹۔۲۳) جن کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے۔

قَطَفَتِ الدَّابَّةُ قَطْفًا: جانور کا آہستہ چلنا اور ایسے جانور کو قطوف کہا جاتا ہے اور جانور کے متعلق اس کا استعمال صرف تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یعنی دابۃ کو قَاطِفٌ (پھل چننے والا) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جیسا کہ نقص کے ساتھ کوئی چیز متصف ہوتی ہے۔ وَقَدْ تقدم ذکرہ۔ اَقْطَفَ الْكَرْمُ: انگور چننے کا موسم قریب آگیا۔ اور جو انگور پک کر زمین پر گر پڑیں انہیں قِطَافَة کہا جاتا ہے اور یہ قِفَايَة کی طرح ہے۔

(ق ط م ر)

اَلْقِطْمِيْرُ: (نقطہ سپید بر پشت دانہ کہ خرما از وے روید) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ﴾ (۳۵۔۱۳) اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے نقطہ سپید کے برابر بھی تو کسی چیز کے مالک نہیں۔

قِطْمِيْرٌ: کے معنی اس ہلکے سے سپید نقطہ کے ہیں جو گٹھلی پر ہوتا ہے۔ یہ حقیر اور بے قدر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

(ق ط ن)

اَلْيَقْطِيْنُ: گیاہ بے ساق مثل درخت کدو و مانند آں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ﴾ (۳۷۔۱۴۶) اور ان پر ہم نے کدو کا درخت اگایا۔

اَلْقُطْن: روئی۔ قَطَنُ الْحَيَوَان: میانِ دوران۔

(ق ع د)

اَلْقُعُوْدُ: یہ قِيَامٌ (کھڑا ہونا) کی ضد ہے۔ اس سے قَعْدَةٌ صیغہ مرۃ ہے یعنی ایک بار بیٹھنا اور قِعْدَةٌ (بکسرہ قاف) بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور اَلْقُعُوْدُ قَاعِدٌ کی جمع بھی ہے جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۴۔۱۰۳) تو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرو۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۳۔۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اَلْمَقْعَدُ کے معنی جائے قیام کے ہیں اس کی جمع مقاعد ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴۔۵۵) (یعنی) پاک مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔ یعنی نہایت پرسکون مقام میں ہوں گے اور آیت کریمہ:

﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (۳۔۱۲۰) لڑائی کے لیے مورچوں پر، میں لڑائی کے مورچے مراد ہیں جہاں سپاہی جم کر لڑتے ہیں اور کبھی کسی کام میں سستی کرنے والے کو بھی قاعد کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ﴾ (۴۔۹۵) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے ہیں اور لڑنے سے جی چراتے ہیں) ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے۔

اسی سے رَجُلٌ قُعَدَة ضُجَعَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی بہت کاہل اور بیٹھے رہنے والے آدمی کے ہیں نیز فرمایا۔

﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (۴۔۹۵) خدا نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے۔

اور کبھی قَعَدَ لَهٗ کے معنی کسی چیز کے لیے گھات لگا کر بیٹھنے اور انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۷۔۱۶) میں بھی سیدھے رستے پر...... بیٹھوں گا۔ نیز فرمایا:

﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (۵۔۲۴) ہم یہیں بیٹھیں رہیں گے یعنی یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہیں گے۔ اور آیت کریمہ ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۷) جو دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔

میں قَعِيْدٌ سے مراد وہ فرشتہ ہے جو (ہر وقت اعمال کی) نگرانی کرتا رہتا ہے اور انسان کے اچھے برے اعمال (اس کے نامہ اعمال میں) درج کرتا رہتا ہے یہ واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ نیز جو وحشی جانور پیچھے سے آتا ہے اور اس سے برا شگون لیا جاتا ہے اسے بھی قَعِيْدٌ کہا جاتا ہے اور یہ نَطِيْحٌ کی ضد ہے۔

قَعِيْدَكَ اللّٰهُ وَقِعْدَكَ اللّٰهُ: یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری حفاظت کا سوال کرتا ہوں۔

اَلْقَاعِدَةُ: وہ عورت جو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے، نکاح اور حیض کے قابل نہ رہی ہو۔ اس کی جمع قَوَاعِدُ ہے [1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ (۲۴۔۶۰) اور بڑی عمر کی عورتیں۔

اور مُقْعَدٌ اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہو اور اپاہج آدمی جو چل پھر نہ سکے اسے بھی مُقْعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجازاً مینڈک کو بھی مُقْعَدٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مُقْعَدَات ہے اور ابھری ہوئی چھاتی پر ثَدْيٌ مُقْعَدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور كناية کے طور پر کمینے اور خسیس اطوار آدمی پر بھی مُقْعَدٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ [2] قَوَاعِدُ الْبِنَاءِ: عمارت کی بنیادیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲۔۱۲۷) اور جب ابراہیم علیہ السلام...... بیت اللہ کی بنیادی اونچی کر رہے تھے۔

قَوَاعِدُ الْهَوْدَجِ (چوکھٹا) ہودے کی لکڑیاں جو اس کے بمنزلہ بنیاد کے ہوتی ہیں۔

(ق ع ر)

قَعْرُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کی گہرائی کی انتہا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ (۵۴۔۲۰) کہ

---

[1] بل القاعد بغيرها ويقال: قعدت عن المحيض فهي قاعد دراجع اضداد ابي الطيب (۵۸۳) والجمع القواعد ۱۲.

[2] ههُنَا القواعد جمع قاعدة و في صفة المروة جمع قاعد بغيرها.

گویا کھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔
میں نخل منقعر سے کھجور کے وہ درخت مراد ہیں جن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک چلی گئی ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ اِنْقَعَرَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنی درخت کے زمین کی گہرائی سے اکھڑ جانے کے ہیں اور بقول بعض اس کے معنی زمین کی گہرائی تک چلے جانے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح زمین کی گہرائی تک چلے جانے والے نخلۃ کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔
قَصْعَۃٌ قَعِیْرَۃٌ: گہرا پیالہ۔قَعَّرَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِہٖ: حلق سے آواز نکالنا جیسا کہ جبڑے سے آواز نکالنے کو شَدَّقَ کہا جاتا ہے۔

(ق ف ل)

اَلْقُفْلُ: تالا جمع۔اَقْفَالٌ محاورہ ہے:
اَقْفَلْتُ الْبَابَ: میں نے دروازے کو قفل لگا دیا اور تمثیل کے طور پر ہر اس چیز کو قفل کہا جاتا ہے جو کسی کام سے مانع اور رکاوٹ بنے۔چنانچہ محاورہ ہے۔فُلَانٌ مُقْفَلٌ عَنْ کَذَا: فلاں کو اس کام سے روک دیا گیا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (۴۷۔۲۴) یا انکے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔
اور کنجوس آدمی کو جس طرح مغلول الیدین کہا جاتا ہے اسی طرح مَقْفُوْلُ الْیَدَیْنِ بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلْقُفُوْلُ: سفر سے واپس لوٹنا اور سفر سے واپس آنے والی جماعت کو قافلہ کہا جاتا ہے۔

اَلْقَفِیْلُ: خشک چیز کو کہتے ہیں اس لیے کہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کے اجزاء ایک دوسرے کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یا اس لیے کہ صلابت کی وجہ سے گویا اس پر قفل لگ جاتا ہے۔محاورہ ہے:
قَفَلَ النَّبَاتُ: نباتات خشک ہوگئی۔
قَفَلَ الْفَحْلُ: مستی سے سانڈھ کا دبلا ہو جانا۔

(ق ف و)

اَلْقَفَا کے معنی گدی کے ہیں اور قَفَرْتُہٗ کے معنی کسی کی گدی پر مارنا اور کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔یہ دونوں محاورے استعمال ہوتے ہیں قَفَوْتُ اَثْرَہٗ وَاقْتَفَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں دوسرے کا مصدر اِقْتِفَاء ہے۔جس کے اصل معنی کسی کی قفا کا اتباع کرنے کے ہیں۔لیکن کنایہ کے طور پر کسی کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ (۱۷۔۳۶) اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔
یعنی محض قیافہ اور ظن سے کام نہ لو بعض کے نزدیک قیافہ کا لفظ بھی اقتفاء سے مقلوب ہے۔جیسے جَذَبَ وَجَبَذَ اور یہ (قیافہ) ایک فن ہے۔اور قَفَّیْتُہٗ کے معنی کسی کو دوسرے کے پیچھے لگانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ﴾ (۲۔۸۷) اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے۔
اَلْقَافِیَۃُ: مصرعہ کے جزء اخیر کو کہا جاتا ہے۔جس کے حرف روی کی ہر شعر میں رعایت رکھی جاتی ہے۔
اَلْقَفَاوَۃُ: وہ کھانا جس سے مہمان کی آؤ بھگت کی جائے۔

(ق ل ل)

اَلْقِلَّةُ وَالْکثرۃ: بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عِظَم اور صِغَر صفات اجسام سے ہیں بعدہ کثرت وقلت اور عظم وصغر میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْهَآ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۶۰) پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قَلِیْلًا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۷۳۔۲) رات کو قیام کرو، مگر تھوڑی رات۔

﴿وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۱۶) اور اس وقت تم بہت ہی کم فائدہ اٹھاؤ گے۔

﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا﴾ (۱۳۔۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔

اور آیت کریمہ:

﴿مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۳۳۔۲۰) تو لڑائی نہ کریں مگر کم۔

قَلِیْلًا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی قِتَالًا قَلِیْلًا اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۱۵۔۱۳) اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

قَلِیْلًا سے مراد تھوڑی سی جماعت اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا﴾ (۸۔۴۳) اس وقت خدا نے تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑی تعداد میں دکھایا:

﴿وَ یُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ﴾ (۸۔۴۴) اور کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا، میں مراد ہے اور شاعر کے قول [1] (السریع)

(۳۵۷) وَلَسْتَ بِالْاَکْثَرِ مِنْهُ حَصًا
وَاِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْکَاثِرِ

اور تم تعداد میں ان سے زیادہ نہیں ہو اور عزت صرف کثیر التعداد کے لیے ہے۔

کے پیش نظر کبھی قلت کا لفظ بطور کنایہ ذلت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ ﴿وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ﴾ (۷۔۸۶) اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو خدا نے تم کو جماعت کثیر بنا دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ﴾ (۳۸۔۲۴) اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

میں قلیل کا لفظ بطور عزت واحترام کے استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جتنی کوئی چیز زیادہ عزیز القدر ہو اتنی ہی کمیاب ہوتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (۱۷۔۸۵) اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مَآ اُوْتِیْتُمْ سے مستثنیٰ ہو

---

[1] قاله الاعشى الميمون وفي رواية فيهم، بدل منه والبيت في التاج واللسان (كثر) راجع تخريجه (ك ث ر)

یعنی تم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جنہیں اس کا علم دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ قَلِیْلاً مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی تمہیں اس کے متعلق علم قلیل (تھوڑا سا علم) دیا گیا ہے۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلاً﴾ (۲۔۴۱) اور میری آیتوں (میں تحریف کر کے ان) کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو۔

میں قلیل سے مراد دنیوی مال و متاع ہے کیونکہ دنیوی مال و متاع خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں جو حق تعالیٰ نے متقین کے لیے تیار کی ہیں، نہایت ہی حقیر ہے اسی بناء پر فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ﴾ (۴۔۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔

اور کبھی قلیل کا لفظ بول کر نفی کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ جیسے قَلَّمَا یَفْعَلُ فُلَانٌ بِکَذَا: کہ فلاں ایسا کام نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ نفی کی طرح اس کے بعد بھی استثناء لانا صحیح ہوتا ہے جیسے قَلَّمَا یَفْعَلُ کَذَا اِلَّا قَاعِدًا اَوْ قَائِمًا اَوْمَا یَجْرِیْ مَجْرَاہُ۔ اور بعض نے آیت کریمہ: ﴿قَلِیْلًا مَا تُؤْمِنُوْنَ﴾ (۶۹۔۴۱) لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی وہ ایمان ہی نہیں لاتے" اور بعض نے اس کے معنی تُؤْمِنُوْنَ اِیْمَانًا قَلِیْلًا کیے ہیں۔ یعنی وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اور ایمان قلیل سے مراد صرف زبان کے ساتھ اقرار اور سطحی سی معرفت حاصل کرنے کے ہیں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ﴾ (۱۲۔۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

اَقْلَلْتُ کَذَا کے معنی کسی چیز کو ہلکا پانے کے ہیں کبھی یہ ہلکا سمجھنا محض حکمی ہوتا ہے۔ اَقْلَلْتُ مَا اَعْطَیْتَنِیْ یعنی میں نے تمہارے دیئے ہوئے کو حقیر سمجھا اور کبھی اس شے کی قوت کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا﴾ (۷۔۵۷) جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہے۔ یہاں اقلت کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ کہ وہ بادل جن کو اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار سے نہایت ہلکے ہیں۔ اِسْتَقْلَلْتُهٗ: کسی چیز کو حقیر خیال کرنا جیسے اِسْتَخْفَفْتُهٗ: کسی چیز کو ہلکا خیال کرنا۔ اَلْقُلَّةُ: ہر چیز کا بالائی حصہ۔ اور قُلَّةُ الْجَبَلِ: پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں کیونکہ باقی پہاڑ کے مقابلہ میں وہ قلیل سی ہوتی ہے۔

تَقَلْقَلَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں اور تَقَلْقَلَ الْمِسْمَارُ (میخ کا مضطرب ہونا) قَلْقَلَة سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حرکت کی آواز کو حکایت کرنے کے ہیں۔

(ق ل ب)

قَلْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف قَلْبُ الثَّوْبِ: پلٹنے کے ہیں۔ (کپڑے کو الٹنا) اور قَلْبُ الْاِنْسَانِ کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِلَیْهِ تُقْلَبُوْنَ﴾ (۲۹۔۲۱) اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اَلْاِنْقِلَابُ کے معنی پھر جانے کے ہیں ارشاد ہے۔

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۳۔۱۴۴) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا۔

﴿اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۵۰) ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

﴿اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۷) کہ کونسی جگہ لوٹ جاتے ہیں۔

﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ (۸۳۔۳۱) اور جب اپنے گھر کو لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کے دل کو بھی قلب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کثرت سے الٹتا پلٹتا رہتا ہے اور قلب کا لفظ بول کر اوصاف قلبی مراد لیے جاتے ہیں جیسے علم، شجاعت، روح وغیرہ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۳۳۔۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔ میں قلوب سے ارواح مراد ہیں اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ (۵۰۔۳۷) جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے...... اس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔

میں قلب سے مراد علم وفہم ہے۔ نیز فرمایا:۔ ﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ (۶۔۲۵) اور ہم نے ان کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔

﴿طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (۹۔۸۷) ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے تو یہ سمجھتے ہی نہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ (۳۔۱۲۶) اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی ہو۔

میں قلوب کے مطمئن ہونے سے ان میں بہادری کا ثابت ہونا اور خوف کا زائل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس خوف کے طاری ہونے کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۳۳۔۲۶) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ﴾ (۳۳۔۵۳) یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔

میں اَطْهَرُ سے جالب عفت ہونا مراد ہے۔ نیز فرمایا:۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۴۸۔۴) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى﴾ (۵۹۔۱۴) مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

میں شتی کے معنی متفرق ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (۲۲۔۴۶) بلکہ دل۔ جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ قلوب سے مراد عقلیں ہیں اور بعض نے روحیں مراد لی ہیں۔ لیکن عقل کبھی اندھی نہیں ہوتی لہذا تَعْمٰى کی قلوب کی طرف نسبت مجازی ہوگی جیسا کہ آیت کریمہ ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (۲۔۱۲۵) میں (مجازا) جاری ہونے کی نسبت انہار کی

طرف کی گئی ہے حالانکہ انہار جاری نہیں ہوتیں بلکہ ان میں پانی جاری ہوا کرتا ہے۔ تَقْلِیْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کی حالت کو متغیر کر دینے کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۳۳-۶۶) جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائیں جائیں گے۔ اور تَقْلِیْبُ الْاُمُوْرِ کے معنی کسی کام کی تدبیر اور اس میں غور وفکر کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ (۹-۴۸) اور بہت سی باتوں میں تمہارے لیے الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دلوں اور بصیرتوں کو پھیر دینے سے ان کی آراء کو تبدیل کر دینا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ﴾ (۶-۱۱۰) اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے۔

اور تَقْلِیْبُ الْیَدِ پشیمانی سے کنایہ ہوتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر نادم آدمی کا یہی حال ہوتا ہے (کہ وہ اظہار ندامت کے لیے اپنے ہاتھ ملنے لگ جاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ﴾ (۱۸-۴۲) تو.......... (حسرت سے) ہاتھ ملنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے ❶ ( )

(۳۵۸) كَمَغْبُوْنٍ يَعَضُّ عَلٰى يَدَيْهِ
تَبَيَّنَ غِبْنُهٗ بَعْدَ الْبِيَاعِ

جیسے خسارہ اٹھانے والا آدمی تجارت میں خسارہ معلوم کر لینے کے بعد اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔ اور تقلب (تفعل) کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ارشاد ہے:۔

﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ﴾ (۲۶-۲۹) اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی۔

﴿اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ﴾ (۱۶-۴۶) یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے وہ (خدا کو) عاجز نہیں کر سکتے۔

رَجُلٌ قُلَّبٌ: بہت زیادہ حیلہ گر اور ہوشیار آدمی جو معاملات میں الٹ پھیر کرنے کا ماہر ہو اَلْقُلَابُ: دل کی ایک بیماری (جو اونٹ کو لگ جاتی ہے)

مَابِهٖ قَلْبَةٌ: یعنی وہ تندرست ہے اسے کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے جو پریشانی کا موجب ❷ ہو اَلْقَلِیْبُ۔ پرانا کنواں جو صاف نہ کیا گیا ہو۔ اَلْقُلْبُ: ایک خاص قسم کا کنگن۔

(ق ل د)

اَلْقَلْدُ کے معنی رسی وغیرہ کو بل دینے کے ہیں۔ جیسے قَلَدْتُ الْحَبَلَ: (میں نے رسی بٹی) اور بٹی ہوئی رسی کو قَلِیْدٌ یا مَقْلُوْدٌ کہا جاتا ہے اور قلادۃ اس بٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو گردن میں ڈالی جاتی ہے جیسے ڈور اور چاندی وغیرہ کی زنجیر اور مجازاً تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو جو گردن میں ڈالی جائے یا کسی چیز کا احاطہ کرے قِلَادَۃ کہا جاتا ہے اور اسی سے تَقَلَّدَ سَیْفَهٗ کا محاورہ ہے۔ کیونکہ وہ بھی قلادۃ کی طرح گردن میں ڈال کر لٹکائی جاتی ہے۔ جیسے وشاح (ہار) سے توشّح بہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور قَلَّدْتُهٗ سَیْفًا کے معنی کسی کی گردن میں تلوار باندھنے یا تلوار سے اس کی گردن مارنے کے ہیں۔ قَلَّدْتُهٗ عَمَلًا کوئی کام کسی کے ذمہ لگا دینا۔

---

❶ قاله قيس بن ذريح والبيت في اللسان (بيع) وفي محاضرات الادباء (۳/۱۰۰-۱۰۱) في ثلاثة بغير عزو ۱۲۔
❷ انظر ادب الكاتب (۱۲٤۳)

قَلَّدْتُهٗ هِجَاءً: کسی پر ہجو کو لازم کر دینا اور آیت کریمہ:

﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۶۳) اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ میں مقالید سے مراد وہ چیز ہے جو ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بعض نے اس سے خزانے اور بعض نے کنجیاں مراد لی ہیں لیکن ان سب سے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حفاظت کی طرف اشارہ ہے، جو تمام کائنات پر محیط ہے۔

(ق ل م)

اَلْقَلْمُ: (مصدر ض) اس کے اصل معنی کسی سخت چیز کو تراشنے کے ہیں۔ اس لیے ناخن، بانس کی گرہ اور سرکنڈے وغیرہ کے تراشنے پر قَلْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور تراشیدہ چیز کو قِلْم کہا جاتا ہے تو قِلْمٌ بمعنی مقلوم ہے جیسے نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ آتا ہے۔

اور (عرف میں) خاص کر لکھنے کے آلہ اور قرعہ اندازی کے تیر پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَقْلَامٌ ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (۶۸۔۱) قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ﴾ (۳۱۔۲۷) اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ (۳۔۴۴) جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے۔

میں اَقْلَامٌ سے قرعہ اندازی کے تیر مراد ہیں۔ [1]

اور آیت کریمہ:

﴿اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶۔۴) جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انسان کو کتابت کی تعلیم دینا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جبریل علیہ السلام سے وحی اخذ کرتے تھے اور جبریل میکائیل سے، وہ اسرافیل سے اور اسرافیل لوح محفوظ سے اور لوح محفوظ قلم سے۔ تو یہاں قلم سے سر الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی تحقیق کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اَلْاَقْلِيْمُ: ربع مسکون کا ساتواں حصہ۔ علماء ہیئت کی تحقیق کے مطابق زمین کے سات حصے ہیں۔ اور ہر حصہ پر اقلیم کا لفظ بولتے ہیں اس کی جمع اَقَالِيْمُ ہے۔

(ق ل ی)

اَلْقِلٰى کے معنی شدت بغض کے ہیں قَلَاهُ (ماضی) اور يَقْلِيْهِ وَيَقْلُوْهُ مضارع دونوں طرح آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾ (۹۳۔۳) (اے محمد ﷺ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

﴿اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ﴾ (۲۶۔۶۸) میں تمہارے کام کا سخت دشمن ہوں۔

اگر اسے واوی قَلْوٌ سے مشتق مانا جائے جس کے معنی (رَمْیٌ) کے ہیں تو یہ قَلَتِ النَّاقَةُ بِرَاكِبِهَا قَلْوًا۔

---

[1] كذا قال عطاء ونقل عن ابن عباس ومجاهد وابن جريج ان المراد بها الاقلام التى كانو يكتبون بها التوراة وكانت من نحاس. انظر الفيوضات الالهية (ص۳۱۸ ج او الطبرى (ص۲۴۳ ج۳)۔

(ناقہ نے سوار کو گرادیا) وَقَلَوْتُ بِالْقُلَّةِ (میں نے گلی کو پھینکا) وغیرہا محاورات سے مشتق ہوگا۔ اور جس چیز سے دل بوجہ بغض یا ناپسندیدہ ہونے کے اس طرح گھن کھائے گویا اسے پھینک رہا ہے تو اسے مَقْلُوٌّ کہا جائے گا۔ اور اگر ناقص یائی سے مشتق مانا جائے تو یہ قَلَيْتُ الْبُسْرَ وَالسَّوِيْقَ عَلَى الْمِقْلَاةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی مِقْلَاة (فرائی پین) میں کھجور اور ستو ڈال کر تلنے کے ہیں۔

(ق م ح)

اَلْقُمْحُ: خلیل نے کہا ہے کہ قَمْحٌ اس گیہوں کو کہتے ہیں جو پکنے کے وقت سے لے کر ذخیرہ اندوزی تک بالی کے اندر ہی رکھا جائے اور اس گیہوں سے جو ستو بنایا جاتا ہے اسے قَمِيْحَة کہا جاتا ہے۔

(اور ستو کی مناسبت سے) کوئی چیز پھانکنے کے لیے سر اوپر اٹھانے کو اَلْقَمْحُ (ف) کہتے ہیں۔ پھر محض سر اٹھانے پر (خواہ کسی وجہ سے ہو قَمْحَ کہا جانے لگا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے قَمَحَ الْبَعِيْرُ: اونٹ نے (سیری کے بعد حوض سے) سر اوپر اٹھالیا اَقْمَحْتُ الْبَعِيْرَ: میں نے اونٹ کا سر اونچا کر کے پچھلی جانب باندھ دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾ (۳۶-۸) تو انکے سر الٹ رہے ہیں۔ میں تشبیہ اور تمثیل کے طور پر ان کو مُقْمَحُوْنَ کہا گیا ہے۔ اور اس سے مقصود قبول حق سے ان کی سرتابی اور سرکشی اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے ان کے انکار کو بیان کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان کی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ میں پایا جاتا ہے۔

(ق م ر)

اَلْقَمَرُ: چاند جب پورا ہو رہا ہو تو اسے قمر کہا جاتا ہے اور یہ حالت تیسری رات کے بعد ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ چاند کو قَمَر اس لیے کہا جاتا ہے وہ ستاروں کی روشنی کو خیرہ کر دیتا ہے اور ان پر غالب آجاتا ہے[1] قرآن پاک میں ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ﴾ (۳۶-۳۹) اور چاند کی (بھی) ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔

﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۵۴-۱) اور چاند شق ہو گیا۔

﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا﴾ (۹۱-۲) اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے۔

﴿كَلَّا وَالْقَمَرِ﴾ (۷۴-۳۲) ہاں ہاں (ہمیں) چاند کی قسم۔

اَلْقَمْرَاءُ: چاند کی روشنی۔ چاندنی۔ تَقَمَّرْتُ فُلَانًا چاندنی رات میں کسی کے پاس جانا۔

قَمِرَتِ الْقِرْبَةُ: چاند کی روشنی سے پانی کی مشک خراب ہوگئی۔

حِمَارٌ اَقْمَرُ: چاند کے رنگ۔ یعنی سبزی مائل سفید رنگ کا گدھا۔

قَمَرْتُ فُلَانًا كَذَا میں نے فلاں کو اس چیز سے دھوکا دیا۔

---

[1] یقال قمرہ ای غلب علیہ فی القمار

(ق م ص)

اَلْـقَـمِيْـصُ: قمیص۔کرتہ جمع قُـمُـصٌ وَاَقْمِصَةٌ وَقُمْصَانٌ: قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ﴾ (۱۲:۲۶) اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو۔﴿وَاِنْ كَـانَ قَـمِيْـصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲۔۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

تَقَمَّصَهٗ قمیص پہننا۔قَمَصَ (ن۔ض) اَلْبَعِيْرُ اونٹ کا جست کرنا۔

اَلْـقُـمَـاصُ: اونٹ کا ایک مرض جو اسے چین سے کھڑا ہونے نہیں دیتا اور اسی سے لفظ قَـامِصَةٌ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے[1] (۸۵)

(ق م ط ر)

اَلْـقَمْطَرِيْرُ: سخت۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا﴾ جو (چہروں کو) کریہہ المنظر اور (دلوں کو) سخت (مضطر) کردینے والا۔(۷۶۔۱)

قَمْطَرِيْرٌ ایک لغت میں قما طیر بھی ہے۔

(ق م ع)

اَلْمَقَامِعُ (مفرو مِقْمَعٌ) ہتھوڑے۔قرآن پاک میں ہے:

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ﴾ (۲۲۔۲۱) اوران (کے مارنے ٹھوکنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔

مَقَامِعُ کا واحد مِقْمَعٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے پیٹ پیٹ کر کسی کو مطیع اور مقہور کیا جائے اسی سے محاورہ ہے۔

قَـمَعْتُهٗ فَانْقَمَعَ: میں نے اسے ردکا تو وہ رک گیا۔اور

اَلْقِمَعُ وَالْقِمْعُ (قیف) وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی (سیال) چیز (بوتل وغیرہ میں) ڈالی جائے۔تاکہ نیچے نہ گرنے پائے۔حدیث میں ہے[2] (۸۶)

((وَيْـلٌ لِاَ قْمَاعِ الْقَوْلِ)) یعنی ان پر افسوس ہے جو اپنے کان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے قیفیں بنائے رکھتے ہیں یعنی دوسروں کی باتیں سننے کے درپے رہتے ہیں۔

اَلْقَمَعُ: ذباب ازرق کیونکہ اسے مار کر دور بھگایا جاتا ہے

تَقَمَّعَ الْحِمَارُ: گدھے کا مکھی کو دور ہٹانا۔

(ق م ل)

اَلْقُمَّلُ: چھوٹی مکھیاں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ الْـقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ﴾ (۷۔۱۳۳) اور چھوٹی مکھیاں، مینڈک اور خون۔

اَلْقَمْلُ: کے معنی ہیں۔جوں اور رَجُلٌ قَمِلٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے جوئیں پڑ جائیں اور اسی سے چھوٹے سے بدصورت مرد یا عورت کو قَمِلٌ یا قَمِلَةٌ کہا جاتا ہے گویا وہ جوں یا چھوٹی مکھی کی طرح ہے۔

(ق ن ت)

اَلْـقُـنُـوْتُ: (ن) کے معنی خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام کرنے کے ہیں اس بنا پر آیت کریمہ:۔

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (۲۔۲۳۸) اور خدا کے آگے

---

[1] روی عن علی انه قضی فی القارصة والقامصة والو اقصة بالدیة اثلاثا راجع للقصة النهایة۔

[2] الکلمة من الحدیث الفائق (۲/۱۸٤) والنهایة (قمع) قال فی الفائق معناه ای لا ینجع فیهم الوعظ کالا قماع التی لا تعی شیئا مما یفرغ فیها ۱۲۔

ادب سے کھڑے رہا کرو۔

میں بعض نے قانتین کے معنی طائعین کیے ہیں ❶ یعنی اطاعت کی حالت میں اور بعض نے خاضعین یعنی خشوع اور خضوع کے ساتھ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (۲۔۱۱۶) سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ میں بعض نے قٰنِتُوْنَ کے معنی خَاضِعُوْنَ کیے ہیں اور بعض نے طَائِعُوْنَ (فرمانبردار) اور بعض نے سَاكِتُوْنَ یعنی خاموش اور چپ چاپ اور اس سے بالکل خاموش ہو کر کھڑے رہنا مراد نہیں بلکہ عبادت گزاری میں خاموشی سے ان کی مراد یہ ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ❷ ۔(۸۷)

''کہ نماز تلاوت قرآن اور اللہ کی تسبیح وتحمید کا نام ہے اور اس میں کسی طرح کی انسانی گفتگو جائز نہیں ہے۔'' اسی بنا پر جب آپ سے پوچھا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے تو آپ نے فرمایا ❸ (۸۸) ((طُوْلُ الْقُنُوْتِ)) یعنی عبادت میں ہمہ تن مصروف ہو جانا اور اس کے ماسوا سے توجہ پھیر لینا قرآن پاک میں ہے ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا﴾ (۱۶۔۱۲۰) بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام (لوگوں کے) امام اور (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ اور مریم علیہا السلام کے متعلق فرمایا ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ﴾ (۶۶۔۱۲) اور فرمانبرداروں میں سے تھیں۔

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا﴾ (۳۹۔۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

﴿اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ﴾ (۳۔۴۳) اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا۔

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (۳۳۔۳۱) اور جو تم میں سے خدا اور اس کے رسول کی فرمانبردار رہے گی۔

﴿وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ﴾ (۳۳۔۳۵) اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں۔

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ (۴۔۳۴) تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں۔

(ق ن ط)

اَلْقُنُوْطُ (مصدر) کے معنی بھلائی سے مایوس ہونے کے ہیں اور یہ قَنَطَ (ض) وَقَنِطَ (س) قُنُوْطًا یعنی ہر دو ابواب سے استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ﴾ (۱۵۔۵۵) آپ مایوس نہ ہوئیے۔

﴿وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ (۱۵۔۵۶) خدا کی رحمت سے (میں مایوس کیوں ہونے لگا۔ اس سے) مایوس ہونا تو گمراہوں کا کام ہے۔

---

❶ وفی المستدرك عن ابی سعید: كل حرف فی القرآن یذكر فیه القنوت فهو الطاعة (كنز العمال ۲ رقم ۷۷)

❷ رواه ابوداوٗد و النسائی فی حدیث طویل و مسلم فی صحیح انظر العون (۱: ۳۴۹۔۳۵۱) ورواه الترمذی عن جابر (۱: ۵۱) والحدیث فی اللسان (قنت) و مشكل القرآن للقبتی (۳۵۰) ونسبه المتقی فی التزالی الابانة لابی نصر عبدالله بن سعید بن سعید بن حاتم السخبری رقم ۷۷۔

❸ الحاكم فی المستدرك والترمذی ومسلم وابن ماجة عن جابرؓ والطبرانی عن ابن موسیٰ وعن عمرو بن عبیدة وعن عمر بن قتادة اللیثی والحدیث فی الكشاف (۳/۴۰) والفائق (۲/۸۵) قال الحافظ فی تخریجه علی الكشاف: وفی روایة الطحاوی طول القیام (راجع رقم ۳۱۸)

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۵۳) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَیَئُوْسٌ قَنُوْطٌ﴾ اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے (۴۱۔۴۹) اور کبھی قــنــط کا لفظ فرح کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿اِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ﴾ (۳۰۔۳۶) تو ناامید ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(ق ن ع)

اَلْقَنَاعَة کے معنی ضروریات زندگی میں سے تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہیں اور یہ قَنِعَ (س) یَقْنَعُ قَنَاعَةً سے ہے کیونکہ قَنَعَ (ف) یَقْنَعُ قُنُوْعًا کے معنی سوال کرنے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کریمہ: ﴿وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲۔۳۶) اور قناعت سے بیٹھنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قَانِعٌ سے مراد وہ سائل ہے جو باصرار سوال نہ کرے اور جو کچھ مل جائے اسی پر راضی ہو جائے شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۳۵۹) لَمَالُ الْمَرْءِ یُصْلِحُهُ فَیُغْنِیْ
مَفَاقِرَهُ اَعَفُّ مِنَ الْقُنُوْعِ

وہ مال جو انسان کی حالت درست رکھے اور احتیاج سے بچائے وہ سوال کرنے سے بہرحال بہتر ہے۔

اَقْنَعَ رَأْسَهُ: اس نے اپنے سر کو اونچا کیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ﴾ (۱۴۔۴۳) سر اٹھائے ہوئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قِنَاعٌ سے مشتق ہے اور قِنَاعٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے سر ڈھانکا جائے اس سے قَنِعَ (س) کے معنی ہیں اس نے اپنے فقر کو چھپانے کے لیے سر پر قناع اوڑھ لیا اور قَنَعَ (ف) کے معنی سوال کرنے کے لیے سر کھولنے یعنی لوگوں کے سامنے احتیاج ظاہر کرنے کے ہیں جیسا کہ خَفِیَ (س) کے معنی چھپنے اور خَفَی (ف) کے معنی خفاء کو دور کرنے یعنی ظاہر ہونے کے ہیں اور رجل مَقْنَعٌ کا محاورہ قَنَاعَة سے ہے یعنی وہ آدمی جس کی شہادت کو کافی سمجھا جائے اس کی جمع مَقَانِعُ ہے۔ شاعر نے کہا ہے [2]۔ (الطّویل)

(۳۶۰) شُهُوْدِیْ عَلٰی لَیْلٰی عُدُوْلٌ مَقَانِعٌ

اور لیلیٰ پر عادل اور پسندیدہ لوگ میرے گواہ نہیں تھے جن

---

[1] قاله شماخ بن ضرار فی ابیات یخاطب امرء ته، عائشه من قصیدة فی دیوانه ٥٦۔٦٢ والبیت فی اللسان والمحکم (قنع والاضداد للاصمعی (٥٠) والسجستانی (١٦) وابن السکیت (٢٠٣) وابن الانباری مع اخر (٦٦۔٦٧) واضدا دوابی الطیب (٥٧٩) والصاجی (١٦٨۔١٩٧) والمعانی اللقبتی (٤٢٩، ٤٩٩، ٢٣٣) والطبری (١٦٨/١٧) والبحر (٣٤٧/٦) وتهذیب الالفاظ ١٧ والبخلاء (١٨١) ومجاز ابی عبیدة (٢: ٥١) والجمهرة (٣: ١٣٢) والقرطبی (١٢: ٦٤) والمیدانی (١: ٢٥٤) والاشتقاق ٣٥٦۔

[2] قاله البعیث وصدره ١٠ نیت لیلی بالخلاء ولم یکن والبیت فی اللسان (قنع) والاشباه النحویه (٤: ٢٢) لکن فیه خلاء بدل بالخلاء وشهود بدون الاضافة وهی روایة الکامل (٣٩١) والمحاضرات للمؤلف (٨٦) والبیت أصا فی ایضاً لی (١: ١٩٣) والبلدان (سم: قعاقع) فی ستة ابیات والمحکم (قنع) واضداد ابی الطیب ٥٨٠ وبعده: وما کل مامنتك نفسك خالیا۔ یکون والا کل الهوی انت تابع ١٢۔

کی شہادت پر قناعت ہو سکے۔

اور قِنَاعٌ سے تَقَنَّعَتِ الْمَرْءَ ةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی برقعہ اوڑھنے کے ہیں۔

اور اس کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے: تَقَنَّعَ الرَّجُلُ مرد نے سر پر خود رکھا۔ قَنَّعْتُ رَأْسَهٗ بِالسَّيْفِ او السَّوْط: کسی کے سر پر تلوار یا کوڑا مارنا۔

(ق ن و)

اَلْقِنْوُ کے معنی (کھجور یا انگور کے) خوشے کے ہیں اس کا تثنیہ قِنْوَان اور جمع قِنْوَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ (۶۔۹۹) لٹکے ہوئے گچھے۔

اور قَنَاة (نیزے کی لکڑی) بھی ٹہنی ہونے میں قِنْوٌ کے مشابہ ہے لیکن وہ قناعت (نالی) جس میں پانی بہتا ہے اسے طول میں نیزے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر قَنَاةٌ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل قَنَيْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کا ذخیرہ جمع کرنے کے ہیں اور نالی میں بھی چونکہ پانی کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اس لیے اسے قَنَاةٌ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قَانَاهُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مل جانے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۳۶۱) كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ

اس کا رنگ شتر مرغ کے تازہ انڈے جیسا ہے جس کی سفیدی میں ہلکی سی زردی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اور قنا جس کے معنی ناک کے بانسہ کے اوپر اٹھنے اور اس کی نوک کے جھکی ہوئی ہونے کے ہیں۔ یہ معنی قَنَا بمعنی نیزہ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ وہ ہیئت میں اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ محاورہ ہے:

رَجُلٌ اَقْنٰى وَامْرَءَةٌ قَنْوَاءُ: وہ مرد یا عورت جس کی ناک درمیان سے اٹھی ہوئی ہو اور اس کے نتھنے تنگ ہوں۔

(ق ن ی)

اَلْاِقْنَاءُ: (افعال) کے معنی غنی کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى﴾ (۵۳۔۴۸) اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس کرتا ہے۔

یہ اِقْنَاءٌ (افعال) سے ہے جس کے معنی اتنا مال دینے کے ہیں کہ احتیاج باقی نہ رہے یا قُنْيَةٌ سے ہے اور اسکے معنی ذخیرہ کیا ہوا مال بخشنے کے ہیں۔ [2] اور بعض نے کہا ہے کہ اَقْنٰى کے معنی اَرْضٰى یعنی راضی کرنا ہیں۔ [3] اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رضا و اطاعت کا خزانہ بخش دیا اور یہ غنا مادی غنا (مالداری) سے بڑھ کر ہے۔

اور قِنْيَةٌ کی جمع قِنْيَاتٌ آتی ہے اور قَنَيْتُ كَذَا او اَقْتَنَيْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو لازم پکڑنے کے ہیں، اسی سے شاعر نے کہا ہے [4] ()

(۳۶۲) قَنَيْتُ حَيَائِيْ عِفَّةً وَتَكَرُّمًا

---

[1] قاله امرؤالقيس فی لامیته یصف حبیبته، وتمامه: غذاها نمیر الماء غیر محلل راجع للبیت دیوانه۔ ۱۰ (صنعة السند وبی) والجمهرة ۹۸ والمعانی للقبتی ۳۶۱ ولعمدة (۲: ۹۸) والبحر (۷: ۳۶) ومختار الجاهلی ۱۱ والاشباه (۳: ۲۱۵) واللسان (قنی) وغریب القرآن للقبتی ۳۷۱ والعقد الثمین ۱۴۸ والمعلقات مع الانباری ۷۰ والتبریزی ۳۵ وفیه ضبط اعرابه۔

[2] قال ابن کثیر وعلیه یدور کلام کثیر من المسفرین واختاره بن جریر ورواه عن ابی صالح (ص۷۵ ج ۲۷)۔

[3] رواه ابن ابی حاتم عن ابن عباسؓ ونقل فیه اقوالا آخر (ص۷۶ ج ۲۷)

[4] قاله حاتم الطائی واوله۔ اذا قل مالی او نکبت بنکبة والبیت فی اللسان (قنی) ۱۲

تو میں بوجہ عفت و کرم کی وجہ سے حیا کی چادر اوڑھ لیتا ہوں۔

(ق ھ ر)

اَلْقَھْرُ کے معنی کسی پر غلبہ پا کر اسے ذلیل کرنے کے ہیں اور دنوں (یعنی غلبہ اور تذلیل) میں سے ہر ایک معنی میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (۶۔۱۸) اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔

﴿وَ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (۱۳۔۱۶) اور وہ یکتا اور زبردست ہے۔

﴿وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۲۷) اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ (۹۳۔۹) تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرو۔ یعنی اسے ذلیل نہ کرو۔

اَقْهَرَهٗ: کسی پر ایسے شخص کو مسلط کرنا جو اسے ذلیل کر دے۔

اَلْقَهْقَرٰی: پچھلے پاؤں لوٹنا۔

(ق و ب)

اَلْقَابُ کے معنی کمان کے درمیانی حصہ (مقبض) سے لے کر ایک گوشہ کمان تک کے فاصلہ کے ہیں اور قوس کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے) چنانچہ فرمایا:

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ (۵۳۔۹) تو دو کمانوں کے قاب کے فاصلہ پر یا اس سے بھی کم۔

(ق و ت)

اَلْقُوْتُ: غذا جس سے سدِّ رمق ہو سکے اس کی جمع اقوات ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا﴾ (۴۱۔۱۰) اور اس میں سب سامان معشیت مقرر کیا۔

قَاتَهٗ يَقُوْتُهٗ قَوْتًا کے معنی غذا کھلانے کے ہیں، اور اَقَاتَهٗ يُقِيْتُهٗ کے معنی ایسی چیز دینے کے ہیں جس سے وہ قوت حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے [1] (۸۹)

((اِنَّ اَكْبَرَ الْكَبَائِرِ اَنْ يُّضَيِّعَ الرَّجُلُ مَنْ يَّقُوْتُ)) کہ جس کی قوت انسان کے ذمہ ہو اسے ضائع کرنا سب سے بڑا گناہ ہے ایک روایت میں مَنْ يُّقِيْتُ (افعال) بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا﴾ (۴۔۸۵) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی مقتدر یعنی قدرت رکھنے والا کیے ہیں اور بعض نے محافظ اور بعض نے شاہد یعنی حاضر رہنے والا...... لیکن اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اللہ ہر چیز کی حفاظت کرتا اور اسے روزی دیتا ہے۔

اور اس میں قوت قُوْتٌ قِيْتٌ وَقِيْتَهٌ تین لغات ہیں جیسے طُعْمٌ وَطِعْمٌ وَطُعْمَةٌ چنانچہ محاورہ ہے: مَالَهٗ قُوْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتَةُ لَيْلَةٍ: اس کے پاس ایک رات کا بھی کھانا نہیں ہے شاعر نے آگ کی صفت میں کہا ہے [2] (الطّویل)

---

[1] مجمع البحار والفائق (۲/۱۸۹) وفیه کفی بالرجل اثما ان يُّضِيِّعَ من يقوت وابوداؤد (۱/۲۳۵) والنسائی والحدیث فی الاحیاء للغزالی ولفظه: کفی بالمرء اثما ان یضیع من یعول وهو عند مسلم بلفظ آخر آخر راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (۲: ۳۳)۔

[2] قاله ذوالرمة فی وصف نار فی قصیده له فی دیوانه ۲۴ (طبعه کمبرج ۱۹۱۹ وقد مرّفی (روح)

(۳۶۳)فَقُلْتُ لَهٗ اِرْفَعْهَا اِلَیْكَ وَاَحْيِهَا بِرُوْحِكَ وَاقْتَتْهُ لَهَا قِيْتَةً قَدْرًا

میں نے اسے کہا کہ اسے اپنی طرف اٹھاؤ اور اس پر تھوڑا تھوڑا ایندھن لگا کر نرم پھونک سے اسے سلگاؤ۔

(ق و س)

اَلْقَوْس: کمان۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ (۵۳۔۹)تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔

اور کمان کی ہیئت کذائی کے لحاظ سے تَقَوُّسٌ بمعنی اِنْحِنَاءِ آتا ہے۔محاورہ ہے:۔

قَوَّسَ الشَّيْخُ وَتَقَوَّسَ: بوڑھا خمیدہ ہوگیا۔قَوَّسْتُ الْخَطَّ: میں نے خمیدہ خط کھینچا۔اور خمیدہ خط کو مُقَوَّسٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِقْوَسُ: وہ جگہ جہاں سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑنا شروع کرتے ہیں اور اس کے اصل معنی اس رسی کے ہیں جس سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں کی صف بندی کی جاتی ہے اور پھر انہیں دوڑنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔

(ق و ل)

اَلْقَوْلُ اور اَلْقِيْلَ کے معنی بات کے ہیں

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (۴۔۱۲۲)اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہوسکتا ہے۔

قول کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱)عام طور پر حروف کے اس مجموعہ پر قول کا لفظ بولا جاتا ہے جو بذریعہ نطق کے زبان سے ظاہر ہوتے ہیں خواہ وہ الفاظ مفرد ہوں یا جملہ کی صورت میں مفرد۔جیسے زَيْدٌ خَرَجَ اور مرکب جیسے زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ وَهَلْ خَرَجَ عَمْرٌو وَنَحْو ذَالِكَ: کبھی انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف میں ہر ایک کو قول کہا جاتا ہے جس طرح کہ قصیدہ اور خطبہ وغیرہما کو قول کہہ دیتے ہیں۔

(۲)جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قول کہتے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں آیت کریمہ:﴿وَيَقُوْلُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ﴾ (۵۸۔۸)اور اپنے دل میں کہتے ہیں (اگر یہ واقعی پیغمبر ہیں تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا ہمیں اس کی سزا کیوں نہیں دیتا۔

یعنی دل میں خیال کرنے کو قول سے تعبیر کیا ہے۔

(۳)رائے خیال اور عقیدہ پر بھی قول کا لفظ بولا جاتا ہے۔جیسے فُلَانٌ يَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ: (فلاں ابو حنیفہؒ کی رائے کا قائل ہے)

(۴)کسی چیز پر دلالت کرنے کو قول سے تعبیر کر لیتے ہیں۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔❶ (الرجز)

(۳۶۴)اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِيْ

حوض بھر گیا اور اس نے کہا بس مجھے کافی ہے۔

---

❶ قاله الراجز وقرينه مهلا رويدا قد ملات بطنى هذه الرواية فى شرح الدرة للخفاجى ۳۱ والصحاح (قطط) والتنبيه للبكرى (۶۲) والمسط (۴۷۵) والابدال لابى الطيب (۱: ۳۷۴) وهى رواية النحاة وفى اللسان والتاج (قطط) وتهذيب اصلاح المنطق (۱: ۱۰۱) واصلاح يعقوب (۵۷، ۳۴۲) وابن الشجرى (۱: ۳۱۳/۲: ۴۰) سلا بدل مهلا وفى المقاييس حسبى بدل قطنى وفى الكامل (۴۲۴) قد خنق بدل امتلا راجع ايضا الانصاف ۷۳ مجالس ثعلب (۱: ۱۵۸) والعينى (۳۶۱) والطبرى (۱: ۵۱۰) والفخر (۲۱: ۱۰۲) والمقاييس (۵: ۱۴) والمرتضى (۲: ۱۰۹) ومجازات القرآن للسيد شريف الرضى (۳۱۱)۔

(۵) کسی چیز کا صدق دل سے اعتبار کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا جیسے فُلَانٌ یَقُوْلُ بِکَذَا فلاں اس کا صدق دل سے خیال رکھتا ہے۔

(۶) اہل منطق کے نزدیک قول بمعنی حد کے آتا ہے جیسے قَوْلُ الْجَوْهَرِ كَذَا۔ وَقَوْلِ الْعَرْضِ كَذَا یعنی جوہر کی تعریف یہ ہے اور عرض کی یہ۔

(۷) الہام کرنا یعنی کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا جیسے فرمایا:

﴿قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ﴾ (۱۸۔۸۶)

ہم نے کہا ذوالقرنین! تم ان کو خواہ تکلیف دو۔

(یہاں قول بمعنی الہام اور القا کے ہے) کیونکہ تاریخ اور روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو (انبیاء کی طرح) مخاطب نہیں کیا گیا بلکہ یہ بات ان کے دل میں القا کر دی گئی تھی چنانچہ اس الہام کو قول سے تعبیر کر دیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:

﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ (۴۱۔۱۱) انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔

میں خطاب ظاہری نہیں تھا بلکہ ان کا یہ امتثال اور اظہار اطاعت تسخیری طریقہ سے تھا اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا﴾ (۲۱۔۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور .... (موجب سلامتی بن جا۔)

میں مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (۳۔۱۶۷) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

میں اَفْوَاهِهِمْ کے لفظ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اس کی تائید نہیں کرتے اور یہ محاورہ ایسے ہی ہے جس طرح کتابت کے ساتھ ید کا لفظ ذکر کر کے اس کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۷۹) تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۳۶۔۷) ان میں سے اکثر پر خدا کی بات پوری ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ میں قول سے اللہ کا علم اور اس کا حکم مراد ہے۔ ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ (۶۔۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں پوری ہو گئیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۰۔۹۶) جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پا چکا ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔

حکم عذاب کو کلمۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت کریمہ

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ﴾ (۱۹۔۳۴) یہ مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام ہیں (اور یہ) سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو قول الحق کہہ کر آیت کریمہ:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (۳۔۵۹)

اللہ کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام کی مثال...... پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے۔

کے مضمون پر تنبیہ کی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو قول کہنا ایسے ہی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:

﴿وَ كَلِمَتُهٗۤ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ﴾ (۴۔۱۷۱) اور یہ کلمہ (بشارت) تھا جو اس نے مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا تھا۔ میں انہیں کلمہ کہا گیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱۔۸) تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ بعث (موت کے بعد زندگی) کے معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور بعث کو جو درحقیقت مقول فیہ ہے (مجازاً) قول کہہ دیا ہے۔ جیسا کہ مذکور چیز کو ذکر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ﴾ (۶۹۔۴۰،۴۱) یہ قرآن پاک فرشتے عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

میں قرآن پاک کو قولِ رسول یعنی حضرت جبریل کا قول کہنا بنا برمجاز ہے کیونکہ جو پیغام کسی رسول کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے اس کی نسبت رسول اور مرسل دونوں کی طرف صحیح ہوتی ہے یعنی کبھی مجازاً اسے قولِ رسول کہہ دیتے ہیں اور کبھی بنا برحقیقت مرسل کی طرف نسبت کر دیتے ہیں اگر اس پر یہ شبہ وارد ہو کہ اس اصل کی بنا پر تو شعر یا خطبہ کی نسبت بھی ان کے راوی کی طرف صحیح ہونی چاہیے جس طرح کہ انکی نسبت قائل کی طرف ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ بے شک آپ شعر یا خطبہ کو قولِ راوی کہہ سکتے ہیں لیکن اسے شعر راوی یا خطبہ راوی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شعر کا اطلاق قول کی خاص شکل وصورت پر ہوتا ہے اور اس شکل وصورت کے ڈھالنے میں راوی کا کوئی دخل نہیں ہے مگر قول کی نسبت راوی اور مروی عنہ دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۶) جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

میں صرف زبان کے ساتھ اِنَّا لِلّٰهِ الخ کہنا مراد نہیں بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد وعمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اَلْمِقْوَلُ کے معنی زبان کے ہیں اور محاورہ میں رَجُلٌ مِقْوَلٌ وَ مِنْطِيْقٌ وَ قَوَّال وَ قَوَّالَةٌ کے معنی زبان دراز آدمی کے ہیں۔

اَلْقِيْلُ: حمیری بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اور انہیں قیل یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کی ہر ایک بات پر اعتماد کیا جاتا تھا اور اس کی اقتداء کی جاتی تھی اور یا اس لیے کہ ان میں ہر ایک اپنے آباء کی روش پر چلتا تھا اور یہ تَقَيَّلَ فُلَانٌ اَبَاهُ (گفتار میں اپنے باپ کے مشابہ ہونا) کے محاورہ سے مشتق ہے جس طرح کہ (یمن کے ہر) بادشاہ کو تبع کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر بادشاہ اپنے فیصلوں میں اپنے سے پیشرو کی اقتداء کرتا تھا۔

اصل میں یہ واوی ہے کیونکہ اس کی جمع اقوال آتی ہے جیسے مَيْتٌ کی جمع اَمْوَاتٌ آتی ہے۔

نیز یہ قَيِّلٌ کا مخفف ہے جیسے مَيْتٌ وَ مَيِّتٌ اور جو لوگ اس کی جمع اَقْيَالٌ بناتے ہیں تو یہ (اقوال جمع قول سے،

فرق کرنے کے لیے ہے جو) جس طرح کہ (عید کی جمع) اَعْیَادٌ ہے پھر اس سے فعل مشتق کرکے تَقَیَّلَ اَبَاہُ کہہ دیتے ہیں جس طرح کہ (عید کے لفظ سے) تعید کہا جاتا ہے۔

اِقْتَـالَ قَوْلًا: ایسی بات کہنا جو فائدہ یا نقصان کا باعث بنے اور کبھی اِقْتَـالَ بھی اِحْتَـکَمَ آتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الخفیف)

(۳۶۵) یَأْبٰی حَکُوْمَةَ الْمُقْتَالِ

کسی زبردستی حاکم بننے والے کی حکومت کو نہیں مانتا۔

اَلْقَالُ وَالْقَالَةُ: وہ بات جو نشر ہو جائے۔

خلیل نے کہا ہے کہ کبھی قَالَ بمعنی قَائِلٌ بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

اَنَا قَالَ کَذَا یعنی میں اس کا قائل ہوں ❷۔

(ق و م)

قَـامَ یَـقُوْمُ قِیَامًا فَھُوَ قَائِمٌ...... کھڑا ہونا قَائِمٌ کی جمع (بھی) قیام آتی ہے اور اَقَـامَ بِالْمَکَانِ اِقَـامَةً کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں اور قیام کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے:۔

(۱) کسی شخص کا تسخیری طور پر یا اپنے ارادے سے کھڑا ہونا۔

(۲) قِیَامٌ لِّلشَّیْءِ: یعنی شے کی حفاظت اور نگہبانی کرنا۔

(۳) کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا۔

تسخیری طور پر کھڑا ہونے کے معنی میں فرمایا۔

﴿مِـنْـھَـا قَـآئِمٌ وَّ حَصِیْدٌ﴾ (۱۱۔۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض تہس نہس ہو گئے ہیں۔ ﴿مَـا قَـطَـعْـتُـمْ مِّـنْ لِّیْـنَةٍ اَوْ تَـرَکْتُمُوْھَا قَآئِمَةً عَلٰٓی اُصُوْلِھَا﴾ (۵۹۔۵) کھجور کے جو درخت تم نے کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا کے حکم سے تھا۔

اور قیام اختیاری کے معنی میں فرمایا:

﴿اَمَّـنْ ھُـوَ قَـانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا﴾ (۳۹۔۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلَّـذِیْـنَ یَـذْکُـرُوْنَ الـلّٰـهَ قِیَـامًـا وَّ قُعُوْدًا﴾ (۳۔۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے...... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اور نیز آیت:

﴿وَالَّـذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا﴾ اور وہ لوگ اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کرکے (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

میں قیام قائم کی جمع ہے اور کسی چیز کی حفاظت اور مراعات کے معنی میں فرمایا:

﴿اَلـرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (۴۔۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور محافظ ہیں۔

﴿کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۔۸) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

---

❶ قاله الاعشی فی قصیدة له فی ۷۵ بیتا یمدح فیها الاسود بن المذر اللخمی وصدره: والمثل الذی جمعت لریب الد...... هر والبیت فی اللسان والمحکم (حکم) والمعانی للقبتی (۹۲۳) وفی المطبوع تابی بالتاء والصواب بالیاء کما فی المراجع وفی دیوانه (۱٦۸) من العدة بدل لریب الدهر۔

❷ وایضا ﴿ولو تقول علینا بعض الاقاویل﴾ (٦۹۔٤٤) معناه النسبة الی احد القول کذبا وزورا۔

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (۳۔۱۸) جو انصاف پر قائم ہیں۔
﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو خدا ہر متنفس کے اعمال کا نگہبان ہے۔
یہاں (بھی) قائم بمعنی حَافِظٌ ہے۔ نیز فرمایا ﴿لَيْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (۳۔۱۱۳) یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں۔
اور آیت کریمہ:
﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا﴾ (۳۔۷۵) تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔
میں قَآئِمًا کے معنی برابر مطالبہ کرنے والے کے ہیں اور قیام بمعنی عزم کے متعلق فرمایا:
﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ (۵۔۶) مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (۲۔۳) اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ...... ہیں۔
میں يُقِيْمُوْنَ کے معنی نماز پر دوام اور (اس کے ارکان کی) حفاظت کرنے کے ہیں۔
اور قِيَامٌ و قِوَامٌ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی چیز قائم رہ سکے جس طرح کہ عِمَادٌ اور سِنَادٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو سہارا لگا دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (۴۔۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال، جسے خدا نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا مت دو۔
یعنی ان کو تمہاری بقا کا سبب بنایا، اسی طرح آیت:
﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا﴾ (۵۔۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو موجب امن مقرر فرمایا:
میں بیت اللہ کے قِيَامًا لِّلنَّاسِ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کی اصلاح اور درستگی بیت اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اصم کا قول ہے [1] کہ یہاں قیام بمعنی قائم ہے یعنی اس کی یہ حیثیت کبھی منسوخ نہیں ہوگی اور ایک قرأت میں قِيَمًا ہے جو بمعنی قِيَامًا ہے اور بعض اسے قِيْمَةٌ کی جمع بتاتے ہیں لیکن یہ توجیہہ بے معنی سی ہے۔
اور محاورہ میں قَامَ كَذَا وَثَبَتَ وَرَكَزَ کے ایک ہی معنی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى﴾ (۲۔۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔
(میں لفظ مقام بھی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔)
قَامَ فُلَانٌ مَقَامَ فُلَانٍ کے معنی کسی کے قائم مقام ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ﴾ (۵۔۱۰۷) تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ

[1] هو ابوبكر عبدالرحمن بن كيسان الاصم المتوفى ٢٤٠هـ اقدم شيوخ المعتزلة وفي الفهرست ٥٧ ان له كتابافي في تفسير القرآن وفي لسان الميزان (٣: ٤٢٧) الاصم المعتزلي صاحب المقالات في الاصول وله تفسير عجيب انظر الملل وذيله (١: ٣٦)

کھڑے ہوں پاک تمام کتب سماویہ کے مطالب پر حاوی ہے کیونکہ قرآن

اورآیت کریمہ: ﴿دِيْـنًا قِيَمًا﴾ (۶۔۱۶۲) یعنی دین صحیح ہے۔ میں قِيَـمًـا بھی ثابت ومقوّم کے معنی میں ہے یعنی ایسا دین جو لوگوں کے معاشی اور اخروی معاملات کی اصلاح کرنے والا ہے ایک قرأت میں قِيَـمًا مخفف ہے جو قیام سے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صفت کا صیغہ ہے جس طرح کہ قَـوْمٌ عِـدًى، مَـكَـانٌ سِوًى، لَـحْمٌ، رِذًى، مَاءٌ رُوًى میں عدًى سِوًى اور رِذًى وغیرہا اسمائے صفات ہیں اور اسی معنی میں فرمادیا۔

﴿ذٰلِكَ الـدِّيْـنُ الْـقَيِّـمُ﴾ (۹۔۳۶) یہی دن (کا) سیدھا (راستہ) ہے۔

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (۱۸۔۱) اوراس میں کسی طرح کی کجی اور پیچیدگی نہ رکھی بلکہ سیدھی (اور سلیس اتاری ہے)

اورآیت کریمہ: ﴿وَذٰلِكَ دِيْـنُ الْقَيِّمَةِ﴾ (۹۸۔۵) یہی سچا دین ہے۔

میں قَيِّـمَة سے مراد امت عادلہ ہے جس کی طرف آیت کریمہ:

﴿كُـنْتُـمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ (۳۔۱۱۰) تم سب سے بہتر ہو۔

اورآیت:

﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (۴۔۱۳۵) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَتْلُوْا صُحُفًا مُّـطَهَّـرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ (۹۸۔۲،۳) جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

میں صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ اور فِيْهَـا كُتُـبٌ قَيِّـمَة کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک تمام کتب متقدمہ کا ثمرہ اور نچوڑ ہے اور آیت:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (۲۔۲۵۵) خدا وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ، ہمیشہ رہنے والا۔

میں قَيُّـوْم (اسمائے حسنٰی سے ہے) یعنی ذات الٰہی ہر چیز کی نگران اور محافظ ہے اور ہر چیز کو اس کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿اَلَّـذِيْ اَعْـطٰـى كُـلَّ شَـيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

﴿اَفَـمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۱۳۔۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران ہے۔

قَيُّوْمٌ بروزن فَيْعُوْلٌ اور قَيَّامٌ بروزن فَيْعَالٌ سے جیسے دَيُّوْنٌ وَدَيَّانٌ۔

اَلْقِيَامَةُ: سے مراد وہ ساعت (گھڑی) ہے۔

جس کا ذکر کہ ﴿وَيَـوْمَ تَـقُوْمُ السَّاعَةُ﴾ (۴۰۔۴۶) اور جس روز قیامت برپا ہوگی۔

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۸۳۔۶) جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

﴿وَّمَآ اَظُـنُّ السَّـاعَةَ قَآئِمَةً﴾ (۱۸۔۳۶) اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو۔

وغیـرھا آیات میں پایا جاتا ہے۔ اصل میں قیامۃ کے معنی انسان کے یکبارگی قِيَـام یعنی کھڑا ہونے کے ہیں اور قیامت کے یکبارگی وقوع پذیر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لیے

لفظ قیام کے آخر میں ھاء (ۃ) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ❶

اَلْـمُـقَـامُ: یہ قیام سے کبھی بطور مصدر میمی اور کبھی بطور ظرف مکان اور ظرف زمان کے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ کَـانَ کَـبُـرَ عَـلَـیْـکُـمْ مَّقَامِیْ وَ تَذْکِیْرِیْ﴾ (۱۰۔۷۱) اگر تم کو میرا رہنا اور...... نصیحت کرنا ناگوار ہو۔

﴿وَذٰلِکَ لِـمَـنْ خَافَ مُقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ﴾ (۱۴۔۱۴) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے۔ ﴿وَلِـمَـنْ خَـافَ مَقَـامَ رَبِّـهٖ﴾ (۵۵۔۴۶) اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا۔ ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی﴾ (۲۔۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔

﴿فِیْـهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ﴾ (۳۔۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَـقَـامٍ کَرِیْمٍ﴾ (۴۴۔۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

﴿اِنَّ الْـمُـتَّـقِیْـنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ﴾ (۴۴۔۵۱) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

﴿خَیْـرٌ مَّـقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا﴾ (۱۹۔۷۳) مکان کس کے اچھے اور مجلس کس کی بہتر ہیں۔

﴿وَمَـا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ (۳۷۔۱۶۴) ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقرر مقام ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنَـا اٰتِیْکَ بِـهٖ قَبْـلَ اَنْ تَـقُـوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ﴾ (۲۷۔۳۹) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، میں اس کو آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔

کی تفسیر میں اخفش نے کہا ہے کہ یہاں مقام بمعنی مَـقْعَد یعنی نشستگاہ کے ہیں۔ اگر اخفش کا مقصد اس سے یہ ہے کہ مقام اور مقعد بالذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف نسبت الی الفاعل کے لحاظ سے دونوں میں فرق پایا جاتا (یعنی ایک ہی جگہ کو کسی شخص کے وہاں کھڑے ہونے کے لحاظ سے مقام اور بیٹھنے کے اعتبار سے مقعد کہا جاتا ہے جس طرح کہ صَـعُـوْدٌ اور حَدُوْرٌ کے الفاظ ہیں (کہ ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَـعُـوْدٌ اور اس سے نیچے اترنے کے لحاظ سے حَـدُوْرٌ کہا جاتا ہے) تو یہ بجا ہے اور اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ لغت میں مقام بمعنی مقعد آتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض نے الـمـقـامۃ کے معنی جماعت بھی کیے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❷

(الطّویل)

(۳۶۲) وَفِیْهِمْ مَقَامَات حِسَانٌ وُجُوْهُهُمْ

اور ان میں خوبرو لوگوں کی جماعتیں ہیں...... مگر یہ بھی دراصل ظرف مکان ہے اگرچہ (مجازاً) اصحاب مقام مراد

---

❶ و لذا عبر عن اتیا نها بلفظ بغتة راجع (۶۔۳) (۷۔۱۸۷) (۲۱۔۴۰) (۲۲۔۵۵) (۴۳۔۶۶) (۴۷۔۱۸)۔

❷ قاله زهیر یمدح سنان بن الحارثه وتمامه: واندیة ینتابها القول والفعل۔ والبیت فی دیوانه مع شرح الاعلم الشنتمری۔ رطبعه لیدن و شواهد الکشاف (۹۰) والعمدة (۲: ۱۳۴) والصناعتین (۱۰۲) ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۶۳) ونقد الشعر ۳۳ فی سبعه ابیك والبحر المحیط (۵/۸۸) (۸/۸۹۱) والعقد الثمین ۹۱ والعقد الفرید (۱: ۳۸۸) والسیوطی (۱۰۸)۔

ہیں جس طرح کہ [1] (الکامل)

(۳۶۷)وَاسْتَبَّ بَعْدَكَ يَا كُلَيْبُ الْمَجْلِسُ

اے کلیب! تیرے بعد لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے ہیں۔

اَلْاِسْتِقَامَةُ: (استفعال) کے معنی راستہ کے خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی...... صراط مستقیم کہا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿اِهْدِنَـا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (۱۔۵) ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

﴿وَ اَنَّ هٰـذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا﴾ (۶۔۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۱۱۔۵۶) بے شک میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّـذِيْـنَ قَـالُـوْا رَبُّـنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (۴۱۔۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔

﴿فَـاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ (۱۱۔۱۱۲) سو (اے پیغمبر) جیسا کہ تم کو حکم ہوتا ہے اس پر...... قائم رہو۔

﴿فَـاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْـهِ﴾ (۴۱۔۶) تو سیدھے اس کی طرف متوجہ ہو۔

اِلْاِقَـامَةُ: (افعال) فی المکان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اِقَـامَةُ الشَّيْءِ: (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُـمْ عَـلٰـى شَـيْءٍ حَتّٰـى تُـقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ (۵۔۶۸) کہو کہ اے اہل کتاب! جب تک تم توراۃ اور انجیل......کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں سکتے۔یعنی جب تک کہ علم وعمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَـامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (۵۔۶۶) اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو...... قائم رکھتے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔وہاں اقامۃ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اَقِيْـمُـوا الـصَّـلٰـوةَ اور اَلْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ کہا ہے [2]۔اور آیت کریمہ:

---

[1] قالہ مهلهل بن ربيعه يرثى اخاه كليباً وصدره كما فى امالى القالى (۱ : ۹۵) نبئت انَّ النّارَ بعدك اوقدت والشطر فى مجالس ثعلب ۳۷ والبيت فى الحماسة مع المرزوقى رقم ۳۱۵ والمختارات ۶۲ واللآلى ۲۹۸ وفيها صدره برواية ابن السكيت، ذهب الخيار من المعاشر كلهم والبيت فى الحصرى (۴/۶۳/۲ : ۱۷۹) فى ثلاثة وفى الصناعتين (۲۰۳ والمجالس (۵۸۴) وامالى ابن التجرى (۱ : ۵۲) اودى بدل ذهب فى خمسة والبيت ايضا فى البحر (۱ : ۱۱۳) و محاضرات المولف (۱ : ۲/۷۵ : ۴۰) وانظر القصة (۱/۳۰۱) والعقد فى ايام العرب والاغانى (۴ : ۱۳۹۔۱۵۱)

[2] الآية ۳۵ من سورة الحج هذه قراءة ابن مسعود و بحذف النون والاضافة قراءة ابى عمرو وابن ابى اسحاق والحـ.. وبحذف النون ونصب الصلوة راجع ابو حبان (۶ : ۳۶۹)

﴿وَ اِذَا قَامُوْآ اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی﴾ (۴۔۱۴۲) اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو ست اور کاہل ہوکر۔

میں قَامُوْا ، اِقَامَۃٌ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ﴾ (۱۴۔۴۰) اے پروردگار! مجھ کو (ایسی توفیق عنایت) کر کہ نماز پڑھتا رہوں۔

میں دعا ہے کہ الٰہی! مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔اور آیت کریمہ:﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (۹۔۵) پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے......لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

اَلْمُقَامُ: یہ مصدر میمی، ظرف مکان، ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّھَا سَآئَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا﴾ (۲۵۔۶۶) اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامۃ (بضم المیم) بمعنی اقامۃ ہے جیسے فرمایا۔

﴿الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَۃِ مِنْ فَضْلِہٖ﴾ (۳۵۔۳۵) جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا یہاں جنت کو دَارُالْمُقَامَۃَ کہا ہے جس طرح کہ اسے دَارُالْخُلْدِ اور جَنّٰتِ عَدْنٍ کہا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا مُقَامَ لَکُمْ فَارْجِعُوْا﴾ (۳۳۔۱۳) یہاں تمہارے لیے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور ایک قرأت میں مَقَامُ (بضم المیم) اَقَام سے ہے اور کبھی اَقَامَۃ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔جیسے فرمایا﴿عَذَابٌ مُّقِیْمٌ﴾ (۵۔۳۷) ہمیشہ کا عذاب۔

اور ایک قرأت میں آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ﴾ (۴۴۔۵۱) بے شک پرہیز گار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ مقام بضمہ میم ہے۔یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تَقْوِیْمُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (۹۵۔۵) کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل وفہم قد وقامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

تَقْوِیْمُ السِّلْعَۃِ: سامان کی قیمت لگانا۔اَلْقَوْمُ: یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔چنانچہ فرمایا:

﴿لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۴۹۔۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

اور شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۳۶۸) أَقَوْمٌ آلُ حِصْنٍ اَمْ نِسَاءٌ کہ آل حصن مرد ہیں یا عورتیں؟

اور قرآن پاک میں عموماً مرد وعورتیں سبھی مراد لیے گئے ہیں لیکن اصل میں یہ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس پر کہ آیت۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (۴۔۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور حاکم ہیں۔

میں (بھی) تنبیہ پائی جاتی ہے۔ ❷

(ق و و)

اَلْقُوَّةُ: یہ کبھی قدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ (۲۔۶۳) اور حکم دیا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی اس کو زور سے پکڑے رہو۔

اور کبھی قوت بمعنی استعداد اور صلاحیت کے آتا ہے جو کسی چیز کے اندر پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نَوٰۃ (یعنی کھجور کی گٹھلی) بـاالقوۃ کھجور کا درخت ہے یعنی اس میں کھجور کا درخت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اور کبھی قوت بدنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

اور کبھی قوت قلبی کے لیے اور کبھی کبھی خارجی معاون چیزیں مراد ہوتی ہیں اور کبھی قوت بمعنی قدرت الٰہیہ کے آتا ہے چنانچہ بدنی قوت کے متعلق فرمایا:

﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (۴۱۔۱۵) ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے۔

﴿فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ﴾ (۱۸۔۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

یہاں قوت سے بدنی قوت مراد ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی مدد کی پیش کش کو مَامَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا اور قوت قلبی کے متعلق فرمایا:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ (۱۹۔۱۲) اے یحییٰ! ہماری کتاب کو زور سے پکڑے رہو۔

یعنی پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کتاب الٰہی پر عمل کرو اور خارجی معاون کے معنی میں فرمایا:۔ ﴿لَوْ اَنَّ لِىْ بِكُمْ قُوَّةً﴾ (۱۱۔۸۰) اگر مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوگی۔

چنانچہ بعض نے اس جگہ قوت سے فوجی یا مالی طاقت مراد لی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿نَحْنُ اُولُوا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ (۲۷۔۳۳) ہم بڑے زور آور اور سخت جنگجو ہیں۔ اور قوۃ بمعنی قدرت الٰہیہ کے متعلق فرمایا:

---

❶ قاله زبير بن ابى سلمى هجاء بيت من كلب من بنى سليم فى قصيدة له مطلعها: عنا من آل فاطمة الجوائر۔ فيمن فالقوادم فالحساء راجع اللسان (حصن) وديوانه (۱۵۹) مع شرح الاعلم الشنتمرى وشواهد الكشاف ٦ مختار الشعر الجاهلى (۱: ۱۹۵) والبحر المحيط (۵: ۸/۸۳: ۱۱۲) والطبرى (۲۶: ۹۳) والعمدة (۲: ٦٦) فى باب التشكك (۱۷۱) وابن هشام رقم ۵۵، ۲۳۹ العجز والعقد الثمين (۷۷) وامالى ابن الشجرى (۲: ۳۳٤) (۱: ۲۲٦) والصاحبى ۱۸۹ والمعاهد (۲: ۵۲) والمعانى الكبير (۵۹۳) والسيوطى (۱٤۱،٤۸) وفى صنعة تجاهل العارف انظر قانون البلاغة (٤۵۹) فى ضمن رسائل البغاء

❷ وفى الكشاف القوم الرجال خاصة لانهم القوام بامور النساء قال الله تعالىٰ ﴿الرجال قوامون على النساء﴾ ص ۱۵۳ ج۳ قال فى الطبرى (۲٦/۹۳): وهو قول الخليل۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ (۵۷۔۲۵) بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔
﴿وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیْزًا﴾ (۳۳۔۲۵) اور خدا طاقت ور اور زبردست ہے۔
اور آیت کریمہ:
﴿اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔
میں قوت کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ قدرت الٰہی اور اس قدرت کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو عطا کی ہے اور آیات کریمہ ﴿وَ یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ﴾ (۱۱۔۵۲) اور تمہاری طاقت پر طاقت بڑھائے گا۔
میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ان کی استعداد کے مطابق قسما قسم کی قوت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور آیت:
﴿ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ﴾ (۸۱۔۲۰) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا۔
میں ذِیْ قُوَّۃٍ سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور اسے لفظ مفرد اور نکرہ کے ساتھ ذی قُوَّۃٍ کہنے سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ مَلَأ اَعْلٰی کے لحاظ سے اس کی قوت کم درجہ کی ہے۔ اور پھر آیت کریمہ:
﴿عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی﴾ (۵۳۔۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھلایا۔
میں ان کو جمع معرف بلام الجنس کے ساتھ متصف کر کے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ عالم سفلی اور اہل دنیا کے لحاظ جنہیں وہ تعلیم دیتا ہے وہ بہت بڑی قوت اور قدرت عظیم کا مالک ہے۔
قوت بمعنی استعداد و صلاحیت عام طور پر علمائے فلاسفہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص میں صلاحیت موجود ہو لیکن وہ بالفعل اسے استعمال نہ کر رہا ہو جیسے فُلَانٌ کَاتِبٌ بِالْقُوَّۃِ: (فلاں کاتب بالقوہ ہے) یعنی وہ لکھنا تو جانتا ہے لیکن اس وقت بالفعل لکھنے میں مشغول نہیں ہے اور دوسرے معنی فُلَانٌ کَاتِبٌ بِالْقُوَّۃِ کے یہ ہوتے ہیں کہ اس میں کتابت سیکھنے کی صلاحیت ہے۔ نہ کہ وہ فن کتابت جانتا ہے۔
مَفَازَۃٌ: یعنی ریگستان کو قَوَاءٌ کہا جاتا ہے اور اَقْوَی الرَّجُلُ کے معنی کسی آدمی کے قِوَاء یعنی بیابان میں چلے جانے کے ہیں۔ پھر قَفْر یعنی بیابان سے فَقْر کا معنی لے کر اَقْوَی الرَّجُلَ کا محاورہ افتقر یعنی محتاج اور نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ﴾ (۵۶۔۷۳) [1] اور محتاج ضرورت مندوں کے لیے سامان آسائش بنایا ہے۔ میں مُقْوِیْنَ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(ق ی ض)

اَلْقَیْضُ کے معنی انڈے کے اوپر کا چھلکا کے ہیں اور چھلکا چونکہ اس کے باقی ماندہ اجزاء پر محیط اور مستولی ہوتا ہے لہٰذا اس سے قَیَّضَ (فعل) کسی چیز پر غالب اور مستولی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

---

[1] اقوی من الاضداد (ابو الطیب ۵۶۹) ویحتمل ان یکون من اقوی الرجل اذا حصل فی القواء الی المفازۃ ۲۔

قَیَّضْنَا لَھُمْ قُرَنَآءَ اور ہم نے شیطانوں کو ہم نشین مقرر کر دیا ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا﴾ (۴۳۔۳۶) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ میں نُقَيِّضْ لَهٗ شيطانا کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے الگ ہو جاتے ہیں تاکہ شیطان اس پر اس طرح مسلط ہو جائے (جیسے انڈے کا اوپر کا چھلکا اپنے مَا فِيْهَا پر مستولی رہتا ہے۔

(ق ی ع)

اَلْقِيْعَةُ: ہموار میدان۔قرآن پاک میں ہے: ﴿كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ﴾ (۲۴۔۳۹) جیسے میدان میں ریت اَلْقِيعُ وَالْقَاعُ کے معنی ہموار زمین کے ہیں۔اس کی جمع قِيْعَانٌ اور تصغیر قُوَيْعٌ آتی ہے اور اسی سے قَاعَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی نر اونٹ کے ناقہ کے ساتھ جفتی کرنے (اور پوری طرح سوار ہو کر اس پر بیٹھ جانے) کے ہیں۔

(ق ی ل)

اَلْمَقِيْلُ: مقام استراحت چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا﴾ (۲۵۔۲۴) اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔ میں مَقِيْلًا قِلْتُ قَيْلُوْلَةً کا مصدر ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت استراحت کے لیے لیٹنے کے ہیں اور یا ظرف مکان ہے یعنی قیلولہ کی جگہ [1] محاورہ ہے: قِلْتُهٗ فِي الْبَيْعِ وَاَقَلْتُهٗ وَتَقَلَّيْلًا: بیع فسخ کرنا۔

❀❀❀

[1] القيلوله وزنه فيعلولة ويختص بذوات الياء مثل سار سير ورة وحاد حيدودة الاربعة احرف من ذوات الواوهي: كينونة وديومة هيعوعة وسيدودة راجع ادب الكاتب (۴۹۶) ومن القيلولة قوله تعالى: ﴿اوهم قائلون (۷۔۴)﴾

کِتَابُ الْکَافِ

(ک (حرف)

الکاف: حروف ہجا سے ہے۔ اور تشبیہ یا تمثیل کے معنی ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ (۲۔۲۶۴) تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر تھوڑی سی مٹی ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ (۲۔۲۶۴) اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔

میں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمثیل کے معنی پر محمول ہے۔ جیسا کہ علماء نحو کہتے ہیں۔ فَالْاِسْمُ كَقَوْلِكَ زَيْدٌ یعنی اسم کی مثال جیسے زید تو یہاں بھی کاف تمثیل کے لیے ہے۔ پھر تمثیل، تشبیہ سے عام ہے۔ کیونکہ ہر تمثیل کو تشبیہ کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تشبیہ تمثیل نہیں ہو سکتی۔ [1]

(ک ء س)

اَلْكَاْسُ: پینے کا برتن۔ جب کہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) اور ایسی شراب نوش جان کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

اور کبھی اس کا اطلاق خالی پیالہ یا صرف پینے کی چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً

شَرِبْتُ كَاْسًا: میں نے شراب کا پیالہ پیا۔

كَاْسٌ طَيِّبَةٌ: عمدہ شراب۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ﴾ (۵۶۔۱۸) اور صاف شراب کے گلاس۔ كَأَسَتِ النَّاقَةُ تَكْؤُسُ: اونٹنی کا تین پاؤں پر چلنا اور اَلْكَيْسُ کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور اَكْأَسَ الرَّجُلُ وَاَكْيَسَ کے معنی غَدْرٌ یعنی بدعہدی بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں زیرکی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور یا اس لیے کہ كَيْسَانُ نامی ایک شخص تھا جو بے وفائی میں ضرب المثل تھا پھر ہر غدار کو كَيْسَانُ کہا جانے لگا۔ جیسا کہ هَالِكِيٌّ اصل میں ایک مشہور آہنگر کا نام تھا پھر ہر حداد یعنی آہنگر پر هَالِكِيٌّ کا لفظ بولا جانا لگا ہے۔

(ک ب ب)

اَلْكَبُّ (ن) کے معنی کسی کو منہ کے بل گرانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۲۷۔۹۰) تو ایسے لوگ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے

اَلْاِكْبَابُ: کسی چیز پر منہ کے بل گر جانا (اور کنایہ از ہمہ تن مشغول شدن در کارے) اسی سے قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] التشبیہ یکون بین المفردات والتمثیل عام ای بین المفردات والمرکبات (البیضاوی)

﴿اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی﴾ (۶۷۔۲۲) بھلا جو شخص چلتا ہوا منہ کے بل گر گر پڑتا ہو۔ وہ سیدھے رستے پر ہے۔ یعنی جو غلط روش پر چلتا ہے۔

اَلْکَبْکَبَةُ: کسی چیز کو اوپر سے لڑھکا کر گڑھے میں پھینک دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَکُبْکِبُوْا فِیْهَا وَالْغَاوٗنَ﴾ (۹۶۔۹۴) تو وہ اور گمراہ (یعنی بت اور بت پرست) اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

کَبَّ وکَبْکَبَ (ثلاثی ورباعی دونوں طرح آتا ہے۔ مثل کَفَّ وکَفْکَفَ وَصَرَّا الرِّیْحُ وَصَرْصَرَ الْکَوَاکِبُ ظاہر ہونے والے ستارے، ستاروں کو کواکب اسی وقت کہا جاتا...... جب نمودار اور ظاہر ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا﴾ (۶۔۷۶) (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا (تو آسمان میں) ایک ستارہ نظر پڑا۔

﴿کَاَنَّهَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ﴾ (۲۴۔۳۵) گویا وہ موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے۔

﴿اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْکَوَاکِبِ﴾ (۳۷۔۶) بے شک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔

﴿وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ﴾ (۸۲۔۲) اور جب (آسمان کے) ستارے جھڑ پڑیں گے۔

محاورہ ہے۔ ذَهَبُوْا تَحْتَ کُلِّ کَوْکَبٍ: وہ منتشر ہو گئے۔ کَوْکَبُ الْعَسْکَرِ لشکر میں اسلحہ کی چمک

(ک ب ت)

اَلْکَبْتُ: (ض) کسی کو سختی اور ذلت کے ساتھ واپس کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۵۸۔۵) وہ اسی طرح ذلیل کیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل کیے گئے تھے۔

﴿لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْ یَکْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآئِبِیْنَ﴾ (۳۔۱۲۷) (یہ خدا نے) اس لیے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک، یا انہیں ذلیل ومغلوب کر دے کہ (جیسے آئے تھے ویسے ہی) ناکام واپس جائیں۔

(ک ب د)

اَلْکَبِدُ: جگر کو کہتے ہیں۔ اور اَلْکُبَدُ وَالْکُبَادُ کے معنی درد جگر کے ہیں اور اَلْکَبِدُ (مصدر) کے معنی جگر پر مارنے کے ہیں اس سے کَبِدْتُ الرَّجُلَ (س) کا محاورہ ہے۔ یعنی جگر پر مارنا۔ پھر انسان کا جگر چونکہ وسط جسم میں ہوتا ہے۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر وسط آسمان کو کَبِدُ السَّمَآءِ کہا جاتا ہے۔

تَکَبَّدَتِ الشَّمْسُ: (آفتاب کا وسط آسمان میں پہنچنا) نیز اَلْکَبَدُ کے معنی مشقت بھی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾ (۹۰۔۴) کہ ہم نے انسان کو تکلیف (کی حالت) میں (رہنے والا) بنایا ہے۔

میں متنبہ کیا ہے انسان کی ساخت ہی اللہ تعالیٰ نے کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب تک (دین کی) گھاٹی پر ہو کر نہ گزرے وہ نہ تو رنج ومشقت سے نجات پا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اسے (حقیقی) چین نصیب ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری

جگہ فرمایا:﴿لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (۸۴۔۱۹) کہ تم درجہ بدرجہ (رتبہ اعلیٰ پر) چڑھو گے۔

(ک ب ر)

کبیر اور صغیر اسمائے اضافیہ سے ہیں۔جن کے معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی چیز دوسری کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے۔ لیکن وہی شے ایک اور کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے۔اور قلیل وکثیر کی طرح کبھی تو ان کا استعمال کمیت متصلہ یعنی اجسام میں ہوتا ہے۔اور کبھی کمیۃ منفصلہ یعنی عدد میں۔ اور بعض اوقات کثیر اور کبیر دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے ایک ہی چیز پر بولے جاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ (۲۔۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں۔

کہ اس میں ایک قرأت کثیر بھی ہے۔

یہ اصل وضع کے لحاظ سے تو اعیان میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔لیکن استعارہ کے طور پر معانی پر بھی بولے جاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا:

﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (۱۸۔۴۹) کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے گن رکھا ہے۔ ﴿وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ﴾ (۱۰۔۶۱) اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے نہ بڑی۔

اور آیت کریمہ:﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ﴾ (۹۔۳) اور حج اکبر کے دن......

میں حج کو اکبر کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ عمرہ حج اصغر ہے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

اَلْعُمْرَةُ هِيَ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ۔ کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ اور کبھی بڑائی بلحاظ زمانہ مراد ہوتی ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَبِيْرٌ کہ فلاں سن رسیدہ ہے اور قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائے۔

﴿وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ﴾ (۲۔۲۶۶) اور اسے بڑھاپا آ پکڑے۔

﴿وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ (۳۔۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔

اور کبھی بڑائی بلحاظ مرتبہ اور رفعت کے ملحوظ ہوتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ﴾ (۶۔۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔کہہ دو کہ خدا ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔

﴿الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ﴾ (۱۳۔۹) سب سے بزرگ (اور عالی رتبہ ہے۔

اور آیت:﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ﴾ (۲۱۔۵۸) پس ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا مگر ایک بڑے (بت) کو (نہ توڑا)

میں صنم کو کبیر کہنا اس کی حقیقی قدر و منزلت کے لحاظ سے نہیں ہے۔بلکہ ان کے اعتقاد کی بنیاد پر ہے۔اور آیت۔

﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ (۲۱۔۶۳) بلکہ یہ ان کے بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) بھی اس معنی پر محمول ہے۔

اور آیت:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِیْهَا﴾ (۶۔۱۲۳) اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے۔

میں اکابر سے وہاں کے رؤساء مراد ہیں اسی طرح آیت:

﴿اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ (۲۰۔۷۱) بے شک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد) ہے جس نے تم کو جادو سکھایا۔

میں بھی کبیر بمعنی رئیس ہی ہے۔ اور اس معنی میں مشہور محاورہ ہے۔ وَرِثَهٗ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ۔ یعنی یہ چیز اسے بلند مرتبہ آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔

اَلْكَبِیْرَةُ: عرف میں اس گناہ کو کہتے ہیں جس کی سزا بڑی سخت ہو۔ اس کی جمع اَلْكَبَائِرُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳۔۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اور آیت۔ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (۴۔۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو۔

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ کبائر سے مراد شرک ہے۔ کیونکہ دوسری آیت: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (۳۱۔۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

میں شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کبائر کا لفظ۔ شرک اور تمام مہلک گناہوں کو شامل ہے۔ جیسے زنا اور کسی جان کا ناحق قتل کرنا جیسا کہ فرمایا۔

﴿اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا﴾ (۱۷۔۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔ ﴿قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲۔۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے نقصان فائدوں سے زیادہ ہیں۔

اور کبیرۃ اس عمل کو بھی کہتے ہیں جس میں مشقت اور صعوبت ہو۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ اِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ﴾ (۲۔۴۵) بے شک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ﴾ (۴۲۔۱۳) جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے۔

﴿وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ﴾ (۶۔۳۵) اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے اور آیت:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً﴾ (۱۸۔۵) (یہ) بڑی بات ہے۔

میں اس گناہ کے دوسرے گناہوں سے بڑا اور اس کی سزا کے سخت ہونے پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے۔ (۶۱۔۳۵) اور آیت۔

﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ﴾ (۶۱۔۳۵) اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا۔

میں تَوَلّٰى كِبْرَهٗ سے مراد وہ شخص ہے جس نے افک کا شاخسانہ کھڑا کیا تھا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو

شخص کسی برے طریقے کی بنیاد ڈالے اور لوگ اس پر عمل کریں تو وہ سب سے بڑھ کر گنہگار ہوگا۔اور آیت۔

﴿اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ﴾ (۴۰۔۵۶) (ارادہ) عظمت ہے اور اس کو پہنچنے والے نہیں۔

میں كِبْرٌ کے معنی بھی تکبر ہی کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر بڑا امر مراد ہے۔اور یہ کبر بمعنی پیرانہ سالی سے ماخوذ ہے جیسا کہ آیت: ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ﴾ میں ہے۔اور اَلْكِبْرُ وَالتَّكَبُّرُ وَالْاِسْتِكْبَارُ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پس کبر وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اور عجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا تکبر قبول حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔ [1]

اَلْاِسْتِكْبَارُ: (استفعال) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔اور یہ بات اگر منشائے شریعت کے مطابق اور برمحل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو۔جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔یہ مذموم ہے۔اور قرآن پاک میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔فرمایا۔

﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۲۔۳۴) مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ (۲۔۸۷) تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا۔تم سرکش ہو جاتے رہے۔

﴿وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

﴿اسْتِكْبَارًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۵۔۴۳) (یعنی انہوں نے ملک میں غرور کرنا۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۲۹۔۳۹) تو وہ ملک میں مغرور ہو گئے۔

﴿تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ (۴۶۔۲۰) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا﴾ (۷۔۴۰) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی۔

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۷۔۴۸) (آج) نہ تو تمہاری جماعت ہی تمہارے کسی کام آئی۔اور نہ ہی تمہارا تکبر سود مند ہوا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا﴾ (۴۰۔۴۷) تو ادنیٰ درجے کے لوگ بڑے آدمیوں سے کہیں گے، میں متکبرین کے مقابلہ میں ضعفاء کا لفظ لانے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔کہ ان کا استکبار بدنی اور مالی قوت کے حاصل ہونے کی وجہ سے تھا۔اسی طرح آیت۔

---

[1] وفی الحدیث الکبران تسفه الحق وتغمص الناس (الادب المفرد للبخاری) من روایة عبداللہ بن عمرو بن العاص وقال علماء الاخلاق الکبر یکون بالمنزلة الرفیعه والعجب یکون بالفضیلة الماوروی بشرحه منهاج الیقین ۳۹۷

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۷۔۷۵) تو ان کی قوم کے سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے غریب لوگوں سے .... کہنے لگے۔
میں بھی متکبرین مستضعفین کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔اور آیت۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴾ (۱۰۔۷۵) تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔
میں لفظ فَاسْتَكْبَرُوْا سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے قبول حق کے سلسلہ میں تکبر، خود پسندی، اور نخوت سے کام لیا اور پھر وہ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ان کے سابقہ جرائم نے ہی انہیں تکبر پر اکسایا تھا۔اور یہ تکبر ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ ان کا شیوہ بن چکا تھا۔اور فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۱۶۔۲۲) تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں۔اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ (۱۶۔۲۳) وہ (خدا) سرکشوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اَلتَّكَبُّرُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الحقیقت کسی کے افعال حسنہ زیادہ ہوں اور وہ ان پر دوسروں سے بڑھا ہوا ہو۔اسی معنی میں اللہ تعالیٰ صفت تکبر کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (۵۹۔۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔

دوم یہ کہ کوئی شخص صفات کمال کا ادعاء کرے۔لیکن فی الواقع وہ صفات حسنہ سے عاری ہو اس معنی کے لحاظ سے یہ انسان کی صفت بن کر استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا ہے:

﴿فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ (۴۰۔۷۶) متکبروں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (۴۰۔۳۵) اسی طرح خدا ہر سرکش متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تو معنی اول کے لحاظ سے یہ صفات محمودہ میں داخل ہے اور معنی ثانی کے لحاظ سے صفت ذم ہے اور کبھی انسان کے لیے تکبر کرنا مذموم نہیں ہوتا جیسا کہ آیت:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۷۔۱۴۶) جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔
سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر بغیر الحق نہ ہو تو مذموم نہیں ہے۔

اور آیت:

﴿عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ﴾ (۳۵۔۴۰) ہر متکبر جابر کے دل پر، میں لفظ قلب متکبر کی طرف مضاف ہے۔اور بعض نے قلب تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں متکبر قلب کی صفت ہوگا۔

اَلْكِبْرِيَاءُ: اطاعت کیشی کے درجہ سے اپنے آپ کو بلند سمجھنے کا نام کبریاء ہے۔اور یہ استحقاق صرف ذات باری تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾

(۴۵۔۳۷) اور آسمانوں اور زمینوں میں اس کے لیے بڑائی ہے اور اس کا ثبوت اس حدیث قدسی سے بھی ملتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ❶ (۹۰) ((اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْ وَاحِدٍ مِنْهُمَا قَصَمْتُهٗ)) کہ کبریاء میری رداء ہے اور عظمت ازار ہے۔ جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ مزاحم ہوگا۔ تو میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اور قرآن پاک میں ہے: ﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا وَ تَكُوْنَ لَكُمُ الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۷۸) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ جس (راہ) پر ہم اپنے باپ دادوں کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو اور اس ملک میں تم دونوں ہی کی سرداری ہو جائے۔ اَكْبَرْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو بڑا خیال کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ﴾ (۱۲۔۳۱) جب عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کا رعب ان پر چھا گیا۔

اَلتَّكْبِيْرُ: (تفعیل) اس کے ایک معنی تو کسی کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ اور دوم اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی عظمت کا احساس کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ (۲۔۱۸۵) اور اس احسان کے بدلے کہ خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو۔ ﴿وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾ (۱۷۔۱۱۱) اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔ اور آیت: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۴۰۔۵۷) آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

میں اَكْبَرُ کے لفظ سے قدرت الٰہی کی کاریگری اور حکمت کے ان عجائب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو آسمان اور زمین کی خلق میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کو کہ وہ خاص لوگ ہی جان سکتے ہیں۔ جن کی وصف میں فرمایا: ﴿وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۹۱) اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔

ورنہ ان کی ظاہری عظمت کو تو عوام الناس بھی سمجھتے ہیں (اس لیے یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں) اور آیت: ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى﴾ (۴۴۔۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ روز قیامت سے پہلے دنیا یا عالم برزخ میں کافر کو جس قدر بھی عذاب ہوتا ہے عذاب آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اَلْكُبَّارُ۔ اس میں کبیر کے لفظ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اور كُبَّار (بتشدید یاء) اس سے بھی زیادہ بلیغ

---

❶ الحديث ذكره السيوطي في الدر (٦ : ٣٧) وابن كثير (٤ : ١٥٣) وفي رواية ابي داؤد قذفته في النار وفي رواية مسلم عن ابي هريرة وابي سعيد القيته في النار وغدبته، انظر للحديث وتخريجه باختلاف الالفاظ كنز العمال (ج٣ رقم ٢٦١٣-٢٦١٦) عن علي وابي هريرة وابن عباس وابي سعيد وتخريج الكشاف للحافظ رقم (١٣٧) وتخريج الاحياء للعراقي (٣/٣٢٧) وزوائد ابن حبان رقم ٤٩ و منهاج اليقين شرح ادب الدنيا والدين واويس وقا الازرنجاني ٢٩٧۔

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا﴾ (۷۱۔۲۲) اور وہ بڑی بڑی چالیں چالیں چلے۔

(ک ت ب)

اَلْكَتْبُ ۔ کے اصل معنی کھال کے دو ٹکڑوں کو ملا کر سی دینے کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: كَتَبْتُ السِّقَاءَ ''میں نے مشکیزہ کو سی دیا كَتَبْتُ الْبَغْلَةَ: میں نے خچری کی شرمگاہ کے دونوں کنارے بند کر کے ان پر (لوہے) کا حلقہ چڑھا دیا'' عرف میں اس کے معنی حروف کو تحریر کے ذریعہ باہم ملا دینے کے ہیں مگر کبھی ان حروف کو تلفظ کے ذریعہ باہم ملا دینے پر بھی بولا جاتا ہے الغرض كِتَابَة کے اصل معنی تو تحریر کے ذریعہ حروف کو باہم ملا دینے کے ہیں مگر بطور استعارہ کبھی معنی تحریر اور کبھی بمعنی تلفظ استعمال ہوتا ہے اس بنا پر کلام الٰہی کو کتاب کہا گیا ہے گو (اس وقت) قید تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (۲۔۱) یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔

﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ﴾ (۱۹۔۳۰) میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے۔

اَلْكِتَابُ: اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں کچھ لکھا گیا ہو) کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل اَلْكِتَابُ اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت:

﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۴۔۱۵۳) (اے محمد) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ تم ان پر ایک لکھی ہوئی کتاب آسمان سے اتار لاؤ۔

میں ''کتاب'' سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو اسی لیے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ.........﴾ (۶۔۷) اور اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے۔

نیز کسی چیز کے ثابت کر دینے، اندازہ کرنے، فرض یا واجب کر دینے اور عزم کرنے کو كِتَابَة سے تعبیر کر لیتے ہیں اس لیے کہ پہلے پہل تو کسی چیز کے متعلق دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر زبان سے ادا کی جاتی ہے اور آخر میں لکھ لی جاتی ہے لہٰذا ارادہ کی حیثیت مبدأ اور کتابت کی حیثیت منتہٰی کی ہے پھر جس چیز کا ابھی ارادہ کیا گیا ہو تاکید کے طور پر اسے كَتَبَ سے تعبیر کر لیتے ہیں جو کہ دراصل ارادہ کا منتہٰی ہے...... چنانچہ فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (۵۸۔۲۱) خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (۹۔۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جو خدا نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے۔

﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾ (۳۔۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا۔ وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔ اور آیت: ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (۸۔۷۵) اور رشتے دار خدا کے حکم کی رو سے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں کتاب اللہ سے مراد قانونِ خداوندی ہے اور آیت: ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (۵۔۴۵) اور ہم نے ان لوگوں کے لیے توراۃ میں یہ حکم لکھ دیا تھا۔ کہ جان کے بدلے جان۔ میں کَتَبْنَا بمعنی اَوْحَيْنَا وَفَرَضْنَا ہے یعنی ہم نے وحی بھیجی یا فرض کر دیا اور اسی معنی میں فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲۔۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آ جائے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۲۔۱۸۳) مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے۔

﴿لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ﴾ (۴۔۷۶) تو نے ہم پر جہاد (جلد) کیوں فرض کر دیا۔

﴿مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ (۵۷۔۲۷) ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور آیت:

﴿وَلَوْلَا اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ﴾ (۵۹۔۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے گھروں کو چھوڑنا ان پر ضروری نہ کیا ہوتا (تو ان کو کوئی دوسری سزا دی جاتی) اور کبھی کتابت سے تقدیر حتمی یا حتمی کی مثل مراد ہوتی ہے۔

چنانچہ آیت:۔

﴿بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۴۳۔۸۰) ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔ میں بعض نے تقدیر کے نویسندے مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ آیت۔

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۹) میں بھی تقدیر کی دونوں اقسام مراد ہیں اور آیت:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸۔۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت ان کفار کے برعکس ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸۔۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اس کا کہنا نہ ماننا۔

کیونکہ اَغْفَلْنَا کا لفظ اَغْفَلْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب کو مہمل یعنی اعراب و نقاط سے معری چھوڑ دینا کے ہیں۔ اور آیت ﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔ اور ہم اس کے لیے (ثواب اعمال) لکھ رہے ہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کو ثابت رکھا جا رہا ہے۔ اور ان کی ضروری ہی جزا دی جائے گی۔ اور آیت:

﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (۳۔۵۳) تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ان کے زمرہ میں داخل فرما۔ اور یہ آیت کریمہ:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۴۔۶۹) وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ جن پر خدا نے بڑا فضل کیا، کے مضمون کی

طرف اشارہ ہے۔اور آیت:﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (۱۸۔۴۹) ہائے شامت!یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو(کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔میں الکتاب سے لوگوں کے اعمال نامے مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ (۵۷۔۲۲) مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی ہے۔)

میں بعض نے کہا ہے کہ ''کتاب'' سے لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔

﴿وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۶۔۵۹) کوئی تر یا خشک چیز نہیں۔مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔

﴿فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا﴾ (۱۷۔۵۸) یہ کتاب (یعنی تقدیر میں) لکھا جا چکا ہے۔اور آیت:

﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ (۸۔۶۸) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ بات حکمت الٰہی میں مقدر نہ ہو چکی ہوتی لہٰذا یہ آیت۔

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (۶۔۵۴) خدا نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا، کی طرف اشارہ ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ (۸۔۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا۔کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا۔کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (۹۔۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔

میں كَتَبَ کے معنی مقدر اور فیصلہ کرنا کے ہیں اور یہاں عَلَيْنَا کی بجائے لنا کہنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں پہنچتی ہے اسے ہم اپنے لیے نعمت سمجھتے ہیں۔اور نقمت خیال نہیں کرتے اور آیت:﴿اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵۔۲۱) (تو بھائیو) تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ چل داخل ہو۔میں بعض نے كَتَبَ اللّٰهُ کے معنی وَهَبَهَا لَكُمْ کئے ہیں یعنی جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی تھی۔اور پھر تمہارے وہاں نہ جانے اور اس عطا الٰہی کو قبول نہ کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ نے وہ زمین ان پر حرام کر دی۔اور بعض نے کہا ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے معنی یہ ہیں۔کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں اس کا فیصلہ کر دیا تھا۔بشرطیکہ تم وہاں چلے جاتے اور بعض نے کتب کے معنی اوجب کیے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے وہاں چلے جانا تم پر واجب کر دیا تھا اور پھر عَلَيْكُمْ کی بجائے لَكُمْ اس لیے کہا ہے کہ وہاں چلے جانے میں ان کے دنیوی اور اخروی دونوں قسم کے فوائد مضمر تھے اس لیے وہاں چلے جانا لَكُمْ ہوگا نہ کہ عَلَيْكُمْ جیسا کہ مثلاً کوئی شخص کسی بات کو نقصان دہ خیال کرتا ہو مگر مال کے اعتبار سے جو فوائد اس میں پنہاں ہیں اس سے غافل اور بے خبر

ہوتو اس سے کہا جائے گا ھٰذَا الْكَلَامُ لَكَ لَا عَلَيْكَ (یعنی اس میں) تمہارا فائدہ ہے نہ کہ نقصان اور آیت۔
﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ﴾ (۳۰۔۵۶) اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا۔ وہ کہیں گے خدا کی کتاب کے مطابق تم قیامت تک رہو گے۔ میں کتاب اللہ سے اللہ کا حکم، فیصلہ اور علم مراد ہے۔ اور یہی معنی آیت۔
﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ﴾ (۱۳۔۳۸) ہر (حکم) قضا (کتاب میں) مرقوم ہے۔ کے ہیں۔ اور آیت:
﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں یعنی...... کتاب خدا میں، میں کتاب اللہ کے معنی بھی حکم الٰہی ہی ہیں۔ اور کبھی کتاب سے وہ حجت الٰہی مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہو چنانچہ فرمایا ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾ (۲۲۔۸) اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے۔
اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتَابًا مِّنْ قَبْلِهٖ: یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی۔
﴿فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ﴾ (۳۷۔۵۷) تو اپنی حجت پیش کرو۔ ﴿اُوْتُوا الْكِتَابَ﴾ (۲۔۴۵) جنہیں الکتاب یعنی حجت دی ﴿كِتَابَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۰۱) خدا کی کتاب کو۔ اور آیت: ﴿اَمْ اٰتَيْنَاهُمْ كِتٰبًا﴾ (۴۳۔۲۱) یا ہم نے انکو (اس سے پہلے) کوئی کتاب دی تھی۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ (۶۸۔۴۷) کہ وہ اسے لکھ لیتے ہیں، میں يَكْتُبُوْنَ سے ان کے علم و تحقیق اور عقیدہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت۔
﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۲۔۱۸۷) اور خدا نے جو تمہاری چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے۔ (یعنی اولاد) اس کو (خدا سے) طلب کرو۔
میں ایک لطیف نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں نکاح کی خواہش اس لیے رکھی ہے کہ وہ اس سے طلب نسل کرے جو نوع انسانی کے بقاء کا موجب ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ نکاح سے اسی چیز کا قصد کرے جو کہ عقل و دیانت کے تقاضا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ یعنی حفظ نسل اور عفت نفس اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ ما کتب اللہ سے مراد اولاد ہے۔ تو انہوں نے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کبھی کتابت سے کسی چیز کا وجود میں لانا۔ اور محو سے کسی چیز کا زائل اور فنا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ آیت:
﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۸،۳۹) میں تنبیہ ہے کہ کائنات میں ہر لحہ ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ مقتضائے حکمت کے مطابق اشیاء کو وجود میں لاتی اور فنا کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس آیت کا وہی مفہوم ہے۔ جو کہ آیت ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ (۵۵۔۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ اور آیت: (۱۳۔۳۹) میں وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ (اور اس کے پاس اصل کتاب ہے) کا ہے اور آیت: ﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ

الْكِتٰبِ﴾ (۳۔۷۸) اوران (اہل کتاب) میں سے بعض ایسے ہیں کہ کتاب کوزبان مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب (توراہ) میں سے ہے۔ حالانکہ وہ (کسی سماوی) کتاب سے نہیں ہوتا۔ میں (لفظ الکتاب تین مرتبہ آیا ہے چنانچہ) پہلی جگہ الکتاب سے وہ جھوٹی تحریریں مراد ہیں جن کا تذکرہ آیت: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) میں کیا گیا ہے۔ اور دوسری الکتاب سے توراۃ مراد ہے اور تیسری الکتاب میں الف لام جنس کا ہے اور اس سے ہر آسمانی کتاب اور کلام الٰہی مراد ہوسکتی ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ حکم نہ تو کسی آسمانی کتاب میں موجود ہے اور نہ ہی کلام الٰہی ہوسکتا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۔۵۳) اور جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور معجزے عنایت کیے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کتاب اور فرقان دونوں سے توراۃ مراد ہے اس لحاظ سے کہ توراۃ میں احکام الٰہی ثبت ہیں اسے الکتاب کہا گیا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس میں حق کو باطل سے جدا کرنے والے احکام مذکور ہیں اسے الفرقان کہا گیا ہے اور آیت: ﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (۳۔۱۴۵) اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے (اس نے موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔ میں کتابا مؤجلا سے حکم الٰہی مراد ہے۔ چنانچہ آیات ﴿لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ﴾ (۸۔۶۸) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا......تو تم پر...... نازل ہو۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ میں کتاب سے مراد حکم ہی ہے۔ اور آیت: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) تو ان لوگوں پر افسوس ہے۔ جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔

میں تنبیہ کی ہے کہ از خود جھوٹی باتیں گھڑ کر لکھ لیتے ہیں۔ اور یہاں جھوٹی تحریروں کو ان کے ہاتھوں کی طرف منسوب کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت ﴿ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ (۹۔۳۰) میں ان کی من گھڑت باتوں کو ان کے مونہوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

اَلْاِكْتِسَابُ (افتعال) کا لفظ عموماً جھوٹی اور جعلی تحریر کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا﴾ (۲۵۔۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے۔ اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اہل الکتاب کا لفظ آیا ہے۔ وہاں الکتاب سے توراۃ، انجیل یا دونوں مراد ہیں۔ اور آیت:۔ ﴿وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى﴾ ... ﴿اِلٰى قَوْلِه وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ﴾ (۱۰۔۳۷) اور یہ قرآن پاک ایسا نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ اور (ان ہی) کتابوں کی (اس میں) تفصیل ہے۔

میں الکتاب سے قرآن پاک سے پہلے کی تمام کتب سماویہ مراد ہیں۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں قرآن کو ان کا مصدق ٹھہرایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ خود ان میں شامل نہیں ہوسکتا اور آیت کریمہ:

﴿وَّ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾ (۶۔۱۱۴) حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب

کتاب بھیجی ہے۔
میں بعض نے کہا ہے۔کہ الکتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے دلائل حقہ اور علم وعقل کو بھی شامل ہے۔اسی طرح آیت:
﴿فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ﴾ (۲۹۔۴۷) تو جن لوگوں کو ہم نے کتابیں دی تھیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں، میں بھی الکتاب کا مفہوم عام ہے۔اور آیت:
﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ﴾ (۲۷۔۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الٰہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بعض نے کہا ہے۔کہ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ میں مِنْ زائدہ ہے اور اس کے معنی علم الکتاب یعنی کتاب کا علم کے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ منجملہ ان علوم کے ایک علم مراد ہے جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی خاص کتاب میں عطا فرمائے تھے اور انہی کے ذریعے سے ہر چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہوگئی تھی۔اور آیت۔
﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّہٖ﴾ (۳۔۱۱۹) اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔
میں الکتاب سے تمام کتب ساویہ مراد ہیں اور جمع کی بجائے مفرد کا لفظ یا تو اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ اسم جنس ہے۔ جیسا کہ کَثُرَ الدِّرْھَمُ فِیْ اَیْدِی النَّاسِ میں اَلدِّرْھَمُ سے جنس درہم مراد ہے۔اور یا اس لیے کہ یہ اصل میں عدل کی طرح مصدر ہے (جو مفرد وجمع دونوں کے لیے آتا ہے) جیسا کہ آیت:۔
﴿یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾ (۲۔۴) جو کتاب تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں، میں ہے مگر بعض نے کہا ہے۔کہ الکتاب سے قرآن پاک مراد ہے اور کُلِّہٖ کہہ کر اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہیں ہو۔جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
﴿وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ (۴۔۱۵۰) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔
کِتَابَۃُ الْعَبْدِ کے معنی غلام کے خود کو اپنے آقا سے اس (مقررہ) مال کے عوض خرید لینے کے ہیں۔ جو وہ کما کر اسے (بالاقساط) ادا کرے گا۔چنانچہ آیت کریمہ:
﴿وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ﴾ (۲۴۔۳۳) اور جو غلام تم سے مکاتب چاہیں.....تو ان سے مکاتبت کرلو۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کَاتِبُوْھُمْ کتابت بمعنی ایجاب سے مشتق ہو۔اور یہ بھی کہ اَلْکَتَب بمعنی نظم یعنی تحریر سے ہو کیونکہ ان دونوں کی نسبت انسان کی طرف ہوسکتی ہے۔

(ک ت م)

کَتَمْتُہٗ (ن) کَتْمًا وَکِتْمَانًا کے معنی کوئی بات چھپانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۴۰) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کی شہادت کو، جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے۔ چھپائے۔
﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۔۱۴۶) مگر ایک فریق ان میں سچی بات

جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ (۲-۲۵۳) اور (دیکھنا) شہادت کومت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴-۳۷) جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں۔

میں کِتْمَانِ فَضْل سے کفرانِ نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا:

﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ (۴-۳۷) اور ہم نے ناشکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ (۴-۴۲) اور خدا سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔تو جھٹ سے پکار اٹھیں گے۔ ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ (۶-۲۳) خدا کی قسم! جو ہمارا پروردگار! ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں [1] کہ آخرت میں متعدد مواقع ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی بات چھپا نہ سکنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

(ک ث ب)

اَلْكَثِيْبُ: ریت کا ٹیلہ۔چنانچہ آیت:۔

﴿وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا﴾ (۷۳-۱۴) اور پہاڑ (ایسے بھر بھرے گویا) ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے اور کَثِيْبٌ کی جمع اَكْثِبَةٌ وَكُتُبٌ وَكُثْبَانٌ آتی ہے۔

اور معنی اجتماع کے لحاظ سے دودھ اور کھجوروں کی تھوڑی سی مقدار کو كَثِيْبَة کہا جاتا ہے۔

كَثَبَ: (ض) اصل معنی اکٹھا کرنا کے ہیں اور اس سے صفت فاعلی كَاثِبٌ آتی ہے جس کے معنی ہیں ''جمع کرنے والا'' اور اَلتَّكْثِيْبُ کے معنی شکار کے اپنے آپ پر موقعہ دینے کے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے: اَكْثَبَكَ الصَّيْدُ فَارْمِهٖ (کہ شکار تجھے پر آ گیا ہے لہٰذا اسے شکار کر لو) اور یہ كَثْبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہونا کے ہیں۔

(ک ث ر)

پہلے گذر چکا ہے کہ کثرت اور قلت کمیت منفصلہ یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ﴾ (۵-۸۶) (اس سے) ان

[1] ابو سعید الحسن البصری من سادات التابعین و امام اهل البصرة توفی سنہ ۱۱۰ھ (شذرات الذهب ۱/۱۳۶) (وابن خلکان ۱/۱۶۰) وقد جمع العاجز تراجمه فی مقالة۔

میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔

﴿وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُوْنَ﴾ (۲۳-۷۰) اور ان میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً﴾ (۲-۲۴۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے .... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً﴾ (۴-۱) پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب...... یہ چاہتے ہیں۔

علی ہذا القیاس بہت سی اس قسم کی آیات ہیں (جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے) اور آیت:

﴿وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ﴾ (۵۶-۳۲) اور میوہ ہائے کثیرہ کے باغوں میں۔

میں فواکہ جنت کو مطعومات دنیا کے لحاظ سے کثیرہ کہا ہے۔ اور اس سے صرف کثرت عدد ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ کثرت بلحاظ فضیلت بھی مراد ہے اور عَدَدٌ كَثِيْرٌ وَّكُثَارٌ وَّكَاثِرٌ کے معنی کثرت تعداد کے ہیں اور رَجُلٌ كَاثِرٌ مال وار آدمی کو کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے [1] (السریع)

(۳۶۹) وَلَسْتَ بِالْاَكْثَرِ مِنْهُمْ حَصًى
وَاِنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَاثِرِ

تم گنتی میں ان سے زیادہ نہیں ہو۔ عزت تو انہی کے لیے ہے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔

اَلْمُكَاثَرَةُ وَالتَّكَاثُرُ: کے معنی ایک دوسرے سے مال و دولت اور عزت میں بڑھنے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲-۱) (لوگو) تم کو (مال کی) بہت سی طلب نے غافل کر دیا۔

اور فُلَانٌ مَكْثُوْرٌ کے معنی مَغْلُوْبٌ فِي الْكَثْرَةِ کے ہیں۔

اَلْمِكْثَارُ: عرف میں بہت سی باتیں کرنے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْكَثَرُ کے معنی ہیں خرما کا گودا جب زیادہ ہو۔ اور یہ سکون ثاء کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے [2] (۹۱)

((لَا قَطْعَ فِيْ ثَمَرٍ وَّلَا كَثَرٍ)) کہ پھل اور گودے کی چوری میں قطع ید نہیں ہے۔ اور آیت:

﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ﴾ (۱۰۸-۱) (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

---

[1] قاله الاعشى يعمون من كلمة فى ٦٠ بيتا يهجو فيها علقمة بن علاثة فى منافرته ويمدح عامر بن طفيل والاصح ان الكاثر بمعنى كثير العدد كما فى اللسان (كثر) والقصيدة فى ديوانه (٩٢-٩٦) والبيت فى التاج (كثر) والخزانة (٢ : ٨) وتهذيب الالفاظ ٣٤ وابن عقيل رقم (٢٧٧) السيوطى (٣٠٥) وقد مر (قلل)

[2] اورده فى المؤطا من حديث رافع بن خديج (الزرقانى ١٦٣/٤) و الشافعى فى الام (٦ : ١١٨) عن مالك وعن سفيان ابن عينية وابو داؤد الطيالسى رقم (٩٥٨) واحمد فى المسند (٤١٣/٣ و ٤٦٤ و١٤٠/٤ والدارمى (١٦٤/٢) وابوداود (٢٣٨) والترمذى (٢٧٣/١-٢٧٤) والنسائى (٢٥٨/٢) و ابن ماجة (٦٦/٢)۔

اور بعض نے خیر کثیر مراد لی ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو عطا کی اور سخی آدمی کو کوثر کہا جاتا ہے تَکَوْثَرَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الطّویل)

(۳۷۰) وَقَدْ ثَارَ نَقْعُ الْمَوْتِ حَتّٰی تَکَوْثَرَا

موت کا غبار اٹھا۔ یہاں تک کہ بہت زیادہ ہو گیا۔

(ک د ح)

اَلْکَدْحُ کے معنی کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا﴾ (۸۴-۶) تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے۔

اور کبھی کَدْحٌ بمعنی کَدْمٌ بھی آتا ہے جس کے معنی دانت کاٹنے کا نشان کے ہیں۔

(ک د ر)

اَلْکَدَرُ کے معنی کسی چیز میں گدلا پن کے ہیں اور یہ صَفَاءٌ (صفائی) کی ضد ہے، مثلاً: عَیْشٌ کَدِرٌ۔ تیرہ زندگی۔ اَلْکُدْرَۃُ کے معنی بھی گدلا پن کے ہیں مگر اس کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور کُدُوْرَۃُ کا پانی اور زندگی میں۔

اَلْاِنْکِدَارُ: (انفعال) اس تغیر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بکھر جانے سے واقع ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ﴾ (۸۱-۲) اور جب ستارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے۔

اِنْکَدَرَ الْقَوْمُ عَلٰی کَذَا: قوم بکھر کر اس پر ٹوٹ پڑی۔

(ک د ی)

اَلْکُدْیَۃُ کے معنی سخت زمین کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔

حَفَرَ فَاَکْدٰی: وہ گڑھا کھودتا ہوا سخت زمین تک جا پہنچا اور مزید کھدائی سے رک گیا اور استعارہ کے طور پر اَکْدٰی کا لفظ تھوڑا سا دے کر ہاتھ روک لینے اور ناکام ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی﴾ (۵۳-۳۴) تھوڑا سا دیا اور پھر (ہاتھ) روک لیا۔

(ک ذ ب)

اَلْکَذِبُ: (جھوٹ) صِدْقٌ پر بحث کے سلسلہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۶-۱۰۵) جھوٹ اور افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں۔ جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللّٰہُ یَشْہَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ﴾ (۶۳-۱) لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ میں ان کے کاذب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں گو واقعتاً

---

[1] قالہ حسان بن نشبہ واولہ: ابوا ان یبیحو اجارھم لعد وھم۔ والبیت من قصدیۃ حماسیۃ فی اربعۃ ابیات راجع المرزوقی رقم ۱۱۳ وفی التبریزی حتی تکورا ای من کور العمامۃ والمعنی واحد قال ابو محمد الاعرابی واسم الشاعر مصحف والصواب جساس بن نشبہ قال جریر یھجو حجذب بن خرعب التیمی: احجذب اشبھت التی کان بظرھا کطرثوث ارض غیر ذات اناس: لقد شھدت یتم علی ام حجذب کان سراۃ التیم رھط جساس

صحیح ہے مگر ان کے ضمیر اس کے خلاف ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (۵۶۔۲) اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں ہے۔

میں نفس فعل یعنی وقوع کی طرف کذب کی نسبت کی ہے۔ جیسا کہ فِعْلَةٌ صَادِقَةٌ وَّفِعْلَةٌ كَاذِبَةٌ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ﴾ (۹۶۔۱۶) یعنی اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی (کے بال) میں ناصیہ کو مبالغہ کے طور پر کاذب کہا ہے) اور كَذَّابٌ كَذُوْبٌ، كُذُبْذُبٌ وَكَيْذُبَانٌ یہ سب مبالغہ کے صیغے ہیں۔ محاورہ ہے۔

لَا مَكْذُوْبَةَ یعنی...... میں تیرے سامنے جھوٹ نہیں بولتا۔ كَذَبْتُكَ حَدِيْثًا: میں نے تم سے جھوٹ کہا۔ قرآن میں ہے۔

﴿الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ (۹۔۹۰) جنہوں نے خدا اور رسولؐ سے جھوٹ بولا۔

اور کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آیت:۔

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾ میں صدق دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ محاورہ ہے۔

كَذَبَهٗ كَذِبًا وَّكِذَّابًا: یعنی اس کے سامنے جھوٹ بولا۔

اَكْذَبْتُهٗ: میں نے اسے جھوٹا پایا۔ كَذَّبْتُهٗ: میں نے اس کی طرف جھوٹ کی نسبت کی (یعنی اسے جھوٹا کہا) خواہ وہ واقعہ میں سچا ہے یا جھوٹا۔ دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف سچے آدمی کی تکذیب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ (۲۔۳۹) اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

﴿رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ﴾ (۲۳۔۲۶) کہ پروردگار! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو میری مدد کرو۔

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ﴾ (۵۰۔۵۰) بلکہ انہوں نے حق کو جھوٹ سمجھا۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا﴾ (۵۴۔۹) ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا۔

﴿وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۳۵۔۲۵) اور (اے پیغمبر) اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔

﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ﴾ (۶۔۳۳) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے۔

ایک قراءت میں لَا يُكْذِبُوْنَكَ ہے۔ یعنی وہ نہ تجھے جھوٹا پاتے ہیں۔ اور نہ ہی تیرا جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۱۲۔۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا (کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انہوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے۔

یعنی انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ لوگ جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ہے تکذیب ہی کریں گے تو كُذِّبُوْا کے معنی جھٹلائے جانے کے ہیں جیسے فُسِّقُوْا وَخُطِّئُوْا کے معنی کسی کی طرف فسق یا خطا کاری کی نسبت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:
﴿فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ (۳۵-۴) تو تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے گئے ہیں۔
فَكَذَّبُوْا رُسُلِیْ: تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ (۳۸-۱۴) (ان) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
مذکورہ بالا آیت (۱۲-۱۱۰) میں ایک قراءت کُذِبُوْا بتخفیف دال بھی ہے ❶ جو کہ كَذَبْتُكَ حَدِيْثًا سے ماخوذ ہے اس صورت میں كُذِّبُوْا کا فاعل کفار ہوں گے یعنی حتی کہ کفار نے یہ خیال کیا کہ پیغمبر جھوٹ بولتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور کفار کے دلوں میں یہ خیال اس بنا پر پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی اور فوراً عذاب نازل نہ کیا۔ اور آیت ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا﴾ (۷۸:۲۵) (وہاں نہ وہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ (وخرافات) میں كِذَّاب کے معنی تَكْذِيْب کے ہیں۔ یعنی وہ جھوٹ ہی نہیں بولیں گے حتیٰ کہ ایک دوسرے کی تکذیب کی نوبت آئے لہٰذا جنت میں تکذیب کی نفی کذب کی نفی کو مستلزم ہے ایک قراءت میں كِذَابًا ہے۔ جو کہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ ''کہ اہل جنت باہم کذب بیانی نہیں کریں گے۔'' جس طرح کہ لوگ دنیا میں کرتے ہیں۔ محاورہ ہے۔
حُمِلَ فُلَانٌ عَلٰی فِرْيَةٍ وَكَذِبٍ: فلاں کو جھوٹ بولنے پر اکسایا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کی ضد میں صَدَقَ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب اونٹنی کے متعلق یہ یقین ہو کہ کچھ عرصہ تک اس کا دودھ خشک نہیں ہوگا۔ لیکن توقع کے خلاف اس مدت سے پہلے ہی خشک ہو جائے تو کہا جاتا ہے كَذَبَ لَبَنُ النَّاقَةِ: اونٹنی کا دودھ توقع کے خلاف خشک ہوگیا اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْحَجُّ فَبَادِرْ کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم پر حج فرض ہو چکا ہے۔ اسے فوراً ادا کرو۔ ❷ (۹۲) اور اصل حج کو اس غائب آدمی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی آمد میں دیر ہوگئی ہے اور یہ قَدْ فَاتَ الْحَجُّ فَبَادِرْ ۔ (کہ حج فوت ہونے کو ہے لہٰذا جلدی کرو) کے ہم معنی ہے اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْعَسَلَ میں عَسَل منصوب عَلَى الْاَغْرَاءِ ہے۔ یعنی شہد ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ❸ (۹۳)

---

❶ قال الطبری: وذالك قراءة بعض قراء المدينة وعامة قرار اهل الكوفة ونحن نختار هذا القراءة وماخوذ من التفسير ص(۸۵ ج۱۲)۔
❷ قاله عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه انظر للاثر و معانيه المختلفة الصحاح واللسان (كذب) واصلاح المنطق لابن السكيت (۳۲۴) قال فى الدنياه (۱۳۲/۱) ان لاحمد بن محمد لاغسيكفى كتاب كذب عليك كذا، وفى النوادر (۱۱۲/۱-۱۱۵): قال ابوعبيدة الحج مرفوع على الاغراء ثم ذكر الشاهد وجاء فى المنصب ايضا انتهى مختصرا وانظر للاثر ايضا غريب ابى عبيد ۳/والمعانى للقبتى (۱۹۰) لزم الحج ۱۲۔
❸ وحينئذ يكون عليك اسم فعل بمعنى الزم وفى ابدال ابى الطيب (۳۱۹/۲) والفائق (۱۹۶/۲) (وفيه البحث على طوله): وشكا عمرو بن معديكرب الى عمرؓ بن الخطاب المعص (اى التواء عصب الرجل فقال كذب عليك العسل اى عليك بالعدد فالعسل ههنا بمعنى العسلان اى الاسراع ومقاربة الخطو كما يفعل الذئب اذا قارب من الشىء والمثل يضرب على طرق شتى قال ابوشميل اللغوى كذب العسل اى امكنك فاعسل واسرع ورفع العسل بكذب ومعناه النصب لانه يريدان يامره بالعسلان كما يقال امكنك الصيد فارمه وانظر ايضا الدرة للحريرى مع شرح الخفا جى (۱۴۹-۱۵۰) فان الشارح قد حقق القول بانه يجوز النصب والرفع على العسل والحج۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَسَلٌ بمعنی عَسَلَانٌ اور عَسَلَانٌ کے معنی ایک قسم کی دوڑ کے ہیں۔اَلْکِذَابَةُ: ایک قسم کا کپڑا جس پر مصنوعی نقش و نگار کیا گیا ہو مگر ایسا معلوم ہو کہ اس کا نقش و نگار اصلی ہے۔اس کے دیکھنے میں چونکہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔اس لیے اسے کِذَابَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ک ر ر)

اَلْکَرُّ: اس کے اصل معنی کسی چیز کو بالذات یا بالفعل پلٹانا یا موڑ دینا کے ہیں۔اور بٹی ہوئی رسی کو بھی کَرٌّ کہا جاتا ہے۔یہ اصل میں مصدر ہے مگر بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔اس کی جمع کُرُوْرٌ آتی ہے اسی سے اَلْکَرَّةُ (دوسری بار) ہے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ﴾ (۱۷-۶) پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا۔

﴿فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً فَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۲۶-۱۰۲) کاش ہمیں دنیا میں بھی پھر جانا ہو تو ہم مومنوں میں ہو جائیں۔

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً﴾ (۲-۱۶۷) (یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّةً: اگر مجھے پھر ایک بار دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

اَلْکِرْکِرَةُ: (مِثْلُ زِبْرِجَةٌ) شتر کے سینہ کی سخت جگہ کو کہتے ہیں۔اور لوگوں کی مجتمع جماعت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اَلْکَرْکَرَةُ۔کے معنی ہوا کے بادل کو چلانا کے ہیں اور یہ کَرٌّ سے فعل رباعی ہے۔

(ک ر ب)

اَلْکَرْبُ: کے معنی سخت غم کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ﴾ (۲۱-۷۶) تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔

اور کُرْبَةٌ، غُمَّةٌ کی طرح ہے یہ اصل میں کَرْبُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے جس کے معنی زمین میں قلبہ رانی کے ہیں۔اور غم سے بھی چونکہ طبیعت الٹ پلٹ جاتی ہے۔اس لیے اسے کَرْبٌ کہا جاتا ہے۔مثل مشہور ہے۔[1]

اَلْکِرَابُ عَلَی الْبَقَرِ: یعنی ہر آدمی کو اس کا کام کرنے دو اور یہ اَلْکِلَابُ عَلَی الْبَقَرِ کے قبیل سے نہیں ہے[2] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کِرَابٌ (سخت غم) کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا اور اِنَاءٌ کَرْبَانٌ میں کَرْبَانٌ بمعنی قَرْبَانٌ ہے۔یعنی تقریباً بھرا ہوا برتن اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔کہ کَرْبٌ (غم) اَلْکَرْبُ سے مشتق ہو جس کے معنی سخت گرہ کے ہیں جو ڈول کے ساتھ رسی میں لگی رہتی

---

[1] قال فی المیدانی (۲/۱۴۲): یضرب فی تخلیة المرء وصناعة۔

[2] انظر للمثل "الکلاب علی البقر" الحیوان للجاحظ (۱: ۲۶۰) واللسان (کلب) والعیون (۲: ۲) وفی التاج وکذا فی الحیوان للدمیری کلدم فیه کثیر وایضا انظر المزهرا ۶۵ قال فی مجمع الامثال یضرب عند تحریش بعض القوم علی بعض من غیر مبالات۔

ہے۔اور غم بھی دل پر بمنزلہ گرہ کے بیٹھ جاتا ہے۔اس لیے اسے کَرْب کہا جاتا ہو۔اَکْرَبْتُ الدَّلْوَ: ڈول کے دستہ میں چھوٹی سی رسی باندھنا۔

(ک ر س)

اَلْکُرْسِیُّ: عوام کے عرف میں اس شے کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴾ (۳۸۔۳۴) اور ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔

یہ اصل میں کِرْسٌ کی طرف منسوب ہے اور کرس کے معنی ہیں، اوپر تلے جم جانے والا اور جمع ہو جانے والا۔ اسی سے کُرَّاسَۃٌ (مجموعہ اوراق) ہے۔کَرَسْتُ الْبِنَاءَ فَتَکَرَّسَ: میں نے عمارت کی بنیاد رکھی چنانچہ وہ بنیاد پڑ گئی عجاج نے کہا ہے❶ (الرجز)

(۳۰۸) یَا صَاحِ هَلْ تَعْرِفُ رَسْمًا مُکْرَسًا
قَالَ نَعَمْ اَعْرِفُهٗ وَاَبْلَسَا

اے میرے دوست: کیا تم نشان منزل کو پہچانتے ہو جہاں کہ اونٹوں کا بول و براز جما ہوا ہے۔ اس نے کہا ہاں پہچانتا ہوں اور غم زدہ ہو کر خاموش ہو گیا اَلْکِرْسُ کسی چیز کی اصل اور بنیاد کو کہتے ہیں۔

محاورہ ہے۔

هُوَ قَدِیْمُ الْکِرْسِ: اس کی بنیاد پرانی ہے اور ہر چیز کے ڈھیر کو کِرْسٌ کہا جاتا ہے اور کَرُوْسٌ کے معنی بڑے سر والا کے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ (۲۔۲۵۵) اس کی ''کرسی'' آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔کہ کرسی سے علم باری تعالیٰ مراد ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ کرسی کے معنی حکومت و اقتدار کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ فلک محیط یعنی فلک الافلاک کا دوسرا نام کرسی ہے❷ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔کہ سات آسمان کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہو۔❸

(ک ر م)

اَلْکَرَمُ: جب اللہ کی صفت ہو تو اس سے احسان و انعام مراد ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتا رہتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ﴾ (۲۷۔۴۰) تو میرا پروردگار بے پرواہ اور کرم کرنے والا ہے۔

---

❶ قاله العجاج وثالثهما وانحلبت عيناه من فرط الاسى وفي اللسان وابلسابدل واباسا، انظر للشطر ديوانه ١٦ و الكامل ٥٣٩ و الطبرى (٧: ١١٦) والقرطبى (٦: ٤٢٧) واللسان و التاج (بلس، كرس) ومعانى القرآن المنسوب الى الفراء (١: ٣٣٥) والمكرس موضع فيه الكروس اى ابوال الابل وابعارهما يتلبد بعضها على بعض والرجز ايضا فى الطبرى (١: ٢٢٧/ ٢١: ٢٦) ومجازا القرآن رقم (٢١٧) وتهذيب الالفاظ ٦٢٥ والبحر (٢: ٢٨٠) والثالث فقط فى مجاز القرآن (١٦١)

❷ فسره الزمخشرى بالملك والعلم قال ومنه يقال للعلماء الكراسى ١٢۔

❸ اخرجه ابن جرير وابن المنذر عن ابن عباس وروى بمعناه مرفوعا عن ابى ذر كما فى زوائد ابن حبان رقم (٩٤) فى اثناء حديث طويل وقال فى آخره وفيه ابراهيم بن هشام بن يحيى الغسانى قال ابو حاتم وغيره كذاب انظر لترجمته الحرج عليه لسان الميزان ١٢۔

اور جب انسان کی صفت ہو، تو پسندیدہ اخلاق اور افعال مراد ہوتے ہیں جو کسی انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور کسی شخص کو اس وقت تک کریم نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس سے کرم کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حریت اور کرم ہم معنی ہیں لیکن حریت کا لفظ چھوٹی بڑی ہر قسم کی خوبیوں پر بولا جاتا ہے اور کرم صرف بڑے بڑے محاسن کو کہتے ہیں۔ مثلاً جہاد میں فوج کے لیے سازوسامان مہیا کرنا یا کسی ایسے بھاری تاوان کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ اور آیت:۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ﴾ (۴۹۔۱۳) اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

میں "اَتْقٰی" یعنی سب سے زیادہ پرہیزگار کو "اَكْرَمُ" یعنی سب سے زیادہ عزت وتکریم کا مستحق ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ کَرَم بہترین صفات کو کہتے ہیں اور سب سے بہتر اور پسندیدہ کام وہی ہو سکتے ہیں جن سے رضا الٰہی کے حصول کا قصد کیا جائے لہٰذا جو جس قدر زیادہ پرہیزگار ہوگا اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

نیز اَلْكَرِيْمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ باشرف ہو چنانچہ فرمایا: ﴿فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ﴾ (۳۱۔۱۰) پھر (اس سے) اس میں ہر قسم کی نفیس چیزیں اگائیں۔

﴿وَزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ﴾ (۴۴۔۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (۵۶۔۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے۔

﴿وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ (۱۷۔۲۲) اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔

اَلْاِكْرَامُ وَالتَّكْرِيْمُ کے معنی ہیں: کسی کو اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی اور خفت نہ ہو یا جو نفع پہنچایا جائے وہ نہایت باشرف اور اعلیٰ ہو اور اَلْمُكَرَّمَ کے معنی معزز اور باشرف کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾ (۵۱۔۲۴) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے؟ اور آیت کریمہ:۔

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (۲۱۔۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے معزز بندے ہیں جیسے فرمایا:۔ ﴿وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ﴾ (۳۶۔۲۷) اور مجھے عزت والوں میں کیا۔

﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾ (۸۲۔۱۱) عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے۔

﴿بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰۔۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار اور نیکوکار ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (۵۵۔۲۷) اور جو صاحب جلال اور عظمت ہے۔

میں اکرام کا لفظ ہر دو معنی پر مشتمل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ عزت وتکریم بھی عطا کرتا ہے اور باشرف چیزیں بھی بخشتا ہے۔ [1]

---

[1] وهذا المعنى هو المراد (۹۶۔۳) (۱۷۔۶۲) (۸۹۔۱۵)

(ک ر ہ)

اَلْکَرْہُ وَالْکُرْہُ: (سخت ناپسندیدگی) ہم معنی ہیں۔جیسے ضَعْفٌ وَضُعْفٌ بعض نے کہا ہے کہ کَرْہٌ (بفتح الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں۔ جو انسان کو خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی ڈالی جائے۔اور کُرْہٌ (بضم الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں جو اسے ناخواستہ طور پر خود اپنے آپ سے پہنچتی ہے۔اور یہ دو قسم پر ہے۔ایک وہ جو طبعًا ناگوار ہو۔اور دوم وہ جو عقل یا شریعت کی رو سے مکروہ ہو لہٰذا ایک ہی چیز کے متعلق انسان کہہ سکتا ہے۔کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور برا بھی سمجھتا ہوں یعنی مجھے طبعا تو پسند ہے لیکن عقل وشریعت کی رو سے اسے ناپسند کرتا ہوں یا عقل وشریعت کی رو سے مجھے پسند ہے لیکن طبعًا ناپسند ہے چنانچہ آیت کریمہ:

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (مسلمانو) تم پر (خدا کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا۔

میں کُرْہٌ کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری طبیعتیں اسے ناپسند کرتی ہیں پھر اس کے بعد۔

﴿وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) (مگر) عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور تمہارے حق میں بھلی ہو۔

فرما کر وضاحت کر دی ہے۔کہ انسان کو چاہیے کہ کسی چیز کو اس وقت تک محبوب یا مکروہ نہ سمجھے جب تک کہ اس کی حقیقت حال سے آگاہ نہ ہو جائے۔

کَرِھْتُ کا لفظ دونوں قسم کی کراہت کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔گو زیادہ تر کُرْہٌ یعنی ناگوار کے معنی دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (۹۔۳۲) اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

﴿وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ (۹۔۳۳) اور اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ﴾ (۸۔۵) اور (اس وقت) مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔اور آیت کریمہ: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ﴾ (۴۹۔۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے۔ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کا گوشت کھانے کا خواہ قصد بھی کرے مگر طبعًا اسے اس سے ضرور نفرت ہوگی اور آیت کریمہ: ﴿لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا﴾ تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ (۴۔۱۹) میں ایک قراءت کُرْھًا بھی ہے۔اَلْاِکْرَاہُ: اس کے معنی کسی کو ایسے کام پر مجبور کرنا کے ہیں جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ﴾ (۲۴۔۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ میں بدکاری پر مجبور کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس پر کَرْہٌ اور کُرْہٌ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔اور آیت:

﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ (۲۔۲۵۶) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں: اول یہ کہ شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ کسی پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جائے تو فبہا

اس پر جبر نہ کیا جائے ❶۔

دوم یہ کہ یہ حکم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے۔یعنی اگر وہ لوگ جزیہ دینا قبول کرلیں اور دوسری شرائط کی پابندی کریں تو انہیں مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا جائے۔❷

سوم (۳) یہ کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو دین باطل کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور وہ زبان سے اس کا اقرار کر کے اس دین میں داخل ہو جائے تو اس پر کفر کا حکم عائد نہیں ہوتا۔جیسا کہ آیت:

﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۶۔۱۰۶) وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، سے معلوم ہوتا ہے۔

چہارم (۴) زیر بحث آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص دنیا میں کسی طرف سے مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔تو آخرت میں اسے اس کا ثواب نہیں ملے گا بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔اور وہ اخلاص کے بغیر کسی عمل کو قبول نہیں کرتا ❸ ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اسی لیے آنحضرت ﷺ فرمایا ❹ (۹۴) ((اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) کہ اعمال کے ثواب کا مدار نیتوں پر ہے۔ نیز فرمایا ❺: اَخْلِصْ يَكْفِيْكَ الْقَلِيْلُ مِنَ الْعَمَلِ کہ اخلاص کے ساتھ تو تھوڑا عمل بھی کافی ہوتا ہے۔

بعض نے آیت کے معنی یہ کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا بھی انسان کو مکلف بناتا ہے تو وہ درحقیقت اسے کسی امر پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اپنی ابدی نعمتوں کے حاصل کرنے کی تکلیف دیتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس قوم پر تعجب فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔❻ (۹۵)

ششم (۶) یہ کہ دین کے معنی اجزاء کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزائے اعمال پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ اسے اختیار ہے کہ جس کے ساتھ جس طرح چاہے سلوک کرے۔اور آیت کریمہ: ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

---

❶ وهذا هوا المروى عن عبدالله بن مسعود وابن زيد وسليمان بن موسى وعندهم هذا الحكم منسوخ بآية: جاهد الكفار والمنافقين۔

❷ وهو المحكى عن الحسن قتادة والضحاك و ورد فى سبب نزوله يؤيدّه (روح المعانى ص٢ ج٣)

❸ قاله وقال هذا يشير كلام مجاهد واخرج ابن جرير وغيره عن ابى العالية (روح المعانى ١٨٨/٣)

❹ متفق عليه لئكن بزياده "انما" وابن حبان فى صحيحه بدونها (المقاصد ٦٨) ومالك برواية محمد بن الحسن والحاكم فى المستدرك واصحاب السنن كلهم عن عمرؓ وايضا مالك فى رواية محمد بن الحسن والشافعى فى مختصر الربيع والحميدى وابن الجارود وابن خزيمة والطحاوى عن غير عمر ايضاً لئكن طرقها كلها ضعيفة راجع للبحث (الفتح البارى) (والعينى) فانهما اشبع الكلام والسيوطى فى التدريب فى بحث "الشاذ" والحاصل ان الحديث صحيح غريب وقد تواتر معناه (راجع كنز العمال(٣ رقم ٣٦۔٢١، ٢٤٥) بعض علماء الازهر جمع اسانيده فى رساله مسماة الابتهاج بتخريج احاديث المنهاج۔

❺ والحديث ابن ابى الدنيا فى الاخلاص وللديلمى فى مسنده باسناد منقطع ولفظه اخلص العمل يجزك من القليل (راجع كنز العمال (ج٣ رقم ١٣٠) وتخريج العراقى على الاحياء (٣٨٦/٤)۔

❻ البخارى فى صحيحه فى باب الاسارى فى فى السلاسل من حديث ابى هريرة وابوداؤد و مسلم وباختلاف الفاظه الحاكم فى المستدرك والطبرانى عن ابى امامة (راجع كنز العمال (٤ رقم ١٧٨، ٢١٩۔)

﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ (۳۔۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان وزمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طوعا کا تعلق مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ کے ساتھ ہے اور کَرْهًا کا تعلق اَلْاَرْضِ سے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اہل آسمان تو بطیب خاطر اس کی فرمانبرداری کر رہے ہیں اور اہل زمین زبردستی سے یعنی دلائل فطرت سے مجبور ہو کر اس کی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

اَلدَّلَالَةُ اَكْرَهَتْنِىْ عَلَى الْقَوْلِ بِهٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ کہ دلائل سے مجبور ہو کر میں اس مسئلہ کو مانتا ہوں اور اس قسم کا جبر جبر مذموم نہیں ہے یعنی دلائل سے مجبور ہو کر کسی بات کو ماننا سلب اختیار کو مستلزم نہیں ہے (حتیٰ کہ اس پر عدم جزا کا مسئلہ مرتب ہو جیسا کہ جبریہ فرقہ کا مذہب ہے)

(۲) اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مومنین تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور کافر کرھا یعنی زبردستی سے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بات کا ان سے ارادہ کرتا ہے اور جو بھی ان کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اس سے انکار کی طاقت نہیں رکھتے۔

(۳) قتادہ نے اس کو حالت نزع پر محمول کیا ہے۔ کہ عندالموت مومنین تو خوشی سے اور کفار زبردستی سے اس کی فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آیت:

﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ﴾ (۴۰۔۸۵) اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ كَرْهًا مسلمان ہونے سے وہ لوگ مراد ہیں جو لڑائی میں جان بچانے کے لیے مسلمان ہو جاتے تھے۔

(۵) اس آیت میں پانچواں قول ابوالعالیہ اور مجاہد کا ہے کہ ہر شخص اللہ کے خالق ہونے کا معترف ہے۔ خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ آیت: ﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (۳۱۔۲۵) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔ سے معلوم ہوتا ہے گویا مومن خوشی سے اس کی خالقیت کا اعتراف کرتے ہیں اور کفار زبردستی سے۔

(۶) ابن عباس سے مروی ہے کہ تمام لوگ احوال فطری کے لحاظ سے اس کے فرمانبردار ہیں اگرچہ زبان کے ساتھ وہ اظہار کفر کرتے ہیں اور اس سے مراد "ذَرِّ اَوَّل" کے وقت کا اسلام ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ (۷۔۱۷۲) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں، میں پایا جاتا ہے۔ یعنی عقل (وغیرہ) کی قسم کے فطری دلائل مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مقتضی ہیں اور وہ دلائل وہی جن کی طرف کہ آیت:

﴿وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ﴾ (۱۳۔۱۵) اور ان کے سائے بھی صبح وشام (سجدہ کرتے ہیں) میں اشارہ فرمایا ہے۔

(۷) زیر بحث آیت میں ساتواں قول بعض صوفیاء کرام کا

ہے۔ کہ مَنْ اَسْلَمَ طَوْعًا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ثواب اور عقاب کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ براہ راست اس ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ثواب وعقاب دینے والی ہے اور کَرْهًا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ثواب وعقاب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ثواب کی رغبت یا عذاب کے خوف سے اس کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْهًا﴾ (۱۳۔۱۵) اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں ہیں خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہیں۔

بھی اس کی مثل ہے (یعنی مذکورۃ الصدر معانی پر محمول ہو سکتی ہے۔)

(ک س ب)

اَلْکَسْبُ: اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں، جیسے کسب مال وغیرہ اور ایسے کام کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الٹا اس سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پس اَلْکَسْبُ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لیے کرے اسی لیے یہ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے کَسَبْتُ فُلَانًا کَذَا: میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کر کے دیا۔ مگر اَلْاِکْتِسَابُ: ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہٰذا ہر اَکْتِسَاب کو کسب لازم ہوتا ہے۔ لیکن ہر کسب کو اکتساب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خَبَزَ وَاخْتَبَزَ وَشَوٰی وَاشْتَوٰی، وَطَبَخَ وَاطَّبَخَ کی طرح ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾ (۲۔۲۶۷) جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو...... اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔

کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا [1]

اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ؟ کہ کونسا کسب زیادہ پاکیزہ ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ((عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِهٖ۔ کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا [2] (۹۵) ((اِنَّ اَطْیَبَ مَا یَاْکُلُ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِهٖ وَاِنَّ وَلَدَهٗ مِنْ کَسْبِهٖ)) سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھالے اور اسکی اولاد بھی اس کے کسب سے ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ (۲۔۲۶۴) (اسی طرح یہ ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور قرآن پاک میں نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

---

[1] رواہ الترمذی عن عنبسة والبخاری عن عبداللہ بن عمر والطبرانی واحمد عن رافع بن خدیج وابن اسحاق عن علی قال فی الکنز (٤ رقم ٦٦٠٦) وتفرد به بهلول وقال الحاکم صحیح الاسناد راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (٢/٦٣ـ١٢٦٤)۔

[2] الحدیث فی ابی داؤد عن عائشة رضی اللّٰہ عنها وزوائد بن حبان رقم (١٠٩١ و ١٠٩٢) وکنز العمال (ج ٤ رقم ٣١، ٣٢، ٤٠) وایضاً تخریج الکشاف للحافظ (ص ١٢٠) رقم (٩٠) وقال الحاکم عن عمارة عن امه عن عائشه وذکر الدارقطنی فی العلل وطال ویتعلق بالباب حدیث ((انت ومالك لابیك فارجع الیه)) قال القبتی فی الغریب وبعضهم فسرآیة اللهب "وما کسب" ای وما ولد

﴿اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ (۱۵۸-۶) یا اپنے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کیے ہونگے اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الْاٰية﴾ کے بعد فرمایا:

﴿مِمَّا كَسَبُوْا﴾ (۲۰۲-۲) ان کے کاموں کا (حصہ) اور اعمال بد کے متعلق فرمایا۔

﴿اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۷۰-۶) تاکہ (قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا﴾ (۷۰-۶) یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ﴾ (۱۲۰-۶) جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۷۹-۲) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے۔ اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

﴿فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۸۲-۹) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو اعمال کے بدلے جو کرتے رہے ہیں بہت سا رونا ہوگا۔ ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا﴾ (۴۵-۳۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا۔

﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا﴾ (۱۶۴-۶) اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (۲۸۱-۲) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔ میں مَاكَسَبَتْ کا لفظ نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کو شامل ہے اور اِكْتِسَابِ کا لفظ بھی ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (۳۲-۴) مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (۲۸۶-۲) اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا اور برے کام کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔

سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ کسب کا لفظ اعمال صالحہ اور اکتساب کا لفظ اعمال سیئہ کے ساتھ مخصوص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کَسْب سے اعمال اخروی اور اکتساب سے مکاسب دنیوی مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کسب سے مراد ہر وہ عمل ہے جو فعل خیر یا جلب نفع کے قبیل سے ہو اور دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے جائز طریقے سے انسان اسے کرتا ہے اور اکتساب سے ہر وہ نفع مراد ہے جو انسان اپنی ذات کے لیے حاصل کرتا ہے بشرطیکہ اس کا حصول اس کے لیے جائز ہو لہٰذا آیت میں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ جو فعل انسان دوسروں

کو فائدہ پہنچانے کے لیے کرتا ہے۔ اس کا اسے ثواب حاصل ہوگا اور جو صرف اپنی ذات کے لیے حاصل کرتا ہے خواہ اس کا حصول جائز طریقے پر ہی کیوں نہ ہو، تو شاذ ونادر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا وبال اس پر نہ پڑے تو یہ اس مقولہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو مصائب کا خوگر بنائے جیسا کہ آیت: ﴿اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔ اور اس قسم کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

(ک س ف)

كَسُوْفُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ کے معنی ہیں: سورج یا چاند کا کسی خاص عارضہ سے مستور یعنی گہن میں آجانا کے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر چہرہ یا حالت کے خراب ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے كَاسِفُ الْوَجْهِ یا كَاسِفُ الْحَالِ۔

اَلْكِسْفَةُ: کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے متخلخل اجسام کے ٹکڑہ کے ہیں اس کی جمع كِسَفٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا﴾ (۳۰۔۴۸) اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۲۶۔۱۸۷) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا کر گراؤ۔ ﴿اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ (۱۷۔۹۲) یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے لا کر گراؤ۔

ایک قراءت میں كِسْفًا بسکون سین ہے اور كِسَفٌ کا واحد كِسْفَةٌ ہے جیسے سِدْرَةٌ وَسِدَرٌ اور فرمایا۔

﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۲۔۴۴) اور اگر یہ آسمان سے عذاب کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔ ابوزید نے کہا ہے ❶ كَسَفْتُ الثَّوْبَ (ض) كِسْفًا کے معنی کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں بعض نے كَسَفْتُ عُرْقُوْبَ الْاِبِلِ بھی کہا جس کے معنی اونٹ کی کونچ کاٹ دینے ہیں (لیکن) بعض اہل لغت کے نزدیک اس معنی میں صرف كَسَحْتُ (ف) ہی استعمال ہوتا ہے۔

(ک س ل)

اَلْكَسَلُ کے معنی کسی ایسے معاملہ میں گراں باری ظاہر کرنا کے ہیں۔ جس میں گرانباری کرنا مناسب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مذموم خیال کیا جاتا ہے اور یہ باب كَسِلَ (س) فَهُوَ كَسِلٌ وَّكَسْلَانٌ کا مصدر ہے۔ اور كَسْلَانٌ کی جمع كُسَالٰی وَكَسَالٰی آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ ابوزید البلخی احمد بن سهل (۲۳۵۔۳۲۲) احد الكبار الافذاد من علماء الاسلام وصاحب التاليفات وكتابه نظم القرآن من امثل ما كتب فيه قال ابو حيان فى كتاب "البصائر والذخائر" قال ابو حامد القاضى لم اركتا با فى القرآن مثل كتاب ابى زيد البلخى وفى الفهرست ۵۹ له كتاب غريب القرآن وقوارع القرآن وغير ذالك وهناك ابوزيد سعيد بن اوس الانصارى وله ايضا كتاب النواد رتوفى سنه ۲۱۵ھ الفهرست ۸۷، لئكن النوا درللبلخى اجمع فى فنون شى جمع بين الشريعة والفلسفة والادب الفنون (راجع لسان الميزان) (۱: ۱۸۳) ومعجم الادباء (۳: ۶۵۔۸۶) وحكماء الاسلام (۲۲) ماخوذ من الاعلام للزركلى ۱۲۔

﴿وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (۹۔۵۴) اور نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا يَكْسِلُهُ الْمَكَاسِلُ: اس کو اسباب کاہلی سست نہیں بناتے۔

فَحْلٌ كَسِلٌ، جونر کہ جفتی میں سست ہو جائے اِمْرَاَةٌ مِّكْسَالٌ: زن سست، جو ناز پروردہ ہونے کی وجہ سے اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلے۔ (صفت مدح)

(ک س و)

اَلْكِسَاءُ وَالْكِسْوَةُ کے معنی لباس کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْكِسْوَتُهُمْ﴾ (۵۔۸۹) یا ان کو کپڑا دینا۔

كَسَوْتُهٗ: میں نے اسے لباس پہنایا۔

اِكْتَسٰى: (افتعال) اس نے پہن لیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ﴾ (۴۔۵) ہاں اس میں سے ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔

﴿فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا﴾ (۲۳۔۱۴) پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا۔

اِكْتَسَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ: زمین نے نباتات کا لباس پہن لیا۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۳۷۲) فَبَاتَ لَهٗ دُوْنَ الصَّبَا وَهِيَ قَرَّةٌ
لِخَافٌ وَمَصْقُوْلُ الْكِسَاءِ رَقِيْقٌ

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مصقول اَلْكِسَاءِ سے مراد دودھ ہے جس پر بالائی کی تہ آ چکی ہو۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے [2] (المنسرح)

(۳۷۳) حَتّٰى اَرٰى فَارِسَ الصَّمُوْتِ عَلٰى
اَكْسَاءِ خَيْلٍ كَاَنَّهَا الْاِبِلُ

یہاں تک کہ میں "صموت" کے شہسوار کو دیکھوں کہ وہ اونٹ جیسے قد آور گھوڑوں کا تعاقب کر رہا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اَكْسَاءٌ بمعنی اعقاب کے ہے۔ لیکن اصل میں اونٹ کے تیز دوڑانے سے جو غبار اٹھتا ہے اور وہ بلند ہو کر انہیں چھپا لیتا ہے۔ اسے اَكْسَاءٌ کہا جاتا ہے۔ یہاں عَلٰى اَكْسَاءِ اِبِلٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے لباس کے غبار میں متصل آ رہا ہے۔

(ک ش ف)

اَلْكَشْفُ یہ كَشَفْتُ (ض) الثَّوْبَ عَنِ الْوَجْهِ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانا کے ہیں۔ اور مجازاً غم واندوہ کے دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ﴾ (۶۔۱۷) اور خدا تم کو سختی پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ﴾ (۶۔۴۱) تو جس دکھ

---

[1] قاله عمرو بن الاهتم وقبله: فَبَاتَ لنا منها و للضيف موهنا۔ شواء سمين زاهق وغبوق وفي اللسان (كسا) قال ابن برى: والصواب انشاده وبات بدل فبات والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۳ بيتا راجع عيون الاخبار (۱: ۳۴۲) والمعانى للقبتى ۳۹۸۔

[2] قاله المثلم عن عمرو التنوخى فى اربعة ابيات يصف فرسه الصموت ومعناه هو يهزم اعداءه فيسوقهم من وراءهم ويطردهم كما يطرد الابل والبيت لى اللسان (صمت) والمؤتلف للامدى ۲۷۶ فى خمسة ابيات وقد نسب الى بريق بن عياض الهذلى (بقية اشعار الهذليين ۲۵) وفى رواية انساء خيل بدل اكساء خيل وفى رواية التبريزى كانها أبل (جميع ابيل) والمرزوقى ۴۷۹ وفى الجمحى: ونرويها لرجل من تنوخ ۱۲۔

کے لیے اسے پکارتے ہو...... تو اس کو دور کر دیتا ہے۔
﴿لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ﴾ (۵۰۔۲۲) یہ وہ دن ہے کہ اس سے تو غافل ہو رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا۔
﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ﴾ (۲۷۔۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔ اور (کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔) اور آیت:
﴿یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۶۸۔۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰی سَاقٍ کی طرح کا محاورہ ہے یعنی شدت اور سختی...... ظاہر ہونے سے کنایہ ہے۔ [1]
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں تَذْمِیْرُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جب کوئی شخص حاملہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بچہ نکالتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے۔
كُشِفَ عَنِ السَّاقِ (کہ پنڈلی کھولی گئی) تو یہاں بھی صعوبت حال ہی سے کنایہ ہے۔

(ک ش ط)

اَلْكِشْطُ (ض) کے معنی کھال اتارنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ (۸۱۔۱۱) اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔
یہ كَشْطُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹنی کی کھال اتارنے کے ہیں اور اس سے اِنْكَشَطَ رَوْعُهٗ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی خوف زائل ہونے کے ہیں۔

(ک ظ م)

اَلْكَظْمُ: اصل میں ''مخرج النفس'' یعنی سانس کی نالی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:
اَخَذَ بِكَظْمِهٖ: اس کی سانس کی نالی کو پکڑ لیا۔ یعنی غم میں مبتلا کر دیا۔
اَلْكُظُوْمُ کے معنی سانس رکنے کے ہیں اور خاموش ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ انتہائی خاموشی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے فُلَانٌ لَّا یَتَنَفَّسُ کہا جاتا ہے۔ فلاں سانس نہیں لیتا یعنی خاموش ہے۔ كُظِمَ فُلَانٌ اس کا سانس بند کر دیا گیا۔ (مراد نہایت غمگین ہونا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ﴾ (۶۸۔۴۸) کہ انہوں نے خدا کو پکارا اور وہ (غم) غصہ میں بھرے تھے اور كَظْمُ الْغَیْظِ کے معنی غصہ روکنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:
﴿وَالْكَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ﴾ (۳۔۱۳۴) اور غصے کو روکتے۔
اور اسی سے كَظَمَ الْبَعِیْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کا جگالی نہ کرنا کے ہیں۔ كَظْمُ السِّقَآءِ مشک کو پانی سے بھر کر اس کا منہ باندھ دینا تاکہ اس سے پانی نہ نکل سکے۔ اَلْكِظَامَةُ: ترازو کے اس حلقہ کو کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے ترازو کی ڈنڈی کے ساتھ

[1] کذا قال قتادة علی ما فی المشکل للقبتی ۱۰۳ والطبری وروی نحوه عن ابن عباس ومجاهد وابن جبیر وهو اختیار ابی عبیدة واهل اللغة کما فی اللسان ۱۲۔

باندھ دی جاتی ہیں۔ (۲) اس تسمہ کو بھی کظامۃ کہا جاتا ہے جس کو کمان کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔

اَلْکَظَائِمُ: (واحد کِظَامَۃٌ) وہ زمین دوز نالیاں جن کے ذریعہ ایک کنویں کو (دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے) تاکہ ایک کا پانی دوسرے میں منتقل ہوتا رہے۔ گویا وہ سانس آنے جانے کی نالیاں ہیں ❶

(ک ع ب)

کَعْبُ الرِّجْلِ: (ٹخنہ) اس ہڈی کو کہتے ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ پر ہوتی ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ (۵۔۶) اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔

اَلْکَعْبَۃُ: اصل میں ہر اس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چوکور بنا ہوا ہو اسی سے بیت الحرام کو اَلْکَعْبَۃُ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ (۵۔۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو لوگوں کے لیے موجب امن قرار فرمایا۔

ذُوْالْکَعَبَاتِ: بنو ربیعہ کی عبادت گاہ کا نام جو انہوں نے جاہلیت میں بنائی تھی۔ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَابِسٌ فِیْ کَعْبَتِہٖ: یعنی فلاں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو مکعب شکل پر بنا ہوا ہے اِمْرَأَۃٌ کَاعِبٌ ابھرے ہوئے پستانوں والی لڑکی۔ اور یہ کِعَابَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی عورت کی چھاتی ابھرنے کے ہیں۔

اور کَاعِبُ کی جمع کَوَاعِبٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا﴾ (۷۸۔۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔

کَعَبَ الثَّدْیُ کَعْبًا وَکَعَّبَ تَکْعِیْبًا: (لڑکی کی) چھاتی ابھر آنا۔

ثَوْبٌ مُکَعَّبٌ: لپیٹا ہوا کپڑا جس کی تہ سخت اور اٹھی ہوئی ہو۔ اور سرکنڈے یا نیزے کی دو گرہوں کے درمیان کے حصہ کو بھی تشبیہ کے طور پر کعب (پور) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ٹخنہ پنڈلی اور پاؤں کے درمیان فاصل ہوتا ہے اس طرح یہ بھی دو گرہوں کے درمیان فاصل ہوتی ہے۔

(ک ف ف)

اَلْکَفُّ ۔ کے معنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں جس کے ساتھ انسان چیزوں کو اکٹھا کرتا اور پھیلاتا ہے۔ کَفَفْتُہٗ کے اصل معنی کسی کی ہتھیلی پر مارنے یا کسی کو ہتھیلی کے ساتھ مار کر دور ہٹانے اور روکنے کے ہیں پھر عرف میں دور ہٹانے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے خواہ ہتھیلی سے ہو یا کسی اور چیز سے ❷ رَجُلٌ مَکْفُوْفُ الْبَصَرِ جس کی بینائی جاتی رہی ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ﴾ (۳۴۔۲۸) اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو گناہوں سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

---

❶ وفی الحدیث: اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کظامۃ قوم فتوضا و مسح علی قدمیہ انظر الفائق (۲/۱/۲۰۱) وغریب ابی عبید (۲۶۸/۱)۔

❷ کما فی قولہ تعالیٰ: کف ایدی الناس عنکم (الفتح۔ ۲۰) وھو الذی کف ایدیھم عنکم (الفتح ۲۵)

میں کَـافَّۃً کے معنی لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا کے ہیں۔ اس میں ہامبالغہ کے لیے ہے۔ جیسے کہ رَاوِیَۃٌ وَعَلَّامَۃٌ اورنَسَّابَۃٌ۔ میں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَ قَـاتِـلُـوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ (۹۔۳۶) اورتم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔ جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ میں بعض نے دونوں جگہوں میں کَافَّۃً کے معنی کافین یعنی روکنے والے کیے ہیں۔اور بعض نے یہ معنی کیا ہے۔کہ جـمـاعـۃً یعنی اجتماعی قوت کی وجہ سے اسے کَافَّۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿يَـآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (۲۔۲۰۸) مومنو: اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ میں بھی کَـافَّۃً بمعنی جماعت ہی ہے اور آیت کریمہ ﴿فَـاَصْبَـحَ يُـقَـلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا﴾ (۱۸۔۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

پشیمان ہونے والے کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔کیونکہ انسان پشیمانی کی حالت میں ہاتھ ملتا ہے۔

تَـكَـفَّـفَ الـرَّجُـلُ: سوال کے لیے ہاتھ پھیلانا۔

اِسْتَـــــكَفَّ سوال یا مدافعت کے لیے ہاتھ پھیلانا۔

اِسْتَكَفَّ الشَّمْسَ: ہتھیلی کے ذریعہ دھوپ کو دفع کرنا اور وہ اس طرح کہ دھوپ کی شعاعوں کو روکنے کے لیے ابروں پر بطور سایہ ہاتھ رکھ لے تاکہ جس چیز کو دیکھنا مطلوب ہو آسانی سے دیکھی جا سکے۔

كِـفَّةُ الْمِيْزَانِ: ترازو کا پلڑا۔کیونکہ وہ بھی موزوں چیز کو روک لینے میں ہتھیلی کے مشابہ ہوتا ہے۔ایسے ہی كُـفَّةُ الْـحِبَـالَةِ ہے۔❶ جس کے معنی شکاری کے پھندا کے ہیں۔

كَـفَـفْـتُ الثَّوْبَ: کچی سلائی کے بعد کپڑے کے اطراف کو سینا۔

(ک ف ت)

اَلْـكَـفْـتُ: (ض) کسی چیز کو جمع کر کے اسے قبضہ میں لے لینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿اَلَمْ نَـجْـعَـلِ الْاَرْضَ كِـفَـاتًـا اَحْيَـآءً وَّاَمْوَاتًـا﴾ (۷۷۔۲۵۔۲۶) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا۔ یعنی زندوں اور مردوں کو۔

یعنی زمین تمام مردوں اور زندوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ احیاء سے مراد انسان، حیوان اور نباتات ہیں اور اموات سے جمادات بعض نے ''کفات'' کے معنی تیزی سے اڑنا بھی کیے ہیں لیکن اصل میں اس کے معنی اڑنے کے لیے پروں کو سمیٹنا کے ہیں۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَوَلَـمْ يَـرَوْا اِلَـى الطَّيْـرِ فَـوْقَهُـمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ﴾ (۶۷۔۱۹) کیا انہوں نے اپنے سروں پر اڑتے جانوروں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلائے رہتے ہیں اور سکیڑ بھی لیتے ہیں۔

تو یہاں قبض کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں كِفَاتٌ کا لفظ ہے۔

اَلْـكَـفْـتُ کے معنی تیز ہانکنا بھی آتے ہیں۔اور قبض کی

---

❶ وفي الكامل يقال لكل مستطيل كفة (بضم الكاف) ومعناه كفة الحاهل و لكل مستدير كفة ومنه كفة الميزان (۸۵۷/۳)۔

طرح کفت کا لفظ بھی اونٹوں کے ہنکانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قبض الراعی الابل کے معنی ان کو تیز ہانکنے کے ہیں۔ اور منتظم چرواہے کو راعی قبضۃ کہا جاتا ہے۔ اور کَفَتَ اللّٰهُ فُلَانًا اِلٰی نَفْسِهٖ (اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی) قبضہ کے ہم معنی ہے۔ حدیث میں ہے ❶ (۹۸)

((اِكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ بِاللَّيْلِ)) رات کو اپنے بچوں کو اپنے گھروں میں بند رکھو۔

(ک ف ر)

اَلْكُفْرُ: اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور رات کو کافر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ اور یہ رات یا کسان کے ناموں میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل لغت نے بطور دلیل مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے ❷ (الکامل)

(۳۷۴) اَلْقَتْ ذُكَاءُ يَمِيْنَهَا فِيْ كَافِرٍ۔

سورج نے اپنا دایاں ہاتھ رات کے اندر ڈال دیا۔ یعنی غروب ہوگیا۔

اَلْكَافُوْرُ: اس غلاف کو کہتے ہیں۔ جو پھل کو اپنے آغوش میں چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❸ (الرجز)

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ اِذْ نَادٰی مِنَ الْكَافُوْرِ

جیسے انگور غلاف سے ظاہر ہوتا ہے۔

كُفْرٌ یا کفران نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کر کے اسے چھپانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ﴾ (۲۱۔۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ تر نعمت کا انکار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکارِ دین کے معنی میں اور كُفُوْرٌ کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ كلمة من حديث طويل عن جابر قاله ﷺ فى الآداب والحديث فى الفائق (۱/۱۸٤) واللسان والنهايه (كفت)

❷ قاله ثعلبه بن صعير المازنى يصف ناقته، وشبيه عيبته والقيان بريش جناحى الظليم حين يكون معارضا لنعامة رائحين بينهما عند غروب الشمس وصدره فتذكر اثقلا ثيد ابعد ما.......... والبيت فى الطبرى (۱: ۱۱۱) والطبرسى (۲: ۹۵) واللسان (ثقل اثر، ذكا، كفر، يدى) وتهذيب اصلاح المنطق (۱: ۸٤) والاصلاح ٤۱۷ والحصرى (٤: ۱۲۳) والشعراء ۱۵٦ والكنز اللغوى ۵۱ والاشتقاق (۳۵۱، ۱۸۷) وفى الامالى (۲: ۱٤۲) غير منسوب ونسبه فى السمط (۷٦۹) مع البيتين وفى رواية المفضلية ۱۵۲ فتذكرت بدل فتذكر اوالبيت ايضا فى ذيل الصناعتين ۱۸۵ وابن ولاد ۵۲ وتهذيب الالفاظ ۳۸۷ وابدال ابى الطيب (۲: ۵۷) وابدال يعقوب ۵۱ وشرح السبع لابن الانبارى ومبادى اللغة للاسكافى اوالعجز فقط فى نظام الغريب ۱۸۵ والمعانى للقبتى ۳۵۸ وهو من قصيدة فى منتهى الطلب (۱: ۱٦۱۔۱۵۲) والمفضلية ۲٤ التى مطلعها: هل عند عمرة من نبات...... والرشيد معناه النضيد فانهم يذكرون ان النعامة تضع بيضها طولا وعرضا على خط وسطر كما فى الحيوان (٤: ۳۲۸) وعيون الاخبار (۲: ۸۷۔۸۸) والبيت ايضا فى الحيوان (۵: ۱۳۱) والمخصص (۱۹/۹) (۹/۱۷) والحصرى (٤: ۱۱۵) والبا فلانى فى اعجازه ۲۰۰۔

❸ قاله العجاج وقبله غراء تسبى نظر الناظور۔ بفاحم يعكف او منشور (راجع اللسان (۱۲: ۱۱۲) والعمدة (۱: ۲٦۷) ومبادى اللغة (۱۷۸) ومشكل القرآن للقبتى ۱۰۰ وديوانه ۲۷۔

﴿فَاَبٰی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا کُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۸۹) تو ظالموں نے انکار کرنے کے سوا اسے قبول نہ کیا ﴿فَاَبٰی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۸۹) مگر اکثر لوگوں نے انکار کرنے کے سوا قبول نہ کیا۔ اور فعل کَفَرَ فَھُوَ کَافِرٌ ہر دو معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ معنی کفران کے متعلق فرمایا: ﴿لِیَبْلُوَنِیٓ ءَ اَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّی غَنِیٌّ کَرِیْمٌ﴾ (۲۷۔۴۰) تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے۔ تو میرا پروردگار بے پروا (اور) کرم کرنے والا ہے۔ ﴿وَاشْکُرُوْلِی وَلَا تَکْفُرُوْنِ﴾ (۲۔۱۵۲) اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۹) اور تم نے ایک اور کام کیا تھا جو کیا۔ تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قصداً میری نعمت کی ناشکری کی ہے۔

﴿لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ﴾ (۱۴۔۷) اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب بھی سخت ہے۔

اور کفران نعمت چونکہ انکار نعمت کا مقتضی ہے اس لیے یہ مطلقاً انکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَکُوْنُوْآ اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ﴾ (۲۔۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔

تو یہاں کافر بمعنی جاحد (منکر) کے ہے اور کافر علی الاطلاق یعنی بلا تقیید عرف میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت اور نبوت میں سے کسی ایک یا تینوں کا منکر ہو۔ اور کبھی کفر کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو شریعت کے کسی حکم میں خلل اندازی کرتا ہو یا اللہ تعالیٰ کی اس طرح شکر گزاری نہ کرتا ہو جیسے کرنا چاہیے۔ چنانچہ آیت:

﴿مَنْ کَفَرَ فَعَلَیْہِ کُفْرُہٗ﴾ (۳۰۔۴۴) تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی پر ہے۔

میں کفر کے معنی شریعت کے حکم میں خلل اندازی کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل آیت:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِہِمْ یَمْھَدُوْنَ﴾ (۳۰۔۴۴) اور جس نے نیک عمل کیے تو ایسے لوگ اپنے ہی لیے آرام گاہ درست کرتے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَاَکْثَرُھُمُ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (۸۶۔۸۳) اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَکُوْنُوْآ اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ﴾ (۲۔۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ائمہ کفر نہ بنو کہ دوسرے لوگ اس میں تمہاری اقتداء کریں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (۱۲۔۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

میں مَنْ کَفَرَ سے حقوق الٰہی کو چھپانے والے لوگ مراد

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فاسق کہا ہے کیونکہ کفر مطلق فسق سے اعم ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص حق باری تعالیٰ میں جحود سے کام لے گا تو وہ اپنے اس ظلم کے سبب اطاعت الٰہی سے خارج سمجھا جائے گا۔

پھر جس طرح ہر اچھے کام کو ایمان قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہر برے کام کو کفر شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سحر کے متعلق فرمایا:

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۲۔۱۰۲) اور سلیمانؑ نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔

اور آیت ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ کے بعد فرمایا۔ ﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) کہ اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اسی طرح آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے آخر میں فرمایا:

﴿وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۳۔۹۷) اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

اَلْكَفُوْرُ: (مبالغہ) کے معنی انتہائی درجہ کے ناسپاس کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ﴾ (۲۲۔۶۶) اور انسان تو بہت ناشکرا ہے۔

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَ هَلْ نُجٰزِيْ اِلَّا الْكَفُوْرَ﴾ (۳۴۔۱۷) یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی۔ اور ہم سزا ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں انسان کو كَفُوْرٌ بصیغہ مبالغہ کہا ہے۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ "اِنَّ" ولام تو کید لا کر کلام کو اور بھی زوردار بنا دیا گیا ہے حالانکہ دوسرے مقام پر آیت:

﴿وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ﴾ (۴۹۔۱۷) اور کفر سے تم کو بیزار کردیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کفر سے طبعی نفرت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ" میں "كَفُوْرٌ" کفر سے نہیں ہے۔ بلکہ کفران نعمت سے ہے پس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ ناسپاسی اور شکر گزاری سے غفلت برتنا انسان کا فطرتی خاصہ ہے۔ اور آیت۔

﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ﴾ (۸۰۔۱۷) انسان ہلاک ہو جائے، کیسا ناشکرا ہے، بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اسی لیے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ (۳۴۔۱۳) اور میرے بندوں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (۷۶۔۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

میں بھی متنبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو (ہدایت اور گمراہی کے) راستے بتا دیئے ہیں جیسا کہ آیت: ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر وشر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ اب کوئی شکر گزاری کے رستہ پر گامزن ہے اور کوئی ناشکری کی راہ پر اور آیت: ﴿وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا (یعنی) ناشکرا ہے۔ میں كَفُوْرٌ کفر سے ہے اور آیت میں كَانَ کے لفظ سے

اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اس نے جنم ہی کفر پر لیا ہے۔

اَلْكُفَّارُ: اس میں کفور سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ (۵۰۔۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۹۔۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ (۲۔۲۷۶) اور خدا کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ ﴿اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ (۷۱۔۲۷) وہ بھی بدکار اور ناشکر گزار ہوگی۔

اور کبھی کَفَّار بمعنی کفور بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (۱۴۔۳۴) بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

كُفَّارٌ اور كَفَرَةٌ دونوں کافِرٌ کی جمع ہیں۔ لیکن پہلی جمع تو عام طور پر مومنین کے بالمقابل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (۴۸۔۹) وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں۔

﴿لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

اور دوسری بمعنی کفرانِ نعمت کے آتی ہے چنانچہ آیت: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ﴾ (۸۰۔۴۲) یہ لوگ کفار بدکردار ہیں۔

میں آپ نہیں دیکھتے کہ کَفَرَةٌ کی صفت فَجَرَةٌ لائی گئی ہے اور فَجَرَةٌ فاسق مسلمان کو بھی کہا جاتا ہے (تو معلوم ہوا کہ یہاں کَفَرَةٌ سے مراد ناشکرے ہی ہیں اور آیت: ﴿جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ﴾ (۵۴۔۱۴) یہ سب کچھ اس شخص کے انتقام کے لیے کیا گیا ہے۔ جس کو کافر مانتے نہ تھے۔

میں لِمَنْ كَانَ كُفِرَ سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفاء مراد ہیں۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کو نصیحت کی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ (۴۔۱۳۷) جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہوگئے۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کفر کیا۔ پھر عیسائی عیسیٰ پر ایمان لائے مگر ان کے بعد آنے والے پیغمبر کے ساتھ کفر کیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا پھر انہی کے ساتھ کفر کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ان کا کسی دوسرے پر تو ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت۔

﴿وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ﴾ (۳۔۷۲) اور اہل کتاب ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ (جو) کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کردیا کرو۔

کی طرح ہے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دو دفعہ ایمان لائے اور پھر دوبار ہی کفر کیا۔ بلکہ اس سے ان کی

مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔بعض نے کہا ہے کہ جس طرح فضائل میں ترقی کے تین درجات ہیں اسی طرح رذائل میں بھی انحطاط کے تین درجے ہیں۔اور آیت کریمہ میں انہی درجات کی طرف اشارہ ہے۔اس مفہوم کو ہم نے اپنی کتاب "الـذریعة" میں خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

کَفَرَ فُـلَانٌ کے معنی اعتقاد کفر کے بھی ہوتے ہیں اور محض زبان سے اظہار کفر کے بھی۔خواہ دل سے اس کا معتقد نہ ہو۔اسی لیے فرمایا:۔

﴿مَـنْ کَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَ قَـلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ﴾ (۱۶۔۱۰۶) جو شخص ایمان کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

کَفَرَ فُلَانٌ بِالشَّیْطَانِ کے معنی شیطان کی وجہ سے کفر کرنے کے ہیں۔اور کبھی اس کا معنی شیطان کے ساتھ کفر کرنا بھی آ جاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا:﴿فَمَـنْ یَّـکْفُـرْ بِـالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ (۲۔۲۵۶) تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے۔

اَکْفَرَہٗ اِکْفَارًا کے معنی کسی پر کفر کا فتوی لگانے کے ہیں۔اور کبھی کفر کے معنی کسی سے بیزار ہونا بھی آ جاتے ہیں۔چنانچہ فرمایا۔

﴿ثُـمَّ یَـوْمَ الْـقِیٰـمَةِ یَـکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۹۔۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کر دو گے۔

﴿اِنِّـیْ کَـفَـرْتُ بِـمَـآ اَشْـرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۴۔۲۲) میں تو اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے مجھے شریک بناتے تھے۔اور آیت کریمہ:

﴿کَـمَثَـلِ غَیْـثٍ اَعْـجَـبَ الْکُفَّـارَ نَبَـاتُـہٗ﴾ (۲۰۔۵۷)؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ اس سے کھیتی (اگتی اور) کسانوں کو بھی بھلی لگتی ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کفار سے کسان مراد ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتے ہیں جیسا کہ کافر اللہ تعالیٰ کے حق کو چھپاتا ہے۔چنانچہ آیت:﴿یُـعْـجِـبُ الـزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ﴾ (۴۸۔۲۹) اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ بارش کی روئیدگی سے خوش ہونا کافر کے ساتھ مختص نہیں ہے۔بلکہ ہر کاشتکار کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر بعض نے کہا ہے کہ یہاں بھی کفار سے کافر ہی مراد ہیں اور ان کی تخصیص اس لیے کہ ہے۔کہ وہ دنیا اور اس کے ساز وسامان پر خوش اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔

اَلْـکَـفَّـارَۃُ: جو چیز گناہ دور کر دے اور اسے ڈھانپ لے اسے کفارۃ کہا جاتا ہے۔اسی سے کَـفَّـارَۃُ الْیَمِیْنِ ہے چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:﴿ذٰلِكَ کَـفَّـارَۃُ اَیْـمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ﴾ (۵۔۸۹) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھالو۔

﴿فَکَفَّارَتُہٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ﴾ (۵۔۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔اسی طرح دوسرے گناہ جیسے قتل، ظہار وغیرہ کے تاوان پر بھی کفارہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اَلتَّـکْـفِیْرُ: اس کے معنی بھی گناہ کو چھپانے اور اسے اس طرح مٹا دینے کے ہیں جیسے اس کا ارتکاب ہی نہیں کیا۔اور ہو سکتا ہے کہ یہ اصل میں ازالہ کفر

یا کفران سے ہو جیسے تمریض کے معنی ازالہ مرض کے آتے ہیں۔ اور تَـقْـذِيَةٌ کے معنی ازالہ قذی یعنی تنکا دور کرنے کے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (۵۔۶۵) اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے۔

﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ (۴۔۳۱) تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (۱۱۔۱۱۴) کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑے گناہوں کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ (۳۔۱۹۵) میں ان کے گناہ دور کر دوں گا۔

﴿لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا﴾ (۳۹۔۳۵) تاکہ خدا ان سے برائیوں کو جو انہوں نے کیں، دور کر دے۔ محاورہ ہے۔

كَفَرَتِ الشَّمْسُ النُّجُوْمَ: سورج نے ستاروں کو چھپا دیا۔ اور اس بادل کو بھی کافر کہا جاتا ہے جو سورج کو چھپا لیتا ہے: تَكَفَّرَ فِي السَّلَاحِ: اس نے ہتھیار پہن لیے۔

اَلْكَافُوْرُ: اصل میں پھلوں کے غلاف کو کہتے ہیں جو ان کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ اِذْ نَادٰى مِنَ الْكَافُوْرِ۔

جیسے انگور شگوفہ کے غلاف سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن کافور ایک مشہور خوشبو...... کا بھی نام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

(ک ف ل)

اَلْكَفَالَةُ: ضمانت کو کہتے ہیں۔ اور تَكَفَّلْتُ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کا ضامن بننے کے ہیں۔

اور كَفَّلْتُهٗ فُلَانًا کے معنی ہیں: میں نے اسے فلاں کی کفالت میں دے دیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ (۳۔۳۷) اور زکریاؑ کو اس کا متکفل بنایا۔

بعض نے كَفَلَ تخفیف فاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ [2] اس صورت میں اس کا فاعل زکریا علیہ السلام ہوں گے یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا۔

(اَكْفَلَهَا زَيْدًا۔ اسے زید کی کفالت میں دے دیا)

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَكْفِلْنِيْهَا﴾ (۳۸۔۲۳) یہ بھی میری کفالت میں دے دو (میرے سپرد کر دو)

اَلْكَفِيْلُ: اصل میں بقدر ضرورت حصہ کو کہتے ہیں۔ گویا وہ انسان کی ضروریات کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا﴾ (۱۶۔۹۱) اور تم خدا کو اپنا کفیل بنا چکے ہو۔

اور اَلْكِفْلُ کے معنی بھی اَلْكَفِيْلُ یعنی حصہ کے آتے

---

[1] راجع في العنوان نفسه۔

[2] وهي قراءة معظم السبعة وقراءة التشديد هي قراءة الكوفيين عاصم وحمزه والكسائي (ابوحيان ۲/۴۲)

ہیں۔چنانچہ فرمایا:
﴿یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ﴾ (۵۷۔۲۸) وہ تمہیں اپنی رحمت سے اجر کے دو حصے عطا فرمائے گا۔یعنی دنیا اور عقبیٰ دونوں جہانوں میں تمہیں اپنے انعامات سے نوازے گا۔اور یہی دو قسم کی نعمتیں ہیں جن کے لیے آیت ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً﴾ (۲۔۲۰۱) کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہاں کِفْلَیْنِ'' سے دو نعمتیں مراد نہیں ہیں۔بلکہ اس سے پیہم اور کفایت کرنے والی نعمت مراد ہے۔اور تثنیہ کا لفظ لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ کی طرح تاکید معنوی کے لیے ہے۔اور آیت کریمہ:﴿مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا﴾ (۴۔۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ میں کِفْلٌ کا معنی کافی حصہ کے نہیں ہے بلکہ استعارۃً اس سے حقیر چیز مراد لی ہے۔اور یہ اس کفل سے مشتق ہے جس کے معنی کولہے کے پچھلے حصہ کے ہوتے ہیں۔چونکہ اس حصہ پر سواری تکلیف دہ ہوتی ہے اس لیے عرف میں کِفْلٌ بمعنی شدت استعال ہونے لگا ہے جیسا کہ سِیْسَاءَ کا لفظ ہے کہ اصل میں اس کے معنی گدھے کی پشت پر کی ابھری ہوئی ہڈی ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔
لَاَحْمِلَنَّكَ عَلَی الْکِفْلِ اَوْ عَلَی السِّیْسَاءِ اَوْلَاُرْکِبَنَّكَ الْحَسْرٰی۔ یعنی میں تمہیں سخت تکلیف پہنچاؤں گا۔اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے [1]۔

(۳۷۷) وَحَمَلْنَا ھُمْ عَلٰی صَعْبَۃٍ زَوْ
رَاءَ یَعْلُوْنَھَا بِغَیْرِ وِطَاءٖ

اور ہم نے ان کو نہایت تند اور ٹیڑھی حالت کی ننگی پشت پر سوار ہونے پر مجبور کر دیا۔
پس آیت (۴۔۸۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی اچھے کام میں دوسرے کا شریک کار ہوگا۔تو اسے بھی اس سے حصہ ملے گا۔اور اگر کوئی شخص برے کام میں دوسرے کی مدد کرے گا تو اسے بھی اس کے انجام بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔
بعض کے نزدیک اس آیت میں بھی کفل بمعنی کفیل ہی ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ جو شخص شر یعنی برائی کا جویا ہوگا تو وہ برائی اس پر کفیل ہوگی جو اس سے باز پرس کرے گی۔ جیسا کہ محاورہ ہے۔
مَنْ ظَلَمَ فَقَدْ اَقَامَ کَفِیْلًا بِظُلْمِہٖ کہ جس نے ظلم کیا تو اس نے اپنے اوپر ظلم سے کفیل کھڑا کر دیا چنانچہ آیت مذکورہ میں تنبیہ کی ہے کہ برائی میں دوسرے کی مدد کرنے والا کبھی بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

(ک ف ی)

اَلْکُفْوُ کے معنی مرتبہ اور منزلت میں دوسرے کا ہم پلہ ہونے کے ہیں اسی سے کِفَاءٌ کپڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس جیسے دوسرے ٹکڑے کے ساتھ ملا کر خیمہ کے پچھلی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور اسی سے نکاح یا لڑائی میں ہمسروں کے متعلق کہا جاتا ہے فُلَانٌ کُفْوٌ

[1] قالہ ابوزبید الطائی وقد مر تخریجہ، فی (عتب)

لِفُلَانٍ فلاں اس کا ہمسر ہے قرآن میں ہے۔
﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (۱۱۲۔۴) اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔
اسی سے مُکَافَاءَۃٌ ہے جس کے معنی کسی کام میں دوسرے کے بالمقابل ہونے کے ہیں۔ نیز محاورہ ہے:
فُلَانٌ كُفُوٌّ لَكَ: فلاں دشمنی میں تیرا ہم پلہ ہے۔
اَلْاِكْفَاءُ کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں گویا اس میں مساوات کو دور کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور اسی سے اِكْفَاءٌ فِی الشِّعْرِ ہے جس کے معنی قصیدہ میں حرف روی کے مختلف ہونے کے ہیں۔ مُكْفَاءُ الْوَجْهِ اَذْ كَفِئُ الْوَجْهِ: متغیر روآدی۔ كَفَأَةٌ۔ اونٹوں کی ناقص پیدائش۔ محاورہ ہے۔
جَعَلَ فُلَانٌ اِبِلَهٗ كَفْأَتَيْنِ: اس نے اپنے اونٹوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی ایک سال ایک حصہ سے نسل لیتا ہے اور دوسرے سال دوسرے سے۔

(ک ف ی)

اَلْكِفَايَةُ: وہ چیز جس سے ضرورت پوری اور مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ﴾ (۳۳۔۲۵) اور خدا مومنوں کے لیے جنگ کی ضروریات کے سلسلہ میں کافی ہوا۔
﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ (۱۵۔۹۵) ہم تمہیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لیے جو تم سے استہزاء کرتے ہیں، کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (۴۸۔۲۸) اور حق ظاہر کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ با زائدہ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی گواہ ہونے کے لیے کافی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ با اصلی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ گواہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ پر ہی اِكْتِفَا کرو اَلْكُفْيَةُ مِنَ الْقُوْتِ غذا جو گذارہ کے لیے کافی ہو۔ ج كُفًى محاورہ ہے۔
كَافِيْكَ فُلَانٌ مِّنْ رَّجُلٍ۔ یعنی فلاں شخص تمہارے لیے کافی ہے اور یہ حَسْبُكَ مِنْ رَّجُلٍ کے محاورہ کے ہم معنی ہے۔

(ک ل ل)

كُلٌّ کا لفظ کسی شے کے اجزاء کو یک جا کرنے پر بولا جاتا ہے اور یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) کبھی اس سے کسی چیز کی ذات اور اس کے احوال خصوصی کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اور لفظاً تمام کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (۱۷۔۲۹) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو)
شاعر نے کہا ہے [1] ( )
(۳۷۸) لَيْسَ الْفَتٰى كُلُّ الْفَتٰى۔ اِلَّا الْفَتٰى فِیْ اَدَبِهٖ

[1] قاله ابو محمد اليزيدی (يحيیٰ بن المبارك بن العدوی المتوفی ۲۰۲) وسمی اليزيدی لصحبته يزيد بن منصور خال المهدی و كان شاعرا فصيحا نحويا ربيب ابی عمرو بن العلاء في النحو واللغة والغريب والقرءة، جعل الرشيد المامون ابنه فی حجره وله فی هجو الاصمعی ابيات منها ابن لی دمی بن اصمعی۔ متی كنت فی الاسرة الفاضلة ومنها: رايت قريب الاصمعی۔ كثيرا فواضحه شاملة والبيت فی المواعظ فی ثمانية ابيات وبعده: وبعض اخلاق الفتی۔ اولی به من نسبه۔ راجع للبيت المعجم للمرزبانی ۴۸۷ وروضة العقلا ۱۹۸ بغير عزو ولا موال الشاعر الانساب (۵۹۹۔ ۶۰۰) وابن خلكان ۷۷۰ واليافعی (۲: ۷۰۳) والبغيه للسيوطی ۴۱۴، وطبقات زبيدی ۲۱ وطبقات ابن المعتز ۲۷۳۔۲۷۶ ونزهة الالباء لابن الانباری ۱۰۳۔۱۱۰)

یعنی کامل جوانمرد تو وہی ہوسکتا ہے جو ادب میں کامل ہو۔

(۲) کبھی اس سے کئی چیزوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اس صورت میں کبھی تو یہ جمع معرف باللام کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے:

كُلُّ الْقَوْمِ: (پوری قوم) اور کبھی جمع معرف باللام کی ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ (۱۵-۳۰) تو فرشتے سب کے سب سجدہ میں گر پڑے۔ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (۹-۳۳) تاکہ اس (دین) کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔ ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (۱۹-۹۵) اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

اور کبھی نکرہ مفردہ کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ﴾ اور ہم نے ہر انسان (کے اعمال کو بصورت کتاب اس کے گلے میں) لٹکا دیا ہے۔ (۱۷-۱۳) ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (۶-۱۰۲) اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وغیر ذالك من الآیت:

اور کبھی بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کا مضاف الیہ مقدر ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (۳۶-۴۰) اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

﴿وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ﴾ (۲۷-۸۷) اور سب اس کے پاس عاجز ہوکر چلے آئیں گے۔

﴿وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ﴾ (۲۱-۷۲) اور سب کو نیک بخت کیا۔

﴿وَكُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۲۱-۸۸) یہ سب صبر کرنے والے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں۔ اور قرآن پاک اور فصحاء عرب کے کلام میں کہیں بھی یہ لفظ [1] معرف باللام یعنی اَلْكُلُّ استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ محض متکلمین، فقہا اور دیگر علمائے فن کی اصطلاح ہے۔

اَلْكَلَالَةُ: باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث بھی ہو وہ كَلَالَةٌ ہے [1]

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ كَلَالَةٌ ہر اس وارث کو کہتے ہیں، جو اولاد کے علاوہ ہو، ایک روایت میں ہے [2] کہ آنحضرت ﷺ سے "كَلَالَةٌ" کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ((مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَا وَالِدٌ)) کہ كَلَالَةٌ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا باپ اور اولاد زندہ نہ ہوں۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے خود میت کو کلالۃ قرار دیا ہے اور کلالہ کے یہ دونوں معنی صحیح ہیں کیونکہ "كَلَالَةٌ" مصدر ہے جو وارث اور مورث دونوں پر بولا جا سکتا ہے گویا کلالہ کو کلالہ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ سلسلہ نسب اس تک...... پہنچنے سے عاجز ہوگیا ہے اور یا اس لیے کہ وہ نسب کسی ایک جانب یعنی جانب اصل یا جانب فرع سے اس کے ساتھ بالواسطہ پہنچتا ہے اور یہ (یعنی دو احتمال) اس لیے ہیں کہ نسبی تعلق دو قسم پر ہے انتساب [1]

---

[1] راجع الآیات (٤-١٣) (٤-١٧٧)

[2] وفی الطبری من قول ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما ولم یثبت عندی مرفوعا وفی کنزالعمال (١١/٧٣-٧٧) بعض آثار الصـ فلیراجع الیه ١٢۔

بالعمق (یعنی براہ راست تعلق) جیسے باپ بیٹے کا باہمی تعلق ۔نسبت (۲) بالعرض یعنی بالواسطہ جیسے بھائی یا چچا کے ساتھ (رشتے کی نسبت) قطرب کا قول ہے کہ والدین اور بھائی کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو كَلَالَةٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ قول بلا دلیل ہے۔بعض نے کہا ہے کہ كَلَالَة کا لفظ ہر وارث پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶ (مجزءالکامل)

(۳۷۹) وَالْمَرْءُ یَبْخَلُ بِالْحُقُوْقِ
وَلِلْکَلَالَةِ مَا یُسِیْمُ

انسان حقوق کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے حالانکہ اس کا تمام مال اس کے وارثوں کے لیے ہے۔

یُسِیْمُ ، اَسَامَ الْاِبِلَ سے مشتق ہے۔جس کے معنی اونٹوں کو چراگاہ میں لے جانے کے ہیں مگر لفظ كَلَالَةٌ سے شاعر نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو اس شارح نے سمجھے ہیں بلکہ شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان کو مال جمع کرنے میں زہد سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ کلالہ کے لیے ترک مال اولاد کے لیے ترک مال سے بڑھ کر شاق ہوتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جن کے لیے تم مرتے وقت مال چھوڑ رہے ہو وہ بمنزلہ کلالہ کے ہیں۔جیسے تم کہو۔مَا تَجْمَعُهٗ فَهُوَ لِلْعَدُوِّ: تم جو جمع کرتے ہو وہ تمہارے دشمن کا ہے۔اور اہل عرب کے ہاں محاورہ ہے۔

لَمْ یَرِثْ فُلَانٌ كَلَالَةً: فلاں آدمی کلالہ کا وارث نہیں ہے۔اور یہ اس شخص کے حق میں کہتے ہیں جو اپنے باپ سے کسی مال کا وارث ہو۔شاعر نے کہا ہے ❷ (البسیط)

(۳۸۰) وَرِثْتُمْ قَنَاةَ الْمُلْكِ غَیْرَ كَلَالَةٍ
عَنِ ابْنَیْ مُنَافٍ عَبْدِ شَمْسٍ وَّهَاشِمِ

تمہیں عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے حکومت کا ورثہ ملا ہے۔اور تم اس کے مستحق ہو۔اَلْاِكْلِیْلُ کے معنی تاج کے ہیں۔اور تاج کا نام اکلیل اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ سر پر محیط ہو جاتا ہے۔محاورہ ہے۔

كَلَّ الرَّجُلُ فِیْ مِشْیَتِهٖ كَلَالًا ۔انسان کا چلنے سے عاجز ہو جانا ❸

كَلَّ السَّیْفُ عَنْ ضَرِیْبِهٖ كُلُوْلًا وَّكِلَّةً ۔تلوار کا نشانہ پر نہ لگنا۔

كَلَّ اللِّسَانُ: زبان کا کلام سے عاجز ہو جانا۔

اَكَلَّ فُلَانٌ: کسی کی سواری کا تھک جانا۔

اَلْكَلْكَلُ: سینہ کو کہتے ہیں۔نیز ہر چیز کا اگلہ حصہ۔

کِلَا

کِلَا: تثنیہ کے معنی دیتا ہے جیسا کہ کُلٌّ جمع کے لیے آتا ہے۔ یہ چونکہ لفظاً مفرد اور معنیً تثنیہ ہوتا ہے اس لیے اسے کبھی مفرد اور کبھی تثنیہ تصور کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے

---

❶ قاله یزید بن الحکم الثقفی یعظ ابنه بدرا والبیت فی الحماسة مع المرزوقی (۱۱۹۵) من قصیدة فی ۲۳ بیتا وللبیات قصة انظر الاغانی (۱۱: ۹۶۔۱۰۲) والخزانة (۱: ۱۱۱)۔

❷ قاله الفرزدق والخطاب لسلیمان بن عبدالملك والبیت فی اللسان (کلل) وفی روایة "لاعن" بدل غیر و قناة المجد بدل قناة الملك وفی روایة الکامل (۳: ٦٣٦) اول البیت ورثتم ثیاب المجد فهی لبوسكم والبیت فی الاشباه (۳: ۱۷۰) والبحر (۳: ۱۸۸) والسیوطی ۳۲۔

بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ کِلَا کا مؤنث کِلْتَا ہے۔
جب یہ اسمِ ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو احوال ثلاثہ میں ان کا الف بحالہ باقی رہتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی مگر جب اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو حالت رفعی میں بحالہ باقی رہتا ہے اور نصبی اور جری حالت میں ''یٰ'' سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے:
جَاءَ فِیْ کِلَاھُمَا رَأَیْتُ کِلَیْھِمَا، مَرَرْتُ بِکِلَیْھِمَا اور مؤنث کے لیے کِلْتَا آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔
کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا (۱۸۔۳۳) دونوں باغ کثرت سے پھل لائے۔

(ک ل ی)

اَلْکِلَاءَۃُ کے معنی کسی چیز کی حفاظت کرنے اور اسے باقی رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
کَلَأَکَ اللّٰہُ: اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے وَبَلَغَ بِکَ اَکْلَأَ الْعُمُرِ تمہیں انتہائی عمر تک بحفاظت پہنچائے۔
اِکْتِلَاتُ بِعَیْنِیْ کَذَا: میں نے بذات خود فلاں چیز کی نگرانی۔ کی قرآن میں ہے:
﴿قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِالَّیْلِ الایۃ﴾ (۲۱۔۴۲) کہو کہ رات اور دن میں خدا سے تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے۔
اَلْمَکْلَأُ (گودی) ہر وہ مقام جہاں کشتیوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔
اَلْکِلَّاءُ: بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے کیونکہ وہاں کشتیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے لے جاتے تھے اور کَالِیٌٔ کے معنی ادھار کے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ (۱۰۳) کہ آنحضرت ﷺ نے بَیْعُ الْکَالِئِ بِالْکَالِیءِ یعنی ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا۔
اَلْکَلَاءُ: اس گھاس کو کہتے ہیں جسے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ اور ہر وہ مقام جہاں گھاس زیادہ ہو اسے مَکْلَا یا مَکَانٌ کَالِیٌٔ کہا جاتا ہے۔

(ک ل ب)

اَلْکَلْبُ: (کتا) بھونکنے والا جانور۔ اس کی مؤنث کَلْبَۃٌ اور جمع اَکْلُبٌ وَکِلَابٌ آتی ہے۔ کبھی اس کی جمع کَلِیْبٌ بھی آ جاتی ہے۔ ﴿کَمَثَلِ الْکَلْبِ﴾ (۷۔۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔
﴿وَ کَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ بِالْوَصِیْدِ﴾ (۱۸۔۱۸) اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔
اور اسی سے اَلْکَلْبُ (بفتح اللام) مشتق ہے۔ جس کے معنی شدت حرص کے ہیں۔ اسی سے کہا جاتا ہے:
ھُوَ اَحْرَصُ مِنْ کَلْبٍ: وہ کتے سے زیادہ حریص ہے اور رَجُلٌ کَلِبٌ کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں اور کَلْبٌ کَلِبٌ باؤلا کتا جسے انسان کا گوشت کھانے کا چسکا لگ جاتا ہے اور جسے وہ کاٹ کھائے اسے بھی ہڑکائے کتے جیسا مرض لاحق ہو جاتا ہے مفرد کے لیے رَجُلٌ کَلْبٌ اور جمع کے لیے قَوْمٌ کَلْبٰی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے: ❶ (الوافر)

---

❶ اخرجہ الدار قطنی من حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ وصححہ الحاکم علی شرط مسلم لٰکن اھل الحدیث یوھنون ھذا الحدیث وایضا فی الطبرانی من حدیث رافع بن حدیج راجع النیل (۵/۶۶) وایضا (ك) ھق عنہ کنز العمال (٤ رقم ٤١٣) والحدیث فی الفائق (۲/۲۰۶) وغریب ابی عبید (۱: ۲۰) واللسان والنھایۃ (کلاء)

(۳۸۱) دِمَاءُ هُمْ مِّنَ الْكَلْبِ الشِّفَاءُ
ان کے خون کلب کی مرض سے شفا بخشتے ہیں۔

اور کبھی یہ مرض اونٹ کو بھی لاحق ہو جاتا ہے چنانچہ اَكْلَبَ الرَّجُلُ کے معنی باؤلے اونٹ کا مالک ہونے کے ہیں۔ كَلِبَ الشِّتَاءُ: سردی سخت ہوگئی گویا وہ کتے کی طرح باؤلی ہوگئی ہے۔ دَهْرٌ كَلِبٌ: سخت زمانہ۔ اَرْضٌ كَلِبَةٌ: اس زمین کو کہتے ہیں جو سیراب نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جائے جیسا کہ باؤلا آدمی پانی نہ پینے کی وجہ سے آخر کار سوکھ کر رہ جاتا ہے۔ اَلْكَلَّابُ وَالْمُكَلِّبُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار کے لیے سدھاتا اور انہیں تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ﴾ (۵۔۴) اور وہ شکار بھی حلال ہے جو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔

اَرْضٌ مُكَلَّبَةٌ: بہت کتوں والی سرزمین۔

اَلْكِلَابُ وَالْكَلْبُ: میخ جو تلوار کے قبضہ میں لگی ہوتی ہے۔

اَلْكَلْبَةُ۔ توشہ دان باندھنے کے تسمہ سے نیچے کا تسمہ جس سے اسے سیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام شکاری کتے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ پس كَلَبْتُ الْاَدِيْمَ کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے [2] (الرجز)

(۳۸۲) سَيْرُ صَنَاعٍ فِىْ اَدِيْمٍ تَكْلُبُهٗ
کاریگر عورت کے تسمہ کی طرح ملائم اور چمکدار ہے جس سے وہ مشکیزہ سی رہی ہو۔

اَلْكَلْبُ: تاروں کے ایک جھمکے کا نام ہے جسے کتے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے جھمکے کے تابع ہوتا ہے جسے اَلرَّاعِىْ (چرواہا) کہا جاتا ہے۔

اَلْكَلْبَتَان (دسپناہ) لوہار کے ایک اوزار کا نام ہے جس سے وہ گرم لوہے کو پکڑتا ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لحاظ سے اسے شکاری کتے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور دو کنارے ہونے کی وجہ سے تثنیہ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اَلْكَلُّوْبُ۔ کنڈی۔ كَلَالِيْبُ جمع كَلَالِيْبُ الْبَازِىْ: باز کے پنجے۔ یہ بھی كَلْبٌ سے مشتق ہے۔ کیونکہ جو چیز اس کے پنجہ میں آجائے اسے کتے کی طرح پکڑ کر روک لیتا ہے۔

(ک ل ف)

اَلْكَلْفُ: (س) کسی چیز پر شیفتہ ہونا۔ محاورہ ہے كَلِفَ

---

[1] وفی اللالی قال الشاعر (وهو الحطيئة) قال الاستاذ الميمنی فی طرقه عليه "اوهذه الزيادة خطا" لانه لا يوجد فی شیء من نسخ ديوان الحطيته وانما هو لابی ابرج القاسم بن حنبل المری فی زفر بن ابی هاشم (عامل اليمامة يكن ابا حبيب) من ثمانية ابيات وصدره: جناة مكارم واساة كلم...... راجع للبيت المرزوقی رقم ۷۲۷ والمعجم للمرزبانی (۲۱٤) والآمدی ۸۱ فی خمسة مطلعها: اری الخلان بعد ابی خبيب بحجر فی بقائهم جفاء۔ راجع للبيت الحيوان للجاحظ (۲ : ۵) وفيه بعد ابی عمير وفيه البيت منسوب الی بعض المريين والشطر ايضا مروی لامية بن ابی السلت وفی المعافی للقبتی بغير عزو (۲٤۳)

[2] قاله دكين بن رجاء الفقيمی يصف فرسا وقبله: كان غير متنه اذ نحنبه من بعد يوم كامل نؤدبه۔ وفی رواية اللسان والصحاح (حزز) خريز بدل اديم والرجز فی الاقتضاب بتقديم وتاخير وراجع للشطر ايضا الجمهرة لابن دريد ۷۵۰٦ والازمنة للمرزوقی (۲ : ۷۰) والمعانی للقبتی ۲٦۰ والسمط ۵۸٦ واللسان والصحاح (كلب) ولفظة خريز اكثر من لفظة اديم۔

فُلَانٌ بِكَذَا: فلاں اس پر شیفتہ ہے۔اَكْلَفْتُهٗ بِهٖ: میں نے اسے شیفتہ کر دیا۔

اَلْكَلَفُ: (ایضاً) چہرہ پر کے سیاہ دھبے، چہرہ کی چھائیاں گویا اس پر کلفت کا اثر ظاہر ہے۔

اَلتَّكَلُّفُ: کوئی کام کرتے وقت شیفتگی ظاہر کرنا باوجودیکہ اس کے کرنے میں مشقت پیش آ رہی ہو اسلئے عرف میں کلفت مشقت کو کہتے ہیں اور تَكَلُّفٌ اس کام کے کرنے کو جو مشقت تصنع یا اوپرے جی سے دکھلاوے کے لیے کیا جائے اس لیے تکلیف دو قسم پر ہے محمود اور مذموم۔اگر کسی کام کو اس لیے محنت سے سرانجام دے کہ وہ کام اس پر آسان اور سہل ہو جائے اور اسے اس کام کے ساتھ شیفتگی اور محبت ہو جائے تو ایسا تکلف محمود ہے چنانچہ اسی معنی میں عبادات کا پابند بنانے میں تکلیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اور اگر وہ تکلیف محض ریاکاری کے لیے ہو تو مذموم ہے۔چنانچہ آیت:

﴿قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾ (۳۸۔۸۶) (اور اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں، میں تکلیف کے یہی معنی مراد ہیں اور حدیث ہے[1] (۹۹) ((اَنَا وَاَتْقِيَاءُ اُمَّتِىْ بُرَآءُ مِنَ التَّكَلُّفِ)) کہ میں اور میری امت کے پرہیزگار آدمی تکلیف سے بری ہیں۔اور آیت۔﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲۔۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن احکام کو یہ مشقت سمجھتے ہیں وہ مآل کے لحاظ سے ان کے لیے وسعت کا باعث ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۲۲۔۷۸) اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لیے تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین پسند کیا۔

اور نیز فرمایا:

﴿فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۔۲۱۶) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

(ک ل م)

اَلْكَلْمُ: یہ اصل میں اس تاثر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کے ساتھ ہوتا ہے: اور كَلْمٌ: (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔محاورہ ہے: كَلَمْتُهٗ۔میں نے اسے ایسا زخم لگایا، جس کا نشان ظاہر ہوا۔

اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور كَلْم) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔اس لیے شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل) (۳۸۳) ....

---

[1] قال النووی لیس بثابت راجع المقاصد للسخاوی رقم ۱۹۱ والحدیث اخرجه الدار قطنی فی الافراد من حدیث الزبیر بن العوام ولفظه: الانی بری من التکلف وصالحو امتی واسناده جید والحدیث بلفظ المؤلف اورده الغزالی فی الاحیاء (راجع بتخریج العراقی ۲/۱۸۹)

[2] قاله طرفة بن العبد والبیت بتمامه: بحسام سیفك اولسانك وار۔ کلم الاصیل کا رعب الکلم والبیت فی الصناعتین ۳۲۷، ۳۹۳ دیوانه ۶۱ وفیه قبله: وتصدعنك مخلیة الرحل الشنوف موضحة عن العظم وفی نقد الشعر وتکف بدل تصد والقریض بدل الشنوف وفی الشعراء للجمعی ترو" وفی العیون (۲/۲۳) کا وسع الکلم۔

وَالْحِكَمُ الْاَصِيْلُ كَارْغَبِ الْكَلْمِ

اس شعر میں پہلا اَلْکَلِم ، کلمۃ کی جمع ہے اور دوسرا کَلْمٌ کی جس کے معنی زخم کے ہیں اور اَرْغَبُ کے معنی بہت وسیع کے ہیں پس شعر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ❶ (المتقارب)

(۳۸۴) وَجَرْحُ اللِّسَانِ كَجَرْحِ الْيَدِ

اور زبان کے زخم بھی ہاتھ کے زخم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ کَلَامٌ کا اطلاق منظّم و مرتب الفاظ اور ان کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اہل نحو کے نزدیک کلام کے ہر جزو پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ اسم ہو یا فعل ہو یا حرف۔ مگر اکثر متکلمین کے نزدیک صرف جملہ مرکبہ ومفیدہ کو کلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ قَوْلٌ سے اخص ہے۔ کیونکہ قَوْلٌ کا لفظ ان کے نزدیک صرف مفرد الفاظ پر بولا جاتا ہے اور کَلِمَۃٌ کا اطلاق انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف تینوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۸۔۵) یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ (۲۔۳۷) پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمات سے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وغیرہ ادعیہ مراد ہیں ❷ (۱۰۰) حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ان سے مراد یہ دعا ہے ❸ (۱۶)

اَلَمْ تَخْلُقْنِيْ بِيَدِكَ؟ اَلَمْ تُسْكِنِّيْ جَنَّتَكَ؟ اَلَمْ تُسْجِدْلِيْ مَلَائِكَتَكَ؟ اَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتُكَ غَضَبَكَ؟ اَرَأَيْتَ اِنْ تُبْتُ اَكُنْتَ مُعِيْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ؟ (اے باری تعالیٰ) کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں بسایا؟ کیا مجھے مسجود ملائکہ نہیں بنایا؟ کیا تیری رحمت تیرے غضب پر سبقت نہیں لے گئی؟ پھر کیا اگر میں توبہ کرلوں تو مجھے جنت میں دوبارہ لوٹا کر نہیں لے جائے گا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امانت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انہوں نے

---

❶ وفی الـلالـئ (۵۳۰۔۵۳۱) نسبه بعضهم لامری القیس انظر العقد الثمین (۱۲۳) والمعانی للقبتی ۲۳ وعن ابن درید انه لامری القیس بن عابس الصحابی وهو الصحیح (العینی (۲: ۳۱) وفی روایة وزرواللسان کذا والید (العینی ۲/۳۵) قال ابن الکلبی: والبیت لعمر وابن معدی کرب قاله فی قتله بنی مازن ثم ندم علی قتالهم وصدره: ولو عن تناغیره جاء نی...... فی خمسة والشطر فی الصناعتین (۳۹۳) والعقد الفرید (۲: ۴۴۵) والعیون (۲: ۲۳) ومختار الشعراء الحاهلی (۱: ۶۶) وفی المقصورة الدریدیة ۱۲۸ بغیر عزو۔

❷ اخرجه الثعالبی عن ابن عباس، وابن المنذر من طریق ابن جریر نحوه والبیهقی فی الشعب عن محمد بن کعب القرظی مثله۔

❸ اخرجه ابن جریر عن ابن عباس ایضا (انظر فتح القدیر للشوکانی (۷۱/۱) والحاکم فی المستدرك فی تنزیه آدم من فضائل الانبیاء (من روایة المنهال بن عمرو عن سعید بن جبیر وقول ابن عباس ایضًا فی الکشاف (راجع تخریج الکشاف وللحافظ ص۷ رقم ۴۴) وذکر الدیلمی فیه قصة طویلة عن علی مرفوعا قال فی الکنز (۲ رقم ۳۵۵) وسنده واه وابن جریر نسب القول الاول الی الحسن ایضا والثانی الی ابن عباس علی عکس ما قال المؤلف ۱۲۔

اس کے اٹھانے سے انکار کردیا جس کا ذکر کہ آیت کریمہ:
﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ الایة﴾ (۳۳۔۷۲) ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا: میں آچکا ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَاِذِابْتَلٰى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (۲۔۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے ذبح ولد، ختنہ وغیرہ ایسے کام مراد ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی آزمائش کی تھی۔ اور زکریا علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۳۔۳۹) خدا تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ جو خدا کے فیض یعنی عیسیٰ کی تصدیق کریں گے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بکلمۃ سے مراد کلمہ توحید ہے اور بعض نے کتاب اللہ مراد لی ہے اور بعض نے عیسیٰ علیہ السلام مراد لیے ہیں پس آیت......
(۳۔۳۹) اور آیت کریمہ:
﴿وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْیَمَ﴾ (۴۔۱۷۱) اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔
میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے جیسا کہ آیت ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۳۔۵۹) عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک۔
میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کے ان کے ذریعہ ہدایت پانے کی وجہ سے انہیں کلمہ کہا گیا ہے جیسا کہ کلام اللہ کے ذریعہ لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خصوصی رحمت کے سبب سے ہے جو انکے بچپنے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کی تھی۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔
﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا﴾ (۱۹۔۳۰) کہ میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ نبی ہونے کی وجہ سے انہیں کلمۃ اللہ کہا گیا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کو رسول اللہ ہونے کی وجہ سے ذکر کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا﴾ (۶۔۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔
میں کَلِمَة بمعنی قضیہ یعنی فیصلہ کے ہے چنانچہ ہر قضیہ کو خواہ وہ قولی ہو یا فعلی کَلِمَةٌ کہہ سکتے ہیں اور اسے صدق کے ساتھ متصف کرنا اس لیے ہے کہ قول اور فعل دونوں صدق کے ساتھ متصف ہوتے ہیں لہٰذا تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ میں آیت کریمہ:
﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ (۵۔۳) (اور) آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، کے مضمون کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ آج کے بعد شریعت میں ''نسخ'' نہیں ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے [1] (۱۰۲)

[1] اخرجه احمد مسنده (۳/۱۲۵) وایضاً ابوداود عن عبادة بن الصامت وبمعناه فی (حل، هق) عن ابن عباس والترمذی عن عبادة راجع کنز العمال (۵۳۶) وروضة العقلاء للبستی ۱۳۵۔

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اَجْرِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اسے لکھ دو...... الخ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَلِمَةٌ سے مراد قرآن پاک ہے اور اسے "کَلِمَةٌ" کہنا ایسا ہی ہے جیسے قصیدہ کو کلمہ کہا جاتا ہے اور تَمَّتْ سے قرآن پاک کے تا قیامت (تحریف سے) محفوظ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ ماضی لاکر اس بات کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآن پاک کی اسی قسم کی حفاظت کی طرف آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ الْاٰيَة﴾ (۶۔۹۰) اگر یہ کفار ان باتوں سے انکار کریں، میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے ثواب و عقاب کا وعدہ مراد ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات میں فرمایا: ﴿بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۳۹۔۷۱) کہیں گے کیوں نہیں۔ لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم حق ہو چکا تھا۔

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا﴾ (۱۰۔۳۳) اسی طرح خدا کا ارادہ نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے معجزات مراد ہیں جو قوم نے طلب کیے تھے اور لفظ تمت سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ جو آیات بھیجی گئی ہیں وہ اپنی جگہ پر مکمل اور کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ (۱۸۔۲۷) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، میں ان کے اس مطالبہ کی تردید ہے جو کہ آیت:

﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ﴾ (۱۰۔۱۵) کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ، میں مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تمت کلمۃ ربک سے احکام الٰہی مراد ہیں اور تمت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہی احکام اپنے بندوں کے لیے مشروع کیے ہیں جن میں کہ ان کے لیے کفایت ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۷۔۱۳۷) اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک پورا ہوا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمہ حسنیٰ سے مراد وہ فیصلہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸۔۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں۔

میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا﴾ (۲۰۔۱۲۹) اور اگر یہ بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور (جزائے اعمال کے لیے) ایک میعاد (مقرر نہ ہوتی) تو (نزول) عذاب واقع ہو جاتا۔

نیز دوسری آیت:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۲۔۱۴) اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہی ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں سبق کلمة الله تعالیٰ سے اس حکم ازلی کی طرف

اشارہ ہے جس کی حکمت الٰہی مقتضی تھی اور یہ کہ کلمات الٰہیہ کوکوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے تغیر کی گنجائش ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِهٖ﴾ (۸۔۷) کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔

میں کَلِمَاتِهٖ سے وہ دلائل ثابتہ مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف مسلمانوں کے لیے سلطان مبین یعنی زبردست دلیل کی حیثیت سے قائم کیا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (۴۸۔۱۵) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں۔

میں کلام اللہ سے اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت ﴿فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا﴾ (۹۔۸۳) تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ ہرگز نہیں نکلو گے۔میں مذکور ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کا یہ کہنا کہ ﴿ذَرُوْنَا نَتَّبِعْکُمْ﴾ (۴۸۔۱۵) کلام الٰہی میں تبدیلی کے مترادف ہے اور متنبہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ نہیں نکلیں گے اور نکل بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ علم الٰہی میں یہ...... فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ ❶

بندے سے اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا دو قسم پر ہے یعنی یا دنیا میں اور یا آخرت میں۔چنانچہ آیت: ﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا﴾ الآیۃ (۴۲۔۵۱) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعہ سے......۔

میں دنیا میں ہم کلام ہونے کا بیان ہے اور آخرت میں ثواب و کرامت کے طور پر صرف مومنین سے ہم کلام ہوگا جس کی کیفیت ہم سے مخفی ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۷۷) کے آخر میں لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ کفار اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔اور آیت کریمہ:

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (۴۔۴۶) کہ کلمات کو ان کے مقام سے بدل دیتے ہیں۔میں کَلِمٌ کَلِمَةٌ کی جمع ہے۔اس آیت کی تاویل میں اختلاف ہے۔بعض نے کہا ہے کہ وہ الفاظ میں تغیر و تبدل کرتے تھے اور بعض نے تحریف معنوی مراد لی ہے یعنی آیت کو اس کے مقتضی کے خلاف معنی پر محمول کرنا یہ دوسرا قول قوی تر معلوم ہوتا ہے ❷ کیونکہ الفاظ کے مشہور اور متداول ہونے کے بعد ان میں تبدیلی کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ﴾ (۲۔۱۱۸) اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے (یعنی مشرک ہیں) وہ کہتے ہیں۔کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بالمشافہ گفتگو کیوں نہیں

---

❶ هذا ما تاول به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم وقال به الجبائى وفيه نظر لان آية البراءة نزلت في غزوة تبوك وهى متاخرة عن عمرة الحديبية باربع سنين (لان صلح الحديبية كان سنة ست وغزوة تبوك سنة تسع) ابن كثير (٤/١٨٦) فالصحيح هو الوعد الذى وعد به اهل الحديبية قال الطبرسى (٢٦/٦٠) وهذا اى قول الجبائى غلط فاحش حمله عليه العصبية ١٢۔

❷ نسبه علماء التفسير الى ابن عباسؓ

کرتا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (۴۔۱۵۳) (اے محمدؐ) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے دکھا دو)۔

کَلَّا

یہ حرف ردع اور زجر ہے اور ماقبل کلام کی نفی کے لیے آتا ہے اور یہ۔ ''اِیْ'' حرف ایجاب کی ضد ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا كَلَّا﴾ (۱۹۔۷۷،۷۸،۷۹) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا۔ اور کہنے لگا (اگر میں از سر نو زندہ ہوا بھی تو یہی) مال اور اولاد مجھے وہاں ملے گا کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے یا خدا کے یہاں (سے) عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں۔

﴿لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا﴾ (۲۳۔۱۰۰) تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک کام کروں ہرگز نہیں۔

﴿كَلَّا لَمَّا یَقْضِ مَاۤ اَمَرَهٗ﴾ (۸۰۔۲۳) کچھ شک نہیں کہ خدا نے اسے جو حکم دیا۔ اس نے ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا۔

اور اس نوع کی اور بھی بہت آیات ہیں۔

کَم

یہ عدد سے کنایہ کے لیے آتا ہے اور یہ دو قسم پر ہے۔ استفہامیہ [1] اور خبریہ [2]۔ استفہامیہ ہو تو اس کا مابعد اسم تمیز بن کر منصوب ہوتا ہے (اور اس کے معنی) کتنی تعداد یا مقدار کے ہوتے ہیں جیسے كَمْ رَجُلًا ضَرَبْتَ: اور جب خبریہ ہو تو اپنی تمیز کی طرف مضاف ہو کر اسے مجرور کر دیتا ہے اور کثرت کے معنی دیتا ہے ''یعنی کتنے ہی'' جیسے كَمْ رَجُلٍ ضَرَبْتُ: میں نے کتنے ہی مردوں کو پیٹا اور اس صورت میں کبھی اس کی تمیز پر من جارہ داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ (۷۔۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔ ﴿وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ (۲۱۔۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر ڈالا۔

(ک م م)

اَلْكُمُّ: آستین کو کہتے ہیں اور اَلْكِمُّ (بکسر الکاف) خوشوں کے غلاف کو...... اس کی جمع اَكْمَام آتی ہے جیسے فرمایا ﴿ذَاتُ الْاَكْمَامِ﴾ (۵۵۔۱۱) اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے خوشوں) پر غلاف ہوتے ہیں۔

اَلْكُمَّةُ: ایک طرح کی گول ٹوپی۔ جو سر پر پہنی جاتی ہے۔

(ک م ل)

كَمَالُ الشَّیْءِ: کسی چیز کے کامل ہونے سے مراد ہے، وہ غرض پوری ہو جانا جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جب کسی چیز کے متعلق كَمُلَ ذَالِكَ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اس سے مقصود تھا۔ وہ حاصل ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ﴾ (۲۔۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔

میں کَامِلَیْنِ سے مراد یہ ہے کہ رضاعت کے لیے دو سال کی مدت آخری مدت ہے جس سے بچہ کی نشوونما اور اسکی بیوی کا تعلق ہے اور آیت کریمہ:

﴿لِیَحْمِلُوْا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ﴾ (۱۶۔۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ انہیں قیامت کے دن پوری سزا ملے گی اور آیت:

﴿تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ﴾ (۲۔۱۹۶) یہ پورے دس ہوئے۔

میں عَشَرَۃٌ کی صفت کَامِلَۃٌ لانے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ سات اور تین مل کر دس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کَامِلَۃٌ کے لفظ سے اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ دس دن کے روزوں سے ہدی کا پورا بدل حاصل ہو جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَامِلَۃٌ کا لفظ استطراداً لایا گیا ہے اور اس سے مقصد اسم عدد میں عشرہ کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ پہلی (دہائی) ہے جس پر عدد کامل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان ہی ہندسوں کا تکرار ہوتا رہتا ہے جو اس سے قبل ہوتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عشرۃ ہی کامل عدد ہے۔

(ک م ہ)

اَلْاَکْمَہُ کے معنی پیدائشی اندھا کے ہیں [1] مگر کبھی اس شخص کے لیے آتا ہے جس کی بعد میں بصارت کھوگئی ہو شاعر نے کہا ہے (الرجز)

(۳۸۵) کَمِھَتْ عَیْنَاہُ حَتّٰی ابیضَّتَا

اس کی آنکھیں بے نور ہو کر سفید ہو گئیں۔

(ک ن ن)

اَلْکِنُّ: ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے۔

کَنَنْتُ الشَّیْءَ کَنًّا: کسی چیز کو کِنَّ میں محفوظ کر دیا اور کَنَنْتُ (ثلاثی مجرد) خصوصیت کے ساتھ کسی مادی شی کو گھر یا کپڑے وغیرہ میں چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿کَاَنَّھُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ﴾ ((۳۷۔۴۹) گویا وہ محفوظ انڈے ہیں۔

﴿کَاَنَّھُمْ لُؤْلُؤٌ مَّکْنُوْنٌ﴾ (۵۲۔۲۴) جیسے چھپائے ہوئے موتی۔

اور اَکْنَنْتُ (باب افعال سے) دل میں کسی بات کو چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَوْ اَکْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ﴾ (۲۔۲۳۵) یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو۔

اور کِنٌّ کی جمع اَکْنَانٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا﴾ (۱۶۔۸۱) اور پہاڑوں میں تمہارے لیے غاریں بنائیں۔

اَلْکِنَانُ: پردہ، غلاف وغیرہ جس میں کوئی چیز چھپائی جائے اس کی جمع اَکِنَّۃٌ آتی ہے۔ جیسے غِطَاءٌ کی جمع اَغْطِیَۃٌ: چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿وَ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ﴾ (اور

---

[1] وفی القرآن ﴿ وابرئ الاکمہ والابرص ﴾ (۳۔۴۹)۔

[2] قالہ سوید بن ابی کامل الیشکری فی عینیتہ المشھورۃ التی تسمی "الیتیمۃ" راجع المفضلیات (۱ : ۱۸) والبیت فی اللسان (کمہ) وتمامہ فھو یلحی نفسہ لما نزع والبیت من شواھد الطبری (۳/۲۷۷)۔

ہم نے انکے دلوں پر تو پردے ڈال رکھے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِی اَکِنَّۃٍ﴾ (۴۱۔۵) اور کہنے لگے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔ کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ ہم تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ﴾ (۱۱۔۹۱) انہوں نے کہا اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ﴾ (۵۶۔۷۷،۷۸) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ کتاب مکنون سے لوح محفوظ مراد ہے [1] اور بعض نے کہا ہے کہ یہ قرآن پاک کے عند اللہ محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (۱۵۔۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اور شادی شدہ عورت پر بھی کِنَّۃٌ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کی حفاظت میں رہتی ہے اس بنا پر شادی شدہ عورت کو مُحْصَنَۃٌ بھی کہتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خاوند کی حفاظت کے قلعے میں محفوظ ہے۔

اَلْکِنَانَۃُ: ترکش جو کہیں سے پھٹا ہوا نہ ہو۔

(ک ن د)

اَرْضٌ کَنُوْدٌ: بنجر زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو۔ (اور کنایہ کے طور پر ناسپاس گذار کو کَنُوْدٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَکَنُوْدٌ﴾ (۱۰۰۔۶) کہ انسان اپنے پروردگار کا احسان نہ ماننے والا اور ناشکرا ہے۔

(ک ن ز)

اَلْکَنْزُ: (ض) کے معنی دولت جمع کر کے اسے محفوظ رکھ دینے کے ہیں یہ اصل میں کَنَزْتُ التَّمْرَ فِی الْوِعَاءِ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھجور کو باردان میں بھر کر محفوظ کر لینے کے ہیں۔ اور کھجور اندوختہ کرنے کے موسم کو زَمَنُ الْکِنَاز کہا جاتا ہے۔ اور نَاقَۃٌ کِنَازٌ کے معنی گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّۃَ﴾ (۹۔۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔ میں یَکْنِزُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سونا اور چاندی جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اسے راہ خدا میں صرف نہیں کرتے ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کہا جائے گا۔ ﴿فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ﴾ (۹۔۳۵) کہ جو کچھ تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔ اور آیت ﴿لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ کَنْزٌ﴾ (۱۱۔۱۲) میں کنز کے معنی خزانہ اور بڑی دولت کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَکَانَ تَحْتَهٗ کَنْزٌ لَّهُمَا﴾ (۱۸۔۸۲) اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (مدفون) تھا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کنز سے صحیفہ علم مراد ہے۔

(ک ہ ف)

اَلْکَهْفُ کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں اس کی جمع کُهُوْفٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ﴾ (۱۸۔۹) کہ

[1] کما فی قولہ تعالیٰ۔ ﴿فی لوح محفوظ﴾ (۸۵۔۲۲)

غار اور لوح والے۔

(ک ہ ل)

اَلْکَھْلُ: ادھیڑ عمر آدمی جس کے بال سفید ہو گئے ہوں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَ کَھْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (۳-۴۶) اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں ہوگا۔

اِکْتَھَلَ النَّبَاتُ: پودے کا حد یبوست یعنی بڑھنے کی آخری حد کو پہنچ جانا۔جیسا کہ ادھیڑ عمر آدمی بڑھاپے کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [1] (لبسیط)

(۳۸۶) مُؤَزَّرٍ بِھَشِیْمِ النَّبْتِ مُکْتَھِلٌ

اس کی گھاس آخری حد تک بڑھی ہوئی ہے اور اس نے اپنے گرداگرد دوسرے پودوں کی چادر پہن رکھی ہے۔

(ک ہ ن)

اَلْکَاھِنُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو تخمینے سے ماضی کے خفیہ واقعات کی خبر دیتا ہو اور عرّاف اسے جو آئندہ کے متعلق خبر دیتا ہو ان دونوں پیشوں کی بنا چونکہ ظن پر ہے جس میں صواب وخطا کا احتمال پایا جاتا ہے۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۱۰۴) ((مَنْ اَتٰی عَرَّافًا اَوْ کَاھِنًا فَصَدَّقَهٗ بِمَا قَالَ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی اَبِی الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ))۔ کہ جو شخص عراف یا کاہن کے پاس جا کر ان کے قول کی تصدیق کرے تو اس نے جو کچھ ابوالقاسم ﷺ (یعنی مجھ پر) اتارا گیا ہے اس کے ساتھ کفر کیا کَھَنَ فُلَانٌ کَھَانَةً کہانت کرنا۔اور جب کوئی شخص اس پیشہ کے ساتھ مختص ہو تو اس کے متعلق کَھُنَ کہتے ہیں۔

تَکَھَّنَ: بتکلف کہانت کرنا قرآن پاک میں ہے:﴿وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ﴾ (۶۹-۴۲) اور نہ کسی کاہن کے مزخرفات ہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم دھیان دیتے ہو۔

(ک و ب)

اَلْکُوْبُ: پیالہ جس کا دستہ نہ ہو۔اس کی جمع اَکْوَابٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بِاَکْوَابٍ وَّاَبَارِیْقَ وَکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ﴾ (۵۶-۱۸) یعنی آبخورے اور آفتابے اور صاف شراب کے گلاس۔

اَلْکُوْبَةُ: (ڈگڈگی) یعنی باریک میان طبلک جو تماشہ کے وقت مداری بجاتے ہیں۔

(ک و د)

کَادَ: (س) یہ فعل مقارب ہے یعنی کسی فعل کے قریب ہونے کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً کَادَ یَفْعَلُ: قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گذرتا یعنی کرنے والا

---

[1] قاله الاعشى وصدره: يضاحك الشمس منها كوكب شرق۔ راجع للبيت الصناعتين ٢٧٦ والبلغة فى شذور اللغته (كتاب النبات الاصمعى ٣٣) وديوانه (١٤٤) افى قصيدة مخاطبا ليزيد بن مسهر مطلعها: ودع هريرة ان الركب مرتحل۔ وهل تطيق وداعا ايها الرجل۔ وهريرة هذه قينة لبشر بن عمر تكنى بام الخليد والقصيدة فى ديوانه (١٤٤-١٤٩) والبيت فى اللسان (ازر، كمل) وشرح للديوان ٥٧۔ والطبرى (٢١-٢٧) والمرتضى (١: ٢٢١) والمشكل للقبتى (١٠٣ والعيون (٢: ١٠٦) وشرح العشر للتبريزى (٢٧٦) وفى روايته بعميم بدل بهشيم ١٢۔

[2] عن ابى هريرة مرفوعاً رواه الحاكم فى المستدرك وعن علیؓ موقوفا (رسته) انظر كنز العمال (٦: رقم٣٠٩٨ و٤٠٠٤ ج ٦) وفى رواية مسلم والحاكم فقد برى مما انزل الله على محمدض (كنز العمال ٣٠٩٥)

تھا مگر کیا نہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا﴾ (۱۷۔۷۴) تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ﴾ (۱۷۔۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بچادیں۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ﴾ (۲۔۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے۔

﴿يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ﴾ (۲۲۔۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ ان پر حملہ کردیں۔

﴿اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ (۳۷۔۵۶) تو تو مجھے ہلاک ہی کر چکا تھا اور اگر اس کے ساتھ حرف نفی آ جائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل کے وقوع کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہو اور حرف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (۲۔۷۱) اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ (۴۔۷۸) کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور كَادَ کے بعد ان کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۳۸۷) قَدْ كَادَ مِنْ طُوْلِ الْبِلٰى اَنْ يَّمْصَحَا

قریب تھا کہ زیادہ بوسیدگی کے باعث وہ مٹ جائے۔

(ک و ر)

اَلْكَوْرُ: کے معنی کسی چیز کو عمامہ کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تلے گھمانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت: ﴿يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ﴾ (۳۹۔۵) اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔

میں مطالع شمسی کے تبدیل ہونے سے دن رات کے بڑھنے اور گھٹنے کو تکویر سے تعبیر فرمایا ہے۔

طَعَنَهٗ فَكَوَّرَهٗ: اس کو نیزہ مار کر گچھلی کر دیا۔

اِكْتَارَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑتے وقت اپنی دم گھمانا اور بہت سے اونٹوں کو بھی كَوْرٌ کہا جاتا ہے اور كُوَارَةُ النَّحْلِ کے معنی شہد کے چھتہ کے ہیں۔

اَلْكُوْرُ کے معنی اونٹ کا پالان بھی آتے ہیں اور ہر بڑے شہر کو كُوْرَةٌ کہا جاتا ہے یعنی وہ علاقہ جس میں بہت سی بستیاں اور دیہات جمع ہوں۔

(ک و ن)

كَانَ ۔فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے بیشتر صفات باری تعالٰی کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (۳۳۔۴۰) اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا﴾ (۴۸۔۲۱) اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

---

[1] قاله رؤبة بن العجاج وقبله: ربع عفاه الدهر طولا فانمحى۔ والرجز فی اسرار ابن الانباری (۱۲۹) واللسان والصحاح (کاد) والکامل (۱٦٧) والعینی (۲: ۲۱۵) وابن یعیش والاقتضاب (۳۹٦) وقال والرجزیروی لرؤبة بن العجاج ولم اجده فی دیوانه وارجع للشطر ایضا المشکل للقبتی (٤٠٧) والکتاب (۱: ٤٧٨) والخزانة (٤: ۹۱) والجمل للزجاجی۔ ۲۱۰ و الانصاف ۲۳٤ والدرر اللوامع (۱/۱۰٥) وادب الکاتب ٤۱۱ ویروی قبله: ربع عفا من بعد ما قد انمحی و کلتا الروایتین ذکرهما الخفاجی فی شرح الدرة ونسبه الی رؤیة وفی الفائق (۲: ۳۱٦) معز والی ابی النجم قال الشنقیطی ولم احقق لسبته۔

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم وملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس سے علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۰) اور انسان ہے ہی ناشکرا۔

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ (۱۷۔۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (۱۸۔۵۴) اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

میں تنبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ ونادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا﴾ (۲۵۔۲۹) اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ ﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی ناقدرا ہے۔

جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہو تو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تا حال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہوگئی ہو مثلاً كَانَ فُلَانٌ كَذَا ثُمَّ صَارَ كَذَا: یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہوگئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لیے بھی آتا ہے جیسے۔ كَانَ فِي اَوَّلِ مَا اَوْجَدَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَذَا۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لیے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت زمانہ تکلم سے ایک لحہ بھی پہلے ہو تو اس کے متعلق کان کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے لہٰذا جس طرح "كَانَ اٰدَمُ كَذَا" کہہ سکتے ہیں اسی طرح "كَانَ زَيْدٌ هٰهُنَا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:

﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے جو گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ "جو ابھی گود کا بچہ ہے" یعنی ماں کی گود میں ہے۔ [1] لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ (۳۔۱۱۰) جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ (۲۔۲۸۰) اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں كَانَ کے معنی کسی چیز کے واقع ہو جانا کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگدست ہو جائے بعض لوگ کہتے ہیں کہ کون کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جوہر میں تبدیل ہونے کے لیے آتا ہے۔ اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ كَيْنُوْنَةٌ کا لفظ اصل میں كَوْنُوْنَةٌ بروزن فَعْلُوْلَةٌ ہے۔ ثقل کی وجہ سے واؤ یاء سے تبدیل ہوگئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ

[1] فی الصورة الثانية يكون تامه وفی الاولی ناقصة (الطبری ص۷۹۔۱۹)

اصل میں کَیْوِنُوْنَة بروزن فَیْعِلُوْلَةٌ ہے۔واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے کَیَّنُوْنَةٌ ہوگیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لیے گرادیا تو کَیْنُوْنَةٌ بن گیا جیسا کہ مَیِّتٌ سے مَیْتٌ بنا لیتے ہیں جو اصل میں مَیْوِتٌ ہے۔فرق صرف یہ ہے۔ کہ کَیَّنُوْنَة (بتشدید الیاء) استعمال نہیں ہوتا اور مَیِّتٌ تشدید یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے۔اَلْمَکَانُ: بعض کے نزدیک یہ دراصل کَانَ یَکُوْنُ (ک و ن) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کر کے اس سے تَمَکَّنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مِسْکِیْنٌ سے تَمَسْکَنَ بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (س ک ن) سے ہے۔اِسْتَکَانَ فُلَانٌ فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔گویا وہ ٹھہر گیا اور ذلت کی وجہ سے سکون وطمانیت کو چھوڑ دیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا اسْتَکَانُوْا لِرَبِّهِمْ﴾ (۲۳۔۷۶) تو بھی انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی نہ کی۔

(ک و ی)

کَوَیْتُ الدَّابَّةَ بِالنَّارِ کَیًّا کے معنی جانور کو گرم لوہے سے داغ دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ﴾ (۹۔۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو داغے جائیں گے۔

کَیْ

یہ کسی چیز کے فعل کا سبب بیان کرنے کے لیے آتا ہے بمعنی ''تاکہ'' اور کَیْلَا اس کی نفی کے لیے جیسے فرمایا:﴿کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً﴾ (۵۹۔۷) تاکہ مال...... گردش نہ کرتا رہے۔

(ک ی د)

اَلْکَیْدُ: (خفیہ تدبیر) کے معنی ایک قسم کی حیلہ جوئی کے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی مگر عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح لفظ اِسْتِدْرَاجٌ اور مَکْرٌ بھی کبھی اچھے معنوں میں آجاتے ہیں چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:۔

﴿کَذٰلِكَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ﴾ (۱۲۔۷۶) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے تدبیر کردی۔

﴿وَ اُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾ (۷۔۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں کید سے مراد عذاب ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے ڈھیل اور مہلت دینا مراد ہے جو آخر کار موجب عذاب بنتی ہے جیسے فرمایا:﴿اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا﴾ (۳۔۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کرلیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ﴾ (۱۲۔۵۲) اور اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو روبراہ نہیں کرتا۔خائنین کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی تدبیر سے خیانت کا ارادہ نہیں کرتے ان کی تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ روبراہ اور کامیاب کردیتا ہے۔جیسا کہ یوسفؑ کی اپنے بھائی کے بارے میں تدبیر کرنا۔اور آیت کریمہ:۔

﴿لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ﴾ (۲۱۔۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔میں لَاَکِیْدَنَّ کے معنی یہ

ہیں کہ میں ان کے ساتھ بری طرح پیش آؤں گا۔

﴿فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ﴾ (۳۷۔۹۸) غرض انہوں نے ان کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے انہی کو زیر کردیا۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ﴾ (۷۷۔۳۹) اگر تم کو کوئی داؤ آتا ہو تو مجھ پر کر چلو۔

﴿كَيْدُ سَاحِرٍ﴾ (۲۰۔۶۹) جادو کے ہتھکنڈے......

﴿فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ﴾ (۲۰۔۶۹) تو تم جادو کا سامان اکٹھا کرلو۔

محاورہ ہے: فُلَانٌ يَكِيْدُ بِنَفْسِهٖ: فلاں جان دے رہا ہے اور جب چقماق دیر سے آگ نکالے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے كَادَ الزَّنْدُ۔

(ک ی ف)

كَيْفَ: (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ جس پر کہ شبیہ اور غیر شبیہ کا لفظ بولا جاسکتا ہو جیسے اَبْيَضُ (سفید) اَسْوَدُ (سیاہ) صَحِيْحٌ (تندرست) سَقِيْمٌ (بیمار) وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی كَيْفَ کا اطلاق کردیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اسود اور اَبْيَضُ مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تنبیہ یا توبیخ کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لیے لایا گیا ہے جیسے فرمایا:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (۲۔۲۸) کافرو! تم خدا سے کیونکر منکر ہوسکتے ہو۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا﴾ (۳۔۸۶) خدا ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے۔

﴿كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ﴾ (۹۔۷) بھلا مشرکوں کے لیے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ﴾ (۱۷۔۴۸) دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔

﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ﴾ (۲۹۔۲۰) اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ (۲۹۔۱۹) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

(ک ی ل)

اَلْكَيْلُ: (ض) کے معنی غلہ ناپنے کے ہیں) اور كِلْتُ لَهُ الطَّعَامَ (صلہ لام) کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے لیے غلہ ناپنے کی ذمہ داری سنبھالی اور كِلْتُ الطَّعَامَ (بدوں لام) کے معنی ہیں میں: نے اسے غلہ ناپ کردیا اور اِكْتَلْتُ عَلَيْهِ کے معنی ہیں۔ میں نے اس سے ناپ کرلیا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ (۸۳۔۱،۲،۳) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کردیں تو کم دیں۔

یہ آیت اگرچہ خاص کرناپ میں کمی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔مگراس میں ہرقسم کے لین دین میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کی تاکید ہے۔نیز فرمایا: ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ﴾ (۱۲۔۸۸) آپ ہمیں (اس کے عوض) پورا غلہ دیجیے۔

﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ﴾ (۱۲۔۶۳) تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے تاکہ ہم پھر غلہ ناپوا کرلائیں اور آیت کریمہ:

﴿وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ﴾ (۱۲۔۶۵) (اور ہم) ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ زیادہ لائیں گے۔میں كَيْلَ بَعِيْرٍ کے معنی بارشتر کے برابر غلہ کے ہیں۔

❀❀❀

کتابُ اللّام

(اللام) (حرف)

یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔اول حرف جارہ اوراس کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) تعدیہ کے لیے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا:

﴿وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ﴾ (۱۷۔۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹا دیا۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ (۴۔۲۶) خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔ میں لام مذکور ہے اور آیت: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا﴾ (۶۔۱۲۵) تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔ میں اسے حذف کردیا ہے۔(یعنی اصل میں لِاَنْ يَّهْدِيَهٗ وَلِاَنْ يُّضِلَّهٗ ہے۔

(۲) مِلک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور مِلک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملک منافع اور مِلک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۴۵۔۲۷) اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۴۸۔۴) اور آسمانوں اور زمین کے لشکر سب خدا ہی کے ہیں اور مِلک تصرف کے لیے مثلاً: کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو: خُذْ طَرَفَكَ لِآخُذَ طَرَفِيْ کہ تم اپنی جانب سے پکڑلو تاکہ میں اپنی جانب سے پکڑوں۔

اور لِلّٰهِ دَرُّكَ کی طرح جب لِلّٰهِ كَذَا کہا جاتا ہے تو اس میں بعض نے لام تملیک مانا ہے یعنی یہ چیز بلحاظ شرف (منزلت کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کسی کا مِلک نہیں ہونا چاہیے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لیے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطہ سے ایجاد کیا ہے۔اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی واسطہ کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اوراعلیٰ ہے۔اور آیات کریمہ: ﴿وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ﴾ (۴۰۔۵۲) اوران کے لیے لعنت اور برا گھر ہے۔

اور ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ﴾ (۸۳۔۱) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت اور ویل کے مستحق ہیں۔اور یہ لام بھی لام مِلک کی طرح ہے لیکن لام مِلک اس چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک میں حاصل ہو

چکی ہو اور لام استحقاق اس پر جوتا حال حاصل تو نہ ہوئی ہو مگر اس پر استحقاق ثابت ہونے کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ میں لام بمعنی علی ہے۔ای عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ (یعنی ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ:

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ﴾ (۲۴۔۱۱) ان میں جس شخص نے گنہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا ہی وبال ہے۔میں بھی لام بمعنی علی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی لام بمعنی الی بھی آتا ہے۔جیسا ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا﴾ (۹۹۔۵) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا، میں ہے یعنی اَوْحٰى اِلَيْهَا مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری مراد ہے اور لام کے ذریعہ اس وحی کے تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور یہ اس وحی کی طرح نہیں ہوتی جو انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجی جاتی ہے لہٰذا لام بمعنی الی نہیں ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ (۴۔۱۰۵) اور (دیکھو) دغا بازوں کی حمایت میں بھی بحث نہ کرنا۔میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام لامِ اجل ہے اور سبب اور جانب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۴۔۱۰۷) اور جو لوگ اپنے ہم جنسوں کی خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے بحث نہ کرنا۔

اور یہ لَا تَكُنْ لِّلّٰهِ خَصِيْمًا کے لام کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور معنی یہ ہیں۔لَا تَكُنْ خَصِيْمُ اللّٰهِ کہ تم اللہ کے خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔

(۳) لام ابتداء جیسے فرمایا:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى﴾ (۹۔۱۰۸) البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

﴿لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا﴾ (۱۲۔۸) کہ یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔

﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۹۔۱۳) تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں...... بڑھ کر ہے۔

(۴) چہارم وہ لام جو اِنَّ کے بعد آتا ہے۔یہ کبھی تو اِنَّ کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی اِنَّ کی خبر اور کبھی متعلق خبر پر، چنانچہ جب اسم خبر سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً﴾ (۲۴۔۴۴) اس میں بڑی عبرت ہے۔

اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (۸۹۔۱۴) بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ (۱۱۔۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے تحمل والے اور نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر ان کی خبر پر مقدم ہو۔جیسے فرمایا:

﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۱۵۔۷۲) اے محمد ﷺ تمہاری جان کی قسم! وہ اپنی

مستی میں مدہوش (ہورہے) تھے۔

(۵) وہ لام جو اِن مخففہ اور اِنْ نافیہ میں فرق کرنے کے لیے اِن مخففہ کے ساتھ آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۳۔۳۵) اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(۵) لام قسم۔ یہ کبھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ﴾ (۲۲۔۱۳) (بلکہ) ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (۱۲۔۱۱۱) ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا: ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (۳۔۸۱) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا۔اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی۔اور آیت کریمہ: ﴿وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ﴾ (۱۱۔۱۱۱) اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

میں لَمَّا کا لام اِن کے جواب میں واقع ہوا ہے۔اور لَيُوَفِّيَنَّهُمْ کا لام قسم کا ہے۔

(۷) وہ لام جو "لَوْ" کی خبر پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ﴾ (۲۔۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ﴾ (۴۸۔۲۵) اگر دونوں فریق الگ الگ ہوجاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم......عذاب دیتے ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (۴۔۴۶) اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لیے...... رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

اور کبھی لَوْ کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسا لَوْ جِئْتَنِيْ اَكْرَمْتُكَ اصل میں لَاَكْرَمْتُكَ ہے۔

(۸) وہ لام جو "مدعو" یا مدعو الیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مدعو کے لیے یہ مفتوح ہوتا ہے۔جیسے يَالَزَيْدٍ۔اور مدعو الیہ پر آئے تو مکسور ہوتا ہے۔جیسے يَالِزَيْدٍ۔

(۹) لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۲۴۔۵۸) مومنو! تمہارے غلام، لونڈیا...... تم سے اجازت لیا کریں۔﴿لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (۴۳۔۷۷) تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

اور اگر اس پر واو یا فا آجائے تو ساکن ہوجاتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَ لِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹۔۶۶) اور فائدہ اٹھائیں (سو خیر) عنقریب ان کو معلوم ہوجائے گا ﴿وَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (۱۸۔۲۸) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

﴿فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ (۱۰۔۵۸) تو چاہیے کہ لوگ

اس سے خوش ہوں۔ایک قرأت میں فَلْتَفْرَحُوْا ہے۔
اور جب اس پر ثم داخل ہوتو اسے ساکن اور متحرک دونوں طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا:﴿ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (۲۲۔۲۹) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔اور خانہ قدیم یعنی بیت اللہ کا طواف کریں۔

(ل ء ل ء)

اَللُّؤْلُؤُ: موتی۔جمع لَآلِئُ۔قرآن پاک میں ہے:
﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ﴾ (۵۵۔۲۲) دونوں دریاؤں سے موتی...... نکلتے ہیں۔
﴿كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ (۵۲۔۲۴) جیسے چھپائے ہوئے موتی۔اور تَلَأْلَأَ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے موتی کی طرح چمکنے کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔لَا اَفْعَلُ ذٰلِكَ مَا لَأْلَأَتِ الظِّبَاءُ بِاَذْنَابِهَا: جب تک کہ آہو اپنے دم ہلاتے رہیں گے میں یہ کام نہ کروں گا یعنی کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

(لا (حرف)

لا۔یہ کبھی عدم محض کے لیے آتا ہے۔جیسے:
زَيْدٌ لَا عَالِمٌ: یعنی زید جاہل ہے اور کبھی نفی کے لیے ہوتا ہے۔اور اسم و فعل دونوں کے ساتھ ازمنہ ثلاثہ میں نفی کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی میں نفی کے لیے ہوتو یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی هَلْ خَرَجْتَ کہے تو اس کے جواب میں صرف "لا" کہہ دینا کافی ہے یعنی لا خَرَجْتُ اور اگر فعل مذکور بھی ہوتا ہے تو شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت (۱) جب لا اور فعل کے درمیان کوئی فاصل آ جائے۔جیسے لَا رَجُلًا ضَرَبْتُ وَلَا اِمْرَاءَةً (۲) جب اس پر دوسرے فعل کا عطف ہو جیسے: لَا خَرَجْتُ وَلَا ضَرَبْتُ اور یا (۳) لا مکرر ہو جیسے:۔
﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ (۷۵۔۳۱) اس ناعاقبت اندیش نے نہ تو کلام خدا کی تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی اور یا (۴) جملہ دعائیہ میں جیسے لَا كَانَ (خدا کرے ایسا نہ ہو)
لَا اَفْلَحَ (وہ کامیاب نہ ہو) وغیرہ۔
اور زمانہ مستقبل میں نفی کے متعلق فرمایا:
﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (۳۴۔۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔
اور کبھی "لا" کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام محذوف کی نفی کے لیے آتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ (۱۰۔۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں...... اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی معنی پر حمل کیا ہے۔
﴿لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (۷۵۔۱) ہم کو روز قیامت کی قسم۔
﴿فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ﴾ (۷۰۔۴۰) میں شرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کھاتا ہوں۔﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۴۔۶۵) تمہارے پروردگار کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔
﴿فَلَا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ (۵۶۔۷۵)

ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم [1] اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے [2] (المتقارب)

(۳۸۸) لَا وَاَبِيْكَ اِبْنَةَ الْعَامِرِيِّ

نہیں تیرے باپ کی قسم! اے عامری کی بیٹی۔

اور مروی ہے [3] (۱۰۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہوگیا ہے روزہ افطار کر دیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپ نے فرمایا:

لَا نَقْضِيْهِ مَا تَجَانَفْنَا الْاِثْمَ فِيْهِ اس میں بھی لا کلام محذوف کی نفی کے لیے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا ہے کہ آپ نے گناہ کا ارتکاب لیا تو اس کی نفی کے لیے انہوں نے لا فرمایا یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد نَقْضِيْهِ سے ازسرنو جملہ شروع کیا ہے۔

اور کبھی یہ لا نہی کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۴۹۔۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ (اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ اور آیت:۔

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ (۷۔۲۷) اے بنی آدم! دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ اور نیز ﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ﴾ (۲۷۔۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں...... میں بھی لا نہی کے لیے ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ (۲۔۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لا نافیہ بمعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾ (۲۔۸۴) اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت وخون نہیں کرو گے۔

میں بھی لا نفی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ﴾ (۴۔۷۵) تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔

میں ہوسکتا ہے کہ لَا تُقَاتِلُوْنَ موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہو: مَا لَكُمْ غَيْرَ مُقَاتِلِيْنَ یعنی تمہیں کیا ہوا در آنحالیکہ تم لڑنے والے نہیں ہو۔

اور لا کے بعد اگر اسم نکرہ آجائے تو وہ مبنی برفتحہ ہوتا ہے اور لا نفی کے معنی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ﴾ (۲۔۱۹۷) نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی

---

[1] وبعضهم قال ان "لا" زائده فی القسم لٰکن ضعفه الرازی (۳۰/۲۱۴۔۲۱۵)۔

[2] والبیت مطلع قصیده لامری القیس عدتها ۴۲ بیتا وغی بابنة العامری فاطمة بنت عمه وتمامه...... لا یدعی القوم انی افرد" البیت فی الحماسة فی قصیدة طویلة راجع الخزانة (۱: ۳۳۷/۴: ۴۸۹) والعینی (۱: ۹۶) و شرح المفضلیات والمعلقات لابن الانباری (۴۴) والعقد الثمین (۲۶) والسیوطی (۲۱۷) والطبرسی (۲۷/۱۳۱) والفخر (۳۰/۲۱۴) والبیت من شواهد الکشاف قال المحب: و قیل لبیت الربیعة بن جشم الیمنی۔

[3] انظر لقول عمرؓ وتاویله غریب ابی عبیدة (۳/۳۱۳) فی حدیث عمرو المسند لعمر (۲۔۷) عن زید بن وهب والنهایة (جنف) والفائق (۱/۲۱۸)

برا کام کرے۔

اور کبھی متضاد معنوں کے درمیان لا مکرر آ جاتا ہے۔ اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:۔

لَا زَیْدٌ بِمُقِیْمٍ وَّلَا ظَاعِنٍ نہ زید مقیم ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی دو متضاد معنوں کی نفی سے ایک درمیانی حالت کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے لَیْسَ اَبْیَضَ وَلَا اَسْوَدَ سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آیہ کریمہ: ﴿لَا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ﴾ (۲۴۔۳۵) یعنی زیتون کی نہ مشرق کی صرف منسوب ہے اور نہ مغرب کی طرف۔ کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی بھی ہے اور غربی بھی اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔

کبھی لا محض سلب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کر کے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً لَا اِنْسَانَ کہہ کر صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عامی محاورہ لَا حِدٌّ بھی اس معنی پر محمول ہے۔

(اللّات)

اَللّات اور اَلْعُزّٰی۔ دو بتوں کے نام ہیں۔

اَللّات اصل میں اللہ ہے۔ ہاء کو حذف کر کے اس کے عوض تاء تانیث لائی گئی ہے۔ اور اس تانیث سے اللہ تعالیٰ کے مرتبہ سے کم ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کہ وہ اس کو اپنے زعم میں قرب الٰہی حاصل کرنے کا خاص ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ﴾ (۳۸۔۳) اور وہ رہائی کا وقت نہیں تھا۔ میں فراء کے نزدیک لَاتَ اصل میں لَا حِیْنَ ہے اور اس میں تاء زائدہ ہے جیسا کہ ثُمَّتَ اور رُبَّتَ میں لائی جاتی ہے۔ بعض اہل بصرہ نے کہا ہے وَلَاتَ بمعنی لَیْسَ ہے۔ ابو بکر العلاف کا قول ہے کہ یہ اصل میں لَیْسَ ہے [1] یا الف سے اور سین تاء سے تبدیل ہو کر لَاتَ بن گیا ہے۔ جیسا کہ نَاسٌ میں ایک لغت نَاتٌ بھی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ لَاتٌ اصل میں لَا ہی ہے۔ اس میں تاء تانیث کا اضافہ کر کے ایک ساعت یا مدت کے معنی پر تنبیہ کی گئی ہے اور پوری بات یوں ہے:
لَیْسَتِ السَّاعَۃُ اَوِ الْمُدَّۃُ حِیْنَ مَنَاصٍ۔

(ل ب ب)

اَللُّبُّ کے معنی عقل خالص کے ہیں جو آمیزش (یعنی ظن و وہم اور جذبات) سے پاک ہو اور عقل کو لُبٌّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے معنوی قوی کا خلاصہ ہوتی ہے جیسا کہ کسی چیز کے خالص حصے کو اس کا لُبّ اور لُبَاب کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لُبٌّ کے معنی پاکیزہ اور ستھری عقل کے ہیں چنانچہ ہر لُبٌّ کو عقل کہہ سکتے ہیں لیکن ہر عقل "لُبٌّ" نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کو جن کا ادراک عقول زکیہ ہی کرسکتی ہیں اُولُوا الْاَلْبَابِ کے ساتھ مختص کیا ہے۔

---

[1] ای بکسر الیاء ذکر ابن ھشام فی المغنی (۱/۲۸۱) ولم ینسبه والیه ذھب ابو عبیدۃ وابن الطراوۃ و ابوبکر ھذا العله الخیاط مکان العلاف لان الخیاط کان من علماء النحاۃ ذکرہ السیوطی فی البغیه ۱۹ باب المحمدیین مات سنة عشرین وثلاثمأۃ وثلاثماته راجع للبحث المغنی لابن ھشام فانه یغنیك۔

جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ أُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (۲۔۲۶۹) اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں اور اس نوع کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

لَبَّ فُلَانٌ (س) کے معنی کسی کے صاحب لُبّ ہونے کے ہیں۔ایک عورت نے اپنے خاوند کولڑکے کے متعلق کہا۔

اِضْرِبْهُ كَيْ يَلُبَّ وَيَقُوْدَ الْجَيْشَ ذَا اللَّجَبِ: اسے پیٹو تا کہ عقلمند ہو جائے اور لشکر جرار کی قیادت کر سکے۔

رَجُلٌ اَلْبَبُ کے معنی عقلمند آدمی کے ہیں اسکی جمع اَلِبَّاءُ آتی ہے۔اور مَلْبُوْبٌ اسے کہتے ہیں جو عقلمندی میں مشہور ہو۔

اَلَبَّ بِالْمَكَانِ: کسی مقام پر قیام کرنا اس کے اصل معنی اونٹ کا کسی مقام پر اپنا لبہ یعنی سینہ رکھ دینے کے ہیں۔

تَلَبَّبَ: اس کے اصل معنی سینہ پر پیٹی باندھنے کے ہیں (پھر مجازا) (احرام باندھنے اور کسی کام کے لیے مستعد ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) لَبَبْتُهٗ کے معنی کسی کے لَبَّةٌ یعنی سینہ پر مارنے کے ہیں۔اور لَبَّةٌ (سینہ) کو لَبَّةٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ قوت عقلی کا مقام ہے۔محاورہ ہے۔فُلَانٌ فِيْ لَبَبٍ: فلاں آسودہ حال ہے۔

لَبَّيْكَ (کلمہ ایجاب ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہ لَبَّ بِالْمَكَانِ وَاَلَبَّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر مقیم ہونے کے ہیں اور مؤکد طور پر فرمانبرداری کا اظہار کرنے کے لیے اسے تثنیہ بنالیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں لَبَّبَ ہے، اس کی آخری باء کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔جیسے تَظَنَّيْتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے اس کا آخری نون یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے بعض کا خیال ہے یہ اِمْرَءَةٌ لَبَّةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اولاد سے محبت کرنے والی عورت کے ہیں۔بعض کے نزدیک اس کے معنی اِخْلَاصٌ لَّكَ بَعْدَ اِخْلَاصٍ کے ہیں یعنی بار بار تمہارے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہوں اور یہ لُبُّ الطَّعَامِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی خالص کھانا کے ہیں۔اسی سے حَسَبٌ لُبَابٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی خالص حَسَبَ کے ہیں۔

(ل ب ث)

لَبِثَ بِالْمَكَانِ کے معنی کسی مقام پر جم کر ٹھہرنے اور مستقل قیام کرنا کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۲۹۔۱۴) تو وہ ان میں ...... ہزار برس رہے۔

﴿فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ﴾ (۲۰۔۱۴۰) پھر تم کئی سال ٹھہرے رہے۔

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ (۲۳۔۱۱۳) خدا پوچھے گا کہ تم کتنے برس رہے۔

﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ (۲۳۔۱۱۳) وہ کہیں گے کہ ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔

﴿قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ (۱۸۔۱۹) انہوں نے کہا جتنی مدت تم رہے ہو تمہارا پروردگار ہی اس کو خوب

جاتا ہے۔
﴿لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً﴾ (۷۹۔۴۶) کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام رہے تھے۔
﴿لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً﴾ (۴۶۔۳۵) (تو خیال کریں گے کہ) گویا وہ دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر۔ ﴿مَالَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ﴾ (۳۴۔۱۴) تو ذلت کی تکلیف میں نہ پڑے رہتے۔

(ل ب د)

لِبْدَةٌ: تہ برتہ جمی ہوئی اون ج لِبَدٌ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا﴾ (۷۲۔۱۹) کافران کے گرداگرد ہجوم کرلینے کو تھے۔
یعنی تہ برتہ جمی ہوئی اون کی طرح ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ آپ پر مجتمع ہو کر لبدہ کی طرح گرنے لگے۔ایک قرأت میں لُبَدًا بھی ہے۔یعنی آپ کے گرد ہجوم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر چڑھ رہے تھے۔اور لُبْدٌ کی جمع اَلْبَادٌ وَّلُبُوْدٌ آتی ہے اَلْبَدْتُ السَّرْجَ: میں نے زین کے لیے نمدہ بنایا اور اَلْبَدْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں: میں نے گھوڑے پر نمدہ ڈالا۔جیسے اَسْرَجْتُهٗ (میں نے اس پر زین کسی)۔ وَالْجَمْتُهٗ: میں نے اسے لگام دی۔اَلْبَبْتُهٗ (سینہ بند باندھا)۔
اَللِّبْدَةُ: یہ لَبَدٌ کا مفرد ہے نمدہ کے ایک ٹکڑہ کو لِبْدَةٌ کہتے ہیں۔مثل مشہور ہے [1]
هُوَ اَمْنَعُ مِنْ لِبْدَةِ الْاَسَدِ: وہ شیر کے لبدہ یعنی سینہ یا ایال سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔لَبَدَ الشَّعْرُ: بالوں کا اوپر تلے جم جانا۔
لَبِدَتِ الْاِبِلُ لَبَدًا: زیادہ گھاس کھانے کی وجہ سے اونٹ پریشان اور سینہ گرفتہ ہو گئے اور آیت کریمہ:
﴿مَالًا لُّبَدًا﴾ (۹۰۔۶) بہت سا مال۔
میں لُبَدٌ کے معنی مال کثیر کے ہیں۔مثل مشہور ہے [2]
مَالَهٗ سَبَدٌ وَّلَا لَبَدٌ: نہ اس کے پاس اون ہے نہ بال یعنی بالکل مفلس ہے نہ تھوڑا ہے نہ بہت۔لُبَدٌ ایک پرند جو زمین کے ساتھ سینہ لگا کر چپک جاتا ہے اور نسور لقمان (لقمان کے گدھوں میں سے آخری نر گدھ) کو لُبَدٍ کہا جاتا ہے۔اَلْبَدَ الْبَعِيْرُ: اونٹ کے سرین پر گوبر کا جم جانا کبھی یہ اس کے خوبصورت اور موٹا ہونے سے کنایہ ہوتا ہے۔
اَلْبَدْتُ الْقِرْبَةَ: مشک کو لَبِيْدٌ یعنی بالوں سے بنی ہوئی چھوٹی بوری میں ڈال دینا۔

(ل ب س)

لَبِسَ الثَّوْبَ: کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور اَلْبَسَهٗ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا﴾ (۱۸۔۳۱) اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔
اَللِّبَاسُ وَاللَّبُوْسُ وَاللِّبْسُ: وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانپے۔

---

[1] المثل فی جل المعاجم۔
[2] انظر للمثل ادب الکاتب (۳۹) وجمهرة العسکری (۱۹۱) والمیدانی (۲: ۲۰۰) واللسان (لبدۓ والحیوان (۴۷۹/۵) والنوادر لابی مسحل ۱۲۔

اورلباس کا لفظ ہراس چیز پر بولا جاتا ہے۔جوانسان کے برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔چنانچہ میاں بیوی میں سے ہرایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قبائح کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (۲۔۸۷) وہ تمہاری پوشاک ہیں اورتم ان کی پوشاک ہو۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کوازار کہا ہے۔ [1]

(۳۸۹) فِدًى لَّكَ مِنْ اَخِيْ ثِقَةٍ اِزَارِيْ

اے میرے قابل اعتبار بھائی! تجھ پر میری ازار یعنی بیوی قربان ہو۔

اور تمثیل وتشبیہ کے طور پر''تقویٰ'' کو بھی لباس قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ (۷۔۲۶) اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ (۸۱۔۸۰) (اور ہم نے) تمہارے لیے ان کو ایک طرح کا لباس بنانا...... میں لَبُوْسٌ سے زرہیں مراد ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ﴾ (۱۶۔۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر ناشکری کا مزہ چکھا دیا۔

میں جوع یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لیے اسے لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔جیسا کہ:

تَدَرَّعَ فُلَانٌ الْفَقْرَ اَوْلَبِسَ الْجُوْعَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اور شاعر نے کہا ہے [2] ( )

(۳۹۰) وَكِسْوَتُهُمْ مِّنْ خَيْرِ بُرْدٍ مُّنَجَّمِ

عمدہ دھاری دار چادریں ان کا لباس ہیں۔

بعض نے وَلَبَاسُ التَّقْوٰى پڑھا ہے جو لَبْسٌ بمعنی ستر سے مشتق ہے۔

دراصل لَبْسٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔اور معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔مثلاً لَبَسْتُ عَلَيْهِ اَمْرَهٗ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ﴾ (۶۔۹) اور جو شبہ (اب) کرتے ہیں اسی شبہ میں پھر ڈال دیتے۔

﴿وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۲۔۴۲) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

﴿لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۳۔۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (۶۔۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے مخلوط نہیں کیا۔

فِي الْاَمْرِ لُبْسَةٌ یعنی اس معاملہ میں اشتباہ ہے۔

لَا بَسْتُ الْاَمُوْر: کسی کام کی مزاولت کرنا۔

لَا بَسْتُ فُلَانًا: کسی سے گھل مل جانا یعنی اندرون سے واقف ہونا۔لَيْسَ فِيْ فُلَانٌ مُلْبَسٌ: یعنی دروے کبر وسال خوردگی نیست شاعر نے کہا ہے [3] (الطّويل)

(۳۹۱) وَبَعْدَ الْمَشِيْبِ طُوْلُ عُمْرٍ وَمَلْبَسًا

---

[1] قاله جعدة بن عبدالسلمی وقد مر فی (ازر)

[2] لم اجده فی المراجع۔

[3] قاله امرؤ القيس وصدر الا ان بعد العدم للمرء قنوة...... والبيت فی اللسان (لبس) وديوانه (۱۴۲) ومن الستة ۱۳۵ وامالی المرتضیٰ (۱: ۵۹۶) والسمط (۳۳۷) و الصناعتين (۴۴۳) وفی بعد الشباب بدل بعد المشيب ۱۲۔

اور بڑھاپے کے کبرسنی اور کہن سالی ہے:

(ل ب ن)

اَللَّبَنُ: دودھ۔ ج۔ اَلْبَانٌ۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ﴾ (۴۷۔۱۵) اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلے گا۔
﴿مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا﴾ اور اس غذا سے جو نہ فضلہ بنی ہو اور نہ خون ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں۔

لَابِنٌ: بہت دودھ والا۔ لَبَنْتُهٗ: میں نے اسے دودھ پلایا۔
فَرَسٌ مَّلْبُوْنٌ: دودھ سے پرورش کیا ہوا گھوڑا۔
اَلْبَنَ فُلَانٌ: بہت سے دودھ کا مالک ہونا اور ایسے آدمی کو مُلْبِنٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْبَنَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں: اونٹنی بہت دودھ والی ہوگئی عام اس سے کہ طبعی طور پر ہو یا تھنوں میں دودھ چھوڑ دینے کی وجہ سے ہو۔ اَلْمَلْبَنُ: دودھ دوہنے کا برتن اور هُوَ اَخُوْهُ بِلِبَانِ اُمِّهٖ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا رضاعی بھائی ہے اور اس محاورہ میں لِبَانِ اُمِّهٖ کی بجائے لَبَنُ اُمِّهٖ کہنا۔ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اہل عرب سے مسموع نہیں ہے۔
كَمْ لُبْنُ غَنَمِكَ: یعنی تیری بکریوں میں دودھ والی کتنی ہیں [1]
اَللُّبَانُ کے معنی صدر یعنی سینہ کے ہیں اور لُبَانَةٌ کے اصل معنی تو دودھ کی ضرورت کے ہیں مگر مطلق ضرورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اَللَّبِنُ جس کے معنی عمارتی اینٹ کے ہیں اور اس کا واحد لَبِنَةٌ ہے اس کا لَبَنٌ (دودھ) سے کوئی معنوی تعلق نہیں اللَّبِنُ (اینٹ سے لَبَنَهٗ (ض) يَلْبُنُهٗ کے معنی اینٹ سے مارنے کے ہیں اور اینٹ بنانے والے کو لَبَّانٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ج ج)

اَللَّجَاجُ: (مصدر ض س) کے معنی کسی ممنوع کام کے کرنے میں بڑھتے چلے جانے اور اس پر ضد کرنے کے ہیں۔ [2] اس سے فعل لَجَّ فِي الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۳۔۷۵) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو تکلیفیں انہیں پہنچ رہی ہیں وہ دور کر دیں تو اپنی سرکشی پر اڑے رہیں اور بھٹکتے (پھریں)
﴿بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ﴾ (۶۷۔۲۱) لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔
اسی سے لَجَّةُ الصَّوْتِ مشہور ہے۔ [3] جس کے معنی آواز کے بار بار آنے جانے اور پلٹنے کے ہیں۔ لُجَّةُ الْبَحْرِ: (بضم اللام) سمندر کی موجوں کا تلاطم (ان کا بار بار آنا اور پلٹنا)
لُجَّةُ اللَّيْلِ: رات کی تاریکی کا آنا جانا اور سخت ہونا۔ اور لَجَّةٌ وَلُجَّةٌ: میں ایک لغت لُجٌّ اور لِجٌّ بھی ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ﴾ (۲۴۔۴۰) دریائے عمیق میں۔ میں لُجِّيٌّ بھی لُجَّةُ الْبَحْرِ کی طرف منسوب ہے اور

---

[1] وهو جمع لبون بمعنى ذات الدر۔
[2] في معناه استلج وفي الحديث اذا ستلج احدكم بيمينه فانه آثم له عند الله من الكفارة۔
[3] اي ارتفاعه وفي حدث عكرمة: سمعت لهم لجة بآمين (اللسان)

روایت ❶ (۱۰۶) وَضَعَ اللُّجَّ عَلٰی قَفَیَّ (اس نے میری گردن پر تلوار رکھ دی) میں لُجٌّ کے معنی آبدار تلوار کے ہیں اور قَفَیَّ اصل میں قَفَایَ ہے الف یاء سے مبدل ہو کر یاء میں ادغام ہو گیا ہے۔

اَللَّجْلَجَۃُ کے معنی ہکلاپن کے ہیں اور نیز لقمہ کو بغیر چبائے منہ میں پھرانے کو بھی لَجْلَجَۃٌ کہتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے ❷ (الوافر)

(۳۹۲) یُلَجْلِجُ مُضْغَۃً فِیْھَا اَنِیْضٌ

یعنی منہ میں گوشت کا نیم پختہ ٹکڑا پھرا رہا ہے۔

رَجُلٌ لَجْلَجٌ: ہکلا رک رک کر بات کرنے والا۔

اَلْحَقُّ اَبْلَجُ وَالْبَاطِلُ لَجْلَجٌ: حق واضح ہے اور باطل مشتبہ یعنی کوئی شخص باطل کو نہ تو صاف طور پر بیان کر سکتا ہے اور نہ انشراح صدر کے ساتھ اسے انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس میں ہمیشہ متردد رہتا ہے۔

(ل ح د)

اَللَّحْدُ: اس گڑھے یا شگاف کو کہتے ہیں جو قبر کی ایک جانب میں بنایا جاتا ہے۔ اور لَحَدَ الْقَبْرَ وَالْحَدَہٗ کے معنی قبر میں لحد بنانا کے ہیں۔

لَحَدَ الْمَیِّتَ وَاَلْحَدَہٗ: میت کو لحد میں دفن کرنا اور لَحْدٌ کو مُلْحَدٌ بھی کہا جاتا ہے جو کہ اَلْحَدْتُہٗ (افعال) سے اسم ظرف ہے۔

لَحَدَ بِلِسَانِہٖ اِلٰی کَذَا: زبان سے کسی کی طرف جھکنے یعنی غلط بات کہنا کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ﴾ (۱۶۔۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں۔ میں یَلْحِدُوْنَ لَحَدَ سے ہے اور ایک قرأت میں یُلْحِدُوْنَ (اَلْحَدَ سے) ہے۔

کہا جاتا ہے: اَلْحَدَ فُلَانٌ۔ فلاں حق سے پھر گیا۔

اِلْحَادٌ دو قسم پر ہے۔ ایک شرک باللہ کی طرف مائل ہونا۔

(۲) دوم شرک بالاسباب کی طرف مائل ہونا۔

اول قسم کا الحاد ایمان کے منافی ہے اور انسان کے ایمان وعقیدہ کو باطل کر دیتا ہے۔ اور دوسری قسم کا الحاد ایمان کو تو باطل نہیں کرتا لیکن اس کے عروۃ (حلقہ) کو کمزور ضرور کر دیتا ہے چنانچہ آیات:۔ ﴿وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (۲۲۔۲۵) اور جو اس میں شرارت سے کجروی وکفر کرنا چاہے تو اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ﴿اَلَّذِیْنَ

---

❶ فی حدیث طلحة ولفظه قدّمونی فوضعوا للحو علی قفی قال فی النهایة (۲۳۴/۴) اللج بالضم السیف بلغة طی وقیل هو اسم سمی به السیف کما قالوا الصمصامة راجع غریب ابی عبید (۹/۴) احادیث طلحة بن عبیدالله التمیمی وهو من العشرة المبشرة قتل یوم الحمل سنة ۳۶ وهو بجانب عائشة وله فی الصحیحین ۳۸ حدیثاً انظر لترجمته الاصابة (۲۹۰/۳) وتهذیب التهذیب (۲۰/۵) والحدیث فی قصه بیعة علیؓ قال طلحة "انی اخذت فادخلت فی الحش وقربوا فوضعوا اللج علی قفی فقالوا: لتبایعن اولنقتلنك فبایعت وانا مکره وراجع للحدیث ایضا الفائق (۹۱/۳) والصواب وضعوا مکان وضع کذافی جمیع المراجع ۱۲۔

❷ قاله زهیر وتمامه: اصلت فهی تحت الکشح واؤ والبیت فی اللسان (انض، لحج، صلل) ودیوانه بشرح الشنتمری ۱۶۳ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۸) وتهذیب الالفاظ ۴۹۷ والبحر (۷: ۲۰۰) وفی روایة الکامل تلحلج (۱: ۱۶) وهی موافقة لروایة الستة (العقد الثمین ۸۷) وهو الصواب لانه خطاب وبعده: و غصصت بینهما فبشمت منها۔ وعندك لواردت لهادواء۔ والبیت من ابیات المعانی انظر المعانی الکبیر للقبتی (۸۴۸، ۱۴۱)۔

یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِہٖ﴾ (۷۔۱۸۰) جولوگ اس کے ناموں کے وصف میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔

میں یہی دوسری قسم کا الحاد مراد ہے اور اِلْحَادِ فِیْ اَسْمَآئِہٖ یعنی صفات خداوندی میں الحاد کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ باری تعالیٰ کو ان اوصاف کے ساتھ متصف ماننا جو شان الوہیت کے منافی ہوں دوم یہ کہ صفات الٰہی کی ایسی تاویل کرنا جو اس کی شان کے زیبا نہ ہو۔اِلْتَحَدَ فُلَانٌ اِلٰی کَذَا: وہ (راستہ ہٹ کر) ایک جانب مائل ہوگیا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا﴾ (۱۸۔۲۷) اور اس کے سوا تم کہیں پناہ کی جگہ بھی نہیں پاؤ گے۔ میں مُلْتَحَدًا مصدر میمی بمعنی اِلْتِحَادِ بھی ہوسکتا ہے اور اسم ظرف بھی (اور اس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں) اِلْتَحَدَ السَّھْمُ عَنِ الْھَدَفِ ۔تیر نشانے سے ایک جانب مائل ہوگیا۔ (یعنی ہٹ گیا۔

(ل ح ف)

اَلْاِلْحَافُ کے معنی الحاح یعنی چمٹ کر مانگنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (۲۔۲۷۳) (اور شرم کے سبب) لوگوں سے منہ پھوڑ کر (اور) لپٹ کر نہیں مانگ سکتے۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اَلْحَفَ شَارِبَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی مونچھیں جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں اور یہ دراصل لِحَافٌ سے ہے اور لحاف کے معنی اوڑھنے کا کپڑا ہیں۔اَلْحَفْتُہٗ فَالْتَحَفَ: میں نے اسے لحاف میں ڈھانپ دیا چنانچہ وہ اس میں لپٹ گیا۔

(ل ح ق)

لَحِقْتُہٗ وَلَحِقْتُ بِہٖ کے معنی کسی کو پالینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ﴾ (۳۔۱۶۹) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے۔(اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہ ہوسکے۔

﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ﴾ (۶۲۔۳) اور ان میں سے دوسرے لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان مسلمانوں سے نہیں ملے محاورہ ہے: اَلْحَقْتُ بِہٖ کَذَا: میں نے اسے اس سے ملا دیا۔بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَقَہٗ بمعنی لَحِقَہٗ ہے۔اور دعائے قنوت میں ❶ (۱۰۶) اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ میں بھی ملحق اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْحَقْتُ بِہٖ کَذَا سے ماخوذ ہے۔

لیکن عذاب کی ہولنا کی بیان کرنے کے لیے اسے مُلْحِقٌ (ملنے والا) کہہ دیا ہے۔اور کنایۃً مُلْحَقٌ اسے بھی کہتے ہیں جسے کسی خاندان نے اپنے سے وابستہ کرلیا ہو۔اور وہ نسباً ان سے نہ ہو۔

(ل ح م)

اَللَّحْمُ: (گوشت) کی جمع لِحَامٌ، لُحُوْمٌ اور لُحْمَانٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَوْلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ﴾ (۲۔۱۷۳) اور سور کا گوشت۔ لَحُمَ الرَّجُلَ فَھُوَ لَحِیْمٌ کے معنی ہیں: وہ پر گوشت

❶ وقوله ای قول الداعی او قوله تعالی لان اُبیًّا کان یزید فی مصحفه وبعد القنوت سورتین عن القرآن انظر المشکل للقتبی ۲۰ وایضا فی مصحف بن عبدالله بن مسعود رضی الله عنه انظر کنز العمال (۸/۴۸) ولتخریجه رقم (۶۹۲) وفی منتهی الارب ملحق بکسر الحاء والفتح احسن واصوب ۱۲۔

اور موٹا ہو گیا۔ اور موٹے چربی چڑھے ہوئے آدمی کو لَاحِمٌ شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ جیسے: لَابِنٌ وَ تَامِرٌ: لَحِمَ (س) کے معنی گوشت کھانے کا حریص ہونا کے ہیں اسی سے بہت زیادہ گوشت خور باز یا بھیڑیے کو لَحِمٌ کہا جاتا ہے۔

بَیْتُ لَحِمٍ: وہ گھر جہاں لوگوں کی اکثر غیبتیں کی جائیں۔ حدیث میں ہے ❶ (۱۰۷)

اِنَّ اللّٰہَ یَبْغَضُ قَوْمًا لَحِمِیْنَ کہ اللہ تعالیٰ بہت گوشت خور لوگوں کو ناپسند کرتا ہے یعنی جو ہر وقت لوگوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں۔ اَلْحَمَہٗ کے معنی کسی کو گوشت کھلانے کے ہیں۔ اور اسی سے تشبیہ کے طور پر اس آدمی کو جس کی گذران شکار پر ہو۔ رَجُلٌ مُلْحَمٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مطلقاً تشبیہاً ہر کھاتے پیتے آدمی کو مُلْحَمٌ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے "ثَوْبٌ مُلْحَمٌ" کا محاورہ ہے جس کے معنی بنے ہوئے کپڑے کے ہیں کپڑے کے بانا کو لُحْمَۃٌ کہا جاتا ہے جو کہ لُحْمَۃُ الْبَازِیْ سے مشتق ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ ❷ (۱۰۸)

اَلْوِلَاءُ لُحْمَۃٌ کَلُحْمَۃِ النَّسَبِ کہ ولاء کا رشتہ بھی نسب کے رشتہ کی طرح ہے شَجَّۃٌ مُتَلَاحِمَۃٌ زخم پر گوشت چڑھ گیا ہو۔ لَحَمْتُ اللَّحْمَ عَنِ الْعَظْمِ میں نے ہڈی سے گوشت کو الگ کر دیا۔ لَحَمْتُ الشَّیْءَ وَاَلْحَمْتُہٗ وَلَاحَمْتُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ میں نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ اس طرح گتھی کر دیا۔ جیسے ہڈی کے ساتھ گوشت پیوست ہوتا ہے۔

اَلِلحَامُ: وہ چیز جس سے برتن کو ٹانکا لگایا جائے

اَلْحَمْتُ فُلَانًا کسی کو قتل کر کے اسکا گوشت درندوں کو کھلا دیا۔

اَلْحَمْتُ الطَّائِرَ: میں نے پرند کا گوشت کھلایا۔

اَلْحَمْتُكَ فُلَانًا: میں نے فلاں کی غیبت کا موقع دیا۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے غیبت و بد گوئی کو اکل اللحم یعنی گوشت کھانے سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا﴾ (۴۹۔۱۲) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

فُلَانٌ لَحِیْمٌ فلاں کو قتل کر دیا گیا۔ گویا اسے درندوں کی خوراک بنا دیا گیا۔ اَلْمَلْحَمَۃُ معرکہ مَلَاحِمٌ۔

(ل ح ن)

اَللَّحْنُ (ف) کے معنی ہیں بات کو اس کے مستعمل طریقہ اور اسلوب سے پھیر دینا۔ اگر یہ لفظ کے اعراب یا ہیئت تبدیل کر دینے سے ہو جو کہ لَحْنٌ کا عام مفہوم ہے تو یہ قابل مذمت ہے اور اگر تصریح چھوڑ کر بطور تعریض کلام کرنے سے ہو تو اکثر ادباء کے نزدیک فن بلاغت کے لحاظ سے یہ مستحسن اور کلام کی خوبیوں میں شمار ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے ❸ (الخفیف)

(۳۹۳) وَخَیْرُ الْحَدِیْثِ مَاکَانَ لَحْنًا

---

❶ انظر مجمع البحار (۳/۲٤۸) والفائق (۲/۲۲۲) باختلاف یسیر فی اللفظ و کذا فسرہ سفیان الثوری۔

❷ حدیث مرفوع اخرجه ابویعلی و ابن حبان عن ابن عمر انظر الذرقانی علی الموطا (٤/۹٦) و کنز العمال (ج ۱۰ رقم ۵٤۳) ورقم (۱۵۵۷) و (۱٦۲۲) عن علی وعبد اللہ بن ابی اوفی والفتح الکبیر للنبھانی ۳/۳۰۸

❸ قاله مالك بن اسماء بن خارجه (۷۵٦۔۷۵۸ الشعراء) شاعر اسلامی غزل و صدرہ منطق رائع و لتحن احیاء ناد...... ←

بہتر کلام وہ ہے جو تعریض میں ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (۴۷۔۳۰) اور تم انہیں ان کے انداز گفتگو سے پہچان لو گے۔ میں بھی یہی مراد ہے۔ اور اسی سے ذہین آدمی جو کلام کے صحیح مقصد کو خوب سمجھ لیتا ہو۔ لَحِنٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ ❶(۱۰۹)

لَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ: شاید تم میں سے بعض آدمی دوسرے کی نسبت دلیل پر زیادہ قدرت رکھتے ہوں تو اَلْحَنُ کے معنی زبان آور اور فصیح شخص کے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کو وضاحت اور استدلال سے بیان کرسکتا ہو۔

(ل د د)

اَلْاَلَدُّ: سخت جھگڑالو آدمی کو کہتے ہیں جو کسی کی بات مانتا ہی نہ ہو۔ اسی کی جمع لُدٌّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ (۲۔۲۰۴) حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔

﴿وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (۱۹۔۹۷) تاکہ اس کے ذریعہ سخت جھگڑالو قوم کو بدانجام سے آگاہ کرو۔ اصل میں اَلَدَّ شدید اللدد یعنی اس آدمی کو کہتے ہیں۔ جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو۔ اور مجازاً اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے اس کے ارادہ سے پھیرا نہ جاسکے۔

فُلَانٌ يَتَلَدَّدُ: فلاں گردن موڑ کر رخ پھیرتا ہے۔

اَللَّدُوْدُ: وہ دوا جو منہ کی جانب سے پلائی جائے۔

❷ اِلْتَدَدْتُ: لدود لینا۔

(ل د ن)

لَدُنْ: یہ عِنْدَ سے اخص ہے کیونکہ یہ کسی فعل کی انتہاء کے آغاز پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے اَقَمْتُ عِنْدَهٗ مِنْ لَّدُنْ طُلُوْعِ الشَّمْسِ اِلٰی غُرُوْبِهَا: آغاز طلوع شمس سے غروب آفتاب تک اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ تو یہاں لَدُنْ کا لفظ ٹھہرنے کے آغاز کو بیان کرتا ہے اور کبھی عِنْدَ کی بجائے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حکایت ہے اَصَبْتُ عِنْدَهٗ مَالًا وَلَدُنْهُ مَالًا: میں نے اس کے پاس مال پایا بعض نے کہا ہے کہ لَدُنْ عِنْدَ سے ابلغ اور اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تُصٰحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا﴾ (۱۸۔۷۶) تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا کہ آپ کو (مجھے ساتھ نہ رکھنے کے بارے میں) میری طرف سے عذر حاصل ہوگا۔

← وفی مصارع العشاق (۲۶۳) انه قال فی اُمرئته حسینة بنت ابی حندب الانصاری انظر البیت السمط ۱۶ والمشاطرة للاستاذ المیمنی وامالی المرتضی (۱/۱۴،۱۵) وفی روایتهما جمیعا صائب بدل رائع والبیت فی ادب الکتاب للصولی (۱۳۱) والعقد الفرید (۲/۴۸۰) والمعجم للمرزبانی (۲۶۶) والبیان للجاحظ ۱۴۷ والعیون (۲/۱۶۱) والخزانة (۲/۴۸۵) والعمدة (۱/۳۰۸) وفیه صنعة الاشارة اللحن ومعناه فی الآیة والبیت الشاهد کلام یعرفه المخاطب بفحواه وان کان علی غیر وجهه ویسمی الیوم المحا جاة لدلالة الحجۃ علیها کذا افسر ابن درید البیت لٰکن قرینه صائب یا بی عن ذالك الا انه یستلذمن الحواری وایضا راجع هوامش مجالس ثعلب (۵۳۱)

❶ قال الحافظ فی الکاف اصلحه فی الصحیحین قال الذکر ۱/۲۰۳) اخرجه مالك والشافعی وابن ابی شیبة والصحیحان عن ام سلمة والحاکم واحمد من روایة اسامة بن زید وابن حبان فی زوائده رقم ۱۱۹ عن ابی هریرة والحدیث فی الفائق (۲/۵۱،۲۲۱) وغریب القبتی ۷۵

❷ وفی الحدیث خیر ماتدا ویتم به اللدو دالفائق (۲/۲۲۳)۔

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ (۱۸۔۱۰) اے ہمارے پروردگار ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما:
﴿فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (۱۹۔۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما:
﴿وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ (۱۷۔۸۰) اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیو۔
﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (۱۸۔۶۵) ہم نے اسے اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔
اور لَدُنْ میں لَدْ، لَدُ، لَدٰی تین لغات اور بھی ہیں۔
اَللَّدِنُ: لچکدار نرم۔

(ل د ی)

لَدَی یہ تقریباً لَدُن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (۱۲۔۲۵) اور دونوں کو دروازے کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

(ل ز ب)

اَللَّازِبُ: اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر شدت سے ثبت ہو جائے اور چمٹ جائے قرآن پاک میں ہے:
﴿مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ (۳۷۔۱۱) چپکتے گارے سے (بنایا) اور کبھی لَازِبٌ بمعنی واجب بھی آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کے لازم اور ضروری ہونے کو بیان کرنے کے لیے ضربة لازب کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اَللَّزْبَةُ: سخت قحط سالی اس کی جمع لَزَبَاتٌ آتی ہے۔

(ل ز م)

لَزِمَهٗ يَلْزَمُهٗ لُزُوْمًا کے معنی کسی چیز کا عرصہ دراز تک ایک جگہ ٹھہرے رہنا کے ہیں۔ اور اِلْزَامٌ (افعال) دو قسم پر ہے ایک تو اِلْزَامٌ بِالتَّسْخِيْرِ ہے اسکی نسبت اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور دوسرے اِلْزَامٌ بِالْحُكْمِ وَالْاَمْرِ یعنی کسی چیز کا حکماً واجب کر دینا جیسے فرمایا:
﴿اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ (۱۱۔۲۸) تو کیا ہم اس کے لیے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں۔ اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو۔ ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ (۴۸۔۲۶) اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا۔
﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ (۲۵۔۷۷) سو وہ (سزا) تمہارے لیے لازم ہوگی۔
﴿وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (۲۰۔۱۲۹) اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور اجزائے اعمال کے لیے میعاد مقرر نہ ہو چکی ہوتی۔ تو عذاب (تم سے) چمٹ جاتا۔

(ل س ن)

اَللِّسَانُ: زبان اور قوت گویائی کو کہتے ہیں۔
قرآن مجید میں ہے:
﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ (۲۰۔۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔
یہاں لِسَانٌ کے معنی قوت گویائی کے ہیں کیونکہ وہ بندش ان کی زبان پر نہیں تھی بلکہ قوت گویائی سے عقدہ کشائی کا سوال تھا۔ محاورہ ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ لِسَانٌ وَلِسْنٌ (بکسر اللام) یعنی ہر قوم را لغت و لہجہ جدا است۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹۔۹۷)(اے پیغمبر) ہم نے یہ قرآن پاک تمہاری زبان میں آسان نازل کیا۔

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ﴾ (۲۶۔۱۹۵) فصیح عربی زبان میں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَ اَلۡوَانِكُمۡ﴾ (۳۰۔۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔

میں السنہ سے اصوات اور لہجوں کا اختلاف مراد ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح دیکھنے میں ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی اسی طرح قوت سامعہ ایک لہجہ کو دوسرے سے الگ کر لیتی ہے۔

(ل ط ف)

اَللَّطِیۡفُ: جب یہ کسی جسم کی صفت واقع ہو تو یہ جَثْلٌ کی ضد ہوتا ہے جس کے معنی بھاری اور ثقیل کے ہیں کہتے ہیں شَعْرٌ جَثْلٌ ...... (یعنی زیادہ اور بھاری بال) اور کبھی لَطَافَةٌ یا لُطْفٌ سے حرکت خفیہ اور دقیق امور کا سرانجام دینا مراد ہوتا ہے اور لَطَائِفُ سے وہ باتیں مراد لی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لَطِیۡفٌ ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ انسانی حواس کے ادراک سے مافوق اور بالاتر ہے اور یا اسے اس لیے لطیف کہا جاتا ہے کہ وہ دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کی ہدایت دینے میں نہایت نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَللّٰهُ لَطِیۡفٌ بِعِبَادِهٖ﴾ (۴۲۔۱۹) خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ﴾ (۱۲۔۱۰۰) بے شک میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے۔ میں لطیف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسن تدبیر سے سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے انہیں اس مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اور کبھی ان تحائف کو بھی لطف کہا جاتا ہے جو دوستی بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کو دیئے جاتے ہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا[1] (۱۱۰)

تَهَادُوۡا تَحَابُّوۡا کہ ایک دوسرے کو تحفے بھیجا کرو۔ تو تمہاری آپس میں محبت بڑھ جائے گی۔

اَلۡطَفَ فُلَانٌ اَخَاهُ بِكَذَا: فلاں نے اپنے بھائی کے ساتھ کسی چیز کے ذریعہ حسن سلوک کیا۔[2]

(ل ظ ی)

لَظِیَتِ النَّارُ وَتَلَظَّتْ کے معنی آگ بھڑک اٹھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿نَارًا تَلَظّٰی﴾ (۹۲۔۱۴) بھڑکتی آگ سے۔

اور لَظٰی آگ کے شعلہ کو کہا جاتا ہے۔ جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ یہ جہنم کا علم اور غیر منصرف ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّهَا لَظٰی﴾ (۷۰۔۱۵) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

---

[1] الحدیث اخرجه البخاری فی الادب المفرد والبیهقی من حدیث ابی هریرة بسند جید انظر تخریج الاحیاء (۲/۴۰) وکنز العمال (ج ٦ رقم ٤٧٦، ٤٧٧)۔

[2] وایضاً الآیات (٦۔١٠٤ و ١٨۔١٩)

(ل ع ب)

اَللَّعْبُ: اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جس کے معنی منہ سے بہنے والی رال کے ہیں اور لَعَبَ (ف) یَلْعَبُ لَعْبًا کے معنی لعاب بہنے کے ہیں۔لیکن لَعِبَ (س) فُلَانٌ یَلْعَبُ لَعِبًا کے معنی بغیر صحیح مقصد کے کوئی کام کرنا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ﴾ (۲۹۔۶۴) اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا﴾ (۶۔۷۰) اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔ان سے کچھ کام نہ رکھو۔

﴿اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۷۔۹۸) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آنازل ہو،اور وہ کھیل رہے ہوں۔

﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ﴾ ((۲۱۔۵۵) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس واقعی حق لائے ہو یا ہم سے کھیل کی باتیں کرتے ہو۔﴿وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ (۲۱۔۱۶) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو مخلوقات ان دونوں کے درمیان ہیں اس کو لہو ولعب کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا اَللَّعْبَةُ: (صیغہ مَرَّة) ایک مرتبہ کھیلنا لِعْبَةٌ (بکسر اللام) کھیلنے کی حالت رَجُلٌ تِلْعَابَةٌ کے معنی ہیں ذُوْتَلَعُّبٍ یعنی بہت بڑا کھلاڑی بے کار کام کرنے والا۔لُعْبَةٌ۔گڑیا،(شطرنج چوسر وغیرہ جن کے ساتھ کھیلا جاتا ہے)اَلْمَلْعَبُ: (ظرف) کھیلنے کی جگہ یا میدان۔

لُعَابُ النَّحْلِ: شہد۔لُعَابُ الشَّمْسِ: وہ چیز جو دھوپ میں مکڑی کے جالے کی طرح دکھائی دیتی ہے مُلَاعِبُ ظِلِّهٖ: ایک جانور (جس کی گردن چھوٹی اور بازو بڑے ہوتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا پیٹ سفید ہوتا ہے) بیٹھے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سائے سے کھیل رہا ہے۔

(لَعَلَّ)

لَعَلَّ: (حرف) یہ طمع اور اشفاق (ڈرتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لیے استعمال کرے تو اس کے معنی میں قطعیت آجاتی ہے.........اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ کی اس کی تفسیر کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی لینا صحیح نہیں ہیں۔اور گو لَعَلَّ کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی متکلم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ﴾ (۲۶۔۴۰) تاکہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہو جائیں۔میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ (۲۰۔۴۴) شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔میں توقع کا تعلق موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے ساتھ ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اس امید پر فرعون سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ﴾

(۱۱۔۱۲) شائد تم کچھ چیز وحی میں سے جو تمہارے پاس آتی ہے چھوڑ دو۔ میں لعل کے معنی یہ ہیں کہ لوگ تمہارے متعلق ایسا گمان کرتے ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ﴾ (۱۸۔۶) تو شاید تم اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔

میں بھی لعل کا تعلق لوگوں سے ہے یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۶۲۔۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو یاد کرو مگر دل میں یہ امید رکھ کر اللہ کا ذکر کرو کہ اس سے فلاح و کامرانی حاصل ہوگی جیسا کہ دوسری جگہ مومنین کے متعلق فرمایا:

﴿وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُونَ عَذَابَهٗ﴾ (۱۷۔۵۷) کہ وہ اس کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

(ل ع ن)

اَللَّعْنُ: کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا۔ خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے اور انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بد دعا کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِينَ﴾ (۱۱۔۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

﴿وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾ (۲۴۔۷) اور پانچویں (بار) یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ ﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِىٓ اِسْرَآءِيلَ﴾ (۵۔۷۸) جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر لعنت کی گئی۔

﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ﴾ (۲۔۱۵۹) اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔ [1]

اَللُّعْنَةُ: (بسکون العین) یہ اِلْتَعَنَ سے ہے یعنی اپنے آپ پر لعنت کرنے والا۔ یا جس پر بہت لعنتیں بھیجی جائیں۔ مگر اَللُّعَنَةُ (بفتح العین) لَعَنَ (متعدی) سے ہے یعنی دوسروں پر بہت لعنت کرنے والا۔

اَلتَّلَاعُنُ وَالْمُلَاعَنَةُ: لوگوں کا باہم اپنے آپ یا دوسروں پر لعنت بھیجنا۔

(ل غ ب)

اَللُّغُوبُ کے معنی بہت زیادہ درماندہ ہونے اور تھک جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَتَانَا سَاغِبًا لَاغِبًا: وہ ہمارے پاس بھوکا اور تھکا ہارا ہو کر پہنچا۔ قرآن پاک میں ہے: [2]

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوبٍ﴾ (۵۰۔۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تکان محسوس نہیں ہوئی۔

سَهْمٌ لَغِبٌ۔ وہ تیر جس کے پر کمزور ہوں۔

رَجُلٌ لَغِبٌ: کاہل اور کمزور رائے آدمی۔

ایک اعرابی کا قول ہے: فُلَانٌ لَغُوبٌ اَحْمَقُ جَاءَتْهُ كِتَابِىْ فَاحْتَقَرَهٗ کہ فلاں شخص بڑا بے وقوف

---

[1] وایضا راجع الآیات (۳۳۔۶۱) (۱۵۔۳۵) ۲۔۸۸)

[2] وایضاً لاحظ الآیة (۳۵۔۳۵)

اور احمق ہے کہ اس نے میرے خط کو حقیر سمجھا یہاں لَغُوْبٌ کے معنی کمزور رائے آدمی کے ہیں۔اس پر اعرابی سے کسی نے سوال کیا کہ کتاب تو مذکر ہے پھر جَاءَتْهُ کیوں کہا تو اس نے جواب دیا اَلَیْسَ الْکِتَابُ بِصَحِیْفَةٍ کہ کیا کتاب بھی ایک صحیفہ نہیں ہے (اور صحیفہ مونث ہے)

(ل غ و)

اَللَّغْوُ (ن) کے معنی بے معنی بات کے ہے جو کسی گنتی شمار میں نہ ہو یعنی جو سوچ سمجھ کر نہ کی جائے۔گویا وہ پرندوں کی آواز کی طرح منہ سے نکال دی جائے ابوعبیدہؒ کا قول ہے کہ اس میں ایک لغت لَغَا بھی ہے۔ جیسے عَیْبٌ وَعَابٌ شاعر نے کہا ❶ (الرجز)

(۳۹۴) عَنِ اللَّغَاوَ رَفَثِ التَّکَلُّمِ

جو بے ہودہ اور فحش گفتگو سے خاموش ہیں۔

اس کا فعل لَغِیْتَ تَلْغٰی یعنی سَمِعَ سے ہے۔اور کبھی ہر قبیح بات کو لغو کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا کِذّٰبًا﴾ (۷۸۔۳۵) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ اور خرافات ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (۲۳۔۳) اور جو بیہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ﴿وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ﴾ (۲۸۔۵۵) اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا﴾ (۵۶۔۲۵) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ الزام تراشی۔اور آیت کریمہ:

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا﴾ (۲۵۔۷۲) اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزرتے ہیں۔کہ معنی یہ ہیں کہ وہ فحش بات کبھی صراحت سے نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ کنایہ سے کام لیتے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ اگر کہیں اتفاق سے وہ ایسی مجلس میں چلے جاتے ہیں جہاں بے ہودہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں تو اس سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

پس لغو ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جو کسی شمار قطار میں نہ ہو۔ اور اسی سے لَغْوٌ فِی الْاَیْمَانِ ہے یعنی وہ قسم جو یونہی بلا ارادہ زبان سے نکل جائے ❷ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ﴾ (۲۔۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے ❸ (البسیط)

---

❷ وفی اللسان قاله رؤبة ونسبه ابن بری للعجاج وقبله: ورب اسراب حجیج کظم والشطر فی القرطبی (۲/۴۰۷) وفی مجازالقرآن (۱:۷۰) وفی دیوانه ۵۹ وابن ولاد (۱۱۲) والطبرسی (۲:۲۳۳) والاقتضاب (۴۶۱) واللسان والتاج (رفث لغو) وشواهد الکشاف (۲۹۸) وابو علی الفارسی فی الحجة (۲:۲۶۲) وفی الانصاف ۱۲۲ وصدره: استغفرالرحمن ذاالتعظیم ۱۲۔

❷ کذا فسریه ابن عباس وعکرمة والشعبی وروی مرفوعا عن عائشةؓ قال ابوهریرة والحسن ومجاهد وآخرون اللغو فی الیمین ان یحلف زاعما انه صادق ولا یکون کذالك وروی مرفوعا عن ابن عباس انه لا یمین فی غضب (الطبری ج۲ ص ۴۰۴۔ ۴۱۴)

❸ قاله الفرزق روی ان الحسن سئل عن لغو الیمین فقال للفرزدق وعنی اجب وعنك یا ابا سعید وانشد والبیت من شواهد لکشاف ۱۱ والبحر (۲:۱۷۹) ومحاضرات المؤلف (۲:۴۸۱)۔

﴿۳۹۵﴾ وَلَسْتَ بِمَاْ خُوْذٍ بِلَغْوٍ تَقُوْلُهٗ
اِذَا لَمْ تُعَمِّدْ عَاقِدَاتِ الْعَزَائِمِ

لغوقسم کھانے پر تم سے مواخذہ نہیں ہوگا بشرطیکہ قصداً عزمِ قلب کے ساتھ قسم نہ کھائی جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً﴾ (۸۸۔۱۱) وہاں کسی طرح کی بکواس نہیں سنیں گے۔ میں لَاغِیَۃٌ بمعنی لغو کے ہے اور یہ (اسم فاعل) کلام کی صفت واقع ہوا ہے جیسا کہ کَاذِبَۃٌ وغیرہ۔

اور خوبہا میں لَغْوٌ اونٹ کے ان بچوں کو کہا جاتا ہے جو گنتی میں شمار نہ کیے جائیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1]

(الوافر)

﴿۳۹۶﴾ کَمَا اَلْغَیْتَ فِی الدِّیَۃِ الْحُوَارْ

جیسا کہ اونٹ کے چھوٹے بچے کو خوبہا میں ناقابل شمار سمجھا جاتا ہے۔

لَغِیَ بِکَذَا کے معنی چڑیا کے چہچہانے کی طرح کسی چیز کا بار بار تذکرہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اسی سے ہر گروہ کی زبان اور بولی جس کے ذریعے وہ بات کرتا ہے لُغَۃٌ کہلاتی ہے۔

(ل ف ف)

لَفَفْتُ الشَّیْءَ لَفًّا کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور مدغم کر دینے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا﴾ (۱۷۔۱۰۴) اور ہم تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے۔ اور محاورہ ہے: جَاءُوْا وَمَنْ لَفَّ لَفَّھُمْ: یعنی وہ اور ان کے سب متعلقین آئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا﴾ (۷۸۔۱۶) اور گھنے گھنے باغ میں الفاف سے ایک دوسرے سے متصل گھنے اور گنجان درختوں والے باغیچے مراد ہیں۔

اِلْتَفَّ ایک چیز کا دوسری سے لپٹ جانا قرآن پاک میں ہے:

اَلْاَلَفُّ: وہ آدمی جس کی رانیں موٹاپے کی وجہ سے باہم ملی ہوئی ہوں اور بہت زیادہ بھاری جسم اور سست آدمی کو بھی اَلَفُّ کہا جاتا ہے۔ لَفَّ رَأْسَهٗ: اس نے اپنے سر کو (کپڑوں ...... میں) چھپالیا۔

اَللَّفِیْفُ: مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ اور خلیل نے ہر اس کلمے کا نام لفیف رکھا ہے جس کے حروف اصلی میں سے دو حرف علت ہوں۔

(ل ف ت)

لَفَتَهٗ عَنْ کَذَا: کسی چیز سے پھیر دینا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا﴾ (۱۰۔۷۸) کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ (جس راہ پر ہم اپنے باپ دادا کو پاتے رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو۔

اور اسی سے اِلْتَفَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی رخ موڑنے کے ہیں۔ اِمْرَءَۃٌ لَفُوْتٌ وہ عورت جو اپنے پہلے خاوند کے بچہ سے محبت کرے اور دوسرے خاوند کی طرف توجہ نہ دے۔

اَللَّفِیْتَۃُ: ایک قسم کا گاڑھا حریرہ۔

---

[1] قاله ذو الرمة يهجو هشام بن قيس المرئي (احد بنى امرئ القيس بن زيد مناة) وصدره: ويهلك وسطها المرئي لغوا...... قال في اللسان (لغو) وهذا البيت عمل له جرير وقد احس به الفرزدق لما سمعه والبيت في الامالي (۲: ۱۳۷)

(ل ف ح)

لَفَحَتْهُ الشَّمْسُ وَالسَّمُوْمُ کے معنی ہیں: سورج یا بادسموم نے اپنی لپٹ سے جھلسا دیا۔قرآن پاک میں ہے:﴿تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ (۲۳-۱۰۴) آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر لَفَحْتُهٗ بِالسَّيْفِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنی تلوار سے سر قلم کر دینا ہیں۔

(ل ف ظ)

اَللَّفْظُ بِالْكَلَامِ کے معنی کلام کرنا کے ہیں اور یہ لَفْظُ الشَّيْءِ مِنَ الْفَمِ یا لَفْظُ الرَّحٰی بِالدَّقِیْقِ کے محاورہ سے مستعار ہے۔اسی سے مرغ کو لَافِظَةٌ کہا جاتا ہے ❶ کیونکہ وہ مرغی کے لیے چوگا ڈالتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (۵۰-۱۸) کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔

(ل ف ی)

اَلْفَيْتُ کے معنی وَجَدْتُ یعنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا﴾ (۲-۱۷۰) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔

﴿وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (۱۲-۲۵) اور دونوں نے دروازے کے پاس اس کے شوہر کو پایا۔

(ل ق ب)

اَللَّقَبُ: اس نام کو کہتے ہیں جو اصلی نام کے علاوہ ہو...... لقب دینے میں معنی کی رعایت کی جاتی ہے بخلاف اعلام کے کہ ان میں معنوی رعایت نہیں ہوتی اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ❷ ()

(۳۹۷) وَقَلَّمَا اَبْصَرَتْ عَلَيْنَاكَ ذَالَقَبٍ
اِلَّا وَمَعْنَاهُ اِنْ فَتَّشْتَ فِيْ لَقَبِهٖ

تم نے کسی صاحب لقب کو نہیں دیکھا ہوگا۔مگر ذرا تلاش کرنے پر اس کے اوصاف اس کے لقب میں مل سکتے ہیں۔

لقب دو قسم پر ہے۔ایک لقب تشریفی جیسا کہ سلاطین کے القاب ہوتے ہیں اور دوسرا لقب تحقیری چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ﴾ (۴۹-۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ میں اس دوسری قسم کے القاب سے منع کیا گیا ہے۔کیونکہ ان سے اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔

(ل ق ح)

لَقِحَتِ النَّاقَةُ تَلْقَحُ ۔لَقْحًا وَلَقَاحًا کے معنی اونٹنی کے حاملہ ہونے کے ہیں۔اسی طرح درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اَلْقَحَ

---

❶ وفی المثل "اسمح من لافظة" الامالی (۱/۲۴۴) والسمط (۵۵۲) وتهذیب الالفاظ (۲۰۳) والعسکری (۴۴، ۱/۱۷) لکن بلفظ اسخیٰ وفی الثمار (۳۷۴) والمستقصی والبخلاء (۱۳۵) لاقطة بالقاف وقیل اللافظة العنز لانها تلفظ مافی فیها من العلف وقت الحلب والحیوان (۱/۲۲۰، ۷/۱۰) ولا نصیح الالحمله علی الحازة البعیدة راجع الحیوان (۲/۱۴۹-۱۵۱)

❷ والبیت فی محاضرات الادباء (۳/۳۳۷) بغیر عزو وفی روایة من رجل بدل ذالقب وفی اسم اولقب" بدل ان فتشت فی لقبه۔

اَلْفَحْلُ النَّاقَةَ وَالرِّیْحُ السَّحَابَ کے معنی سانڈھ کے اونٹنی کو یا ہوا کے بادل کو باردار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ﴾ (۱۵۔۲۲) اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں۔ (جو بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

اَلْقَحَ فُلَانُ النَّخْلَ وَلَقَّحَهَا: کھجور کو پیوند کرنا۔ اِسْتَلْقَحَتِ النَّخْلَةُ: کھجور پیوند کے لائق ہوگئی اور حاملہ اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دے کر حَرْبٌ لَاقِحٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سخت لڑائی کے ہیں۔ جو اپنے ساتھ بہت مصائب لائے۔ لِقْحَةٌ۔ شیر دار اونٹنی۔ ج لِقَاحٌ وَلُقَّحٌ۔ اَلْمَلَاقِیْحُ: حاملہ اونٹنیاں۔

نیز بچوں کو بھی ملاقیح کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے (۱۱۱)[1] نُهِیَ عَنْ بیع الملاقیح والمضامین۔ کہ آنحضرت ﷺ نے ملاقیح ومضامین کی بیع سے منع فرمایا۔ تو ملاقیح کے معنی جنین کے ہیں اور مضامین نر کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں۔ جو تا حال اس کی پشت میں محفوظ ہو۔

اَللَّقَاحُ: نر جانور کا مادہ منویہ۔ نیز لَقَاحٌ اس آزاد قبیلے کو بھی کہتے ہیں جو کسی بادشاہ کے زیر حکومت نہ ہو گویا وہ حامل ہے محمول نہیں ہے۔

(ل ق ف)

لَقِفْتُ الشَّیْءَ اَلْقَفُهُ وَتَلَقَّفْتُهُ کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری اور خداقت سے لینا کے ہیں اور یہ منہ یا ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ﴾ (۷۔۱۱۷) وہ فوراً جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو (ایک ایک کر کے) نگلنے لگا۔

(ل ق م)

﴿لُقْمَان﴾ (۳۱۔۱۲) مشہور حکیم کا نام ہے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی لَقِمْتُ الطَّعَامَ اَلْقَمُهُ وَتَلَقَّمْتُهُ سے مشتق ہو جس کے معنی کسی چیز کو ہڑپ کر جانا کے ہیں۔ رَجُلٌ تِلْقَامٌ: بڑے بڑے لقمے نگلنے والا۔ اَللَّقِیْمُ۔ لوالا اور راستہ کی ایک جانب کو لَقَمٌ کہا جاتا ہے۔

(ل ق ی)

لَقِیَهُ (س) یَلْقَاهُ لِقَاءً کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ (۳۔۱۴۳) اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔

﴿لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (۱۸۔۶۲) اس سفر سے ہم کو بہت تکان ہوگئی ہے۔

اور ملاقات الٰہی سے مراد قیامت کا بپا ہونا اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ اعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ (۲۔۲۲۳) اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ ﴿قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۴۹) جو

[1] رواه الطبرانی عن ابن عباس رضی الله عنه والحدیث فی الفائق (۲/۲۲۸) وغریب ابی عبید (۱/۲۰۷) وایضاً الفتح الکبیر للنبهانی (۳/۲۷۹)

لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے۔ اور لِـقَـاءٌ (مصدر) ملاقات کے ہم معنی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَائَنَا﴾ (۲۵۔۲۱) اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔

﴿اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴾ (۸۴۔۶) اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا﴾ (۳۲۔۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قیامت کے دن اور حشر ونشر کو بھلا رکھا تھا اور ﴿يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ (۴۰۔۱۵) سے قیامت کا دن مراد ہے اور قیامت کے دن کو يَوْمَ التَّلَاقِ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس روز سب سے اگلے اور پچھلے یا اہل سماء اور اہل ارض ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں گے۔ نیز اس روز ہر شخص اپنے اعمال کے نتائج کو پالے گا۔ لَقِيَ فُلَانٌ خَيْرًا اَوْ شَرًّا فلاں نے خیر یا شر کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الویل)

(۳۹۸) فَمَنْ يَّلْقَ خَيْرًا يَّحْمَدِ النَّاسُ اَمْرَهٗ

جو شخص خیر کو پالیتا ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔

(۳۹۹) وَتَلْقَى السَّمَاحَةَ مِنْهُ وَالنَّدٰى خُلُقًا

سخاوت اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔

لَقَّيْتُهٗ بِكَذَا: میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے پہنچا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلَامًا﴾ (۲۵۔۷۵) اور وہاں ان کا استقبال دعا وسلام کے ساتھ کیا جائے گا۔

﴿وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) اور تازگی اور شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تَلَقَّاهُ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۱۔۱۰۳) اور فرشتے ان کو لینے آئیں گے۔

﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ﴾ (۲۷۔۶) اور تم کو قرآن عطا کیا جاتا ہے۔

اَلْاِبْقَاءُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا کے ہیں کہ وہ دوسرے کو سامنے نظر آئے پھر عرف میں مطلق کسی چیز کو پھینک دینے پر القاء کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ﴾ (۲۰۔۸۷) اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا۔

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ قَالَ اَلْقُوْا﴾ (۷۔۱۱۵۔۱۱۶) تو جادوگروں نے کہا کہ موسیٰ یا تو تم جادو کی چیز ڈالو یا ہم ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو۔

﴿قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى فَاَلْقٰهَا﴾ (۲۰۔۱۹) فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام اسے ڈال دو تو انہوں نے اس کو ڈال دیا۔

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲۰۔۳۹) تو دریا اس کو کنارے پر ڈال دے گا۔

﴿اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا﴾ (۶۷۔۷) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔

---

[1] قاله المرقش الاصغر وتمامه: ومن يغول لا يعدم على الغي لائما۔ وقد مرتخريجه، في (غ و ی)

﴿كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ﴾ (۶۷۔۸) جب اس میں ......کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔اور آیت: ﴿وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ﴾ (۸۴۔۴) اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔اور بالکل خالی ہو جائے گی۔دوسری آیت۔ ﴿وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ﴾ (۸۲۔۴) اور جب قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی۔ کے ہم معنی ہے۔ اَلْقَيْتُ اِلَيْكَ قَوْلًا وَّسَلَامًا وَكَلَامًا وَّمَوَدَّةً کے معنی ہیں۔تجھ سے کوئی بات کی یا سلام و کلام کیا یا دوستی بڑھائی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰۔۱) تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔ ﴿فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ﴾ (۱۶۔۸۶) تو وہ ان سے کہیں گے۔

﴿وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (۷۳۔۵) ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔ میں وحی اور نبوت کے اس بوجھ کی طرف اشارہ ہے۔جو آپ پر ڈالا گیا تھا۔اور آیت کریمہ: ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (۵۰۔۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔ میں اِلْقَاءِ سَمْع سے کان لگا کر سننا مراد ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا﴾ (۲۰۔۷۰) تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ میں فعل مجہول لا کر اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کو دیکھ کر وہ سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔اور انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

(لَمْ) (حرف)

لَمْ ۔کے بعد اگرچہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا﴾ (۲۶۔۱۸) کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ (۹۳۔۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔۔بے شک دی)

(لَمَّا) (حرف)

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لیے جیسے فرمایا:

﴿وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ (۳۔۱۴۲) حالانکہ ابھی خدا نے تم میں جہاد کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں۔

اور کبھی یہ اسم ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اور یہ قرآن پاک میں بکثرت آیا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ﴾ (۱۲۔۹۶) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔

(ل م م)

لَمَمْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو جمع کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں۔اسی سے لممت شعثہ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کی پراگندہ حالت کو سنوارنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اللمم کے اصل معنی معصیت کے قریب جانے کے ہیں کبھی اس سے صغیرہ گناہ بھی مراد لیے جاتے ہیں محاورہ ہے:

فَلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا لَمَمًا: وہ کبھی کبھار یہ کام کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳۔۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

میں لَمَمٌ کا لفظ اَلْمَمْتُ بِكَذَا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کے قریب جانا کے ہیں یعنی ارادہ کرنا مگر مرتکب نہ ہونا۔ نیز محاورہ ہے۔

زِيَارَتُهٗ اِلْمَامٌ: یعنی اس کی زیارت مختصر ہوتی ہے۔

(ل م ح)

اَللَّمْحُ کے معنی بجلی کی چمک کے ہیں۔ محاورہ ہے۔

رَأَيْتُ لَمْحَةَ الْبَرْقِ میں نے اسے بجلی کی چمک کی طرح ایک جھلک دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ (۵۴۔۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ اور محاورہ ہے:

لَاُرِيَنَّكَ لَمْحًا بَاصِرًا: میں تمہیں صاف طور پر دکھلا دوں گا۔ تم پر حقیقت کھول دوں گا۔

(ل م ز)

لَمَزَهٗ (ض ن) لَمَزًا کے معنی کسی کی غیبت کرنا۔ اس پر عیب چینی کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

لَمَزَهٗ يَلْمِزُهٗ وَيَلْمُزُهٗ: یعنی یہ باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ﴾ (۹۔۵۸) اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ تقسیم صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ......﴾ (۹۔۷۹) جو رضا کارانہ خیر خیرات کرنے والوں پر طنز و طعن کرتے ہیں۔ ....

﴿وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۴۹۔۱۱) اور اپنے (مومن بھائیوں) پر عیب نہ لگاؤ۔

یعنی دوسروں پر عیب نہ لگاؤ ورنہ وہ تم پر عیب لگائیں گے۔ اسی طرح گویا تم اپنے آپ پر عیب لگاتے ہو۔

رَجُلٌ لَّمَّازٌ وَلُمَزَةٌ: بہت زیادہ عیب جوئی اور طعن وطنز کرنے والا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

(ل م س)

اَللَّمْسُ (ن) مَسٌّ کی طرح اس کے معنی بھی اعضاء کی بالائی کھال کے ساتھ کسی چیز کو چھو کر اس کا ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مطلق کسی چیز کی طلب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (مجزو الوافر)

(۴۰۰) اَلمِسُهٗ فَلَا اَجِدُهٗ

میں اسے تلاش کرتا ہوں مگر وہ ملتا نہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾ (۷۲۔۸) اور یہ کہ ہم نے

---

[1] قاله اعرابی في رثاء ابن له فی ستة وهذا خامسه وصدره الام على تبكيه والبيت فى الحماسة المرزوقی ۳۰۲ واللسان (لمس) والبيت من شواهد الكشاف ۱۳۷ وبعده: وكيف يلام محزون كبير فاته ولده۔

آسمان کو ٹٹولا۔

اور لَمْسٌ اور مُلَامَسَۃ کے معنی کنایۃً جماع کے بھی آتے ہیں۔اور آیت کریمہ:

﴿اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ (۵۔۶) یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو۔

میں ایک قراءت لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ بھی ہے اس لئے بعض نے اس سے مطلق ہاتھ لگانا اور بعض نے مجامعت کرنا مراد لیا ہے ❶ اور حدیث میں ہے ❷ (۱۱۲) ((انه نهى عن الملامسة)) کہ آنحضرتؐ نے بیع مُلَامَسَۃ سے منع فرمایا۔اور بیع ملامسة کی صورت یہ ہے کہ بائع یا مشتری دوسرے سے کہے کہ جب ہم سے کوئی دوسرے کا کپڑا چھولے گا تو بیع واجب ہوجائے گی۔

الماسة: معمولی حاجت۔

(ل ھ ب)

اَللَّھَبُ: آگ کا شعلہ۔قرآن پاک میں ہے:﴿وَلَا یُغْنِی مِنَ اللَّھَبِ﴾ (۷۷۔۳۱) اور نہ لپٹ سے بچائے گا۔

﴿سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ﴾ (۱۱۱۔۳) وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں جلے گا۔

اَللَّھِیْبُ: شعلہ۔اور لَھَبٌ کا لفظ دھوئیں اور غبار پر بھی بولا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ﴾ (۱۱۱۔۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔

میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابولہب کے لفظ سے اس کی کنیت...... مراد نہیں ہے۔جس کے ساتھ وہ مشہور تھا۔بلکہ اس سے اس کے دوزخی ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے لہٰذا یہاں اس نام سے اسے موسوم کرنا ایسے ہی ہے۔جیسا کہ لڑائی بھڑکانے والے اور ہمیشہ لڑنے والے کو اَبُو الْحَرْبِ یا اَخُو الْحَرْبِ کہا جاتا ہے۔فَرَسٌ مُلْھِبٌ: برق رفتار گھوڑا گویا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔اس سے اُلْھُوْبٌ ہے جس کے معنی سخت دوڑ کے ہیں۔

اَللُّھَابُ: پیاس کی شدت،اندرونی سوزش جو پیاس کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے۔

(ل ھ ث)

لَھِثَ (س) یَلْھَثُ لَھَثًا: سخت پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا۔

ابن درید کہتے ہیں ❸ کہ لَھَثٌ کا لفظ درماندگی اور پیاس دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْھَثْ اَوْ

---

❶ ذهب الى الاول عمر بن الخطاب وابن مسعود والشعبى وعطاء واختاره الشافعى والى الثانى على وابن عباس ومجاهد والسدى وقتادة واختاره ابو حنيفة وابوعلى الجبائى من المعتزلة وفى الطبرسى (۱۱۳/۵): قصة العرب والسـ[illegible] واختلافهم فى معنى الآية فقال ابن عباس غلبت الموالى المراد به الجماع ورجحه الطبرسى من الامامية۔

❷ متفق عليه من حديث ابى سعيد وعن انس فى البخارى وعن ابى هريرة رضى الله عنه فى النسائى ومسلم وله ثلاث صور و ما ذكره المؤلف منقول عن الزهرى وابى هريرة قال فى الفتح و تفسير ابى هريرة اقعد انظر النيل (۱۵۹۔۱۶۰)

❸ هو ابوبكر محمد بن الحسن بن وريد الحماغى صاحب الجمهرة فى اللغة ولد ۲۲۳ھ وتوفى ۳۲۱ انظر لتراجمه الفهرست ابن نديم (۹۷۔۹۸) وبغية الوطاة للسيوطى (۳۳۰) وامالى القالى (۲۷۹/۲) وكشف الظنون (۱۹۸۰/۲) لكتابه (الجمهرة عدة نسخ والصحة هى نسخة عبيد الله بن عبدالله ۱۲۔

﴿تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ (۷۔۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہوگی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔

(ل ھ م)

اَلْاِلْهَامُ: (افعال) کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا کے ہیں۔لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القاء کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے کسی کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (۹۱۔۸) پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے) کی سمجھ دی۔

اور اس کو لَمَّةُ الْمَلَكِ يَانَفْثٌ فِي الرَّوْعِ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:❶ (۱۱۳) ((اِنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً وَّلِلشَّيْطَانِ لَمَّةٌ)) کہ ایک لمۃ فرشتے کا ہے اور ایک لَمَّة شیطان کا ہے۔اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا ❷: (۱۱۴) ((اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ)) کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بت ڈال دی۔

اصل میں یہ اِلْتِهَامُ الشَّيْءِ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی کسی چیز کو نگل جانا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: اِلْتَهَمَ الْفَصِيْلُ مَا فِي الضَّرْعِ۔کہ اونٹنی کے بچے نے تھنوں سے تمام دودھ چوس لیا۔فَرَسٌ لَهُمٌ: تیز رو گھوڑا۔گویا وہ اپنی تیز روی سے زمین کو نگل رہا ہے۔

(ل ھ و)

اَللَّهْوُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے یہ لَهَوْتُ بِكَذَا اولَهَيْتُ عَنْ كَذَا سے اسم ہے جس کے معنی کسی مقصد سے ہٹ کر بے سود کام میں لگ جانا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ (۵۷۔۲۰) جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشا ہے۔

پھر ہر وہ چیز جس سے کچھ لذت اور فائدہ حاصل ہو اسے بھی لَهْوٌ کہہ دیا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ﴾ (۲۱۔۱۷) اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو ہم اپنے پاس سے بنالیتے۔

اور جن مفسرین نے یہاں لَهْوٌ سے مراد عورت یا اولاد لی ہے انہوں نے دنیاوی آرائش کی بعض چیزوں کی تخصیص کی ہے جو لہو ولعب بنالی گئی ہیں ❸ محاورہ ہے:

اَلْهَاهُ كَذَا: یعنی اسے فلاں چیز نے اہم کام سے مشغول کر دیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲۔۱) لوگو! تم کو کثرت مال و جاہ واولاد کی خواہش نے غافل کر دیا۔﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۲۴۔۳۷) یعنی ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت۔

اس آیت سے تجارت کی ممانعت یا کراہت بیان کرنا

---

❶ زوائد ابن حبان رقم (٤٠) من حديث عبدالله ١٢۔

❷ رواه البيهقي وفي شرح السنة راجع لتخريجه (روع)

❸ قاله قتادة والحسن: اللهوا المرءة وقال ابن عباس رضى الله عنه هو الولد راجع الطبرى والدر وفى الروح لكن حمله على العموم اولى (١٩/١٧) قارن المشكل للقبتى (١٢٣ ـ ١٢٤)۔

مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں پروانہ وار مشغول ہو کر نماز اور دیگر عبادات سے غافل ہونے کی مذمت کی طرف اشارہ ہے نفس تجارت کو قرآن پاک نے فائدہ مند اور فضل الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۲۲۔۲۸) تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۲۔۱۹۸) اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ﴾ (۲۱۔۳) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دل غافل ہو کر بیکار کاموں میں مشغول ہیں۔

اَللَّهْوَةُ: آٹا پیتے وقت چکی میں ایک مرتبہ جتنی مقدار میں غلہ ڈالا جائے۔ اسے لَهْوَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع لِهَاءٌ آتی ہے۔ پھر تشبیہ کے طور پر عطیہ کو بھی لَهْوَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

اَللَّهَاةُ: (حلق کا کوا) وہ گوشت جو حلق میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی منہ کا آخری سرا بھی کیے ہیں۔

(ل و ح)

اَللَّوْحُ: تختہ (کشتی وغیرہ کا) اس کی جمع الواح ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ﴾ (۵۴۔۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

اور لوح لکڑی وغیرہ کی اس تختی کو بھی کہتے ہیں جس پر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (۸۵۔۲۲) لوح محفوظ میں۔ میں لوح محفوظ کی اصل کیفیت کو ہم اسی قدر جان سکتے ہیں جو احادیث میں مروی ہے اس کو دوسری آیت میں کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (۲۲۔۷۰) بے شک یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ کسب خدا کو آسان ہے۔

اَللَّوْحُ کے معنی پیاس کے ہیں۔ اور جس چوپایہ کو جلدی پیاس لگتی ہو اسے دَابَّةٌ مِلْوَاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور لوح (ضمہ لام کے ساتھ) آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھی کہتے ہیں لیکن اکثر علمائے لغت کے نزدیک فتحہ لام کے ساتھ بمعنی پیاس کے ہے اور ضمہ لام کے ساتھ زمین و آسمان کے درمیانی خلا کے معنی میں آتا ہے گو اس میں فتح لام بھی جائز ہے۔

لَوَّحَهُ الْحَرُّ: اسے گرمی نے جھلس دیا۔

لَاحَ الْحَرُّ لَوْحًا گرمی فضا میں پھیل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَمَحَ کی طرح ہے اور اَلَاحَ بِسَيْفِهٖ کے معنی ہیں اس نے تلوار سے اشارہ کیا۔

(ل و ذ)

لَاوَذَ (مفاعلہ) بِكَذَا لِوَاذًا وَمُلَاوَذَةً کے معنی کسی چیز کی آڑ لینا اور اس کے پیچھے چھپ جانا ہیں۔ پس آیت کریمہ:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴۔۶۳) کے معنی یہ نہیں کہ خدا کو وہ لوگ خوب معلوم

ہیں جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لے کر یکے بعد دیگر کھسک کر نکل جاتے ہیں اور یہاں لِــوَاذًا لَاوَذَ (مفاعلہ) کا مصدر ہے کیونکہ اگر یہ لَاذَ (ن) کا مصدر ہوتا تو لِیَــــاذًا (بالیاء) آنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ لَاذَ لِیَاذًا کہا جاتا ہے۔ اَللَّوْذُ: پہاڑ کا کنارہ۔

(ل و ط)

لُــوْطٌ: (حضرت لوط علیہ السلام) یہ اسم علم ہے اور لَاطَ الشَّیْءُ بِقَلْبِی یَلُوْطُ لَوْطًا وَلَیْطًا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی محبت دل میں جاگزیں اور پیوست ہو جانے کے ہیں۔ حدیث میں ہے [1] (۱۱۵) ((اَلْــوَلَـدُ اَلْوَطُ بِالْکَبِدِ)) کہ اولاد سے جگری محبت ہوتی ہے۔

هٰــذَا اَمْــرٌ لَا یَلْتَاطُ بِصَفَرِیْ: یہ بات میرے دل کو نہیں کھاتی۔

لُطْتُّ الْحَوْضَ بِالطِّیْنِ لَوْطًا: میں نے حوض پر کہگل کی۔ گارے سے پلستر کیا...... حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے اشتقاق کر کے تَــلَــوَّطَ فُــلَانٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے [2] جس کے معنی خلاف فطرت فعل کرنا ہیں حالانکہ حضرت لوط علیہ السلام تو اس فعل سے منع کرتے تھے اور اسے قوم لوط سے مشتق نہیں کیا گیا جو اس کا ارتکاب کرتے تھے۔

(ل و م)

لُــمْتُہٗ: (ن) لَــوْمًا کے معنی کسی کو برے فعل کے ارتکاب پر برا بھلا کہنے اور ملامت کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ﴾ (۱۴۔۲۲) تو آج مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

﴿فَــذٰلِــکُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْہِ﴾ (۱۲۔۳۲) یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔

﴿وَ لَا یَــخَــافُـوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (۵۔۵۴) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

اور مَــلُــوْمٌ (ملامت کیا ہوا) صفت مفعولی ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَــاِنَّهُــمْ غَیْــرُ مَــلُوْمِیْنَ﴾ (۲۳۔۶) ان سے مباشرت کرنے میں انہیں ملامت نہیں ہے۔ میں تنبیہ کی ہے کہ جب ان پر ملامت ہی نہیں ہے۔ تو اس سے زیادہ سرزنش کے وہ بالاولیٰ مستحق نہیں ہیں۔

اَلَامَ: مستحق ملامت ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنَبَذْنَاهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ﴾ (۵۱۔۴۰) تو ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ کام ہی قابل ملامت کرتا تھا۔

اَلتَّلَاوُمُ: ایک دوسرے کو ملامت کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ﴾ (۶۸۔۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۷۵۔۲) اور نفس لوامہ کی قسم۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے۔ کہ نفس لوامہ سے مراد نفس ہے جس نے کچھ فضائل حاصل کر لیے ہوں اور کسی غلطی کے ارتکاب پر صاحب نفس کو ملامت کرے۔ اس لحاظ سے لوامہ کا درجہ مطمئنہ سے کم ہوگا بعض نے کہا

---

[1] حدیث ابی بکر فی الجامع الکبیر مسند ابی بکر رقم (۵۳۴) والفائق (۴۷۹/۲) وغریب ابی عبید (۲۲۲/۳) والحدیث ذکره الماوردی فی ادبہ ص (۲۶۳)۔

[2] ولا یخفی ان الکلمة قبیحة لان فیہ نسبة السوء فالاولی ماورد وفی الحدیث عمل قوم لوط فلیستعمل ھذہ۔

ہے کہ نفس لوامہ اس نفس کو کہتے ہیں۔ جو بذات خود مطمئن ہو۔ علاوہ ازیں اس میں دوسروں کو تادیب کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی ہو۔ اس لحاظ سے یہ نفس مطمئنہ سے افضل ہوگا رَجُلٌ لَوَّمَةٌ: وہ شخص جو دوسروں کو ملامت کرے مگر لَـوْمَةٌ (بسکون واؤ) وہ ہے جسے لوگ ملامت کرتے ہوں۔

جیسا کہ سُخَرَةٌ وَسُخْرَةٌ اور هُـزَءَةٌ وَ هُزْءَةٌ میں فرق پایا جاتا ہے

اَللَّوْمَةُ: کے معنی ملامت کے ہیں۔ اور لَائِمَةٌ اس فعل کو کہتے ہیں۔ جس کا ارتکاب کرنے پر انسان قابل ملامت سمجھا جائے

(ل و ن)

اَلـلَّوْنُ: کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے رنگ پر بولا جاتا ہے۔ تَـلَـوَّنَ کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ مِنَ الْجِبَـالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا﴾ (۳۵۔۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ (۳۰۔۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔ میں اختلاف الوان سے انواع واقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس سے خدا کی وسیع قدرت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع واقسام مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَتـى بِـالْاَلْوَانِ مِـنَ الْاَحَـادِيْـثِ اس نے رنگا رنگ کی باتیں کیں اور اَلْوَانٌ مِنَ الطَّعَامِ سے مراد ہیں قسم قسم کے کھانے۔

(ل و ی)

لَوَىٰ (ض) اَلْجَبْلَ يَلْوِيْهِ لَيًّا کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ لَـوىٰ يَـدَهٗ: اس کے ہاتھ کو موڑا لَـوَىٰ رَأْسَـهٗ وَبِـرَاسِـهٖ اس نے اپنا سر پھیر لیا یعنی اعراض کیا [1]۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ﴾ (۶۳۔۵) تو سر پھیر لیتے ہیں لَوَىٰ لِسَانَهٗ بِكَذَا: کنایہ ہوتا ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو کی باتیں بنانے سے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَـلْـوُنَ اَلْسِنَتَهُـمْ بِـالْـكِتٰبِ﴾ (۳۔۷۸) کتاب (توراۃ) کو زبان موڑ موڑ کر پڑھتے ہیں۔

﴿لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ﴾ (۴۔۴۶) زبان کو موڑ کر۔

محاورہ ہے:۔ فُـلَانٌ لَا يَلْوِيْ عَلٰى اَحَدٍ: وہ کسی کی طرف گردن موڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ سخت ہزیمت کھا کر بھاگ اٹھنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِذْ تُـصْـعِـدُوْنَ وَ لَا تَـلْـوُنَ عَـلٰـى اَحَدٍ﴾ (۳۔۱۵۳) جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے۔ اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ شاعر نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے [2] (الکامل)

---

[1] ومنه قوله تعالىٰ: ﴿وان تلوا وتعرضوا﴾ (٤۔١٣٥)

[2] قـالـه حسان بن ثابت يعير به الحارث بن هشام حيث فريوم بدر عن اخيه ابى جهل و قبله: ان كنت كاذبة الذى حدثتنى فـنـجـوت منجى الحارث بن هشام والبيت من كلمة فى ديوانه (٩٥ و ٢١٥) و(طبعه وار صاوں) والسيرة (٣٨٣/٣) ←

(۴۰۱) تَرَكَ الْاَحِبَّة ان تُقَاتِلَ دُوْنَهٗ
وَنَجَابِرَ أْسِ طِمِرَّةٍ وَثَّابِ

اور اس نے دوستوں کے ورے لڑنا چھوڑ دیا اور چھلانگیں بھر کر دوڑنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔

اَللِّوَاءُ: جھنڈے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ اَللَّوِيَّةُ وہ کھانا جو لپیٹ کر توشہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔

لَوٰى مَدِيْنَهٗ: اپنے مقروض کو ڈھیل دینا۔

اَلْوٰى: ٹیلے کے لوی یعنی موڑ پر پہنچنا۔

(لو)

لَوْ (حرف) بعض نے کہا ہے کہ یہ اِمْتِنَاعُ الشَّيْءِ لِاِمْتِنَاعِ غَيْرِه کے لیے آتا ہے (یعنی ایک چیز کا دوسری کے امتناع کے سبب ناممکن ہونا) اور معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْ﴾ (۱۷-۱۰۰) کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے۔

(لولا)

لَوْلَا (حرف) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا ممتنع ہونا۔ اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لَوْلَا کا جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْلَا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۴-۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی هَلَّا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد متصلا فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا: تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔ وغیرہ ذالك من الامثلة۔

(ل ی ت)

لَاتَهٗ (ض) عَنْ كَذَا لَيْتًا: کے معنی اسے کسی چیز سے پھیر دینا اور ہٹا دینا ہیں۔ نیز لَاتَهٗ وَاَلَاتَهٗ کسی کا حق کم کرنا پورا نہ دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ (۴۹-۱۴) تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور اس کے اصلی معنی رَدُّ اللِّيْتِ یعنی گردن کے پہلو کو پھیرنے کے ہیں۔

لَيْتَ: یہ حرف طمع و تمنی ہے یعنی گذشتہ کوتاہی پر اظہار تاسف کے لیے آتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿يَاوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾ (۲۵-۲۸) کہے گا کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا ﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا﴾ (۷۸-۴۰) اور کافر کہے گا اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ ﴿يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ (۲۵-۲۷) کہے گا اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رستہ

← و السهيلي (۲: ۱۱۰) والمحاضرات للمؤلف (۳: ۱۸۶) واعجاز القرآن للباقلاني (۱۰۴) (دارالمعارف ۱۹٦٤) والبحر (۵: ۱۵۸/۳: ۲۹۱) والعقد (۱: ۱۷۰) والعيون (۱: ۱۲۹) والصناعتين ۲۰۸ فى بحث الاستطر ادمع اعتزار الحارث وقال فيه: وهذا اول من اعتذر من هزيمة رويت عن العرب و البيت ايضا فى المحبر لابن حبيب (۲۰۵) والجز فى الفاضل (۵۲) والاصابة رقم (۱۵۰٤) فى ترجمة الحارث بن هشام واسد الغابة (۱: ۳۵۱) وفى روايتهم ولجام وفى المطبوع وثاب والطمزه الفرس الجواد ويستعار للاتان ويروي البيت ايضا لحماس بن قيس بن خالد البكرى ۱۲۔

اختیار کیا ہوتا۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الرجز)

(۴۰۲) وَلَیْلَۃٍ ذَاتِ دُجًی سَرَیْتُ
وَلَمْ یَلِتْنِی عَنْ ھَوَاھَا لَیْتُ

بہت سی تاریک راتوں میں میں نے سفر کیے۔ لیکن مجھے کوئی پر خطر مرحلہ بھی محبوب کی محبت سے دل برداشتہ نہ کر سکا (کہ میں کہتا کاش میں نے محبت نہ کی ہوتی)۔

یہاں لَیْتَ اسم معرب اور لَـمْ یَلِتْ کا فاعل ہے اور یہ قَوْلِیْ لَیْتَہٗ کَانَ کَذَا کی تاویل میں ہے۔

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے [2] (الخفیف)

(۴۰۳) اِنَّ لَیْتًا وَّاِنَّ لَوًّ اعَنَاءٌ

کہ لَیْتَ یا لَوْ کہنا سراسر باعث تکلف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے شعر میں لیت مصدر بمعنی لَائِـتٌ یعنی اسم فاعل ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھے اس کی محبت سے کوئی چیز نہ پھیر سکی۔

(ل ی ل)

لَیْـلٌ وَّلَیْـلَۃٌ کے معنی رات کے ہیں۔ اس کی جمع لَیَـالٍ وَلَیَـائِلُ وَلَیْـلَاتٌ آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لَیْـلٌ اَلْیَلُ وَلَیْلَۃٌ لَیْـلَاءُ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لَیْلَۃٌ اصل میں لَیْلَاۃٌ ہے کیونکہ اس کی تصغیر لُیَیْلَۃٌ اور جمع لَیَـالٍ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّـآ اَنْزَلْنٰـهُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ﴾ (۹۷۔۱) ہم نے اس قرآن پاک کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

﴿وَ سَـخَّـرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ﴾ (۱۴۔۳۳) اور رات، دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

﴿وَالَّیْـلِ اِذَا یَغْشٰی﴾ (۹۲۔۱) رات کی قسم جب ان پر چھا جائے۔

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿وَلَیَالٍ عَشْرٍ﴾ (۸۹۔۲) اور دس راتوں کی۔

﴿ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ (۱۹۔۱۰) برابر تین راتیں (دن)

(ل ی ن)

اَلـلِّیْنُ کے معنی نرمی کے ہیں اور یہ خشونت کی ضد ہے اصل میں تو یہ اجسام کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر استعارہ اخلاق وغیرہ یعنی معانی کے لیے بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ فُـلَانٌ لَیِّنٌ یا خَشِنٌ کے معنی ہیں: فلاں نرم یا درشت مزاج ہے۔ اور یہ دونوں لفظ حسب موقع ومحل

---

[1] قاله الراجز ابو محمد الحری الفقعی وفی لسان العرب ندی بدل وجی فلفظة لیت " ھھنا اسم ای لم یلتنی عن سراھا ان اتندم فاقول لیتنی ماسر یتھا وقیل لیت مصدر موضع اسم بمعنی صارف والشطران فی اللسان (لیت، سری) والقالی (۲ : ۴۲) فی تسعة ابیات والطبری (۲۰۱۵/۲۶ : ۴۳) ونسبھا الطبری وابوحیان فی البحر (۸ : ۱۰۴) ویعقوب فی اصلاحه ۱۳۶ وابن خالویه فی اعرابه ۴۷ الی روبه من العجاج ونسبه صاحب الحاشیة الی الوھم وھو الحق کما فی الالی والرجز ایضا فی شرح دیوان الحطیئة للسکری (۳۶)۔

[2] قاله ابو زبید الطائی یصف حال الحیوان عند اشتداد الھجیر واوله: لیت شعری: واین منی لیت...... والبیت فی اللسان (امالا) والبحر (۱ : ۳۶۲) والکتاب (۲ : ۳۲) والخفاجی ۴۹ والفتح لابن حجر (۱۶ : ۳۵۳) باب مایجوز من اللو والشطر فی الصناعتین ۷۷ ومحاضرات المؤلف ۲/۴۵۵ وفی الوسیط بعده ثلاثة اخری وصدر البیت فی البلد ان (رسم برام) من قصیدة قالھا ابو قطیفة عمرو بن الولید بن عقبة بن ابی معیط فی حنین الی المدینة حین نفاه عبدالله بن الزبیر فلحق بالشام لکن فیه عجزه اعلی العھد یلبن خیر ام فی عشرة ابیات ویلین غدیر لمدینة ۱۲۔

کبھی مدح کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی مذمت کے لیے آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ (۳۔۱۵۹) (اے محمدؐ) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد و مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۳۹۔۲۳) پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل نرم ہو کر خدا کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ کہ اباء اور انکار کے بعد وہ حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ﴾ (۵۹۔۵) مومنو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے۔ میں لِيْنَة کے معنی نرم و نازک کھجور کا درخت ہیں......اور یہ فِعْلَة کے وزن پر ہے جیسے حِنْطَةٌ۔تاہم یہ مختلف انواع میں سے ایک نوع کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

❀❀❀

كِتَابُ المِيم

(ما)

یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسمی اور حرفی۔ پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہٰذا کل دس قسمیں ہیں (۱) ما اسمی ہو تو واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پھر لفظاً مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنی جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما[1] کبھی بمعنی اَلَّذِیْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔ ﴿وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ﴾ (۱۰۔۱۸) اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں تو یہاں مَا کی طرف یَضُرُّھُمْ میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ اس کے بعد معنی جمع کی مناسبت سے ھٰٓؤُلَاءِ شُفَعَآءُ نَا عِنْدَاللّٰہِ آ گیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِكُ لَھُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں روزی دینے کا ذرہ بھی اختیار نہیں رکھتے، میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:۔

﴿بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِہٖٓ اِیْمَانُكُمْ﴾ (۲۔۹۳) کہ تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں۔ اور کبھی (۲) نکرہ ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِہٖ﴾ (۴۔۵۸) بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔

تو یہاں نِعِمَّا بمعنی نِعْمَ شَیْئًا ہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَنِعِمَّا ھِیَ﴾ (۲۔۳۵) تو وہ بھی خوب ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَھَا﴾ (۲۔۲۶) کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی۔

میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما نکرہ بمعنی شَیْئًا ہو اور (۳) یہ بھی کہ مَا صلہ ہو اور اس کا مَا بعد یعنی بَعُوْضَةً مفعول ہو[1] اور نظم کلام دراصل یوں ہو۔ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا بَعُوْضَةً۔

اور کبھی (۴) اِسْتِفْھَامِیَه ہوتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کسی چیز کی نوع یا جنس سے سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور اعیان کے متعلق سوال کے لیے بھی آجاتا ہے۔

بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُھُمْ﴾ (۲۳۔۶) مگر ان ہی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں۔

[1] تنسب العلامة الالوسی ھذا الاحتمال الی صاحب البحر (۱/۱۹۰)

اور آیت کریمہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۲۹۔۴۲) جس چیز کو خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ خدا اسے جانتا ہے۔

میں خلیل نے کہا ہے کہ مَا تَدْعُوْنَ میں ما استفہامیہ ہے اَیْ اَیُّ شَيْءٍ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور انہوں نے یہ تکلف اس لیے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتدا کلام میں واقع ہوتا ہے اور مـا بعد کے متعلق استفہام کے لیے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ﴾ الایة (۳۵۔۲) خدا جو اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اور مثال مَا تَضْرِبْ اَضْرِبْ میں ہے۔

اور کبھی (۵) تعجب کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (۲۔۱۷۵) یہ (آتش) جہنم کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔

مـا (۶) حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے اول (۱) یہ کہ اس کا مابعد بمنزلہ مصدر کے ہو۔ جیسا کہ فعل مستقبل پر اَن ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (۲۔۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تو یہاں ما رزق بمعنی رزق مصدر کے ہے اور اس ما کے بمعنی ان مصدر یہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظاً یا تقدیراً ضمیر نہیں لوٹتی۔ اور آیت کریمہ:

﴿بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾ (۲۔۱۰) اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب۔ میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔

اسی طرح اَتَانِي الْقَوْمُ مَا عَدَا زَيْدًا میں بھی ما مصدر یہ ہے اور تقدیر ظرف کی صورت میں بھی ما مصدر یہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلَّمَآ اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں۔ خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا﴾ (۱۷۔۹۷) جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے) کے لیے اور بھڑکا دیں گے اور آیت کریمہ:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۵۔۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو۔ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما مصدر یہ ہو اور یہ بھی کہ مـا موصولہ بمعنی اَلَّذِيْ ہو۔

یاد رکھو کہ مَـا اپنے مابعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسمی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے۔ پس یہ اُرِيْدُ اَنْ اَخْرُجَ میں اَنْ کی طرح ہوتا ہے جس طرح اَنْ کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد عائد (ضمیر) نہیں آتی۔

دوم (۲) ما نافیہ ہے۔ اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ (۱۲۔۳۱) یہ آدمی نہیں ہے۔

تیسرا (۳) ما کافہ ہے جو اِنَّ وَاَخَوَاتُهَا اور رُبَّ کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (۳۵۔۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

﴿اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ (۲۔۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ کرلیں۔

کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ گویا موت کی طرف دھکیلے جارہے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۱۵۔۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے۔

میں بھی مَا کافہ ہی ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ قَلَّمَا اور لَمَّا میں بھی ما کافہ ہوتا ہے۔

چہارم (۴) ما مُسَلِّطَة یعنی وہ ما جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل بنا کر ما بعد پر مسلط کر دیتا ہے جیسا کہ اِذْ مَا وَحَیْثُمَا کا مَا ہے کہ ماکے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر عاملہ تھے۔لیکن ترکیب کے بعد اسمائے شرط کا سا عمل کرتے ہیں۔اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔جیسے حَیْثُمَا تَقْعُدْ اَقْعُدْ وغیرہ۔

پانچواں (۵) ما زائدہ ہے۔جو محض پہلے لفظ کی توکید کے لیے آتا ہے۔جیسے اِذَا مَا فَعَلْتَ کَذَا (جب تم ایسا کرو) اِمَّا تَخْرُجُ اَخْرُجْ (اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی نکلوں گا۔قرآن پاک میں ہے۔﴿فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا﴾ (۱۹۔۲۶) اگر تم کسی آدمی کو دیکھو۔

﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ﴾ (۱۷۔۲۳) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

(م ی ء)

اَلْمِائَةُ: (سو) یہ اصول اعداد میں تیسری اکائی کا نام ہے۔کیونکہ اصول اعداد چار ہیں۔آحاد، عشرات، مئات اور اُلُوف...... قرآن پاک میں ہے:﴿فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ﴾ (۸۔۶۶) پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے۔

﴿وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ (۸۔۶۵) اور اگر سو (ایسے) ہوں گے تو ہزاروں پر غالب رہیں گے۔اور مائۃ کا آخری حرف یعنی لام کلمہ محذوف ہے۔

اَمْاَیْتُ الدَّرَاھِمَ فَاَمْاَتْ ھِیَ بمعنی میں نے دراہم کو سو کیا تو وہ سو ہو گئے۔

(م ی د)

اَلْمَیْدُ: زمین کی طرح کی کسی بڑی چیز کا مضطرب ہونا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اَنْ تَمِیْدَبِکُمْ﴾ (۱۶۔۱۵) کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے۔

﴿اَنْ تَمِیْدَبِھِمْ﴾ (۲۱۔۳۱) تاکہ لوگوں (کے بوجھ سے ہلنے اور جھکنے) نہ لگے۔

مَادَتِ الْاَغْصَانُ تَمِیْدُ: شاخوں کا مضطرب ہونا بعض نے کہا ہے کہ شاعر کے کلام ❶ ()

❶ قالہ ابن احمر (ابو الخطاب عمرو بن احمر بن العمرو الباھلی القیسی المتوفی فی خلافة عثمان قبل سنة ۳۵ھ راجع الخزانہ (۳: ۳۸) واولہ...... وصادفت والبیت فی اللسان والصحاح (مید)

(۴۱۷) نَعِیْمًا وَمَیْدَانًا مِّنَ الْعَیْشِ اَخْضَرًا (نعمتیں اور سرسبز لہلہاتی ہوئی زندگی) میں بھی مَیْدَانًا مَادَتِ الْاَغْصَانُ سے ہے اور اس کے معنی کشادہ زندگی کے ہیں اور اسی سے میدان الدابۃ ہے جس کے معنی جانور کے کھلے میدان میں پھرنے کے ہیں۔

اَلْمَائِدَۃُ اصل میں اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اور ہر ایک پر یعنی کھانے اور خالی خوان پر انفراداً بھی مَائِدَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ مَادَنِیْ یَمِیْدُنِیْ سے ہے جس کے معنی کھانا کھلانے کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی رات کا کھانا کھلانا بھی کیے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے کھانا طلب کیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ علم کے لیے دعا کی تھی۔ اور علم کو مَائِدَہ سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ علم روح کی غذا بنتا ہے جیسا کہ طعام بدن کے لیے غذا ہوتا ہے۔

(م ی ر)

اَلْمِیْرَۃُ: غلہ جو انسان کھانے کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اور مَارَ اَھْلَہٗ یَمِیْرُھُمْ کے معنی اہل وعیال کے لیے غلہ لانے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ نَمِیْرُ اَھْلَنَا﴾ (۱۲۔۶۵) اب ہم اپنے اہل وعیال کے لیے پھر غلہ لائیں گے۔

اور خِیْرَۃٌ اور مِیْرَۃٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں۔

(م ی ز)

اَلْمِیْزُ وَالتَّمْیِیْزُ کے معنی متشابہ اشیاء کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے ہیں۔ اور مَازَہٗ یَمِیْزُہٗ وَمَیَّزَہٗ تَمْیِیْزًا دونوں ہم معنی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ﴾ (۸۔۳۷) تاکہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔ اور ایک قرأت میں لِیُمَیِّزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ ہے۔ اَلتَّمْیِیْزُ کے معنی الگ کرنا بھی آتے ہیں اور اس ذہنی قوت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان معانی کا استنباط کرتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَّا تَمْیِیْزُ لَہٗ: فلاں میں قوت تمیز نہیں ہے۔

اِنْمَازَ اور اِمْتَازَ کے معنی الگ ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَامْتَازُوا الْیَوْمَ﴾ (۳۶۔۵۹) اور آج الگ ہو جاؤ۔ اور تَمَیَّزَ کَذَا (تفعل) مَازَ کا مطاوع آتا ہے اور اس کے معنی الگ اور منقطع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ﴾ (۶۷۔۸) گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی۔

(م ی ل)

اَلْمَیْلُ: اس کے معنی وسط سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کبھی ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو بدل میں پیدائشی کجی کو مَیَلٌ (بفتح الیاء) اور عارضی کجی کو مَیْلٌ (بسکون الیاء) کہتے ہیں۔ اور مِلْتُ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ﴾ (۴۔۱۲۹) تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ۔
مِلْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر حملہ کرنے کے ہیں۔جیسے فرمایا ہے:
﴿فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً﴾ (۴۔۱۰۲) تو تم پر یکبارگی حملہ کردیں۔
اور اَلْمَالُ کو مال اس لیے کہا جاتا ہے۔کہ وہ ہمیشہ مائل اور زائل ہوتا رہتا ہے۔ بدیں وجہ اسے عرض بھی کہتے ہیں۔اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ مال کی مثال ایک پیشہ ور عورت کی ہے جو کبھی عَطَّار اور کبھی بَيْطَار کے گھر ہوتی ہے۔

(م ی ہ)

اَلْمَاءُ۔ کے معنی پانی کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَىْءٍ حَيٍّ﴾ (۲۱۔۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔
﴿مَاۤءً طَهُوْرًا﴾ (۲۵۔۴۸) پاک (اور نتھرا ہوا) پانی۔
اور محاورہ ہے۔
مَاءُ بَنِیْ فُلَانٍ: فلاں قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی۔
مَاءٌ اصل میں مَوَہٌ ہے۔کیونکہ اس کی جمع اَمْوَاہٌ اور مِيَاہٌ آتی ہے۔اور تصغیر مُوَيْهٌ پھر ہا کو حذف کر کے واؤ کو الف سے تبدیل کرلیا گیا ہے۔رَجُلٌ مَاهُ الْقَلْبِ: پانی دل۔یعنی بزدل آدمی۔ یہاں ماہ موہ سے بنا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ رَجُلٌ قَاهٌ کی طرح ہے۔یعنی ہا ہمزہ سے مبدل ہے۔مَاهَتِ الرَّكِيَّةُ تَمِيْهُ وَتَمَاهُ: کنویں میں پانی بڑھ گیا۔بِئْرٌ مَيِّهَةٌ وَّمَاهَةٌ وَمَيْهَةٌ زیادہ پانی والا کنواں۔

اَمَاهَ الرَّجُلُ وَاَمْهٰى (کنواں کھودتے ہوئے) پانی تک پہنچ گیا۔

(م ت ع)

اَلْمُتُوْعُ کے معنی کسی چیز کا بڑھنا اور بلند ہونا کے ہیں۔
جیسے مَتَعَ النَّهَارُ: (دن بلند ہوگیا)۔
مَتَعَ النَّبَاتُ: (پودا بڑھ کر بلند ہوگیا) اَلْمَتَاعُ: عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانا۔محاورہ ہے۔
مَتَّعَهُ اللّٰهُ بِكَذَا وَاَمْتَعَهٗ: اللہ اسے دیر تک فائدہ اٹھانے کا موقع دے۔تَمَتَّعَ بِهٖ: اس نے عرصہ دراز تک اس سے فائدہ اٹھایا۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۱۰۔۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔
﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا﴾ (۳۱۔۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔
﴿فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا﴾ (۲۔۱۲۶) میں اس کو بھی کسی قدر متمتع کروں گا۔
﴿سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (۱۱۔۴۸) ان کو ہم (دنیا کے فوائد سے) محفوظ کریں گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے عذاب الیم پہنچے گا۔ اور قرآن پاک میں جہاں کہیں دنیاوی سازوسامان کے متعلق تَمَتَّعُوْا آیا ہے تو اس سے تہدید مراد ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ عیش کوشی اور وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں اور اِسْتَمْتَعَ کے معنی کسی چیز سے نفع حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔
﴿رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ (۶۔۱۲۸) اے

ہمارے پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

﴿فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ﴾ (۹۔۶۹) وہ اپنے حصے سے بہرہ یاب ہو چکے۔ سو جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے کا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اسی طرح تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (۲۱۔۳۶) اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا (مقرر کر دیا گیا ہے)

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر انسان کو دنیا میں ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اور پھر آیہ کریمہ: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ (۴۔۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔ میں متاع دنیا کو قلیل کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اخروی ثواب کے مقابلہ میں دنیا کا ساز وسامان بے وقعت ہے اور نا قابل اعتناء جیسا کہ آیت ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (۹۔۳۸) دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں اور آیت:۔

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ (۱۳۔۲۶) سے واضح ہوتا ہے اور خانگی ضروریات کی چیزوں کو بھی متاع کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ﴾ (۱۳۔۱۷) زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے...... اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔

نیز ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے۔ اسے مَتَاعٌ وَّمُتْعَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کریمہ:۔

﴿وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ﴾ (۱۲۔۶۵) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

میں غلہ کو متاع کہا ہے۔ اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لیے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۴۱) اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیے۔ میں متاع بمعنی متعہ ہے اور متعہ سے یہاں وہ نان ونفقہ مراد ہے جو عورت کو طلاق دینے کے بعد شوہر سے ملتا ہے تا کہ عدت طلاق پوری ہونے تک وہ گذر بسر کر سکے۔ اور اَمْتَعَ وَمَتَّعَ کے معنی متعہ دینے کے ہیں۔ مگر قرآن پاک میں اس معنی کے لیے صرف مَتَّعَ یعنی تفعیل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (۳۳۔۴۹) تو ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر...... رخصت کر دو۔ ﴿قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (۲۔۲۳۶) ہاں ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔

مُتْعَةُ النِّكَاحِ (یعنی نکاح متعہ) کی صورت یہ ہے کہ مرد کسی عورت کو کچھ مال دے کر متعین عرصہ کے لیے اس سے نکاح کر لے۔ پھر جب وہ مدت گذر جائے تو وہ

عورت بغیر طلاق کے خاوند سے الگ ہو جاتی ہے اور حج کے ساتھ عمرہ کرنے کو مُتْعَةُ الْحَجِّ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۶) تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔

شَرَابٌ مَاتِعٌ: بعض نے اس کے معنی سرخ شراب" کیے ہیں لیکن اصل میں مَاتِعٌ ہر عمدہ اور اعلیٰ شراب کو کہتے ہیں۔ گو شراب کا سرخ ہونا بھی اس کی عمدگی کی ایک علامت ہے مگر مَاتِعٌ کا لفظ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

جَمَلٌ مَاتِعٌ: قوی اونٹ [1] (اور مَاتِعٌ کے معنی راجح اور زائدہ بھی آجاتے ہیں چنانچہ شاعر کے شعر۔

(۴۰۴) وَمِيْزَانُهٗ فِيْ سُوْرَةِ الْبِرِّ مَاتِعٌ

(اس کا ترازو نیکیوں سے جھکا ہوا ہے)

میں مَاتِع معنی راجح اور زائد ہی کے ہیں۔

(م ت ن)

اَلْمَتْنَان: پیٹھ کے دونوں حصے جو ریڑھ کی ہڈی کے اردگرد ہوتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو المتن کہتے ہیں۔

مَتَنْتُهٗ: کسی کی پیٹھ پر مارنا مَتُنَ مضبوط پشت والا ہونا اور مضبوط پشت والے آدمی کو مَتِيْنٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے حَبْلٌ مَّتِيْنٌ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (۵۱۔۵۸) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

(م ت ی)

مَتٰى: یہ اسم استفہام ہے اور کسی کام کا وقت دریافت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ (۳۶۔۴۸) یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ ﴿مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ﴾ (۳۲۔۲۸) یہ فیصلہ کب ہوگا؟

کہتے ہیں کہ بنی ہذیل، جَعَلْتُهٗ مَتٰى كُمِّيْ (میں نے اسے اپنے آستین کے وسط میں ڈال لیا) کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابو ذویب (الہذلی) نے کہا ہے [3] (الکامل)

(۴۰۵) شَرِبْنَ بِمَاءِ الْبَحْرِ ثُمَّ تَرَفَّعَتْ
مَتٰى لُجَجٍ خُضْرٍ لَّهُنَّ نَئِيْجُ

---

[1] کذا فی الصلب والصواب حبل بدل جمل کما فی المعاجم۔

[2] قالہ النابغۃ الذبیانی واولہ الی خیر دین سنۃ قد علمتہ والبیت فی اللسان (متع) وفی روایۃ المحمدبدل البروالشطر ایضا فی ملحق دیوانہ۔

[3] وفی دیوان الھذلیین تروت بدل شربن وعلی حبشیات بدل لجج خضر والضمیر فی شر بن یعود الی حناتم سود فی البیت قبلہ سقی ام عمرو کل آخر لیلۃ۔ حناتم سود ماء ھن ثجیج، والمراد بھا السحاب والبیت فی الطبری (۲۹: ۲۰۷) وادب الکاتب (۵۱۷) واللسان (متی) وشرح شواھد المغنی للسیوطی (۱۰۹) والاقتضاب (۴۴۷) والجوالیقی (۳۶۷) ودیوان الھذلیین (۱: ۵۱) وفی روایتہ) اختلاف یسیر وفی الصاجی (۱۷۵) غیر منسوب وفی مشکل القرآن (۴۳۰) (بحث الباء مکان من) والخزانۃ (۳: ۹۳۔۹۵) والبیت ایضا فی الطبرسی (۲۹: ۱۴۵)۔

انہوں نے سمندر سے پانی پیا پھر سمندر کے گہرے کنڈوں سے بلند ہوئیں اور گرجتے ہوئے تیز رفتاری سے چل پڑیں۔

(م ث ل)

مَثُلَ (ک) اَلشَّیْءُ مُثُوْلًا: کے معنی کسی چیز کا سیدھا کھڑا رہنا یا دوسری چیز کی شکل وصورت اختیار کر لینا کے ہیں۔اسی سے حدیث میں ہے [1] (۱۱۲)

((مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) کہ جوشخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے کھڑے رہیں۔تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔

اَلْمُمَثَّلُ: وہ چیز جو کسی نمونہ کے مطابق بنائی گئی ہو۔

اَلتِّمْثَالُ: تصویر۔کسی چیز کا مجسمہ [2] تَمَثَّلَ کَذَا: کسی کی شکل بن جانا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَمَثَّلَ لَهَابَشَرًا سَوِیًّا﴾ (۱۹۔۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی شکل) بن گیا۔

اَلْمَثَلُ کے معنی ہیں: ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہوجاتا ہو۔اور معاملہ کی شکل سامنے آجاتی ہو۔مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لیے اَلصَّیْفَ ضَیَّعْتِ اللَّبَنَ کا محاورہ ضرب المثل ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (۵۹۔۲۱) اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں۔اور دوسرے مقام پر ﴿وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ (۵۹۔۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔فرمایا ہے:۔

مَثَلٌ وَمِثْلٌ دونوں ہم معنی ہیں جیسے شَبَهٌ وَشِبْهٌ وَنَقَضٌ وَنِقْضٌ وغیرہ۔اور یہ دوطرح استعمال ہوتا ہے ایک بمعنی وصف جیسے فرمایا ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۱۳۔۳۵) یعنی جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

اور دوم مشابہ کے معنی میں آتا ہے اور ہر قسم کی مشابہت کو شامل ہوتا ہے یعنی عربی میں جو الفاظ بھی مشابہ کے معنی میں آئے ہیں سب سے زیادہ عام ہوتا ہے مثلاً نِدٌّ صرف اس مشابہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ اس کے جوہر میں شریک ہو اور شِبْهٌ کا لفظ دوسرے کے ساتھ صرف کیفیت میں شرکت کو ظاہر کرتا ہے اور مساوی اسے کہتے ہیں جو صرف کمیت میں دوسرے کے برابر ہو اسی طرح مشَکْلٌ کا لفظ صرف اندازہ اور پیمائش کے لحاظ سے مشابہت پر بولا جاتا ہے اس بنا پر اللہ تعالیٰ سے من کل الوجوہ تشبیہ کی نفی کرنے کے لیے قرآن پاک نے مثل کا لفظ استعمال کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (۴۲۔۱۱) اس جیسی کوئی چیز نہیں۔اب رہا یہ سوال کہ اگر یہاں مثل بمعنی مشابہ ہے تو پھر کاف تشبیہ کیوں لایا گیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ ان

---

[1] وفی روایة ان تمثل قال الحافظ فی تخریجه لم اجده هکذا وفی السنن، من حدیث معاویة من سره ان یتمثل له الناس قیاما فلیتبوء مقعده من النّار انظر ایضاً تخریج الاحیاء للعراقی (۲/۵۰۲) فی غریب ابی عبید من حدیث البراء راجع الکافی (ص۱۴۲ رقم ۳۰۷) والفائق (۳/۷) والنهایة (۴/۸۲)

[2] وجمعه تماثیل کما فی قوله تعالیٰ: (۲۱۔۵۲) (۳۴۔۱۳)

دونوں کو تاکید نفی کی غرض سے یکجا لایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مثل کا استعمال صحیح ہے اور نہ ہی کاف کا اس لیے یکبارگی دونوں کی نفی کر دی ہے۔

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (۱۳۔۳۵) جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مثل بمعنی صفت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی طرح کسی کی صفت نہی ہے یعنی گو ذاتِ باری تعالیٰ بھی بہت سی ان صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان متصف ہوتا ہے لیکن ان صفات کے وہ معنی نہیں ہیں جو بشر میں لیے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی﴾ (۱۶۔۶۰) جو لوگ آخرت پر ایمان نہں رکھتے انہی کے لیے بری باتیں (شایاں) ہیں۔ اور خدا کو صفت اعلیٰ زیب دیتی ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ نہایت بری صفات کے مالک ہیں۔ اور باری تعالیٰ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ (۱۶۔۷۴) تو (لوگو) خدا کے بارے میں (غلط مثالیں پیش نہ کرو)۔

میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے امثال بیان کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ پھر اس خود ہی اس کے بعد آیت:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا﴾ (۱۶۔۷۵) الآیۃ۔ خدا ایک (اور) مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے...... میں اپنی ذات کے لیے مثال بھی بیان فرما دی ہے۔ مگر ان میں تعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مثال کے بیان کرنے کے بعد آخر میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہہ کر یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بشری صفات میں سے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت بیان نہیں کر سکتے۔ بلکہ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کی ہیں بیان کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ......﴾ (۶۲۔۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی...... ان کی مثال، کے معنی یہ ہیں کہ یہود تورات میں بیان کردہ حقائق کے مفہوم سے اس گدھے کی طرح جاہل ہیں جس کی پشت پر علم وحکمت کی بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ﴾ (۷۔۱۷۶) اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی ہے۔ کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے۔ اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔ میں اس شخص کو ہوائے نفسانی کی اتباع اور ہر وقت اس کی تکمیل کے درپے رہنے میں اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ہر حالت میں زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ اور کسی حالت میں بھی زبان نکال کر ہانپنا نہیں چھوڑتا اور آیت کریمہ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ الآیۃ (۲۔۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس نے (شب تاریک میں) آگ جلائی...... میں اس شخص کو جسے اللہ تعالیٰ نے ایک گونہ ہدایت اور اس کے لیے صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہو۔ اور ابدی انعامات کے حاصل کرنے کے لیے انہیں ذریعہ نہ

بنایا ہو۔ اسے اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جس نے تاریکی میں آگ سلگائی ہو لیکن جب اس نے اس کے لیے آس پاس کو روشن کر دیا تو اس نے وہ روشنی ضائع کر دی ہو اور وہ...... دوبارہ اندھیرے میں چلا گیا ہو اور آیت کریمہ:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ میں اس شخص کو جسے ہدایت کی طرف دعوت دی گئی ہو۔ بکریوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر الفاظ کے باہم مقابلہ اور بسط کلام کے بجائے معنوی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کفار کو ہدایت کی طرف دعوت دینے والے شخص اور کفار کی مثال اس چرواہے اور بکریوں کی سی ہے جو انہیں بلانے کے لیے چیختا ہو۔ لیکن وہ اس کے بلانے اور پکارنے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتیں اور اسی طرح آیات۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲۔۲۶۱) جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے۔ جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو سو دانہ ہو۔

﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ﴾ (۳۔۱۱۷) یہ جو مال دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو۔ میں بھی مثل بمعنی مثال کے ہے۔

اَلْمِثَالُ: (۱) ایک چیز کا اس کی نظیر سے مقابلہ کرنا یا (۲) نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

اَلْمُثْلَةُ: عبرت ناک سزا جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کر کے ارتکاب جرم سے رک جائیں یہی معنی نَكَالٌ کے ہیں۔ اس کی جمع مَثُلَاتٌ و مَثْلَاتٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ (۱۳۔۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب واقع ہو چکے ہیں۔ میں ایک قرأت اَلْمَثْلَاتُ (سکون ثاء) بھی مروی ہے۔ جیسا کہ عَضُدٌ وَ عَضْدٌ میں اور اَمْثَلَ السُّلْطَانُ فُلَانًا کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ نے فلاں کو عبرت ناک سزا دی۔

اَلْاَمْثَلُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو نفوس فاضلہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو اور اقرب الی الخیر ہو اور کنایہ کے طور پر برگزیدہ لوگوں کو اَمَاثِلُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا﴾ (۲۰۔۱۰۴) جب کہ اس وقت ان میں سب سے اچھی راہ والا (یعنی عاقل و ہوشمند) کہے گا کہ نہیں بلکہ ایک ہی روز ٹھہرے ہو۔

میں بھی امثل اسی معنی پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾ (۲۰۔۶۳) اور تمہارے شائستہ ترین مذہب کو نابود کر دیں۔

میں مُثْلٰے کا مذکر اَمْثَلُ ہے۔ یعنی وہ راستہ جو دوسروں سے بہتر ہو۔

(م ج د)

مَجَدَ یَمْجُدُ مَجْدًا وَمَجَادَۃً کے معنی کرم و شرف اور بزرگی میں وسعت اور پہنائی کے ہیں یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اونٹوں کا کسی وسیع اور زیادہ چارہ والی چراگاہ میں پہنچ جانا...... اور اَمْجَدَھَا الرَّاعِیُ کے معنی ہیں چرواہے کا اونٹوں کو بڑی وسیع چراگاہ میں لے جانا عرب لوگ کہتے ہیں [1] فِیْ کُلِّ شَجَرٍ نَارٌ وَاسْتَمْجَدَ الْمَرْخُ وَالْعَفَارُ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار درخت میں تو بہت زیادہ آگ پائی جاتی ہے۔ المجید اسمائے حسنٰی میں سے ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنے فضل و کرم خصوصی سے نوازنے میں نہایت وسعت اور فراخی سے کام لینے والی ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ﴾ (۸۵۔۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔

میں ذات باری تعالیٰ کا اَلْمَجِیْدُ کے ساتھ متصف ہونا اس کے وسعتِ فیض اور کثرتِ جُود کے سبب سے ہی ہے ایک قرأت میں اَلْمَجِیْدِ کسرہ دال کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہوگی اور جلالت قدر اور عظمت شان کے لحاظ سے عرش کو اَلْمَجِیْدِ کہا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے [2] (۱۱۷)

((مَا الْکُرْسی فی جَنب العرش الا کحلقة ملقاة فی ارض فلاة)) کہ عرش کے مقالہ میں کرسی کی حیثیت بیاباں میں پڑی ہوئی ایک انگوٹھی کی ہے اور اسی مفہوم کے پیش نظر آیت کریمہ: ﴿لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ﴾ (۲۳۔۱۱۶) میں عرش کو الکریم کہا ہے۔ قرآن پاک کی صفت میں بھی اَلْمَجِیْد آیا ہے کیونکہ قرآن پاک بھی تمام دنیوی اور اخروی مکارم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جلیل القدر کتاب ہے چنانچہ فرمایا:

﴿قٓ . وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ﴾ (۵۰۔۱) قرآن مجید کی قسم ہے۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ﴾ (۸۵۔۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔

اور قرآن پاک کے عظیم الشان اور مکارم دارین کی تعلیمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ آیت بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اَلتَّمْجِیْدُ: بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی تمجید کے معنی اس کی صفات حسنہ بیان کرنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی تمجید کے معنی اس پر فضل و کرم کرنے کے ہوتے ہیں۔

(م ح ص)

اَلْمَحْصُ کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں۔ یہ فَحْصٌ کے ہم معنی ہے مگر فَحْصٌ کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیزوں سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل جائیں لیکن درحقیقت اس سے منفصل ہوں۔ مگر مُحْصٌ کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو کسی سے الگ کرنے کے لیے آتا ہے۔ جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہوں...... چنانچہ محاورہ ہے۔

---

[1] المثل فی المیدانی (۲۷۵۲) واللسان (مجد) والمخصص (۲۷/۱۱) والخزانة (۱:۱۵۹) (۲:۸۶) (۴:۴۶) بولاق (والحیوان ۴/۴۶۶) وامالی المرتضی (۲/۲۹) والمثل یضرب فی تفضیل بعض الشیء علی بعض۔

[2] اخرجه ابن جریر وابو الشیخ فی العظمة وابن مردویه والبیهقی عن ابیؒ ذر الغفاری (شوکانی)

مَحَصْتُ الذَّھَبَ وَمَحَّصْتُہٗ: سونے کو آگ میں گلا کر اس کی کھوٹ کر الگ کردیا۔

چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَ لِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۳۔۱۴۱) اور یہ بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص مومن بنادے۔

﴿وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (۳۔۱۵۴) اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کردے۔

میں دلوں کے پاک کرنے پر تمحیص کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ تَزْکِیَۃٌ وَتَطْھِیْرٌ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں چنانچہ دعا کرتے وقت کہا جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوْبَنَا: اے اللہ! ہمارے گناہوں کو جو ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں دور کردے۔

مَحَصَ الثَّوْبُ: کپڑے کا رواں استعمال سے گھس گیا اور اس کی تازگی چلی گئی۔

مَحَصَ الْحَبْلُ یَمْحَصُ: رسی پرانی ہوگئی۔ اور اس کا رواں صاف ہوگیا۔ مَحَصَ الصَّبِیُّ: بچہ (طاقت ور ہوکر) دوڑنے لگا۔

(م ح ق)

اَلْمَحْقُ کے معنی گھٹنے اور کم ہونے کے ہیں اور اسی سے اَلْمِحَاقُ قمری مہینہ کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا۔ اِنْمَحَقَ وَامْتَحَقَ کے معنی کم ہونا اور مٹ جانا ہیں اور مَحَقَہٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے اور اس سے برکت کو ختم کردینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ﴾ (۲۔۲۷۶) خدا سود کو نابود (یعنی بے برکت کرتا) اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔

﴿وَ یَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۳۔۱۴۱) اور کافروں کو نابود کردے۔

(م ح ل)

مَحَلَ (ن) بِہٖ مَحْلًا وَمِحَالًا کے معنی کسی کے خلاف بری تدبیر کرنے کے ہیں چنانچہ آیت: ﴿وَ ھُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳۔۱۳) جس کے معنی ''عقوبت کے ساتھ سختی سے گرفت کرنے والا کے ہیں'' میں بعض کے نزدیک یہ مَحَلَ بِہٖ کے محاورہ سے ہی مشتق ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اَلْمِحَالُ میں میم زیادہ ہے اور یہ دراصل اَلْحَوْل اور اَلْحِیْلَۃ سے مشتق ہے۔ [1]

ابوزید نے کہا ہے کہ مَحَلَ الزَّمَانُ کے معنی قحط سالی ہونا کے ہیں اور قحط زدہ علاقہ کو مَکَانٌ مَاحِلٌ وَمُتَمَاحِلٌ کہتے ہیں اور اَمْحَلَتِ الْاَرْضُ کے معنی بارش نہ ہونے کی وجہ سے ملک میں قحط ہونے کے ہیں۔ نیز اَلْمَحَالَۃُ پیٹھ کے مہرہ کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع اَلْمَحَالُ ہے اور جو دودھ خراب اور ترش ہوجائے اسے مُمْحِلٌ کہا جاتا ہے۔ مَاحَلَ عَنْہُ کے معنی کسی کی طرف سے جھگڑنے کے ہیں اور مَحَلَ بِہٖ اِلَی السُّلْطَان کے معنی بادشاہ کے پاس کسی چغلی کھانے کے ہیں اور ایک حدیث ہے

---

[1] قالہ القبتی فی غریبہ (۲۲۶) وفی اللسان: قال ابو منصور الازھری قول القتیبی غلط فاحش لان المیم اذا کانت زائدۃ فی "مفعل" یجیء باظھار (الواو والیاء مثل مزود ومحول ومحور و ماشاء کلھا ومثل ھذا النقد ذکر ایضا فی القرطبی (۹/۲۹۹) ولعلہ اخذ من قول قتادۃ: شدید المحال ای شدید الحیلۃ وعن عباس رضی اللہ عنہ ای شدید الحول انظر الطبری (۱۳/۱۲۶۔۱۲۸)۔

❶ (۱۱۸) اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الْقُرْآنَ مَا حِلًا بِنَا اے اللہ! قرآن کو ہمارے عیوب ظاہر کرنے والا نہ بنا کہ تیرے سامنے ہماری بدعملیوں کی شکایت کرے۔

(م ح ن)

اَلْمَحْنُ وَالْاِمْتِحَانُ کے معنی آزمانے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَامْتَحِنُوْھُنَّ﴾ (۶۰۔۱۰) تو انکی آزمائش کرو۔ اور اِمْتِحَانٌ اور اِبْتِلَاءٌ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں چنانچہ قرآن پاک نے ایک مقام پر:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ (۴۹۔۳) خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزمالیے ہیں۔ کہا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا﴾ (۸۔۱۷) اس سے غرض تھی کہ مومنوں کو...... اچھی طرح آزمالے۔ فرمایا ہے اور یہاں بَلَاءٌ اور اِمْتِحَانٌ کا وہی مفہوم ہے جو کہ آیت:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ الایة (۳۳۔۳۳) اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل دور کردے۔ میں جس کے دور کرنے کا معنی ہے۔

(م ح و)

اَلْمَحْوُ (ن) کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان کو زائل کرنا اور مٹا دینا کے ہیں۔ اسی سے بادشمالی مَحْوَةُ کہا جاتا ہے۔ ❷ کیونکہ وہ بادل کے آثار اور نشانات کو مٹا دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ﴾ (۱۳۔۳۹) خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔

(م خ ر)

مَخَرَ الْمَاءُ الْاَرْضَ: پانی کا زمین کو چیرنا اور اسمیں چکر لگانا۔ محاورہ ہے۔

مَخَرَتِ السَّفِیْنَةُ مَخْرًا وَمُخُوْرًا: کشتی کا اپنے سینہ سے پانی کو چیرنا اور سمندر چیر کر چلنے والی کشتی کو سَفِیْنَةٌ مَاخِرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع مَوَاخِرُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ﴾ (۱۶۔۱۴) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

اِسْتَمْخَرْتُ الرِّیْحَ وَامْتَخَرْتُھَا: میں ہوا کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ حدیث میں ہے ❸۔

(۱۱۹) ((اِسْتَمْخِرُوا الرِّیْحَ وَاَعِدُّ وَالنَّبْلَ)) (رفع حاجت کے وقت) ہوا کی طرف پشت کر کے بیٹھو اور استنجا کے لیے پتھر ساتھ لے جاؤ۔

---

❶ وفی الکشاف "ولا تجعله ماحلا مصدقا" وفی ابن حبان عن جابر والحاکم عن معقل بن یسار والطبرانی عن انس وابو عبید فی فضائل القرآن "القرآن شافع ومشفع وماحل ومصدق" راجع الکافی ۲۲۸ وکنز العمال رقم (۲۳۷ و ۲۳۶) والفائق (۲ ۲۳۸) موقوفا علی ابن مسعود وقد مر الحدیث فی (ش ف ع) ۱۲

❷ ای غیر مصروفة لکونها علما للشمال انظر الذیل للقالی ٦ وفی السمط (٥۔٦) هذا (تفسیر محوة) قول الاصمعی وتبعه، المبرد فی الکامل (٤٦٣) و قد انکره علی بن حمزة فی التنبیهات علی اغالیط الرواة علیها ۱۲۔

❸ الحدیث فی عب عن سراقة بن مالك مرفوعا انظر کنز العمال (۹ رقم ۳۰۷۔ ۳۰۸) وفی النهایة واللسان (مخر) والفائق (۲/۲۳۹) قال والنبل حجارة الاستنجاء والحدیث فی مجمع البحار (۳/۲۸۵) قال والمراو ههنا من الاستمخار الاستد بارویاتی بمعنی الاستقبال ایضا ۱۲۔

اَلْـمَـاخَـوْرُ: شراب کی دوکان۔وہ جگہ جہاں شراب فروخت ہوتی ہو۔بَـنَـاتُ مَخْرٍ: سفید ابر،موسم گرما میں اٹھنے والی بدلیاں۔

(م د د)

اَلْـمَـدُّ کے اصل معنی (لمبائی میں) کھینچنے اور بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مُدَّۃٌ کہتے ہیں اور مِـدَّۃُ الْجَرْحِ کے معنی زخم کا گندہ مواد کے ہیں۔مَدُّ النَّهْرِ: دریا کا چڑھاؤ۔مَدَّہٗ نَهْرٌ اٰخَرُ۔دوسرا دریا اس کا معاون بن گیا۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَـمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (۲۵۔۴۵) تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر کے پھیلا دیتا ہے۔

مَـدَدْتُ عَيْنِيْ اِلٰى كَذَا: کسی کی طرف حریصانہ...... اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ﴾ الآیة (۱۵۔۸۸) تم...... للچائی نظروں سے نہ دیکھنا۔

مَدَدْتُهٗ فِيْ غَيِّهٖ: گمراہی پر مہلت دینا اور فوراً گرفت نہ کرنا۔

مَـدَدْتُ الْاِبِـلَ: اونٹ کو مدید پلایا۔اور مدید اس بیج اور آٹے کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو۔

اَمْـدَدْتُ الْـجَيْشَ بِمَدَدٍ: لشکر مدد دینا۔کمک بھیجنا۔

اَمْـمَـدَدْتُ الْاِنْسَـانَ بِطَعَامٍ: کسی کی طعام (غلہ) سے مدد کرنا۔

قرآن پاک میں عموماً اَمَدَّ (افعال) اچھی چیز کے لیے اور مَدٌّ (ثلاثی مجرد) بری چیز کے لیے استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَاَمْـدَدْنٰـاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم ان کو عطا کریں گے۔(۵۲۔۲۲)

﴿اَيَـحْسَبُـوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (۲۳۔۵۵) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

﴿وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (۱۷۔۱۲) اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

﴿يُـمْـدِدْكُـمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ﴾ (۳۔۱۲۵) تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیجے گا۔

﴿اَتُمِدُّوْنَنِيْ بِمَالٍ﴾ (۲۷۔۳۶) کیا تم مجھے مال سے مدد دینا چاہتے ہو۔

﴿وَ نَـمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ (۱۹۔۷۹) اور اس کے لیے (آہستہ) عذاب بڑھاتے جاتے ہیں۔﴿وَ يَـمُـدُّ هُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت اور سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿وَ اِخْـوَانُهُـمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ﴾ (۷۔۲۰۲) اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچے جاتے ہیں۔لیکن آیت کریمہ:

﴿وَّ الْبَـحْـرُ يَـمُـدُّهٗ مِـنْ بَـعْـدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ﴾ (۳۱۔۲۷) اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو اور سات سمندر اور (روشنائی ہو جائیں) میں يَـمُدُّهٗ کا صیغہ مَدَّہٗ نَهْرٌ اٰخَرُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔اور یہ اِمْدَادٌ یا مَدٌّ سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتے ہیں بلکہ یہ مَـدَدْتُ الـدَّوَاۃَ اَمُـدُّهَا کے محاورہ

سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (۱۸۔۱۰۹) اگر چہ ہم ویسا اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔

میں بھی مدد سے مِدَادٌ یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔

اَلْمُدُّ: غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔

(م د ن)

اَلْمَدِیْنَۃُ: بعض کے نزدیک یہ فَعِیْلَۃٌ کے وزن پر ہے اس کی جمع مُدُنٌ آتی ہے [1]۔ اور مَدَنْتُ مَدِیْنَۃٌ کے معنی شہر آباد ہونے کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں میم زیادہ (یعنی دین سے مشتق ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ (۹۔۱۰۱) اور بعض مدینے والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔

﴿وَجَآءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِیْنَةِ﴾ (۳۶۔۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی...... آیا۔ ﴿وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ﴾ (۲۸۔۱۵) اور وہ شہر میں داخل ہوئے۔

(م ر ر)

اَلْمُرُوْرُ کے معنی کسی چیز کے پاس سے گذر جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو باہم آنکھوں سے اشارہ کرتے۔

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (۲۵۔۷۲) اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ نیز آیت کریمہ میں اس بات پر بھی متنبہ کیا ہے کہ اگر انہیں بیہودہ بات کہنے پر مجبور بھی کیا جائے تو کنایہ سے بات کرتے ہیں اور لغویات سن کر اس سے بہرے بن جاتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اعراض کر لیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَآ﴾ (۱۰۔۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں (تو بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گذر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ میں مَرَّ بمعنی اَعْرَضَ ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ (۱۷۔۸۳) اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو روگردان ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ اور بٹی ہوئی رسی کو مَرِیْرٌ یا مُمَرٌّ کہا جاتا ہے اس سے فُلَانٌ ذُوْمِرَّةٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی طاقت ور اور توانا کے ہیں۔ [2]

قرآن پاک میں ہے: ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ (۵۳۔۶) طاقتور نے۔ مَرَّ الشَّیْءُ وَاَمَرَّ: کسی چیز کا تلخ ہونا۔ اسی سے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ مَا یُمِرُّ وَمَا یُحْلِیْ: کہ فلان نہ تو کڑوا ہے اور نہ میٹھا، یعنی نہ تو اس سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی

---

[1] وایضا؟

[2] ومنه فی الحدیث لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی اخرجه النسائی وابن ماجة من حدیث ابی هریرة والفائق (۲/۲۴۴)۔

نقصان اور آیت کریمہ:

﴿حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ (۷۔۱۸۹) (تو) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

میں مَرَّتْ بمعنی اِسْتَمَرَّتْ ہے۔ یعنی وہ اسے اٹھائے چلتی پھرتی رہتی ہے۔

مَرَّةٌ (فَعْلَة) ایک بار مَرَّتَانِ (تثنیہ) دو بار قرآن پاک میں ہے:

﴿يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِىْ كُلِّ مَرَّةٍ﴾ (۸۔۵۶) پھر ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔ ❶

﴿وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۹۔۱۳) اور انہوں نے تم سے پہلی بار (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔

﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾ (۹۔۸۰) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بخشش طلب فرمائیں۔ ﴿اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۹۔۸۳) تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر رضامند ہوگئے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ﴾ (۹۔۱۰۱) ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے۔

﴿ثَلٰثَ مَرّٰتٍ﴾ (۲۴۔۵۸) تین دفعہ (یعنی تین اوقات میں)۔

(م ر ج)

اصل میں اَلْمَرَجُ کے معنی خلط ملط کرنے اور ملا دینے کے ہیں اور اَلْمُرُوْجُ کے معنی اختلاط اور مل جانے کے۔

مَرِجَ اَمْرُهُمْ: ان کا معاملہ ملتبس ہوگیا۔

مَرِجَ الْخَاتَمُ فِىْ اَصْبُعِىْ: انگوٹھی انگلی میں ڈھیلی ہوگئی مَارِجٌ (صفت فاعلی) ڈھیلی انگوٹھی۔ اَمْرٌ مَرِيْجٌ گڈمڈ اور پیچیدہ معاملہ۔ غُصْنٌ مَّرِيْجٌ: باہم گتھی ہوئی ٹہنی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَهُمْ فِىْ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ﴾ (سو یہ) ایک غیر واضح معاملہ میں ہیں۔

اَلْمَرْجَانُ: مونگا۔ چھوٹا موتی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ (۵۵۔۵۸) اور آیت کریمہ:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ﴾ (۵۵۔۱۹) اس نے دو دریا رواں کئے جو آپس میں ملتے ہیں۔

میں مَرَجٌ کا لفظ مَرَجَ ❷ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور جس زمین میں گھاس بکثرت ہو اور جانور اس میں مگن ہوکر چرتے رہیں اسے مَرَجٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵۔۱۵) آگ کے شعلے سے۔ میں مَارِجٌ کے معنی آگ کے (دھوئیں سے) مخلوط شعلے کے ہیں۔

اَمْرَجْتُ الدَّابَّةَ فِى الْمَرْعٰى: میں نے جانور کو چراگاہ میں کھلا چھوڑ دیا چنانچہ وہ آزادی سے چرتا رہا۔

(م ر ح)

اَلْمَرَحُ کے معنی ہیں: بہت زیادہ اور شدت کی خوشی جس میں انسان اترانے لگ جائے، قرآن پاک میں ہے:

---

❶ وفی المطبوع "فی کل عام مرة" زلة من المصحح وھی آیة اخری: یفتنون فی کل عام مرة او مرتین۔ (۹۔۲۶) ۱۲۔

❷ وفی الطبعة الاولی کان ھھنا بیاض وفی الطبعة الحلبیه (تحقیق وضبط محمد سعید کیلانی) من قولھم مرج ولم یترك الفراغ فخلط علی خلط والصواب من قولھم مرج الدابة اذا اخلاھا فی المرج ترعی (راجع الغریب للقبتی ۴۳۸) وفی اللسان وھذا لایقوله الا اھل تھامة واما النحویون فیقولون امرجته ۱۲۔

﴿وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (۱۷۔۳۷) اور زمین پر اکڑ کر (اور اٹھلا کر) مت چل۔
اس میں ایک قرأت مَرِحًا بمعنی فَرِحًا بھی ہے۔
مَرْحَی: یہ کلمہ تعجب ہے (اور اَحْسَنْتَ یا اَصَبْتَ کی جگہ استعمال ہوتا ہے) یعنی خوب کیا کہنے ہیں!۔

(م ر د)

اَلْمَارِدُ وَالْمَرِیْدُ: جنوں اور انسانوں سے اس شیطان کو کہا جاتا ہے جو ہر قسم کی خیر سے عاری ہو چکا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ﴾ (۳۷۔۷) اور ہر شیطان سرکش سے اس کی حفاظت کے لیے۔
یہ شَجَرٌ اَمْرَدُ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں: وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ اور اسی سے رَمْلَةٌ مَّرْدَاءُ ہے یعنی ریت کا ٹیلہ جس پر کوئی چیز نہ اگتی ہو اور اس سے اَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کے ہنوز سبزہ نہ اگا ہو۔
حدیث میں ہے ❶ (۱۲۰)
((اَهْلُ الْجَنَّةِ كُلُّهُمْ مُرْدٌ)) کہ اہل جنت سب کے سب امرد ہوں گے۔ چنانچہ بعض نے اس حدیث کو ظاہری معنی پر ہی حمل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں گے۔ جیسے محاورہ ہے:۔
مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْقَبَائِحِ فلاں ہر قسم کی قباحت سے پاک ہے۔
مَرَدَ فُلَانٌ عَنِ الْمَحَاسِنِ وہ محاسن سے عاری ہے
مَرَدَ عَنِ الطَّاعَةِ: سرکشی کرنا۔ پس آیت کریمہ: وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اہل مدینہ سے بعض لوگ...... نفاق پر اڑ کر ہر قسم کی خیر سے محروم ہو گئے ہیں۔ ❷ اور آیت کریمہ:۔
﴿مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ﴾ (۲۷۔۴۴) شیشے جڑے ہونے کی وجہ سے ہموار۔
میں مُمَرَّدٌ کے معنی ہموار یا چکنا کیا ہوا کے ہیں۔ اور یہ شَجَرَةٌ مَّرْدَاءُ سے ماخوذ ہے۔ گویا مُمَرَّدٌ کے لفظ سے اس کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے یوں بیان کیا ہے ❸ (سریع)

(۴۰۲) فِی مَجْدَلٍ شُیِّدَ بُنْیَانُهٗ
یَزِلُّ عَنْهُ ظُفُرُ الطَّائِرِ

ایک مضبوط محل میں جس پر ایسا پلاسٹر لگایا گیا ہے کہ اس سے پرند کے ناخن بھی پھسل جاتے ہیں۔

---

❶ رواہ الدارمی (۲/۳۳۵) والحدیث فی النہایۃ (۱/۱۸۱ و ۴/۱۰) الاضداد لابی الطیب (۱۶۲) وفی الکشاف: یدخل اھل الجنۃ الجنۃ جردا مردا۔ قال الحافظ فی الکافی (ص۱۶۳ رقم ۷۶) رواہ احمد وابن ابی شیبۃ وابو یعلی الطبرانی فی الاوسط من روایۃ سعید بن المسیب عن ابی ھریرۃ و روی مرسلا قال الترمذی وفی الباب عن معاذ بن جبل و روی مرسلا وفی البیہقی موصلا: ۱۲۔

❷ "ومرد علی" یاتی بمعنی التمرن والتعود علی الشیء لکن علی توجیہ المؤلف تکون صلتہ، محذوفۃ وعلی النفاق حال ای ارتکسوا عن الخیر وھم علی النفاق ۱۲۔

❸ البیت من قصیدۃ لاعشی یھجو علقمۃ بن علاثۃ ویمدح عامر بن الطفیل فی المنافرۃ التی جرت بینھما والقصیدۃ فی بوانہ (۹۲۔۹۶) والبیت فیہ ۹۶ واللسان (شید، جدل) وفی روایۃ شدد بدل شید والبلدان (رسم: وسط) وفیہ منزل بدل مجدل والمراء حصن الورد وفی المطبوع الظافر بدل الطائر ولعلم زلۃ من المصحح وما اثبتناہ طبقا للمراجع ھوالا نسب ۱۲۔

مَارِدٌ ایک مشہور قلعے کا نام ہے۔ ❶ مثل مشہور ہے تَمَرَّدَ مَارِدٌ وَعَزَّ الْاَبْلَقُ: مارد (قلعہ) نے سرکشی کی اور ابلق (قلعہ) غالب رہا۔ یعنی یہ دونوں قلعے سر نہ ہو سکے۔ یہ مقولہ ایک بادشاہ کا ہے جو ان دونوں قلعوں کو زیر نہیں کر سکا تھا۔

(م ر ض)

اَلْمَرَضُ کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد سے نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے مرض (۱) جسمانی جیسے فرمایا:

﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ (۲۴-۹۱) اور نہ بیمار پر کچھ گناہ ہے۔

﴿وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾ (۹-۹۱) اور نہ بیماروں پر۔

دوم (۲) مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور اس سے جہالت بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رزیلہ مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔ (۲-۱۰)

﴿اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا﴾ (۲۴-۵۰) کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں ہیں۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ﴾ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں مرض ہے۔ ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ (۵-۶۴) اور یہ (قرآن پاک) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر بڑھے گا۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ و (مجازاً بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لیے کہ اخروی زندگی سے محروی کا سبب بنتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی کا کہ آیت کریمہ:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۹-۶۴) اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس لیے مرض کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی طبیعت کو ردی اخلاق کی طرف مائل کر دیتے ہیں جیسا کہ بیماری جسم کو مضر اشیاء کے کھانے پر اکساتی ہے اور چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لیے قلب وصدر میں کینہ وکدورت پیدا ہونے کے لیے دَوِيَ صَدْرُ فُلَانٍ وَنَغِلَ قَلْبُهٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں ایک حدیث میں ہے: ❷ (۱۲۱)

((وَاَيُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ)) اور بخل سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہوسکتی ہے۔

اور شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ اس وقت کہتے ہیں، جب گرد وغبار یا

---

❶ قالتہ زباء والابلق المارد و کانا حصنین فی دومۃ الجندل للسموءل بن عادیا لیھودی فعزتھا زباء فاستصعبا علیھا فقالت المثل انظر المثل والخبر المیدانی رقم (۲۵۹۶) والبلدان (رسم: مارد) والحیوان (۱/۷۲)

❷ قالہ ابوبکر الصدیق مخاطبا جابر بن عبداللہ حین عیرہ بالبخل فی حدیث طویل اورد ہ البخاری فی کتاب الکفالۃ والشھادات وفی فرض الخمس وفی المغازی (الفتح ۸/۷۸) ۱۲

کسی اور عاضہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔اَمْرَضَ فُلَانٌ فِیْ قَوْلِہٖ کے معنی تعریض اور کنایہ سے بات کرنے کے ہیں۔

اَلتَّمْرِیْضُ: تیمارداری کرنا۔اصل میں تَمْرِیْض کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ...... تَقْذِیَۃٌ کی طرح ہے جس کے معنی آنکھ سے خاشاک دور کرنا کے ہیں۔

(م ر ء)

مَرْءٌ وَامْرُءٌ: مرد اور مَرْءَۃٌ وَامْرَءَۃٌ کے معنی عورت کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنِ امْرُؤٌ ھَلَکَ﴾ (۴۔۱۷۶) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے ﴿وَکَانَتِ امْرَءَتِیْ عَاقِرًا﴾ (۱۹۔۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

اور مُرُوْءَۃ کے معنی کمال مردانگی کے ہیں اور یہ لفظ رَجُوْلِیَّۃَ کے ہم معنی ہے۔اور اَلْمَرِیْءُ اس نالی کو کہتے ہیں۔جو معدہ کے سرے سے حلق تک ملی ہوتی ہے۔اسی سے مَرُؤَ الطَّعَامُ وَاَمْرَءَ کے معنی ہیں: کھانا خوشگوار ہو گیا اور طبیعت کے موافق ہونے کی وجہ سے غذا کی نالی میں بسہولت اتر گیا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا﴾ (۴۔۴) تو اسے کھالو لذیذ اور خوش ہضم۔

(م ر ی)

اَلْمِرْیَۃُ کے معنی کسی معاملہ میں تردد کرنے کے ہیں اور یہ شک سے خاص ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ﴾ (۲۲۔۵۵) اور کافر لوگ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے۔

﴿فَلَاتَکُ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّمَّا یَعْبُدُ ھٰٓؤُلَآءِ﴾ (۱۱۔۱۰۹) تو یہ لوگ جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔اس سے تم خلجان میں نہ پڑنا۔

﴿فَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآئِہٖ﴾ (۳۲۔۲۳) تو تم اس کے ملنے سے شک میں نہ ہونا۔

﴿اَلَآ اِنَّھُمْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّھِمْ﴾ (۴۱۔۵۴) دیکھو! یہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔

اَلْاِمْرَاءُ وَالْمُمَارَاۃُ کے معنی ایسے کام میں جھگڑا کرنا کے ہیں۔جس کے تسلیم کرنے میں تردد ہو۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ﴾ (۱۹۔۳۴) یہ سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔﴿بِمَا کَانُوْا فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ﴾ (۱۵۔۶۳) جس میں لوگ شک کرتے تھے۔

﴿اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی﴾ (۵۳۔۱۲) کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو۔

﴿فَلَا تُمَارِ فِیْھِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاھِرًا﴾ (۱۸۔۲۲) تو تم ان کے معاملے میں گفتگو نہ کرنا۔مگر سرسری سی گفتگو۔

دراصل مَرَیْتُ النَّاقَۃَ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی ہیں: اونٹنی کے تھنوں کو سہلانا تا کہ دودھ دے دے۔

(مَرْیَمُ) علیہا السلام۔یہ عجمی لفظ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام (قرآن پاک نے) ﴿مَرْیَمُ﴾ (۳۔۴۵) بتایا ہے۔

(م ز ن)

اَلْمُزْنُ کے معنی سفید چمک دار بادل ہیں۔اس بادل کے ایک ٹکڑے کو مُزْنَۃٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک

میں ہے:
﴿ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾ کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا یا ہم نازل کرتے ہیں۔
اِبْنُ مُزْنَةٍ: ماہ نو جو بادل سے نمودار ہو۔
فُلَانٌ يَتَمَزَّنُ کے معنی ہیں: فلاں بادل کی طرح سخاوت کرتا ہے یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے۔ مَزَّنْتُ فُلَانًا میں نے اسے بادل کے ساتھ تشبیہ دی اور مَازِنٌ چیونٹی کے انڈوں کو کہتے ہیں۔

(م ز ج)

مَزَجَ الشَّرَابَ کے معنی شراب میں کوئی چیز ملا دینا کے ہیں۔ اور جو چیز شراب میں ملائی جائے اسے مِزَاجٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿مِزَاجُهَا كَافُوْرًا﴾ (۷۶۔۵) جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔
﴿وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ﴾ (۸۳۔۲۷) اور اس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی۔
﴿مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا﴾ (۷۶۔۱۷) جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔

(م س س)

اَلْمَسُّ کے معنی چھونا کے ہیں اور یہ لَمْسٌ کے ہم معنی ہیں لیکن گاہے لَمْسٌ کسی چیز کی تلاش کرنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں وہ چیز مل بھی جائے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ❶ (رجز والوافر)
(۴۰۷) وَاَلْمِسُهٗ فَلَا اَجِدُهٗ
میں اسے تلاش کرتا ہوں لیکن وہ نہیں ملتا۔ مگر مس کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب ''حاسہ لمس'' کے ساتھ اس کا ادراک بھی ہو۔ اور کنایۃً مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مَسَّ الْمَرْاَةَ وَ مَاسَّهَا کے معنی عورت سے مجامعت کے ہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (۲۔۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو ان سے مجامعت سے پہلے طلاق دے دو۔
﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ (۲۔۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو ان سے مجامعت سے پہلے طلاق دے دو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔
ایک قرأت میں مَالَمْ تُمَاسُّوْهُنَّ ہے۔ ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ (۳۔۴۷) میرے ہاں بچہ کیوں کر ہوگا حالانکہ کسی نے مجھے ہاتھ تو لگایا نہیں۔
اور کنایۃً مَسِيْسٌ مجامعت کو کہتے ہیں اور مجازاً اَمَسُّ کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (۲۔۲۷۵) جیسا کہ کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔
اور مَسٌّ کا لفظ ہر اس تکلیف کے لیے بول دیا جاتا ہے۔ جو انسان کو پہنچے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ (۲۔۸۰) اور کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں...... چھو ہی نہیں سکے گی۔
﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ﴾ (۲۔۲۱۴) ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں۔ ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۵۴۔۴۸) (اب) آگ کا مزہ چکھو۔
﴿مَسَّنِيَ الضُّرُّ﴾ (۲۱۔۸۳) کہ مجھے ایذا ہو رہی ہے ﴿مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ﴾ (۳۸۔۴۱) شیطان نے مجھ کو

❶ قاله اعرابی وقد مرفی (ل م س)

اذیت دے رکھی ہے۔
﴿مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِيْ اٰيَاتِنَا﴾ (۱۰۔۲۱) تکلیف پہنچنے کے بعد تو ہماری آیتوں میں حیلے کرنے لگتے ہیں۔
﴿وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ﴾ (۱۷۔۶۷) اور جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے۔..........

(م س ح)

اَلْمَسْحُ (ف) کے معنی کسی چیز پر ہاتھ پھیرنے اور اس سے نشان اور آلائش صاف کر دینے کے ہیں اور کبھی صرف کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا اور کبھی ازالہ اثر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَسَحْتُ يَدِيْ بِالْمِنْدِيْلِ: میں نے رومال سے ہاتھ پونچھا اور گھسے ہوئے چکنے درھم (سکے) کو مَسِيْحٌ کہا جاتا ہے اور ہموار اور چکنی جگہ کو مکان اَمْسَحُ کہہ دیتے ہیں۔
مَسَحَ الْاَرْضَ: اس نے زمین کی پیمائش کی۔ پھر جس طرح (مجازاً) ذَرْعٌ (ناپنا) کے معنی چلنا اور مسافت طے کرنا آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسْحٌ کا لفظ بھی چلنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
مَسَحَ الْبَعِيْرُ الْمَفَازَةَ وذَرَعَهَا: اونٹ نے بیابان کو عبور کیا۔ اصطلاح شریعت میں مَسْحٌ کے معنی اعضاء پر پانی گزارنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
مَسَحْتُ لِلصَّلٰوةِ وَتَمَسَّحْتُ: میں نے نماز کے لیے مسح کیا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ﴾ (۵۔۶) اور سر کا مسح کر لیا کرو اور پاؤں دھو لیا کرو۔ اور کبھی مَسِسْتُ کی طرح مَسَحْتُهٗ بِالسَّيْفِ کے معنی بھی تلوار سے مارنا کے آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:[1]
﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸۔۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے کہ دجال کا نام مَسِيْحٌ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے چہرے کی ایک جانب مسخ ہو چکی ہو گی۔ چنانچہ مروی ہے انه لا عين له ولا حاجب کہ اس کے ایک جانب کی آنکھ اور بھویں کا نشان تک نہیں ہوگا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ زمین میں سیاحت کرتے تھے۔ اور ان کے زمانہ میں ایک گروہ تھا۔ جنہیں زمین میں سیاحت کی وجہ سے مَشَّائِيْنَ اور سَيَّاحِيْنَ کہا جاتا تھا بعض کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مس کرنے سے چونکہ کوڑھی تندرست ہو جاتے تھے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بطن مادر سے پیدا ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن پر تیل کی مالش کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں مسیح کہا گیا ہے۔
بعض کا قول ہے کہ یہ عبرانی لفظ مشوح سے معرب ہے جیسا کہ موسیٰ عبرانی لفظ موشیٰ سے معرب ہے (:۔) بعض کا قول ہے کہ مسیح اسے کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی ہو اور مروی ہے[2] ان الدجال ممسوح اليمنى

---

[1] روى ذالك عن ابن عباس وقتادة ومقاتل وغيرهم واختاره الزمخشرى لكن الرازى ذهب الى ان المراد منه المسح باليد لا بالسيف وهذا اقرب وقد حقق الآلوسى البحث ورد المعنى الاول ردا بليغا (راجع ۲۳/۱۷۵۔۱۷۹) وقارن القبتى ۳۷۹ والطبرى ۲۳/۱۰۰ والقرطبى ۲۳/۱۹۵ والبحر ۷/۳۹۶ واللدر ۲۰۹۔

[2] قد ذكر هذه الاقوال ابن الاثير فى النهايه (مسح) ۱۲۔

وان عیسی ممسوح الیسری کہ دجال کی دائیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔اس کے معنی یہ ہیں کہ دجال علم وعقل،حلم اور دیگر اخلاق جمیلہ سے کلیۃً محروم ہوگا اس کے برعکس عیسیٰ علیہ السلام کی بائیں آنکھ مٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہالت،حرص اور دیگر اخلاق مذمومہ سے پاک تھے۔

پھر جس طرح مَسٌّ اور لَمْسٌ کے الفاظ کنایۃً مجامعت کے لیے آجاتے ہیں۔اسی طرح مَسْحٌ بھی مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔معمولی پسینے پر بھی مَسِیْحٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔اور مِسْحٌ ٹاٹ کو کہتے ہیں۔اس کی جمع مُسُوْحٌ و اَمْسَاحٌ آتی ہے۔اَلتِّمْسَاحُ مگرمچھ کو کہتے ہیں اور تشبیہ کے طور پر سرکش آدمی کو بھی تِمْسَاحٌ کہہ دیتے ہیں۔

(م س خ)

اَلْمَسْخُ: کے معنی شکل وصورت بگاڑ دینا اور اخلاق وعادات خراب کر دینا کے ہیں۔بعض حکماء نے کہا ہے کہ مسخ دو قسم پر ہے ایک مسخ خاص یعنی شکل وصورت بگاڑنا یہ خاص قوم کے ساتھ خاص دور میں ہوا تھا دوم مسخ عام یعنی اخلاق وعادات کا بگاڑنا یہ ہر دور میں ہوسکتا ہے کہ انسان جانوروں کے سے اخلاق اختیار کر لے مثلاً اس کے اندر کتے کی سی شدت حرص پیدا ہو جائے یا خنزیر کی طرح جنسی خواہش میں اندھا ہو جائے یا بیل کی سی حماقت اختیار کرے۔چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ﴾ (۵۔۶۰)

اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے۔

کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے۔کہ یہاں بندر اور خنزیر بنا دینے سے ان کے اخلاق وعادات بگاڑ دینا مراد ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ﴾ (۳۶۔۶۷) تو ان کی جگہ ان کی صورتیں بدل دیں۔

میں مسخ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔اگرچہ پہلے معنی زیادہ واضح ہیں۔[1] اور اَلْمَسِيْخُ وہ کھانا جو بے مزہ ہو۔چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔[2] (المتقارب)

(۴۰۸) وَاَنْتَ مَسِيْخٌ كَلَحْمِ الْحُوَارِ

اور تو حوار یعنی اونٹ کے نوزائیدہ بچے کے گوشت کی طرح بے مزہ ہے۔

مَسَخْتُ النَّاقَةَ: میں نے ناقہ کو دبلا کر کے اس کی شکل بگاڑ دی۔

اَلْمَاسِخِيُّ کے معنی کمان ساز کے ہیں یہ مَاسِخَةٌ قبیلہ کی طرف منسوب ہے۔جو کمانیں بنایا کرتا تھا پھر ہر کمان

---

[1] ذهب الى الاول ابن عباس وايضا روى عنه ان المسخ بمعنى الهلاكة (روح المعانى ٤٢/٢٣)

[2] البيت لاشعر الرقبان الاسدى الجاهلى (اسمه عمرو بن حارثه) يهجو رجلا اسمه رضوان وكان نزل به فلم يقره (ترجمة فى المرزبانى ١٩) وتمامه: فلا انت حلو ولامر وفى رواية الامالى (٢١١/٢) سيلخ ميلخ وفى اللسان مسيخ مليخ بدل وانت مسيخ راجع اللسان والتاج (ضرر، مسخ) ومجالس ثعلب (١: ١٩٨) والمسط (٢: ٨٣) وما ذكره المولف رواية ابى زيد فى النوادر (٧٣) والبيت فى الميدان (٢: ٢٣٤، ١٨٦، ٢٥١) و المؤتلف (٤٧، ١٣٣) والجمهرة (٢: ٢١١، ٢٥١) والمرزبانى ١٩ والمخصص (٥: ١١/١٤: ٣٨) وكتاب الابدال (٣٥٠) ومحاضرات المؤلف (٣١٣/١) والحيوان للجاحظ (١: ٣٠١) وتهذيب الالفاظ والابيات ستة وفى المؤتلف (٣٠) والمعجم للمرزبانى (٣٥) فى رواية ثعلب عزاه الى عمرو بن ثعلبة الشيانى وهو شاعر جاهلى خبيث۔

سازکو مانحی (منسوبا) کہا جانے لگا ہے۔ جیسا کہ ہر آہنگر کو هَالِکِیٌّ کہا جاتا ہے۔

(م س د)

اَلْمَسَدُ: کھجور کے درخت کی پتے نکالی ہوئی شاخوں کا ریشہ، جسے بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے [1] قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ (۱۱۱۔۵) یعنی کھجور کے پٹھوں سے بٹی ہوئی رسی۔

اِمْرَءَۃٌ مَّمْسُوْدَۃٌ: بٹی ہوئی رسی کی طرح گتھے ہوئے گوشت والی (اور معتدل قامت) عورت۔

(م س ک)

اِمْسَاکُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز سے چمٹ جانا اور اس کی حفاظت کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (۲۔۲۲۹) پھر (عورت کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

﴿وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَے الْاَرْضِ﴾ (۲۲۔۶۵) اور وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پر نہ گر پڑے۔

اِسْتَمْسَکْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے اور تھامنے کا ارادہ کرنا کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاسْتَمْسِکْ بِالَّذِیْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ﴾ (۴۳۔۴۳) پس تمہاری طرف جو وحی کی گئی ہے اسے مضبوط پکڑے رہو۔

﴿اَمْ آتَیْنَاھُمْ کِتٰبًا مِنْ قَبْلِهٖ فَھُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ﴾ (۴۳۔۲۱) یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی تو یہ اس سے (سند) پکڑتے ہیں۔

محاورہ ہے۔

تَمَسَّکْتُ بِهٖ وَمَسَکْتُ بِهٖ: کسی چیز کو پکڑنا اور تھام لینا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ﴾ (۶۰۔۱۰) اور کافر عورتوں کی ناموس قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو واپس دے دو۔

اَمْسَکْتُ عَنْهُ کَذَا: کسی سے کوئی چیز روک لینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ھَلْ ھُنَّ مُمْسِکٰتُ رَحْمَتِهٖ﴾ (۳۹۔۳۸) تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر امساک بمعنی بخل بھی آتا ہے اور مُسْکَۃٌ مِّنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ: اس قدر کھانے یا پینے کو کہتے ہیں جس سے سدرمق ہو سکے۔

اَلْمَسَکُ: (چوڑا) ہاتھی دانت کا بنا ہوا زیور جو عورتیں کلائی میں پہنتی ہیں۔ اَلْمَسْکُ: کھال جو بدن کے ڈھانچے کو تھامے رہتی ہے۔

(م ش ج)

اَلْمَشِیْجُ: مخلوط شے۔ ج اَمْشَاج قرآن پاک میں ہے ﴿اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ﴾ (۷۶۔۲) (نطفہ مخلوط سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔

یعنی خون کی مختلف خلطوں سے اور مختلف خلطوں سے

---

[1] کذا ذکرہ القبتی فی غریبہ (۵۴۲) وقال عروۃ بن الزبیر ھو السلسلۃ التی ذکرھا اللہ تعالیٰ فی سورۃ الحاقۃ (۳۲) انظر الطبری (۳۰/۳۴۰) وروی عن مجاھد سفیان انظر المشکل (۱۲۳۔ ۱۲۲) فیہ، کذالک قال ابن عباس۔

مختلف قویٰ مراد ہیں۔ [1] جن کی طرف کہ آیت ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ اِلٰی قَوْلِهٖ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ (۲۳۔۱۲) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(م ش ی)

اَلْمَشْیُ: (ض) کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ﴾ (۲۔۲۰) جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَّمْشِي عَلٰى بَطْنِهِ الاية﴾ (۲۴۔۴۵) ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔

﴿يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ (۶۷۔۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور کنایۃ مَشْیٌ کا لفظ کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا چغلیاں لیے پھرنے والا۔

اور کنایۃ کے طور پر مَشْیٌ کے معنی مسہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

شَرِبْتُ مَشْيًا وَمَشْوًا: میں نے مسہل دوا پی۔ اَلْمَاشِيَةُ: مویشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔ اور اِمْرَاَةٌ مَّاشِيَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

(م ص ر)

اَلْمِصْرُ: ہر محدود شہر کو (جس کے گرد فصیل ہو) مصر کہتے ہیں۔ اور مَصَّرْتُ مِصْرًا کے معنی شہر آباد کرنے کے ہیں۔ دراصل مِصْرٌ دو چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہجر شہر میں مکانات کے بیع ناموں کی شروط میں یہ الفاظ خاص طور پر لکھے جاتے تھے۔

اِشْتَرٰی فُلَانُ الدَّارَ بِمُصُوْرِهَا: فلاں نے یہ مکان اس کی حدود (اربعہ) کے ساتھ خرید کیا۔ اور کسی شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)

(۴۰۹) وَجَاعِلُ الشَّمْسِ مِصْرًا لَاخَفَاءَ بِهٖ
بَيْنَ النَّهَارِ وَبَيْنَ اللَّيْلِ قَدْ فَصَلَا

(بلاشبہ) اللہ تعالیٰ نے سورج کو رات اور دن کے درمیان حد فاصل بنا رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿اُدْخُلُوْا مِصْرَ﴾ (۱۲۔۹۹) مصر میں داخل ہو جاؤ۔

میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔ اور تخفیف کے طور پر اسے منصرف کر دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کوئی ایک شہر مراد ہے۔ [3]

اَلْمَاصِرُ: دو پانیوں کے درمیان حد فاصل۔ مَصَرْتُ

---

[1] وفی غریب القبتی (۵۰۲): یرید اختلاط ماء الرجل بماء المرئة وكذا قال قال ابن عباس وغيره على ما فی الفخر (۲۹/۲۹۱) والطبرانی (۲۹/۱۲۶) وانظر احکام شافعی (۲/۱۸۸۔۱۸۹)

[2] وفی اللسان قال امية يذكر حكمة الخالق وقال ابن البرى البيت لعدى بن زيد العبادى وهو الصواب راجع تفسير الطبرى (۱: ۷۱) والخفاجی شرح الدرة (۹۴) والبيت ايضا فی البحر (۱: ۲۲۰/۱: ۴۵۵)

[3] واليه ذهب عامة المفسرين وحكى عن مالك انه مصر مسكن فرعون وفی مصحف عبدالله بن مسعود بلا الف ولام يؤيد ذالك (روح المعانی ۱: ۲۵۰)

النَّاقَۃَ کے معنی اونٹنی کو انگلیوں کے اطراف سے دوہنا کے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے۔لَھُمْ غَلَّۃٌ یَمْتَصِرُوْنَھَا۔ ان کے پاس کچھ غلہ ہے۔ جسے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے استعمال کرتے ہیں۔ثوب مُمَصَّرٌ: (گیرو سے رنگا ہوا کپڑا) گہرا رنگا ہوا کپڑا۔

نَاقَۃٌ مَصُوْرٌ کم اور بمشکل دودھ دینے والی اونٹنی۔

حسن نے کہا ہے لا بَاْسَ بِکَسْبِ التَّیَّاسِ مَالَمْ یَمْصُرْ وَلَمْ یَبْسُرْ: کہ سانڈ والے کی کمائی میں کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ انگلیوں سے نہ نچوڑے۔اور نہ ہی مادہ کی خواہش کے بغیر نر سانڈ اس سے جفتی کھائے۔

اَلْمَصِیْرُ: آنت۔ج مُصْرَانٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صَار سے مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم ظرف ہے۔اور آنت کو مَصِیْرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ طعام کی قرار گاہ بنتی ہے۔

(م ض غ)

اَلْمُضْغَۃُ: گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے کے لیے منہ میں ڈالا جا سکے۔شاعر نے کہا ہے ❶ (الوافر)

(۴۱۰) یُلَجْلِجُ مُضْغَۃً فِیْھَا اَنِیْضٌ

وہ گویا نیم پختہ گوشت کی بوٹی کو منہ میں پھراتا ہے۔پھر جنین کی اس حالت کو جو علقہ کے بعد ہوتی ہے۔

مضغۃ۔کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ عِظَامًا﴾ (۲۳۔۱۴) اور لوتھڑے کی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔اور فرمایا: ﴿مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ﴾ (۲۲۔۵)

بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی۔

اَلْمُضَاغَۃُ: چبانے سے جو آخر کار منہ میں باقی رہ جائے۔

اَلْمَاضِغَانِ: دونوں جبڑے۔کیونکہ ان سے کھانا چبایا جاتا ہے۔اَلْمَضَائِغُ: (واحد مَضِیْغَۃٌ) وہ تانت جو کمان کے دونوں سروں پر کسی ہوتی ہیں۔

(م ض ی)

اَلْمُضِیُّ وَالْمَضَاءُ: کسی چیز کا گذر جانا اور چلے جانا یہ اعیان واحداث دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَمَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۴۳۔۸) اور اگلے لوگوں کی مثال گذر گئی۔

﴿فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (۸۔۳۹) تو اگلے لوگوں کی سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے حق میں برتی جائے گی۔

(م ط ر)

اَلْمَطَرُ کے معنی بارش کے ہیں اور جس دن بارش برسی ہوا سے یَوْمٌ مَّطِیْرٌ وَمَاطِرٌ وَمُمْطِرٌ کہتے ہیں۔وَادٍ مَطِیْرٌ باراں رسیدہ وادی۔مَطَرَتْنَا السَّمَاءُ وَاَمْطَرَتْنَا کے معنی بارش برسانا کے ہیں۔

مَا مُطِرْتُ مِنْہُ بِخَیْرٍ: مرا از و خیرے نہ رسید۔بعض نے کہا ہے کہ مَطَرَ اچھی اور خوشگوار بارش کے لیے بولتے ہیں اور اَمْطَرَ عذاب کی بارش کے لیے ❷ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

---

❶ قالہ زبیر و قد مر فی (لحج)

❷ الفرق منقول عن ابی عبیدۃ وعلماء اللغۃ وذکرہ الحریری فی الدرۃ وعزاہ الی بعض علماء التفسیر وردہ فی الکشاف والخفاجی فی الدرۃ (۲۳) اذا لوا قع فی القرآن اتفاقا لا وضعًا۔

﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ مَطَرًا فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۷۳) اور ان پر ایک بارش برسائی سو جو بارش ان (لوگوں) پر برسی جوڈرائے گئے تھے بری تھی۔

﴿وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ﴾ (۷۔۸۴) اورہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ سو دیکھ لو کہ گنہگاروں کا کیسا انجام ہوا۔

﴿وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھِمْ حِجَارَةً﴾ (۱۵۔۷۴) اوران پر (کھنگر کی) پتھریاں برسائیں۔

﴿فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۸۔۳۲) توہم پرآسمان سے پتھر برسا۔

مَطَّرَ وَتَمَطَّرَ کے معنی بارش کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ باراں کی رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ مُتَمَطِّرٌ کہا جاتا ہے: اَلْمُسْتَمْطِرُ: بارش طلب کرنے والا، کھلا میدان جہاں بارش سے کوئی روک نہ ہو۔ اور کنایہ کے طور پر طالب خیر یعنی سائل کو مُسْتَمْطِرٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (المتقارب)

(۴۱۱) فَوَادٍ خِطَاءٌ وَوَادٍ مَطِرٌ

ایک وادی میں وہ قدم یعنی آہستہ چلتا ہے اور دوسری میں بارش کی طرح دوڑتا ہے۔

(م ط ی)

اَلتَّمَطِّیْ (تفعل) اس کے اصل معنی اَلْمَطَا (پیٹھ) کو بڑھانے اور لمبا کرنے کے ہیں (جیسا کہ انگڑائی لیتے وقت انسان کرتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر اکڑ کر چلنے کے معنی میں آتا ہے) قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ ذَھَبَ اِلٰی اَھْلِهٖ یَتَمَطّٰی﴾ (۷۵۔۳۳) پھر اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا چل دیا۔

اَلْمَطِیَّةُ: وہ اونٹ جس کی اَلْمَطَا یعنی پیٹھ پر سواری کی جاتی ہے اور اِمْتَطَیْتُهٗ: (افتعال) کے معنی ہیں: میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا اسی سے مجازاً اس رفیق کو جس پر انسان کو پورا بھروسہ ہو مِطًی کہا جاتا ہے جیسے ظَھْرٌ

(مع)

مَعَ: اجتماع کے معنی کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ اجتماع مکانی، ہو جیسے ھُمَا مَعًا فِی الدَّارِ: وہ دونوں ایک مکان میں ہیں۔ اور خواہ (۲) زمانی جیسے: ھُمَا وُلِدَا مَعًا وہ دونوں ایک وقت میں پیدا ہوئے۔

اور (۳) خواہ معنوی اعتبار سے ہو جیسے: اَخٌ یا اَبٌ وغیرہما اسمائے اضافی ہیں کہ ایک آدمی کو اسی وقت دوسرے کا بھائی کہا جاسکتا ہے۔ جب وہ بھی اس کا بھائی ہو۔

کبھی (۴) وہ اجتماع رتبہ اور شرف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے ھُمَا مَعًا فِی الْعُلُوِّ وہ دونوں بلند رتبہ ہونے میں برابر ہیں۔

اور کبھی مَعَ کا لفظ معنی نصرت کو چاہتا ہے۔ اس وقت یہ منصور یعنی جس کی مدد کی جاتی ہے۔ اس کا مضاف الیہ بنتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (۹۔۴۰) کہ غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو یہاں مَعَ کے مضاف الیہ یعنی نا ضمیر سے منصور مراد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ناصر ہے۔ جس کی معیت نا ضمیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ نیز فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶۔۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیز گار ہو......... خدا ان کا مددگار ہے۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (۵۷۔۴) اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔
﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۲۔۱۵۳) بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
﴿اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۸۔۱۹) اور خدا تو مومنوں کے ساتھ ہے۔
اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔
﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾ (۲۶۔۶۲) میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے رستہ بتائے گا۔
رَجُلٌ اِمَّعَةٌ: اناڑی آدمی جو ہر ایک کے ساتھ ہو جائے۔
اَلْمَعْمَعَةُ: آتشزدگی کی آواز۔ لڑائی میں بہادروں کا شور۔
اَلْمَعْمَعَانُ: لڑائی کی شدت۔

(م ع ز)

اَلْمَعْزُ: بکریاں۔ قرآن پاک میں ہیں:۔
﴿وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ﴾ (۶۔۱۴۳) اور دو بکریوں میں سے۔
اَلْمَعِيْزُ: بکریوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں جیسا کہ ضَئِيْنٌ۔ بھیڑوں کے ریوڑ پر بولا جاتا ہے۔
رَجُلٌ مَّاعِزٌ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْاَمْعَزُ وَالْمَعْزَاءُ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْاَمْعَزُ وَالْمَعْزَاءُ: سخت زمین۔ اِسْتَمْعَزَ فِيْ اَمْرِهٖ: کسی کام میں کوشش کرنا۔

(م ع ن)

مَاءٌ مَّعِيْنٌ: جاری پانی کو کہتے ہیں۔ یہ مَعَنَ الْمَاءُ فَهُوَ مَعِيْنٌ سے ماخوذ ہے مَمْعَانٌ: پانی بہنے کی جگہ اَمْعَنَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں دور نکل جانا۔
اَمْعَنَ بِحَقِّيْ: اس نے میرے حق کا انکار کر دیا۔ فُلَانٌ مَّعَنَ فِيْ حَاجَتِهٖ اس نے اپنی حاجت میں کوشش کی۔
بعض نے کہا ہے کہ مَاءٌ مَّعِيْنٌ میں مَعِيْنٌ عین سے مشتق ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔

(م ق ت)

اَلْمَقْتُ کے معنی کسی شخص کو فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بہت بغض رکھنے کے ہیں۔
یہ مَقَتَ مَقَاتَةً فَهُوَ مَقِيْتٌ وَمَقَتَهٗ فَهُوَ مَقِيْتٌ وَمَمْقُوْتٌ سے اسم ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَّ سَآءَ سَبِيْلًا﴾ (۴۔۲۲) یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔ جاہلیت میں اپنے باپ کی بیوہ سے شادی کرنے کو نِكَاحُ الْمُقِيْتِ کہا جاتا تھا۔ اَلْمُقِيْتُ کی اصل قُوَّةٌ ہے جس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

(م ک ک)

مَكَّةُ: یہ ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ اور تَمَكَّكْتُ الْعَظْمَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہڈی سے گودا اور مغز نکالنے کے ہیں۔
اِمْتَكَّ الْفَصِيْلُ مَا فِيْ ضَرْعِ اُمِّهٖ: اونٹ کے بچے نے اپنی ماں کے تھنوں سے سارا دودھ چوس لیا۔ اسی سے

---

(1) قاله امراؤ القيس فى فرس وصدره: له وثبات كوثب الظباء۔ والقصيدة مقيدة القافيه فى ٤٤ بيتا وهى فى ديوانه (صنعة السندوبى (٥٢۔٥٧) والبيت فى آخر القصيدة وبعده المقطع۔ وتعدو كعد ونجاة الظباء۔ اخطا ها الحادف المقتدر۔ والبيت فى العقد الثمين (١٢٨) والمعانى للقبتى (٢٠) وكتاب الخيل لابى عبيدة (١٤٠) وقال فى الآخره: وقد تروى هذه الابيات لربيعة بن جشم النمرى وراجع للبيت محاضرات الأدباء (٤ : ٦٤١) واللسان (خطا) وخطاءٌ جمع خطوة قال ابن البر معناه اى تخطو مرة فتكف عن العدد وتعدد ومرة عدوا يشبه المطروفى رواية ابى عبيدة: فواد خطيط وكذا فى المعانى للقبتى ٢٠ مع اختلاف طفيف فى رواية وفى روايته كصوب الخريف والمعنى واحد لان صوب الخريف يقع بموضع ويخطى اُخرىٰ ١٢۔

تَمَكُّكٌ بمعنی استقصاء استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے۔ ❶(۱۲۳)((لَا تَمَكُّوْا عَلٰى غُرَمَاءِ كُمْ)) اپنے قرضداروں سے مطالبہ میں اصرار نہ کرو۔

اور مَكَّة کو مَكَّه اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ظلم کرنے والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ روئے زمین کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے اسے مکہ کہا گیا ہے جیسا کہ مغز ہڈی کے درمیان ہوتا ہے۔

اَلْمَكُّوْكُ: (والجمع مکاکی) صواع کی طرح کا ایک طاس جو پانی پینے اور غلہ ماپنے کے کام آتا ہے (یہ صاع کا $\frac{1}{2}$۱ ہوتا ہے)۔

(م ك ث)

اَلْمَكْثُ: کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرے رہنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ (۲۷۔۲۲) ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔

ایک قرأت میں مُكُثٌ ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿اِنَّكُمْ مَاكِثُوْنَ﴾ (۴۳۔۷۷) تم ہمیشہ (اسی حالت میں) رہو گے۔

﴿قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا﴾ (۲۸۔۲۹) تو اپنے گھر والوں سے کہنے لگے کہ تم یہاں ٹھہرو۔

(م ك ر)

اَلْمَكْرُ کے معنی کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس کے مقصد سے پھیر دینے کے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے (۱) اگر اس سے کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو محمود ہوتا ہے ورنہ مذموم۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (۳۔۵۴) اور خدا خوب تدبر کرنے والا ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے۔ اور دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (۳۵۔۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۸۔۳۰) اور (اے محمدؐ) اس وقت کو یاد کرو۔ جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ (۲۷۔۵۰) اور وہ ایک چال چلے اور ہم بھی ایک چال چلے۔

میں دونوں معنی مذکور ہیں۔ یعنی مَكَرُوْا سے مکر مذموم اور مَكَرْنَا سے مکر محمود مراد ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مکر خداوندی کے معنی بندے کو ڈھیل دے رکھنے اور دنیوی ساز و سامان پر خوب قدرت دینے کے ہیں اسی لیے امیر المومنینؓ نے فرمایاں۔ (۱۲۴)

مَنْ وُسِّعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ مُكِرَ بِهٖ فَهُوَ مَخْدُوْعٌ فِيْ عَقْلِهٖ۔ کہ جس پر اس کی دنیا فراخ کر دی گئی ہو اور وہ یہ نہ سمجھا ہو کہ اسے ڈھیل دی گئی ہے۔ تو وہ فریب خوردہ اور احمق ہے۔

(م ك ن)

اَلْمَكَانُ: اہل لغت کے نزدیک مکان اس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی جسم پر حاوی ہو۔ بعض متکلمین کے نزدیک یہ من قبیل عرض ہے اور جسم حاوی ومحوی دونوں کے

❶ انظر للحدیث فی الفائق (۲/۲۰۲) والنهاية وفيه لا تتمككوا...... وفی رواية لا تمكنوا (مكلك ٤/٣٤٩) راجع غريب أبي عبيد ٣/١٢٣)

اجتماع سے عبارت ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جسم حاوی کی سطح (باطن) جسم محوی کی سطح پر محیط ہو تو گویا ان کے نزدیک ان دونوں جسموں کے باہم مل جانے کا نام مکان .... ہے۔قرآن پاک میں ہیں۔ ﴿مَكَانًا سُوًى﴾ (۲۰۔۵۸) ایک ہموار مکان میں۔ ﴿وَإِذَا أُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا﴾ (۲۵۔۱۳) اور جب یہ دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں (زنجیروں میں جکڑ کر) ڈالے جائیں گے۔

مَكَّنْتُهٗ وَمَكَّنْتُ لَهٗ: میں نے اسے تسلط یا قدرت دی فَتَمَكَّنَ چنانچہ اس نے قدرت حاصل کر لی۔قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۰) اور ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا۔

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ﴾ (۴۶۔۲۶) اور ہم نے ان کو ایسے مقدور دیئے تھے۔ جو تم لوگوں کو نہیں دیئے۔

﴿اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ﴾ (۲۸۔۵۷) کیا ہم نے ان کو جگہ نہیں دی۔

﴿وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (۲۸۔۶) اور ملک میں ان کو قدرت دیں۔

﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ (۲۴۔۵۵) اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ مستحکم و پائیدار کرے گا۔

﴿فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ (۲۳۔۱۳) ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں۔

اور اَمْكَنْتُ فُلَانًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی کو دوسرے پر قدرت دینے کے ہیں۔ مَكَانٌ وَ مَكَانَةٌ جگہ اور حالت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ﴾ (۳۹۔۳۹) اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ۔

ایک قراءت میں مَكَانَاتِكُمْ بصیغہ جمع ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ﴾ (۸۱۔۲۰) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا ہے۔ میں مکین بمعنی متمکن یعنی صاحب قدر و منزلت ہے۔

مَكِنَاتُ الطَّيْرِ وَمَكُنَاتُهَا: پرندوں کے گھونسلے۔

اَلْمَكْنُ: سوسمار وغیرہ کے انڈے۔ آیت کریمہ: ﴿بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ (۳۷۔۴۹) محفوظ انڈے۔ [1]

خلیل کا قول ہے کہ لفظ مکان (صیغہ ظرف) مفعل کے وزن پر ہے اور یہ كَوْنٌ سے مشتق ہے پھر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اسے فعال کا حکم دے کر اس سے تَمَكَّنَ تَمَسْكَنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے مَنْزِلٌ سے تَمَنْزَلَ وغیرہ۔

(م ک و)

مَكَا الطَّيْرُ يَمْكُوْ مُكَاءً کے معنی پرندے کے سیٹی بجانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً﴾ (۸۔۳۵) میں ان کی نماز کو مکاء کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ وہ نماز بے روح ہونے کے اعتبار سے پرندوں کی سیٹی کے بمنزلہ ہے اور مکاء ایک پرند کا نام ہے۔

---

[1] وعلیٰ هذا وزنه فعلون والصحیح انه من الكن معناه الحفظ والستر وليس من هذه المادة۔

مکت استه: گوز مارنا۔

(م ل ل)

اَلْمِلَّةُ: دین کی طرح ملت بھی اس دستور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی زبان پر بندوں کے لیے مقرر فرمایا تا کہ اس کے ذریعہ وہ قربِ خداوندی حاصل کر سکیں۔

دین (۱) اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۳۔۹۵) پس دین ابراہیم کی پیروی کرو۔

﴿وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِ یْ﴾ (۱۲۔۳۸) اور اپنے باپ دادا...... کے مذہب پر چلتا ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ یا کسی افراد امت کی طرف اسکی اضافت جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس قوم کی طرف بحیثیت مجموعی مضاف ہوتا ہے۔ جو اس کے تابع ہوتی ہے۔ اور افراد امت کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ اس لیے مِلَّةُ اللّٰهِ یا مِلَّتِیْ اور مِلَّةُ زَيْدٍ کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ دِيْنُ اللّٰهِ وَ دِيْنُ زَيْدٍ کا استعمال جائز ہے (اسی طرح کسی فریضہ کی نسبت بھی مِلَّة کی طرف نہیں کی جاتی) لہٰذا اَلصَّلٰوةُ مِلَّةُ اللّٰهِ کہنا جائز نہیں ہے (اس کے برعکس اَلصَّلٰوة دِيْنُ اللّٰهِ کہنا صحیح ہے)

اصل میں مِلَّةٌ کا لفظ اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی لکھوانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ (۲۔۲۸۲) اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے۔

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (۲۔۲۸۲) اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

مِلَّةٌ اور دین میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے من جانب اللہ مشروع ہونے کے لحاظ سے مِلَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے قائم کرنے اور بجا لانے والے کے لحاظ سے دین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین کے معنی طاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ مَلَّ خُبْزَهٗ يَمُلُّهٗ مَلًّا کے معنی گرم راکھ پر روٹی پکانے کے ہیں۔ اور راکھ پر پکی ہوئی روٹی کو خُبْزُ مَلَّةٍ کہا جاتا ہے اور اَلْمَلِيْلُ وہ چیز کہلاتی ہے جسے آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور وہ حرارت جو انسان محسوس کرتا ہے۔ اسے مَلِيْلَةٌ کہا جاتا ہے۔

مَلِلْتُ الشَّیْءَ اَمَلُّهٗ کے معنی کسی چیز سے بددل ہو کر اس سے اعراض کر لینے کے ہیں۔ اَمْلَلْتُهٗ مِنْ كَذَا۔ کسی کو کسی چیز سے بددل کر دینا۔ حدیث میں ہے ❶ (۱۲۴) ((تَكَلَّفُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا)) وہ عمل بجالاؤ جن کی طاقت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اُکتائے گا۔ آخر کار تم ہی اُکتا جاؤ گے۔ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بھی

---

❶ والحدث بتغير الالفاظ فی البخاری ومسلم والموطا مالك من حديث عائشة قاله صلی الله عليه وسلم فی شان امرة لاتنام من الليل (الزرقانی ۲۴۳۔۲۴۴) والحديث فی المستدرك للحاكم والنسائی (انظر كنز العمال ج۳ رقم ۱۶۹۔

ملول ہو جاتا ہے جیسا کہ لفظ حتیٰ سے وہم ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اکتائے گا نہیں آخر کار تم ہی اکتا جاؤ گے۔

(م ل ح)

اَلْمِلْحُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو متغیر ہو کر جم جائے یعنی نمک بن جائے اور صرف متغیر پانی کو بھی مِلْحٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ کھاری پانی کو مَاءٌ مِلْحٌ کہا جاتا ہے۔ اور مَاءٌ مَالِحٌ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ (۲۵۔۵۳) اور یہ کھاری ہے کڑوا۔ مَلَّحْتُ الْقِدْرَ کے معنی ہنڈیا میں نمک ڈالنے کے ہیں۔ اور اَمْلَحْتُهَا کے معنی زیادہ نمک ڈال کر خراب کر دینے کے۔ اور نمک لگا کر خشک کی ہوئی مچھلی کو سَمْكٌ مَلِيْحٌ کہتے ہیں۔ پھر مِلْحٌ سے استعارہ کے طور پر مَلَاحَةٌ بمعنی خوبروئی آتا ہے۔ اور رَجُلٌ مَلِيْحٌ اس خوبرو آدمی کو کہتے ہیں جس کا حسن خوب غور کے بعد محسوس ہو۔

(م ل ک)

اَلْمَلِكُ: بادشاہ جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَلِكُ النَّاسِ تو کہا جاتا ہے لیکن مَلِكُ الْاَشْيَاءِ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (۱۔۳) انصاف کے دن کا حاکم۔ میں ملک کی اضافت یوم کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل میں ملک الملک فی یوم الدین ہے۔ یعنی قیامت کے دن اسی کی بادشاہت ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۴۰۔۱۶) آج کس کی بادشاہت ہے، خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

اور مِلْكٌ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے عَمَلاً کسی کا متولی اور حکمران ہونے کو کہتے ہیں۔ دوم حکمرانی کی قوت اور قابلیت کے پائے جانے کو کہتے ہیں۔ خواہ بالفعل اس کا متولی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ پہلے معنی کے لحاظ سے فرمایا۔

﴿اِنَّ الْمُلُوكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا﴾ (۲۷۔۳۴) بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔

﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ (۵۔۲۱) کہ اس نے تم میں پیغمبر کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ تو اس آیت میں نبوّت کو خاص اور ملوکیت کو عام قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سارے کے سارے بادشاہ نہیں تھے۔ کیونکہ یہ تو حکمت الٰہی کے ہی منافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ رؤساء کی کثرت میں خیر نہیں ہوتی لہٰذا یہاں جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں ملک کا انتظام سنبھالنے کے قابل بنایا۔ تو یہاں ملک کا لفظ سیاست کی قابلیت اور قوت پیدا کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملک ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سیاست کا مالک ہو۔ خواہ وہ اپنے نفس کی سیاست کرے بایں طور پر کہ نفس کو خواہشات سے روک رکھنے پر اسے قدرت ہو۔ یا دوسروں کی سیاست کرے اور عام اس سے کہ بالفعل لوگوں کو بادشاہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ

اٰتَیْنٰھُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا﴾ (۴۔۵۴) ہم نے خاندان ابراہیم علیہ السلام کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بخشی تھی۔

حقیقی بادشاہت چونکہ اللہ ہی کے لیے ہے۔اس لیے فرمایا:۔ ﴿لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ﴾ (۶۴۔۱) اس کی (سچی) بادشاہی ہے اور اس کی تعریف نا متناہی ہے۔ ﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶) کہو کہ اے خدا، اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پس ملک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ حکم کنٹرول کرنے کے ہیں۔ اور ملک بمنزلہ جنس کے ہیں۔ لہٰذا ہر مُلْکٌ کو مِلْکٌ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر ملک کو مُلک نہیں کہہ سکتے۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَلَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔اور فرمایا۔ ﴿اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ﴾ (۱۰۔۳۱) یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔ ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا﴾ (۷۔۱۸۸) کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔علیٰ ہذا القیاس بہت سی آیات ہیں (جن سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے) حتیٰ کہ انسان تو اپنے حواس اور اپنی ذات کے نفع و نقصان پر بھی قدرت نہیں رکھتا چہ جائے کہ۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ذمہ دار

بنے۔ اَلْمَلَکُوْتُ یہ مَلَکٌ کا مصدر ہے اور (رَحَمُوْتٌ وَرَھَبُوْتٌ کی طرح اس میں تاء زائدہ ہے۔اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ملک کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ کَذٰلِکَ نُرِیْ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۶۔۷۵) اور ہم اس طرح ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے۔

﴿اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں کی۔

اَلْمَمْلَکَۃُ کے معنی سلطنت کے ہیں۔اور مملوک کا لفظ عرف میں غلام مملوک پر بولا جاتا ہے۔ دوسری ملکیت کو مملوک نہیں کہتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿عَبْدًا مَّمْلُوْکًا﴾ (۱۶۔۷۵) ایک غلام ہے۔اور کبھی عام املاک پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ جَوَّادٌ بِمَمْلُوْکِہٖ کہ فلاں اپنے املاک میں سخی ہے۔

اَلْمِلْکَۃُ: خاص کر عبید یعنی غلاموں کا مالک ہونے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ الْمِلْکَۃِ: یعنی فلاں اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔اور قرآن پاک میں غلاموں کے ملک کو یَمِیْنٌ کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۲۴۔۵۸) تمہارے غلام لونڈیاں.......... اجازت لیا کریں۔

﴿اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۴۔۳) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔

﴿اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُنَّ﴾ (۲۴۔۳۱) یا لونڈی

غلاموں (کے سوا)

اَلْمُلُوْکَۃُ: بہ معنی مِلک کے آتا ہے جیسے: مَمْلُوْکٌ مُّقِرٌّ بِالْمُلُوْکَۃِ وَالْمِلْکَۃِ وَالْمِلْکِ: یعنی ملک کا اقرار کرنے والا غلام۔

مِلَاکُ الْاَمْرِ: کسی چیز کا سرمایہ جس کے سہارے پر وہ قائم ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

اَلْقَلْبُ مِلَاکُ الْجَسَدِ: کہ دل پر جسم کا دارومدار ہے۔

اَلْمِلَاکُ کے معنی تزویج کے ہیں۔ اور اَمْلَکُوْہُ کے معنی ہیں کہ انہوں نے اس کا نکاح کر دیا پھر خاوند کو عورت کا منتظم ہونے کے لحاظ سے اس کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے کسی نے کہا ہے۔

کَادَ الْعَرُوْسُ اَنْ یَّکُوْنَ مَلِکًا کہ خاوند قریب قریب بادشاہ ہی ہوتا ہے۔

مَلِکُ الْاِبِلِ وَالشَّاۃِ: اس اونٹ یا بکری کو کہتے ہیں۔ جو دوسروں کے آگے آگے چلتی ہے۔ دوسرے چونکہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر اس کو ملک کہا جاتا ہے۔ ایک محاورہ ہے۔

مَالِاَحَدٍ فِیْ ھٰذَا مَلْکٌ وَمِلْکٌ غَیْرِیْ کہ میرے سوا اس پر کسی کا اختیار یا قبضہ نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا﴾ (۲۰۔۸۷) ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلاف نہیں کیا۔ اور ایک قرأت میں کسرہ میم کے ساتھ ہے۔

مَلَکْتُ الْعَجِیْنَ: آٹے کو اچھی طرح سے گوندھا۔

حَائِطٌ لَیْسَ لَہٗ مِلَاکٌ: دیوار میں پائیداری نہیں ہے۔

اَلْمَلَکُ: علمائے نحو اس لفظ کو مَلَائِکَۃٌ سے ماخوذ مانتے ہیں۔ اور اس کی میم کو زائدہ بناتے ہیں۔ لیکن بعض محققین نے اسے ملک سے مشتق مانا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو فرشتہ کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ اسے فتحہ لام کے ساتھ مَلَکٌ کہا جاتا ہے۔ اور فتحہ لام کے ساتھ ملک کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو مَلِکَ کہتے ہیں معلوم ہوا کہ مَلَکٌ تو مَلَائِکَۃٌ میں شامل ہے لیکن کل مَلَائِکَۃٌ مَلَکٌ نہیں ہوتے۔ بلکہ ملک کا لفظ ان فرشتوں پر بولا جاتا ہے جن کی طرف کہ آیات۔

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے۔

﴿فَالْمُقَسِّمَاتِ اَمْرًا﴾ (۵۱۔۴۰) پھر چیزیں تقسیم کرتے ہیں۔

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ (۷۹۔۱) ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

﴿وَالْمَلَکُ عَلٰی اَرْجَآئِھَا﴾ (۶۹۔۱۷) اور فرشتے اس کے کناروں پر (اتر آئیں گے)

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ﴾ (۲۔۱۰۲) اور (ان باتوں کے بھی پیچھے لگ گئے) جو دو فرشتوں پر اتری تھیں۔ اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اسی سے مَلَکُ الْمَوْتِ (موت کا فرشتہ) ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ﴾ (۳۲۔۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

(م ل ی)

اَلْمَلَاءُ: وہ جماعت جو کسی امر پر مجتمع ہو تو نظروں کو ظاہری حسن و جمال اور نفوس کو ہیبت و جلال سے پھیر دے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاءِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾

(۲-۲۴۶) بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا۔ ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖ﴾ (۷-۲۷) اور قوم فرعون میں جو سردار تھے کہنے لگے۔

﴿اِنَّ الْمَلَأَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ﴾ (۲۸-۲۰) کہ (شہر کے) رئیس تمہارے بارے میں صلاحیں کرتے ہیں۔

﴿قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ﴾ (۲۷-۲۹) وہ کہنے لگی کہ اے اہل دربار! میری طرف ایک نامہ گرامی ڈالا گیا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی آیات ہیں۔ جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مَلْأُ الْعُيُوْنِ: یعنی سب اسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں گویا اس نے ان کی نظروں کو اپنے جلوہ سے بھر دیا ہے۔ اسی سے کہا گیا ہے:۔

شَابٌّ مَالِئُ الْعَيْنِ: اپنی خوبصورتی سے آنکھ کو بھر دینے والا نوجوان۔ اَلْمَلَاءُ

اخلاق جو حسن سے بھرپور ہو [1]۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ [2]

(الوافر)

(۴۱۲) فَقُلْنَا اَحْسِنِيْ مَلَأً جُهَيْنَا

تو ہم نے کہا کہ اے جہینہ اپنے اخلاق درست کرو۔ مَالَأْتُهٗ کے معنی کسی کا معاون بننے اور اس کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ شَايَعْتُهٗ کے معنی کسی کے طرف داروں میں داخل ہونے کے آتے ہیں۔ محاورہ ہے۔

هُوَ مَلِئٌ بِكَذَا: یعنی وہ فلاں چیز سے پر ہے۔ اَلْمُلَاءَةُ زکام جو فضلہ سے دماغ کو بھر دے۔ اور مُلِئَ فُلَانٌ وَاَمْلَأَ کے معنی زکام زدہ ہونے کے ہیں۔

اَلْمِلْءُ: کسی چیز کی اتنی مقدار جس سے کوئی برتن بھر جائے۔ محاورہ ہے۔

اَعْطِنِيْ مِلْأَهٗ وَمِلْأَيْهِ وَثَلَاثَةَ اَمْلَائِهٖ: مجھے ایک، دو، یا تین پیمانے بھر کر دو۔

(م ل ی)

اَلْاِمْلَاءُ کے معنی امداد یعنی ڈھیل دینے کے ہیں اسی سے مَلَاوَةٌ مِنَ الدَّهْرِ یا مَلِيٌّ مِّنَ الدَّهْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی عرصہ دراز کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ (۱۹-۴۶) اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔

تَمَلَّيْتَ دَهْرًا: تمہاری عمر دراز نہ ہو۔

تَمَلَّيْتُ الثَّوْبَ: میں نے اس کپڑا سے بہت فائدہ اٹھایا۔

تَمَلّٰى بِكَذَا: اس نے فلاں چیز سے عرصہ تک فائدہ اٹھایا۔

مَلَاكَ اللّٰهُ: (بغیر ہمزہ) اللہ تیری عمر دراز کرے۔ چنانچہ اسی سے غِشْتَ مَلِيًّا کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں تم عرصہ دراز تک جیتے رہو۔

اَلْمَلَا: (اسم مقصور) وسیع ریگستان۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلْمَلَوَانِ کے معنی ہیں ''لیل ونہار'' مگر اصل میں یہ لفظ رات دن کے تکرار اور ان کے امتداد

---

[1] وفي الحديث "احسنوا املاء كم" قاله صلى الله عليه وسلم لاصحابه حين ضربوا الرجل الذي بال في المسجد (اللسان) والفائق (۲/۲٥٤)۔

[2] قاله الجهني واوله: تنادوا يا لهثة اذاراُ ونا۔ وبعضهم فسر الملاء ههنا بالظن والبيت في اللسان (ملاء جهن) وابن الانباري في شرح السبع (٤٦٥) والحماسة بشرح المرزوقي رقم (١٥٢) في ١٥ بيتا والمقطوعة من المنصفات والجهني هو عبدالشارق بن عبدالعزى الجهني الجاهلي۔

پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ لیل ونہار کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)

(۴۱۳) نَهَارٌ وَلَيْلٌ دَائِمٌ مَلَوَاهُمَا
عَلٰى كُلِّ حَالِ الْمَرْءِ يَخْتَلِفَانِ

رات دن کا تکرار ہمیشہ رہتا ہے اور ہر حالت میں یہ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

اگر مَلَوَان کا اصل معنی لیل ونہار ہوتا تو ان کی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر استعمال نہ ہوتا اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَ اُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ (۷۔۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔ میں اُمْلِيْ لَهُمْ کے معنی مہلت دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ﴾ (۳۔۱۷۸) کہ ہم ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ﴾ (۴۷۔۲۵) شیطان نے یہ کام ان کو مزین کر دکھایا اور انہیں طول (عمر کا وعدہ) دیا۔

میں اَمْلَا کے معنی اَمْهَلَ یعنی مہلت دینے کے ہیں۔ ایک قراءت میں اَمْلَا لَهُمْ ہے جو اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ اُمْلِيْهِ اِمْلَاءً سے مشتق ہے اور اس کے معنی تحریر لکھوانے اور املا کروانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ (۲۵۔۵) اور وہ صبح شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ اصل میں اَمْلَيْتُ اَمْلَلْتُ (مضاعف) ہے۔ دوسرے لام کو تخفیف کے لیے یا (ے تبدیل کرلیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (۲۔۲۸۲) تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

(م ن ن)

اَلْمَنُّ: ایک وزن کا نام ہے اس کا تثنیہ مَنَّانِ اور جمع اَمْنَانٌ آتی ہے۔ کبھی ایک نون کو الف سے تبدیل کر کے مَنًا بنا لیتے ہیں اس کی جمع اَمْنَاءٌ ہے۔ اور ہر اندازہ کی ہوئی چیز کو مَمْنُوْنٌ۔ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے مَوْزُوْنٌ کہتے ہیں۔

اَلْمِنَّةُ کے معنی بھاری احسان کے ہیں۔ اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک منت بالفعل جیسے مَنَّ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ۔ یعنی فلاں نے اس پر گرانبار احسان کیا۔ اسی معنی میں فرمایا:۔ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۔۱۶۴) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ (۴۔۹۴) تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے پھر خدا نے تم پر احسان کیا۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهَارُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۱۴) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر بھی احسان کیے۔

﴿يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۱۴۔۱۱) خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (نبوت) کا احسان کرتا ہے۔

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ (۲۸۔۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں۔ ان پر احسان کریں۔

---

❶ قاله ابن مقبل (واسمه تميم بن ابى بن مقبل) راجع للبيت اللائى مع السمط (۵۳۳) والاقتضاب (۴۷۲) والخزانة (۳: ۲۷۵) والعينى (۴: ۵۴۲) واللسان (ملاء) وبعضهم نسبه لاعرابى من بنى مقبل راجع الحصرى (۴: ۶۸) وفى البلدان لابن مقبل اوابن احمر والبيت فى الروض (۱: ۲۶) والعينى على ابن هشام وقبله: الا ياد يار الحى بالسبعان۔ امل عليها بالبلى الملوان راجع ترجمته فى الاصابة رقم ۸۶۲ والخزانة (۱: ۱۱۳)

اور یہ یعنی منت بالفعل درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔اور دوسرے معنی مِنَّة بِالْقَوْلِ یعنی احسان جتلانا گو انسانی معاشرہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔مگر جب کفران نعمت ہو رہا ہو تو اس کے اظہار میں کچھ قباحت نہیں ہے۔اور چونکہ (بلاوجہ) اس کا اظہار معیوب ہے اس لیے مشہور ہے۔
اَلْمِنَّةُ تَهْدِمُ الصَّنِيْعَةَ: منت یعنی احسان رکھنا احسان کو برباد کر دیتا ہے۔اور کفران نعمت کے وقت چونکہ اس کا تذکرہ مستحسن ہوتا ہے اس لیے کسی نے کہا ہے۔ اِذَا كُفِرَتِ النِّعْمَةُ حَسُنَتِ الْمِنَّةُ۔ جب نعمت کی ناشکری ہو تو احسان رکھنا ہی مستحسن ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (۴۹۔۱۷) یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں۔ کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہدو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔ بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے۔کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا۔
میں ان کی طرف سے منت بالقول یعنی احسان جتلانا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منت بالفعل یعنی انہیں ایمان کی نعمت سے نوازنا مراد ہے جیسا کہ بعد میں اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ کے لفظ سے خود ہی اس کی تشریح کر دی ہے اور آیت کریمہ:۔ ﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً﴾ (۴۷۔۴) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر۔ میں مَنًّا کے لفظ سے انہیں بلا معاوضہ رہا کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔اور آیت کریمہ: ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸۔۳۹) یہ ہماری بخشش ہے اسے خرچ کر دیا...... رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔
میں فَامْنُنْ کے معنی خرچ کرنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (۷۴۔۶) اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مِنَّة بالقول مراد ہے یعنی احسان جتلانا اور اسے بہت بڑا خیال کرنا۔ ❶ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ زیادہ کی طلب کے لیے احسان نہ کر۔ ❷ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ (۹۵۔۶) ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔
میں بعض نے غیر ممنون کے معنی غیر محدود (یعنی ان گنت) کیے ہیں۔جیسا کہ دوسری جگہ "بِغَيْرِ حِسَابٍ فرمایا ہے:۔ بعض نے اس کے معنی غیر مقطوع ولا منقوص کے ہیں۔ ❸ یعنی ان کا اجر نہ منقطع ہوگا اور نہ ہی کم کیا جائے گا۔اسی سے اَلْمَنُوْن، بمعنی موت ہے۔ ❹ کیونکہ وہ تعداد کو گھٹاتی اور عمر کو قطع کر دیتی ہے۔بعض نے کہا ہے کہ مِنَّة بالقول بھی اس سے ہے کیونکہ احسان جتلانا

---

❶ هذا ما ذهب اليه الحسن وابن ابي ليلى وعلى هذا يكون تستكثر محذوما بلا الناهية بدلا من تمنن اى لاتمنن ولا تستكثر وهن شان المان بما يعطى ان يستكثره ويراه كثيرا ۱۲۔

❷ وهذا هو المنقول عن ابن عباسؓ واكثر اصحاب التفاسير فعلى هذا المعنى يكون تستكثر منصوبا بان المقدرة ويؤيده قراءة ابن مسعود ان تستكثر باظهار ان مختصرا من روح المعانى (۲۹/۱۱۹۔۱۲۰)

❸ قارن اضداد ابى الطيب (۶۲۳۔ ۶۲٤)۔

❹ وايضا سمى الدهر المنون بهذا المعنىٰ ويكون واحدً اوّجمعاً (اضداد ابى الطيب (۶۲۳)

نعمت کو قطع کر دیتا ہے اور شکر گذاری کے انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ (۲۔۵۷) اور تمہارے لیے من سلویٰ اتارتے رہے۔

میں مَـنٌّ سے شبنمی گوند مراد ہے۔ جو رات کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلویٰ ایک پرند کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے ان احسانات کی طرف اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں۔ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے مَـنٌّ کہا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لیے باعث اطمینان تھی اسے سلویٰ فرمایا ہے۔ جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔

(مَنْ)

اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں۔ اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت (۱) ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے بالتبع مراد ہوں مثلاً: رَاَيْتُ مَنْ فِي الــــدَّارِ۔ کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لیے جائیں۔ اور اس (۲) وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَـمِـنْهُـمْ مَّـنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّـمْشِـيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ﴾ اَلْاٰیة تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لیے استعمال نہیں ہوتا اسی لیے بعض محدثین نے اغنام (عوام) سے انسانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ مَـنْ استفہامیہ کے ساتھ ان کے متعلق سوال کرنا غلط ہے۔ پس آیت میں تنبیہ ہے کہ وہ بمنزلہ جانوروں کے ہیں یا ان سے بھی کمتر درجہ کے ہیں۔

"مَنْ" واحد، جمع، مذکر، مونث سب کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت۔ ﴿وَ مِـنْهُـمْ مَّـنْ يَّسْتَـمِـعُ﴾ (۶۔۲۵) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تمہاری باتوں کی طرف کان رکھے ہیں۔ میں من کے بعد ضمیر واحد مذکر لائی گئی ہے۔ اور آیت ﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ﴾ (۱۰۔۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔ میں مَـنْ کی طرف ضمیر جمع لوٹ رہی ہے نیز فرمایا:۔ ﴿وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ﴾ (۳۳۔۳۱) اور جو تم میں سے خدا........ کی فرمانبردار رہے گی۔

(مِنْ)

یہ حرف جار ہے اور یہ ابتدائی (۱) غایت (۲) تبعیض (۲)، تبین (۳)، کے لیے آتا ہے۔ اور حرف (۴) نفی اور استفہام کے ساتھ ہو تو استغراق جنس کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَـمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ (۶۹۔۴۷) پھر تم میں سے کوئی۔ اور کبھی (۵) عوض کے لیے ہوتا ہے جیسے خُـذْ هٰذَا مِــنْ ذٰلِكَ یعنی اس کے عوض میں یہ لے لو۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنِّـيْ اَسْكَـنْـتُ مِنْ ذُرِّيَّتِـيْ بِوَادٍ﴾ (۱۴۔۳۷) میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں لا بسائی ہے۔

میں مِن تبعیض کے لیے ہے۔ کیونکہ وہاں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے بعض آباد ہوئے تھے۔ اور آیت کریمہ: ﴿مِنَ السَّمَـآءِ مِـنْ جِبَالٍ فِيْهَـا مِنْ بَـرَدٍ﴾ (۲۴۔۴۳) اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان

سے اولے نازل کرتا ہے۔

میں (۱) ہوسکتا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب عَلَی الْمَفْعُوْلِیَة ہو ای یُنَزِّلَ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا تو مِنْ اولی برائے ظرفیت ہے اور ثانی برائے مفعولیہ اور ثالث برائے تبیین۔ اور اولوں کے جبال اتارنے سے بکثرت اولے نازل کرنا مراد ہے جیسا کہ محاورہ ہے۔ عِنْدَہٗ جِبَالٌ مِنْ مَّالٍ۔ یعنی اس کے پاس بہت سامان ہے۔

بعض (۲) نے کہا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی الظرفیۃ بھی ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اولے پہاڑوں سے نازل ہوتے ہیں اور مِنْ بَرَدٍ منصوب علی المفعولیہ ہو تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

بعض (۳) کے نزدیک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مِنْ بَرَدٍ موضع رفع میں ہو۔ اور مِنْ جِبَالٍ منصب علی المفعولیۃ ہو۔ تو گویا اصل عبارت یوں ہے۔ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ جِبَالًا فِیْھَا بَرَدٌ اور جبال کا لفظ مَا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ کی عظمت اور کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ ❶ اور آیت کریمہ:۔

﴿فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ﴾ (۵۔۴) تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھا لیا کرو۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے۔ ❷ کہ مِن زائدہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مِن زائدہ نہیں ہے۔ بلکہ تبعیضیہ ہے کیونکہ بعض مَآ اَمْسَکْنَ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جیسے خون، غدودیں اور وہ چیزیں جو قاذورات سے مختلط ہوتی ہیں اور ان کے تناول سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

(م ن ع)

اَلْمَنْعُ: یہ عطا کی ضد ہے۔ رَجُلٌ مَانِعٌ وَ مَنَّاعٌ: بخیل آدمی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ (۱۰۷۔۷) اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے۔

﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ﴾ (۵۰۔۲۵) جو مال میں بخل کرنے والا ہے۔ اور منع کے معنی حمایت اور حفاظت کے بھی آتے ہیں اسی سے مکان منیع کا محاورہ ہے جس کے معنی محفوظ مکان کے ہیں اور منع کے معنی حفاظت کرنے کے فُلَانٌ ذُوْمَنَعَةٍ وہ بلند مرتبہ اور محفوظ ہے کہ اس تک دشمنوں کی رسائی ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۴۔۱۴۱) کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے؟ اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچایا نہیں؟

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۴) اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو خدا کی مسجدوں سے منع کرے۔ اور آیت۔

﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ (۷۔۱۲) میں مَا مَنَعَكَ کے معنی ہیں کہ کس چیز نے تمہیں اکسایا۔ اور بعض نے اس کا معنی مَا الَّذِیْ سَدَّكَ وَحَمَلَكَ عَلٰی تَرْكِ ذٰلِكَ کیا ہے یعنی کس نے تجھے روکا اور ترک سجود پر اکسایا۔ اَوَ اِمْرَاَۃٌ مَنِیْعَۃٌ عفیفہ عورت۔

---

❶ ذکر المؤلف ثلاث توجیہات من الاعراب وقد ذکر ھذہ الثلاثۃ اصحاب التفاسیر فلا بدع فیہ وقد نسب صاحب الروح احتمال الثالث الی الفراء والاولان تبتغییر یسیر الی الاخفش (۱۸/۱۷۲) وانوار التنزیل (۲/۲۵۷)۔

❷ ای الاخفش وکنی عنہ الطبری ببعض نحوی البصرۃ قال الطبری وخطاءہٗ البصریون والخلاف فیہ مشھور والحق الجواز ولذا قال علماء التفسیر "وان اکل فلاتا کل (م۔ ۳)

اور مَنَاعِ اسم فعل بمعنی اِمْنَعْ (امر) جیسے نَزَالِ بمعنی اَنْزِلْ۔

(م ن ی)

اَلْمَنْیُ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔ مَنٰی لَكَ الْمَانِیْ: مقدر کنندہ نے تیرے لیے مقدر کر دیا ہے۔اسی سے بعض کے نزدیک مَــنٌ ایک وزن کا نام ہے 1

﴿اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی﴾ (۷۵۔۳۷) کیا وہ منی جو (رحم میں) ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا؟ ﴿مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰی﴾ (۵۳۔۴۶) (یعنی) نطفے سے جو (رحم میں) ڈالا جاتا ہے۔

یعنی نطفہ سے جو قدرت الٰہی کے ساتھ اس چیز کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ جو اس سے پیدا ہونا ہوتا ہے۔اسی سے مَنِیَّةٌ بمعنی اجل مقدر ہے۔والجمع: مَنَایَا۔

اَلتَّمَنِّیْ کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھنے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں۔پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن وتخمین پر مبنی ہوتی ہے۔اور کبھی غور وفکر کا نتیجہ اور مبنی بر حقیقت۔مگر عام طور پر تمنی کی بنا چونکہ ظن وتخمین پر ہی ہوتی ہے اس لیے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔کیونکہ اکثر طور پر تمنی کا لفظ دل میں غلط آرزوئیں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی﴾ (۵۳۔۲۴) کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ﴾ (۲۔۹۴) تو موت کی آرزو تو کرو۔﴿وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗ﴾ (۶۲۔۷) اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

اَلْاُمْنِیَّةُ: کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے اُمْنِیَّةٌ کہا جاتا ہے اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کر کے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں۔تو گویا تمنی جھوٹ کا مبدء ہے۔لہٰذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے اسی معنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔2

مَا تَغَنَّیْتُ وَلَا تَمَنَّیْتُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ گایا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔ اور امنیۃ کی جمع امانی۔آتی ہے۔3 چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَانِیَّ﴾ (۲۔۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی) کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

مجاہد نے اِلَّا اَمَانِیَّ کے معنی اِلَّا كَذِبًا یعنی جھوٹ کیے ہیں۔اور دوسروں نے اَمَانِیَّ سے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنا مراد لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس اُمْنِیَّة سے زیادہ وقت نہیں رکھتی ہے۔جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی

---

1 منسوب الی الاخفش کما فی الروح (۲۷/۵۹)۔

2 انظر لقول عثمان غریب القرآن للقبتی (۵۵) والنھایة لابن الاثیر (۴: ۱۹) واللسان (منی) والفائق (۱/۱۶۳) وفی کتاب الاشربة للقبتی و"ولا تفتیت" ای ولا تشبھت بالفتیان ولایصح۔ ورواہ ابویعلی الموصلی فی مجمعه باسناد ضعیف من روایة انس عنه فی اثناء حدیث (راجع تخریج الاحیاء للعراقی (۳/۳۱۹) وفی روایة الفائق ایضا فی جاھلیة ولا اسلام۔

3 بتشدید الیاء وتخفیفھا و بالثانی قرء ابوجعفر وشیبة (ابن الانباری ۲۴۲)

ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ (۲۲۔۵۲) اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا۔مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈال دیتا تھا۔

میں اُمْنِيَّة کے معنی تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمنی ظن وتخمین سے بھی ہوتی ہے۔اور مبنی بر حقیقت بھی۔ اور چونکہ آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپؐ اس کی تلاوت کے لیے مبادرت کرتے تھے۔حتیٰ کہ آپؐ کو آیت ﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ﴾ اور ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ کے ذریعہ منع فرمادیا گیا۔الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمنی سے موسوم کیا ہے۔اور متنبہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں شیطان کا دخل غالب ہو جاتا ہے۔[1] اسی معنی میں آنحضرتؐ نے بھی فرمایا ہے[2]

(۱۲۵) اِنَّ الْعَاجِلَةَ مِنَ الشَّيْطَانِ کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔مَنَّيْتَنِيْ كَذَا کے معنی فریب دہی سے جھوٹی امیدیں دلانے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ﴾ (۴۔۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

(م ہ د)

اَلْمَهْدُ: گہوارہ۔جو بچے کے لیے تیار کیا جائے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ (۱۹۔۲۹) کہ ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے، کیونکر بات کریں؟ اور اَلْمَهْدُ وَالْمِهَادُ: ہموار اور درست کی ہوئی زمین کو بھی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا﴾ (۲۰۔۵۳) وہ (وہی تو ہے) جس نے تم لوگوں کے لیے زمین کو فرش بنایا۔

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ (۷۸۔۶) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟

اور یہ ایسے ہی ہے۔جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کو فراش کہا ہے۔چنانچہ فرمایا:

﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲۔۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔

مَهَّدْتُ لَكَ کے معنی کسی چیز کو تیار اور ہموار کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا﴾ (۷۴۔۱۴) اور ہر طرح سامان میں وسعت دی۔

اِمْتَهَدَ السَّنَامُ کے معنی کوہان کے مِهَاد یا مَهْد یعنی فرش کی طرح ہموار ہو جانے کے ہیں۔

---

[1] اشارة الى قصة ذكرها بعض علماء التفسير اى تلك الغرانيق العلى وان شفا عتهن لترتجى۔ ذهب الحافظ بناء على كثرة الطريق الى ان لها اصلاً الفتح (۸/۳۳۳) لكن المحققين افكروه راجع الفخر (۶/۲۴۵۔۲۴۶) وقارن ما ذكره القبتى فى غريبه (۵۵۔۵۶) و فى اللسان (هنى) قال الازهرى والتلاوة سميت امية لان تالى القرآن اذامر باية رحمة تمنا ها واذا مر بآية عذاب تمنى ان يوقاه

[2] انظر لتخريجه (ع ج ل) ۱۲۔

(م ھ ل)

اَلْــمَهْــلُ: کے معنی حلم وسکون کے ہیں۔اور مَهَلَ فِیْ فِعْلِهٖ کے معنی ہیں اس نے سکون سے کام کیا۔ اور مَهْلًا کے معنی رِفْـقًا کے ہیں۔یعنی جلدی مت کرو۔ مَهَّـلْتُهٗ: کسی کو مَهْلًا کہنا اور اَمْهَـلْتُهٗ کے معنی کسی کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَمَهِّلِ الْکٰفِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا﴾ (۸۶۔۱۷) تو تم کافروں کو مہلت دو، پس چند روز ہی مہلت دو۔

اَلْمُهْلُ: تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں۔[1] چنانچہ فرمایا:۔

﴿کَـالْمُهْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ﴾ (۴۴۔۵۴) جیسے پگھلا ہوا تانبا پیٹوں میں۔(اس طرح) کھولے گا۔

(م و ت)

اَلْـمَوْتُ: یہ حیات کی ضد ہے۔لہٰذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

اول قوت نامیہ (جو کہ انسان، حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا:۔

﴿یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۵۷۔۱۷) زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

﴿اَحْیَیْنَـا بِـهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا﴾ (۵۰۔۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

دوم (۲) حس وشعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا﴾ (۱۹۔۲۳) کاش میں اس سے پہلے مر چکتی۔

﴿ءَ اِذَا مَـا مِـتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَیًّا﴾ (۱۹۔۶۶) کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔

سوم (۳)۔قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا: اور اسی کا نام جہالت ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ﴾ (۶۔۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّکَ لَا تُسْـمِـعُ الْمَوْتٰی﴾ (۲۷۔۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔

میں اسی معنی کے لحاظ سے کفار کو موتی کہا ہے۔

چہارم (۴):۔غم: جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَ یَـاْتِیْـهِ الْـمَـوْتُ مِـنْ کُـلِّ مَکَانٍ وَّ مَا هُوَ بِـمَیِّتٍ﴾ (۱۴۔۱۷) اور ہر طرف سے اسے موت آ رہی ہوگی۔ مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا۔ میں موت سے یہی معنی مراد ہیں۔

پنجم (۵): موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ اَلـنَّـوْمُ مَوْتٌ خَفِیْفٌ وَالْمَوْتُ نَوْمٌ ثَقِیْلٌ کہ نیند ہلکی سی موت ہوتی ہے۔ اور موت بھاری نیند کا نام ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰـکُمْ بِالَّیْلِ﴾ (۶۔۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔ ﴿اَللّٰـهُ یَتَـوَفَّـی الْاَنْـفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ

[1] قال ابو بکر الصدیق ادفنو فی فی ثوبی هذین فانهما للمهل والتراب۔ الفائق (۲/۲۵۸)۔

﴿فِی مَنَامِھَا﴾ (۳۹۔۴۲) اور خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ﴾ (۳۔۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ..........زندہ ہیں۔

میں شہداء کی روحوں سے موت کی نفی مراد ہے۔ اور اس میں ان کی روحوں کے عیش و آرام میں ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے اس حزن کی نفی ہے۔ جس کا کہ ابھی آیت ﴿وَیَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ﴾ میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ﴾ (۳۹۔۳۰) (اے پیغمبر) تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے۔ میں بعض نے مَیِّتٌ کے معنی سَتَمُوْتُ کیے ہیں۔ یعنی تم عنقریب فوت ہو جاؤ گے۔ تو اس سے متنبہ کیا ہے کہ موت سے کسی کو بھی چارہ کار نہیں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (السریع)

(۴۱۴) اَلْمَوْتُ حَتْمٌ فِیْ رِقَابِ الْعِبَادِ

ہر انسان کو حتماً مرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلْمَیِّتُ کے معنی جسم سے روح کے الگ ہونے کے نہیں ہیں۔ بلکہ جسم کا تدریجاً تحلیل ہونا اور گھٹنا مراد ہے۔ یعنی انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ تدریجاً مرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ [2] ()

یَمُوْتُ جُزْءً افَجُزْءً ا

کہ وہ تدریجاً تحلیل ہو جائے گا۔

اور اسی معنی کے لحاظ سے بعض نے انسان کو مَائِتٌ (بصیغہ فاعل) کہا ہے۔ اور انہوں نے میّت و مائت میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ مَائِتٌ کے معنی تحلیل ہونے والے کے ہیں۔ اور مَیِّتٌ بمعنی مردہ کے۔

قاضی علی ابن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ ہماری زبان (یعنی عربی) میں مَائِتٌ بایں معنی ثابت نہیں ہے۔ اَلْمَیْتُ یہ مَیِّتٌ کا مخفف ہے اور مَوْتٌ مَائِت کا محاورہ مبالغہ پر محمول ہے۔ جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ وسَیْلٌ سَائِلٌ وغیرہا ہیں۔ اور بَلَدٌ یعنی شہر پر مَیِّتٌ اور مَیْتٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

سُقْنَاہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ: ہم اس کو ایک مری ہوئی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ (۷۔۵۷)

﴿بَلْدَۃً مَّیْتًا﴾ (۲۵۔۴۹) شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ کو)۔

اَلْمَیْتَۃُ: اس حیوان کو کہتے ہیں جس کی روح بغیر تزکیہ کے زائل ہوگئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ﴾ (۵۔۳) تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے۔ ﴿اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً﴾ (۶۔۱۴۵) بجز اس کے کہ وہ

---

[1] وصدرہ: قد کان لہ فی الموت راحۃ (مقید القافیہ) والبیت فی الحصری (۱: ۱۱۷۔۱۱۸) فی ثلاثۃ قال ابو اسحاق رُوِیَت لمحمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین وقد رویت لاخیہ موسیٰ وکان زید بن علیؓ کثیراً ینشد وروی فی العقد (۴: ۳۳، ۴۷۳) ثلاثۃ وعزاہ لزید بن علی والبیان والتبیین (۱: ۱۹۶) وفی ذیل الامالی (۳: ۱۴۳) ان ابن الاشعث لما ھزم اتی سجستان فولی شاماً فانشد فی ثلاثۃ ۱۲۔

[2] لم اجدہ ویرجیٰ ۱۲

مرا ہوا جانور ہو۔

اَلْمَوْتَانُ: یہ حیوان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اور مَوْتَان یا مَوَاتٌ بنجر زمین کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:۔ وَقَعَ فِی الْاِبِلِ مَوْتَانٌ کَثِیْرٌ: بہت سے اونٹ مر گئے۔

نَاقَةٌ مُمِیْتَةٌ وَّ مُمِیْتٌ: جس ناقہ کا بچہ مر گیا ہو۔ اِمَاتَةُ الْخَمْرِ: (کنایۃ) شراب کو پکا کر اس کا جوش مارنا۔

اَلْمُسْتَمِیْتُ: موت کا سامنا کرنے والا۔ نڈر آدمی۔

شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۴۱۶) فَاَعْطَیْتُ الْجِعَالَةَ مُسْتَمِیْتًا

تو میں نے موت سے نہ ڈرنے والے کو انعام دیا۔

اَلْمَوْتَةُ: ایک قسم کا جنون گویا اس سے علم و عقل مردہ ہو جاتا ہے اسی سے مردہ دل آدمی کو مَوْتَانُ الْقَلْبِ اور عورت کو مَوْتَانَةُ الْقَلْبِ کہا جاتا ہے۔

(م و ج)

اَلْمَوْجُ: سمندر سے پانی کی جو لہر مغرب کی طرف سے اٹھتی ہے اسے موج کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فِیْ مَوْجٍ کَالْجِبَالِ﴾ (۱۱۔۴۲) لہروں میں (چلنے لگی) (لہریں کیا تھیں) گویا پہاڑ (تھے)

﴿یَغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ﴾ (۲۴۔۴۰) جس پر لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر آ رہی ہو۔ مَاجَ کَذَا یَمُوْجُ وَتَمَوَّجَ تَمَوُّجًا موج کی طرح مضطرب ہونا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

﴿وَ تَرَکْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ﴾ (۱۸۔۹۹) (اس (روز) ہم ان کو چھوڑ دیں گے۔ کہ (روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔

(م و ر)

اَلْمَوْرُ: کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔ اور یہ مَارَ یَمُوْرُ مَوْرًا سے ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا﴾ (۵۲۔۹) جس دن آسمان لرزنے لگے گا کپکپا کر۔

مَارَ الدَّمُ عَلٰی وَجْهِهٖ کے معنی چہرہ پر تیزی سے خون جاری ہونے کے ہیں۔ اور مَوْرٌ غبار کو بھی کہتے ہیں۔ جو ہوا میں ادھر ادھر اڑتا ہے۔ اور نَاقَةٌ تَمُوْرُ فِیْ مَیْرِهَا کے معنی ہیں: اونٹنی کا تیز رفتاری کی وجہ سے غبار اڑاتے ہوئے چلے جانا اور تیز رو اونٹنی کو مَوَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔

[1] فی معجم البلدان (۳: ۴۷۴) قاله الاسدی وفی التبریزی: وقال شفیق بن سلیك الاسدی وهو شاعر اسلامی قاله معتذرا الی الضحاك (ابو انس الضحاك بن قیس بن خالد الشیبانی الفهری شهد صفین مع معاویة و غلب علی دمشق ودعا الی بیعة ابن الزبیر ثم دعا الی نفسه فقتل مراج راهط سنة ۶۵ راجع الاصابة ۶۴ : ۴ وتمامه: خفیف الحاذهن فتیان جرم" والبیت فی اللسان والحکم (جعل) والحماسة، مع المرزوقی رقم ۲۶۱ فی ستة ۱۲۔

كِتَابُ النُّوْن

(ن ب ء)

اَلنَّبَاءُ: کے معنی خبر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن کا فائدہ دے۔اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر پر نبا کا لفظ استعمال نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس میں تین چیزیں موجود نہ ہوں۔یعنی نہایت (۱) مفید (۲) ہونا اور اس سے علم (۳) یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا۔ اور نَبَا صرف اس خبر کو کہا جاتا ہے۔جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔جیسے خبر متواتر، خبر الٰہی، اور خبر نبوی اور لفظ نَبَاء چونکہ معنی خبر کو متضمن ہوتا ہے۔اس لیے اَخْبَرْتُهُ بِكَذَا کی طرح اَنْبَأْتُهُ بِكَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔اور معنی علم کو متضمن ہونے کی وجہ سے اَعْلَمْتُهُ كَذَا کی طرح اَنْبَأْتُهُ كَذَا بھی کہا جاتا ہے۔جیسے فرمایا:۔

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ﴾ (۳۸۔۶۷، ۶۸) کہہ دو کہ یہ ایک بڑی (ہولناک چیز کی) خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ﴾ (۷۸۔۱،۲) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔کیا بڑی خبر کی نسبت؟

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ (۶۴۔۵) کیا تم کو ان لوگوں کے حال کی خبر نہیں پہنچی جو پہلے کافر ہوئے تھے۔تو انہوں نے اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ لیا۔﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ﴾ (۱۱۔۴۹) یہ حالات منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں۔

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا﴾ (۷۔۱۰۱) یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سناتے ہیں۔﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ﴾ (۱۱۔۱۰۰) یہ (پرانی) بستیوں کے تھوڑے سے حالات ہیں جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (۴۹۔۶) اگر کوئی بدکار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی خبر کسی اہم واقعہ کی حامل ہو تو اگر چہ اس کے صحیح ہونے کا یقین یا ظن غالب حاصل ہو جائے لیکن جب تک اس پر نظر ثانی اور اچھی طرح سے اس کی جانچ پڑتال نہ ہو جائے اسے بیان کرنے میں توقف کرنا چاہیے۔

نَبَّأْتُهُ وَاَنْبَأْتُهُ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔چنانچہ قرآن میں ہے:۔

﴿اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (۲۔۳۱) اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔﴿اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ (۲۔۳۳) کہ......تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔جب انہوں نے ان کو ان کے نام بتائے۔﴿نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ﴾

(۱۲۔۳۷) کہ میں تم کو اس کی تعبیر بتا دوں گا۔
﴿وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۱۵۔۵۱) اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا حال دو۔
﴿قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۱۰۔۱۸) کہہ دو کیا تم خدا کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔
﴿اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ﴾ (۱۳۔۳۳) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جن کو وہ......... معلوم نہیں کرتا۔
﴿نَبِّـئُـوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (۶۔۱۴۳) اگر سچے ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔
﴿قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔
اور نَبَّاتُہٗ میں اَنْبَاتُہٗ کی بنسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ (۴۱۔۵۰) پس کافر جو عمل کرتے ہیں۔ وہ ہم ان کو ضرور جتائیں گے۔
﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ﴾ (۷۵۔۱۳) اس دن انسان نے جو عمل آگے بھیجے۔ اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے۔ سب بتا دیئے جائیں گے۔
اور اس سے ابلغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ:۔
﴿فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ (۶۶۔۳) تو جب وہ ان کو جتائی تو پوچھنے لگیں گے کہ آپ کو یہ کس نے بتایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

میں اس خبر کے محقق اور من جانب اللہ ہونے پر شبہ کرنے کے لیے جواب میں اَنْبَاءَ کی بجائے نَبَّاءَ کہا ہے۔ کیونکہ یہ اس سے ابلغ ہے۔
اسی طرح آیت کریمہ:۔
﴿قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۔۹۴) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۶۲۔۸) پھر جو جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائے گا۔ بھی اس لیے ابلغ ہونے پر دال ہیں۔ اَلنُّبُوَّۃُ: وہ سفارت جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ان کے امور دنیوی اور اخروی میں خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جاری ہوتی ہے اسے نبوت کہا جاتا ہے۔ اور نبی کو نبی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کی خبر دیتا ہے۔ جن پر عقول سلیمہ مطمئن ہوتی ہیں۔ اور نَبِيٌّ ہوسکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل سے ہو۔ چنانچہ فرمایا: ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْ﴾ (۱۵۔۴۹) (اے پیغمبر) میرے بندوں کو بتا دو۔
﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ﴾ (۳۔۱۵) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں؟
اور یہ بھی کہ فعیل بمعنی مفعول سے ہو یعنی خبر دیا گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ (۶۶۔۳) مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔
تَنَبَّاَ فُلَانٌ کے معنی دعویٰ نبوت کرنے کے ہیں اور وضع لغوی کے اعتبار سے نبی کے متعلق اس کا استعمال صحیح ہونا

چاہیے تھا۔کیونکہ یہ باب تفعیل کا مطاوع ہوتا ہے، جیسے: زَیَّنَہٗ فَتَزَیَّنَ وَحَلَّاہُ فَتَحَلّٰی وَجَمَّلَہٗ فَتَجَمَّلَ وغیرہ۔
لیکن جھوٹا دعوٰیٔ نبوت کرنے والے کے حق میں متعارف ہونے کی وجہ سے سچے نبی کے حق میں اس کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے اور صرف مدعی کاذب کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے تَنَبَّاءَ مُسَیْلَمَۃُ یعنی مُسَیلمہ نے جھوٹا دعوٰیٔ نبوت کیا۔ پھر اس بات پر متنبہ کرنے کے لیے کہ اس کی خبریں منجانب اللہ نہیں ہوتی تھیں نبی کی تصغیر کر کے مُسَیْلَمَۃُ نُبَیِّءُ سَوْءٍ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی نے اسکا کلام سن کر کہا تھا۔ وَاللّٰہِ مَا خَرَجَ ھٰذَا الْکَلَامُ مِنْ اِلٍّ: کہ اللہ کی قسم: یہ ال یعنی اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اَلنَّبْأَۃُ: پست اور خفی آواز۔

(ن ب ت)

اَلنَّبْتُ وَالنَّبَاتُ: ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے۔ اسے نَبْتٌ یَا نَبَاتٌ کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تنہ دار ہو جیسے درخت۔ یا بے تنہ جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کے تنہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ ﴿لِّنُخْرِجَ بِہٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا﴾ (۷۸۔۱۵) تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔
میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور نباتات، حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا ہے۔ اور اِنْبَاتٌ (افعال) کا لفظ ان سب چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاکِھَۃً وَّاَبًّا﴾ (۸۰۔۲۷ تا ۳۱) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور زیتون اور کھجوریں، اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ۔
﴿فَاَنْۢبَتْنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ مَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَھَا﴾ (۲۷۔۶۰) (ہم نے) پھر اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا۔ کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے۔
﴿یُنْۢبِتُ لَکُمْ بِہِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۱) اسی پانی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اگاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاللّٰہُ اَنْۢبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ (۷۱۔۱۷) اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔
کی تفسیر میں علمائے نحو نے لکھا ہے کہ یہاں نَبَاتًا مصدر من غیر بابہٖ ہے اور اِنْبَاتًا کی جگہ پر استعمال ہوا ہے۔[1] دوسرے علماء کے نزدیک نَبَاتًا حال ہے۔ مصدر نہیں ہے۔ اور اس سے متنبہ کیا ہے کہ انسان بھی ایک طرح سے نبات میں داخل ہے کیونکہ اس کی ابتدائی نشأت بھی تراب ہی سے ہے۔ اور پھر وہ نبات ہی کی طرح بڑھتا ہے اگرچہ اس میں نبات سے کچھ زائد اوصاف پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
﴿ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ﴾ (۴۰۔۶۷) وہی تو ہے جس نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا

---

[1] نسب الالوسی ھذا القول الی ابی حیان النحوی وجماعۃ من العلماء وعلی ھذا ایکون نباتا مصدراً منصوبًا لا بنبت روح المعانی (۲۸۔۷۵) ۱۲۔

پھر نطفہ بنا کر۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ (۳۔۳۷) اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔اور آیت کریمہ:۔﴿تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ﴾ (۲۳۔۲۰) (یعنی زیتون کا درخت کہ)...... روغن...... لیے ہوئے اگتا ہے۔ میں باء تعدیۃ کے لیے نہیں ہے کیونکہ نَبَتَ: خود فعل متعدی ہے۔بلکہ حال کے لیے ہے: اور تقدیر یہ ہے تَنْۢبُتُ حَامِلَةً لِلدُّهْنِ: یعنی وہ درخت اس حال میں اگتا ہے کہ روغن اس میں بالقوۃ موجود ہوتا ہے۔مشہور محاورہ ہے: اِنَّ بَنِیْ فُلَانٍ لَنَابِتَةُ شَرٍّ کہ فلاں لوگ فساد کی جڑ ہیں۔ نَبَتَتْ فِیْهِمْ نَابِتَةٌ: یعنی ان کی نئی پود جوان ہوگئی۔

(ن ب ذ)

اَلنَّبْذُ کے معنی کسی چیز کو در خود اعتناء نہ سمجھ کر پھینک دینے کے ہیں۔اسی سے محاورہ مشہور ہے۔ نَبَذْتُهُ نَبْذَ النَّعْلِ الْخَلِقِ: میں نے اسے پرانے جوتے کی طرح پھینک دیا۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ﴾ (۱۰۴۔۴) وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ (۳۔۱۸۷) تو انہوں نے اسے پس پشت پھینک دیا۔

یعنی انہوں نے اسے قابل التفات نہ سمجھا۔نیز فرمایا:

﴿نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ﴾ (۲۔۱۰۰) تو ان میں ایک فریق نے اس کو بے قدر چیز کی طرح پھینک دیا۔﴿فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ﴾ (۲۸۔۴۰) تو ہم نے ان کو اور ان کے لشکر کو پکڑ لیا۔اور دریا میں ڈال دیا۔

﴿فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ﴾ (۳۷۔۱۴۵) پھر ہم نے ان کو فراخ میدان میں ڈال دیا۔

﴿لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ﴾ (۶۸۔۴۹) تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ﴾ (۸۔۵۸) تو ان کا عہد انہی کی طرف پھینک دو (اور برابر کا جواب دو) میں فَانْۢبِذْ عَلٰی سَوَآءٍ کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ صلح سے دستبردار ہو جاؤ لہٰذا یہاں معاہدہ صلح سے دستبردار ہونے کے لیے مجاز اَنْۢبِذْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ آیت کریمہ:۔﴿فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ وَ اَلْقَوْا اِلَی اللّٰهِ یَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ ((۱۶۔۸۶۔۸۷) تو ان کے کلام کو مسترد کر دیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ میں قول (اور متکلم) کے متعلق اِلْقَاءَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اور آیت:۔ فَانْۢبِذْ الخ میں متنبہ کیا ہے کہ (اس صورت میں) ان کے معاہدہ کو مزید مؤکد نہ کیا جائے۔بلکہ حسن معاملہ سے اسے فسخ کر دیا جائے اور ان کے رویہ کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے۔یعنی جب تک وہ معاہدہ کو قائم رکھیں اس کا احترام کیا جائے۔فَانْتَبَذَ فُلَانٌ کے معنی اس شخص کی طرح یکسو ہو جانے کے ہیں جو اپنے آپ کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہو۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا﴾ (۱۹۔۲۲) اور وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہوگئیں اور اسے لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔

اور قَعَدَ نَبْذَةً وَنُبْذَةً کے معنی یکسو ہو کر بیٹھ جانے کے ہیں اور راستہ میں پڑے ہوئے بچے کو صَبِیٌّ مَنْبُوْذٌ وَنَبِیْذٌ کہتے ہیں۔جیسا کہ اسے مَلْقُوْطٌ یا لَقِیْطٌ کہا جاتا ہے لیکن اس لحاظ سے کہ کسی نے اسے پھینک دیا ہے۔ اسے مَنْبُوْذٌ کہا جاتا ہے۔اور اٹھائے جانے کے لحاظ سے "لَقِیْطٌ" کہا جاتا ہے۔اَلنَّبِیْذُ: اصل میں انگور یا کھجور کو کہتے ہیں۔ جو پانی میں ملائی گئی ہو۔ پھر خاص قسم کی شراب پر بولا جاتا ہے۔

(ن ب ز)

اَلنَّبْزُ کے معنی کسی کو برے نام کے ساتھ پکارنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ﴾ (۴۹۔۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

(ن ب ط)

اَلْاِسْتِنْبَاطُ: کے معنی استخراج کے ہیں۔جیسے فرمایا:۔

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (۴۔۸۳) اور اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔اور یہ اَنْبَطْتُ کَذَا سے استفعال کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی پانی نکالنے کے ہیں اور کنواں کھودنے کے بعد جو پہلی دفعہ پانی نکالا جاتا ہے اسے نبط کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ اَنْبَطُ: اسپ سفید بغل۔اسی سے نَبْطٌ ایک مشہور قوم کا نام ہے۔

(ن ب ع)

اَلنَّبْعُ کے معنی چشمہ سے پانی پھوٹنے کے ہیں۔اور یہ نَبَعَ الْمَاءُ یَنْبُعُ (ن) نُبُوْعًا وَنَبْعًا کا مصدر ہے اور اَلْیَنْبُوْعُ اس چشمہ کو کہتے ہیں جس سے پانی ابل رہا ہو اس کی جمع ینابیع آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۹۔۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا۔کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا ہے۔

اَلنَّبْعُ ایک قسم کا درخت جس کی کمانیں بنتی ہیں۔

(ن ب و)

اَلنَّبِیُّ: (بدون ہمز) کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے۔اور اس پر وہ مُسَیْلَمَةُ نُبَیِّءُ سُوْءٍ کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔ [1]

مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نَبْوَةٌ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ [2] جیسا کہ آیت کریمہ:۔

﴿وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا﴾ (۱۹۔۵۷) اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔

کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے۔پس معلوم ہوا کہ نبی بدون

---

[1] ای لا جماع العرب انه بالهمزة ۱۲۔

[2] وفی الفائق ومنه (نبوة) زعم ان اشتقاق البنی منه وهو غیر متقبل عند محققة اصحابنا ولا یعرج علیه (۲:۲۶۲)

ہمزہ (مہموز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر مُنَبَّأٌ لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو ازراہ بغض یَا نَبِیَّ اللّٰهِ کہہ کر پکارا تو آپ نے فرمایا❶ (۱۲۵)

((لَسْتُ بِنَبِیءِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ نَبِیُّ اللّٰهِ)) کہ میں نبی اللہ نہیں ہوں بلکہ نَبِیُّ اللّٰهِ ہوں۔

اَلنَّبْوَۃُ وَالنَّبَاوَۃُ کے معنی بلندی کے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے۔

نَبَا بِفُلَانٍ مَکَانُہٗ: کہ اسے یہ جگہ راس نہ آئی۔جیسا کہ قَضَّ عَلَیْهِ مَضْجَعُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں۔نَبَا السَّیْفُ عَنِ الضَّرِیْبَةِ: تلوار کا اچٹ جانا۔پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر نَبَا بَصَرُہٗ عَنْ کَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

(ن ت ق)

نَتَقَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر ڈھیلا کر دینے کے ہیں۔جیسے نَتَقَ عُرَی الْحِمْلِ: اس نے بوجھ کی گرہیں کھول دیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ﴾ (۷۔۱۷۱) اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ اٹھا کھڑا کیا۔

اسی سے استعارہ کے طور پر کثیر الاولاد عورت کو اِمْرَءَۃٌ نَاتِقٌ کہا جاتا ہے۔❷ اور اس عورت کے ساتھ تشبیہ دے کر زود آتش افروز چقماق کو بھی زَنْدٌ نَاتِقٌ کہتے ہیں۔

(ن ث ر)

نَشَرَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو بکھیرنے اور پراگندہ کر دینے کے ہیں۔

یہ نَثَرْتُہٗ (ض) کا مصدر ہے۔اور اِنْتَثَرَ (انفعال) کے معنی بکھر جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ﴾ (۸۲۔۲) اور جب تارے جھڑ پڑیں۔

اور پہنی ہوئی زرہ کو نَثْرَۃٌ کہا جاتا ہے۔

نَثَرَتِ الشَّاۃُ: بکری کا چھینک کر فضلہ باہر پھینکنا اور چھینک سے جو فضلہ ناک سے بہہ نکلتا ہے اسے بھی نَثْرَۃٌ کہا جاتا ہے کبھی نَثْرَہٌ کا لفظ ناک پر بھی بولا جاتا ہے۔ اسی سے نَثْرَۃٌ ایک ستارے کا نام ہے جسے اَنْفُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔محاورہ ہے۔

طَعَنَهٗ فَانْتَثَرَ: اسے نیزہ مارا تو وہ ناک کے بل گر پڑا۔

اَلْاِسْتِنْثَارُ: ناک میں پانی چڑھا کر جھاڑنا۔

(ن ج د)

اَلنَّجْدُ کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

میں نَجْدَیْنِ کا لفظ حق و باطل، صدق و کذب اور حسن و قبیح، قول و عمل کے لیے بطور مثال ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں راستے واضح کر دیے ہیں۔جیسے

---

❶ رواه الحاكم فی المستدرك والحديث غير صحيح لان فی سنده حمران من غلاة الشيعة ومما يدل على ان الصحيح انه بالهمزة قرء مهموزا فی السبعة

❷ وفی الحديث عليكم بالابكار فانهن افواها وانتق ارحاما (انظر النهاية (۱۳۱/٤) والفائق (٦٥/٣)۔

فرمایا:۔
﴿اِنَّا ھَدَیْنٰـہُ السَّبِیْلَ﴾ لایۃ (۷۶۔۳)اور اسے رستہ بھی دکھایا۔

اَلنَّجْدُ: (ایضاً)ایک علاقے کا نام ہےاور اَنْجَدَہٗ کے معنی نجد کا قصد کرنے کے ہیں۔اور رَجُلٌ نَجِدٌ وَنَجِیْدٌ وَنَجْدٌ کے معنی مشہور طاقت وراور بہادر آدمی کے ہیں۔اور اِسْتَنْجَدَہٗ فَاَنْجَدَنِیْ کے معنی ہیں: میں نے اس سے فریاد کی تو اس نے بہادری اور قوت سے میری مدد کی اور کبھی اِسْتَنْجَدَ فُلَانٌ کے معنی قوی ہونا کے بھی آجاتے ہیں۔اور تکلیف زدہ اور مغلوب آدمی کو مَنْجُوْدٌ کہا جاتا ہے۔گویا وہ نَجْدَۃٌ یعنی شدت میں گرفتار ہے۔

اَلنَّجْدُ: (ایضاً)پسینہ۔ نَجَدَہُ الدَّھْرُ کے معنی کسی کو قوی کردینے کے ہیں۔گویا وہ تجربہ حاصل کر کے قوی ہو گیا۔ [1]

اسی سے فُلَانٌ ابْنُ نَجْدَۃَ کَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اس کام میں ماہر ہے۔

اَلنِّجَادُ: مکان کی آراستگی کا سامان یہ(نَجَدَ) کی جمع ہے۔

نَجَّادٌ فرش سازوآنچہ بستر و بالین دوزد۔نِجَادُ السَّیْفِ: تلوار لٹکانے کا پرتلہ۔

اَلنَّاجُوْدُ: شراب صاف کرنے کی صافی۔راوُوق۔

(ن ج س)

اَلنَّجَاسَۃُ کے معنی پلیدی کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔نجاست: (۱) حسی یا مادی جس کا ادراک حس سے ہوسکتا ہو۔نجاست (۲) معنوی: جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہو۔چنانچہ نجاست معنوی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق فرمایا:۔
﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ (۹۔۲۸)مشرک تو پلید ہیں۔

نَجَّسَہٗ کے معنی: کسی چیز کو نجس کردینا کے ہیں۔نیز اس کے معنی ازالہ نجاست بھی آتے ہیں۔ اور اسی سے تَنْجِیْسُ الْعَرَبِ ہے یعنی تعویذ گنڈا۔جو شیطانی نجاست کو دور کرنے کے لیے بچے کے گلہ میں لٹکاتے تھے۔

نَاجِسٌ وَنَجِیْسٌ ایک بری اور لاعلاج بیماری۔

(ن ج م)

اَلنَّجْمُ: اصل میں طلوع ہونے والے ستارے کو کہتے ہیں۔اس کی جمع نُجُوْمٌ آتی ہے۔اور نَجَمَ (ن) نُجُوْمًا وَنَجْمًا کے معنی طلوع ہونے کے ہیں۔ نَجم کا لفظ کبھی اسم ہوتا ہے۔اور کبھی مصدر اسی طرح نجوم کا لفظ کبھی قُلُوْبٌ وَ جُیُوْبٌ کی طرح جمع ہوتا ہے اور کبھی طُلُوْعٌ وَغُرُوْبٌ کی طرح مصدر اور تشبیہ کے طور پر سبزہ کے اگنے اور کسی رائے کے ظاہر ہونے پر بھی نَجَمَ النَّبْتُ اَوِ الْقَرْنُ وَنَجَمَ لِیْ رَأْیٌ نَجْمًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

نَجَمَ فُلَانٌ عَلَی السُّلْطَانِ: بادشاہ سے بغاوت کرنا۔نَجَّمْتُ الْمَالَ عَلَیْہِ: اس کے اصل معنی تو ستاروں کے طلوع کے لحاظ سے قرض کی قسطیں مقرر کرنے کے ہیں۔مثلاً: فلاں ستارے کے طلوع پر مال کی اتنی قسط ادا کرتا رہوں گا۔مگر عرف میں مطلق اقساط مقرر کرنے پر

[1] وفی المثل "وانہ، لمنجد" المیدانی (۱/۲۹)۔

بولا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ (۱۶۔۱۶) اور لوگ ستاروں سے بھی رستے معلوم کرتے ہیں۔

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ﴾ (۳۷۔۸۸) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی۔

یعنی علم نجوم سے حساب نکالا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ (۵۳۔۱) تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ ہے اور طَلَعَ کی بجائے هَوٰی کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ طلوع کے معنی پر تو لفظ نجم ہی دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ثریا یعنی پروین ہے۔ کیونکہ اہل عرب جب مطلق اَلنَّجْمِ کا لفظ بولتے ہیں تو پروین ہی مراد ہوتی ہے۔ جیسا کہ مقولہ ہے [1] (الرمل)

طَلَعَ النَّجْمُ غُدَيَّهْ
وَابْتَغَى الرَّاعِيْ شُكَيَّهْ

صبح کا ستارہ طلوع ہوا اور چرواہے نے اپنا مشکیزہ سنبھالا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں النجم سے مراد نجوم القرآن ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تدریجاً معین مقدار میں نازل ہوتا رہا ہے اور هوی سے اس کا نزول مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ (۵۶۔۷۵) ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم۔

میں بھی مواقع النجوم .... کی دو طرح تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یعنی بعض نے مواقع النجوم سے مراد ستاروں کے منازل لیے ہیں اور بعض نے نجوم القرآن مراد لیے ہیں۔

اَلتَّنَجُّمُ: علم نجوم کے حساب سے کوئی پیش گوئی کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵۔۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدے کر رہے ہیں۔

میں نجم سے بے تنہ نباتات یعنی جڑی بوٹیاں مراد ہیں اور بعض نے ستارے مراد لیے ہیں۔

(ن ج و)

اصل میں نَجَاءٌ کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اسی سے نَجَا فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں۔ اور اَنْجَيْتُهٗ وَنَجَّيْتُهٗ کے معنی نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۷۔۵۳) اور جو لوگ ایمان لائے ...... ان کو ہم نے نجات دی۔ ﴿اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ﴾ (۲۹۔۳۳) ہم آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو بچالیں گے۔

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ (۲۔۴۹) جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے خلاصی بخشی۔

﴿فَلَمَّاۤ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۱۰۔۲۳) لیکن جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ (۷۔۸۳) تو ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچالیا۔ مگر ان کی بی بی۔ ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا﴾ (۷۔۷۲) پھر ہم نے ہود علیہ السلام اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کو نجات بخشی۔

---

[1] انظر للكلمة الميداني والبحر (۱۵۷/۸) والمرزوقي (۴۷۹) اوفي المعاني للقبتي عشاء وكساء بدل غديه وشكيه بغير عزو۔

﴿نَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا﴾ (۳۷۔۱۱۵) اور ان کو اور ان کی قوم کو...... نجات بخشی۔

﴿نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ نِعْمَةً﴾ (۵۴۔۳۴) ان کو پچھلی رات ہی سے بچالیا اپنے فضل سے۔

﴿وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۱۔۱۸) اور جو ایمان لائے...... ان کو ہم نے بچالیا۔

﴿نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۱۱۔۵۸) اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا﴾ (۱۰۔۱۰۳) اور ہم اپنے پیغمبروں کو...... نجات دیتے رہے ہیں۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۹۔۷۲) پھر ہم پرہیز گاروں کو نجات دیں گے۔

اَلنَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ: بلند جگہ، جو بلندی کی وجہ سے اپنے ماحول سے الگ معلوم ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ سیلاب کی زد سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اسے نَجْوَةٌ یا نَجَاةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے نَجَّيْتُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کو نَجْوَۃٌ یعنی علیحدہ بلند جگہ پر چھوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ﴾ (۱۰۔۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔

اور نَجَوْتُ کے معنی درخت یا بکری کا پوست اتارنا بھی آتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۱۸) فَقُلْتُ انْجَوَا عَنْهَا نَجَا الْجِلْدِ اِنَّهٗ
سَيُرْضِيْكُمَا مِنْهَا سَنَامٌ وَّغَارِبُهٗ

میں نے کہا کہ اس کا پوست اتارلو بے شک اس کی کوہان اور کندھے تمہارے لیے کافی ہوں گے۔ نَاجَيْتُهٗ کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔ مگر اس کے اصل معنی بلند زمین پر کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے ہیں۔ بعض نے اسے نَجَاةٌ سے لیا ہے۔ لہٰذا نَاجَيْتُهٗ کے اصل معنی کسی معاملہ میں دوسرے کی رہائی کے لیے اس کی مدد کرنے کے ہیں۔ یا اپنے بھید کو دوسروں پر افشا ہونے سے بچانے کے ہیں۔ تَنَاجَى الْقَوْمُ لوگوں کا باہم سرگوشی کرنا۔

چنانچہ فرمایا:۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ (۵۸۔۹) مومنو! جب تم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگو تو گناہ اور زیادتی، پیغمبر کی نافرمانی کی باتیں نہ کرنا۔ بلکہ نیکوکاری اور پرہیز گاری کی باتیں کرنا۔

﴿اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ (۵۸۔۱۲) جب تم پیغمبروں کے کانوں میں کوئی بات کہو تو بات کہنے سے پہلے (مساکین

---

[1] البیت فی اللسان (نجا، جمع) غیر منسوب والخزانة (۴: ۲/۲۷۰: ۲۲۷) والبیت من شواهد سیبویه فی الکتاب والتنبیهات للبکری علی القالی واصلاح المنطق ۹۴ ونسبه ابن البری بعید الرحمن بن حسان بن ثابت لئکنه لابی الغمر الکلابی (کذا قال العینی ونسبه ابی العباب للصاغانی ولئکن نقد علیه صاحب الخزانة والبیت مما اورده العلما شاهدا علی انه یجوز اضافة الشیء الی نفسه اذا اختلف اللفظان فان النحا والحلد مترادفان وقد تضایفا راجع الخزانة (۴: ۲۷۰۔۲۷۲) وابن ولاد ۱۱۲ و ذهب السیرانی فی شرح ابیات الاصلاح: ان النحا ههنا بمعنی النحو منصوب علی انه مفعول مطلق والبیت ایضا فی امالی الزجاجی والنبهات لابی القاسم البصری (علی بن حمزه)۱۲۔

کو) کچھ دے دیا کرو۔

اَلنَّجْوٰی: یہ اصل میں مصدر ہے جیسے فرمایا:۔

﴿اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ﴾ (۵۸۔۱۰) (کافروں کی) سرگوشیاں تو شیطان (کی حرکات) سے ہیں۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰی﴾ (۵۸۔۸) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا﴾ (۲۱۔۳) اور ظالم لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ میں نَجْوٰی کے ساتھ اَسَرُّوْا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے ہر طرح سے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کیوں کہ نَجْوٰی اگرچہ خفیہ ہوتا ہے لیکن کبھی قبل از وقت افشاء ہو جاتا ہے۔ نیز فرمایا:۔﴿مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ (۵۸۔۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع اور) کانوں میں صلاح مشورہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے۔

اور لفظ نَجْوٰی کبھی بطور وصف کے بھی آ جاتا ہے اور واحد و جمع دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

هُوَ نَجْوٰی وَهُمْ نَجْوٰی قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰٓی﴾ (۱۷۔۴۷) اور جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔

اَلنَّجِیُّ کے معنی سرگوشی کرنے والے کے ہیں یہ بھی واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا﴾ (۱۹۔۵۲) اور باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا۔

﴿فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے نا امید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

اِنْتَجَیْتُ فُلَانًا: کسی کو راز دار بنانا۔

اَنْجٰی فُلَانٌ: بلند زمین پر جانا۔

هُمْ فِیْ اَرْضِ نَجَاةٍ: وہ ایسی سرزمین میں ہیں جس کے درختوں سے لاٹھیاں اور کمانیں بنائی جاتی ہیں۔ اور اَلنَّجَا اس لکڑی کو کہتے ہیں۔ جس کا پوست اتار دیا گیا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نَجَوْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے منہ کی بدبو سونگھنے کے ہیں۔ اور شعر سے استدلال کیا ہے[1] (الوافر)

(۴۱۹) نَجَوْتُ مُجَالِدًا فَوَجَدْتُ مِنْهُ
كَرِيْحِ الْكَلْبِ مَاتَ حَدِيْثُ عَهْدٍ

تو بقول بعض اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے مجالد کے منہ کی بو سونگھی تو اس سے تازہ مرے ہوئے کتے کی سی بدبو پائی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ محض اس شعر کی بنا پر نَجَوْتُ کے یہ معنی بیان کرتے ہیں تو یہ شعر ان کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ شاعر کی مراد تو یہ ہے کہ میں نے مجالد سے سرگوشی کی تو مرض بخر کی وجہ سے اس کے منہ سے مجھے مردہ کتے کی سی بدبو آئی۔ اور کنائیہ کے طور پر نَجْوٌ کے معنی پائخانہ

---

[1] فی اللسان (نجا) غیر منسوب والبیت لحکم بن عدل فی قصیدة ٤٤ بیتا یهجو فیها محمد بن حسان بن سعد کما فی الاغانی (٢: ٤١٢) و عیون الاخبار (٤: ٦٢) وفی البیت تحریف دان نقله ایضا صاحب اللسان والصواب فی الروایة نجوت محمدا بدل نجوت مجالدا کما فی الحیوان (١: ٢٥١) فعلی هذا لاشاهد ١٢۔

کے بھی آتے ہیں۔محاورہ ہے: شَرِبَ دَوَاءً فَمَا اَنْجَاهُ: اس نے دوا پی لیکن ٹٹی نہ آئی۔

اَلْاِسْتِنْجَاءُ کے معنی استنجاء کرنے اور رفع حاجت۔کے لیے علیحدہ جگہ تلاش کرنے کے ہیں۔جیسا کہ تَغَوَّطَ کے معنی پست جگہ تلاش کرنے کے آجاتے ہیں کبھی استنجاء کے معنی ازالہ نجاست کے لیے مٹی کا ڈھیلا تلاش کرنا بھی ہوتے ہیں۔جیسے اِسْتَجْمَرَ: پتھر تلاش کرنا۔

اَلنَّجَأَةُ (مہموز) نظر بد لگانا۔حدیث میں ہے۔ [1]

اِدْفَعُوْا نَجَأَةَ السَّآئِلِ بِاللُّقْمَةِ: یعنی سائل کی حریصانہ نظر کو لقمہ سے دور کرو۔

(ن ح ب)

اَلنَّحْبُ: اس نذر کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا واجب ہو۔محاورہ ہے۔

قَضٰى فُلَانٌ نَحْبَهٗ یعنی فلاں نے اپنی نذر پوری کی قرآن میں ہے:۔

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔ (۳۳۔۲۳)

مجازاً اس سے موت مراد لی جاتی ہے۔جیسا کہ قَضٰى اَجَلَهٗ اَوِ اسْتَوْفٰى اُكُلَهٗ اَوْ قَضٰى مِنَ الدُّنْيَا حَاجَتَهٗ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں۔اور ان سے موت مراد ہوتی ہے۔

اَلنَّحِيْبُ کے معنی گریہ زاری اور آواز کے ساتھ رونے کے ہیں۔اور نُحَابٌ کھانسی کو کہتے ہیں۔

(ن ح ت)

نَحَتَ (ض) کے معنی لکڑی، پتھر یا اس قسم کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ﴾ (۲۶۔۴۹) اور تکلیف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر......گھر بناتے ہو۔

نُحَاتَةٌ: تراشہ۔وہ ریزے جو کاٹنے سے گریں اور انسانی فطرت کو اس لحاظ سے کہ انسان کی ساخت اس کے مطابق بنائی گئی ہے نَحِيْتَةٌ کہا جاتا ہے۔اور اس لحاظ سے کہ وہ انسان کے اندر پیوست کی گئی ہے غریزہ کہلاتی ہے۔

(ن ح ر)

اَلنَّحْرُ: سینہ کا بالائی حصہ جہاں پر ہار پڑا رہتا ہے۔نَحَرْتُهٗ: کسی کے سینہ پر مارنا۔اسی سے نَحْرُ الْبَعِيْرِ ہے جس کے معنی اونٹ کے سینہ پر برچھا مار کر اسے ذبح کرنے کے ہیں۔

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔

﴿فَنَحَرُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (۲۔۷۱) انہوں نے اس بیل کو ذبح کیا۔اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔پھر نَحْرُ الْبَعِيْرِ کی تشبیہ سے اِنْتَحَرُوْا عَلٰى كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز پر باہم لڑائی کرنے کے ہیں۔

نَحْرَةُ الشَّهْرِ وَنَحِيْرُهٗ: مہینہ کے پہلے دو دن اور تیسری رات کی مجموعی مدت۔

اور بقول بعض، مہینے کے آخری دن کو بھی نَحِيْرَةٌ کہا جاتا ہے۔گویا وہ اپنے سے پہلے دنوں کو تحریر کر ڈالتا ہے۔

[1] انظر للحديث الفائق (۲/۲٦٥) وفيه رُدُّوا بدل ادفعوا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (۱۰۸۔۲) اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔

میں خاص کر ان ہر دو ارکان یعنی نماز اور قربانی ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں عبادتیں ضروری ہیں۔ اور ہر دین اور ہر دور میں یہ واجب رہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے یہاں وَانْحَرْ کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے ہیں۔ ❶ (۱۲۶)

اور بعض نے کہا ہے کہ ریاضت کے ذریعہ نفس کشی مراد ہے۔

اَلنِّحْرِیْرُ: کسی چیز کا ماہر و حاذق۔

(ن ح س)

اَلنُّحَاسُ: دھواں، بغیر شعلہ کے آگ کی لپٹ۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ﴾ (۳۵۔۵۵) تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا۔

تو یہاں نُحَاس کے معنی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ اور لپٹ کا رنگ چونکہ تانبے جیسا ہوتا ہے لہٰذا تشبیہاً نُحَاس کے معنی تانبا بھی آجاتے ہیں۔

اَلنَّحْسُ: (منحوس) یہ سعد کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾ (۱۹۔۵۴) سخت منحوس دن میں۔

﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ﴾ (۱۶۔۴۱) ہم نے ان پر نحوست کے دنوں میں زور کی ہوا چلائی۔

اور ایک قرأت میں نَحْسَاتٍ بِفَتْحِ الْخَاءِ ہے۔ جس کے معنی بعض نے منحوس اور بعض نے سخت سردی والے دنوں کے کیے ہیں۔ اصل میں نَحَسَ کے معنی افق آسمان کے سرخ ہو کر نحاس کی طرح ہو جانے کے ہیں۔ اور یہ نحوست کے لیے ضرب المثل ہے۔

(ن ح ل)

اَلنَّحْلُ: شہد کی مکھی۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ (۶۸۔۱۶) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا۔ اَلنَّحْلَةُ وَالنِّحْلَةُ: اس عطیہ کو کہتے ہیں جو تبرعاً دیا جائے۔ یہ ہبہ سے خاص ہے۔ کیونکہ ہر ہبہ کو نحْلَة تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نحلہ کو ہبہ نہیں کہتے۔ میرے خیال میں یہ نَحْلٌ سے مشتق ہے۔ اور اس میں مکھی کے فعل کے معنی ملحوظ ہیں۔ تو گویا نَحْلَتُهُ کے معنی نَحْلٌ کی طرح عطیہ دینے کے ہیں جس پر کہ آیت:۔ ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ الْاٰيَة میں متنبہ کیا ہے۔ حکماء کا بیان ہے کہ نحل جن پودوں سے غذا لیتی ہے۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ الٹا فائدہ پہنچاتی ہے۔ اور شہد جیسی شفا بخش چیز لوگوں کو حاصل کر کے دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق بیان فرمایا ہے۔

اور نَحْلَةٌ وَنِحْلَةٌ: صداق یعنی عورتوں کے مہر کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں سوائے لذت اندوزی کے

---

❶ وفی السنن للبیھقی والتاریخ للبخاری منسوب الی علیؓ وانس ولکن قال صاحب الجوھری النقی ان ھذاہ الروایۃ مضطربۃ ورِوایۃ انس غیر صحیحۃ وقال ابن کثیر والصحیح ان المراد منہ الزبیحۃ وقال الجصاص ھو معناہ الحقیقی الذی یفھم عند الاطلاق (احکام القرآن ۳/۵۱۵)

اور کوئی مالی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔اسی سے اولاد کو عطیہ دینے پر نَحَلَ ابْنَہٗ کَذَا وَاَنْحَلَہٗ بولتے ہیں۔اور اسی سے نَحَلْتُ الْمَرْءَۃَ ہے۔قرآن پاک میں ہے۔﴿وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَۃً﴾ (۴۔۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔اور نَحِلَ جِسْمُہٗ کے معنی دبلا ہو کر مکھی کی طرح باریک ہو جانے کے ہیں۔ اور اسی سے تیز تلواروں کو ان کی دھاروں کے باریک ہونے کی وجہ سے نَوَاحِلُ کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نِحْلَۃٌ کو اصل قرار دے کر نحل کو اس سے مشتق مانا جائے۔کیونکہ مکھی سے جو شہد حاصل ہوتا ہے وہ بھی فائدہ بخش ہونے کے لحاظ سے ایک قسم کی عطا ہی ہوتی ہے۔

اَلْاِنْتِحَالُ کے معنی کسی چیز کا ادعاء کرنے اور لینے کے ہیں اسی سے فُلَانٌ یَنْتَحِلُ الشِّعْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی شعری سرقہ کرنے کے ہیں۔واللہ اعلم۔

نحن

نَحْنُ: (ہم) اسے ضمیر متکلم مع الغیر کہتے ہیں۔قرآن پاک میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق نَحْنُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔جیسے فرمایا:۔

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (۱۲۔۳) اے پیغمبر علیہ السلام ہم تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔اس کی تاویل میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔لیکن شاہی خطابات کی طرح صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے۔اور بعض نے کہا ہے ذات! باری تعالیٰ اپنے متعلق اس قسم کے الفاظ ان افعال کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔جو بواسطہ ملائکہ یا اولیاء اللہ کے سرانجام پاتے ہیں تو نَحْنُ سے مراد اللہ تعالیٰ اور وہ فرشتے یا اولیاء کرام ہوتے ہیں۔جن کے ذریعہ وحی، مومنین کی نصرت کفار کی ہلاکت اور اس قسم کے دیگر افعال سرانجام پاتے ہیں۔جن کا ذکر کہ آیت:۔

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ (۷۹۔۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

میں پایا جاتا ہے۔اس بنا پر آیت کریمہ:۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ﴾ (۵۷۔۸۵) اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں۔

میں نَحْنُ سے حالت نزع کے وقت حاضر ہونے والے فرشتے مراد ہوں گے۔جن کا ذکر کہ آیت:۔

﴿تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ﴾ (۱۶۔۲۸) میں پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک کا نزول بھی قلم، لوح محفوظ اور جبریل علیہ السلام کی وساطت سے ہوا ہے۔لہٰذا آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ﴾ (۱۵۔۹) بےشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔میں بھی تَنْزِیْل کو بصیغہ جمع ذکر فرمایا ہے۔

(ن خ ر)

نَخِرَۃٌ بوسیدہ: قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ءَ اِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَۃً﴾ (۷۹۔۱۱) بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

یہ نَخِرَتِ الشَّجَرَۃُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی تیز ہوا چلنے سے بوسیدہ درخت میں آواز پیدا ہونے کے ہیں۔

اور اَلنَّخِیْرُ: خراٹے کی آواز جو نیند کی حالت میں ناک

سے نکلتی ہے۔اور ناک کے دونوں نتھنوں کو جن سے آواز نکلتی ہے نُخْرَتَان یا مَنْخَرَیْنِ کہتے ہیں۔

اَلنَّخُوْرُ: وہ اونٹنی کہ جب تک اس کے نتھنوں میں انگلی ڈال کر سہلایا نہ جائے۔دودھ نہ دے۔

اَلنَّاخِرُ خراٹے بھرنے والے آدمی کو نَاخِرٌ کہا جاتا ہے۔اسی سے محاورہ ہے۔

مَابِالدَّارِ نَاخِرٌ: گھر میں کوئی نہیں رہا۔

(ن خ ل)

اَلنَّخْلُ: کھجور کا درخت۔یہ واحد وجمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ﴾ (۶۹۔۷) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

﴿کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ﴾ (۲۶۔۱۴۸) اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔

﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّھَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ﴾ (۵۰۔۱۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔

اس کی جمع نَخِیل آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ﴾ (۱۶۔۶۷) اور کھجور کے میووں سے بھی۔

اَلنَّخْلُ (مصدر کے معنی چھلنی سے آٹا چھاننے کے ہیں)۔

اور اِنْتَخَلْتُ الشَّیْءَ کے معنی عمدہ چیز منتخب کر لینے کے۔

(ن د د)

نَدِیْدُ الشَّیْءِ: وہ کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ مماثلت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بولا جاتا ہے۔اس بنا پر ہر نِدٌّ کو مِثْلٌ کہہ سکتے ہیں۔لیکن ہر مِثْلٌ نِدٌّ نہیں ہوتا۔

اور نِدٌّ، نَدِیْدٌ، نَدِیْدَۃٌ تینوں ہم معنی ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا﴾ (۲۔۲۲) پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا﴾ (۲۔۱۶۵) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک خدا بناتے ہیں۔

﴿وَتَجْعَلُوْنَ لَہٗٓ اَنْدَادًا﴾ (۴۱۔۹) اور بتوں کو اس کا مدمقابل بناتے ہو۔

اور ایک قراءت میں ﴿یَوْمَ التَّنَادِّ﴾ (۴۰۔۳۲) تشدید دال کے ساتھ ہے۔اور نَدَّ یَنِدُّ سے مشتق ہے۔جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے قرابتداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ﴾ مذکور ہے اس لیے روز قیامت کو یَوْمَ التَّنَادِّ بتشدید الدال کہا گیا ہے۔

(ن د م)

اَلنَّدْمُ وَالنَّدَامَۃُ کے معنی فوت شدہ امر پر حسرت کھانے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ﴾ (۵۔۳۱) پھر وہ پشیمان ہوا۔

﴿عَمَّا قَلِیْلٍ لَّیُصْبِحُنَّ نٰدِمِیْنَ﴾ (۲۳۔۴۰) تھوڑے ہی عرصے میں پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔اس کے اصل معنی حزن کا ندیم بن جانے کے ہیں۔اور نَدِیْمٌ نُدْمَانٌ اور مُنَادِمٌ تینوں قریب المعنی ہیں۔بعض نے کہا ہے کہ مُنَادَمَۃٌ اور مُدَاوَمَۃٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔اور بقول بعض اور ہم پیالہ (شراب نوش) کو ندیمان اس لیے

کہا جاتا ہے۔ کہ انجام کار وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتے ہیں۔

(ن د ی)

اَلنِّدَآءُ کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں اور کبھی نفس آواز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿...... مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (۲۔۱۷۱) جولوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

میں نداء سے مراد آواز اور پکار ہے۔ یعنی وہ چوپائے صرف آواز کو سنتے ہیں۔ اور اس کلام سے جو مفہوم ہوتا ہے۔ اسے ہرگز نہیں سمجھتے۔ اور کبھی اس کلام کو، جس سے کوئی معنی مفہوم ہوتا ہو اسے نِـــــدَاءٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰی﴾ (۲۶۔۱۰) اور جب تمہارے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ﴾ (۵۔۵۸) اور جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو۔

میں نماز کے لیے اذان دینا مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:۔

﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ﴾ (۶۲۔۹) جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے۔

میں بھی نداء کے معنی نماز کی اذان دینے کے ہیں۔ اور شریعت میں نِدَاءُ الصَّلٰوۃِ (اذان) کے لیے مخصوص اور مشہور کلمات ہیں اور آیت کریمہ:۔ ﴿اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ﴾ (۴۱۔۴۴) ان کو گویا دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔ میں ان کے متعلق نداء کا لفظ استعمال کر کے متنبہ کیا ہے کہ وہ حق سے بہت دور جا چکے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ﴾ (۵۰۔۴۱) اور سنو! جس دن پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے پکارے گا۔

﴿وَ نَادَیْنٰہُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ﴾ (۱۹۔۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔ ﴿فَلَمَّا جَآءَ ھَا نُوْدِیَ﴾ (۲۷۔۸) جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تو ندا آئی۔ اور آیت کریمہ ﴿اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا﴾ (۱۹۔۳) جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دبی آواز سے پکارا۔ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق نَادٰی کا لفظ استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نے اپنے گناہ اور احوال سیئہ کے باعث اس وقت اپنے آپ کو حق اللہ تعالیٰ سے دور تصور کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے کی حالت ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ﴾ (۳۔۱۹۳) اے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا۔ جو ایمان کے لیے پکار رہا تھا۔ میں منادی کا لفظ عقل، کتاب منزل، رسول مرسل اور ان آیات الٰہیہ کو شامل ہے۔ جو ایمان باللہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو مُنَادِی لِلْاِیْمَانِ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ

ندا کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔اور وہ پکارنے والے کی طرح ایمان لانے کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔

اصل میں نِدَاءٌ نَدًی سے ہے جس کے معنی رطوبت نمی کے ہیں۔اور صَوْتٌ نَّدِیٌّ کے معنی بلند آواز کے ہیں۔ اور آواز کے لیے نداء کا استعارہ اس بنا پر ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہوگی اس کی آواز بھی بلند اور حسین ہوگی اس سے فصیح شخص کو کثرت ریق کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور نَدًّی کے معنی مجلس کے بھی آتے ہیں اس کی جمع اَنْدَاءٌ وَاَنْدِیَةٌ آتی ہے۔اور درخت کو بھی نَدًّی کہا جاتا ہے۔کیونکہ وہ نمی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ تَسْمِیَةُ الْمُسَبَّبِ بِاِسْمِ السَّبَبِ کے قبیل سے ہے۔شاعر نے کہا ہے ❶ (الرجز)

(۴۲۰) کَالْکَرْمِ اِذَا نَادٰی مِنَ الْکَافُوْرِ

جیسا کہ انگور کا خوشہ غلاف (پردہ) سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ منادی کرنے والے کی آواز ہوتی ہے۔

کبھی نداء سے مراد مجالست بھی ہوتی ہے۔اس لیے مجلس کو اَلنَّادِیْ وَالْمُنْتَدٰی وَالنَّدِیّ کہا جاتا ہے۔اور نادی کے معنی ہم نشین کے بھی آتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ﴾ (۹۶۔۱۷) تو وہ اپنے یارانِ مجلس کو بلا لے۔

اور اسی سے شہر مکہ میں ایک مقام کا نام دَارُ النَّدْوَۃِ ہے۔ کیونکہ اس میں مکہ کے لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔اور کبھی نَدًی سے مراد سخاوت بھی ہوتی ہے۔چنانچہ محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ اَنْدٰی کَفًّا مِنْ فُلَانٍ: وہ فلاں سے زیادہ سخی ہے۔

هُوَ يَتَنَدّٰی عَلٰی اَصْحَابِهٖ: وہ اپنے ساتھیوں پر بڑا فیاض ہے۔

مَا نَدَیْتُ بِشَیْءٍ مِنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے کچھ سخاوت حاصل نہ کی۔

مُنْدِیَاتُ الْکَلِمِ: رسوا کن باتیں جو مشہور ہو جائیں۔

(ن ذ ر)

اَلنَّذْرُ: کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

نَذَرْتُ لِلّٰهِ نَذْرًا: میں نے اللہ کے لیے نذر مانی قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ (۱۹۔۲۶) میں نے خدا کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ (۲۔۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کر دیا کوئی نذر مانو۔

اَلْاِنْـذَارُ کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔اور اس کے بالمقابل تَبْشِیْرٌ کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سنانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی﴾ (۹۲۔۱۴) سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کر دیا۔

﴿اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (۴۱۔۱۳) میں تم کو کیسے چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں۔جیسے عاد اور ثمود پر چنگاڑ (کا عذاب) آیا تھا۔

﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ﴾ (۴۶۔۲۱) اور (قوم) عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو یاد کرو

---

❶ قد مر تخریجه فی (ك ف ر)

کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں (ہدایت کی) اور اللہ کے (عذاب) سے ڈرایا۔
﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ﴾ (۴۶۔۳) اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔
﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (۴۲۔۷) یعنی مکے کے رہنے والوں اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ۔
﴿وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ﴾ (۴۲۔۷) اور انہیں قیامت کے دن کا بھی...... خوف دلاؤ۔
﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ﴾ (۳۶۔۶) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہ کیا گیا تھا۔ متنبہ کر دو۔
اَلنَّذِيْرُ کے معنی مُنْذِر یعنی ڈرانے والا ہیں۔ اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے۔ جس میں خوف پایا جائے۔ خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۴۶۔۹) اور میرا کام تو علانیہ ہدایت کرنا ہے۔
﴿وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ (۳۵۔۳۷) اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔
﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ﴾ (۷۴۔۳۶) اور بنی آدم علیہ السلام کے لیے موجب خوف ہے۔
﴿اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ (۱۱۔۲۵) میں تم کو کھول کھول کر ڈر سنانے والا آیا ہوں۔
﴿اِنِّىْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ﴾ (۱۵۔۸۹) کہ میں تو اعلانیہ ڈر سنانے والا ہوں۔
اور نَذِيْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے جیسے فرمایا:

﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى﴾ (۵۳۔۵۶) یہ (محمد ﷺ) بھی اگلے ڈر سنانے والوں میں سے ایک ڈر سنانے والے ہیں۔
یعنی انہی کی جنس سے ہے جن کے ساتھ پہلے لوگوں کو ڈرایا گیا۔ نیز فرمایا۔
﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ﴾ (۵۴۔۲۳) قوم ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا۔
﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ﴾ (۵۴۔۴۱) اور قوم فرعون کے پاس بھی ڈر سنانے والے آئے۔
﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ﴾ (۵۴۔۱۶) سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔
نَذَرْتُ: کسی چیز کو جان کر اس سے چوکس رہنے کے معنی ہیں۔

(ن ز ع)

نَزَعَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو اس کی قرارگاہ سے کھینچنے کے ہیں۔ جیسا کہ کمان کو درمیان سے کھینچا جاتا ہے اور کبھی یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور محبت یا عداوت کے دل سے کھینچ لینے کو بھی نَزْعٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَنَزَعْنَا مَا فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۷۔۴۳) اور جو کینے ان کے دلوں میں ہوں گے۔ ہم سب نکال ڈالیں گے۔
اِنْتَزَعْتُ اٰيَةً مِّنَ الْقُرْاٰنِ فِىْ كَذَا: آیت کو کسی واقعہ میں بطور مثال کے پیش کرنا۔
تَنْزِعُ فُلَانٌ كَذَا: کے معنی کسی چیز کو چھین لینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ (۳۔۲۶) اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا﴾ (۷۹۔۱) ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نَازِعَات سے مراد فرشتے ہیں جو روحوں کو جسموں سے کھینچتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ﴾ (۵۴۔۱۹،۲۰) ہم نے ان پر سخت منحوس دن میں آندھی چلائی وہ لوگوں کو اس طرح اکھیڑ ڈالتی تھی۔

میں تَنْزِعُ النَّاسَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہوا اپنی تیزی کی وجہ سے لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے نکال باہر پھینک دیتی تھی بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کی روحوں کو ان کے بدنوں سے کھینچ لینا مراد ہے۔

اَلتَّنَازُعُ وَالْمُنَازَعَةُ: باہم ایک دوسرے کو کھینچنا اس سے مخاصمت اور مجادلہ یعنی باہم جھگڑا کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ﴾ (۴۔۵۹) اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقعہ ہو تو رجوع کرو۔

﴿فَتَنَازَعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰۔۶۲) تو وہ باہم اپنے معاملے میں جھگڑنے لگے۔

اَلنَّزْعُ عَنِ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز سے رک جانے کے ہیں۔ اور اَلنُّزُوْعُ: سخت اشتیاق کو کہتے ہیں۔

وَنَازَعَتْنِيْ نَفْسِيْ اِلٰى كَذَا: نفس کا کسی طرف کھینچ کر لے جانا۔ کسی کا اشتیاق غالب آ جانا۔ اَنْزَعَ الْقَوْمُ: اونٹوں کا اپنے وطن کا مشتاق ہونا۔

رَجُلٌ اَنْزَعُ کے معنی سر کے بال جھڑ جانا کے ہیں۔ اور نَزْعَةٌ: سر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سے بال جھڑ جائیں۔ اور تانیث کے لیے نَزْعَاءُ کی بجائے زَعْرَاءُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بِئْرٌ نَزُوْعٌ: کم گہرا کنواں جس سے ہاتھ کے ذریعہ بغیر رسی کے پانی نکالا جا سکے۔

شَرَابٌ طَيِّبُ الْمَنْزَعَةِ: لذیذ شراب کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس معنی میں قرآن پاک خِتٰمُهٗ مِسْكٌ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

(ن ز غ)

اَلنَّزْغُ کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ﴾ (۱۲۔۱۰۰) اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔

(ن ز ف)

نَزَفَ الْمَاءُ کے معنی کنویں سے تدریجاً سارا پانی کھینچ لینے کے ہیں۔ اور بِئْرٌ نَزُوْفٌ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کا پانی خشک ہو گیا ہو۔

نُزْفَةٌ چلو بھر پانی۔ اس کی جمع نُزْفٌ آتی ہے۔

نُزِفَ دَمُهٗ اَوْ دَمْعُهٗ: خون یا آنسوؤں کا کُلِّيَّةً نکل جانا۔ اسی سے سَكْرَانُ نَزِيْفٌ ہے جس کے معنی بدمست کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ﴾ (۵۶۔۱۹) اس سے نہ تو سر میں درد ہوگا اور نہ ان کی عقلیں ضائع ہوں گی۔

ایک قراءت میں يُنْزِفُوْنَ ہے جو کہ اَنْزَفُوْا (افعال) سے ہے۔ جس کے معنی شراب کے ختم ہونے یا عقل کے ضائع ہو جانے کے ہیں۔ اصل میں یہ اَنْزَفُوْا سے ہے جس کے

معنی کنویں کا پانی ختم ہو جانے کے ہیں اور اَنْزَفْتُ الشَّیْءَ میں نَزَفْتُہٗ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔
نَزَفَ الرَّجُلُ فِی الْخُصُوْمَۃِ: جھگڑے میں دلیل سے خاموش ہو جانا۔ مثل مشہور ہے۔
ھُوَ اَجْبَنُ مِنَ الْمَنْزُوْفِ ضَرِطًا: وہ منزوف سے بھی زیادہ بزدل ہے۔

(ن ز ل)

اَلنُّزُوْلُ: (ض) اصل میں اس کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نَزَلَ عَنْ دَابَّتِہٖ: وہ سواری سے اتر پڑا۔
نَزَلَ فِیْ مَکَانٍ کَذَا: کسی جگہ پر ٹھہرنا۔
اَنْزَلَ (افعال) اتارنا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ﴾ (۲۳۔۲۹) ہم کو مبارک جگہ اتاریو اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔
نَزَلَ بِکَذَا وَاَنْزَلَہٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا وقوع یا عطا کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ یا تو بعینہٖ اس چیز کے نازل کرنے کے ذریعہ ہوتا ہے، مثلاً قرآن پاک کا نازل فرمانا اور یا ان چیزوں کے اسباب پیدا کر کے ان کی طرف ہدایت کر دینے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ لوہا، لباس اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اتارنا مراد ہے چنانچہ انعامات کے نازل کرنے کے متعلق فرمایا:۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ﴾ (۱۸۔۱) سب تعریف خدا ہی کو ہے۔ جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔
﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (۴۲۔۱۷) خدا ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔
﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ﴾ (۵۷۔۲۵) اور لوہا پیدا کیا۔
﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ (۵۷۔۲۵) اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) ﴿وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزْوَاجٍ﴾ (۳۹۔۶) اور اسی نے چارپایوں میں سے آٹھ جوڑے بنائے۔
﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَھُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۸) اور ہم آسمان سے پاک اور (نتھرا ہوا) پانی برساتے ہیں۔
﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ (۷۸۔۱۴) اور نچڑے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔
﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔
﴿اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (۵۔۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔
﴿اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۔۹۰) خدا جس پر چاہتا ہے اپنی مہربانی سے نازل فرماتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ﴾ (۲۹۔۳۴) ہم اس بستی کے رہنے والوں پر اس سبب سے کہ یہ بدکاری کرتے ہیں۔ آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔
عذاب کے متعلق اِنْزَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق اِنْزَال اور تَنْزِیْل دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ تَنْزِیْل کے معنی ایک چیز کو مرّۃً بعد اخریٰ اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور

اِنْزَالٌ کا لفظ عام ہے۔ جو ایک ہی دفعہ مکمل طور پر کسی چیز کو نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تَنْزِیْل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ﴾ (۲۶۔۱۹۳) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔

ایک قراءت میں نزل ہے۔

﴿نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا﴾ (۱۷۔۱۰۶) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (۱۵۔۹) بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔

﴿لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ هٰذَا الْقُرْاٰنُ......﴾ (۲۵۔۳۲) کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی بار کیوں نہیں اتارا گیا۔

﴿وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ﴾ (۲۶۔۱۹۸) اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔

اور اِنْزَال کے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۹۔۲۶) پھر خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسلی نازل فرمائی۔ اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے آسمان سے اتارے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ﴾ (۴۷۔۲۰) کہ جہاد کی کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوئی؟ لیکن جب کوئی صاف معنوں کی سورت نازل ہو۔

میں پہلی بار نُزِّلَ اور دوسری بار اُنْزِلَ کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ منافقین کا مطالبہ تو یہ تھا کہ یکے بعد دیگرے جہاد کے احکام نازل ہوں تا کہ وہ انہیں سرانجام دے سکیں۔ لیکن جب انہیں صرف ایک مرتبہ ہی جہاد کا حکم دیا گیا۔ تو وہ کنارہ کش ہو گئے۔ اور اس کی تعمیل نہ کی پس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مطالبہ تو بہت سے احکام کے نازل ہونے کا کرتے تھے۔ مگر ایک حکم بھی بجا نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (۴۴۔۳) ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (۲۔۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے۔ جس میں قرآن پاک اول اول نازل ہوا۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (۹۷۔۱) ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔ میں تَنْزِیْل کا لفظ ترک کر کے خاص کر اِنْزَالٌ کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ حدیث میں ہے [1] (۱۲۷) ((اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ دَفْعَةً وَّاحِدَةً اِلٰى سَمَاءِ الدُّنْیَا ثُمَّ نَزَلَ نَجْمًا فَنَجْمًا)) کہ قرآن پاک ایک ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق اور اس قابل ہیں کہ جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائے ہیں۔ ان سے واقف ہی نہ ہوں۔ میں عام معنی لینے کی غرض سے خاص کر اِنْزَالٌ کا لفظ لایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر

---

[1] رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویہ عن ابن عباس (ابن کثیر ۱/۲۱٦) وفی مجمع الزوائد (۷/۱٤۰)۔ ورجال البزار رجال الصحیح فی اسناد الطبرانی عمرو بن عبدالغفار وھو ضعیف لکن لفظہ انزل القرآن جملۃ واحدۃ حتی وضع فی بیت العزۃ فی السماء الدنیا ونزلہ جبریل علی محمد ﷺ بجواب کلام العباد واعمالھم ۱۲۔

چکے ہیں کہ اِنْزَال تَنْزِیل سے عام ہے۔اور آیت کریمہ:
﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ﴾ (۵۹۔۲۱)
اگر ہم یہ قرآن پاک کسی پہاڑ پر نازل کرتے ہیں۔
میں نَزَّلْنَا کی بجائے اَنْزَلْنَا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر رات میں نازل کی ہے۔اگر اسے پہاڑ پر ایک دفعہ بھی نازل کر دیتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے وہ دبا جاتا ہے اور وہ آیت کریمہ: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَسُوْلًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ (۶۵۔۱۰،۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت کی کتاب بھیجی ہے۔ اور اپنے پیغمبر بھی بھیجے ہیں۔ جو تمہارے سامنے...... پڑھتے ہیں۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اِنْزَالِ ذکر سے آنحضرت کی بعثت مراد ہے۔اور آپ ﷺ کو لفظ "ذِکْر" سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کَلِمَۃٌ سے موسوم کیا گیا ہے لہٰذا اس تفسیر کی بنا پر رَسُوْلًا کا لفظ ذِکْرًا سے بدل الکل ہوگا۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول کا ذکر ہے۔تو اس صورت میں رَسُوْلًا کا لفظ ذِکْرًا کا مفعول ہوگا۔اور تَنَزَّلَ کا لفظ بھی نَزَلَ بِہٖ کی طرح (صلہ بار کے ساتھ) استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے۔نَزَلَ الْمَلَكُ بِكَذَا وَتَنَزَّلَ بِهٖ: فرشتہ اسے لے کر اترا۔مگر یہ محاورہ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔قرآن پاک میں ہے:
﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (۲۶۔۱۹۳) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔نیز فرمایا: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ (۹۷۔۴) اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ (۱۹۔۶۴) کہ ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے۔
﴿يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ﴾ (۶۵۔۱۲) ان میں خدا کے حکم اترتے رہتے ہیں۔
اور جو کلام افترا اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اس کے متعلق صرف تَنَزُّلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ﴾ (۲۶۔۲۱۰) اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوا۔﴿عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ﴾ الآیة (۲۶۔۲۲۰۔۲۲۱) کہ شیطان کس پر اترتے ہیں (ہر گنہگار جھوٹے پر)
اَلنُّزُلُ: (طعام مہمانی) وہ کھانا جو آنے والے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا﴾ (۳۲۔۱۹) ان کے رہنے کے لیے باغ میں یہ مہمانی۔
﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۹۸) یہ خدا کے ہاں سے ان کی مہمانی ہے۔
اور دوزخیوں کے متعلق فرمایا:
﴿لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ اِلٰى قَوْلِه هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ (۵۶۔۵۶) جزا کے دن یہ ان کی ضیافت ہوگی۔
﴿فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ﴾ (۵۶۔۹۳) (تو اس کے لیے) کھولتے پانی کی ضیافت ہے۔
اَنْزَلْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کی مہمانی کرنے کے ہیں اور نَازِلَةٌ مصیبت اور سختی کو کہتے ہیں۔اس کی جمع نَوَازِلُ آتی ہے۔
اَلنِّزَالُ: (مصدر، مفاعلہ) کے معنی دو گروہوں کا باہم لڑنے

کے لیے میدان جنگ میں اترنے کے ہیں۔اور نَــزَلَ فُــلَانٌ کے معنی مقام منیٰ میں اترنا بھی آتے ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ (الطّویل)

(۴۴۱) اَنَازِلَةٌ اَسْمَاءُ اَمْ غَیْرُ نَازِلَةٍ

کیا اسماء میدان منیٰ میں فروکش ہوگی یا نہیں۔

اَلــنُّــزَالَةُ وَالــنُّزْل: کنایۃً مرد کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں جب کہ وہ خارج ہو چکا ہو اور طَــعَــامُ نُزُلٍ یا ذُوْ نُزُلٍ کے معنی پاکیزہ اور بابرکت طعام کے ہیں۔پھر طعام نُزُلٍ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر نَــزِلٌ کے معنی جمع ہونے کی جگہ فرودگاہ کے بھی آتے ہیں۔

(ن س ء)

اَلــنَّــسْءُ کے معنی کسی چیز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دینے کے ہیں۔اور اسی سے نُسِئَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی عورت کے حیض میں مقررہ ایام میں تاخیر کے ہیں۔جس سے اس کے حاملہ ہونے کی امید کی جا سکے۔اور ایسی عورت کو نَسُوْءٌ کہا جاتا ہے۔ اور نَسَأَ اللّٰهُ فِیْ اَجَلِكَ اور نَسَأَ اللّٰهُ بَعْلَكَ کا محاورہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جو کہ درازیٔ عمر کی دعا کے لیے بولتے ہیں۔

اَلنَّسِیْئَةُ: اس کے معنی کسی چیز کو ادھار پر فروخت کرنے کے ہیں۔اسی سے وہ نَسِئٌ ہے۔جس کا جاہلیت میں رواج تھا۔ یعنی وہ کسی ماہِ حرام کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّمَا النَّسِیٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ﴾ (۹۔۳۷) امن کے کسی مہینہ کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔اور آیت کریمہ:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں۔میں ایک قراءت نَــنْسَأْهَا بھی ہے جس کے معنی کسی چیز کو بھلا دینے یا ابطال حکم کے ذریعہ مؤخر کر دینے کے ہیں۔

اَلْــمِــنْسَــاءُ: عصا جس کے ذریعہ کسی چیز کو پیچھے ہٹایا جائے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَـاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ﴾ (۳۴۔۱۴) جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔

نَسَاءَتِ الْاِبِــلُ فِــیْ ظَــمَــئِهَــا یَوْمًا اَوْیَوْمَیْنِ: اونٹوں کے پانی پلانے کے دن کو ایک یا دو روز مؤخر کر دینا شاعر نے کہا ہے ❷ (الطّویل)

(۴۴۲) وَعَنْسٍ كَاَلْوَاحِ الْاِرَانِ نَسَأْتُهَا
اِذَا قِیْلَ لِلْمَشْبُوْبَتَیْنِ هُمَا هُمَا

اور تابوت کے تختوں جیسے سفید اونٹوں کو میں نے ہنکایا جب یہ کہا گیا کہ زہرہ اور مشتری دونوں طلوع ہو گئے۔

اَلــنَّــسُــوْءُ: (ایضاً) تازہ دودھ جو زیادہ دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جائے۔اور اس میں پانی ملا لیا جائے۔

(ن س ب)

اَلــنَّسْبُ وَالنِّسْبَةُ کے معنی اَبَوَیْن میں سے کسی ایک کی طرف سے رشتہ داری کے ہیں اور نسب دو قسم

---

❶ قاله عامر بن الطفیل الغنوی وتمامه...... ابینی لنا یا اسم ما انت فاعله والبیت فی النقائض (۲۸۸) واللسان والمقاییس (نزل) وملحقات دیوانه (۱۵۸) واصلاح یعقوب (۳۰۹) وذیلی الامالی (۱۱۴) والخزانة (۳:۴۴) وشرح السبع (ابن الانباری (۵۳۶)۔

❷ قَالَهٗ شماخ فی قصدیة راجع دیوانه (۸۹) والبیت فی مجالس ثعلب (۲۵۴) واللسان (ارن، خشب) غیر منسوب وغریب القرآن للقبتی (۳۵۵) والقرطبی (۲۸۰)۔

پر ہے۔نَسْبٌ بِالطُّوْلِ: یعنی وہ رشتہ جو آباء اور ابناء کے درمیان پایا جاتا ہے: دوم نَسْبٌ بِالْعَرْضِ یعنی وہ رشتہ جو بنو ا الْاَعْمَام یعنی عم زاد بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا: ﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا﴾ (۲۵۔۵۴) پھر اس کو صاحب نسب اور صاحب قرابت دامادی بنایا۔فُلَانٌ نَسِيْبُ فُلَانٍ وہ فلاں کا قریبی رشتہ دار ہے۔اور نِسْبَةٌ کے معنی ان دو مقداروں کے درمیان باہمی مناسبت کے بھی آتے ہیں۔جن میں کسی قسم کی مجانست ہو اسی سے نَسِيْبٌ کا لفظ ہے۔جس کے معنی اشعار میں عورت کے محاسن ذکر کر کے اس کے ساتھ عشق کا اظہار کرنے کے ہیں۔اور یہ نَسَبَ الشَّاعِرُ بِالْمَرْءَةِ نَسْبًا وَّنَسِيْبًا کا مصدر ہے۔

(ن س خ)

اَلنَّسْخُ: اس کے اصل معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ پر لانے کے ہیں۔

جیسے۔دھوپ کا سائے کو...... اور سائے کا دھوپ کو زائل کر کے اس کی جگہ لے لینا یا جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا وَغَیْرُ ذٰلِكَ پھر کبھی اس سے صرف ازالہ کے معنی مراد ہوتے ہیں جیسے فرمایا۔﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ﴾ (۲۲۔۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔

اور کبھی صرف اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور کبھی اس سے معاً دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں۔لہٰذا نَسْخُ الْكِتَابِ یعنی کتاب اللہ کے منسوخ ہونے سے ایک حکم کو زائل کر کے پھر اس کی بجائے دوسرا حکم نازل کرنا مراد ہوتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں۔تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔کی تفسیر میں بعض نے نَسْخ اور اِنْسَاء کے معنی اس پر عمل سے منع کرنے یا لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دینے کے لیے ہیں۔اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نَسَخْتُ الْكِتَابَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو آیت بھی ہم نازل کرتے ہیں یا اس کے نزول کو ایک وقت تک کے لیے ملتوی رکھتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

نَسْخُ الْكِتَابِ کے معنی کتاب کی کاپی کرنے کے ہیں۔یہ پہلی صورت کے ازالہ کو مقتضی نہیں ہے۔بلکہ کسی دوسرے مادہ میں اس جیسی دوسری صورت کے اثبات کو چاہتا ہے جیسا کہ بہت سی شمعوں میں انگوٹھی کا نقش بنا دیا جاتا ہے۔

اَلْاِسْتِنْسَاخُ: کسی چیز کے لکھنے کو طلب کرنے یا لکھنے کے لیے تیار ہونے کے ہیں کبھی اِسْتِنْسَاخُ بمعنی نسخ بھی آ جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۴۵۔۲۹) جو کچھ تم کیا کرتے تھے، ہم لکھواتے جاتے تھے۔اور علم وراثت میں "مُنَاسَخَةٌ" کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وارث یکے بعد دیگرے مرتے رہیں اور میراث تقسیم نہ ہوئی ہو۔

تَنَاسُخُ الْاَزْمِنَةِ وَالْقُرْاٰنِ: ایک قوم کا گزر جانا اور دوسری کا اس کے قائم مقام ہونا۔

اور تَنَاسُخِيَّةٌ اس فرقے کو کہتے ہیں جو شریعت کے ثابت کردہ حشر و نشر کا انکار کرتے ہیں۔اور ارواح کے مختلف

اجسام میں منتقل ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

(ن س ر)

اَلنَّسْرُ: گدھ۔اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ (۷۱-۲۳) اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔

میں نسر ایک بت کا نام ہے اور اَلنَّسْرُ نَسَرَا الطَّائِرُ الشَّیْءَ بِمِنْسِرِہٖ: کا مصدر بھی آتا ہے جس کے معنی پرند کا چونچ سے کوئی چیز اٹھانا یا اسے ٹھونکنا کے ہیں۔

نَسْرُ الْحَافِرِ گھوڑے کے سم کے درمیان کا ابھرا ہوا گوشت۔

اَلنَّسْرَان: دو ستارے ہیں جن میں سے ایک کو نَسْرِ (طائر) اور دوسرے کو نَسْرِ (واقع) کہا جاتا ہے۔

نَسَرْتُ کَذَا: کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے تناول کرنا جیسا کہ پرند چونچ بھرتا ہے۔

(ن س ف)

نَسَفَتِ الرِّیْحُ الشَّیْءَ کے معنی ہوا کے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے ہیں۔اور نَسَفْتُہٗ وَانْتَسَفْتُہٗ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾ (۲۰-۱۰۵) خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

اور نَسَفَ الْبَعِیْرُ الْاَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِہٖ کے معنی اونٹ کا اپنے اگلے پاؤں کے ساتھ مٹی کو پھینکنا کے ہیں۔

اور گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر چرنے والی اونٹنی کو نَاقَۃٌ نَسُوْفٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾ (۲۰-۹۷) پھر اس کی راکھ کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے۔

یعنی ہم نُسَافَہ کی طرح اسے پھینک دیں گے اور نُسَافَۃٌ کے معنی اڑتی ہوئی غبار کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر جھاگ کو بھی نُسَافَہ کہتے ہیں۔اور اِنَاءٌ نَسْفَانُ، بھرے ہوئے برتن کو کہتے ہیں۔جس پر جھاگ غالب ہو۔

اُنْتُسِفَ لَوْنُہٗ: غبار آلود ہونے کی وجہ سے کسی شخص کی رنگت کا متغیر ہو جانا۔جیسا کہ اِغْبَرَّ وَجْھُہٗ کا محاورہ ہے

اَلنُّسْفَۃُ: سنگ پائے خار۔

کَلَامٌ نَسِیْفٌ: سخن پنہاں۔جو متغیر اور بودا ہو۔

(ن س ک)

اَلنُّسُکُ کے معنی عبادت کے ہیں۔اور نَاسِكٌ عابد کو کہا جاتا ہے۔مگر یہ لفظ ارکان کے ادا کرنے کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔اَلْمَنَاسِكُ اعمال حج ادا کرنے کے مقامات اَلنَّسِیْکَۃُ خاص کر ذبیحہ یعنی قربانی کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ (۲-۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ﴾ (۲-۲۰۰) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ﴾ (۲۲-۶۷) ایک شریعت مقرر کر دی جس پر وہ چلتے ہیں۔

(ن س ل)

اَلنَّسْلُ کے معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے:۔

نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِیْرِ: اون اونٹ سے الگ ہو گئی۔

اور نَسَلَ الْقَمِیْصُ عَنِ الْاِنْسَان کے معنی قمیص کے بدن سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۲۲) فَسُلِّیْ ثِیَابِیْ عَنْ ثِیَابِكِ تَنْسُلِیْ

تو اپنے کپڑوں کو میرے کپڑوں سے کھینچ لے تاکہ جدا ہو جائیں۔

اَلنُّسَالَةُ: (داڑھی سے) گرے ہوئے بال یا پرند کے پر جو جھڑ کر گر پڑتے ہیں۔

اَنْسَلَتِ الْاِبِلُ: اونٹوں کی اون جھڑنے کا وقت آ گیا۔ اسی سے نَسَلَ یَنْسِلُ نَسْلَانًا ہے جس کے معنی تیز دوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۶) اور وہ ہر بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

اَلنَّسْلُ: اولاد کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے باپ سے جدا ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ (۲۔۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں) کی نسل کو نابود کر دے۔

اور تَنَاسَلُوْا کے معنی تَوَالَدُوْا کے ہیں۔ نیز جب کوئی انسان دوسرے سے خیرات طلب کرے۔ تو کہا جاتا ہے۔ فَخُذْ مَا نَسَلَ لَكَ مِنْهُ عَفْوًا کہ جو کچھ ملے وہی لے لو۔

(ن س ی)

اَلنِّسْیَانُ یہ نَسِیْتُهٗ نِسْیَانًا کا مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں۔ خواہ یہ ترک ضبط ضعف قلب کی وجہ سے ہو یا از راہ غفلت ہو۔ یا قصداً کسی چیز کی یاد بھلا دی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۵) ہم نے پہلے آدم علیہ السلام سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ﴾ (۳۲۔۱۴) سو اب آگ کے مزے چکھو۔ اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَ مَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ﴾ (۱۸۔۶۳) تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

﴿لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ﴾ (۱۸۔۷۳) کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجیے۔

﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ (۵۔۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کو جوان کو کی گئی تھی۔ ایک حصہ فراموش کر دیا۔

﴿ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۹۔۸) پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے۔ تو جس کام کے لیے پہلے اس کو پکارتا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے۔ اور آیت

---

[1] والبیت لامری القیس واولہ: وان تك قد ساء تك منی خلیقة۔ والبیت فی المعلقة مع التبریزی ۲۱ والسیوطی ۷ واللسان (ثوب) ومختار الشعرا الجاھلی (۱: ۱۰) والحمھرة (۹۷) والعقد الثمین (۴۷) والمعانی للقبتی (۴۸۲) و دیوانہ بشرح ابن الانباری رقم ۲۱۔

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى﴾ (۸۷۔۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے۔ پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو۔ وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔ اور حدیث میں جو مروی ہے ❶ (۱۲۸)

((رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ)) کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے تو اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے۔ یعنی وہ جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ﴾ (۳۲۔۱۴) سواب آگ کے مزے چکھو اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔

پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازراہِ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الٰہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ (۷۔۵۱) تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (۹۔۶۷) انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (۵۹۔۱۹) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا خود اپنے آپ کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ (۱۸۔۲۴) اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے ابن عباسؓ نے یہ معنی کیے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لیے ابن عباسؓ کے نزدیک حلف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نَسِيْتَ بمعنی اِرْتَكَبْتَ ذَنْبًا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لیے خدا کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تا کہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے۔ ❷

النِّسْيُ کے اصل معنی مَا يُنْسٰى یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے نِقْضٌ بمعنی مَا يُنْقَضُ آتا ہے۔ مگر عرف میں

❶ رواه الطبراني عن ثوبان وفيه وما استكر هوا عليه (راجع الفتح للنبهاني (۲/۱۳۵)

❷ راجع الفتح للشوكاني (۳ : ۲۸۰) انه كان يرى الاستثناء ولو بعد سنة ولقول عكرمة راجع الطبري۔

نِسْیٌ اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو درخور اعتنا، نہ سمجھی جائے اور اسی سے اہل عرب کا مقولہ ہے۔اِحْفَظُوْا اَنْسَاءَ کُمْ (کوچ کے وقت اپنی) معمولی چیزوں کا خیال رکھو جو عموماً بھول جاتی ہیں۔شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۲۳) کَاَنَّ لَهٗ فِی الْاَرْضِ نِسْیًا تَقُصُّهٗ۔

گویا زمین میں اس کی کوئی چیز گری ہوئی ہے۔ جسے وہ تلاش کر رہا ہے۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا﴾ (۱۹۔۲۳) اور میں بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔ میں نَسْیًــــا کے معنی ہیں کہ میں اس حقیر چیز کے بمنزلہ ہوتی۔جس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا اگر چہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو۔ پھر بھولی بسری ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے مَنْسِیًّا کا لفظ لایا گیا ہے۔کیونکہ نَسْیٌ کے معنی اس معمولی چیز کے ہیں۔ جو درخور اعتنا نہ ہو۔ اور اس کا فراموش ہونا ضروری ہے۔

اور ایک قراءت میں نَسِیًّا ہے جو کہ مصدر بمعنی مفعول کے ہیں۔جیسے:۔عَصٰی عَصِیًّا وَّعِصْیَانًا اور آیت کریمہ:۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (۲۔۱۰۶) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں۔ میں اِنْسَا کے معنی قوت الہیہ کے ذریعہ دلوں سے محو کرنے اور فراموش کرا دینے کے ہیں۔

اَلنِّسَآءُ وَالنِّسْوَانُ وَالنِّسْوَةُ: یہ تینوں اِمْرَءَةٌ کی جمع مِنْ غَیْرِ لَفْظِهٖ ہیں۔جیسے مَرْءٌ کی جمع قوم آ جاتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ﴾ (۴۹۔۱۱) اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں۔

﴿نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ﴾ (۲۔۲۲۳) (تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہے......

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ﴾ (۳۳۔۳۰) اے پیغمبر کی بیویو!۔

﴿وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ﴾ (۱۲۔۳۰) اور شہر میں عورتیں گفتگوئیں کرنے لگیں۔

﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (۱۲۔۵۰) کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

اَلنَّسَــــا (عرق النساء) ایک رگ کا نام ہے اس کا تثنیہ نَسَیَانِ اور جمع اَنْسَاءٌ آتی ہے۔

(ن ش ی)

اَلنَّشْأُ وَالنَّشْأَةُ: کسی چیز کو پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی﴾ (۵۶۔۶۲) اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے۔

---

[1] قاله عمرو بن عامر الشفری الازدی وتمامه علیٰ امهاوان تخاطبك تبلت قال ابن البری وبلت (بالفتح) اذ قطع وبالكسر اذ سكن والبيت فی الكامل (۴۹۷) والاقتضاب (۴۱۷) واللسان ونسا، بلت) والمفضليات (۱ : ۱۰۷) والطبری (۱۶ : ۶۶) والطبرسی (۲۹ : ۹۳) وفی رواية اذ ماغدت بدل علی امهاوان تحدثك بدل ان تخاطبك وكذا رواية الكامل (۸۳۹) وفی رواية وان تكلمك والبيت فی مجالس ثعلب (۳۵۳) وفيه علی وجهها بدل علیٰ امها والقصيدة مفضلية وهی فی منتهی الطلب (۲ : ۲۰۵ـ۲۰۷) والاغانی (۲۱ : ۹۰ـ۹۱) وبعضهافی الخزانة (۲ : ۱۸) والبيت ايضا فی تهذيب الالفاظ (۵۰۸) والمحاضرات للمؤلف (۳ : ۲۳۱) والمرزوقی (۱۳۵۸) و غريب القرآن (۲۷۳)۔

نَشَأَ فُلَانٌ کے معنی بچہ کے جوان ہونے کے ہیں۔اور نوجوان کو نَاشِیٌٔ کہا جاتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ (۷۳-۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔

میں نَاشِئَۃٌ کے معنی نماز کے لیے اٹھنے کے ہیں۔اسی سے نَشَأَ السَّحَابُ کا محاورہ ہے جس کے معنی فضا میں بادل کے رونما ہونے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کے ہیں۔قرآن میں ہے:۔﴿وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳-۱۲) اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔

اَلْاِنْشَاءُ: (افعال) اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔عموماً یہ لفظ زندہ چیز...... کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قُلْ ھُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ﴾ (۶۷-۲۳) وہ خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔نیز فرمایا:۔

﴿ھُوَ اَعْلَمُ بِکُمْ اِذْ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۵۳-۳۲) وہ تم کو خوب جانتا ہے۔جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِھِمْ قَرْنًا آخَرِیْنَ﴾ (۲۳-۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔

﴿وَنُنْشِئَکُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (۵۶-۶۱) اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں۔

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا آخَرَ﴾ (۲۳-۱۴) پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔

﴿ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ﴾ (۲۹-۲۰) پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔

ان تمام آیات میں انشاء بمعنی ایجاد استعمال ہوا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَھَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ﴾ (۵۶-۷۱،۷۲) بھلا دیکھو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں۔

میں آگ کا درخت اگانے پر بطور تشبیہ انشاء کا لفظ بولا گیا ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَۃِ﴾ (۴۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

میں یُنَشَّاُ کے معنی تربیت پانے کے ہیں۔یعنی عورت جو زیور میں تربیت پاتی ہے۔ایک قراءت میں یَنْشَأُ ہے یعنی پھلے پھولے۔

(ن ش ر)

اَلنَّشْرُ: کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں۔یہ کپڑے اور صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کے مشہور کر دینے پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ (۸۱-۱۰) اور جب عملوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔

﴿وَھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ م بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ﴾ (۴۲-۲۸) اور وہی تو ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت (یعنی بارش کی برکت) کو پھیلا دیتا ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا﴾ (۷۷-۳) اور بادلوں کو (پھاڑ

کر) پھیلا دیتی ہے۔

میں نَاشِرَاتِ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں کو پھیلاتے ہیں یا اس سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو بادلوں کر بکھیرتی پھرتی ہیں۔

اور نَاشِرٌ کی جمع نَشْرٌ آتی ہے۔ چنانچہ ایک قراءت میں نُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ بھی ہے جو کہ وَالنَّاشِرَاتِ کے ہم معنی ہے اور اسی سے سَمِعْتُ نُشْرًا حَسَنًا کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: میں نے اچھی شہرت سنی۔

نَشِرَ الْمَیِّتُ نَشُوْرًا کے معنی میّت کے (از سرِ نو زندہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾ (۶۷-۱۵) اسی کے پاس قبروں سے نکل کر جانا ہے۔

﴿بَلْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ نُشُوْرًا﴾ (۲۵-۴) بلکہ ان کو مرنے کے بعد جی اٹھنے کی امید ہی نہیں تھی۔

﴿وَلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا﴾ (۲۵-۳) اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔

اَنْشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ کے معنی میّت کو زندہ کرنے کے ہیں۔ اور نُشِرَ اس کا مطاوع آتا ہے۔ جس کے معنی زندہ ہو جانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ﴾ (۸۰-۲۲) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔

﴿فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا﴾ (۴۳-۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کر دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ نَشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ وَاَنْشَرَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن در حقیقت نَشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ نَشَرَ الثَّوْبِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۴۲۵) طَوَتْكَ خُطُوْبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ
كَذَاكَ خُطُوْبُهٗ طَیًّا وَّ نَشْرًا

تجھے پھیلانے کے بعد حوادث زمانہ نے لپیٹ لیا اسی طرح حوادث زمانہ لپیٹتے اور نشر کرتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا﴾ (۲۵-۴۷) اور دن کو اٹھ کھڑا ہونے کا وقت ٹھہرایا۔

میں دن کے نشور بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو کاروبار کے پھیلانے اور روزی کمانے کے لیے بنایا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۲۸-۷۳) اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنایا۔ تا کہ تم اس میں آرام کرو اور اس میں اس کا فضل تلاش کرو۔

اور اِنْتِشَارُ النَّاسِ کے معنی لوگوں کے اپنے کاروبار میں لگ جانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ﴾ (۳۰-۲۰) پھر اب تم انسان ہو کر جابجا پھیل رہے ہو۔

﴿فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا﴾ (۳۳-۵۳) تو جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۲-۱۰) پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَشَرُوْا بمعنی اِنْتَشَرُوْا کے آتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

---

[1] البیت لابی العتاهیة وقد مر تخریجه فی (طوی) وفی المطبوع "طیا ونشرا" مقلوب والتسدید من المراجع۔ ۱۲

﴿وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ (۵۸۔۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہوتو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ میں ایک قراءت فَاِذَا قِیْلَ انْشُرُوْا فَانْتَشِرُوْا بھی ہے۔ یعنی کہا جائے کہ منتشر ہو جاؤ تو منتشر ہو جایا کرو۔

اَلْاِنْتِشَارُ کے معنی چوپایہ کی رگوں کا پھول جانا...... بھی آتے ہیں۔ اور نَوَاشِرُ باطن ذراع کی رگوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بدن میں منتشر ہیں۔

اَلنَّشْرُ: (ایضا) پھیلنے والے بادل کو کہتے ہیں۔ اور یہ بمعنی مَنْشُوْرٌ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ اِکْتَسَی الْبَازِیْ رِیْشًا نَشْرًا: یعنی باز نے لمبے چوڑے پھیلنے والے پروں کا لباس پہن لیا۔

اَلنَّشْرُ (ایضاً) خشک گھاس کو کہتے ہیں۔ جو بارش کے بعد سرسبز ہو کر پھیل جائے اور اس سے سرپستان کی سی کونپلیں پھوٹ نکلیں یہ گھاس بکریوں کے لیے سخت مضر ہوتی ہے۔ اسی سے نَشَرَتِ الْاَرْضُ فَھِیَ نَاشِرَۃٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں نشر گھاس پھوٹنے کے ہیں۔

نَشَرْتُ الْخَشَبَ بِالْمِنْشَارِ کے معنی آرے سے لکڑی چیرنے کے ہیں۔ اور لکڑی چیرنے کو نشر اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے چیرتے وقت نشارہ یعنی برادہ پھیلتا ہے۔ اور نَشْرَۃٌ کے معنی افسوس کے ہیں جس سے مریض کا علاج کیا جاتا ہے۔

(ن ش ز)

اَلنَّشْزُ: بلند زمین کو کہتے ہیں۔ اور نَشَزَ فُلَانٌ کے معنی بلند زمین کا قصد کرنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَزَ فُلَانٌ عَنْ مَقَرِّہٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ سے اوپر ابھر آنے کے ہیں۔ اور ہر اوپر اٹھنے والی چیز کو نَاشِزٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ (۵۸۔۱۱) اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہوتو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔

اور نَشْزٌ وَاِنْشَازٌ کے معنی زندہ کرنا...... بھی آتے ہیں۔ کیونکہ زندگی میں بھی ایک طرح کا ابھار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا﴾ (۲۔۲۵۹) اور (وہاں) گدھے کی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑ دیتے ہیں اور ان پر (کس طرح) گوشت (پوست) چڑھا دیتے ہیں۔ اور نُنْشِزُھَا کے نون پر ضمہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔ اور نُشُوْزُ الْمَرْءَۃِ کے معنی عورت اپنے شوہر کو برا سمجھے اور سرکشی کرنے اور کسی دوسرے مرد پر نظر رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ﴾ (۴۔۳۴) اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی (اور بدخوئی) کرنے لگی ہیں۔

چنانچہ اس معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۲۶) اِذَا جَلَسْتَ عِنْدَ الْاِمَامِ کَاَنَّھَا
تَرٰی رُفْقَۃً مِّنْ سَاعَۃٍ تَسْتَحِیْلُھَا

اور عِرْقٌ نَّاشِزٌ کے معنی پھولی ہوئی رگ کے ہیں۔

---

[1] البیت للفرزدق فی نشوز المرءۃ النوار ابنۃ اعین بن ضبعۃ المحاشعی) فی قصیدۃ (۲۸) بیتا راجع دیوانہ (۲ : ۶۲) وفیہ قعدت بدل جلست وکانما بدل کانھا فی المعانی للقبتی (۸۱۵، ۸۴۵) صدرہ : تراھا اذا صطلك الخصوم کانھا...... وقبلہ: وما خاصم الاقوام من ذی خصومۃ۔ کورھا مشنوء الیھا حلیلھا۔

(ن ش ط)

اَلنَّشْطُ (ض) کے اصل معنیٰ گرہ کھولنے کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾ (۷۹۔۲) اوران کی قسم جو آسانی سے کھول دیتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتِ سے مراد ستارے ہیں جو مشرق سے نکل کر حرکت فلک سے مغرب کی طرف جاتے ہیں۔یا خود مشرق سے مغرب کو چلے جاتے ہیں۔یا خود مشرق سے مغرب کو چلتے ہیں اور یہ "ثَوْرٌ نَاشِطٌ" کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک علاقہ سے نکل کر دوسرے علاقہ میں جانے والے بیل کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امور کو طے کرتے ہیں۔اور یہ نَشَطْتُ الْعُقْدَۃَ سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں اور یہاں خاص کر نَشْطٌ کے لفظ سے جس کے معنی آسانی سے کھلنے والی گرہ کے ہیں۔اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ فرشتے نہایت آسانی سے ان امور کو سرانجام دے رہے ہیں جن پر کہ وہ مامور ہیں۔

بِئْرٌ اَنْشَاطٌ: کم گہرا کنواں جس سے پانی کا ڈول ایک ہی جھٹکے میں باہر آجائے۔

اَلنَّشِيْطَةُ: اس مال کو کہتے ہیں جو رئیس قوم تقسیم غنیمت سے قبل اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ نَشِيْطَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو بلا قصد ہاتھ لگ جائیں اور حدی خواں کے بغیر ہی نشاط سے چلتے ہوں۔

نَشَطَتْهُ الْحَيَّةُ اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔

(ن ص ب)

نَصْبُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو کھڑا کرنے یا گاڑ دینے کے ہیں۔مثلاً: نیزے کے گاڑنے اور عمارت یا پتھر کو کھڑا کرنے پر نَصْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔اور نَصِيْبٌ اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر (بطور نشان کے) گاڑ دیا جاتا ہے۔اس کی جمع نَصَائِبُ وَنَصَبٌ آتی ہے۔جاہلیت میں عرب جن پتھروں کی پوجا کیا کرتے اور ان پر جانوروں کو بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔انہیں نُصُبٌ کہا جاتا تھا۔[1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ﴾ (۷۰۔۴۳) جیسے وہ عبادت کے پتھروں کی طرف دوڑتے ہیں۔نیز فرمایا:۔

﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ (۵۔۴) اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے۔

اس کی جمع اَنْصَابٌ بھی آتی ہے۔چنانچہ فرمایا:۔﴿وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (۵۔۹۰) اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیاطین سے ہیں۔

اور نَصْبٌ و نَصَبٌ کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔اور آیت کریمہ۔

﴿بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ﴾ (۳۸۔۴۱) ایذا اور تکلیف میں ایک قراءت نَصَبٍ بھی ہے اور یہ بُخْلٍ و بَخَلٍ کی طرح ہے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ﴾ (۳۵۔۳۵) یہاں نہ ہم کو رنج پہنچے گا۔

---

[1] قارن الطبری (۲۹: ۵۵۔۵۶) والقرطبی (۲۹/۲۹۶) والشوکانی (۲۸۶) والغریب للقبتی (۴۸۶)

وَانْصَبَنِیْ کَذَا کے معنی کسی کو مشقت میں ڈالنے اور بے چین کرنے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۴۲۷)تَاَوَّبَنِیْ هَمٌّ مَّعَ اللَّیْلِ مُنْصِبٗ

میرے پاس رات کو تکلیف دہ غم بار بار لوٹ کر آتا ہے۔

اور عِیْشَةٌ رَاضِیَةٌ کی طرح هَمٌّ نَاصِبٌ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے۔

اَلنَّصَبُ کے معنی مشقت کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (۱۸۔۶۲)

اس سفر سے ہم کو بہت تھکان ہوگئی ہے۔

اور نَصِبَ (س) فَهُوَ نَصِبٌ وَنَاصِبٌ کے معنی تھک جانے یا کسی کام میں سخت محنت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ﴾ (۸۸۔۳)سخت محنت کرنے والے، تھکے ماندے۔

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (۹۴۔۷)تو جب فارغ ہوا کرو۔تو (عبادت میں) محنت کیا کرو۔اَلنَّصِیْبُ کے معنی معین حصہ کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَمْ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ﴾ (۴۔۵۳) کیا ان کے پاس بادشاہی کا کچھ حصہ ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (۴۔۵۱) بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا۔

اور نَاصَبَهُ الْحَرْبَ وَالْعَدَاوَةَ وَنَصَبَ لَهٗ کے معنی کسی کے خلاف اعلان جنگ یا دشمنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ اس میں لفظ حَرْبٌ یا عَدَاوَةٌ کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔تَیْسٌ اَنْصَبُ وَشَاةٌ اَوْ عَنْزَةٌ نَصْبَاءُ کھڑے سینگوں والا مینڈھا یا بکری۔

نَاقَةٌ نَصْبَاءُ: ابھرے ہوئے سینہ والی اونٹنی نِصَابُ السِّکِّیْنِ وَنَصَبُهٗ کے معنی چھری کے دستہ ہیں۔اور اسی سے نِصَابُ الشَّیْءِ کا محاورہ ہے جس کے معنی اَصْلُ الشَّیْءِ ہیں۔تَنَصَّبَ الغبار۔غبار کا اڑنا۔

نَصَبَ السِّتْرَ: پردہ اٹھانا۔نَصْبٌ (اعراب) زبر کو کہتے ہیں۔اور نَصْبٌ ایک قسم کا راگ بھی ہے۔

(ن ص ح)

اَلنُّصْحُ: کسی ایسے قول یا فعل کا قصد کرنے کو کہتے ہیں۔جس میں دوسرے کی خیر خواہی ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (۷۔۷۹) میں نے تم کو خدا کا پیغام سنا دیا۔اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم ایسے ہو کہ خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

﴿وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ (۷۔۲۱) اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔﴿وَ لَا یَنْفَعُكُمْ نُصْحِیْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ﴾ (۱۱۔۳۴) اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

❶ البیت مطلع قصیدۃ قالها ابو قران طفیل بن کعب الغنوی فی فرسان قومه وعجزه...... وجاء من الاخبار مالا اکذب والقصیدۃ فی دیوانه (۱۷۔۲۷) والبیت فی اللسان (عقب) والطفیل جاهلی مشهور بالحر لحسن وصفه للخیل راجع لترجمته الشعراء (۴۲۲۔۴۲٤) والاشتقاق۔ (۲۷۰)۔

یہ یا تو نَصَحْتُ لَهُ الْوُدَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی سے خالص محبت کرنے کے ہیں۔اور نَاصِحُ الْعَسَلِ خالص شہد کو کہتے ہیں۔اور یا یہ نَصَحْتُ الْجِلْدَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں۔اور نَاصِحٌ کے معنی درزی اور نِصَاحٌ کے معنی سلائی کا دھاگہ کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔

﴿تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ (۶۶۔۸) خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔

میں نُصُوْحًا کا لفظ بھی مذکورہ دونوں محاوروں میں سے ایک سے ماخوذ ہے۔اور اس کے معنی خالص یا محکم توبہ کے ہیں۔اس میں نَصُوْحٌ وَ نِصَاحٌ دولغت ہیں جیسے ذَهُوْبٌ وَذَهَابٌ کسی شاعر نے کہا ہے [1] ()

(۴۲۸) اَحْبَبْتُ حُبًّا خَالَطَتْهُ نَصَاحَةٌ

میں اس سے خالص محبت رکھتا ہوں۔

(ن ص ر)

اَلنَّصْرُ وَالنُّصْرَةُ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ﴾ (۶۱۔۱۳) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی۔﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (۱۱۰۔۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی۔

﴿وَ انْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ﴾ (۲۱۔۶۸) اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (۳۔۶۰) اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔

﴿وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۵۰) اور (لشکر) کفار پر فتح یاب کر۔

﴿وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰۔۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ (۴۰۔۵۱) ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔

﴿وَ مَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ (۹۔۷۴) اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

﴿وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا﴾ (۴۔۴۵) اور خدا ہی کافی کارساز اور کافی مددگار ہے۔

﴿وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ﴾ (۲۔۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۴۶۔۲۸) تو جن کو ان لوگوں نے ...... خدا کے سوا معبود بنایا تھا۔انہوں نے ان کی کیوں مدد نہ کی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں (نَصَرَ) کا لفظ استعال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے کی مدد کرنا کے معنی تو ظاہر ہیں۔اور بندہ کے اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے اس کے بندوں کی مدد، حدود الٰہی کی حفاظت، اس کے عہود کی رعایت، احکام شریعت کی بجا آوری اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنا مراد ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ (۵۷۔۲۵) اور اس لیے کہ جو اس کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کر لے

---

[1] لم اجده فی المراجع ۱۲۔

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْکُمْ﴾ (۴۷۔۷) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔
﴿کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (۶۱۔۱۴) خدا کے مددگار بن جاؤ۔
اَلْاِنْتِصَارُ وَالْاِسْتِنْصَارُ کے معنی طلب نصرت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ﴾ (۴۲۔۳۹) اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم وتعدی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ لیتے ہیں۔
﴿وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ﴾ (۸۔۷۲) اور اگر وہ تم سے دین کے معاملات میں مدد طلب کریں۔تو تم کو مدد کرنا لازم ہے۔
﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ﴾ (۴۲۔۴۱) اور جس پر ظلم ہوا ہو وہ اگر اس کے بعد انتقام لے۔
﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (۵۴۔۱۰) تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (باری تعالی) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو (ان سے) بدلہ لے۔
میں اُنْصُرْ کی بجائے اِنْتَصِرْ کہنے سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ جو تکلیف مجھے پہنچ رہی ہے وہ گویا تجھے (ذات باری تعالیٰ) پہنچ رہی ہے کیونکہ میں تیرے حکم سے ان کے پاس گیا تھا لہٰذا میری مدد فرمانا گویا تیرا اپنی ذات کے لیے انتقام لینا ہے۔اَلتَّنَاصُرُ کے معنی باہم تعاون کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿مَا لَکُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ﴾ (۳۷۔۲۵) تم کو کیا ہوا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔
اور بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی نَصَارٰی اس لیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کا نعرہ لگایا تھا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ (۶۱۔۱۴) جیسے عیسیٰؑ بن مریم نے حواریوں سے کہا، بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار ہوں؟ تو حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ﴾ (۲۔۱۱۳) یہود کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں۔
نُصِرَ اَرْضُ بَنِیْ فُلَانٍ کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔کیونکہ بارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نَصَرْتُ فُلَانًا: جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نَصْرُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور یا نَصْرٌ بمعنی عَوْن سے

(ن ص ف)

نِصْفُ الشَّیْءِ کے معنی ۱/۲ حصہ کے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَلَکُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُکُمْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ﴾ (۴۔۱۲) اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔
﴿وَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ (۴۔۱۱) اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔
﴿فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ (۴۔۱۷۶) تو اس کو بھائی کے ترکہ میں سے آدھا حصہ ملے گا۔
اِنَاءٌ نِصْفَانٌ: آدھا بھرا ہوا برتن۔
نَصَفَ النَّهَارُ وَانْتَصَفَ: دن کا نصف ہو جانا دوپہر کا

وقت نَصَفَ الْإِزَارُ سَاقَهٗ: ازار کا نصف پنڈلی تک ہونا۔

نَصِیْفٌ: غلہ ناپنے کے ایک پیمانے کا نام ہے گویا وہ مِكْيَالِ اَكْبَرِ (بڑے پیمانے) کا نصف ہے اور اس کے معنی عورتوں کی اوڑھنی یا دوپٹہ بھی آتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۴۲۹) سَقَطَ النَّصِیْفُ وَلَمْ تُرِدْ اِسْقَاطَهٗ
فَتَنَاوَلَتْهُ وَاتَّقَتْنَا بِالْيَدِ

اوڑھنی سر سے گری اور اس نے عمداً نہیں گرائی تھی پھر اس نے (بدحواسی میں) اسے سنبھالا اور ہاتھ کے ذریعہ ہم سے پردہ کیا۔

بَلَغْنَا مَنْصِفَ الطَّرِيْقِ: ہم نے آدھا سفر طے کر لیا۔

اَلنَّصَفُ: متوسط عمر کی عورت، ادھیڑ عمر۔

اَلْمُنَصَّفُ: شراب جو آگ پر پکانے کے بعد آدھا رہ گیا ہو۔

اَلْإِنْصَافُ کے معنی کسی معاملہ میں عدل سے کام لینے کے ہیں۔ یعنی دوسرے سے صرف اسی قدر فائدہ حاصل کرے جتنا کہ اسے پہنچا ہے۔

اور نَصَفَةٌ کے معنی خدمت بھی آتے ہیں۔ اور خادم کو نَاصِفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نُصُفٌ آتی ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ خدام کو حق خدمت پورا پورا ملنا چاہیے۔

اَلْاِنْتِصَافُ وَالْاِسْتِنْصَافُ: طلب خدمت کرنا۔

(ن ص ی)

اَلنَّاصِيَةُ کے معنی پیشانی یا پیشانی کے بالوں کے ہیں کہا جاتا ہے:۔

نَصَوْتُ فُلَانًا وَّانْتَصَيْتُهٗ وَنَاصَيْتُهٗ: میں نے اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا﴾ (۱۱۔۵۶) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔ میں "اخذ نَاصِيَة" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چلنے پھرنے والی چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ﴾ (۵۶۔۱۵) تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے [2] (۱۲۹) کہ انہوں نے فرمایا۔ مَالَكُمْ تَنْصُوْنَ مَيِّتَكُمْ تم میت کی ناصیۃ کیوں باندھتے ہو اور فُلَانٌ رَأْسُهُمْ وَعَيْنُهُمْ کی طرح فُلَانٌ نَاصِيَةُ قَوْمِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی سردار کے ہیں۔

اِنْتَصَى الشَّعْرُ: بالوں کا بڑھ جانا۔

اَلنَّصِيُّ: ایک قسم کا عمدہ چارہ۔

پھر اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے:۔ فُلَانٌ نَصِيَّةُ الْقَوْمِ کہ فلاں ان میں بہتر ہے۔

---

[1] قاله النابغة الذبياني (٦٠٤ء) في وصف "متجردة" زوجة نعمان بن المنذر ولا جل هذا الشعر قال صالح بن حسان المدني: ان الشاعر كان مخنثا (شرح ديوان نابغة ٣٠) وراجع للقصة ايضا الشعراء والاغاني والبيت في ديوانه ٣٠ وامالي المرتضى (١: ٤٤٦) ومختار الشعر الجاهلي (١: ١١٢) والعقد الثمين ١٠ (١ في ٣٣) بيتا والبحر (٧: ٢٢٩، ٤٢٤) والحصري (١: ٢٦٥) والعيني (١: ٨٣) والفائق (٢: ٢٧٥) والعمدة (١: ٢٦٣) وادروه في العمدة في امثله الاختراع وهو مغاير عند العلماء والسرقة والتوحيد بوجوه وانظر الاول في المحاضرات للموئف (١: ٨٧)۔

[2] وفي غريب ابي عبيد (٤/٣١٤): علام بدل مالكم والحدث في الفائق (٢/٢٧٨) ولفظه كما في ابي عبيد ١٢۔

(ن ض ج)

نَضِجَ اللَّحْمُ (ض) نُضْجًا وَنَضْجًا کے معنی گوشت کے پوری طرح پک جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ (۴۔۵۶) جب ان کی کھالیں گل اور جل جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔

اسی سے نَاقَةٌ مُنْضِجَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی حاملہ اونٹنی کے مدت ولادت سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور پختہ رائے آدمی کو نَضِيْجُ الرَّأْيِ کہا جاتا ہے۔

(ن ض د)

نَضَدْتُ الْمَتَاعَ بَعْضَهٗ عَلٰی بَعْضٍ کے معنی سامان کو قرینے سے اوپر نیچے رکھنے کے ہیں۔ اور قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو مَنْضُوْدٌ یا نَضِيْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور جس تخت پر سامان جوڑ کر رکھا جائے اسے بھی نَضِيْدٌ کہتے ہیں...... اسی سے استعارۃً فرمایا:۔

﴿طَلْعٌ نَضِيْدٌ﴾ (۵۰۔۱۰) جن کا گابھا تہ بر تہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔

﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (۵۶۔۲۹) اور تہ بہ تہ کیلوں۔

اور مجازاً گہرے بادل کو بھی نَضَدٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَنْضَادُ الْقَوْمِ کے معنی لوگوں کی مختلف جماعتوں کے ہیں۔ اور نَضَدُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کے اعمام واخوال کے ہیں جن کی مدد سے وہ مضبوط ہوتا ہے۔

(ن ض ر)

اَلنَّضْرَةُ وَالنَّضَارَةُ کے معنی حسن اور تروتازگی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ (۸۳۔۲۴) تم ان کے چہروں سے راحت کی تازگی معلوم کر لوگے۔

﴿وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ (۷۶۔۱۱) اور تازگی اور خوشدلی عنایت فرمائے گا۔

اور نَضَرَ وَجْهُهٗ يَنْضُرُ فَهُوَ نَاضِرٌ (نَصَرَ) سے آتا ہے۔ اور بعض نے نَضِرَ يَنْضَرُ یعنی باب عَلِمَ سے مانا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔ (۷۵۔۲۲) نَضَّرَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ: اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو تروتازہ (یعنی خوش وخرم) رکھے۔ غُصْنٌ اَخْضَرُ وَ نَاضِرٌ تروتازہ ٹہنی۔

اور سونے کو بھی اس کی تروتازگی اور حسن کے باعث نَضْرٌ وَنَضِيْرٌ کہا جاتا ہے۔ وَقَدَحٌ نُضَارٌ: (راضافت کے ساتھ) پیالہ کو کہتے ہیں۔ جو عمدہ لکڑی سے بنا ہوا ہو۔

(ن ط ح)

اَلنَّطِيْحَةُ: سینگ لگنے سے مری ہوئی بکری۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ﴾ (۵۔۳) اور جو جانور گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے۔

اَلنَّطِيْحُ وَالنَّاطِحُ: اس آہو یا پرند کو کہتے ہیں۔ جو شکاری کی طرف سیدھا آئے۔ گویا وہ سینگ سے مارنا چاہتا ہے۔ ایسے شکار کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی سے نَوَاطِحُ الدَّهْرِ ہے جس کے معنی شدائد زمانہ کے ہیں۔ اور فَرَسٌ (نَطِيْحٌ) اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی

پیشانی کے دونوں طرف سفید ہوں۔

(ن ط ف)

اَلنُّطْفَةُ: (ضمہ نون) اصل میں تو آب صافی کو کہتے ہیں مگر اس سے مرد کی منی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ﴾ (۲۳۔۱۳) پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ ﴿مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ (۷۶۔۲) نطفہ مخلوط سے ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى﴾ (۷۵۔۳۷) کیا وہ منی کا، جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا۔

اور کنایہ کے طور پر موتی کو بھی نَطْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے صَبِیٌّ مُنَطَّفٌ ہے یعنی وہ لڑکا جس نے کانوں میں موتی پہنے ہوئے ہوں۔

اَلنَّطَفُ کے معنی ڈول کے ہیں اس کا واحد بھی نُطْفَةٌ ہی آتا ہے اور لَيْلَةٌ نَطُوْفٌ کے معنی برسات کی رات کے ہیں جس میں صبح تک متواتر بارش ہوتی رہے۔

اَلنَّاطِفُ: سیال چیز کو کہتے ہیں۔ اسی سے نَاطِفٌ بمعنی شکرینہ ہے اور فُلَانٌ مُنْطِفُ الْمَعْرُوْفِ کے معنی ہیں۔ فلاں اچھی شہرت کا مالک ہے۔ اور فُلَانٌ يَنْطِفُ بِسُوْءٍ کے معنی برائی کے ساتھ آلودہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ فُلَانٌ يُنَدِّيْ بِهٖ کا محاورہ ہے۔

(ن ط ق)

عرف میں نُطْقٌ ان اَصوات مقطعہ: کو کہا جاتا ہے۔ جو زبان سے نکلتی ہیں۔ اور کان انہیں سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ﴾ (۳۷۔۹۲) تمہیں کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں۔

یہ لفظ بالذات صرف انسان کے متعلق بولا جاتا ہے دوسرے حیوانات کے لیے بالتبع استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَلْمَالُ النَّاطِقُ وَالصَّامِتُ کا محاورہ ہے جس میں ناطق سے حیوان اور صامت سے سونا چاندی مراد ہے۔ ان کے علاوہ دیگر حیوانات پر ناطق کا لفظ مقید یا بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ()

(۴۳۰) عَجِبْتُ لَهَا اَنّٰى يَكُوْنُ غِنَاؤُهَا
فَصِيْحًا وَلَمْ تَفْغَرْ لِمَنْطِقِهَا فَمًا

مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنا فصیح گانا گاتی ہے حالانکہ اس نے گویائی کے لیے منہ نہیں کھولا۔

اہل منطق قوتِ گویائی کو نطق کہتے ہیں۔ جب وہ انسان کی تعریف کرتے ہوئے اَلْحَيُّ النَّاطِقُ ...... کہتے ہیں تو ناطق سے ان کی یہی مراد ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ نطق کا لفظ مشترک ہے جو قوت نطقیہ اور کلام ملفوظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ کبھی نَاطِقٌ کے معنی اَلدَّالُ عَلَى الشَّيْءِ کے بھی آتے ہیں اسی بنا پر ایک حکیم سے پوچھا گیا کہ اَلنَّاطِقُ الصَّامِتُ کسے کہتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا: اَلدلائل الْمُخْبِرَةُ وَالْعِبَرُ الْوَاعِظَةُ۔

اور آیت کریمہ:

---

[1] قاله حميد بن ثور يصف حمامة وفى لسان العرب (فغر) بمنطقها بدل لمنطقها والبيت من شواهد الكشاف (۱۱۹) والكامل (۸۴۹) فى ثمانية ابيات والحصرى (۱: ۲۷۱) فى عشرة والبلدان ويلميلم) وطبقات الشافعيه الكبرى (۱: ۱۱۱) فى ۱۳۸ بيت والوسيط (۱۲۸۔۱۲۹) والسمط (۳۸۲) فى خمسة والامالى (۱: ۱۳۹) والوحشيات (۳۱۷) فى سبعة والمحاضرات للمولف (۲: ۶۶) وادب الكاتب (۲۳) ونثار الازهار ۷۸ والخزانة (۱: ۱۷/۴: ۲۹۹) والحيوان (۳: ۱۹۸)

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ (۲۱۔۶۵) کہ تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ وہ ذوی النطق اور ذوی العقول کی جنس سے نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اَنطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (۴۱۔۲۱) جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اس نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق اعتباری مراد ہے کیونکہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ تمام چیزیں حقیقتاً ناطق نہیں ہیں۔اور آیت کریمہ:۔﴿عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ﴾ (۲۷۔۱۶) ہمیں (خدا کی طرف سے) جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ میں پرندوں کی آواز کو محض حضرت سلیمان علیہ السلام کے لحاظ سے نطق کہا ہے کیونکہ وہ ان کی آوازوں کو سمجھتے تھے اور جو شخص کسی چیز سے کوئی معنی سمجھتا ہو تو وہ چیز خواہ صامت ہی کیوں نہ ہو۔اس کے لحاظ سے تو ناطق کا حکم رکھتی ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿هٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ (۴۵۔۲۹) یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کر دے گی۔

میں کتاب کو ناطق کہا ہے لیکن اس کے نطق کا ادراک صرف آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ جیسا کہ کلام بھی ایک کتاب ہے۔ لیکن اس کا ادراک حاسۂ سماعت سے ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (۴۱۔۲۱) اور وہ اپنے چمڑوں یعنی اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی؟ وہ کہیں گے: جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق صوتی مراد ہے اور بعض نے نطق اعتباری مراد لیا ہے۔ اور عالم آخرت کی اصل حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نطق درحقیقت لفظ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معنی کو لپیٹنے اور محصور کرنے میں بمنزلہ نطاق کے ہوتا ہے۔

اَلْمِنْطَقُ وَالْمِنْطَقَةُ: کمر بند کو کہتے ہیں اور شاعر کے قول [1]

(۴۳۱) وَاَبْرَحُ مَا اَدَامَ اللّٰهُ قَوْمِیْ
بِحَمْدِ اللّٰهِ مُنْتَطِقًا مُجِیْدًا

جب تک میری قوم زندہ ہے، میں بحمد اللہ عمدہ گو شاعر رہوں گا۔

میں بعض نے کہا ہے مُنْتَطِقًا کے معنی جانباً کے ہیں یعنی گھوڑے کو آگے سے پکڑ کر کھینچتا رہوں گا اور اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ ہاں اگر اس معنی میں کوئی دوسرا شعر نہ آیا ہو تو یہاں منطق سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس نے کمر پر نطاق باندھا ہوا ہو۔ جیسا کہ مقولہ مشہور ہے [2]

وَمَنْ يَطُلْ ذَيْلُ اَبِيْهِ يَنْتَطِقُ بِهٖ یعنی جس کے باپ

---

[1] قاله خداش بن زهير و في اللسان (نطق) على الاعداد بدل بحمد الله وفي ديوانه رهطى بدل قومي والبيت من شواهد ابى عبيدة في مجازه (۱: ۳۱٦) رقم ۳٦ والعيني (۲: ٦٤)

[2] وفي رواية "هن ابيه" بدل ذيل ابيه (نطق) وفي اللسان (اير) أيرابيه وانظر للمثل للسان (نطق) وجمهرة الامثال (۱۸۷) ومجمع الامثال (۲: ۲٥٦) والفائق (۱: ۳۱) والمشكل للقبتى ٦٤ والحيوان للجاحظ (۳: ٤۲) والعيون في مقدمته ۱۲۔

کے فرزند زیادہ ہوں گے۔تو وہ ان کی وجہ سے طاقت ور اور توانا ہو جائے گا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ مُنْتَطِقٌ کے معنی عمدگو کے ہیں۔

(ن ظ ر)

اَلنَّظَرُ کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لیے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور وفکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں۔ جو غور وفکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: نَظَرْتَ فَلَمْ تَنْظُرْ تو نے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ (۱۰۔۱۱)ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ میں اُنْظُرُوْا کے معنی غور کرنے کے ہیں۔ اگرچہ کچھ عوام کے نزدیک زیادہ تر نظر کا لفظ رؤیۃ بصری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن خواص کے نزدیک یہ عام طور پر بصیرت کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (۷۵۔۲۲،۲۳) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔

نَظَرْتُ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی چیز کی طرف نظر اٹھانے کے ہیں۔ خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ اور نَظَرْتُ فِيْهِ کا معنی کسی چیز کو دیکھ کر اس میں غور کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (۸۸۔۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔

نَظَرْتُ فِيْ كَذَا کے معنی کسی چیز میں غور کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ (۳۷۔۸۸،۸۹) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۔۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں...... نظر نہیں کی۔

میں آسمان وزمین کی خلقت میں جو جو حکمتیں مضمر ہیں۔ ان پر فکر وتامل کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی طرف نظر کرنے سے ان پر احسان اور لطف کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور کفار کی طرف نظر نہ کرنے کے معنی ان سے لطف وکرم اور افاضہ انعامات کو روک لینے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (۳۔۷۷) ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور آیت کریمہ:۔

﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (۸۳۔۱۵) بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے اوٹ میں ہوں گے۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔

اور اَلنَّظَرُ بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نَظَرْتُهٗ وَانْتَظَرْتُهٗ دونوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ﴾ (۱۱۔۱۲۲) اور (نتیجہ اعمال کا) تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

﴿فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ﴾ (۱۰۔۱۰۲) سو جیسے برے دن ان سے پہلے لوگوں پر گذر چکے ہیں اسی طرح کے دنوں کے یہ منتظر ہیں۔ کہہ دو کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے۔ کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

﴿اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ﴾ (۳۳۔۵۳) کھانے کے لیے..... اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔

﴿فَنَاظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۵) اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔ ﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ﴾ (۴۳۔۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر ناگہاں آ موجود ہو۔ اور ان کو خبر تک نہ ہو۔

﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۔۲۱۰) کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آ نازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں)

﴿وَمَا یَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً﴾ (۵۸۔۱۵) اور یہ لوگ تو صرف ایک آواز کا انتظار کرتے ہیں۔

اور اَنْظَرْتُهٗ کے معنی اَخَّرْتُهٗ یعنی مؤخر کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ﴾ (۱۵۔۸) اور اس وقت ان کو مہلت نہیں ملتی۔

﴿قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ﴾ (۷۔۱۴،۱۵) اس نے کہا کہ مجھے اس دن تک مہلت عطا فرماؤ جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا (اچھا) ﴿فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ﴾ (۱۱۔۵۵) تجھ کو مہلت دی جاتی ہے میرے بارے میں جو تدبیر (کرنی چاہو) کرلو اور مجھے مہلت نہ دو۔ ﴿لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ﴾ (۳۲۔۲۹) کہ کافروں کو ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ﴾ (۴۴۔۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔ یہاں ان سے اِنْظَارٌ کی نفی کر کے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس پر کہ آیت کریمہ: ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (۷۔۳۴) جب وہ وقت آ جاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔ میں متنبہ کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ (۷۔۱۴۳) اے میرے پروردگار! مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار (بھی) کروں۔ کی کچھ تشریح پہلے گذر چکی ہے۔ اور اس کے حقائق پر مفصل بحث اس کے بعد دوسری کتاب (تفسیر القرآن) میں بیان ہوگی۔

اور نَظَرٌ کا لفظ کسی معاملہ میں متحیر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

(۲۔۵۵) تو تم کو بجلی نے آ گھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔
﴿وَ تَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَ ھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ (۷۔۱۹۸) آنکھیں کھولے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مگر (دراصل) کچھ نہیں دیکھتے۔ نیز فرمایا:
﴿وَتَرٰاھُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا خَاشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ﴾ (۴۲۔۴۵) اور تم ان کو دیکھو گے کہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ذلت سے عاجزی کرتے ہوئے چھپی (اور نیچی) نگاہ سے دیکھ رہے ہوں گے۔
﴿وَ مِنْھُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تَھْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ (۱۰۔۴۳) اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔ تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے۔ اگر کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔
ان تمام آیات میں نَظَرٌ کے معنی حیرت زدہ ہو کر دیکھنے کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح دیکھنا بے معنی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ (۲۔۵۰) اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔
میں بعض نے تَنْظُرُوْنَ کے معنی مشاہدہ کے لکھے ہیں۔ اور بعض نے عبرت حاصل کرنے کے۔ اور شاعر کے قول❶ (الرمل)
(۴۲۳) نَظَرَ الدَّھْرُ اِلَیْھِمْ فَابْتَھَلْ
میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ زمانہ نے خیانت کی اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔"
اور حَیٌّ نَظَرٌ اس قوم کو کہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب فروکش ہوں کہ ان کے خیمے آمنے سامنے نظر آتے ہوں۔ اور آبادی میں اسی قسم کے قرب سے حدیث میں کفار سے دور رہنے کا حکم دیتے ہیں فرمایا❷ (۱۳۰)
لَا یُتَرَاءَیٰ نَارَاھُمَا کہ مسلمان کفار سے اتنی دور ہوں کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔ اور نَظِیْرٌ کے معنی ہم مثل کے ہیں۔ اصل میں نظیر بمعنی مُنَاظِرٌ ہے گویا ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم موازنہ کرتے ہیں۔
وَبِہٖ نَظْرَۃٌ (وہ آسیب زدہ ہے) شاعر نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے❸ ()
(۴۲۴) وَقَالُوْا بِہٖ مِنْ اَعْیُنِ الْجِنِّ نَظْرَۃٌ
اور لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اور اسے کسی جن کی نظر لگی ہوئی ہے۔
اَلْمُنَاظَرَۃُ کے معنی مباحثہ یعنی بحث ونظر میں باہم مقابلہ کرنے اور ہر ایک کے اپنی رائے علی وجہ البصیرۃ ظاہر کرنے کے ہیں۔ اور نَظَرٌ کے معنی بحث کرنا بھی آتے ہیں۔ اور قیاس سے عام ہے کیونکہ ہر قیاس کو نَظَرٌ کہہ

---

❶ قالہ لبید وصدرہ۔ "فی قروم سادۃ من قومہ" انظر دیوانہ، ۱۷ (طبعہ لیدن (۱۸۹۱ء) والطبرسی (۲۸۰۳) وقد مرفی ابھل)
❷ اخرجہ النسائی وابوداؤد وقد مر تخریجہ، فی (رء ی)
❸ نسبہ صاحب مصارع العاشق (۱۲۹۔۱۳۰) بروایۃ ابن الاعرابی الیٰ مجنون بنی عامر وتمامہ...... ولو عقلوا قالوا بہ اعین الانس وفی محاضرات المؤلف (۳:۸۶) عجزہ: ولو صدقوا قالوا بہ نظرۃ الانس وقبلہ: وَجاءُ والیہ بالتعاویذ والرقیٰ وصبوا علیہ الماء من الم النکس۔

سکتے ہیں لیکن ہر نظر قیاس نہیں ہوتی۔

(ن ع ج)

اَلنَّعْجَۃُ کی جمع نِعَاجٌ آتی ہے اور اس کا اطلاق بھیڑ، نیل گاؤ اور پہاڑی بکریوں میں سے مادینہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿اِنَّ ھٰذَا اَخِی لَہٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَۃً وَّلِیَ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ﴾ (۳۸۔۲۳) یہ میرا بھائی ہے اس کے ہاں ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔

نَعِجَ الرَّجُلُ: بھیڑ کا گوشت کھانے سے بدہضمی ہونا۔

اَنْعَجَ الرَّجُلُ: موٹی بھیڑوں کا مالک ہونا۔ اَلنَّعْجُ کے معنی سپیدی یا سپید ہونے کے ہیں اور اَرْضٌ نَاعِجَۃٌ نرم زمین کو کہتے ہیں۔

(ن ع س)

اَلنُّعَاسُ کے معنی اونگھ یا ہلکی سی نیند کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ﴾ (۸۔۱۱) جب اس نے ...... تمہیں نیند کی چادر اڑھادی۔

﴿اَمَنَۃً نُّعَاسًا﴾ (۳۔۱۵۴) تسلی ...... یعنی نیند بعض نے کہا ہے کہ یہاں نُعَاسٌ سے مراد سکون اور اطمینان ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کے قول مبارک کی طرف اشارہ ہے (۱۳۱)[1]

((طُوْبٰی لِکُلِّ عَبْدٍ نُوَمَۃٍ)) کہ ہر باسکون آدمی کے لیے خوشخبری ہے۔

(ن ع ق)

نَعَقَ الرَّاعِیْ بِصَوْتِہٖ کے معنی چرواہے کے چلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿کَمَثَلِ الَّذِیْنَ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً﴾ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

(ن ع ل)

اَلنَّعْلُ کے معنی جوتا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی﴾ (۲۰۔۱۲) تو اپنا جوتا...... اتار دو تم یہاں پاک میدان یعنی طوئ میں ہو۔

اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کی حفاظت کے لیے جو چمڑا یا لوہا لگایا جاتا ہے اسے بھی نعل الفرس کہتے ہیں۔ اسی طرح نیام شمشیر کے بائیں جانب جو لوہا لگایا جاتا ہے اسے نَعْلُ السَّیْفِ کہا جاتا ہے۔ فَرَسٌ مُنْعَلٌ وہ گھوڑا جس کے رُسْغ کے نیچے بالوں پر سفید نشان ہو۔

اور پاپوش پوش کو نَاعِلٌ وَ مُنْعَلٌ کہا جاتا ہے اور کبھی اس سے مالدار آدمی بھی مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اَلْحَافِیْ سے مراد فقیر ہوتا ہے۔

(ن ع م)

اَلنِّعْمَۃُ: اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فِعْلَۃٌ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے جِلْسَۃٌ وَرِکْبَۃٌ۔ وغیر ذالک

اور نَعْمَۃٌ کے معنی تَنَعُّمْ یعنی آرام آسائش ہیں اور یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے۔ جو مرۃ لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ضَرْبَۃٌ وَشَتْمَۃٌ اور نِعْمَۃٌ کالفظ اسم جنس سے جو قلیل و کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں

---

[1] وفی المعاجم نعق الراعی بغنمہ ۱۲۔

ہے: ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (۱۴۔۳۴) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کرسکو۔

﴿اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ (۲۔۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے ﴿وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (۵۔۴) اور میں نے اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں۔

﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۳۔۱۷۴) پھر خدا کی نعمتوں کے ساتھ واپس آئے۔ وَغَیْـــرَ ذَالِكَ

اَلْاِنْـعَامُ (افعال) کے معنی دوسروں پر احسان کرنے کے ہیں۔ اور یہ لفظ صرف اسی وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب مُنْعَمْ علیه ذوی العقول سے ہو لہٰذا اَنْـعَمَ فُلَانٌ عَلٰی فَرَسِہٖ کہنا درست نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ (۱۔۶) جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا۔

﴿وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ﴾ (۳۳۔۳۷) اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ﴾ (۴۳۔۵۹) وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا تھا۔

اَلنَّعْمَآءُ یہ ضَرَّآءُ کے مقابلہ میں آتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ (۱۱۔۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور نَعْمٰی بُؤْسٰی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور نَعِیْمٌ کے معنی نِعْمَةٌ کَثِیْرَةٌ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ﴾ (۵۶۔۱۲) نعمتوں کی بہشت میں۔

﴿جَنّٰتِ النَّعِیْمِ﴾ (۲۱۔۸) نعمت کے باغ میں۔

تَنَعُّمٌ کے معنی خوش حال ہونے اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے ہیں اور نَعَّمَهٗ کے معنی کسی کو آسودہ حال بنانے کے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ﴾ (۸۹۔۵) اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے۔

طَعَامٌ نَّاعِمٌ: (عمدہ کھانا) جَارِیَةٌ نَاعِمَةٌ: نازک اندام لڑکی۔ اور اَلنَّعَم کا لفظ خاص کر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اونٹوں کو نَعَمٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عرب کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے اس کی جمع اَنْعَامَ آتی ہے۔ لیکن اَنْعَام کا لفظ بھیڑ بکری اونٹ اور گائے سب پر بولا جاتا ہے۔ مگر ان جانوروں پر اَنْعَامٌ کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے۔

جب اونٹ بھی ان میں شامل ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ﴾ (۴۳۔۱۲) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے۔

﴿وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا﴾ (۶۔۱۴۱) اور چارپایوں میں بوجھ اٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے بھی) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے بھی)۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ﴾ (۱۰۔۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں۔ مل کر نکلا۔

میں اَنْعَامَ کا لفظ عام ہے۔ جو تمام جانوروں کو شامل ہے۔

نَعَامٰی۔ جنوبی ہوا جو نرمی سے چل رہی ہو۔ اور شتر مرغ

کو "نَعَامَۃٌ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خلقت میں اونٹ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور پہاڑ یا کنویں کے اوپر سائبان کے مانند بنی ہوئی عمارت جو کہ دور سے شتر مرغ کی طرح دکھائی دیتی ہو۔ اس کو بھی نَعَامَۃٌ کہا جاتا ہے [1] نَعَائِمُ منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے۔ [2] جو شتر مرغ کی ہم شکل فرض کی گئی ہے...... اور شاعر کے قول [3] (الکامل)

(۴۳۴) وَابْنُ النَّعَامَةِ عِنْدَ ذٰلِكَ مَرْكَبِي

اور میری سواری میرا گھوڑا ابن نعامہ ہوگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ابن نعامۃ سے شاعر نے خود اپنے پاؤں مراد لیے ہیں۔ اور سرعت رفتاری میں انہیں اِبْـنِ نَـعَامَہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ نعامہ کے معنی باطن قدم کے بھی آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہل عرب نے یہ معنی بھی اِبْـنُ الـنَّعَامَة کے محاورہ سے ہی اخذ کیا ہے۔ اور تَنَعَّمَ فُلَانٌ جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں، نِعْمَة سے مشتق ہے۔

نِـعْـمَ کلمہ مدح ہے جو بِـئْــسَ فعل ذم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نِـعْـمَ الْـعَبْدُ اِنَّـهٗ اَوَّابٌ﴾ (۳۸۔۳۰) بہت خوب بندے تھے اور (خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔

﴿فَـنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ﴾ (۳۔۱۳۶) اور اچھے کام کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

﴿نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ (۸۔۴۰) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

﴿وَالْاَرْضَ فَـرَشْنٰـهَا فَـنِـعْـمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾ (۵۱۔۴۸) اور زمین کو ہم ہی نے بچھایا تو (دیکھو ہم) کیا خوب بچھانے والے ہیں۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ (۲۔۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔

اور محاورہ ہے:۔

اِنْ فَـعَـلْـتَ كَذَا فَبِهَا وَنَعِمَتْ: اگر تم نے ایسا کیا تو خوب کیا اور یہ اچھی عادت ہے۔

غَسَّـلْتُـهٗ غَسْلًا نَـعِمًّا: میں نے اسے اچھی طرح دھویا۔

فَعَلَ كَذَا وَاَنْعَمَ: اس نے فلاں کام کیا اور خوب کیا۔ نَعَّمَ اللّٰـهُ بِكَ عَيْنًا: اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے یا تمہاری وجہ سے دوسروں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

نَعَمْ: یہ کلمہ ایجاب ہے اور لفظ نعمت سے مشتق ہے۔

اور نَـعَـمْ وَنُعْمَةُ عَيْنٍ وَنُعْمٰى عَيْنٍ وَنُعَامُ عَيْنٍ وغیرہ (ان سب کا ماخذ نعمت ہی ہے) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمام مرکبات اَنْعَمَ سے ماخوذ ہوں جس کے معنی نرم اور سہل بنانے کے ہیں۔

---

[1] انظر المخصص ۵/۱۳۵۔

[2] "هي" منزلة من منازل القمر بها ثمانية نجوم اربعة في المجرة وتسمى الواردة واربعة خارجه تسمى الصادرة (الحيوان ٤/٣٥١)

[3] اختلفت الروايات في صدره ونسبته ففي الصحاح (نعم) ومختارا الشعر الجاهلي (١: ٣٠٤) قاله عنترة في سبعة ابيات وصدره: فيكون مركبك القعود و رحله وكذا في المخصص (٣٠٦/١٣) والحكم والعقد ٣٥ وابن الشجري في حما رتبه ٨ واماليه (١: ٢٦١) والمعاني للقبتي ٩٠ وفي ذيل الصحاح انه لخززين لوذان وكذا في اللسان (عتق) وابن خالويه والحيوان (٤: ٣٦٣-٣٦٤) مع اَرْبَعَة اخر وفيه حد جه بدل رحله ويوم ذاك بدل عند ذاك و كتاب الخيل لابن زياد الاعرابي (٩٢) يعني بابن النعامة فرسا يقال له غراف بن نعامة كانت له كما في الخزانة البغدادية (١١/٣) والبيان للجاحظ (١٧٩/٣) وامالي ابن الشجري (١: ٣٦٠) والشاعر جاهلي قديم راجع الخزانة والموتلف (١٠٢) والمعنى البيت انظر لمعاني للقبتي ٩٠۔

(ن غ ض)

اَلْاِنْغَاضُ کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب سے سر ہلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ﴾ (۱۷۔۵۱) تو تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے۔

نَغَضَ نَغْضَانًا: کپکپی کے ساتھ سر اور دانت ہلانا۔

اَلنَّغْضُ: بہت سر ہلانے والا نر شتر مرغ۔

اَلنُّغْضُ: کندھے کے کنارے کی پتلی ہڈی

(ن ف ث)

اَلنَّفْثُ ۔ کے معنی تھوڑا سا تھوکنے یا تھکارنے کے ہیں۔ اور یہ تفل (تھوکنا) سے کم درجہ ہوتا ہے۔ اور افسوں یا جادو کرنے والے کے گنڈوں پر پڑھ کر پھونکنے کو بھی نَفَثٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِى الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳۔۴) اور گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔

اور اسی سے اَلْحَيَّةُ تَنْفُثُ السُّمَّ (سانپ زہر اگلتا ہے) کا محاورہ ہے مثل مشہور ہے [1] ()

لَوْ سَأَلْتَهُ نُفَاثَةَ سِوَاكِ مَا اَعْطَاكَ اگر تو اس سے مسواک کا ایک ریزہ بھی طلب کرے تو نہ دے (یعنی وہ نہایت بخیل ہے) اور نُفَاثَة سِوَاكِ اس ریزہ کو کہا جاتا ہے جو مسواک کرنے سے دانتوں میں رہ جاتا ہے۔ اور اسے پھینک دیا جاتا ہے۔

دَمٌ نَفِيْثٌ: خون جو زخم سے بہہ نکلے۔ مثل مشہور ہے [2]۔

لَا بُدَّ لِلْمَصْدُوْرِ اَنْ يَّنْفُثَ درد سینہ کے مریض کو تھوکنے سے چارہ نہیں۔

(ن ف ح)

نَفَحَ (ن) نَفْحًا الرِّيْحُ: ہوا کا چلنا۔

لَهٗ نَفْحَةٌ طَيِّبَةٌ: وہ سخی ہے۔

اور کبھی بطور استعارہ شر کے لیے بھی نَفْحَةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ﴾ (۲۱۔۴۶) اور اگر ان کو تمہارے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی پہنچے۔

نَفَحَتِ الدَّابَّةُ: جانور کا سم سے مارنا۔

نَفَحَهٗ بِالسَّيْفِ: ہلکی سی تلوار مارنا۔

اَلنَّفُوْحُ (من النوق): وہ اونٹنی جس کے تھنوں سے بغیر دوہنے کے دودھ نکل پڑے (مِنَ الْقِسِىِّ) دور تک تیر پھینکنے والی کمان۔

اَنْفِحَةُ الْجَدِىْ: بکری کے شیر خوار بچے کے پیٹ سے ایک زردی چیز نکالتے ہیں۔ اور ایسے پشم کے لتہ میں لپیٹ کر پنیر کی طرح خشک کر لیتے ہیں عوام اسے مَجْبَنَةٌ کہتے ہیں۔

(ن ف خ)

اَلنَّفْخُ کے معنی کسی چیز میں پھونکنے کے ہیں۔

---

[1] کذا فی المعاجم۔

[2] الاولی ان یکون بالف الاشباع ای ان ینفثا وقرینہ، وللذی فی الصدر ان یبعثا (رسالۃ ابن القارح الی ابی العلاء المعری الذی اجاب عنھا فی رسالۃ خاصۃ سماھا "الغفران" انظر رسائل البلغاء نشر کرد علی معرض (۲۶۵) ومثلہ فی الفائق (۲ : ۹) قال عمر بن عبدالعزیز لعبید اللہ بن عبداللہ بن عتبۃ حتی متی تقول الشعر فقال: لا بد للمصدور ان یسیلا۔ وللذی فی الصدر ان یبعثا ۱۲۔

جیسے فرمایا:۔

﴿وَ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ﴾ (۲۷۔۸۷) اور جس دن صور پھونکا جائے گا۔

﴿وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ (۳۶۔۵۱) اور (جس وقت) صور پھونکا جائے گا۔

﴿ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی﴾ (۳۹۔۶۸) پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا۔

اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ﴾ (۷۴۔۸) جب صور پھونکا جائے گا۔

اور اسی سے نَفْخُ الرُّوْحِ ہے جس کے معنی اس دنیا میں کسی کے اندر روح پھونکنے کے ہیں چنانچہ آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (۱۵۔۲۹) اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ محاورہ ہے:۔

اِنْتَفَخَ بَطْنُهٗ: کا پیٹ پھول گیا۔

اور اسی سے بطور استعارہ اِنْتَفَخَ النَّهَارُ کا محاورہ ہے جس کے معنی دن کے بلند ہونے کے ہیں۔ اور نَفْخَةُ الرَّبِیْعِ کے معنی موسم بہار کی تروتازگی کے ہیں۔ اور موٹے آدمی کو رَجُلٌ مَنْفُوْخٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ف د)

اَلنَّفَادُ: (س) ختم ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ﴾ (۳۸۔۵۴) یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور اس معنی میں فعل نَفِدَ (س) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ﴾ (۱۸۔۱۰۹) کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر ختم ہو جائے۔ ﴿مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (۳۱۔۲۷) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔

اَنْفَدُوْا: ان کا توشہ ختم ہو گیا۔ اور خَصْمٌ مُنَافِدٌ دوسرے کی حجت کو ختم کرنے کے لیے جھگڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اور نَافَدْتُهٗ وَنَفَدْتُهٗ کے معنی دوسرے کی دلیل کو ختم کرنے کے ہیں۔

(ن ف ذ)

نَفَذَ السَّهْمُ فِی الرَّمِیَّةِ نُفُوْذًا وَّنَفَاذًا کے معنی تیر کے نشانہ سے پار ہو جانے کے ہیں۔ اور نَفَذَ فُلَانٌ فِی الْاَمْرِ نَفَاذًا کے معنی کسی کام کو کر گزرنے کے اور اَنْفَذْتُهٗ (افعال) کے معنی پار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

﴿اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ﴾ (۵۵۔۳۳) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان و زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ اور زور کے سوا تو تم نکل سکتے ہی نہیں۔ نَفَّذْتُ الْاَمْرَ تَنْفِیْذًا حکم نافذ کرنا۔

نَفَّذْتُ الْجَیْشَ فِی الْغَزْوِ: غزوہ میں لشکر بھیجنا...... حدیث میں ہے۔[1] (۱۳۰)

[1] من جملة وصایاه صلی الله علیه وسلم فی مرض موته راجع البخاری۔

نَفِّذُوْا جَيْشَ اُسَامَةَ کہ جیش اسامہ کو روانہ کردو۔
اَلْمَنْفَذُ باہر نکلنے کا راستہ۔

(ن ف ر)

اَلنَّفْرُ: (عن) کے معنی کسی چیز سے روگردانی کرنے اور (الی کے ساتھ) کسی کی طرف دوڑنے کے ہیں۔ جیسا کہ فَــزْعٌ کا لفظ الیٰ اور عن دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔
نَفَرَ عَنِ الشَّیْءِ نُفُوْرًا: کسی چیز سے دور بھاگنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۳۵۔۴۲) تو اس سے ان کی نفرت ہی بڑھی۔
﴿وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ (۱۷۔۴۱) مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔
نَفَرَ اِلَى الْحَرْبِ (ض ن) نَفَرًا: لڑائی کے لیے نکلنا اور اسی سے ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ کو يَوْمَ النَّفْرِ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس روز حجاج منیٰ سے مکہ معظمہ کو واپس ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ (۹۔۴۱) تم سبکسار ہو یا گراں بار (یعنی مال و اسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت) گھروں سے نکل آؤ۔
﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ (۹۔۳۹) اگر نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔
﴿مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۹۔۳۸) تمہیں کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد) کے لیے نکلو۔ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ﴾ (۹۔۱۲۲) اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں۔ تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے۔
اَلْاِسْتِنْفَارُ: (۱) جنگ کے لیے نکلنے کی ترغیب دینا (۲) لوگوں کو لڑائی سے بھاگ جانے پر اکسانا (۳) ڈر کر بھاگ جانا۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (۷۴۔۵۰) گویا گدھے ہیں کہ بدک جاتے ہیں۔
میں مُسْتَنْفِرَةٌ: اگر کسرہ فاء کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی نَافِرَةٌ یعنی ڈر کر بھاگنے والا کے ہوں گے۔ اور فتح فاء کے ساتھ ہو تو مُنْفَرَةٌ: کے ہم معنی ہوگا یعنی بھگایا ہوا۔
اَلنَّفْرُ وَالنَّفِيْرُ وَالنَّفْرَةُ: بھاگنے والے آدمیوں کا گروہ۔
اَلْمُنَافَرَةُ مفاخرۃ میں محاکمہ کرنا۔ اسی سے اُنْفِرَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی مفاخرۃ میں غالب ہونے کا فیصلہ دیے گئے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔
نُفِّرَ فُلَانٌ (بزعم اہل جاہلیت) شیطان کو بھگانے کے لیے بچے کا کوئی نام رکھنا۔ چنانچہ ایک اعرابی کا بیان ہے کہ میری پیدائش پر کسی نے میرے والد سے کہا: نَفِّرْ عَنْهُ کہ اس سے شیطان کو بھگاؤ۔ تو والد نے میرا نام قُنْفُذٌ اور کنیت اَبُو الْعِدَا رکھ دی۔
نَفَرَ الْجِلْدُ: جلد میں ورم ہو جانا۔
ابو عبید کا قول ہے کہ یہ نِفَارُ الشَّیْءِ عَنِ الشَّیْءِ سے ہے جس کے معنی ایک چیز کے دوسری سے دور اور الگ ہونے کے ہیں۔

(ن ف س)

اَلنَّفْسُ کے معنی روح کے آتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ ﴿اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (۶۔۹۳) کہ نکال لو اپنی جانیں۔ ﴿وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي

اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ﴾ (۲۔۲۳۵) اور جان رکھو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خدا کو سب معلوم ہے۔ اور ذیل کی دونوں آیتوں۔

﴿تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ﴾ (۵۔۱۱۶) اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے۔ اور جو تیرے ضمیر میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

﴿وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ (۳۔۳۰) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نَفْسَهٗ کی اضافت اگر چہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی اضافت اضافتِ ملک ہے۔ اور اس سے ہمارے نفوس امارہ مراد ہیں، جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

اَلْمُنَافَسَةُ: کے معنی نفوس فاضلہ کے ساتھ اتصال اور تشبیہ حاصل کرنے کے لیے...... مجاہدہ نفسانی (نفس کشی) کے ہیں۔ بدوں اس کے کہ دوسروں کو اس سے ضرر پہنچے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَّفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (۸۳۔۲۶) تو (نعمتوں کے) شائقین کو چاہیے کہ اس سے رغبت کریں۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (۵۷۔۲۱) بندو! اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔

اَلنَّفْسُ کے معنی سانس کے ہیں۔ جو منہ اور ناک کے نتھنوں کے ذریعہ بدن کے اندر جاتا اور باہر نکلتا ہے۔ اور یہ روح کے لیے بمنزلہ غذا کے ہے۔ جس کے انقطاع سے روح زائل ہو جاتی ہے۔ اور نَفَسٌ کے معنی کشائش اور فراخی کے بھی آتے ہیں اور اسی سے ایک روایت میں ہے۔ [1] (۱۳۰) ((اِنِّیْ لَا جِدُ نَفَسَ رَبِّكُمْ مِّنْ قِبَلِ الْیَمَنِ)) کہ میں یمن کی جانب سے کشائش اور فراخی یعنی نصرت الٰہی پاتا ہوں (انصار کا یمنی ہونا اس احساس کی تصدیق کے لیے کافی ہے) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا [2] (۱۳۱) ((لَا تَسُبُّوا الرِّیْحَ فَاِنَّهَا مِنْ نَّفَسِ الرَّحْمٰنِ)) ہوا کو برا بھلا مت کہو۔ بے شک یہ خدائے رحمٰن کے نفس سے ہے یعنی اس سے غم دور ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے [3] (۱۳۲) اَللّٰهُمَّ نَفِّسْ عَنِّیْ اے اللہ! میری تکلیف دور فرما۔ تَنَفَّسَتِ الرِّیْحُ: عمدہ ہوا چلنا۔ شاعر نے کہا ہے [4] (الطویل)

(۴۳۵) فَاِنَّ الصَّبَارِیْحٌ اِذَا مَا تَنَفَّسَتْ

---

[1] الحديث فی الفائق وفی الطبرانی نفیر ربكم وبهذ اللفظ ذكره صاحب الكشاف وفی رواية نفس الرحمن انظر اللسان (نفس) والمشكل للقبتی والغزالی فی الاحياء (۲۲۲/۳) قال العراقی فی تخريجه اشار به الی اويس القرنی ولم اجدله اصلاو فی مناقب اهل اليمن احاديث ۱۲۔

[2] قطعة من الحديث اخرجه، الترمذی فی جامعه والبيهقی فی سننه۔

[3] قطعة من الدعا ابن السنی فی اليوم والليله (تحفة الذاكرين۔

[4] قالته امرءة نجدية فی ثلاثة ابيات ولشعرها قصة راجع القالی (۲: ۱۷۷) وفی محاضرات المؤلف (ر٤٠٥٥) انشده المجنون فی الريح المستطابة وقبله: احذبردها او تشف منی حرارة علی كبد لم يبق الّا رسو مها والبيت فی اللسان (نسم) بغير عزو۔

عَلٰی نَفْسٍ مَحْزُوْنٍ تَجَلَّتْ هُمُوْمُهَا

بے شک بادِ صبا ایسی ہوا ہے کہ اس کے چلنے سے مغموم دلوں کے تمام غم دور ہو جاتے ہیں۔ اَلنِّفَاسُ کے معنی عورت کے بچہ جننے یا حالت زچگی میں ہونے کے ہیں۔ اور اس عورت کو جو حالت نفاس میں ہو نُفَسَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع نُفَاسٌ آتی ہے۔ اور صَبِیٌّ مَنْفُوْسٌ کے معنی نوزائیدہ بچہ کے ہیں۔

تَنَفَّسَ النَّهَارُ: دن کا چڑھنا، دوپہر ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ﴾ (۸۱۔۱۸) اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔

اور نَفِسْتُ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کو عزیز سمجھنے اور اس پر بخل کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے نَفِیْسٌ وَ مَنْفُوْسٌ بِهِ اور مُنْفِسٌ ہے جس کے معنی قیمتی چیز کے ہیں۔

(ن ف ش)

اَلنَّفْشُ (ن) کے معنی اون دھنکنے اور پھیلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (۱۰۱۔۵) جیسے دھنکی ہوئی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔

نَفْشُ الْغَنَمِ: (رات کے وقت) بکریوں کا بغیر چرواہے کے (چرنے کے لیے) منتشر ہونا۔

اَلنَّفَشُ: (بفتح الفاء اسم) وہ بکریاں جو رات کو بغیر چرواہے کے چرنے کے لیے منتشر ہو گئی ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ﴾ (۲۱۔۷۸) جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں۔

اَلْاِبِلُ النَّوَافِشُ: رات کو بغیر چرواہے کے چرنے والے اونٹ۔

(ن ف ع)

اَلنَّفْعُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خیرات تک رسائی کے لیے استعانت حاصل کی جائے۔ یا وسیلہ بنایا جائے پس نفع خیر کا نام ہے۔ اور اس کی ضد ضَرٌّ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ (۲۵۔۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾ (۷۔۱۸۸) کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ﴾ (۶۰۔۳) نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد۔ ﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ﴾ (۳۴۔۲۳) اور خدا کے ہاں (کسی کے لیے) سفارش فائدہ نہیں دے گی۔

﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ﴾ (۱۱۔۳۴) تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ وَغَیْرُ ذالك من الایَاتِ یعنی اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔

(ن ف ق)

نَفَقَ (ن۔س) اَلشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔ اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) خوب فروخت ہونے سے جیسے نَفَقَ الْبَيْعُ: (سامان) خوب فروخت ہونا۔ اسی سے نَفَاقُ الْاَيِّمِ ہے جس کے معنی بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔

نفق الْقَوْمُ: بازار کا پررونق ہونا۔

(۲) بذریعہ مرجانے کے، جیسے نَفَقَتِ الدَّابَّةُ نُفُوْقًا: جانور کا مرجانا۔

(۳) بذریعہ فنا ہوجانے کے جیسے نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ: دراہم خرچ ہوگئے۔ اَنْفَقْتُهَا: ان کو خرچ کردیا۔

اَلْاِنْفَاقُ کے معنی مال وغیرہ صرف کرنا کے ہیں۔ اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔

﴿اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۱۹۴) اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرو۔

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (۶۳۔۱۰) اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے ..... خرچ کرلو۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ (۳۔۹۲) مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (راہ خدا میں) صرف نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہیں کرسکو گے۔ اور جو چیز تم صرف کرتے ہو۔ خدا اس کو جانتا ہے۔

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ﴾ (۳۴۔۳۹) اور تم جو چیز خرچ کرو گے۔ وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا۔

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ﴾ (۵۷۔۱۰) جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا۔ وہ ..... برابر نہیں۔

علٰی ہذا القیاس اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ﴾ (۱۷۔۱۰۰) کہو اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہوجانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے۔

میں خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ کے معنی مفلس ہونے کا خوف کے ہیں اور یہ اَنْفَقَ فُلَانٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی مال کے خرچ ہوجانے کے بعد قلاش ہوجانے کے ہیں۔ یہاں اِنْفَاقَ بمعنی اِمْلَاق ہے۔ جیسے فرمایا:۔ ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (۱۷۔۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

نَفَقَةٌ (اسم) جو چیز خرچ کی جائے۔ فرمایا:۔

﴿وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ﴾ (۲۔۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کرو۔

﴿وَ لَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً﴾ (۹۔۱۲۱) اور (اسی طرح) وہ جو خرچ کرتے ہیں۔

اَلنَّفَقُ: آر پار ہونے والا کوچہ یا سرنگ جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ فرمایا:۔

﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۶۔۳۵) اور اگر طاقت، ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالو۔

اور اسی سے نَافِقَاءُ الْیَرْبُوْعِ ہے یعنی جنگلی چوہے کا بل جس کے دو دہانے ہوں۔ نَافَقَ الْیَرْبُوْعُ وَنَفَقَ: جنگلی چوہیا اپنے بل کے دہانے سے داخل ہوکر دوسرے سے نکل گئی اور اسی سے نِفَاقٌ ہے۔ جس کے معنی شریعت میں دورخی اختیار کرنے (یعنی شریعت میں ایک دروازے سے داخل ہوکر دوسرے سے نکل جانا) کے ہیں چنانچہ اسی معنی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۴۔۱۴۰) کچھ شک

نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے۔

نَيْفَقُ السَّرَاوِيْلَ: پاجامے کا نیفہ۔

(ن ف ل)

اَلنَّفْلُ: بعض کے نزدیک نفل اور غنیمت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ان میں صرف اعتباری فرق ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ فتح کے بعد چھینا ہوا مال ہوتا ہے، اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا غیر لازم ہونے کے لحاظ سے نفل کہلاتا ہے۔

بعض کے نزدیک ان میں نسبت عموم وخصوص مطلق ہے۔ یعنی غنیمت عام ہے اور ہر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو لوٹ سے حاصل ہو خواہ مشقت سے ہو یا بلا مشقت کے، فتح سے قبل حاصل ہو یا بعد میں استحقاق سے حاصل ہو یا بغیر استحقاق کے اور نفل خاص کر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو غنیمت سے قبل از تقسیم حاصل ہوا ہو۔

بعض کے نزدیک نَفْلٌ وہ مال ہے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے اور اسے فے بھی کہتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے جو سامان وغیرہ تقسیم غنائم کے بعد بانٹا جاتا ہے۔ اسے نفل کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ﴾ الْاٰية (۸۔۱) (اے محمد ﷺ! مجاہد لوگ) آپ سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ (کہ کیا حکم ہے) اصل میں اَنْفَالٌ نَفْلٌ سے ہے جس کے معنی واجب پر زیادتی کے ہیں اور اسے نَافِلَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (۱۷۔۷۹) اور بعض حصہ شب میں بیدار ہوا کرو۔ اور تہجد کی نماز پڑھا کرو۔ (یہ شب خیزی) تمہارے لیے (سبب زیادت ثواب اور نماز تہجد تم پر نفل ہے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً﴾ (۲۱۔۷۲) اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام عطا کیے اور مستزاد و برآں یعقوب علیہ السلام۔

میں نَافِلَةً بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ محاورہ ہے۔

نَفَلْتُهٗ كَذَا: میں نے اسے بطور نفل کے دیا۔

نَفَلَهُ السُّلْطَانُ: بادشاہ نے اسے تبرع کے طور پر قتیل کا سامان دے دیا۔ اَلنَّوْفَلُ: عطائے کثیر۔ اِنْتَفَلْتُ مَنْ كَذَا: میں نے اس سے چن لیا اِنْتَقَيْتُ مِنْهُ۔

(ن ق ب)

اَلنَّقْبُ کے معنی دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنے کے ہیں اور ثَقْبٌ کے معنی لکڑی میں سوراخ کرنے کے...... محاورہ ہے۔ نَقَبَ الْبَيْطَارُ سُرَّةَ الدَّابَّةِ: بیطار نے جانور کی ناف میں مِنْقَبٌ (نشتر) کے ساتھ سوراخ کر دیا۔

مَنْقَبٌ: سوراخ کرنے کی جگہ۔

نَقْبَ الْحَائِطُ: دیوار میں نقب لگائی گئی۔

نَقَّبَ الْقَوْمُ: قوم کا چلنا پھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ (۵۰۔۳۶) وہ شہروں میں گشت کرنے لگے کیا کہیں بھاگنے کی جگہ ہے، كَلْبٌ نَقِيْبٌ: کتا جس کے گلے میں آواز کمزور کرنے کے لیے سوراخ کر دیا گیا ہو۔

اَلنُّقْبَةُ: ابتدائی خارش۔ ج۔ نُقَبٌ

اَلنَّاقِبَةُ: ناسور۔ زخم جو کئی روز تک ایک پہلو پر لیٹے رہنے

کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔
اَلنُّقْبَۃُ: ازار کی مثل ایک قسم کا کپڑا۔ جس میں سوراخ ہونے کی وجہ سے تکہ لگایا جاتا ہے۔
اَلْمُنْقَبَۃُ: اصل میں پہاڑ کی درہ کے کہتے ہیں۔ اور بطور استعارہ شریفانہ کارنامہ کو مُنْقَبَۃٌ کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ اس کا اچھا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور یا اس لیے کہ وہ بھی اسی کی رفعت کے لیے بمنزلہ منہاج کے ہے۔
اَلنَّقِیْبُ: کسی قوم کے حالات جاننے والا۔
ج نُقَبَاءُ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ (۱۵۔۱۲) اور ان میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

(ن ق ذ)

اَلْاِنْقَاذُ: کسی خطرہ یا ہلاکت سے خلاصی دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا﴾ (۳۔۱۰۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔ اَلنَّقَذُ: بمعنی چھڑایا ہوا۔ فَرَسٌ نَقِیْذٌ: دشمن کے ہاتھ سے چھینا ہوا گھوڑا گویا وہ ان سے بچایا گیا ہے ج نَقَائِذُ:

(ن ق ر)

اَلنَّقْرُ: (ن) کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتیٰ کہ اس میں سوراخ ہو جائے۔
اَلْمِنْقَارُ: کھٹکھٹانے کا آلہ جیسے پرند کی چونچ یا چکی کو کندہ کرنے کے اوزار وغیرہ۔
نَقَرْتُ عَنِ الْاَمْرِ: کسی معاملہ کی چھان بین کرنا۔
نَقَرْتُہٗ: بطور استعارہ بمعنی غیبت کرنا۔ جیسا کہ ایک عورت نے اپنے خاوند سے کہا۔ مُرَّبِیْ عَلٰی بَنِیْ نَظَرٍ وَّلَا تَمُرَّبِیْ عَلٰی بَنَاتِ نَقَرٍ۔ کہ مجھے مردوں کے پاس لے کر گزرنا جو نظر ڈالتے ہیں۔ اور عورتوں کے پاس سے لے کر نہ گزرنا جو عیب لگاتی اور غیبت کرتی ہیں۔
اَلنُّقْرَۃُ: (۱) گڑھا جس میں سیلان کا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ (۲) گردن کے پچھلے حصے کے گڑھے کو نُقْرَۃُ الْقَفَا کہا جاتا ہے۔
اَلنَّقِیْرُ: کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کو کہتے ہیں۔ اور یہ حقیر چیز کے لیے ضرب المثل ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا﴾ (۴۔۱۲۴) اور تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔
اور اَلنَّقِیْرُ اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس میں گڑھا کر کے اس میں نبیذ ڈالتے ہیں کہا جاتا ہے ھُوَ کَرِیْمُ النَّقِیْرِ: فلاں شریف الاصل ہے یعنی بعد از تفتیش۔
اَلنَّاقُوْرُ کے معنی صور یعنی بگل کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ﴾ (۷۴۔۸) جب صور پھونکا جائے گا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ: زبان کو تالو سے لگا کر آواز نکال کر کسی آدمی کو بلانا۔
نَقَرْتُ الرَّجُلَ: کسی شخص کو جماعت سے خاص کر علیحدہ بلانا گویا زبان کے ذریعہ آواز نکال کر خاص کر اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس طور سے بلانے کو نَقْرٰی کہا جاتا ہے۔ (دَعَوْتُھُمُ النَّقْرٰی: میں نے خاص طور پر انہیں بلایا۔

(ن ق ص)

اَلنَّقْصُ: (اسم) حق تلفی اور یہ نَقَصْتُہٗ: (ن)

فَهُوَ مَنْقُوصٌ کا مصدر بھی ہے جس کے معنی گھٹانے اور حق تلفی کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ﴾ (۲۔۱۵۵) اور جانوں اور مالوں...... کے نقصان سے۔ ﴿وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ﴾ (۱۱۔۱۹) اور ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا بلا کم و کاست دینے والے ہیں۔
﴿ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا﴾ (۹۔۴) اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا۔

(ن ق ض)

اَلنَّقْضُ: یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا شیرازہ بکھیرنے کے ہیں جیسے نَقَضْتُ الْبِنَاءَ: عمارت کو ڈھانا۔ اَلْحَبْلَ: رسی کے بل اتارنا۔ اَلْعَقْدَ: گرہ کھولنا۔
اَلنِّقْضُ وَالنَّقْضُ: یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں۔ لیکن بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لیے آتا ہے۔ اور بفتح النون کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے۔ اسی سے دبلے اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے نکلنے سے پھٹ جاتی ہے، نِقْضٌ کہا جاتا ہے۔ پھر نَقْضُ الْحَبْلِ وَالْعَقْدِ سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لیے بھی نقض کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ﴾ (۸۔۵۶) ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔
﴿اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۷) جو خدا کے اقرار کو...... توڑ دیتے ہیں۔
﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا﴾ (۱۶۔۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔
اور اسی طرح کلام و شعر میں مُنَاقَضَةٌ ہے جیسا کہ جریر اور فرزدق کے نقائض شعریہ مشہور ہیں۔ اَلتَّنَاقُضُ: وہ قضیے جن میں سے ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو مستلزم ہو جیسے ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی حالت میں هُوَ كَذَا وَلَيْسَ بِكَذَا کا حکم لگانا۔
اِنْتَقَضَ: (افتعال) اِنْتِقَاضًا کے معنی عمارت مسمار ہونے یا رسی کھل جانا کے ہیں۔ اور اسی سے اِنْتَقَضَتِ الْقَرْحَةُ ہے یعنی زخم کا اچھا ہونے کے بعد خراب ہو جانا۔
اِنْقَضَتِ الدَّجَاجَةُ: مرغی کا انڈا دیتے وقت کڑکڑانا۔
اَلْاِنْتِقَاضُ کے اصل معنی آواز کے نہیں ہیں۔ بلکہ کسی چیز کے اس طرح ٹوٹنے کے ہیں۔ کہ اس سے آواز پیدا ہو۔ پھر اس کا اطلاق آواز پر ہونے لگا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اَلَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ (۹۴۔۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔
میں اَنْقَضَ کے معنی کمر کو اس طرح توڑنا کے ہیں کہ اس سے کڑکڑانے کی آواز سنائی دے۔
اَلْاِنْقَاضُ: بیٹھے ہوئے جانور کو للکارنے کی آواز۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)
(۴۳۶) اَعْلَمْتُهَا الْاِنْقَاضَ بَعْدَ الْقَرْقَرَةِ
یعنی میں نے اسے انقاض کے بعد قرقرہ کی آواز سنائی۔

[1] وفی اللسان (نقض شهبره) قاله شظاظ اللص الغبی وقبله: "رب عجوز من نمير شهبرة" وفی اللسان (قرقر) علمتها بدل اعلمتها وفی الاشتقاق لبن درید (٥٤٤) اناس بدل نمير راجع للبیت ومعناه ایضا المعانی الکبیر للقیتی قال الانقاض والقرقرة صوتان من اصوات الابل ومعنی البیت انها كانت لها بعير مسن يقرقر قَرْكَبَهُ وذهب به وترك لها بكرا تنقض به وفی الاشتقاق خلاف ذالك۔

نَقِیْضُ الْمَفَاصِلِ: جوڑوں کے کڑکڑانے کی آواز۔

(ن ق م)

نَقِمْتُ الشَّیْءَ وَنَقَمْتُہٗ: کسی چیز کو برا سمجھنا۔ یہ کبھی زبان کے ساتھ عیب لگانے اور کبھی عقوبت (سزا دینے) پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ (۸۵۔۸) ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی۔ کہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

﴿وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۹۔۷۴) اور انہوں نے (مسلمانوں میں) عیب ہی کونسا دیکھا ہے سوا اس کے کہ خدا نے اپنے فضل سے ...... ان کو دولت مند کر دیا۔

﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ﴾ الْاٰیۃ (۵۔۵۹) تم ہم میں برائی ہی کیا دیکھتے ہو۔

اور اسی سے نَقْمَۃٌ بمعنی عذاب ہے قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْيَمِّ﴾ (۷۔۱۳۶) تو ہم نے ان سے بدلہ لے کر ہی چھوڑا۔ کہ ان کو دریا میں غرق کر دیا۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا﴾ (۳۰۔۴۷) سو جو لوگ نافرمانی کرتے تھے ہم نے ان سے بدلہ لے کر چھوڑا۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (۴۳۔۲۸) تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ سو دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

(ن ک ب)

نَکَبَ عَنْ کَذَا: کسی چیز سے پھر جانا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ﴾ (۲۳۔۷۴) وہ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

اَلْمَنْکِبُ: کندھا۔ ج: مَنَاکِبُ۔ اور اسی سے بطور استعارہ زمین کے راستوں پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ (۶۷۔۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور یہ زمین کے لیے بطور استعارہ ایسے ہی استعمال ہوا جیسا کہ آیت کریمہ:۔

﴿مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (۳۵۔۴۵) تو روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔ میں ظَھْرٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مَنْکِبُ الْقَوْمِ: قوم کا کندھا یعنی رئیس جیسا کہ رَأْس بمعنی رئیس اور یَدٌ بمعنی نَاصِرٌ آجاتا ہے۔ لِفُلَانٍ النِّکَابَۃُ فِیْ قَوْمِہٖ: فلاں کے پاس قوم کی ریاست ہے۔

اَلْاَنْکَبُ (۱) ٹیڑھے شانے والا (۲) اونٹ جو ایک جانب جھک کر چلے۔

اَلنَّکَبُ: ایک قسم کی بیماری جو شانے میں ہوتی ہے (ترکی میں اسے قولاغو کہا جاتا ہے)۔

اَلنَّکْبَاءُ: اپنی سمت سے پھر کر چلنے والی ہوا۔

نَکَبَتْہُ حَوَادِثُ الدَّھْرِ: مصیبت پہنچانا۔

(ن ک ث)

اَلنَّکْثُ: کے معنی کمبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں۔ اور یہ قریب قریب نَقْضٌ کے ہم معنی ہے۔ اور بطور استعارہ عہد شکنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہیں:۔

﴿وَ اِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ﴾ (۹۔۱۲) اور اگر اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔

﴿اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ﴾ (۷۔۱۳۵) تو وہ عہد توڑ ڈالتے ہیں۔

اَلنِّكْثُ وَالنَّكِيْثَةُ ...... مِثْلُ النِّقْضِ وَالنَّقِيْضَةِ) اور نَـكِيْثَةٌ ہر اس مشکل معاملہ کو کہتے ہیں جس میں لوگ عہدو پیمان توڑ ڈالیں۔شاعر نے کہا❶ (الطویل)

(۴۳۷) مَتٰى يَكُ اَمْرٌ لِلنَّكِيْثَةِ اَشْهَدِ

جب کوئی معاملہ عہد شکنی کی حد تک پہنچ جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔

(ن ک ح)

اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے۔ اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد میں بطور استعارہ ہوا ہو۔ کیوں کہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعل کی طرح صراحتاً اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ جو زبان ذکر فحش سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لیے قبیح لفظ استعمال کرے۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ (۲۴۔۳۲) اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔

﴿اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (۳۳۔۴۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے۔

﴿فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ﴾ (۴۔۲۵) تو ان لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کرلو۔

علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

(ن ک د)

اَلنَّكَدُ: ہر وہ چیز جو صعوبت سے حاصل ہو۔ اسی سے سخت خو کو جو سائل کو بمشکل کچھ دینے پر راضی ہو۔ نَكَدٌ وَنَكِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور کم دودھ والی اونٹنی کو جو بمشکل دوہی جاسکے، نَاقَةٌ نَكْدَاءُ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ الَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ (۷۔۸۵) اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے۔ ناقص ہوتا ہے۔

(ن ک ر)

اَلْاِنْكَارُ: ضد عرفان اور اَنْكَرْت كَذَا کے معنی کسی چیز کی عدم معرفت کے ہیں اس کے اصل معنی انسان کے دل پر کسی ایسی چیز کے وارد ہونے کے ہیں جسے وہ تصور میں نہ لاسکتا ہو۔ لہٰذا یہ ایک درجہ کی جہالت ہی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ﴾ (۱۱۔۷۰) جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں جاتے (یعنی وہ کھانا نہیں کھاتے) تو ان کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا۔

﴿فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ﴾

---

❶ قاله طرفة اوله و قربت بالقربى وجدك انه وفى اللسان (نكث) عقد بدل امر والبيت فى العقد الثمين ۵۸ وفى روايته عهد بدل امر۔

(۱۲۔۵۸) تو یوسفؑ کے پاس گئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔ اور وہ اس کو نہ پہچان سکے۔

اور کبھی یہ دل سے انکار کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور انکار لسانی کا اصل سبب گو انکارِ قلب ہی ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان ایسی چیز کا بھی انکار کر دیتا ہے جسے دل میں ٹھیک سمجھتا ہے۔ ایسے انکار کو کذب کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا﴾ (۱۰۱۔۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں۔ مگر واقف ہو کر ان سے انکار کرتے ہیں۔

﴿فَھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۹) اس وجہ سے ان کو نہیں مانتے۔

﴿فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُنْکِرُوْنَ﴾ (۴۰۔۸۱) تو خدا کی کن کن نشانیوں کو نہ مانو گے۔

اور اَلْمُنْکَرُ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقول سلیمہ قبیح خیال کریں یا عقل کو اس کے حسن و قبح میں توقف ہو۔ مگر شریعت نے اس کے قبیح ہونے کا حکم دیا ہو۔ چنانچہ آیات:۔

﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (۹۔۱۱۲) نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے۔

﴿کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ﴾ (۵۔۷۹) اور برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔

﴿وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (۳۔۱۱۴) اور بری باتوں سے منع کرتے۔

﴿وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ﴾ (۲۹۔۲۹) اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔

تَنْکِیْرُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کو بے پہچان کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا﴾ (۲۰۔۴) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

اور اس کے بالمقابل تعریف کے معنی کسی چیز کو معروف بنانے کے ہیں۔ اور علمائے نحو کے نزدیک کسی اسم کو مخصوص صیغہ پر بنانے کے ہوتے ہیں۔ نَکَرْتُ عَلٰی فُلَانٍ وَاَنْکَرْتُ: کسی کو عملاً کسی کام سے روک دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ﴾ (۲۲۔۴۴) میرا عذاب کیسا سخت تھا۔

اَلنُّکْرُ: مکاری یا مشکل امر جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ اور نَکُرَ نَکَارَۃٌ: کسی معاملہ کا دشوار ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ﴾ (۵۴۔۶) جس دن بلانے والا ان کو ایک ناخوش چیز کی طرف بلائے گا۔

اور حدیث میں ہے۔ [1] (۱۳۲) ((اِذَا وُضِعَ الْمَیِّتُ فِی الْقَبْرِ اَتَاہُ مَلَکَانِ مُنْکَرٌ وَّنَکِیْرٌ)) کہ جب میت قبر میں اتار دی جاتی ہے۔ تو اس کے پاس مُنْکَرْ وَنَکِیْر دو فرشتے آتے ہیں۔ اور استعارۃ مُنَاکَرَۃٌ بمعنی مُحَارَبَۃٌ استعمال ہوتا ہے۔

(ن ک س)

اَلنَّکْسُ: (ن) کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں اور اسی سے نُکِسَ الْوَلَدُ ہے...... یعنی ولادت

---

[1] رواہ النسائی (۲۳۴/۱) واصحاب السنن

کے وقت بچے کا پاؤں کا سر سے پہلے باہر نکلنا۔

﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ﴾ (۲۱۔۶۵) پھر شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا۔

اَلنَّكَسُ: صحت یابی کے بعد مرض کا عود کر آنا۔اور نُكْسٌ فِي الْعُمْرِ کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (۳۶۔۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں۔اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۱۶۔۷۰) اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔

اور ایک قراءت میں نُنْكِسْهُ ہے۔

اخفش کا قول ہے کہ نُنَكِّسْهُ (بتشدیدالکاف) کے معنی کسی چیز کو سرنگوں کر دینے کے ہوتے ہیں۔اور نِكْسٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس کا فوتہ ٹوٹ گیا ہو اور اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے لگا دیا گیا ہو۔ایسا تیر چونکہ ردی ہو جاتا ہے۔اس لیے تشبیہ کے طور پر کمینے آدمی کو بھی نِكْسٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ک ص)

اَلنُّكُوْصُ: (ن ص) کسی چیز سے پیچھے ہٹنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (۸۔۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

(ن ک ف)

نَكَفْتُ مِنْ كَذَا وَاسْتَنْكَفْتُ مِنْهُ کے معنی کسی چیز کو اپنے لیے باعث عار سمجھنے کے ہیں۔قرآن میں ہے۔

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ﴾ (۴۔۱۷۲) مسیح علیہ السلام اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا﴾ (۴۔۱۷۳) اور جنہوں نے (بندہ ہونے سے) عار و انکار اور تکبر کیا۔

اصل میں یہ نَكَفْتُ الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو دور ہٹا دینے کے ہیں اور اسی سے نَكْفٌ ہے یعنی رخسار سے ہاتھ کے ساتھ آنسو پونچھنا اور بَحْرٌ لَّا يُنْكَفُ بے پایاں سمندر کو کہتے ہیں۔

اَلْاِنْتِكَافُ: ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلا جانا۔

(ن ک ل)

نَكَلَ عَنِ الشَّيْءِ: کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔

نَكَّلْتُهُ: کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا۔اور نِكْلٌ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔کیوں کہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔اس کی جمع اَنْكَالٌ ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ لَدَيْنَاۤ اَنْكَالًا وَّ جَحِيْمًا﴾ (۷۳۔۱۲) کچھ شک نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔

نَكَّلْتُهُ: کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔اس سے اسم نَكَالٌ ہے جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ (۲۔۶۶) اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔عبرت بنا دیا۔﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۵۔۳۸) ان کے فعلوں

کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔
اور حدیث میں ہے۔❶ (۱۴۳) ((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ النَّکَلَ عَلَی النَّکَلِ)) کہ قوی آدمی جو طاقت ور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

(ن م م)

اَلنَّمُّ (ن) کے معنی چغلی کھانے کے ہیں۔اور چغلخوری کو نَمِیْمَۃٌ کہا جاتا ہے۔نَمَّامٌ: چغل خور۔ قرآن پاک میں ہے۔
هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ: طعن آمیز اشارتیں کرنے والا۔ چغلیاں لئے پھرنے والا (۶۸۔۱۱)
اصل میں نَمِیْمَۃٌ کے معنی ھَمْسٌ (پاؤں کی آہٹ) اور حرکت خفیفہ کے ہیں۔اسی سے محاورہ ہے:۔ اَسْکَتَ اللّٰہُ نَأْمَتَہٗ: خدا اس کی حرکت کو بند کردے یعنی وہ مر جائے۔
اَلنَّمَّامُ: گھاس جس کی خوشبو اس کے وجود پر دلالت کرے۔
اَلنَّمْنَمَۃُ: قریب قریب خطوط گویا کتابت میں قلت حرکت پر دال ہیں۔

(ن م ل)

نَمْلَۃٌ: چیونٹی (ج۔نمل) قرآن پاک میں ہے:۔﴿قَالَتْ نَمْلَۃٌ یّٰۤاَیُّھَا النَّمْلُ﴾ (۲۷۔۱۸) تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو!۔
طَعَامٌ مَّنْمُوْلٌ: طعام جس میں چیونٹیاں پڑ گئی ہوں۔
نَمْلَۃٌ: (۱) ایک قسم کا پھوڑا۔جو پہلو میں نکلتا ہے۔اور اس کی شکل چیونٹی جیسی ہوتی ہے۔ (۲) جانور کے کھر کا شگاف۔

اور اسی سے فَرَسٌ نَمِلُ الْقَوَائِمِ کا محاورہ ہے یعنی سبک پاؤں والا گھوڑا جو ایک جگہ پر سکون سے کھڑا نہ ہو اور مجازاً اَلنَّمْلُ بمعنی نَمِیْمَۃٌ بھی آتا ہے۔اور یہ معنی چیونٹی کی چال سے ماخوذ ہے۔ھُوَ نَمِلٌ وَذُوْنَمْلَۃٍ وَ نَمَّالٌ کے معنی چغل خور کے ہیں۔
تَنَمَّلَ الْقَوْمُ: مال جمع کرنے کے لیے چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔اسی سے ھُوَ اَجْمَعُ مِنْ نِمْلَۃٍ کا محاورہ ہے۔یعنی وہ چیونٹی سے بھی زیادہ ذخیرہ اندوز ہے۔
اَلْاَنْمِلَۃُ: انگلیوں کے اطراف۔ج۔انامل

(ن ہ ج)

اَلنَّھْجُ کے معنی کھلے راستہ کے ہیں۔اور نَھَجَ الْاَمْرُ وَاَنْھَجَ کے معنی ہیں: کسی امر کا واضح ہونا۔
اَلْمَنْھَجُ وَالْمِنْھَاجُ: کشادہ راہ۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا﴾ (۵۔۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔
اور اسی سے نَھَجَ الثَّوْبُ وَاَنْھَجَ ہے۔جس کے معنی کپڑے میں بوسیدگی کے آثار ظاہر ہونے کے ہیں۔
اَنْھَجَہُ الْبِلٰی: کپڑے کو بوسیدگی نے جھر جھرا کر دیا۔

(ن ہ ر)

اَلنَّھْرُ: بافراط پانی بہنے کے مجری کو کہتے ہیں۔ کی جمع اَنْھَارٌ آتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا﴾ (۱۸۔۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔﴿وَ اَلْقٰی فِی

❶ الحدیث فی الفائق (۲/۳۹۱)۔

الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْھٰرًا وَّ سُبُلًا﴾ (۱۶۔۱۵) اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا کر رکھ دیے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیے۔ اور جنت میں لوگوں پر جو فیض اور فضل الٰہی جاری ہوگا اسے بھی بطور مثال کے اَنْھَارٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ﴾ (۵۴۔۵۴) جو پرہیز گار ہیں وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ ﴿وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا﴾ (۷۱۔۱۲) اور تمہیں باغ عطا کرے گا۔ اور (ان میں) تمہارے لیے نہریں بہا دے گا۔

﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ (۲۔۲۵) (نعمت کے) باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

اَلنَّھْرُ کے معنی وسعت اور فراخی کے بھی آتے ہیں۔ (تَشْبِیْھًا بِنَھْرِ الْمَاءِ) اور اسی سے اَنْھَرْتُ الْمَآءَ (پانی بہانا) ہے۔

اور اَنْھَرَ الْمَآءُ کے معنی پانی کے جاری ہونے کے ہیں۔

نَھْرٌ وَ نَھِرٌ نہر جس میں پانی فراوانی سے بہہ رہا ہو۔

ابوذویب نے کہا ہے [1]

(۴۳۸) اَقَامَتْ بِهٖ فَابْتَنَتْ خَیْمَةً
عَلٰی قَصَبٍ وَّفُرَاتٍ نَھِرِ

اَلنَّھَارُ: (ن) شرعًا طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب کے وقت کو نَھَارٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن لغوی لحاظ سے اس کی حد طلوع شمس سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَةً﴾ (۲۵۔۶۲) اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

﴿اَتٰھَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَھَارًا﴾ (۱۰۔۲۴) ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم عذاب آ پہنچا۔

اور کبھی بَیَاتٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَھَارًا﴾ (۱۰۔۵۰) تو اگر اس کا عذاب تم پر ناگہاں آ جائے رات کو یا دن کو۔

رَجُلٌ نَھِرٌ: دن کو لوٹ مارنے والا۔

اَلنَّھَارُ: حباری کا بچہ۔

اَلْمَنْھَرَةُ: آبادی کے درمیان کھلی جگہ کو کہتے ہیں جیسے وہ جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔

اَلنَّھْرُ وَالْاِنْتِھَارُ: سختی سے جھڑکنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا﴾ (۱۷۔۲۳) تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا۔

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ﴾ (۹۳۔۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

(ن ھ ی)

اَلنَّھْیُ: کسی چیز سے منع کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی﴾ (۹۶۔۹،۱۰) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (یعنی) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔

معنوی لحاظ سے نہی بالقول اور بالفعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہی بالقول عام ہے کہ صیغہ اِفْعَلْ کے ذریعہ ہو جیسے اِجْتَنِبْ کَذَا (اس سے دور رہو) یا صیغہ لَا تَفْعَلْ

[1] البیت فی دیوانہ۔ ۱۲

کے ذریعہ ہو۔ لیکن لفظی لحاظ سے صرف "لَا تَفْعَلْ" کو نہیں ہے۔ پس صیغہ لَاتَفْعَلْ لفظاً و معنیً دونوں لحاظ سے نَہْیٌ ہوگا۔ جیسے فرمایا:۔

﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲۔۳۵) لیکن اس درخت کے...... پاس نہ جانا۔

اسی بنا پر شیطان نے کہا تھا۔

﴿مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ﴾ (۷۔۲۰) کہ تم کو تمہارے پروردگار نے اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (۷۹۔۴۰) اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا۔

میں نَهْیٌ سے نفس کو شہوات سے روکنا اور ان کے قصد سے دفع کرنا مراد ہے نہ کہ زبان سے صرف لَا تَفْعَلْ کہہ دینا۔ اسی طرح نَهْی عَنِ الْمُنْكَرِ بھی عام ہے۔ جو کہ ہاتھ اور زبان کے ساتھ روکنے اور دل سے برا سمجھنے کو شامل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا﴾ (۱۱۔۶۲) کیا تم ہم کو ان چیزوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جن کو ہمارے بزرگ پوجتے آئے ہیں؟ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ﴾ (۱۶۔۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے منع کرتا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے امر خیر کی ترغیب دینا اور شر سے روکنا مراد ہے۔ اور یہ ممانعت بعض امور سے عقل کے ذریعہ کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ اور بعض کاموں سے بذریعہ شریعت کے منع فرما دیا ہے جو ہمارے لیے مقرر فرمائی ہے۔

اَلْاِنْتِهَاءُ: کسی ممنوع کام سے رک جانا قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (۸۔۳۸) (اے پیغمبر) کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ (۱۹۔۴۶) اگر تو باز نہ آئے گا۔ تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔ ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ (۲۶۔۱۱۶) کہ نوح علیہ السلام اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (۵۔۹۱) تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ (۲۔۲۷۵) تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔

میں فَانْتَهٰى کے معنی اس کی نہایت کو پہنچنے یعنی رک جانے کے ہیں۔

اَلْاِنْهَاءُ: اصل میں اس کے معنی نہایۃ کو پہنچا دینے کے ہیں۔ پھر عرف میں مطلقاً کسی خبر کے پہنچا دینے پر بولا جاتا

ہے جیسے: اَنْھَیْتُ اِلٰی فُلَانٍ خَبَرَ کَذَا: میں نے اس کے پاس فلاں خبر پہنچا دی۔

نَاھِیْكَ مِنْ رَجُلٍ: فلاں آدمی تجھے کافی ہے۔ یعنی وہ تیرے مطلوب کی غایت ہے گویا کسی دوسرے کی طلب سے تجھے منع کرتا ہے۔ نَاقَۃٌ نِھْیَۃٌ: انتہائی موٹی اونٹنی۔

اَلنُّھْیَۃُ: عقل جو انسان کو قبیح باتوں سے روکتی ہو اس کی جمع نُھیً آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی﴾ (۲۰۔۵۴) بے شک ان (باتوں) میں عقل والوں کے لیے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

تَنْھِیَۃُ الْوَادِیْ: وادی کا آخری کنارہ جہاں کہ سیلان رک جاتا ہے۔

نِھَایَۃُ النَّھَارِ دن کا بلند ہونا۔

طَلَبَ الْحَاجَۃَ حَتّٰی نَھِیَ عَنْھَا: اس نے اپنی حاجت کو طلب کیا حتیٰ کہ اس کی طلب کرنے کے بعد اس سے رک گیا اور اس میں کامیاب ہونا شرط نہیں ہے۔

(ن و ب)

اَلنَّوْبُ: کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ یہ نَابَ (ن) نَوْبَۃً وَ نَوْبًا کا مصدر ہے۔ اور شہد کی مکھی کو نَوْبٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قرار گاہ کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔

نَابَتْہُ نَائِبَۃٌ: یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچی جس کے دوبارہ آنے کا بھی امکان ہے۔

اَلْاِنَابَۃُ اِلَی اللّٰہِ: توبہ اور اخلاص عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ﴾ (۳۸۔۲۴) اور جھک کر گر پڑے اور (خدا کی طرف رجوع کیا۔

﴿وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا﴾ (۶۰۔۴) اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔

﴿وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّكُمْ﴾ (۳۹۔۵۴) اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو۔

﴿مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ﴾ (۳۰۔۳۱) (مومنو!) اس (خدا) کی طرف رجوع کیے رہو۔

فُلَانٌ یَنْتَابُ فُلَانًا: وہ اس کے پاس آتا جاتا ہے۔

(ن و ح)

نُوْحٌ: یہ ایک نبی کا نام ہے دراصل یہ نَاحَ یَنُوْحُ کا مصدر ہے جس کے معنی بلند آواز کے ساتھ گریہ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ نَاحَتِ الْحَمَامَۃُ نُوْحًا: فاختہ کا نوحہ کرنا۔ نوح کے اصل معنی عورتوں کے ماتم کدہ میں جمع ہونے کے ہیں۔ اور یہ تَنَاوُحٌ سے مشتق ہے جس کے معنی تَقَابُلٌ کے ہیں۔ جیسے جَبَلَانِ مُتَنَاوِحَانِ دو متقابل پہاڑ۔ رِیْحَانِ یَتَنَاوَحَانِ دو متقابل ہوائیں۔

اَلنَّوَائِحُ: نوحہ گر عورتیں۔ اَلْمَنُوْحُ: مجلس گریہ۔

(ن و ر)

اَلنُّوْرُ: وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے۔ دنیوی اور اخروی۔ نور دنیوی پھر دو قسم پر ہے۔ معقول (۱) جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الٰہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن پاک کی روشنی۔ دوم (۲) محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند، سورج، ستارے اور دیگر اجسام نیرہ۔ چنانچہ نور الٰہی کے متعلق فرمایا ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ (۵۔۱۵) بے شک تمہارے خدا

کی طرف سے نور اور روشن کتاب آ چکی ہے۔
﴿وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (۶۔۱۲۲) اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے۔ جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل نہ سکے۔
﴿مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (۴۲۔۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔
﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (۳۹۔۲۲) بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو۔ ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۴۔۳۵) روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے۔ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔
اور نور حسی کے متعلق فرمایا:۔
﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (۱۰۔۱۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔
یہاں خاص کر سورج کو ضیاء اور قمر کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ضَوْءٌ نور سے اخص ہے۔
﴿وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا﴾ (۲۵۔۶۱) اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا۔

یعنی روشنی بنایا۔ اور بعض آیات میں نور عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
﴿وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ (۶۔۱) اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔
﴿وَیَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ﴾ (۵۷۔۲۸) اور تمہارے لیے روشنی کر دے گا۔ جس میں چلو گے ﴿وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا﴾ (۳۹۔۶۹) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اور نور اخروی کے متعلق فرمایا:۔
﴿نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ (۶۶۔۸) ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا۔ اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے پروردگار! ہمارا نور ہمارے لیے پورا کر۔ ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔
﴿فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ (۵۷۔۱۳) اور وہاں نور تلاش کرو۔ محاورہ ہے۔
(اَنَارَ اللّٰهُ كَذَا وَنَوَّرَهٗ) اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو روشن کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کو نور کہنا مُنَوِّرٌ ہونے کے لحاظ سے ہے۔
چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۴۔۳۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔
نیز اس کا اپنی ذات کو نور کہنا روشنی میں مبالغہ کی وجہ سے ہے۔

اَلنَّارُ: اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾ (۵۶۔۷۱) بھلا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲۔۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔اور نار کا اطلاق صرف حرارت اور نار جہنم پر بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

﴿اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۷۲) وہ دوزخ کی آگ جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ (۱۰۴۔۶) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں نَار کا لفظ جہنم پر بولا گیا ہے اور نار بمعنی نارِ حرب بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کی آگ جلاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نار اور نور کی اصل ایک ہی ہے اور عام طور پر یہ لازم ملزوم ہوتے ہیں۔لیکن نار کو مُقْوِیْنَ کے لیے متاع دنیوی قرار دیا ہے۔اور نور کو متاع اخروی ہے۔ اسی کے لیے نور کے متعلق اِقْتِبَاسٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (۵۷۔۱۳) کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

تَنَوَّرْتُ نَارًا میں نے آگ دیکھی۔

اَلْمَنَارَةُ: یہ یا تو نور سے مَفْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اور یا نار سے جیسے مَنَارَةُ السِّرَاجِ (چراغ پایہ) یا وہ جس پر کہ اذان دی جاتی ہے اور مَنَارُ الْاَرْضِ: راستہ معلوم کرنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔ [1]

اَلنَّوَارُ: جائے تہمت سے نفرت کرنا۔

نَارَتِ الْمَرْاَةُ (ن) نُوْرًا وَّنَوَارًا: عورت کا تہمت سے دور رہنا

نُوْرًا الشَّجَرَةِ وَنَوَّارُهٗ: درخت کی کلیاں کیونکہ وہ سفیدی میں نور کے مشابہ ہوتی ہیں۔نُوْرٌ گودنے کا پوڈر۔ اور اسی سے محاورہ ہے: نَوَّرَتِ الْمَرْءَةُ يَدَهَا: عورت کا ہاتھ پر گودنا اور گودنے سے چونکہ عضو کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اس لیے اسے تَنْوِیْرٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

(ن و س)

اَلنَّاسُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل اُنَاسٌ ہے۔ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔اور بعض کے نزدیک نَسِیَ سے مقلوب ہے اور اس کی اصل اِنْسِیَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں نَاسَ يَنُوْسُ سے ہے جس کے معنی مضطرب ہونے کے ہیں۔اور نُسْتُ الْاِبِلَ کے معنی اونٹ ہنکانے کے ہیں۔بعض کا قول ہے کہ ذونواس بادشاہ کی وجہ تلقیب بھی یہی تھی کہ اس کے دراز گیسو اس کی پشت پر لہرایا کرتے تھے۔اس صورت میں اس کی تصغیر نُوَیْسٌ ہوگی۔قرآن پاک میں ہے:۔

[1] وفی الحدیث لعن اللہ من غیر منارِ الارض (الفائق ۲/۲۹۳)۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (۱۰۴-۱) کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

کبھی مجازاً اَلنَّاسُ کا عام معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف فضلاء لوگ مراد ہوتے ہیں اس وقت اس میں اِنْسَانِیَۃٌ کا معنی ملحوظ ہوتا ہے۔یعنی جس میں کہ فضیلت، ذکر، اخلاق حمیدہ اور خصوصیات انسانی علی وجہ الاتم پائی جاتی ہیں کیونکہ جو چیز اپنے خواص سے عاری ہو وہ اس نام کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔مثلاً ہاتھ میں اگر اس کے خصوصی وظیفہ کو ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس پر اور سریر کے پایہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔پس آیت کریمہ:۔

﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (۲-۱۳) جس طرح اور لوگ ایمان لائے تم بھی لے آؤ۔

میں اَلنَّاسُ سے کوئی خاص انسان مراد نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔اسی طرح آیت:۔

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴-۵۴) یا جو خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس پر حسد کرتے ہیں۔

میں بھی اَلنَّاسُ سے خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور کبھی اس سے نوع انسانی مراد لی جاتی ہے اور بعض نے آیت مذکورہ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(ن و ش)

اَلنَّوْشُ: کے معنی کسی چیز کو پکڑنا کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۳۹) تَنُوْشُ الْبَرِيْرَ حَيْثُ طَابَ اِهْتِصَارُهَا۔

وہ وہاں سے پیلو کھاتی ہے جہاں سے خوب جھکی ہوئی ہوں۔

بَرِيْرٌ کے معنی پیلو کے ہیں اور اِهْتِصَارٌ کے معنی مائل کرنے اور جھکانے کے۔چنانچہ محاورہ ہے۔

هَصَرْتُ الْغُصْنَ: میں نے ٹہنی کو جھکایا۔

تَنَاوَشَ الْقَوْمُ: کسی چیز کو پکڑنا قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ﴾ (۳۴-۵۲) (اب)......ان کا ہاتھ ایمان کے لینے کو کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ یعنی وہ دور جگہ سے ایمان کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔جب کہ انہوں نے قریب جگہ سے اسے حاصل نہیں کیا جس وقت کہ ایمان لانا اور اسی سے انتفاع حاصل کرنا ان کے اختیار میں تھا۔تو یہ آیت کریمہ:۔﴿يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا﴾ الاية (۶-۱۵۹) مگر جس روز تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آ جائیں گی تو ......اس وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔پھر ایک قراءت میں اَلتَّنَاؤُشُ ہمزہ کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یا تو یہ نَأْشٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی طلب کے ہیں اور یا اس کا ہمزہ واؤ سے مبدل ہوگا جیسے أُقِّتَتْ وَاَدْؤُرٌ میں ہے جو کہ اصل میں وُقِّتَتْ وَاَدْوُرٌ ہے۔

(ن و ص)

نَاصَ اِلٰى كَذَا کے معنی کسی کے پاس پناہ

---

[1] قاله ابوذؤيب الهذلي وصدره: فما ام خشف بالعلايه شادن۔ والبيت في اللسان (نوش، علا) وديوان الهذليين (۱: ۲۲) ومعجم البلدان (رسم: علايه) والمعاني الكبير (۷۲۱) والمحكم (علو) وفي روايتهما نال بدل طاب واهتصارها اى جذبها۔

لینے کے ہیں۔ اور نَـاصَ عَنْهُ يَنُوْصُ نَوْصًا کے معنی کسی کام سے پیچھے ہٹ جانا اور اس سے پھر جانا کے ہیں۔ اور مَنَاصٌ جائے پناہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَّ لَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ﴾ (۳۸۔۳) اور وہاں کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا۔

(ن و ل)

اَلـنَّوْلُ کے معنی تناول کے ہیں اور یہ نِـلْتُ كَذَا اَنُوْلُ نَوْلًا سے آتا ہے۔ اور اَنَلْتُهُ (افعال) کے معنی کسی چیز کے عطا کرنے کے ہیں۔ اور یہ عَـطَـوْتُ كَذَا بمعنی تَـنَاوَلْتُ اور اَعْـطَيْتُهُ بمعنی اَنَـلْتُهُ کی طرح ہے۔ پھر نِـلْتُ اصل میں نَـوِلْتُ ہے اور محاورہ ہے:۔ وَمَـا كَانَ نَوْلُكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا: یعنی ایسا کرنے میں تمہاری بہتری نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الوافر)

(۴۴۰) جَزِعْتَ وَلَيْسَ ذٰلِكَ بِالنَّوال

تم گھبرا گئے ہو اور یہ درست نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نوال بمعنی صواب ہے اصل میں نوال اس عطا کو کہتے ہیں جو انسان حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہیں کہ اس سے تیری مراد حاصل نہیں ہوسکتی۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَـنْ يَّـنَـالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّـنَـالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (۲۲۔۳۷) خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے۔

(ن و م)

اَلـنَّـوْمُ: اس کی تفسیر کی گئی ہے اور مختلف اعتبارات سے تمام وجوہ صحیح ہوسکتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بخارات کی رطوبت سے اعصاب دماغ کے ڈھیلا ہونے کا نام نوم ہے۔ اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا بغیر موت کے روح کو قبض کر لینے کا نام نوم ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اَللّٰـهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ (۳۹۔۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)۔

اور بعض نوم کو موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل کہتے ہیں رَجُلٌ نَوُوْمٌ وَنُوَمَةٌ: بہت زیادہ سونے والا۔ اور مَنَامٌ بمعنی نوم آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ﴾ (۳۰۔۲۳) اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات میں ......سونا۔

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ (۷۸۔۹) اور نیند کو تمہارے لیے موجب آرام بنایا۔

﴿لَا تَـاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾ (۲۔۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

نیز اَلنَّوْمَةُ کے معنی خامل الذکر یعنی گم نام بھی آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَـنَامَ فُلَانٌ اِلٰى كَذَا: کسی چیز سے اطمینان حاصل کرنا۔ مَـنَامَةٌ: لباس خواب۔ نَـامَـتِ السُّوْقُ: کساد بازاری ہونا۔

نَامَ الثَّوْبُ: (لازم ومتعدی) کپڑے کا پرانا ہونا یا کرنا۔

---

[1] قاله لبيد واوله: وقفت بهن حتىٰ قال صحبي والبيت في اللسان (نول) ١٢

ان دونوں معنی میں نَـــامَ کا لفظ تشبیہ کے طور پر مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

(ن و ن)

اَلـنُّـوْنُ: حرف ہجا میں سے ایک حرف کا نام ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿نٓ وَالْـقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (٦٨۔١) ن،قلم اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

اور نون بڑی مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ﴾ (٢١۔٨٧) اور ذاالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر، چل دیئے۔

میں یونس علیہ السلام کو ذَا الـنُّـوْن کہا ہے۔کیونکہ انہیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔اور حارث بن ظالم کی تلوار کا نام بھی ذَالنُّوْن تھا۔

(ن و ی)

نَـاءَ بِـجَانِبِهٖ يَنُوْءُ وَيَنَاءُ کے معنی پہلو پھیر لینے کے ہیں۔

ابوعبیدہ کے نزدیک نَاءَ مثل نَاعَ کے ہیں جس کے معنی اٹھنے کے ہیں اور اَنَاءَ تُهٗ کے معنی اٹھانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَآ اِنَّ مَـفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ﴾ (٢٨۔٧٦) کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔اور آیت کریمہ۔﴿نَـا بِـجَانِبِهٖ﴾ (١٧۔٨٣) اور پہلو پھیر لیتا ہے۔میں ایک قراءت نَــاءَ بروزن نَاعَ ہے جس کے معنی پہلو اٹھانا کے ہیں اور یہ تکبر سے کنایا ہوتا ہے جیسا کہ شَمَخَ بِاَنْفِهٖ وَازْ وَرَّجَانِبُهٗ کا محاورہ ہے۔

ابوعمر کا قول ہے ❶ کہ نَایٰ بروزن نَـعٰی کے ہے جس کے معنی اعراض کرنے کے ہیں اور ابوعبیدہ کے نزدیک نَــاٰی یـنــاٰی کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسی سے اِنْتَاٰی بروزن اِفْتَعَلَ ہے اور مُنْتَاٰی کے معنی مکان بعید کے ہیں۔اور اسی سے نُؤْیٌ ہے جس کے معنی خیمے کے گردا گرد گڑھے کے ہیں جو بارش کے پانی کو اس سے دور رکھتا ہے۔اور نَاٰی بِجَانِبِهٖ کے معنی پہلو تہی کرنے کے ہیں۔

اَلنِّيَّةُ: یہ نَوَيْتُ کا مصدر ہے اور کبھی بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی کسی کام کی جانب دل سے متوجہ ہونے کے ہیں۔یہ نَاٰی کے باب سے قطعاً نہیں ہے۔

(ن ی ل)

اَلـنَّيْلُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔اور یہ نِـلْتُـهٗ اَنَـالُهٗ نَيْلًا کا مصدر ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ (٣۔٩٢) تم کبھی نیکی حاصل نہیں کر سکو گے۔

﴿وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْـلًا﴾ (٩۔١٢٠) یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے۔

﴿لَـمْ يَنَالُوْا خَيْرًا﴾ (٣٣۔٢٥) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے۔

❀❀❀

❶ هو ابو عمرو بن العلاء بن عمار التيميمي المازني عالم البصرة المشهور ١٥٤ تراجمه في مراتب النحويين ١٣۔٢٠ واخبار النحويين (٢٢۔٢٥) وطبقات النحويين للزبيدى (٢٨۔٣٤) والمزهر (٣٩٨۔٣٩٩) والبغيه (٣٦٧) وطبقات القراء (١: ١٨٨۔٢٩٢)

کتَابُ الوَاو

(و ب ر)

اَلْـوَبْـرُ کے معنی ببری اور اون کے ہیں اس کی جمع اَوْبَارٌ ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ مِـنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا﴾ (۱۶۔۸۰) اوران کی اون اور پشم ہے۔

اور جو لوگ پشم کے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں سُکَّانُ الْوَبْرِ (بادیہ نشین) کہا جاتا ہے۔

بَنَاتُ اَوْبَرَ: ردی قسم کے کُکرمتے جن پر ببری کی طرح کا مادہ ہوتا ہے۔چھوٹی اور ردّی قسم کی سانپ کی چھتری۔

وَبَـرَّتِ الْاَرْنَـبُ: خرگوش کا اپنے پاؤں کے پچھلے حصہ کے لٹکے ہوئے بالوں سے اپنے قدموں کے نشانات کو مٹانا۔وَبَرَا الرَّجُلُ فِیْ مَنْزِلِهٖ: اپنے مکان سے باہر نہ نکلنا۔یہ وَبْـرٌ یعنی پشم کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے گھر کے اندر پشم کی طرح پڑا ہوا ہے، جیسا کہ تَـلَبَّـدَ بِـمَكَانِ كَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اپنے مکان کا لبدہ بنا ہوا ہے۔

وَبَارِ بعض نے کہا ہے کہ قوم عاد کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

(و ب ق)

وَبَـقَ (ض) وَبَقًا و مَوْبِقًا...... کے معنی ضعیف اور گراں بار ہو کر ہلاک ہو جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُـمْ مَّوْبِقًا﴾ (۱۸۔۵۲) اور ہم ان کے بیچ میں ہلاکت کی جگہ بنا دیں گے۔

اَوْبَقَهٗ: كَذَا ہلاک کرنا۔

﴿اَوْ يُـوْبِـقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا﴾ (۴۲۔۳۴) یا ان کے اعمال کے سبب ان کو تباہ کر دے۔

(و ب ل)

اَلْـوَبْـلُ وَالْـوَابِلُ کے معنی بڑی اور بھاری بوندوں والی بارش کے ہیں۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَـاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲۔۲۶۵) مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقعہ ہو (جب) اس پر بارش ہو۔

پھر معنی ثقل کے لحاظ سے ہر اس چیز کو وَبَالٌ کہا جاتا ہے۔جس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ذَاقُـوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ (۵۹۔۱۵) اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

وَبِيْـلٌ: وہ طعام یا گھاس جس کے کھانے سے بدہضمی اور ضرر کا اندیشہ ہو۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَخَذْنَاهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا﴾ (۷۳۔۱۶) تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔

(و ت د)

اَلْوَتْدُ وَالْوَتِدُ (ج اَوْتَادًا) کے معنی میخ کے ہیں۔وَتَـدْتُـهٗ اَتِدُهٗ وَتْدًا کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر اسے مضبوط کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا﴾ (۷۸۔۷) اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں نہیں ٹھہرایا۔ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں ٹھہرانے کی کیفیت اس کے بعد بیان ہوگی۔ ❶ اور کبھی وَتَدٌ کی تاء کو ساکن اور پھر دال میں ادغام کرکے وَدٌّ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

اَلْــوَتِـدَان: دونوں کانوں کے سامنے کے حصے جو میخ کی طرح ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

(و ت ر)

اَلْوَتْرُ: (طاق) یہ اعداد شفع کی ضد ہے جس کی بحث آیت ﴿وَالشَّـفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۸۹۔۳) اور جفت اور طاق کی (قسم) کے تحت گزر چکی ہے۔ ❷ اَوْتَــرَ ۔ وتر نماز پڑھنا۔ اَلْوَتْرُ وَالْوِتْرُ وَالتِّرَةُ کے معنی کینہ کے ہیں اور اسی سے وَتَـرْتُهٗ (ض) ہے جس کے معنی کسی کو تکلیف پہنچانے یا اس کا حق کم کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَـنْ يَّتِـرَكُـمْ اَعْـمَالَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۵) وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (اور گم) نہیں کرے گا۔

اَلتَّــوَاتُــرُ: کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا۔ محاورہ ہے جَـاءُوْ تَتْـرٰی (وہ یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ کے بعد آئے) قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرٰی﴾ (۲۳۔۴۴) پھر ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

لَا وَتِيـرَةَ فِـىْ كَذَا وَلَا غَمِيزَةَ وَلَا غَيْرُ: اس میں عقلی کمزوری یا کوئی دوسرا عیب نہیں ہے اور تَـوَاتَـرٌ سے وَتِيْرَة ہے جس کے معنی سَجِيَّةٌ (طبعی عادت کے) بھی آتے ہیں۔ نیز وَتِيْرَةٌ کا لفظ حسب ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ حلقہ جس پر بچے تیراندازی کی مشق کرتے ہیں۔

(۲) نرم زمین

(۳) ناک کے نتھنوں کا درمیانی پردہ۔

(و ت ن)

اَلْــوَتِيْـنُ: (رگ جان) اس رگ کو کہتے ہیں جو جگر کو خون پہنچاتی ہے۔ اور اس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿ثُـمَّ لَـقَـطَـعْـنَـا مِنْهُ الْوَتِيْنَ﴾ (۶۹۔۴۶) پھر اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔

اَلْـمُـوَاتَنَةُ: (مفاعلہ) کے معنی شاہ رگ کی طرح قریب ہونے کے ہیں گویا آیت:

﴿وَنَـحْـنُ اَقْـرَبُ اِلَيْــهِ مِـنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس کے زیادہ قریب ہیں۔ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اِسْتَــوْتَـنَ الْاِبِـلُ: موٹاپے کی وجہ سے اونٹ کی رگ گردن کا غلیظ اور موٹا ہو جانا۔

(و ث ق)

وَثِـقْـتُ بِـهٖ اَثِقُ ثِقَةً: کسی پر اعتماد کرنا اور مطمئن ہونا۔

اَوْثَـقَــهٗ...... (افعال) زنجیر میں جکڑنا، رسی سے کس کر

---

❶ وفی القرآن: وفرعون ذی الاوتاد (۳۸۔۱۲) قال البیضاوی معناہ ذوالجموع الکثیرۃ وفی الکتاب ذوالملک الثابت (کذا فی الروح ۲۳۔۱۵۵)

❷ ملاحظہ ہو عنوان (ش ف ع)

باندھنا۔

اَلْوَثَاقُ وَالْوِثَاقُ اس زنجیر یا رسی کو کہتے ہیں۔ جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ﴾ (۸۹۔۲۶) اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

﴿حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (۴۷۔۴) یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) قید کرلو۔

اَلْمِیْثَاقُ کے معنی پختہ عہد و پیان کے ہیں۔ جو قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ﴾ (۳۳۔۷) اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا۔

﴿وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا﴾ (۳۳۔۷) اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

اَلْمَوْثِقُ: (اسم) پختہ عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿حَتّٰی تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ......مَوْثِقَهُمْ﴾ (۱۲۔۶۶) کہ جب تک تم خدا کا عہد نہ دو۔

اَلْوُثْقٰی: یہ اَوْثَقُ (افعل) کی مؤنث ہے اور قریب قریب مَوْثِقٌ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی﴾ (۲۔۲۵۶) اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی۔

ثِقَةٌ: قابل بھروسہ آدمی، مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ ثِقَةٌ وَقَوْمٌ ثِقَةٌ۔ اور بطور استعارہ مَوْثُوْقٌ (معتمد) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

نَاقَةٌ مُوَثَّقَةُ الْخَلْقِ: مضبوط بناوٹ کی اونٹنی۔

(و ث ن)

اَلْوَثَنُ: (بت) اس کی جمع اَوْثَانٌ ہے اور اَوْثَانٌ ان پتھروں کو کہا گیا ہے جن کی جاہلیت میں پرستش کی جاتی تھی۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا﴾ (۲۹۔۲۵) کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو۔ [1]

اَوْثَنْتُ فُلَانًا: کسی کو بڑا عطیہ دینا۔

اَوْثَنْتُ مِنْ كَذَا: کسی کام کو کثرت سے کرنا۔

(و ج ب)

اَلْوُجُوْبُ: (ض) کے معنی ثبوت کے ہیں اور واجب کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ممکن کے بالمقابل۔ یعنی وہ چیز جو ضروری الثبوت ہو اور اس کا ارتفاع فرض کرنے سے محال لازم آئے جیسے کہا جاتا ہے۔

وُجُوْدُ الْوَاحِدِ مَعَ وُجُوْدِ الْاِثْنَیْنِ وَاجِبٌ: دو کے ساتھ ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) وہ کام جس کے نہ کرنے سے انسان قابل ملامت سمجھا جائے یہ دو قسم پر ہے۔ (الف) واجب مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ، جیسے اللہ کی وحدانیت اور نبوت کہ ان کی معرفت عقلاً واجب ہے۔ (ب) واجب مِنْ جِهَةِ الشَّرْعِ، یعنی وہ فعل جس کا وجوب شریعت سے ثابت ہو جیسے: وُجُوْبُ الْعِبَادَاتِ الْمُوَظَّفَةِ یعنی فرضی عبادات کا وجوب

وَجَبَتِ الشَّمْسُ کے معنی سورج کے گرنے یعنی غروب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ معنی سقوط کے لحاظ سے فرمایا۔

---

[1] انظر (۲۹۔۷)

﴿فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا﴾ (۲۳۔۳۶) تو جب وہ اپنے پہلوں پر گر پڑیں۔

وَجَبَ الْقَلْبُ وُجُوْبًا: دل کا دھڑکنا، اس میں بھی معنی سقوط معتبر ہے اور اَوْجَبَ (افعال) بھی ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کبائر گناہ کو مُوْجِبَاتْ کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ارتکاب سے دوزخ کا عذاب واجب ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ واجب کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک وہ چیز جس کا عدم ناممکن ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ دوسرے واجب اسے کہتے ہیں جس میں موجود ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو اور فقہا کا یہ کہنا کہ واجب وہ ہے جس کے نہ کرنے سے انسان عقوبت کا مستحق ہو تو یہ تَعْرِيْفُ الشَّيْءِ بِالْعَوَارِضِ کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ استحقاق عقوبت اس کا وصف لازم نہیں ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے۔ جس طرح کہ انسان کی تعریف میں کہا جائے: مُسْتَقِيْمُ الْقَامَةِ وَالْمَاشِيْ عَلَى الرِّجْلَيْنِ۔

(و ج د)

اَلْوُجُوْدُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پالینا کے ہیں اور یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) حواس خمسہ میں سے کسی ایک حاسہ کے ساتھ ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُ زَيْدًا (حاسہ بصر) وَجَدْتُ طَعْمَهٗ۔ (حاسہ ذوق) وَجَدْتُ سَمْعَهٗ۔ (حاسہ سمع) وَجَدْتُ خَشُوْنَتَهٗ (حاسہ لمس)

(۲) قوی باطنہ کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُ الشِّبَعَ (میں نے سیری کو پایا) کہ اس کا تعلق قوت شہویہ کے ساتھ ہے۔

وَجَدْتُ الْحُزْنَ اَوِ السَّخَطَ (میں نے غصہ یا غم کو پایا) اس کا تعلق قوت غضبیہ کے ساتھ ہے اور بذریعہ عقل کے کسی چیز کو پالینا جیسے اللہ تعالیٰ یا نبوت کی معرفت کہ اسے بھی وِجْدَان کہا جاتا ہے۔ جب وجود (پالینا) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کے معنی محض کسی چیز کا علم حاصل کر لینا کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ جوارح اور آلات کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنے سے منزہ اور پاک ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ﴾ (۷۔۱۰۱) اور ہم نے ان میں سے اکثروں میں عہد (کا نباہ) نہیں دیکھا اور ان میں اکثروں کو (دیکھا تو) .... بد عہد دیکھا اس کے بالمقابل معدوم کے بھی کئی معنی آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو پالینا کسی ایسے طریق سے ہوتا ہے جو تمام مذکورہ وجوہ سے بالا ہو۔ اور کبھی کسی چیز پر تمکن (قدرت) حاصل کر لینے کو بھی وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (۹۔۵) تم مشرکوں پر جہاں قدرت پاؤ قتل کر دو اور آیت کریمہ:۔

﴿فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ﴾ (۲۸۔۱۵) تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں۔ میں بھی وجد بمعنی تمکن ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَجَدتُّ امْرَاَةً ....يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ﴾ (۲۷۔۲۳۔۲۴) میں نے ایک عورت دیکھی ...... (وہ اور اس کی قوم) آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، میں وجود بلحاظ بصر

اور بصیرت مراد ہے کیونکہ ہد ہد نے آنکھوں سے ان کو دیکھا بھی تھا اور پھر بصیرت سے ان کی حالت کا اندازہ بھی لگایا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا الآیۃ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا (کیونکہ تمام قوم کو تو اس نے سورج کی پرستش کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ کچھ اعتبار اور قیاس سے بھی کام لیا تھا) اور آیت:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ (۴۔۴۳) اور تمہیں پانی نہ ملے میں لَمْ تَجِدُوْا بمعنی لَمْ تَقْدِرُوْا ہے یعنی اگر تمہیں پانی پر قدرت نہ ہو۔ اور آیت:۔

﴿مِنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (۶۵۔۶) مقدور کے مطابق۔

میں وُجْدِ سے مقدور یا مالی حالت مراد ہے۔ اور غنی (تونگری) کو وُجْدٌ اور جِدَةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور وُجْد میں وَجدٌ اور وِجْد (بفتحہ واؤ و کسرہ آں) بھی حکایت کیا گیا ہے۔ اور وَجْدٌ کے معنی غم اور محبت کے بھی آتے ہیں۔ اور مَوْجِدَةٌ غصہ کو کہتے ہیں۔ اور وجود کے معنی گمشدہ چیز کو پالینا بھی آتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ موجودات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو ازلی اور ابدی ہو۔ یعنی اس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو اور یہ صرف ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ دوم وہ ہے جو مبداء اور منتہیٰ رکھتی ہو جیسے اس دنیا میں انسان اور عالم دنیا کے دیگر جواہر۔ تیسری قسم موجودات کی وہ ہے جن کا مبدا تو ہے لیکن منتہیٰ نہیں ہے۔ جیسے عالم آخرت کا انسان۔

(و ج س)

اَلْوَجْسُ کے معنی صورت خفی کے ہیں اور تَوَجُّسٌ (تفعل) خفی آواز سننے کی کوشش کرنے کو کہتے ہیں۔ اور اِیْجَاسٌ کے معنی دل میں کوئی بات محسوس کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی﴾ (۲۰۔۶۰) (اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔ لہٰذا وَجْسٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی (خطرہ) کے بعد دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو چیز مبداء بنتی ہے اسے هَاجِسٌ اور اس کے بعد کی حالت کو وَاجِسٌ کہا جاتا ہے۔

(و ج ف)

اَلْوَجِیْفُ کے معنی تیز رفتاری کے ہیں اور اَوْجَفْتُ الْبَعِیْرَ کے معنی ہیں: میں نے اونٹ کو تیز دوڑایا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ (۵۹۔۶) کیونکہ اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔ مثل مشہور ہے۔

اَدَلَّ فَاَمَلَّ وَاَوْجَفَ فَاَعْجَفَ: یعنی گھوڑے کو تیز دوڑا کر دبلا کر دیا۔ وَجَفَ الشَّیْءُ: کسی چیز کا مضطرب ہونا۔ قَلْبٌ وَاجِفٌ: مضطرب دل جیسے فرمایا:۔

﴿قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴾ (۷۹۔۸) اس دن (لوگوں کے) دل خائف ہو رہے ہوں گے۔

یعنی مضطرب اور پریشان ہوں گے جیسا کہ قلوب کے اضطراب کے لیے طَائِرَةٌ یا خَافِقَةٌ وغیرہ الفاظ بطور استعارہ ہوتے ہیں۔

(و ج ل)

اَلْوَجَلُ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس کرنے کے ہیں اور یہ باب وَجِلَ یَوْجَلُ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ﴾ (۸۔۲) مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

﴿اِنَّا مِنْکُمْ وَجِلُوْنَ﴾ (۱۵۔۵۲) (انہوں نے کہا) ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہ وَجِلٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: ڈرنے والا۔

﴿وَقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ﴾ (۲۳۔۶۰) اور ان کے دل...... ڈرتے رہتے ہیں۔

(و ج ہ)

اَلْوَجْہُ کے اصل معنی چہرہ کے ہیں۔ ج وُجُوْہٌ۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ﴾ (۵۔۶) تو اپنے منہ اور ہاتھ دھولیا کرو۔

﴿وَّتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے چہروں پر آگ لپٹ رہی ہوگی۔

اور چونکہ کہ استقبال کے وقت سب سے پہلے انسان کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے اسے وجہ کہہ لیتے ہیں۔ نیز ہر چیز کے اشرف حصہ اور مبدا پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے وَجْہُ کَذَا اس کا اول حصہ۔

وَجْہُ النَّھَارِ: دن کا اول حصہ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ﴾ (۵۵۔۲۷) اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحب جلال وعظمت ہے۔...... باقی رہ جائے گی۔

میں بعض نے وجہ سے ذات باری تعالیٰ مراد لی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَجْہُ رَبِّکَ سے اعمال صالحہ مراد ہیں۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہوتی ہے۔ نیز فرمایا:۔

﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ﴾ (۲۔۱۱۵) تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔

﴿کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ﴾ (۲۸۔۸۸) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ﴾ (۳۰۔۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ﴾ (۷۶۔۹) اور کہتے ہیں کہ ہم تو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔

ان تمام آیات میں بعض نے کہا ہے کہ وجہ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے لہٰذا آیت کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ کے معنی یہ ہیں کہ باستثناء ذات باری تعالیٰ ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ مروی ہے کہ ابی عبداللہ بن الرضا نے کہا ہے کہ سبحان اللہ لوگ بہت بڑا کلمہ کہتے ہیں۔

آیت ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ میں توجہ کے معنی جہت قصد کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بقا صرف انہیں اعمال کو حاصل ہوگی۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کا قصد کیا جائے اور دیگر آیات بھی اسی معنی پر محمول ہیں۔ اور یہی معنی آیت ﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ﴾ (۳۰۔۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔ اور

﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ﴾ (۱۸۔۳۸) اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:۔

﴿وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (۷۔۲۹) اور ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلے کی طرف)

رخ کیا کرو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ وجوہ سے مراد چہرے ہیں۔اور یہ فَعَلْتُ كَذَا بِيَدِیْ کی طرح بطور استعارہ کے استعمال ہوتا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ وجہ کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں اور اقامت کے معنی استقامت کا قصد کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نماز میں خالص رضا الٰہی کا قصد کرو۔(یعنی ریا کاری وغیرہ سے کام نہ لو) چنانچہ آیات
﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ﴾ (۳۔۲۰) (اے پیغمبر) اگر لوگ تم سے جھگڑنے لگیں تو کہدو کہ میں اور میرے پیروکار تو اللہ کے فرمانبردار ہو چکے ہیں۔
﴿وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (۳۱۔۲۲)اور جو اپنے تئیں خدا کا فرنبردار کر دے اور نیکوکار بھی ہو تو اس نے مضبوط دستاویز ہاتھ میں لے لی۔﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ﴾ (۴۔۱۲۵)اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے۔جس نے حکم خدا کو قبول کیا۔
﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا﴾ (۳۰۔۳۰)تو تم ایک طرف ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کیے چلے جاؤ۔
میں وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اس کی جانب متوجہ ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے۔اور استعارہ کے طور پر مذہب یا طریقہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔اسی طرح فرمایا:۔
﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ (۹۲۔۱۹،۲۰)اور (اس لیے) نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔اور آیت:۔
﴿اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ﴾ (۳۔۷۲) کہ جو کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو۔میں وجہ النہار کے معنی دن کے شروع حصہ کے ہیں۔وَاَجْهَتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے آمنے سامنے ہونے کے ہیں۔اور وَجْهٌ کے معنی قصد بھی آتے ہیں اور جِهَةٌ اور وَجْهَةٌ کے معنی مقصد کے ہیں یعنی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے کی جگہ۔قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا﴾ (۲۔۱۴۸)اور ہر ایک فرقے کے لیے ایک سمت مقرر ہے۔تو وِجْهَةٌ سے شریعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔
﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (۵۔۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔
اَلْجَاهُ : مرتبہ۔بعض نے کہا ہے کہ یہ وجہ سے مقلوب ہے لیکن وجہ کا لفظ عزت مرتبہ اور چہرہ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور جَاهٌ کے معنی صرف مرتبہ کے آتے ہیں۔
وَجَّهْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو ایک جانب بھیجنے کے ہیں اور تَوَجَّهَ کے معنی از خود جانے کے۔
فُلَانٌ وَجْهُ الْقَوْمِ کے معنی رئیس قوم کے ہیں۔جیسا کہ قوم کے رئیس اور سردار کو رَأْسُهُمْ وَعَیْنُهُمْ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔فُلَانٌ وَجِیْهٌ

اَوْ ذُوْجَاہٍ: فلاں صاحب وجاہت ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (۳۔۴۴) اور جو دنیا اور آخرت میں باآبرو ہوگا۔
ایک محاورہ ہے۔
اَحْمَقُ مَا يَتَوَجَّهُ بِهٖ: یعنی وہ انتہائی درجہ کا احمق ہے اور کبھی بِـهٖ کو حذف کر کے بھی بولتے ہیں۔اور مطلب یہ ہے کہ حماقت کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔
اَلتَّوْجِيْهُ: علم عروض میں اس حرف کو کہتے ہیں۔جو الف تاسیس اور حرف روی کے درمیان ہو۔

(و ح د)

اَلْوَحْدَةُ کے معنی یگانگت کے ہیں اور واحدۃ درحقیقت وہ چیز ہے جس کا قطعاً کوئی جزء نہ ہو پھر اس کا اطلاق ہر موجود پر ہوتا ہے۔حتیٰ کہ ہر اسم عدد اس کے ساتھ متصف ہوسکتا ہے۔جیسے عَشْرَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک عشرہ) مَائَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک سو) اَلْفٌ وَاحِدٌ (ایک ہزار) پس وَاحِدٌ کا لفظ مشترک ہے جو چھ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
(۱) واحد بلحاظ جنس یا نوع کے، جیسے کہا جاتا ہے کہ انسان اور فرس دونوں ایک ہی ہیں یعنی بلحاظ جنس ایک ہی ہیں۔یا زید اور عمرو ایک ہیں یعنی بلحاظ نوع کے ایک ہیں۔
(۲) واحد بالاتصال۔یعنی کئی اجزاء مل کر ایک ہو جائیں عام اس سے کہ وہ اتصال۔خلقی ہو جیسے شخص واحد یا صناعی ہو جیسے: حِرْفَةٌ وَاحِدَةٌ۔
(۳) یکتا اور بے نظیر خواہ وہ یکتائی بلحاظ خلقت کے ہو جیسے اَلشَّمْسُ وَاحِدَةٌ یا بلحاظ دعوے فضیلت کے ہو جیسے فُلَانٌ وَاحِدُ عَصْرِہٖ: فلاں یکتائے روزگار ہے۔یا هُوَ نَسِيْجُ وَحْدِهٖ: (وہ اپنی طرز کا) ایک ہے یعنی صاحب الرائے ہونے میں اس کا کوئی شبہ نہیں۔[1]
(۴) وہ جس میں تجزی ممتنع ہو خواہ وہ امتناع صغر جم کی وجہ سے ہو، جیسے ذرہ یا صلابت کی وجہ سے، جیسے الماس یعنی ہیرا۔
(۵) بمعنی مبدا آتا ہے۔خواہ وہ مبدائے اعداد ہو جیسے وَاحِدٌ اِثْنَانِ یا مبدءِ خط جیسے نقطہ۔
الحاصل: ان سب اقسام کو وحدۃ کے معنی عارض ہوتے ہیں لیکن۔(۶) جب واحد کا لفظ باری تعالیٰ پر بولا جاتا ہے۔جیسے اَللّٰهُ وَاحِدٌ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس میں تجزی یا تکثر ناممکن ہو اور اس قسم کی وحدت چونکہ بمشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔اس لیے فرمایا:۔
﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ (۳۹۔۴۸) اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔
اَلْوَحْدُ کے معنی اکیلا کے ہیں اور غیر اللہ کی صفت بھی واقع ہوتا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [2] (البسیط)
(۴۴۱) عَلٰى مُسْتَأْنِسٍ وَحْدٍ
لیکن اَحَدٌ کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بولا جاتا ہے۔جیسا

---

[1] وقالت عائشة فی عمرؓ کان واللہ احوذ یا نسیج وحدہ اللسان (وحد (ا ن س)
[2] قالہ النابغۃ "وتکملۃ البیت۔ کان رحلی وقد زال النہار بنا۔ ھزی الجلیل علی مستانس وحدہ وقد مر تخریجہ فی (ا ن س)

کہ پہلے گزر چکا ہے اور هُوَ نَسِیْجُ وَحْدِہٖ کی طرح فُلَانٌ لَا وَاحِدَ لَهٗ کا محاورہ بھی مشہور ہے اور ذم کے لیے هُوَ عُیَیْرُ وَحْدِہٖ یا جُحَیْشُ وَحْدِہٖ کہا جاتا ہے یعنی وہ کمزور رائے ہے اور جب معمولی سی مذمت کرنا مقصود ہوتی ہے تو رُجَیْلُ وَحْدِہٖ کہہ دیتے ہیں۔

(و ح ش)

اَلْوَحْشُ: یہ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے اور وہ جانور جو انسان سے مانوس نہیں ہوتے، انہیں وَحْشٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع وُحُوْشٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ (۸۱۔۵) اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے۔

اور مَکَانٌ وَحْشٌ: اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

لَقِیْتُهٗ بِوَحْشٍ اِصْمِتَ یعنی میں نے ویران جگہ میں اس سے ملاقات کی۔ ❶

بَاتَ فُلَانٌ وَحْشًا: اس نے بھوکے رات گزاری اس کی جمع اَوْحَاشٌ آتی ہے۔

اور وَحْشٌ سے اَرْضٌ مُوْحِشَةٌ (ویران جگہ) کا محاورہ ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت وَحْشِیٌّ کہا جاتا ہے۔ اور وَحْشِیٌّ اِنْسِیٌّ کے بالمقابل آتا ہے۔ اور کسی شے کی ہر وہ جہت جو انسان کی طرف ہو اسے اِنْسِیٌّ اور دوسری جانب وحشی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں وَحْشِیُّ الْقَوْسِ وَاِنْسِیُّهٗ کا محاورہ آتا ہے۔

(و ح ی)

اَلْوَحْیُ کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں۔

اور اس کے معنی سرعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہر تیز رفتار معاملہ کو اَمْرٌ وَحْیٌ کہا جاتا ہے۔ اور یہ (وحی) کبھی رمز و تعریض کے طور پر بذریعہ کلام کے ہوتی ہے۔ اور کبھی (۲) صوت مجرد کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ترکیب الفاظ نہیں ہوتی۔ اور کبھی (۳) بذریعہ جوارح کے اور کبھی (۴) بذریعہ کتابت کے۔ اس بنا پر آیت۔

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَةً وَّ عَشِیًّا﴾ (۱۹۔۱۱) پھر وہ (عبادت کے) حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان سے اشارے سے کہا کہ صبح و شام خدا کو یاد کرتے رہو۔

میں بعض نے اَوْحٰی کے معنی رمز اور بعض نے کَتَبَ (لکھنا) اور بعض نے اعتبار کر لینا کیے ہیں اور آیت:

﴿وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (۶۔۱۱۳) اور اسی طرح ہم نے شیاطین (سیرت) جنوں اور انسانوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔

میں بھی وحی کا لفظ مذکورہ بالا وجوہ پر حمل کیا جا سکتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ﴾ (۶۔۱۲۲) اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں پر یہ بات ڈالتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اِیْحَاءٌ بمعنی وسوسہ اندازی کے

❶ ای بمکان لا انیس فیه انظر للکلمة المیدانی (۲/۱۸۴)

ہے جس کی طرف کہ آیت:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا❶ (۱۳۴) ((وَاِنَّ لِلشَّیْطَانِ لِمَّۃً)) کہ شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور شریعت میں کلمہ الٰہیہ کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو انبیاء و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے جو انبیا و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے اس کی چند صورتیں ہیں۔

جیسا کہ آیت:۔

﴿مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ﴾ الآیۃ (۴۲۔۵۱) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے۔ مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی [1] یا تو فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے اور اس کا کلام سنائی دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک معین شکل میں آکر آنحضرت ﷺ تک پیام رسالت پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ جملہ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا میں اس معنی کو بیان فرمایا ہے۔

وحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے کلام سنائی دے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور یہی معنی مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ کے ہیں وحی کی یہ دونوں قسمیں انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

وحی کی تیسری صورت القاء فِی الرَّوْعِ کی ہے یعنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا:❷ (۱۳۵) ((اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ)) کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔

اور کبھی [۴] وحی بذریعہ الہام ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ﴾ (۲۸۔۷) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔ اور کبھی وحی تسخیری ہوتی ہے یعنی کسی چیز کو اس کے کام پر مامور کرنا جیسے فرمایا:۔

﴿وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ﴾ (۱۶۔۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا:

اور کبھی نیند میں خواب کے ذریعے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا❸ (۱۳۶) ((اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَبَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ)) کہ وحی تو منقطع ہو چکی ہے مگر مبشرات یعنی رویا مومن باقی رہ گئے ہیں۔ اور وحی کی ان ہر سہ اقسام یعنی الہام تسخیر اور رؤیا پر آیت اِلَّا وَحْیًا دلالت کرتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ﴾ (۶۔۹۴)

---

❶ وتمامه و للملك لمة فامالمة الشيطان فايعاد بالشرو تكذيب بالحق الحديث رواه ' بن حبان فى (زوائد ص ٤٠)۔

❷ الحديث فى الفائق (٢/٢٨٥) وانظر لتخريجه فى وروع) و (نفث)

❸ قد مر تخريجه ف (ب ش ر) ١٢

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ، افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔

عام ہے اور ہر اس شخص پر چسپاں ہوسکتی ہے جو مذکورہ بالا اقسام وحی میں سے کسی ایک قسم کی وحی کا جھوٹا دعویٰ کرے۔اور آیت:۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيَ اِلَيْهِ﴾ اَلْاٰيَةِ (۲۱۔۱۵) اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی...... میں بھی وحی کا لفظ جمیع انواع وحی کو شامل ہے۔کیونکہ اس آیت میں وحی کے تحت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کا ذکر ہے اور ان دونوں چیزوں کی معرفت اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ چیز جس طرح شارع علیہ السلام سے بذریعہ سماعت کے حاصل ہوسکتی ہے۔ایسے ہی عقل و الہام سے بھی حاصل ہوسکتی ہے...... پس اس میں صرف اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر نہیں ہوسکتا۔جسے باری تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی وجوب عبادت کے متعلق معرفت حاصل نہ ہو۔اور آیت:۔

﴿وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ﴾ (۵۔۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا۔

میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔اور آیت:

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ﴾ (۲۱۔۷۳) اور ان کو نیک کام کرنے......کا حکم بھیجا۔

میں بھی لوگوں کی طرف وحی کرنے سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انہیں ان باتوں کا حکم دینا مراد ہے۔اور آیات۔

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (۶۔۱۰۶) اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آتا ہے اس کی پیروی کرو۔

﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (۱۰۔۱۵) میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (۱۸۔۱۱۰) کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے۔

میں خاص وہ وحی مراد ہے جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی۔اور آیت:۔

﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ﴾ (۱۰۔۸۷) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی۔

میں موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف یکساں قسم کی وحی بھیجنا مراد نہیں ہے۔بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی تو حضرت جبریل کی وساطت سے آتی تھی مگر ہارون علیہ السلام کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جبریل علیہ السلام دونوں کی وساطت سے وحی کی جاتی ہے۔اور آیت:

﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ﴾ (۸۔۱۲) جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ لوح وقلم کی وساطت سے وحی بھیجنا مراد ہے۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ (۴۱۔۱۲) اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔

میں آسمان سے مراد اہل سماء ہیں تو یہاں الْمُوْحٰی اِلَیْھِمْ (یعنی جن کی طرف وحی کی تھی) محذوف ہے اور اہل سماء سے مراد چونکہ فرشتے ہی ہیں اس لیے اصل میں ﴿وَاَوْحٰی اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ﴾ (۸۔۱۲) ہے کہ ہم نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی۔ پس یہ مذکورہ بالا آیت کے ہم معنی ہوگی۔

اوراگر مُوْحٰی اِلَیْھِمْ سے آسمان ہی مراد لیے جائیں تو لوگ آسمانوں کے غیر جاندار ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے وحی تسخیری مراد ہوگی۔ اور جن کے نزدیک آسمان زندہ اور جاندار مخلوق ہیں۔ ان کے نزدیک وحی بذریعہ کلام مراد ہوگی۔ اور آیت:۔

﴿بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا﴾ (۹۹۔۵) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔

میں وحی کے پہلے معنی یعنی وحی تسخیری مراد لینا اقرب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ﴾ (۲۰۔۱۱۴) اور قرآن پاک کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اسکے پورا ہونے سے پہلے قرآن پاک کے (پڑھنے) کے لیے جلدی نہ کرو۔ میں آنحضرت ﷺ کو تثبت کے ساتھ وحی کو سننے اور اس کی تلقی میں عجلت کو ترک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(و د د)

اَلْوُدُّ: کے معنی کسی چیز سے محبت اور اس کے ہونے کی تمنا کرنا کے ہیں۔ یہ لفظ ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کی تمنا اس کی محبت کے معنی کو متضمن ہوتی ہے۔ کیونکہ تمنا کے معنی کسی محبوب چیز کی آرزو کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور آیت۔

﴿وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (۳۰۔۲۱) اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اور نیز آیت۔

﴿سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱۹۔۹۶) خدا ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دے گا۔ میں اس الفت کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت ﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ﴾ (۸۔۶۳) اور اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت

﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ (۴۲۔۲۳) کہدو کہ میں اس کا تم سے صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (تو چاہیے) میں مودت کے معنی محض محبت کے ہیں [1] اور آیت ﴿وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ﴾ (۸۵۔۱۴) اور وہ بخشنے والا (اور) محبت کرنے والا ہے۔

اور نیز۔ ﴿اِنَّ رَبِّیْ رَحِیْمٌ وَّدُوْدٌ﴾ (۱۱۔۹۰) بے شک میرا پروردگار رحم والا اور محبت والا ہے۔ میں وَدُوْدٌ اسمائے حسنٰی سے ہے اور اس میں محبت کے ان معنوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ﴾ (۵۔۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے۔ اور جسے

---

[1] الاستثناء منقطع لان القرابة ليست من جنس الاجر فالفاء للبيته وهي بمعنى اللام ومعناه الا ان تودوني لقرابتي منكم والفتوحات (ص۷۲ جو ۱۴)

وہ دوست رکھیں۔ میں پائے جاتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے بندوں سے محبت کرنے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے مودت کے معنی ان کی نگہداشت کرنے کے ہیں۔ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں کبھی بھی چھوٹے سے اس کے چھوٹا پن اور کسی بڑے سے اس کی بڑائی کے سبب غافل نہیں ہوتا اور میں ودود اور شکور ہوں لہٰذا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت:

﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (۱۹۔۹۷) کے بھی وہی معنی ہوں جو کہ آیت: ﴿سَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ ہیں۔

اور مَوَدَّةٌ بمعنی تمنا کے متعلق فرمایا:

﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (۳۔۹۶) (اے اہل اسلام) بعضے اہل کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کردیں۔ ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ (۱۵۔۲) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے اسے کاش وہ مسلمان ہوتے۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳۔۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے۔

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ (۲۔۱۰۹) بہت سے اہل کتاب (اپنے دل کی جلن سے) یہ چاہتے ہیں۔ ﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ (۸۔۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔ ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا﴾ (وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں (اسی طرح) تم بھی کافر ہو کر (سب برابر ہو جاؤ)

﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ﴾ (۷۰۔۱۱) (اس روز) گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے۔

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۸۔۲۲) جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

نیز اس آیت میں کفار سے موالات اور انکی پشت پناہی سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰۔۱) مومنو! (اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مکے سے نکلے ہو) تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

تو یہاں مَوَدَّتْ سے تعلقات محبت یعنی خیر خواہی وغیرہ مراد ہے۔

﴿كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ﴾ (۴۔۷۳) گویا تم میں اور اس میں دوستی تھی ہی نہیں۔

فُلَانٌ وَّدِيْدُ فُلَانٍ وہ فلاں کا دوست ہے۔

اَلْوُدُّ ایک بت کا نام تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف

ہے بعض نے کہا ہے کہ اس بت کو انتہائی محبوب سمجھنے کی وجہ سے اسے وُدٌّ کہتے تھے اور یا ان کے اس اعتقاد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اور اس بت کے درمیان رابطہ محبت پایا جاتا ہے، اسے وُدّ کہا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قسم کی قباحتوں سے پاک ہے۔

اَلْوَدُّ کے معنی وَتَدٌ یعنی میخ کے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں وَتْدٌ ہو تاء دال میں مدغم ہو کر وَدٌّ ہوگیا ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ میخ کے ایک جگہ پر جمے رہنے یا جس چیز میں لگائی جائے اس میں مضبوطی کے ساتھ لگ جانے کی وجہ سے اس سے محبت کے معنی لے کر (اسے وَدٌّ کہہ دیا گیا ہو)۔

(و د ع)

اَلـدَّعَةَ کے معنی آرام اور فراخی عیش کے ہیں اور وَدَعْتُ کَذَا اَدَعُہٗ وَدْعًا (ب) کے معنی ہیں: تَرَکْتُہٗ وَادِعًا۔ یعنی پرسکون طریقہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا بعض کا قول ہے کہ اس کا فعل ماضی اور اسم فاعل استعمال نہیں ہوتا صرف یَدَعُ اور دَعْ یعنی فعل مضارع اور امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ [1] اور آیت ﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ﴾ (۹۳۔۳) میں ایک قرأت تخفیف دال کے ساتھ بھی منقول ہے۔ [2] شاعر نے کہا ہے۔ [3] ()

(۴۴۲) لَیْتَ شِعْرِیْ عَنْ خَلِیْلِی مَا الَّذِیْ
غَالَہٗ فِی الْحُبِّ حتی وَدَعَہٗ

کاش! مجھے میرے دوست کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اسے محبت سے کس چیز نے روک دیا کہ وہ اسے چھوڑ بیٹھا ہے۔

اَلتَّوَدُّعُ کے معنی تن آسان ہونے کے ہیں۔ اور فُـلَانٌ مُتَّدِعٌ وَمُتَوَدِّعٌ وَفِیْ دَعَۃٍ کے معنی ہیں کہ فلاں آسودہ حال اور عیش و آرام میں ہے۔ اصل میں یہ معنی ودع بمعنی تَرَکَ سے ماخوذ ہیں۔ یعنی اس نے مشقت اور تکلیف کے سبب طلب معاش کے لیے جدوجہد کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اَلتَّـوْدِیْـعُ: یہ بھی دَعَۃٌ (سکون) سے مشتق ہے اور تودیع کے اصل معنی مسافر کو الوداع کہنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے سفر کی تکالیف سے محفوظ رکھے اور اسے آرام کی حالت میں پہنچا دے پھر یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ لفظ تسلیم، اصل میں اس کے معنی سلامتی کی دعا کے ہیں کہا جاتا ہے وَدَّعْتُ فُـلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) چنانچہ آیت: ﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی﴾ (۹۳۔۳) (اے محمد!) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

---

[1] هذا قول علماء النحو وفي الحديث ودعوا الحبشة ماودعوكم وفي المستوفي ان كل ذالك وارد في كلام العرب ولاعبرة بكلام النحاة (روح المعاني ۱۵۶/۳۰)

[2] قال ابن جني وهي قراءة النبي صلى الله عليه وسلم وفيه تفصيل ذكره صاحب الروح (۱۵۶/۳۰)۔

[3] والبيت مما اختلف في نسبته وروايته ففي اللسان والمحكم (ودع) في الودبدل في الحب۔ قال الازهري: روى ابن اخي الاصمعي ان هذا الشعر لانس بن زنيم الليثي الصحابي وفيه عن اميري موضع عن خليلي وفي الطبرسي (۳۰: ۱۶۳) وروح المعاني (۳۰: ۵۶) والبحر (۸: ۴۸۵) وابن خالويه (۱۱۷) او العيون (۳: ۱۵۶) والاشباه النحويه (۱: ۲۱۵) معزو الى ابي الاسود الدئلي وفي الاصابة رقم (۲۶۷) في ثلاثة قالها في عبدالله بن عامر حين ابطاء عليه عطاءه والبيت في البلدان (رسم: ودعان) بغير عزو (في حماسة البحري ۳۷۳) برواية اخرى ايضا لانس بن انس الليثي وايته' سل اميري مالذي غيرلي۔ وده والنفع حتى ودعه

میں وَدَّعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) کی طرح صرف چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کنایہ کے طور پر میت کو مُوْدَعٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اِسْتَوْدَعْتُكَ غَيْرَ مُوْدَعٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی درازی عمر کی دعا کے ہیں۔اور اسی سے شاعر کا قول ہے۔ [1]

(۴۴۳) وَدَّعْتُ نَفْسِيْ سَاعَةَ التَّوْدِيْعِ

کہ الوداع کے وقت میری جان ہوا ہوگئی۔

(و د ق)

اَلْوَدْقُ : بعض نے کہا ہے کہ بارش میں جو غبار سا نظر آتا ہے اسے وَدْقٌ کہا جاتا ہے۔اور کبھی اس سے مراد بارش بھی ہوتی ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ﴾ (۲۴۔۴۳) پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر (برس) رہا ہے۔

اور گرمی کی شدت سے ہوا میں جو لہریں نظر آتی ہیں انہیں وَدِيْقَةٌ کہتے ہیں۔اور وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں: مادہ چوپایہ کا نر کی خواہش کے وقت، رطوبت نکالنا چنانچہ اس مادہ (چوپایہ) کو جو نر کی خواہش میں رطوبت نکال رہی ہو، وَدِيْقٌ یا وَدُوْقٌ کہتے ہیں۔

اور جہاں بارش ہوئی ہو اس جگہ کو مَوْدِقٌ (ظرف) کہا جاتا ہے۔شاعر نے کہا ہے [2] (الطّویل)

(۴۴۴) تُعَفِّيْ بذيل المرط اِذَا جِئْتُ مَوْدِقِيْ

تُعَفِّيْ کے معنی نشان مٹانے کے ہیں اور مرط بڑی چادر کو کہتے ہیں جو ستر کے لیے عورتیں اوپر اوڑھتی ہیں یہاں شاعر نے قدم کے پڑنے کی جگہ کو موضع مطر کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ جب میں اپنی محبوبہ کے پاس آتا ہوں تو وہ اپنی چادر سے میرے قدموں کے نشان مٹا دیتی ہے۔

(و د ی)

اَلْوَادِيْ: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہتا ہو اسی سے دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (۲۰۔۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طوی میں ہو۔

اس کی جمع اَوْدِيَةٌ آتی ہے جیسے نَادٍ کی جمع اَنْدِيَةٌ اور نَاجٍ کی جمع اَنْجِيَةٌ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۳۔۱۷) پھر اس سے اپنے اپنے انداز کے مطابق نالے بہہ نکلے۔

اور حدیث میں ہے [3] (۱۳۷)

((لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا)) کہ اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہش مند ہوگا۔

---

[1] لم اجده ۱۲۔

[2] قاله امرئو القيس وصدره: دخلت على بيضاء جم عظامها وفي ديوانه ۹۰ (السند وبى) بذيل الدعر بدن بذيل المرط راجع ديوانه و للسان (ودق) والعقد الثمين (۱٤۱) ومختار الشعر الجاهلي (۱ : ٦۰)

[3] رواه الترمذی (۲ : ۵۷) عن انس بن مالك واحمد و الشيخان عن ابن عباس و مسلم في صحيحه عن ابن الزبير وابن ماجة عن ابی هريرة والبخاری في التاريخ عن بريرة وفي كنز العمال (ج۳ رقم ۱۱۱٦۔ ۱۱۲۰) باختلاف الفاظه وفي محاضرات الادباء (٤/٤۳۳ :) كان في مصحف عبدالله بن مسعود رضي الله عنه۔

اور استعارہ کے طور پر مذہب، طریقہ اور اسلوب بیان کو وادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ فِیْ وَادٍ غَیْرِ وَادِیْكَ کہ فلاں کا مسلک تجھ سے جداگانہ ہے اور قرآن پاک نے شعراء کی مذمت کرتے ہوئے ان کے متعلق کہا ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۵) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔

تو یہاں فِیْ كُلِّ وَادٍ سے مختلف اسالیب سخن مراد ہیں جیسے، مدح، ہجو، جدل، غزل وغیرہ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۴۴۵) اِذَا مَاقَطَعْنَا وَادِیًا مِنْ حَدِیْثِنَا
اِلٰی غَیْرِہٖ زِدْنَا الْاَحَادِیْثَ وَادِیًا

جب ہم موضوع سخن کی ایک وادی کو قطع کر لیتے ہیں تو دوسری وادی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور کنایہ کے طور پر مرد کی اس رطوبت کو وَدْیٌ کہا جاتا ہے جو عورت سے لذت اندوزی کے وقت یا پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے اور اَمْذٰی وَ اَمْنٰی کی طرح اودی (افعال) کے معنی نر کا ودی (رطوبت) خارج کرنے کے ہیں اور یہ مَذّی وَاَمْنٰی کی طرح مجرد و مزید فیہ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

اَلْوَدِیُّ: چھوٹے پودے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی پانی کی طرح طول میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اَوْدَاہُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں گویا اس کے خون کو بہا دیا اسی سے وَدَیْتُ الْقَتِیْلَ کا محاورہ ہے جس کے معنی مقتول کا خون بہا ادا کرنے کے ہیں اور دِیَةٌ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰی اَهْلِهٖ﴾ (۴۔۹۲) تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا۔

(و ذ ر)

یَذَرُ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو قلت اعتداد کی وجہ سے پھینک دینے کے ہیں۔ (پھر صرف چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے)۔ اس کا فعل ماضی استعمال نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا:۔

﴿قَالُوْا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا﴾ (۷۔۷۰) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں ان کو چھوڑ دیں؟

﴿وَ یَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ﴾ (۷۔۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔

﴿فَذَرْهُمْ وَ مَا یَفْتَرُوْنَ﴾ (۶۔۱۳۷) تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور ان کا جھوٹ۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور آیت:۔ ﴿وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ (۲۔۲۳۴) اور عورتیں چھوڑ جائیں۔

میں یَتْرُكُوْنَ یا یَخْلُفُوْنَ کی بجائے یَذَرُوْنَ کا صیغہ اختیار کرنے میں جو خوبی ہے وہ اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔

اَلْوَذْرَةُ: گوشت کی چھوٹی سی بوٹی کو کہتے ہیں اور قلت

❶ لم اجدہ ۱۲۔

اعتناء کے سبب اسے اس کا نام سے پکارتے ہیں جیسا کہ حقیر شخص کے متعلق ھُوَ لَحْمٌ عَلٰی وَضَمٍ یعنی وہ ذلیل ہے) محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(و ر ث)

اَلْـوَرَاثَۃُ وَالْاِرْثُ کے معنی عقد شرعی۔یا جو عقد کے قائم مقام ہے کے بغیر کسی چیز کے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلے جانا کے ہیں۔اسی سے میت کی جانب سے جو مال ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے اسے اِرْثٌ تُرَاثٌ اور مِیْرَاثٌ کہا جاتا ہے اور تُـراث اصل میں وُراث ہے واوَ (مضموم) کے شروع میں آنے کی وجہ سے اسے تا سے تبدیل کرلیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَتَـاْكُـلُـوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹۔۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

اور حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶ (۱۳۸) ((اُثْبُتُوْا عَلٰـى مَشَـاعِـرِكُـمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثِ اَبِيْـكُمْ)) کہ اپنے مشاعر (مواضع نسک) پر ٹھہرے رہو تم اپنے باپ (ابراہیم علیہ السلام) کے ورثہ پر ہو۔تو یہاں ارث کے معنی اصل اور بقیہ نشان کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے ❷ ()

(۴۴۶) فَيَنْظُرُ فِيْ صُحُفٍ كَالرِّيَا
فِيْهِنَّ اِرْثُ كِتَابٍ مُحِيَ

وہ صحیفوں میں تانت باندھنے والے کی طرح غور کرتا ہے جن میں کہ مٹی ہوئی کتابت کا بقیہ ہے۔اور محاورہ میں وُرِثْـتُ مَـالًا عَنْ زَيْدٍ وَّوَرِثْتُ زَيْدًا (میں زید کا وارث بنا) دونوں طرح بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَوَرِثَ سُـلَيْمَانُ دَاوٗدَ﴾ (۲۷۔۱۶) اور سلیمان داؤد علیہ السلام کے قائم مقام ہوئے۔

﴿وَّ وَرِثَـهٗ اَبَوٰهُ﴾ (۴۔۱۱) اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔

﴿وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (۲۔۲۳۳) اور اسی طرح نان ونفقہ بچے کے وارث کے ذمہ ہے۔﴿يٰٓاَيُّهَا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَـرْهًا﴾ (۴۔۱۸) مومنو! تم کو جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔

اور اَوْرَثَـنِـي الْمَيِّتُ كَذَا کے معنی ہیں میت نے مجھے اتنے مال کا وارث بنایا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ اِنْ كَـانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً﴾ (۴۔۱۱) اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔

اور اَوْرَثَنِي اللّٰهَ كَذَا کے معنی کسی چیز کا وارث بنا دینے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيلَ الْكِتٰبَ﴾ (۴۰۔۵۳) اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔

﴿وَاَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِيْنَ﴾ (۴۴۔۲۸) اور ہم نے

---

❶ الحديث باختلاف الفاظه في ابوداؤد والترمذى (۲/۹۹۔۱۰۰) مع تحفة الاحوذى والنسائى (۲/۴۵) وابن ماجة (۲/۲۲۳) والحاكم (۱/۴۶۲) والبيهقى فى سنن الكبرى (۵/۱۱۵) والشافعى فى رسالته (رقم ۱۳۲) من طريق سفيان ابن عيينة باسناده وقال الترمذى حديث سريع حديث حسن لا نعرفه الامن حديث ابن عيينه عن عمرو بن دينار وانظر لتخريجه ايضا (الفتح الكبير ۲/۳۳۴)

❷ لم اجده ۱۲۔

دوسرے لوگوں کو ان کا مالک بنا دیا۔

﴿وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ﴾ (۳۳۔۲۷) اور ان کی زمین ..... کا تم کو وارث بنایا۔

﴿وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ﴾ (۷۔۱۳۶) اور جو لوگ (کمزور سمجھے جاتے تھے) ان کو..... وارث کر دیا۔ ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اسکے متعلق وَرَثَ كَذَا کہتے ہیں اور جب کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دی جائے تو اُوْرِثَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا﴾ (۴۳۔۷۲) اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیئے گئے ہو۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ﴾ (۲۳۔۱۰،۱۱) یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی جو..... میراث حاصل کریں گے)۔

اور آیت: ﴿وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ﴾ (۱۹۔۶) اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔

میں وراثت سے مراد مال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ علم و فضل اور نبوت کا ورثہ مراد ہے کیونکہ دنیا کے مال کی تو انبیاء کرام کی نظر میں کچھ قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فکر کریں۔ بلکہ وہ نہ مال کو جمع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے مالک بنتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

❶ (۱۳۹) ((اِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ)) ہم انبیاء کا گروہ جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور ہمارا کوئی وارث نہیں بن سکتا۔

تو یہاں مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ منصوب عَلَى الْاَخْتِصَاصِ ہے اور تَرَكْنَاهُ سے مراد علم ہے اور اس صدقہ میں تمام امت برابر کے شریک ہے۔ اور جو حدیث میں آیا ہے ❷ (۱۴۰) ((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ)) (کہ علماء کرام انبیاء عظام کے وارث ہیں) تو اس سے مراد بھی ورثہ علم ہی ہے اور اس پر ورثہ کا اطلاق اس لیے ہوا ہے کہ کسی احسان اور معاوضہ کے بغیر ملتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا ❸ (۱۴۱) ((اَنْتَ اَخِيْ وَوَارِثِيْ)) تو میرا بھائی اور وارث ہے لیکن ساتھ ہی فرما دیا وَمَا اَرِثُكَ کہ میں تیرا وارث نہیں ہوں گا اسی طرح فرمایا ❹ (۱۴۲)

((مَا وَرَّثَتِ الْاَنْبِيَاءُ قَبْلِيْ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ)) کہ مجھ سے پہلے انبیاء کا ورثہ کتاب اللہ اور میری سنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو وارث کہا ہے کیونکہ آخر کار تمام اشیاء اسی کی ملک میں جانے والی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۳۔۱۸۰) اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔

---

❶ الحديث باختلاف الفاظه في السنن الكبرى للنسائي واصله متفق عليه بطرق من حديث عائشة وانظر لتخريجه كنز العمال (۱۱: رقم ۹۰۔۹۳) واللالى المصنوعة ج۲ ص۴۴۲

❷ رواه ابوداؤد والترمذى وابن ماجة وزوائد ابن حبان رقم (۸۰) وفيه ان العلماء من حديث ابى الدرداء (حديث واه) وله طرق عند الطبراني وفي الباب عن البراء بن عمرو بن العاص وراجع تخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم (۱۱۷ ص ۱۲۴)۔

❸ وفي رواية انت وارثي وعن ابن بريدة عن ابيه مرفوعا ان وصيي و وارثي على بن ابى طالب اللالى المصنوعة (ج۱ ص۳۵۹) وفي الخصائص من سنن الكبرى للنسائي حديث طويل في اخوة على عليّ قال العراقي في تخريج الاحياء (ج۲۔ ص ۱۹۰) وكل ما ورد في اخوته فضعيف لايصح من شيء۔

❹ قطعة من حديث سابق ولم اجده بهذا اللفظ ۱۲۔

اور فرمایا:۔

﴿وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ (۱۵۔۲۳) اور ہم ہی (سب کے) وارث (مالک) ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے وارث ہونے کے متعلق (یہ بھی) امر وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (کہ آج کس کی بادشاہت ہے) کے ساتھ منادی فرمائیں گے تو جواب میں کہا جائے گا۔ ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۴۰۔۱۶) خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی سے علم حاصل کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَرِثُوا الْكِتٰبَ﴾ (۷۔۱۶۹) جو کتاب کے وارث بنے۔

﴿أُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ (۴۲۔۱۴) (اور جو لوگ) ان کے بعد خدا کی کتاب کے وارث ہوئے۔

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ﴾ (۳۵۔۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا......

﴿يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ (۲۱۔۱۰۵) میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔

اور وراثت حقیقی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جس کے متعلق اس پر نہ کوئی محاسبہ ہو اور نہ کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہو۔اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ دنیا سے بوقت ضرورت قدر کفایت سے زیادہ نہیں لیتے اور پھر اسے جائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں تو جو شخص دنیا کو ان شرائط کے ماتحت حاصل کرے گا اس پر کسی قسم کا محاسبہ یا عقاب نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اس کے لیے عفو وصفو ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے۔

(۱۴۲) ((مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِي الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللّٰهُ فِي الْاٰخِرَةِ)) کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرلے گا۔آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کسی قسم کا محاسبہ نہیں ہوگا۔

(و ر د)

اَلْوُرُوْدُ: یہ اصل میں وَرَدْتُّ الْمَاءَ (ض) کا مصدر ہے جس کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہے۔ پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے اور پانی پر پہنچنے والے کو وَارِدٌ اور پانی کو مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور اَوْرَدَ الْاِبِلَ: (افعال) عَلَى الْمَاءِ کے معنی اونٹوں کو پانی پر وارد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ﴾ (۲۸۔۲۳) اور جب مدین کے پانی کے مقام پر پہنچے۔

اَلْوِرْدُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد ہونے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔اور یہ صَدْرٌ (لوٹنا) کی ضد بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور بخار کی باری کے دن کو بھی وِرْدٌ کہتے ہیں۔

اور تقطیع کے طور پر دوزخ کی آگ میں داخل ہونے پر بھی وَرَدَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔جیسے فرمایا۔

﴿فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ﴾ (۱۱۔۹۸) اور ان کو دوزخ میں جا اتاوے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ برا ہے۔

﴿اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا﴾ (۱۹۔۸۶) دوزخ کی طرف پیاسے......

﴿اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ﴾ (۲۱۔۹۸) تم (سب) اس میں داخل ہو کر رہو گے۔

﴿مَّا وَرَدُوْهَا﴾ (۲۱۔۹۹) تو اس میں داخل نہ

ہوتے۔

اَلْـوَارِدُ: (ایضاً) اس شخص کو بھی کہا گیا ہے جو قافلے کے آگے جا کر پانی لاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ ﴿فَـاَرْسَـلُـوْا وَارِدَهُمْ﴾ (۱۲۔۱۹) اور انہوں نے (پانی کے لیے) اپنا سقا بھیجا۔

ہر وہ شخص جو پانی پر پہنچ جائے اسے بھی وارد کہا جاتا ہے۔ اور آیت

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (۱۹۔۱۷) اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا۔

میں بعض نے وَارِدُهَا کو وَرَدْتُ مَاء كَذَا۔ کے محاورہ سے لیا ہے جس کے معنی پانی پر حاضر ہونے کے ہیں اور اس میں اترنا شرط نہیں ہے [1] اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں اترنا بھی شرط ہے اور اولیاء اللہ اور صالحین بھی ایک مرتبہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوں گے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کی حالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہوگی کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا۔ تو ان پر آگ کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ [2] چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ (۲۱۔۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب سلامتی بن جا)

اور اس مسئلہ پر بحث کے لیے ذرا تفصیل درکار ہے۔ جو یہاں پر ہمارا مقصد نہیں۔

اور جس شخص کو باری کا بخار چڑھا ہوا ہو اسے بھی مَوْرُوْدٌ کہا جاتا ہے اور شَعْرٌ وَارِدٌ لمبے بالوں کو کہتے ہیں۔ جو عورت کی کمر یا اس کے سرینوں تک دراز ہوں۔

اَلْـوَرِيْـدُ: رگ جس کا تعلق جگر اور دل کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ خون اور روح کا مجری بنتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۵۰۔۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔

یعنی اس کی روح سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اَلْـوَرْدُ: اصل میں گل سرخ کو کہتے ہیں۔ اور یہ وَارِدٌ سے ہے جس کے معنی قافلے سے پہلے پانی پر آنے والا کے ہیں۔ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول تمام پھولوں سے پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر درخت کے پھول کو (مجازاً) وَرْدٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ درخت کے پھولدار ہونے پر وَرَّدَ الشَّجَرُ بولا جاتا ہے۔ پھر گھوڑے کے رنگ کو بھی گل سرخ کے ساتھ تشبیہ دے کر فَـرَسٌ وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور آثار قیامت کے طور پر جب آسمان سرخ ہو جائے گا تو اسے بھی قرآن پاک نے وَرْدَةٌ کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵۔۳۷) تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو وہ کیسا ہولناک دن ہوگا)۔

---

[1] قال في روح المعاني واردها اى داخلها كما ذهب الى ذالك جمع كثير من سلف المفسرين واهل السنة وفى معناه رواية جابر بن عبدالله مرفوعا اخرجه احمد والحكم الترمذى وابن المنذر والحاكم وصححه جماعة عن ابى اميه وقد ذكر الامام الرازى لهذا الدخول عدة فوائد فليراجع وعند الحسن وقتادة المرور كما روى ذالك عن عبدالله بن مسعود كذا فى الروح ١٦/١١١۔

[2] وهو قول عبدالله بن مسعود فى رواية ابن ابى حاتم عنه واخرجه عبد بن حميد عن وليد بن نمير ايضا ويدل عليه قوله تعالىٰ ولما وردماء مدين راجع الروح وابن كثير ١٢۔

(و ر ق)

اَلْوَرْقُ: درخت کے پتے۔اس کی جمع اَوْرَاقٌ اور واحد وَرَقَةٌ آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا﴾ (۶۔۵۹) اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے۔

اور وَرَّقَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی درخت کا پتے دار ہونا کے ہیں اور سرسبز خوبصورت پتے دار درخت کو وَارِقَةٌ کہا جاتا ہے۔عَامٌ اَوْرَقُ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔ اور اَوْرَقَ فُلَانٌ کے معنی ناکام ہونے کے ہیں گویا وہ پتے دار درخت ہے جو بدون ثمر کے ہے اور اس کے بالمقابل آیت ﴿وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ﴾ (۱۸۔۳۴) اور اس کو پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔

میں مال کا ثمر کہا ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [1] اور رنگ کی تروتازگی کے لحاظ سے خاکستری رنگ کے اونٹ کو بَعِيْرٌ اَوْرَقُ کہا جاتا ہے اسی طرح حَمَامَةٌ وَرْقَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی خاکی رنگ کی کبوتری یا فاختہ کے ہیں۔

اَوْرَقَ: (ایضاً) مال دار ہونا۔گویا کثرت کے لحاظ سے مال کو درخت سے پتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ مال کو ثَرٰی تُرَابٌ یا سَيْلٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس معنی میں کہا جاتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے:۔لَهٗ مَالٌ كَالتُّرَابِ اَوِ السَّيْلِ اَوِ الثَّرٰی: یعنی وہ بہت زیادہ مالدار ہے۔شاعر نے کہا ہے [2] (الرجز)

(۴۴۷) وَاغْفِرْ خَطَايَايَ وَثَمِّرْ وَرَقِي

میری خطائیں معاف فرما اور میرا مال بڑھا دے۔ اور اَلْوَرِقُ (بکسر الراء) خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ﴾ (۱۸۔۱۹) تو اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دے کر شہر بھیجو۔

ایک قراءت میں بِوَرْقِكُمْ وَبِوُرْقِكُمْ ہے اور یہ وَرْقٌ وَوَرِقٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔جیسے كَبْدٌ وَ كَبِدٌ۔

(و ر ی)

وَارَيْتُ كَذَا: کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ (۷۔۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

تَوَارٰی: (لازم) چھپ جانا۔قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (۳۸۔۳۲) یہاں تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔

وَرَّى الْخَبَرَ کے معنی توریہ کرنے کے ہیں۔یعنی اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریقہ سے ظاہر کرنا...... (اس طور پر کہ جھوٹ بھی نہ ہو۔اور اصل مقصد بھی ظاہر نہ ہونے پائے) چنانچہ حدیث میں ہے۔[3] (۱۴۳) ((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد غزوا وری بغیرہ)) کہ آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تو توریہ سے کام لیتے۔

اَلْوَرٰی: بقول خلیل مخلوقات کو کہتے ہیں جو ایک وقت میں

---

[1] قد مر فی (ث م د) ۱۲

[2] قاله العجاج وقبله: ایاك ادعو فتقبل ملقی والشطر فی اللسان (ورق۔ بلق) او مجالس ثعلب وتهذیب الاصلاح (۱ : ۱۷۵) ابن خالویه ۲۵ والصاحبی (۱۸۷) واضداد ابی الطیب (۲۶۲) والارجوزة فی دیوانه (۳۴۔ ۳۵)۔

[3] رواه البخاری (۴۱۴) وایضا فی مواضع ۱۲۔

زمین پر موجود ہو۔اس میں ماضی اور مستقبل کی نسل شامل نہیں ہوتی اوران کو اَلْوَرٰی اس لیے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اپنے اشخاص سے زمین کو چھپائے ہوئے ہیں۔

اَلْـوَرَآءَ کے معنی خلف یعنی پچھلی جانب کے ہیں۔مثلاً جو زید کے پیچھے یا بعد میں آئے اس کے متعلق وَرَاءَ زَیْدٍ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ مِـنْ وَّرَآءِ اِسْـحٰـقَ یَعْقُوْبَ﴾ (۱۱۔۷۱) اور اسحاق کے بعد یعقوب (کی) خوش خبری دی۔

﴿ارْجِـعُوْا وَرَآئَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُوْرًا﴾ (۵۷۔۱۳) پیچھے کولوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔

﴿فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ﴾ (۴۔۱۰۲) تو وہ پرے ہو جائیں۔

اور کبھی بمعنی قُـــدَّامٌ (سامنے کی طرف) بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ كَـانَ وَرَآءَ هُـمْ مَّـلِكٌ یَّـاْخُـذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا﴾ (۱۸۔۷۹) اوران کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔اور آیت:۔

﴿اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾ (۵۹۔۱۴) یا دیواروں کی اوٹ میں۔ میں دیوار کی دونوں جانب مراد ہوسکتی ہیں۔کیونکہ جو شخص کسی ایک جانب میں ہوگا تو دوسری جانب اس کے لیے وَرَاءَ ہی ہوگی۔اور آیت: ﴿تَرَكْتُمْ مَّا خَـوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (۶۔۹۵) اور جو (مال ومتاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

میں مرنے کے بعد پیچھے چھوڑ آنا مراد ہے۔اور اس میں ان کے لیے سرزنش ہے کہ تم نے مال خرچ کر کے ثواب آخرت کیوں نہ حاصل کیا۔

اور آیت:۔

﴿فَـنَبَـذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِـمْ﴾ (۳۔۱۸۷) تو انہوں نے اس کو پس پشت پھینک دیا۔

بھی تبکیت (ملامت) پر محمول ہے کہ انہوں نے نہ تو کتاب اللہ پر عمل ہی کیا اور نہ کبھی اس کی آیات پر غور کیا۔اور آیت

﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۲۳۔۷) اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

میں وَرَآءَ ذَالِكَ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ان بیان کردہ حلائل کے علاوہ دیگر کا خواہش مند ہو یا ذوات المحارم سے تعرض کرے گا تو اس نے حدود شریعت سے تجاوز کیا اور اس کی حرمت کے پردہ کو چاک کر ڈالا۔اور آیت۔

﴿وَ یَـكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ (۲۔۹۱) (یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کو نہیں مانتے۔

میں وَرَآءَهٗ سے دوسری آسمانی کتابیں مراد ہیں۔اور وَرِیَ الـزَّنْـدُ یَـرِیْ وَرْیًا کے معنی چقماق کے پیچھے سے آگ نکالنے کے ہیں تو گویا اس میں آگ کے پوشیدہ ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [1] (الرمل)

(۴۴۸) كَكُمُوْنِ النَّارِ فِیْ حَجَرِهٖ

جیسے پتھر کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔

[1] قاله ابو نواس (الحسن بن هانئ) وصدره: یکن الشنآن فیه لنا...... والبیت فی طرائف الشعراء (۷۳) ومجموعة المعانی (۱۶۷) والعقد (۱: ۲۵۲) وفی الموشح للمرزبانی ۲۷۳: اخذ علی بن المبارك علی ابی نواس فی شعره فی حرفین احد هما هذا البیت وقال انما کان ینبغی له ان یقول فی حجر ها بدل فی حجره والثانی فی قوله: اسرع من قول قطاة قَطًّا و کان ینبغی له ان یقول قطا بالتخفیف انظر الحیوان للجاحظ (۲: ۳۳)

چنانچہ قرآن میں ہے:۔
﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾ (۵۶۔۷۱) بھلا دیکھوتو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔اور کامیاب شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔
فُلَانٌ وَارِیَ الزَّنْدِ : فلاں کا چقماق آگ دینے والا ہے۔ یعنی وہ کامیاب ہے اور اس کے بالمقابل کَابِیْ الزَّنْدِ کے معنی ناکام کے ہیں۔اور چربی دار گوشت کو اَللَّحْمُ الْوَارِیْ کہا جاتا ہے۔اَلْوَرَآءُ: (ایضاً) اولاد کی اولاد یعنی پوتے یا نواسے کو کہا جاتا ہے اور وَرَاءَكَ کسی کام پر ابھارنے کے لیے بولا جاتا ہے۔یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔چنانچہ محاورہ ہے۔
وَرَاءَكَ اَوْسَعُ لَكَ: اس میں وَرَاءَكَ منصوب بفعل مضمر ہے یعنی اِئْتِ وَرَاءَكَ اور بعض نے اس کا اصل یکُنْ اَوْسَعَ لَكَ بیان کیا ہے اَیِ تَنَحَّ وَائْتِ مَکَانًا اَوْسَعَ لَكَ۔
اَلتَّوْرَاةُ: اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہیں ورثہ میں ملی تھی۔بعض نے کہا ہے کہ یہ فَوْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اور اس میں تاء واؤ سے مبدل ہے جیسے تَیْقُوْرٌ جو وَقَارٌ سے بنا ہے اصل میں وَیْقُوْرٌ ہے اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے اور انہوں نے اسے تَفْعَلَةٌ کے وزن پر نہیں بنایا کیونکہ یہ وزن کلام عرب میں قلیل الوجود ہے۔

(و ز ر)

اَلْوَزَرُ: پہاڑ میں جائے پناہ۔قرآن پاک میں ہے۔﴿کَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ﴾ (۷۵۔۱۱) بے شک کہیں پناہ نہیں اس روز پروردگار ہی کے پاس جانا ہے۔
اَلْوِزْرُ: کے معنی بارگراں کے ہیں اور یہ معنی وَزَرٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ میں جائے پناہ کے ہیں اور جس طرح مجازاً اس کے معنی بوجھ کے آتے ہیں اسی طرح وِزْرٌ بمعنی گناہ بھی آتا ہے (اسی کی جمع اَوْزَارٌ ہے) جیسے فرمایا:۔
﴿لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (۱۶۔۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی (اٹھائیں گے) جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿وَ لَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹۔۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی۔
اور دوسروں کا بوجھ اٹھانے کی حقیقت کی طرف آنحضرتؐ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا [1] (۴۴)
((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّنْقَصَ مِنْ اَجْرِهِ شَیْءٌ وَّمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَیِّئَةً كَانَ لَهُ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا)) کہ جس شخص نے اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بدوں اس کے کہ ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی ہو اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے۔

[1] الحدیث ذکرہ مسلم فی صحیحہ من حدیث جریر بن عبداللہ والغزالی فی الحیاء (راجع تخریج العراقی ۲/۷۳) اشارَ الیہ القبتی فی غریبہ، انظر القرطبی (۱۳/۳۳۱) والبحر (۷/۱۴۴)۔

تو یہاں ان لوگوں کے اجر یا بوجھ سے ان کی مثل اجر یا بوجھ مراد ہے اور آیت کریمہ میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔اور آیت:۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (۶۔۱۶۵) اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ مَحْمُوْل عَنْهُ یعنی وہ دوسرا اس گناہ سے بری ہو جائے (لہٰذا ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے) اور آیت۔

﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ﴾ (۹۴۔۲) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے مراد وہ لغزشیں ہیں جو جاہلی معاشرہ کے رواج کے مطابق قبل از نبوت آنحضرت ﷺ سے سرزد ہوئی تھیں۔

اَلْـوَزِیْـرُ: وہ ہے جو امیر کا بوجھ اور اس کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہو۔اور اس کے عہدہ کو وِزَارَۃٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ﴾ (۲۰۔۲۹) اور میرے گھر والوں میں سے (ایک کو) میرا وزیر (یعنی مددگار) مقرر فرما۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ: اس کا مفرد وِزْرٌ ہے اور اس سے مراد اسلحہ جنگ ہے [1] اور آیت کریمہ:۔

﴿وَلٰـكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ﴾ (۲۰۔۸۷) بلکہ ہم لوگوں کے زیوروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔میں زیورات کے بوجھ مراد ہیں۔

اَلْمُوَازَرَۃُ: (مفاعلۃ) کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنے کے ہیں اور وَازَرْتُ فُلَانًا مُوَازَرَۃً کے معنی ہیں: میں نے اس کی مدد کی۔

(و ز ع)

وَزَعْتُهُ عَنْ كَذَا کے معنی کسی آدمی کو کسی سے کام سے روک دینا کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَحُشِرَ لِسُلَیْمَانَ جُنُوْدُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۲۷۔۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع کیے گئے اور وہ قسم وار کیے گئے تھے۔

تو یُوْزَعُوْنَ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عساکر باوجود کثیر التعداد اور متفاوت ہونے کے غیر مرتب اور منتشر نہیں تھے۔جیسا کہ عام طور پر کثیر التعداد افواج کا حال ہوتا ہے بلکہ وہ نظم وضبط میں تھے کہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے اور بعض نے یُوْزَعُوْنَ کے یہ معنی کیے ہیں کہ لشکر کا اگلا حصہ پچھلے کی خاطر رکا رہتا تھا۔اور آیت:۔

﴿وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ﴾ (۴۱۔۱۹) جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے تو ترتیب وار کر لیے جائیں گے۔

میں یُوْزَعُوْنَ سے انہیں عقوبت کے طور پر روک لینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ﴾ (۲۲۔۲۱) اور ان کے مارنے ٹھوکنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہونگے۔

محاورہ ہے [2] (۱۴۴) لَابُدَّ لِلسُّلْطَانِ مِنْ وَّزَعَةٍ کہ سلطان کے لیے محافظ دستہ یا کارندوں کا ہونا ضروری ہے۔

---

[1] وفی القرآن: ﴿حتیٰ تضع الحرب اوزارها﴾ (۴۷: ۴)

[2] قاله الحسن البصری لما ولی القضاء وازدحم الناس علیه فاذوه انظر المیدانی (رقم ۲۱۰۴) واللسان (وزع) والنهایة (۴/۲۲۱) والفائق (۲/۳۰۵) (۳/۱۶۰) وفی حدیث ابی بکر و قد شکی الیه بعض عماله لیقتص منه فقال: انا اقید من وزعة الله (الفائق ۲/۳۸۴ وغریب ابی عبید ۳/۲۲۸)

جولوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔
بعض نے کہا ہے کہ وُزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے کے ہیں اور محاورہ ہے۔
اَوْزَعَ اللّٰهُ فُلَانًا: اللہ تعالیٰ نے فلاں کو شکر گزاری کا الہام کیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بھی اَوْزَعَ بِالشَّیْءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کا شیدائی بننے کے ہیں تو اَوْزَعَ اللّٰهُ فُلَانًا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی شکر گزاری کا شیدائی بنادیا اور رَجُلٌ وَزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے والا کے ہیں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:۔
﴿رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ﴾ (۲۷۔۱۹) اے پروردگار! مجھے توفیق عنایت کرکہ جو احسان تو نے مجھ پر کیے ہیں ان کا شکر کروں۔ میں بعض نے اَوْزِعْنِیْ کے معنی اَلْهِمْنِیْ کیے ہیں یعنی مجھے شکر گزاری کا الہام کر مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ مجھے شکر گزاری کا اس قدر شیفتہ بنا کہ میں اپنے نفس کو تیری ناشکری سے روک لوں۔

(و ز ن)

اَلْوَزْنُ: (تولنا) کے معنی کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں اور یہ وَزَنْتُہٗ (ض) وَزْنًا وَزِنَةً کا مصدر ہے اور عرف عام میں وزن اس مقدار خاص کو کہتے ہیں جو ترازو یا قپان کے ذریعہ معین کی جاتی ہے اور آیت کریمہ:۔
﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ﴾ (۱۷۔۳۵) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ اور نیز آیت کریمہ۔
﴿وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵۔۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔ میں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اپنے تمام اقوال و افعال میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھو۔ اور آیت:۔
﴿وَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ﴾ (۱۵۔۱۹) اور اس میں ہر ایک سنجیدہ چیز اگائی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ شیء موزون سے سونا، چاندی وغیرہ معدنیات مراد ہیں۔ اور بعض نے ہر قسم کی موجودات مراد لی ہیں اور آیت کے معنی یہ کیے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ جس طرح کہ آیت:۔
﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴۔۴۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔
سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔
﴿وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ﴾ (۷۔۸) اور اس روز (اعمال کا) تلنا برحق ہے۔ میں بتایا ہے۔
کہ قیامت کے دن نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حساب لیا جائے گا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ (۲۱۔۴۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے۔
قرآن پاک میں (قیامت کے روز اعمال کی ترازو کے لیے) بعض مقامات پر میزان لفظ واحد آیا ہے۔ اور بعض جگہوں پر موازین لفظ جمع۔ پس جہاں کہیں لفظ واحد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہاں محاسب (حساب لینے والا) کا اعتبار کیا ہے۔ کہ وہ اکیلی ذات الٰہی ہے اور جہاں لفظ جمع آیا ہے۔ وہاں لوگوں کا اعتبار کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے اعمال کی ترازو الگ الگ ہوگی۔

وَزَنْتُ لِفُلَانٍ وَوَزَنْتُهٗ کے معنی کسی کو تول کر دینے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ (۸۳۔۳) اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔

محاورہ ہے۔

قَامَ مِيْزَانُ النَّهَارِ: یعنی دوپہر ہوگئی۔

(و س و س)

اَلْوَسْوَسَةُ: اس برے خیال کو کہتے ہیں۔جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور اصل میں یہ وَسْوَاسٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زیور کی جھنکار یا ہلکی سی آہٹ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ﴾ (۲۰۔۱۲۰) تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۴۔۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اور وَسْوَاسٌ کے معنی شکاری کے پاؤں کی آہٹ کے بھی آتے ہیں۔

(و س ط)

وَسَطُ الشَّيْءِ: ہر چیز کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔اور اس کا استعمال کمیتہ متصلہ یعنی ایک جسم پر ہوتا ہے۔ جیسے وَسَطُهٗ صُلْبٌ (اس کا درمیان سخت ہے)۔

ضَرَبْتُهٗ وَسَطَ رَأْسِهٖ: لیکن وَسْطٌ (بالسکون) کیت منفصلہ پر بولا جاتا ہے۔یعنی دو چیزوں کے درمیان فاصل کو وَسْطٌ کہا جاتا ہے۔جیسے وَسْطُ الْقَوْمِ كَذَا کہ وہ لوگوں کے درمیان فاصل ہے۔

نیز اَلْوَسَطُ: (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو یعنی معتدل جو افراط و تفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔مثلاً جود کہ بخل اور اسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عَدْلٌ۔ نَصَفَةٌ سَوَاءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے مثلاً جو شخص اپنی قوم میں بلحاظ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجہ کا ہو اس کے متعلق "هٰذَا أَوْسَطُهُمْ حَسْبًا" کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں (امت مسلمہ کے متعلق) فرمایا۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (۲۔۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا۔ اسی طرح آیت:۔

﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ﴾ (۶۰۔۲۰) ایک جوان جواُن میں فرزانہ تھا بولا۔

میں بھی اوسط کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔اور کبھی [۳] کنایۃً رذیل چیز پر بھی بولا جاتا ہے۔جسے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ وَسَطٌ مِّنَ الرِّجَالِ کہ فلاں کم درجے کا آدمی ہے یعنی درجہ خیر سے گرا ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (۲۔۲۳۸) مسلمانو! سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی) عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ وسطی سے مراد صلوۃ ظہر ہے کیونکہ وہ دن کے درمیانی حصہ میں ادا کی جاتی ہے اور بعض اس

سے صلوۃ مغرب مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ تعداد رکعات کے لحاظ سے ثنائی اور رباعی نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض نے صلوۃ فجر مراد لی ہے کیونکہ وہ دن اور رات کی نمازوں کے درمیان میں ہے جیسا کہ دوسری آیت فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷۔۷۸) (اے محمد ﷺ) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر) عصر، مغرب عشاء کی نمازیں اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو۔

اور صلوۃ وسطیٰ کو خاص کر الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح کا وقت سستی اور غفلت کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اٹھنے کے لیے نیند کی لذت کو چھوڑنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ❶ (۱۴۵)

اور جو لوگ اس سے صلوۃ عصر مراد لیتے ہیں۔ ❷ جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے ایک حدیث میں بھی مروی ہے تو وہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ سے یہ بیان کرتے ہیں کہ عصر کا وقت عوام کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے اس لیے نماز میں سستی ہو جاتی ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان کے اول یا آخر میں فرصت کا وقت مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زجرا فرمایا: ❸ (۱۴۶) ((مَنْ فَاتَتْہُ صَلٰوۃُ الْعَصْرِ فَکَاَنَّمَا وُتِرَاَھْلُہٗ وَمَالُہٗ)) کہ جس نے عصر کی نماز ضائع کر دی گویا اس نے اپنے اہل وعیال اور مال کو برباد کر دیا۔

(و س ع)

اَلسَّعَۃُ کے معنی کشادگی کے ہیں اور یہ امکنہ، حالت اور فعل جیسے قدرت، جود وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وسعت مکانی کے متعلق فرمایا:۔

﴿اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ﴾ (۲۹۔۵۶) میری زمین فراخ ہے۔

﴿اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً﴾ (۴۔۹۷) کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا۔

اور وسعت حالت کے متعلق فرمایا:۔

﴿لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَۃٍ مِّنْ سَعَتِہٖ﴾ (۶۵۔۷) صاحب وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے ﴿عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ﴾ (۲۔۲۳۶) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق...... اَلْوُسْعُ: اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (۲۔۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ میں تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا انسان کو مکلّف بناتا ہے۔ ان کا ثمرہ وسعت یعنی وہ جنت ہے جس

---

❶ انظر کنز العمال (۷/۴۹۰) (ابو الشیخ فی کتاب الاذان عن ابی محذورۃ) وعن بلال۔

❷ کما ھو مروی عن الحسن وعلی و ابن مسعود وابن عباس وخلق کثیر الحدیث الذی اشار الیہ المؤلف فی ذالک فقد رواہ مسلم عن حدیث علیؓ فی قصہ یوم الْاَحْزَابِ۔ شغلونا عن الصلوۃ الوسطی صلوۃ العصر ملاء اللہ بیوتھم نارًا۔ وحدیث مصحف عائشۃ وحفصۃ مشھور فی ھذہ المسئلہ رواہ مالک وابوداود (روح المعانی ص۱۳۵ ج۲)

❸ متفق علیہ من حدیث ابن عمر انظر الکافی لابن حجر (۱۸۸) و ۱۵۱ رقم (۴۱۵) وکنز العمال (۷/۲۷۱۔۲۷۳)۔

کی پہنائی ارض وسما ہے ❶ جیسا کہ اس کی تائید میں دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۲۔۱۵۸) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

اور آیت:۔

﴿وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۲۰۔۹۸) اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے احاطہ علمی کا بیان ہے۔ جیسے دوسری جگہ اس مفہوم کو:۔ ﴿اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۵۔۱۲) خدا اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے، سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (۳۔۷۳) اور خدا کشائش والا اور علم والا ہے۔

اور نیز آیت کریمہ:۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا﴾ (۴۔۱۳۰) اور خدا بڑی کشائش اور حکمت والا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کا بلحاظ علم، قدرت، رحمت وفضل کے وسیع ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۔۸۱) میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۷۔۱۵۶) اور جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت۔

﴿وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ (۵۱۔۴۷) اور ہم کو سب مقدور ہے، میں اللہ تعالیٰ کی اس وسعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَلَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

میں بیان کیا جاتا ہے (یعنی خلق وہدایت کے فیضان سے وہ ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے)

وَسِعَ الشَّيْءُ اِتَّسَعَ کے معنی کسی چیز کے فراخ ہونا کے ہیں اور اَلْوُسْعُ کے معنی تونگری اور طاقت کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ مشہور ہے۔ هُوَ يُنْفِقُ عَلٰى قَدْرِ وُسْعِهٖ کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔

اَوْسَعَ فُلَانٌ: وہ غنی اور صاحب وسعت ہوگیا۔ فَرَسٌ وَسَاعُ الْخَطْوِ: وہ گھوڑا جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا نہایت تیزی سے دوڑے۔ ❷

(و س ق)

اَلْوَسَقُ کے معنی متفرق چیزوں کو یکجا اکٹھا کرنے کے ہیں چنانچہ وَسَقْتُ (ض) اَلشَّيْءَ کے معنی ہیں: میں نے اس شے کے متفرق اجزاء کو اکٹھا کیا اور بوجھ کی معین مقدار۔ مثلاً ایک اونٹ کے بار کو بھی وَسَقٌ کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وسق ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔ اسی سے اَوْسَقْتُ الْبَعِيْرَ (افعال) ہے جس کے معنی اونٹ پر بوجھ لادنے کے ہیں۔

نَاقَةٌ وَاسِقٌ: حاملہ اونٹنی۔ اس کی جمع مَوَاسِيْقُ آتی

❶ كما في آية (۵۷۔۲۱)

❷ وصدرة القطوف وقد مر في (ق ط ف) وفي المثل قد يبلغ القطوف الوساع انظر الميداني (رقم ۲۸۴۴)۔

ہے۔
وَسَّقْتُ الْحِنْطَةَ: میں نے گیہوں کا ایک وسق بھرا۔
وَسَقَتِ الْعَيْنُ الْمَاءَ: آنکھ پانی سے بھرگئی۔ مشہور محاورہ ہے۔
لَا اَفْعَلُهٗ مَا وَسَقَتْ عَيْنِيْ الْمَاءَ: کہ جب تک میری آنکھ میں پانی ہے (یعنی زندگی بھر) یہ کام نہیں کروں گا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾ (۸۴۔۱۷) اور رات کی اور جن چیزوں کو اکٹھا کر لیتی ہے۔ ان کی۔
بعض نے کہا ہے کہ ما وسق سے مراد رات کی تاریکی ہے جبکہ پوری طرح چھا جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ماوسق سے طوارق (رات میں واقع ہونے والے حوادث) مراد ہیں۔
اَلْوَسِيْقَةُ: اونٹوں کے گلہ کو کہتے ہیں جیسے رُفْقَةٌ کے معنی انسانوں کی جماعت کے ہیں۔
اَلْاِتِّسَاقُ کے معنی کسی چیز کے اجزاء کے مجتمع اور (پورے طور پر) اکٹھا ہو جانا کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ﴾ (۸۴۔۱۸) اور چاند کی جب وہ کامل ہو جائے۔

(و س ل)

اَلْوَسِيْلَةُ کے معنی کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے ہیں۔ چنانچہ معنی رغبت کو متضمن ہونے کی وجہ سے یہ وَصِيْلَةٌ سے اخص ہے۔ ﴿وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ (۵۔۳۵) اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو۔
درحقیقت توسل الی اللہ، علم و عبادت اور مکارم شریعت کی بجا آوری سے طریق الٰہی کی محافظت کرنے کا نام ہے اور یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والے کو وَاسِلٌ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے علاوہ تَوَسُّلٌ کے معنی چوری کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَخَذَ فُلَانٌ اِبِلَ فُلَانٍ تَوَسُّلًا: اس نے فلاں کے اونٹ چوری کر لیے۔

(و س م)

اَلْوَسْمُ: (ض) کے معنی نشان اور داغ لگانے کے ہیں اور سِمَةٌ علامت اور نشان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
وَسَمْتُ الشَّيْءَ وَسْمًا: میں نے اس پر نشان لگایا۔
قرآن پاک میں ہے:۔
﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ (۶۸۔۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔
یعنی اس کی ناک پر ایسا نشان لگائیں گے جس سے اس کی پہچان ہو سکے گی۔ جیسا کہ مومنین کے متعلق فرمایا:۔
﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ (۸۳۔۲۴) تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔
﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔
﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (۲۔۲۷۳) اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو گے۔
اَلتَّوَسُّمُ کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکانت، فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے حدیث

میں ہے۔ [1] (۱۴۷)

((اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))

یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو وہ خدا تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے نور توفیق سے دیکھتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ﴾ (۱۵۔۷۵) بے شک اس (قصے) میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں۔

یعنی ان کے قصہ میں عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بہت سے نشانات ہیں۔

اَلْوَسْمِیُّ: موسم بہار کی ابتدائی بارش کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے زمین پر گھاس کے نشانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور تَوَسَّمْتُ جس کے معنی علامت سے پہچان لینے کے ہیں۔

دراصل یہ لفظ وسمی گھاس کے تلاش کر لینے پر بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسِيْمُ الْوَجْهِ: فلاں خوب رو ہے۔

هُوَ ذُوْ وَسَامَةٍ: وہ صاحب جمال ہے۔

فُلَانَةٌ ذَاتُ مِيْسَمٍ: فلاں عورت صاحب حسن و جمال ہے۔

فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَيْرِ: اس کے چہرہ سے خیر ٹپکتی ہے۔

قَوْمٌ وَسَامٌ: خوبصورت لوگ۔

مَوْسِمُ الْحَاجِّ: حجاج کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی جمع مَوَاسِمُ ہے اور وَسَّمُوْا کے معنی موسم میں حاضر ہونے کے ہیں۔

جیسا کہ عَرَّفُوْا وَحَصَّبُوْا وَعَيَّدُوْا کے معنی عرفہ، محصّب اور عید گاہ میں جمع ہونے کے ہیں اور جس جگہ پر حجاج کنکر پھینکتے ہیں اسے مُحَصَّبٌ کہا جاتا ہے۔

(و س ن)

اَلْوَسْنُ وَالسِّنَةُ کے معنی غفلت یا اونگھ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ (۲۔۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

رَجُلٌ وَسْنَانٌ: اونگھنے والا مرد۔

تَوَسَّنَ الْمَرْاَةَ: سوئی ہوئی عورت سے مجامعت کرنا۔

وَسِنَ وَاَسِنَ کے معنی کنویں کی بدبو سے بے ہوش ہونیکے ہیں۔ مصنف کی رائے یہ ہے کہ یہ معنی نیند کی مناسبت سے لیا گیا ہے نہ کہ غشیان یعنی ڈھانپنے کے معنی سے۔

(و س ی)

مُوْسٰی: حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

جو لوگ اسے عربی مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ موسی الحدید سے منقول ہے جس کے معنی استرے..... کے ہیں اور اَوْسَيْتُ رَاْسَهٗ کے معنی ہیں: میں نے استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔

(و ش ی)

وَشَيْتُ (ض) اَلشَّیْءَ وَشْيًا کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف اور رنگ لگانا کے ہیں اسی سے وَشْيَةٌ بروزن فَعْلَةٌ ہے جس کے معنی کسی ایسے رنگ کا نشان یا داغ کے ہیں (جو سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو۔) قرآن پاک میں ہے:۔

---

[1] رواہ الترمذی والبخاری فی تاریخہ من حدیث ابی سعید (راجع لطرقہ کنز العمال (۱۱/۸۵) واللآلی المصنوعۃ (۳۲۹۔ ۳۳۰) و تخریج العراقی علی الاحیاء (۲/۳۹۴)۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ (۲۔۷۱) وہ بالکل صحیح سالم ہو اور اس پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

اور ثَوْرٌ مُوَشَّى الْقَوَائِمِ: اس بیل کو کہتے ہیں جس کی ٹانگوں پر اس کے سارے بدن کے رنگ کے خلاف نشانات ہوں۔ (یہ تو اس کے اصل معنی ہیں) اس کے بعد یہ لفظ کلام میں رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ مَوَّهَهُ وَزَخْرَفَهُ کی طرح کہا جاتا ہے۔

وَشَّى فُلَانٌ كَلَامَهُ: اس نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی اور اس میں تمویہ سے کام لیا اور اسی سے اَلْوَاشِيْ ہے جس کے معنی چغلخوری کے ہیں۔

(و ص ب)

اَلْوَصَبُ کے معنی دائمی مرض کے ہیں اور وَصِبَ فُلَانٌ (س) فَهُوَ وَصِبٌ کے معنی دائمی مرض میں مبتلا ہونے کے ہیں۔

اَوْصَبَهُ كَذَا فَهُوَ يَتَوَصَّبُ: اسے فلاں بیماری لگ گئی چنانچہ وہ بیمار پڑ گیا۔ جیسے اَوْجَعَهُ فَهُوَ يَتَوَجَّعُ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ﴾ (۳۷۔۹) اور ان کے لیے عذاب دائمی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ ﴿وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا﴾ (۱۶۔۵۲) اور اسی کی عبادت لازم ہے۔

میں اس شخص کے لیے وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔ کہ ایسے شخص کو دائمی عذاب کی سزا ملے گی۔

اور یہاں دین بمعنی طاعت ہے اور واصب بمعنی دائم اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں ہمیشہ اسی کی عبادت کرنا چاہیے جیسا کہ فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (۶۶۔۶) جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔

وَصَبَ وُصُوْبًا: کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا۔

وَصَبَ الدَّيْنُ: قرض کا واجب اور لازم ہو جانا۔

مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ: دور تک پھیلا ہوا بیابان جس کی انتہا نہ ہو۔

(و ص د)

اَلْوَصِيْدُ: اصل میں اس احاطہ کو کہتے ہیں جو مویشی کے لیے پہاڑ میں بنا لیا جائے اور آیت: (۱۸۔۱۸) میں اس کے معنی غار کا صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں اسی سے اَوْصَدْتُ الْبَابَ وَاَصَدْتُهُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے دروازے کو بند کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ﴾ (۹۰۔۲۰) یہ لوگ آگ میں بند کر دیئے جائیں گے۔

ایک قرات مُؤْصَدَةٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور آیت کے معنی ہیں: اس آگ کو ان پر بند کر دیا جائے گا۔

اَلْوَصِيْدُ (ایضا) پودا، جس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں۔

(و ص ف)

اَلْوَصْفُ کے معنی کسی چیز کا حلیہ اور نعت بیان کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی وہ حالت جو حلیہ اور نعت کے لحاظ سے ہوتی ہے اسے صِفَةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ زِنَةٌ ہر چیز کی مقدار پر بولا جاتا ہے۔

اور وصف چونکہ غلط اور صحیح دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ﴾ (۱۶۔۱۱۶) اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آئے مت کہہ دیا کرو۔ میں تنبیہ کی ہے وہ (یہود) جو کچھ بیان کرتے ہیں سراسر جھوٹ ہے اسی طرح آیت: ﴿رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ﴾ (۳۷۔۱۸۰) یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں..... صاحب عزت ہے، میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف نہیں ہے جن کا کہ اکثر لوگ اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل اور ان باتوں سے جو کفار اس کی طرف منسوب کرتے ہیں بہت بلند اور دور ہے اسی لیے فرمایا: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (۳۰۔۲۷) اور اس کی شان نہایت بلند ہے۔

اِتَّصَفَ الشَّیْءُ: کے معنی ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں یہ چیز اس صفت کے ساتھ متصف ہو سکتی ہے۔

وَصَفَ الْبَعِیْرُ وُصُوْفًا اونٹ کا عمدہ رفتار ہونا۔

اَلْوَصِیْفُ: خادم اور خادمہ کو وَصِیْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے محاورہ ہے۔

وَصُفَتِ الْجَارِیَةُ: کنیز خدمت کے لائق ہوگئی۔

(و ص ل)

اَلْاِتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطر دائرہ کی دونوں طرفیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی ضد انفصال آتی ہے۔ اور وَصْلٌ کے معنی ملانے کے ہیں اور یہ اسم عین اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وَصَلْتُ فُلَانًا صلہ رحمی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ (۲۔۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کیے ڈالتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ﴾ (۴۔۹۰) مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو۔ میں یَصِلُوْنَ کے معنی منتسب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے:۔

فُلَانٌ مُتَّصِلٌ بِفُلَانٍ: یعنی فلاں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ﴾ (۲۸۔۵۱) اور ہم پے در پے ان لوگوں کے پاس (ہدایت کی) باتیں بھیجتے رہے ہیں۔

میں وَصَّلْنَا الْقَوْلَ کے معنی متواتر بات کہنے کے ہیں یعنی ہم..... ان کے پاس لگا تار اپنا کلام بھیجتے رہے ہیں۔

مُوْصِلُ الْبَعِیْرِ: اونٹ کا مفصل، جوڑ جو دو اعضا کے درمیان ہوتا ہے مثلاً ران اور عجز کے درمیان کا جوڑ اور آیت۔

﴿وَّ لَا وَصِیْلَةٍ﴾ (۵۔۱۰۳) اور نہ وصیلہ ہے۔

میں وصیلہ سے مراد وہ بکری ہے جو (دو دو مادینہ بچے دینے کے بعد ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے)۔ (جاہلیت میں) اس مادہ کی وجہ سے نر بچہ کو بھی ذبحہ نہ کرتے اور کہتے کہ وَصَلَتْ اَخَاهَا کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَلْوَصِیْلَةُ کے معنی آبادی اور زرخیزی کے ہیں اور وسیع زمین کو بھی اَلْوَصِیْلَةٌ کہا

جاتا ہے۔

محاورہ ہے: ھٰذَا وَصَلُ ھٰذَا۔

یعنی (یہ اس کی مثل ہے) یہ اس کا صلہ ہے۔

(و ص ی)

اَلْوَصِیَّةُ: واقعہ پیش آنے سے قبل کسی کو ناصحانہ انداز میں ہدایت کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یہ اَرْضٌ وَاصِیَةٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیوستہ گیاہ یعنی باہم گتھی ہوئی گھاس والی زمین کے ہیں اور اَوْصَاهُ وَوَصَّاهُ کے معنی کسی کو وصیت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَوَصّٰی بِھَآ اِبْرٰھِیْمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ﴾ (۲۔۱۳۲) اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام نے بھی۔

ایک قرأت میں اَوْصٰی ہے۔

نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ﴾ (۲۹۔۸) اور ہم نے انسان کو حکم دیا۔

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِھَآ اَوْدَیْنٍ﴾ (۴۔۱۰) وصیت کی تعمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے

﴿حِیْنَ الْوَصِیَّةِ اثْنٰنِ﴾: (۵۔۱۰۶) کہ وصیت کے وقت... تم دو مرد۔

وَصّٰی: (ایضاً) کسی کی فضیلت بیان کرنا۔

تَوَاصَی الْقَوْمُ: ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (۱۰۳۔۳) اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

﴿اَتَوَاصَوْا بِہٖ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ﴾ (۵۱۔۵۳) کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟ بلکہ یہ شریر لوگ ہیں۔

(و ض ع)

اَلْوَضْعُ: (نیچے رکھ دینا) یہ حَطٌّ سے عام ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّاَکْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ﴾ (۸۸۔۱۴) اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوئے۔

اور اسی سے مَوْضِعٌ ہے جس کی جمع مَوَاضِعُ آتی ہے جس کے معنی ہیں جگہیں یا موقعے۔ جیسے فرمایا۔

﴿یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ﴾ (۵۔۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو ان کے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔

اور وَضْعٌ کا لفظ وضع حمل اور بوجھ اتارنے کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے وَضَعَتِ الْمَرْءَةُ الْحَمْلَ وَضْعًا: عورت نے بچہ جنا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْھَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُھَآ اُنْثٰی وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ﴾ (۳۔۳۶) جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور جو کچھ ان کے ہاں پیدا ہوا تھا خدا کو

---

(1) قاله ابو عبيدة فى مجازه (۱/۱۳۶) وجرى عليه ابن قتيبة (۱۳۳) ولكن نقد عليه النحاس فى الناسخ والمنسوخ (۱۰۹) والطبرى فى تفسير (۹۵/۲۰) راجع البحر (۳/۳۱۵) والقرطبى (۵/۳۰۸)۔

(2) وهى قراءة نافع وابن عمر من اهل المدينة والباقون وصّى (تفسير ابى حيان ۱/۳۹۸) وقد ذكر ابو حيان فى هذا الموضع ان مصحف اهل المدينة مخالف لمصحف اهل العراق فى اثنى عشر حرفا فراجعه ۱۲۔

خوب معلوم تھا تو کہنے لگیں کہ پروردگار میرے تو لڑکی ہی ہوئی ہے۔

لیکن اَلْوُضْعُ وَالتُّضَعُ کے معنی عورت کے آخر طہر میں حاملہ ہونے کے ہیں۔وَضَعْتُ الْحِمْلَ: میں نے بوجھ اتار دیا اور اتارے ہوئے بوجھ کو مَوْضُوْعٌ کہا جاتا ہے۔اور آیت:۔

﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ﴾ (۵۵۔۱۰) اور اسی نے خلقت کے لیے زمین بچھائی۔

میں وضع سے مراد خلق وایجاد (یعنی پیدا کرنا) ہے۔اور وَضْعُ الْبَیْتِ کے معنی مکان بنانے کے آتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ (۳۔۹۵) پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَوُضِعَ الْکِتٰبُ فَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ﴾ (۱۸۔۴۹) اور عملوں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی۔

میں وضع کتاب سے قیامت کے دن اعمال کے دفتر کھولنا اور ان کی جزا دینا مراد ہے۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا﴾ (۱۸۔۱۳) اور قیامت کے دن وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔

وَضَعَتِ (ف) الدَّابَّةُ فِیْ سَیْرِهَا: سواری تیز رفتاری سے چلی۔اور تیز رفتار سواری کو حَسَنَةُ الْمَوْضُوْعِ (وَحَسَنُ الْمَوَاضِعِ کہا جاتا ہے۔

اَوْضَعْتُهَا میں نے اسے دوڑایا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَّلَااَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ﴾ (۹۔۴۷) اور تم میں (فساد ڈلوانے کی غرض) سے دوڑے دوڑے پھرتے۔اور وضع کا لفظ سَیْرٌ یعنی چلنے کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اَلْقٰی بَاعَهٗ وَثِقْلَهٗ: میں قیام کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلْوَضِیْعَةُ: (رعایت) کی جو اصل قیمت میں کی جائے۔

وَضَعَ الرَّجُلُ فِیْ تِجَارَتِهٖ: اس نے تجارت میں نقصان اٹھایا۔

رَجُلٌ وَضِیْعٌ: نہایت خسیس آدمی۔(باب کَرُمَ) یہ رَفِیْعٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بلند قدر کے ہیں۔

(و ض ن)

اَلْوَضْنُ: اس کے اصل معنی زرہ بافی کے ہیں۔اور استعارۃً کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ بننے پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ﴾ (۵۶۔۱۵) (جواہرات) سے مرصع پلنگوں پر......

اور اسی سے وَضِیْنُ النَّاقَةِ ہے جس کے معنی حزام یعنی پالان کسنے کی رسی کے ہیں۔اس کی جمع وُضُنٌ ہے۔

(و ط ء)

وَطُؤَالشَّیْءُ فَهُوَ وَطِیْءٌ: کے معنی کسی چیز کے پامال ہونے کے ہیں۔

اَلْوِطَاءُ: ہر اس شے کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے روندی جائے جیسے فراش وغیرہ۔

وَطَأْتُ لَهٗ بِفِرَاشِهٖ کسی کے لیے فراش بچھانا۔

وَطَأْتُهٗ (ف) بِرِجْلِیْ وَطْأً وَّ وَطْأَةً وَّ وِطَاءَةً وَّتَوَطَّأْتُهٗ کسی چیز کو پاؤں سے روندنا قرآن پاک میں

ہے:۔﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً﴾ (۷۳۔۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔

ایک قرأت میں وِطَاءً ہے۔اور حدیث میں ہے۔

❶ (۱۴۸)((اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰی مُضَرَ))

اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر یعنی انہیں ذلیل کر۔

وَطِئَ امْرَءَتَهٗ عورت سے ہمبستری کرنا۔یہ لفظ اگرچہ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے جماع کے معنی میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن عرف میں بمنزلہ لفظ صریح کے ہے۔

اَلْمُوَاطَاةُ: اس کے معنی موافقت کے آتے ہیں۔اور اصل معنی دوسرے کے نشان قدم پر اپنا قدم رکھنے کے ہیں۔چنانچہ آیت اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ کے آخر میں فرمایا ﴿لِّیُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ (۹۔۳۷) تاکہ ادب کے مہینوں کو، جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔گنتی پوری کرلیں۔

(و ع د)

اَلْوَعْدُ: (وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر (یعنی اچھے اور برے (وعدہ) دونوں پر بولا جاتا ہے۔اور اس معنی میں وَعَدَ یَعِدُ وَعْدًا وَّمَوْعِدًا وَ مِیْعَادًا استعمال ہوتا ہے۔مگر اَلْوَعِیْدُ کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لیے بولا جاتا ہے۔اور اس معنی میں باب اَوْعَدَ (تَوَعَّدَ) استعمال ہوتا ہے۔اور وَاعَدْتُهٗ (مُفَاعَلَة) وَتَوَاعَدْنَا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیمان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں وَعْدٌ کا لفظ خیر و شر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے (چنانچہ وعدہ خیر کے متعلق فرمایا)

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ......﴾ (۱۴۔۲۲) جو وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔﴿اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا﴾ (۲۸۔۶۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً﴾ (۴۸۔۲۰) خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا:۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۴۔۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ان سے خدا کا وعدہ ہے۔الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں وَعَدَ کا لفظ خیر کے متعلق استعمال ہوا ہے اور وعدہ شر یعنی وعید کے معنی میں فرمایا۔

﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ (۲۲۔۴۷) اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔

کفار چونکہ آنحضرت ﷺ سے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے تھے اس لیے لَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ میں وَعْدٌ بمعنی وَعِیْدٌ ہوگا نیز فرمایا:۔

﴿قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ اَلنَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (۲۲۔۷۲) کہدو کہ میں تم کو اس سے بھی بری چیز بتاؤں؟ وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔﴿اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ﴾ (۱۱۔۸۱) ان کے عذاب کے وعدے کا وقت صبح ہے۔

❶ متفق علیه من حديث ابى هريرة رضى الله عنه فى قصة القنوت فى الصبح و مسند احمد (۱۲/ ۲۵۰) بتحقيق احمد شاكر وابن سعد فى طبقاته راجع تخريج الكشاف (۱۱۱۔۱۱۲)

﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ﴾ (۷۔۷) تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو اسے لے آؤ۔

﴿وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ﴾ (۱۰۔۴۶) اگر ہم کوئی عذاب جس کا ان لوگوں سے وعدہ کرتے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے (نازل) کریں۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ (۱۴۔۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے۔اس کے خلاف کرے گا۔

﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ (۲۔۲۶۸) (اور دیکھنا) شیطان (کا کہانہ ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔

اور کبھی وعــد کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوتا ہے۔یعنی بیک وقت خیر و شر دونوں معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ (۱۰۔۵۵) اور یہ بھی سن رکھو کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

﴿اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ﴾ (۶۔۱۳۵) کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے۔ وہ وقوع میں آنے والا ہے۔

میں قیامت کے روز جزائے اعمال کا وعدہ مراد ہے کہ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو نتائج بھی خوشگوار ہوں گے اگر برے ہوں گے تو نتائج بھی تباہ کن ہوں گے۔

اَلْمَوْعِدُ وَالْمِيْعَادُ: یہ دونوں لفظ کبھی مصدر اور کبھی اسم ظرف بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ (اور اسم ظرف ہونے کی صورت میں ان سے وعدہ کا زمانہ یا مقدم وعدہ مراد ہے) چنانچہ فرمایا:

﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا﴾ (۲۰۔۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو۔ ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا﴾ (۱۸۔۴۸) لیکن تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے قیامت کا کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا۔ ﴿مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ﴾ (۲۰۔۵۹) (موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ) آپ کے لیے یوم زینت کا وعدہ ہے۔

﴿بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا﴾ (۱۸۔۵۸) مگر ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ اس کے عذاب سے کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ ﴿قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ﴾ (۳۴۔۳۰) کہدو کہ تم سے ایک دن کا وعدہ ہے۔

﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾ (۸۔۴۲) اگر تم جنگ کے لیے آپس میں قرارداد کر لیتے تو وقت معین پر جمع ہونے میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی...... اور لفظ مُوَاعَدَة (مفاعلة) کے متعلق فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ (۲۔۲۳۵) مگر پوشیدہ طور پر ان سے قول و قرار نہ کرنا۔

﴿وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً﴾ (۷۔۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (۲۔۱۵۱) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کی میعاد مقرر کی۔

ان دونوں آیتوں میں ثَـلَاثِيْنَ وَاَرْبَعِيْنَ وَاعَدْنَا کی ظرف نہیں ہیں۔ بلکہ مفعول بہ ہیں اور ان کا مضاف محذوف ہے یعنی اِنْقَضَاءَ ثَلَاثِيْنَ وَ اَرْبَعِيْنَ یعنی تیس اور چالیس رات کے گزرنے کا وعدہ کیا۔ اور آیت۔

﴿وَ وٰعَدْنٰکُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ﴾ (۲۰۔۸۰) اور (تورات دینے کے لیے) تم سے کوہ طور کی داہنی طرف مقرر کی۔

میں بھی یہی تاویل ہوگی یعنی یہاں جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ ظرف نہیں ہے بلکہ مفعول بہ ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے۔ یعنی اِتْیَانَ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ۔ اور آیت۔

﴿وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ﴾ (۸۵۔۲) اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے۔ میں یوم موعود سے قیامت مراد ہے جیسا کہ آیت۔ ﴿مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۰) (سب) ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔ میں میقات یوم معلوم قیامت کا دن مراد ہے۔

اور اَلْاِیْعَادُ (افعال) بمعنی تہدید کے متعلق فرمایا:۔ ﴿وَ لَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (۷۔۸۶) اور ہر راستے پر مت بیٹھا کرو کہ تم ڈراتے اور راہ خدا سے روکتے ہو۔

اور لفظ وعید کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ﴾ (۱۴۔۱۴) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہوئے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کرے۔

﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾ (۵۰۔۴۵) پس جو ہمارے عذاب کی وعید سے ڈرے۔ اس کو قرآن پاک سے نصیحت کرتے رہو۔

﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ﴾ (۵۰۔۲۸) ہمارے حضور میں ردّوکد نہ کرو۔ ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔

اور محاورہ ہے۔

رَأَیْتُ اَرْضَهُمْ وَاعِدَةً: یعنی ان کی زمین سے اچھی پیداوار کی امید ہے۔

یَوْمٌ وَاعِدٌ: بہت گرم یا بہت سرد دن۔

وَعِیْدُ الْفَحْلِ: حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑبڑانا اور آیت:۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۴۔۵۵) اور جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، میں لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ ......الخ وعدہ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ (۴۔۱۰) خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے۔ کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔

میں جملہ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ: وصیت کی تفسیر واقع ہوا ہے۔ اور آیت۔

﴿وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ﴾ (۸۔۷) اس وقت کو یاد کرو جب تم سے خدا وعدہ کرتا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا مسخر ہو جائے گا۔ میں اَنَّهَا لَکُمْ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ سے بدل ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے۔ وَعَدَکُمُ اللّٰهُ اَنَّ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ لَکُمْ یعنی یا تو قافلہ ہاتھ لگے گا اور

یا لشکر سے مقابلہ ہوگا اور مال غنیمت حاصل ہوگا۔

اَلْعِدَۃ: یہ وَعْدٌ سے اسم ہے اور اس کی جمع عِدَاتٌ آتی ہے اور وعد کا لفظ مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی اور وَعَدْتُ دو مفعول کو چاہتا ہے......اور دوسرا مفعول ظرف زمان، مکان یا کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ جیسے۔

وَعَدْتُ زَیْدًا یَوْمَ الْجُمُعَۃِ اَوْ مَکَانَ کَذَا اَوْ اَنْ اَفْعَلَ کَذَا وغیرہ۔

پس آیت وَاعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً میں وَاعَدْنَا کا دوسرا مفعول اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً نہیں ہوسکتا کیونکہ وعدہ کا وقوع اربعین کے اندر نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ہوا ہے لہٰذا اس کا دوسرا مفعول اِنْقِضَاءَ الْاَرْبَعِیْنَ یا تَمَامِ الْاَرْبَعِیْنَ ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر کلام صحیح نہیں ہوسکتا۔

(و ع ظ)

اَلْوَعْظُ: کے معنی ایسی زجر و توبیخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں ''خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اور عِظَۃٌ و مَوْعِظَۃٌ دونوں اسم ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ﴾ (۱۶۔۹۰) تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ تاکہ تم یاد رکھو۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ﴾ (۳۴۔۴۶) کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔

﴿ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ﴾ (۵۸۔۳) مومنو! اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔

﴿قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ (۱۰۔۵۷) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ پہنچی۔

﴿وَ جَآءَکَ فِیْ ھٰذِہِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَۃٌ وَّ ذِکْرٰی﴾ (۱۱۔۱۲۰) اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور نصیحت اور عبرت ہے۔

﴿وَ ھُدًی وَّ مَوْعِظَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ (۳۔۱۳۸) اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

﴿وَ کَتَبْنَا لَہٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَۃً وَّ تَفْصِیْلًا﴾ (۷۔۱۴۵) اور ہم نے (توراۃ کی) تختیوں میں ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

﴿فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَ عِظْھُمْ﴾ (۴۔۶۳) تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو۔

(و ع ی)

اَلْوَعْیُ: (ض) کے معنی (عموماً) بات وغیرہ کو یاد کر لینا کے ہوتے ہیں۔ جیسے وَعَیْتُہٗ فِیْ نَفْسِیْ: میں نے اسے یاد کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لِنَجْعَلَھَا لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّ تَعِیَھَآ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ﴾ (۶۹۔۱۲) تاکہ اس کو تمہارے لیے یادگار بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

اَلْاِیْعَاءُ: (افعال) کے معنی ساز و سامان کو وعاء (ظرف) میں محفوظ کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

جَمَعَ فَاَوْعٰی: مال جمع کیا اور بند رکھا (۷۰۔۱۸) شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۴۴۹) وَالشَّرُّ اَخْبَثُ مَا اَوْعَیْتَ مِنْ زَادِ

---

[1] قالہ عبید بن الابرص وصدرہ: والخیر وان طال الزمان بہ۔ والبیت فی التاج واللسان (وعی) وذیل کتاب الابدال لابی الطیب اللغوی (۱: ۹۳) والکامل للمبرد (۹۷) وفی مجمع الامثال للمیدانی رقم ۱۹۰۴ وزعموا ان ھذا البیت قالتہ الجن وقیل بل ھو لعبید بن الابرص وادرج فی العقد الثمین (۱۸۴) فی ملحقات دیوان طرفۃ۔

اور شر سب سے برا زاد ہے جو انسان جمع کرتا ہے۔

اَلْوِعَاءُ: کے معنی بوری یا تھیلا کے ہیں جس میں دوسری چیزیں اکٹھی کر کے رکھی جائیں اس کی جمع اَوْعِیَۃٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبَدَأَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاءِ اَخِيْهِ﴾ (۱۲۔۷۶) پھر یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اپنے بھائی کے شلیتے میں سے اس کو نکال لیا۔

وَلَاوَعْیَ عَنْ کَذَا: اس کے بغیر طبیعت کو سکون نہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

مَالِیْ عَنْہُ وَعْیٌ: مجھے اس سے چارہ کار نہیں۔

وَعَی الْجَرْحُ یَعْیِ وَعْیًا: زخم میں مِدَّۃ یعنی گندہ مواد بھر گیا۔

وَعَی الْعَظْمُ: ہڈی کا (ٹوٹنے کے بعد) مضبوط ہو جانا اور قوت کو جمع کر لینا۔

اَلْوَاعِیَۃُ: (ایضاً) چیخنے والی۔

سَمِعْتُ وَعَی الْقَوْمِ: میں نے قوم کی چیخ و پکار کی آواز سنی۔

(و ف د)

وَفَدَ الْقَوْمُ (ض) وِفَادَۃً: لوگوں کا وفد بن کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا اور وفد یا وفود ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اسی سے وَافِدٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سب سے آگے نکل جانے والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (۱۹۔۸۵) جس روز ہم پرہیزگاروں کو خدا کے سامنے بطور مہمان جمع کریں گے۔

(و ف ر)

اَلْوَفْرُ: مال کثیر کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی کمی نہ ہو اور وَفَرْتُہٗ (س) وَفْرًا وَوُفُوْرًا وَفِرَۃً کے معنی کسی چیز کو پورا کرنے کے ہیں۔ اور وَفَّرْتُہٗ (تفعیل) تکثیر کے لیے آیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا﴾ (۱۷۔۶۳) تو تم سب کی سزا جہنم ہے (اور وہ) پوری پوری سزا دے)

وَفَرْتُ عِرْضَہٗ: میں نے اس کی عزت کو کم نہیں کیا۔

اَرْضٌ فِیْ نَبْتِھَا وَفْرَۃٌ: وہ زمین جس میں پوری طرح گھاس جمی ہوئی ہو۔

رَأَیْتُ فُلَانًا ذَا وِفَارَۃٍ: میں نے فلاں کو عقل و مروت میں کامل پایا۔

اَلْوَافِرُ: علم عروض کی اصطلاح میں ایک بحر کا نام ہے (جس میں مفاعلتن چھ بار آتا ہے)

(و ف ض)

اَلْاِیْفَاض: (افعال) کے معنی تیز روی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی کسی کے وَفْضَۃ کو اٹھا کر اس طرح تیزی سے بھاگنے کے ہیں کہ اس سے خشخشہ کی آواز پیدا ہو اور وَفْضَۃٌ چمڑی کے ترکش کو کہتے ہیں اس کی جمع وِفَاضٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ﴾ جیسے شکاری شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں۔ (۷۰۔۶۳) بعض نے

کہا ہے کہ اَوْفَاضٌ تیز رو جماعتوں کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

لَقِیْتُهٗ عَلٰی اَوْفَاضٍ: میں اسے عجلت میں ملا۔اس کا واحد وَفْضٌ ہے جس کے معنی جلدی کے ہیں۔

(و ف ق)

اَلْوَفْقُ: دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونے کو کہتے ہیں قرآن نے اعمال کے نتائج کو......

﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ (۲۶-۷۸)(یہ) بدلہ ہے پورا پورا۔ کہا ہے اور یہ وَافَقْتُ فُلَانًا وَ وَافَقْتُ الْاَمْرَ (میں نے اسکی موافقت کی یا اسے پالیا) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔

اَلْاِتِّفَاقُ: انسان کے کسی کام کا تقدیر کے مطابق ہو جانا اور یہ خیر وشر دونوں میں بولا جاتا ہے جیسے اِتَّفَقَ لِفُلَانٍ خَیْرٌ: فلاں کو اتفاق سے خیر حاصل ہوگئی۔

اِتَّفَقَ لَهٗ شَرٌّ اسے اتفاق سے برائی پہنچی یہی مفہوم توفیق کا ہے (مگر یہ متعدی ہے) اور عرف میں یہ خیر کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے (یعنی اسباب کا مقصد کے مطابق مہیا کر دینا) اور شر میں استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (۸۸-۱۱) اور مجھے توفیق کا ملنا خدا ہی کے فضل سے ہے۔ محاورہ ہے: اَتَانَا لِتِیْفَاقِ الْهِلَالِ وَمِیْفَاقِهٖ: میرے پاس روئیت ہلال کے موقع پر آیا۔

(و ف ی)

اَلْوَافِیْ: مکمل اور پوری چیز کو کہتے ہیں جیسے: دِرْهَمٌ وَافٍ، کَیْلٌ وَافٍ وَغَیْرُ ذٰلِكَ اَوْفَیْتُ الْکَیْلَ وَالْوَزْنَ: میں نے ناپ یا تول کر پورا پورا دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ﴾ (۳۵-۱۷) اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو۔

وَفٰی بِعَهْدِهٖ (ض) وَفَاءً وَّاَوْفٰی: اس نے عہد و پیمان پورا کیا۔یعنی اس کی خلاف ورزی نہیں کی اس کی ضد غَدْرٌ ہے۔جو نقض عہد اور عدم وفا کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔لیکن قرآن پاک میں اَوْفٰی (افعال) استعمال ہوا ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ﴾ (۴۰-۲) اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا اور میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔

﴿وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ (۹۱-۱۶) اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو۔﴿بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰی﴾ (۷۶-۳) ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور خدا سے ڈرے۔

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ (۱۷۶-۳) اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں۔

﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ﴾ (۷-۷۶) یہ لوگ نذریں پوری کرتے ہیں۔﴿وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (۱۱۱-۹) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔ اور آیت۔

﴿وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی﴾ (۳۷-۵۳) اور ابراہیم علیہ السلام کی جنہوں نے (حق طاعت و رسالت) پورا کیا۔ میں وفّی سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان مطالبات کو پورا کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر ڈالی جن کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۹۔۱۱۱) خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لیے بہشت تیار کی ہے۔
میں ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال صرف کیا تو دوسری طرف لڑکے کی قربانی پیش کرنے میں بھی کچھ دریغ نہ کیا حالانکہ وہ انہیں ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اور وفیٰ سے جن باتوں کے پورا کرنے پر متنبہ کیا ہے وہ وہی ہیں جن کی طرف کہ آیت:۔
﴿وَاِذِابْتَلٰی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (۲۔۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ میں ارشاد فرمایا ہے۔
اور تَوْفِیَةُ الشَّیْءِ کے معنی بلاکسی قسم کی کمی کے پورا پورا دے دینے کے ہیں۔اور اِسْتِیْفَاء کے معنی (اپنا حق) پورا لے لینے کے۔قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (۳۔۲۵) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔
﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ﴾ (۳۔۱۵۸) اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔
﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۹۔۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔
﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا﴾ (۱۱۔۱۵) جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں۔
﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ﴾ (۸۔۶۰) اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔
﴿فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ﴾ (۲۴۔۳۹) تو اس سے اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔
اور کبھی تَوَفّٰی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا﴾ (۳۹۔۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔
﴿وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ﴾ (۶۔۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے۔
﴿قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (۳۲۔۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔
﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ﴾ (۱۶۔۷۰) اور خدا ہی نے تم کو پیدا کیا پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔
﴿الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۱۶۔۲۸) (ان کا حال یہ ہے کہ جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے لگتے ہیں۔
﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ (۶۔۶۱) (تو) ہمارے فرشتے ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔
﴿اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ﴾ (۱۳۔۴۰) یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔
﴿وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ (۳۔۱۹۳) اور ہم کو دنیا سے

نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔
﴿وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ﴾ (۷۔۱۲۶) اور ہمیں ماریو تو مسلمان ہی ماریو۔
﴿تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا﴾ (۱۲۔۱۰۱) مجھے اپنی اطاعت کی حالت میں اٹھائیو۔
اور آیت:
﴿یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ﴾ (۳۔۵۵) عیسیٰ علیہ السلام! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ توفی بمعنی موت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مدارج کو بلند کرنا مراد ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ نے توفی کے معنی موت کیے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فوت کر کے پھر زندہ کر دیا تھا۔

(و ق ب)

اَلْوَقْبُ کے اصل معنی چٹان، پتھر وغیرہ میں گڑھا کے ہیں۔ اور وَقَبَ (ض) کے معنی گڑھے وغیرہ میں داخل ہو کر غائب ہو جانے کے ہیں اسی سے وَقَبَتِ الشَّمْسُ ہے جس کے معنی آفتاب غروب ہونے کے ہیں۔ اور وَقَبَ الظَّلَامَ کے معنی تاریکی چھا گئی اور اشیاء اس کے اندر غائب ہو گئیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳۔۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔
اَلْوَقِیْبُ: گھوڑے کے ذکر کے ایستادہ ہونے کی آواز۔
وَقَبَهٗ وَقْبَةً: اس نے اسے اکٹھا کر لیا۔

(و ق ت)

اَلْوَقْتُ: کسی کام کے لیے مقررہ زمانہ کی آخری حد کو کہتے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ معین عرصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔
وَقَّتُّ کَذَا: میں نے اس کے لیے اتنا عرصہ مقرر کیا۔ اور ہر وہ چیز جس کے لیے عرصہ متعین کر دیا جائے موقوت کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (۴۔۱۰۳) بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔
﴿وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ﴾ (۷۷۔۱۱) اور جب پیغمبر اکٹھے کیے جائیں گے۔
اَلْمِیْقَاتُ: کسی شے کے مقررہ وقت یا اس وعدہ کے ہیں جس کے لیے کوئی وقت متعین کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا﴾ (۷۸۔۱۷) بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے۔
﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ﴾ (۴۴۔۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن...... اٹھنے کا وقت ہے۔ ﴿اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (۵۶۔۵۰) سب ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔
اور کبھی مِیْقَاتٌ کا لفظ کسی کام کے لیے مقرر کردہ مقام پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے مَوَاقِیْتُ الْحَجِّ یعنی مواضع (جو احرام باندھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔)

(و ق د)

وَقَدَتِ النَّارُ (ض) وُقُوْدًا وَوَقْدًا: آگ روشن ہونا۔
اَلْوَقُوْدُ: ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جائے۔ اور آگ کے شعلہ کو بھی وَقُوْدٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ﴾ (۲۔۲۴) جس کا

ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ (۳۔۱۰) اور یہ لوگ آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اَلنَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (۸۵۔۵) آگ کی خندقیں جن میں ایندھن جھونک رکھا تھا۔ اِسْتَوْقَدْتُ النَّارَ: آگ جلانے کی تیاری کرنا اور کبھی بمعنی اَوْقَدْتُهَا میں نے آگ جلائی بھی آجاتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲۔۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ روشن کی۔ ﴿وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ﴾ (۱۳۔۱۷) اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔

﴿فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ﴾ (۲۸۔۳۸) تو ہامان! میرے لیے (گارے کو) آگ لگا (کر اینٹیں پکا) دو۔ ﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ﴾ (۱۰۴۔۶) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ اور اسی سے وَقْدَةُ الصَّیْفِ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرمی کی شدت کے ہیں۔

اِتَّقَدَ فُلَانٌ غَضَبًا فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا اور استعارہ کے طور پر وَقَدَ وَاتَّقَدَ: لڑائی بھڑکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اَلْاِشْتِعَال وَالْاِسْتِعَارَةُ وغیرہ الفاظ اس معنی میں بطور مجاز استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (۵۔۶۴) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں تو خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

اور کبھی استعارہ کے طور پر چمک دمک کے معنی میں آتا ہے۔ اِتَّقَدَ الْجَوْهَرُ وَالذَّهَبُ: جوہر یا سونے کا چمکنا۔

(و ق ذ)

اَلْوَقْذُ: (ض) کے معنی شدت ضرب کے ہیں اور جس جانور کو لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اسے موقوذۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَالْمَوْقُوْذَةُ﴾ (۵۔۳) اور جو چوٹ لگ کر مر جائے۔

(و ق ر)

اَلْوَقْرُ: کان میں بھاری پن۔ وَقِرَتْ اُذُنُهٗ تَقِرُ وَتَوْقَرُ: کان میں ثقل ہونا) یعنی باب ضَرَبَ وَفَتَحَ سے آتا ہے۔ لیکن ابوزید نے اسے سَمِعَ سے مانا ہے۔ اور اس سے مَوْقُوْرَةٌ صفت مفعولی...... ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَفِیْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ (۶۔۳۵) اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا۔ نیز وِقْرٌ کا لفظ گدھے یا خچر کے ایک بوجھ پر بھی بولا جاتا ہے۔ ❶ جیسا کہ وَسْقٌ کا لفظ اونٹ کے بوجھ کے ساتھ مخصوص ہے اور اَوْقَرْتُهٗ کے معنی بوجھ لادنے کے ہیں۔ نَخْلَةٌ مُوْقِرَةٌ وَمُوْقَرَةٌ: پھل سے لدی ہوئی کھجور۔

اَلْوَقَارُ۔ کے معنی سنجیدگی اور حلم کے ہیں۔ ❷ باوقار اور حلیم آدمی کو وَقُوْرٌ، وَقَارٌ اور مُتَوَقِّرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾ (۷۱۔۱۳) تم کو کیا ہوا کہ تم خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

فُلَانٌ ذُوْ وَقْرَةٍ: فلاں بردبار ہے۔ اور آیت:۔

---

❶ وفی القرآن ﴿فالحاملات وقرا﴾

❷ وقد وقر الرجل فهو وقور

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ (۳۲۔۳۳) اور اپنے گھروں میں پڑی رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَرْنَ، وَقَار بمعنی سکون سے ہے اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ وَقَرْتُ، اَقِرُ، وَقْرًا سے ہے۔ جس کے معنی بیٹھ رہنا کے ہیں۔ ❶

اَلْوَقِيْرُ: بھیڑ بکری کا بہت بڑا ریوڑ۔

یہ بھی وقار سے ہے گویا کثرت تعداد اور سست رفتاری کی وجہ سے اس میں وقار یعنی سکون پایا جاتا ہے۔

(و ق ع)

اَلْوُقُوْعُ: کے معنی کسی چیز کے ثابت ہونے اور نیچے گرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَقَعَ الطَّيْرُ وُقُوْعًا: پرندے نیچے گر پڑا۔

اَلْوَاقِعَةُ: اس واقعہ کو کہتے ہیں جس میں سختی ہو۔ اور قرآن پاک میں اس مادہ سے جس قدر مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر عذاب اور شدائد کے واقع ہونے کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔ ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (۵۶۔۲۹) جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں۔

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾ (۷۰۔۲) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا۔ جو نازل ہو کر رہے گا۔

﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ (۶۹۔۱۵) تو اس روز ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی۔

اور کسی قول کے وقوع سے اس کے متضمن (مفہوم) کا واقع ہو جانا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا﴾ (۲۷۔۸۵) اور ان کے ظلم کے سبب ان کے حق میں وعدہ عذاب پورا ہو کر رہے گا۔

یعنی ان پر وہ عذاب اتر پڑا جس کا کہ ان کے ظلم کے سبب ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نیز فرمایا:۔ ﴿وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (۲۷۔۸۲) اور جب انکے بارے میں عذاب کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے۔

یعنی جب ان علاماتِ قیامت کا ظہور ہو جائے گا۔ جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

﴿قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ﴾ (۷۔۷۱) ہود علیہ السلام نے کہا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب کا نازل ہونا مقرر ہو چکا ہے۔

نیز فرمایا:۔

﴿اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ (۱۰۔۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہوگا۔ تب اس پر ایمان لاؤ گے۔

﴿فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۰) تو اس کا ثواب خدا کے ذمے ہو چکا۔

یہاں لفظ وقوع کا استعمال محض تو کید وجوب کے لیے ہے۔ (معنی اس کے بغیر ہی صحیح ہو سکتے تھے) جیسا کہ آیت

---

❶ وفی الروح (۶/۲۲)۔ قرء الاکثر وقِرن بکسر القاف من وقریقر وقارا اذا ثبت وسکن واصلہ وقرن فضُعِل به مافعل بعِدِ من وعد۔

﴿وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳۰۔ ۴۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

اور آیت:۔

﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰۔۱۰۳) اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔ میں حَقٌّ کا لفظ محض تو کید کے لیے استعمال ہوا ہے ورنہ یہ معنی علینا سے بھی مفہوم ہو سکتا تھا۔ اور آیت:۔

﴿فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴾ (۱۵۔۲۹) تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

میں قَعُوْا کا لفظ مبادرت اِلَى السُّجُوْدِ کے معنی کو ظاہر کرتا ہے۔

وَقَعَ الْمَطَرُ: بارش ہونا۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ: جن مقامات پر بارش برسی ہو۔ ❶

اَلْمُوَاقَعَةُ: باہم جنگ کرنا۔ نیز کنایہ کے طور پر اس کے معنی عورت سے مجامعت کے بھی آتے ہیں۔ اَلْاِیْقَاعُ: (افعال) واقع کرنا۔ سخت معرکہ قائم کرنا۔ اور کنایۃً وَقْعَةٌ کے معنی جنگ بھی آتے ہیں۔ (والجمع وقائع)

وَقْعُ الْحَدِيْدِ: لوہے کی آواز (تلواروں کے کھٹکھٹانے کی آواز) محاورہ ہے۔

وَقَعْتُ الْحَدِيْدَةَ (ف) وَقْعًا مِيْقَعَةً: یعنی سان پر تلوار وغیرہ کا تیز کرنا۔ نیز وقع کا لفظ سقوط شدید یعنی دھماکہ پر بھی بولا جاتا ہے اور اسی سے اَلْوَقِيْعَةُ (فی الانسان) ہے جس کے معنی کسی کی غیبت کرنے کے ہیں۔

اور اَلْحَافِرُ الْوَاقِعُ: اس گھوڑے کو کہتے ہیں۔ جس کے سم سنگستان میں چلنے سے گھس گئے ہوں۔

اَلْوَقِيْعَةُ: (ایضاً) وہ جگہ جہاں بارش کا پانی ٹھہر جاتا ہو (والجمع الوقائع) مَوْقِعٌ: پرند کا مستقر (ج مَوَاقِعُ)

اَلتَّوْقِيْعُ: سواری کی پیٹھ میں زخم کے نشان کو کہتے ہیں اسی طرح کتاب پر نشان لگانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے اَلتَّوْقِيْعُ کے معنی کسی چیز کا گمان کرنا بھی آتے ہیں۔

(و ق ف)

وَقَفْتُ الْقَوْمَ (ض) وَقْفًا (متعدی) لوگوں کو ٹھہرانا اور وَقَفُوْا۔ وُقُوْفًا (لازم) ٹھرنا۔

قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْؤُلُوْنَ﴾ (۳۷۔۲۴) اور ان کو ٹھہرائے رکھو کہ ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

اور اسی سے بطور استعارہ وَقَفْتُ الدَّارَ آتا ہے جس کے معنی مکان کو وقف کر دینے کے ہیں۔ نیز اَلْوَقْفُ کے معنی ہاتھی دانت کا کنگن بھی آتے ہیں اور حِمَارٌ مُوَقَّفٌ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کی کلائیوں پر کنگن جیسے سفید نشان ہوں جیسا کہ فرس مُحَجَّلٌ اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے۔ جس کے پاؤں میں حجل کی طرح سفیدی ہو۔

مَوْقِفُ الْاِنْسَانِ: انسان کے ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافَقَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے معاملہ کو اسی چیز پر روک دے جس پر کہ دوسرے نے روکا ہے۔ (ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا ہونا)

---

❶ وفی القرآن ﴿فلا اقسم بمواقع النجوم﴾ (۵۶۔۵) فالمراد من المواقع ھھنا المغارب کما جاء فی روایة ابن جریر عن قتادة وعند البعض نجوم القرآن راجع الروح (۱۳۲/۲۷) وقد مر البحث فی حرف النون۔

اَلْوَقِيفَةُ: بھگایا ہوا شکار جو شکاری کے تعاقب سے عاجز ہو کر ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اسے شکار کر لے۔

(و ق ی)

وَقَيْتُ الشَّيْءَ (ض) وِقَايَةً وَوِقَاءً کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ﴾ (۷۶۔۱۱) تو خدا ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ﴾ (۱۳۔۳۴) اور ان کو خدا کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہیں۔

﴿مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ﴾ (۱۳۔۳۷) تو خدا کے سامنے نہ کوئی تمہارا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔

﴿قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (۶۶۔۶) اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

اَلتَّقْوٰى: اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقوی ہے جو گناہ کا موجب ہو۔ اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ سے مروی ہے ❶ (۱۴۹) ((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَّالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَمَنْ وَّقَعَ حَوْلَ الْحِمٰى فَحَقِيْقٌ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ)) ''حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو شخص چراگاہ کے اردگرد چرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔'' (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (۷۔۳۵) جو شخص (ان پر ایمان لا کر) خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶۔۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (۳۹۔۷۳) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔

پھر تقوی کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لیے آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۲۔۲۸۱) اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ (لوگو) اپنے پروردگار سے ڈرو۔ (۳۱۔۳۳)

﴿وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ﴾ (۲۴۔۵۲) اور اس سے ڈرے گا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (۴۔۱) اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔ اور قطع مودت ارحام سے۔

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (۳۔۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا

---

❶ رواه النسائی ص(۲۰۳ ج۲) وسائر اصحاب السنن۔ ۱۲

کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقوی کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔ ❶

اِتَّقٰی فُلَانٌ بِکَذَا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْھِہٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ﴾ (۳۹۔۲۴) بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔

میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَتَغْشٰی وُجُوْھَھُمُ النَّارُ﴾ (۱۴۔۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

﴿یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ﴾ (۵۴۔۴۸) اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

(و ک ی)

اَلْوِکَاءُ کے معنی کسی چیز کا سر بند کے ہیں۔ ❷

اور کبھی وَکَاءٌ اس ظرف کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس میں کوئی چیز ڈال کر اس کا منہ باندھ دیا گیا ہو۔ اسی سے اَوْکَأْتُ فُلَانًا ہے جس کے معنی کسی کے لیے تکیہ لگا دینے کے ہیں۔

تَوَکَّأَ عَلَی الْعَصَا: اس نے عصا پر ٹیک لگائی اور اس سے قوت حاصل کی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿ھِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا﴾ (۲۰۔۱۸) (انہوں نے کہا) یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لگاتا ہوں۔

اور حدیث میں ہے ❸ (۱۵۰)

((کَانَ یُوْکِیْ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃِ)) (یعنی بالکل خاموش یا نہایت تیزی سے طواف کرتے تھے) اس کے معنی یہ ہیں کہ سعی سے ان کے مابین کو اس طرح پر کر دیتے تھے جیسا کہ مشکیزہ کو بھرنے کے بعد اس کا منہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ مشک کا منہ باندھنے کے لیے اَوْکَیْتُ السِّقَاءَ (یعنی یاء کے ساتھ) بولتے ہیں اور اوکات (ہمزہ کے ساتھ) اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

(و ک د)

وَکَّدْتُ وَاَکَّدْتُ (تفعیل) کے معنی کسی بات یا معاملہ کو محکم اور پختہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا﴾ (۱۶۔۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو۔

اور وہ تسمہ جس سے زین کے اگلے حصہ کو کس کر باندھ دیتے ہے اسے (بھی) تاکید یا توکید کہا جاتا ہے۔ اور اَلْوِکَادُ اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دودھ دوہتے

---

❶ وفی المطبوع ومن یخش اللّٰہ مصحف ۱۲

❷ وفی الحدیث: ان العین وکاء السہ فاذا نامت العینا ن استطلق الوکاء (الفائق ۲/۳۱۴)

❸ والحدیث فی الفائق (۲/۳۱۴) موقوف علی الزبیرؓ قال ابوعبید فی غریبہ (۸/۴) وھو عندی من امساك الکلام وفیہ تفسیر آخرانہ یروی عنہ قال کان یوکی مابین الصفا والمراوۃ سعیا فان کان ھذا محفوظا فوجھہ ان یملاء ما بینھما سعیًا لا یمشی علی ھینتہ فی شیء من ذالك شبہ بالسقاء وغیرہ' یملاء ثم یوکاء علیہ حیث انتھی امتلاء ھا وایضا انظر مجمع البحار الانوار (۳/۴۶۱۔)

وقت گائے (کی ٹانگیں) باندھ دیتے ہیں۔

خلیل نے کہا ہے کہ اَیْمَانٌ (یعنی قسموں) کی پختگی کے لیے اَکَّدْتُّ زیادہ مناسب ہے اور باقی اقوال کے متعلق وَکَّدْتُّ زیادہ صحیح ہے۔ لہٰذا عقد ایمان کے لیے اَکَّدْتُّ اور حلف وغیرہ کے لیے وَکَّدْتُ کہا جائے گا۔ اور وَکَّدَ وَکْــدَہٗ کے معنی کسی کی طرح قصد کرنے اور اس جیسے اخلاق اختیار کرنے کے ہیں۔

(و ک ز)

اَلْوَکْزُ: (س ض) کے معنی کچوکا لگانے، دھکا دینے اور مکا مارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی﴾ (۲۸۔۱۵) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو مکا مارا۔

(و ک ل)

اَلتَّوْکِیْلُ کے معنی کسی پر اعتماد کر کے اسے اپنا نائب مقرر کرنے کے ہیں اور وَکِیْلٌ فَعِیْلٌ (بمعنی مفعول) کے وزن پر ہے۔ قرآن میں پاک ہے:۔ ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا﴾ (۴۔۸۱) اور خدا ہی کافی کار ساز ہے۔ یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کار ساز ہے۔ یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دیجیے اور کار سازی کے لیے اسی کو کافی سمجھیے اور آیت کریمہ:۔

﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾ (۳۔۱۷۳) ہم کو خدا کافی ہے۔ اور وہ بہت اچھا کار ساز ہے۔

بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۳۹۔۴۱) اور اے پیغمبر! تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کے اعمال کے ذمہ دار اور محافظ نہیں ہو۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی﴾ (۸۸۔۲۲۔۲۳) تم ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس شخص نے منہ پھیرا۔۔۔۔۔۔

اور اسی معنی میں فرمایا:۔

﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَیْکُمْ بِوَکِیْلٍ﴾ (۶۔۶۶) کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا﴾ (۲۵۔۴۳) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ تو کیا تم اس پر نگہبان ہو سکتے ہو۔

﴿اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا﴾ (۴۔۱۰۹) اور کون ان کا وکیل بنے گا۔

یعنی ان کی طرف سے کون ذمہ داری اٹھائے گا۔

اَلتَّوَکُّلُ: (تفعل) اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔

اول (صلہ لام کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ لِفُلَانٍ یعنی میں فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ وَکَّلْتُہٗ فَتَوَکَّلَ لِیْ کے معنی ہیں: میں نے اسے وکیل مقرر کیا۔ تو اس نے میری طرف سے ذمہ داری قبول کر لی۔

(علیٰ[۲] کے ساتھ) تَوَکَّلْتُ عَلَیْہِ کے معنی کسی پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۱۴۔۱۱) اور خدا ہی پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے

﴿وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ﴾ (۶۵۔۳) اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ ﴿رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا﴾ (۶۰۔۴) اے

ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے۔
﴿وَ عَلَی اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا﴾ (۵۔۲۳) اور خدا ہی پر بھروسہ رکھو۔
﴿وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾ (۴۔۸۱) اور خدا پر بھروسہ رکھو اور خدا ہی کافی کارساز ہے
﴿تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (۱۱۔۱۲۳) اور اسی پر بھروسہ رکھو۔
﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ﴾ (۲۵۔۵۸) اور اس خدائے زندہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں مرے گا۔ وَاكَلَ فُلَانٌ: دوسرے شخص پر اعتماد کرکے اپنا کام ضائع کر دینا۔
تَوَاكَلَ الْقَوْمُ: لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنا شروع کر دیئے۔
رَجُلٌ وُكَلَةٌ۔ تُكَلَةٌ: وہ آدمی جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے۔
اَلْوَكَالُ: چوپایہ، جانور میں عیب کو کہتے ہیں یعنی یہ کہ وہ دوسرے جانور کے چلنے کے بغیر تنہا نہ چلے۔
بعض نے وکیل کی تفسیر کفیل کے ساتھ کی ہے کہ وکیل کفیل کو کہتے ہیں۔ مگر وکیل کفیل سے اعم ہے کیونکہ ہر کفیل وکیل بھی ہوتا ہے لیکن ہر وکیل کا کفیل ہونا ضروری نہیں ہے۔

(و ل ج)

اَلْوُلُوْجُ: (ض) کے معنی کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کے ہیں۔
﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۔۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت:
﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ (۲۲۔۶۱) (کہ خدا) رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔
میں اس نظام کائنات پر متنبہ کیا گیا ہے جو اس عالم میں رات کے دن میں اور دن کے رات میں داخل ہونے کی صورت میں قائم ہے اور مطالع شمسی کے حساب سے رونما ہوتا رہتا ہے۔
اَلْوَلِيْجَةُ: وہ شخص ہے جو دوسری قوم سے ہو لیکن تم اسے اپنا معتمد بنالو اور یہ فُلَانٌ وَلِيْجَةٌ فِی الْقَوْمِ کے محاورہ سے لیا گیا ہے یعنی وہ جو قوم میں داخل ہو جائے اور ان میں سے نہ ہو عام اس سے کہ انسان ہو یا کوئی دوسری چیز قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً﴾ (۹۔۱۶) اور انہوں نے خدا اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو ولی دوست نہیں بنایا۔
جیسا کہ مومنین کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔
﴿النَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ﴾ (۵۔۵۱) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔
رَجُلٌ خُرَجَةٌ وُلَجَةٌ: بہت زیادہ اندر اور باہر آنے جانے والا آدمی۔

(و ل د)

اَلْوَلَدُ: جو جنا گیا ہو۔ یہ لفظ واحد (مذکر مؤنث) چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ﴾ (۴۔۱۱) اور اگر اولاد نہ ہو۔
﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ﴾ (۶۔۱۰۱) اس کے اولاد کہاں سے ہو۔

اور وَلَــدٌ کا لفظ مثنیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (۱۲۔۲۱) یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔

﴿وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ﴾ (۹۰۔۳) اور باپ (یعنی آدم علیہ السلام) اور اس کی اولاد کی قسم۔

ابوالحسن کا قول ہے کہ وَلَدٌ کا لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے اور وُلْدٌ وَوِلْدٌ کے معنی اہل وعیال کے ہیں۔محاورہ ہے:۔وُلِدَ فُلَانٌ فلاں پیدا ہوا......قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ﴾ (۱۹۔۳۳) اور جس دن میں پیدا ہوا مجھ پر سلام (ورحمت) ہے۔

﴿وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ﴾ (۱۹۔۱۵) اور جس دن وہ پیدا ہوئے ان پر سلام ورحمت ہے۔

اور باپ کو والد اور ماں کو والدہ کہتے ہیں اور دونوں کو الدین کہا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ﴾ (۷۱۔۲۸) اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو معاف کرنا۔

اَلْــوَلِیْــدُ: عرف میں نوزائیدہ بچے پر بولا جاتا ہے۔اگرچہ نعمت کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے کو ولید کہنا صحیح ہے۔جیسا کہ تازہ چنے ہوئے پھل کو جَنِیٌّ کہا جاتا ہے۔پھر جب بچہ بڑا (یعنی بالغ) ہوجائے تو اسے وَلِیْدٌ نہیں کہتے ہیں۔

اس کی جمع وِلْدَانٌ ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا﴾ (۷۳۔۱۷) (اس دن سے (کیونکر بچو گے) جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔

اَلْوَلِیْدَةُ: عرف عام میں کنیزک کے ساتھ مختص ہے اور لِدَةٌ خاص کر تِرْبٌ (لنگوٹیا) کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔

فُــلَانٌ لِــدَةُ فُــلَانٍ وَتِرْبُهٗ: فلاں اس کا ہم عمر ہے یہ اصل میں وَلَدَةٌ تخفیف کے لیے واؤ ساقط ہوگئی ہے۔

تَوَلُّدُ الشَّیْءِ مِنَ الشَّیْءِ: ایک چیز کا دوسری سے پیدا ہونا۔

اور وَلَــدٌ کی جمع اَوْلَادٌ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۸۔۲۸) تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۶۴۔۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد انسان کے لیے آزمائش ہے۔مگر بعض اولاد دشمن ثابت ہوتی ہے پہلی آیت میں سب کو فتنہ قرار دیا ہے۔لیکن دوسری آیت میں بعض کو دشمن قرار دیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ وَلَدٌ کی جمع وُلْدٌ بھی آتی ہے جیسے اَسَدٌ کی جمع اُسْدٌ مگر ہوسکتا ہے کہ ولد کا لفظ مفرد ہو جیسے بُخْلٌ وَبَخَلٌ اور عَرَبٌ و عُرْبٌ کہ یہ دونوں مفرد ہیں...... مثل مشہور ہے۔

وُلْدُكِ مَنْ دَمّٰی عَقِبَیْكِ: یعنی تیرا لڑکا تو وہی ہے جو تیری ایڑیوں کو خون آلود کرے یعنی جو تمہارے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک قرأت میں ہے۔

﴿مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوُلْدُهٗ﴾ (۷۱۔۲۱) جن کو ان کے مال اور اولاد نے...... کچھ فائدہ نہیں دیا۔ [1]

(و ل ق)

اَلْــوَلْــقُ کے معنی تیز روی کے ہیں اور وَلَقَ الرَّجُلُ: (ض) کے معنی جھوٹ بولنا کے ہیں۔

---

[1] وفی القرآن وعلی المولود له (۲/۲۳۳) ای الاب او العصبة ۱۲۔

اور آیت:

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ﴾ (۲۴۔۱۵) جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے۔

میں ایک قرأت تَلِقُوْنَهٗ بھی ہے ❶ یعنی کذب بیانی کے لیے جلدی کرتے تھے اور یہ جَاءَتِ الْاِبِلُ تَلِقُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کے تیز رفتاری کے ساتھ آنے کے ہیں۔ اَلْاَوْلَقُ: جس کی عقل میں فتور ہو۔

رَجُلٌ مَالُوْقٌ وَمُؤْلَقٌ: پاگل اور دیوانہ آدمی۔ نَاقَةٌ وَلْقٰی: تیز رو اونٹنی۔

اَلْوَلِیْقَةُ: ایک قسم کا کھانا جو گھی سے تیار ہوتا ہے۔

اَلْوَلَقُ: نیزے کا بہت ہلکا زخم۔

(و ل ی)

اَلْوِلَاءُ وَالتَّوَالِیْ کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب اور یا بلحاظ دین اور دوستی یا نصرت کے ہو اور یا بلحاظ اعتقاد کے۔ اَلْوِلَایَةُ (بکسر الواؤ) کے معنی نصرت اور وَلَایَةٌ (بفتح الواؤ) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔ ❷ بعض نے کہا ہے کہ یہ دَلَالَة وَدِلَالَة کی طرح ہے یعنی اس میں دو لغت ہیں۔ اور اس کے اصل معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ وَالْمَوْلٰی: یہ دونوں کبھی اسم فاعل یعنی مُوَالٍ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اسم مفعول یعنی مُوَالًی کے معنی میں آتے ہیں۔ اور مومن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مولی اللہ کہنا ثابت نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَوْلَاهُمْ دونوں طرح بول سکتے ہیں۔ چنانچہ معنی اول یعنی اسم فاعل کے متعلق فرمایا:۔

﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۔۲۵۷) جو لوگ ایمان لائے ان کا دوست خدا ہے۔

﴿اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰهُ﴾ (۷۔۱۹۶) میرا مددگار تو خدا ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۳۔۶۸) اور خدا مومنوں کا کارساز ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴۷۔۱۱) یہ اس لیے کہ جو مومن ہیں ان کا خدا کارساز ہے۔

﴿نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ﴾ (۸۔۴۰) خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی﴾ (۲۲۔۷۸) اور خدا (کے دین کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست ہے۔ اور دوسرے معنی یعنی اسم مفعول کے متعلق فرمایا:۔ ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ (۶۲۔۶) کہہ دو کہ اے یہود! اگر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ﴾ (۶۶۔۴) اور پیغمبر (کی ایذا) پر باہم اعانت کرو گی تو خدا ان کے

---

❶ مروی عن عائشة والآیة فی شان حدیث الافك (اللسان ولق) والنوادر لابی مسهل (۱/۳۱۶) وابدال ابی الطیب (۲/۳۱۲) والمشكل للقبتی (۱۹) والقراءات الشاذه (۱۰۰) لابن خالویه ۱۲۔

❷ كذا قال ابو عبیدة فی مجازه (۱/۴۰۵) ومنه اخذ البخاری تفسیر هذه الكلمة (فتح الباری ۸/۳۲۹)

حامی اور دوست دار ہیں۔

﴿ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ (۶۔۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے اور آیت:

﴿وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ﴾ (۱۳۔۱۱) اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ میں وَالٍ کے معنیٰ وَلِیٌّ کے ہے۔ اور متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایۃ کی نفی کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (۵۔۵۱) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔

﴿لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ﴾ (۹۔۲۳) اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں) تو ان سے دوستی نہ رکھو۔

﴿وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ﴾ (۷۔۳) اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾ (۸۔۷۲) تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ (۶۰۔۱) مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

اور آیت:

﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کے آخر میں فرمایا۔

﴿وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ (۵۔۸۱) اور اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان لوگوں کو دوست نہ بناتے۔ اور کفار اور شیاطین کے درمیان دنیا میں موالات تو ثابت ہے۔ لیکن آخرت میں ان کے درمیان دوستی کی نفی کی گئی ہے چنانچہ دنیا میں ان کی باہم موالات کے متعلق فرمایا:۔

﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (۹۔۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی) ایک ہی طرح کے ہیں۔

نیز فرمایا:

﴿اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۷۔۳۰) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنالیا۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۷۔۲۷) ہم نے شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔

﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ﴾ (۴۔۷۶) سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔

پھر جس طرح ان کے درمیان باہم دوستی کو ثابت کیا ہے اسی طرح دنیا میں کفار پر شیاطین کو تسلط بھی دے رکھا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ﴾ (۱۶۔۱۰۰) اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔

اور آخرت میں ان کی باہم دوستی کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:۔

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا﴾ (۴۴۔۴۱) جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ﴾ (۲۹۔۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کرو گے۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا﴾ (۲۸۔۶۳) الایۃ۔اور جن لوگوں پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا۔وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔

اور تَوَلّٰی کا لفظ جب متعدی بِنَفْسِہٖ ہوتا ہے۔ تو معنی ولایۃ اور قریب ترین مواضع سے اس کے حصول کو چاہتا ہے۔چنانچہ اسی سے کہا جاتا ہے۔وَلَّيْتُ سَمْعِيْ كَذَا وَوَلَّيْتُ عَيْنِيْ كَذَا: میں نے اپنے کان یا آنکھ کو فلاں چیز پر لگایا۔

وَلَّيْتُ وَجْهِيْ كَذَا: میں اپنے چہرے کے ساتھ اس پر متوجہ ہوا۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (۲۔۱۴۴) سو ہم تمکو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو۔ چہرہ پھیرنے کا حکم دیں گے۔ اب اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔

اور جب بذریعہ عــن کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکور ہو یا مقدر، اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔چنانچہ تعدیہ بذاتہٖ کے متعلق فرمایا:۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (۵۔۵۱) اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا۔وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (۵۔۵۶) اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔اور تعدیہ بعن کے متعلق فرمایا:۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ (۳۔۶۳) تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو خدا مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

﴿اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ﴾ (۸۸۔۲۳) ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا﴾ (۳۔۶۴) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۴۷۔۳۸) اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (۶۴۔۱۲) اور اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ﴾ (۸۔۴۰)

اور اگر روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے۔
﴿فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾
(۳۔۸۲) تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ بدکردار ہیں اور تَوَلّٰی (بمعنی اعراض) کے معنی کبھی پیٹھ پھیرنا کے ہوتے ہیں اور کبھی توجہ نہ کرنے اور ترک قرب۔ کے چنانچہ فرمایا۔
﴿وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ﴾ (۸۔۲۰)
اور اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سنتے ہو۔
یعنی ان لوگوں کا کردار ادا نہ کرو جن کی صفت یہ تھی کہ:
﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾ (۷۱۔۷) اور کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے قول کی نقالی کرو۔ جن کے متعلق فرمایا:۔
﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ﴾ (۴۱۔۲۶) اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو۔ اور (جب پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو۔
محاورہ ہے۔
وَلَّاهُ دُبُرَهٗ: یعنی ہزیمت کھا کر بھاگ جانا۔ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (۳۔۱۱۱)
اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔
﴿وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ﴾ (۸۔۱۶) اور جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (۱۵۔۵) مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

میں ولی سے ایسا لڑکا مراد ہے جو اولیاء اللہ سے ہو۔ اور آیت
﴿خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ﴾ (۱۹۔۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ موالی سے عم زاد بھائی مراد ہیں۔ ❶ اور بعض نے دور کے رشتہ دار مراد لیے ہیں۔ ❷ اور آیت کریمہ:۔
﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ (۱۷۔۱۷) اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے کوئی اس کا مددگار نہیں ہے۔
میں مطلق ولی کی نفی نہیں ہے بلکہ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ کی نفی ہے یعنی اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے اس کا کوئی ولی نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندے اس کے اولیاء سے ہیں۔ لیکن وہ اولیا من الذل نہیں ہیں کہ کسی پر غلبہ حاصل کر کے لیے اللہ تعالیٰ کو ان سے امداد کی ضرورت ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ (۱۸۔۱۷) اور جس کو گمراہ کرے تو تم اس کے لیے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔
اَلْوَلْيُ: (ایضاً) وہ بارش جو رسمی یعنی موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد متصل برسے اسے وَلْيٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْمَوْلٰی کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
(۱) غلام کو آزاد کرنے والا (۲) آزاد شدہ غلام (۳) حلیف (۴) عم زاد بھائی (۵) پڑوسی۔

---

❶ هذا هو المروی عن الاصم ۱۲۔
❷ علی ماروی عن ابن عباس ومجاهد روح المعانی (ص۵۷ ج ۱٦)

اور ہر وہ شخص جو دوسرے کے معاملہ کا والی ہو وہ بھی اس کا مولا کہلاتا ہے۔

فُلَانٌ اَوْلٰی بِکَذَا: فلاں اس کا زیادہ حق دار ہے قرآن میں ہے:۔

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۳۳۔۶) پیغمبر مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾ (۳۔۶۸) ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں۔ جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا﴾ (۴۔۱۳۵) تو خدا ان کا خیرخواہ ہے۔ ﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ﴾ (۳۳۔۶) اور رشتہ دار آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت

﴿اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی﴾ (۷۵۔۳۴) افسوس ہے تم پر پھر افسوس ہے۔

میں بھی اولیٰ اسی محاورہ سے ماخوذ ہے اور اَوْلٰی لَكَ وَیلَكَ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ عذاب تیرے لیے اولیٰ ہے یعنی تو عذاب کا زیادہ سزاوار ہے۔ [1]

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعل متعدی بمعنی قرب کے ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَوْلٰی بمعنی اِنْزَجِرْ سے یعنی اب بھی باز آجا۔

وَلِیَ الشَّیْءُ الشَّیْءَ: دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بلا فصل ہونا

اَوْلَیْتُ الشَّیْءَ الشَّیْءَ: دوسری چیز کو پہلی چیز کے ساتھ ملانا۔

اَلْوَلَاءُ: میراث جو آزاد کردہ غلام سے حاصل ہوتی ہے اور احادیث میں وَلَاء کی بیع اور اسکے ہبہ سے منع کیا گیا ہے۔ [2] (۱۵۳)

اَلْمَوَالَاةُ کے معنی متابعت کے ہیں یعنی اشیاء کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا۔

(و ہ ب)

وَهَبْتُهُ (ف) هِبَةً وَمَوْهِبَةً وَّمَوْهِبًا: بلا عوض کوئی چیز دے دینا یا کچھ بخش دینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحَاقَ﴾ (۶۔۶۵) اور ہم نے ان کو اسحاق (اور یعقوب علیہما السلام) بخشے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ (۱۴۔۳۹) خدا کا شکر ہے۔ جس نے مجھے بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام بخشے۔

﴿اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا﴾ (۱۹۔۱۸) انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا یعنی فرشتہ ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

یہاں فرشتے کا لڑکا بخشنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا محض سبب ہونے کی بنا پر ہے (ورنہ حقیقت میں بخشنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے)

---

[1] قاله محی السنة وذهب صاحب غرة التنزيل انه من الولی بمعنی القرب ویفهم من كلام المحلی ان الاول اسم فعل بمعنی التهدید والثانی افعل التفضیل والصحیح مافی الفائق (۲/۳۱۶) انه كلمة لهف و وعید۔

[2] رواه الجماعة "من حدیث ابن عمرو بمعناه عند الحاكم وابن حبان والبیهقی وجمع ابونعیم طرقه فرواه عن خمسین رجلا من اصحاب عبدالله بن دینار عنه (النیل ۵/۷۴۔۷۵) وایضا كنزالعمال ۱۲۔

اور ایک قرأت میں لِیَھَبَ بھی ہے جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔تو یہ نسبت حقیقی ہوگی اور پہلی یعنی فرشتے کی طرف مجازی۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَوَھَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا﴾ (۲۶۔۲۱) خدا نے مجھ کو نبوت وعلم بخشا۔

﴿وَوَھَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمَانَ﴾ (۳۸۔۳۰) اور ہم نے داود کو سلیمان علیہما السلام عطا کیے۔

﴿وَوَھَبْنَا لَہٗ اَھْلَہٗ﴾ (۳۸۔۴۳) اور ہم نے ان کو اہل وعیال بخشے۔

﴿وَ وَھَبْنَا لَہٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاہُ ھٰرُوْنَ نَبِیًّا﴾ (۱۹۔۵۳) اور اپنی مہربانی سے ان کو ان کا بھائی ہارون پیغمبر عطا کیا۔

﴿فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ﴾ (۱۹۔۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

﴿اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا﴾ (۳۳۔۵۰) اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہتی ہے۔)

﴿رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ﴾ (۲۵۔۷۴) ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کو چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

﴿وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً﴾ (۳۔۸) ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔

﴿وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ﴾ (۳۸۔۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد کسی کا شایان نہ ہو۔

اور وَاھِبٌ وَوَھَّابٌ دونوں اسمائے حسنٰی سے ہیں۔ ❶ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو بقدر استحقاق بخشا ہے اس لیے خدا تعالیٰ کو اَلْوَھَّابُ کہا جاتا ہے۔اَلْاِتِّھَابُ: (افتعال) ہدیہ قبول کرنا۔حدیث ہے۔ ❷ (۱۵۴)

((لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ لَا اَتَّھِبَ اِلَّا مِنْ قُرَشِیٍّ اَوْ اَنْصَارِیٍّ اَوْ ثَقَفِیٍّ)) میں نے عزم کرلیا ہے کہ قرشی یا انصاری یا ثقفی قبیلہ کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

(و ھ ج)

اَلْوَھَجُ کے معنی گرمی کی حرارت یا روشنی کے ہیں اور یہی معنی وَھَجَانٌ کے ہیں۔چنانچہ آیت:۔

﴿وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّھَّاجًا﴾ (اور آفتاب کو) روشن چراغ بنایا۔

میں وَھَّاجٌ کے معنی (بافراط) روشنی کرنے والا کے ہیں۔

وَھَجَتِ النَّارُ: (ف ض س) آگ روشن ہونا۔

تَوَھَّجَ الْجَوْھَرُ: جوہر چمک اٹھا۔

(و ھ ن)

اَلْوَھْنُ کے معنی (کسی معاملہ میں جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ﴾ (۱۹۔۴) اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں۔

---

❶ انظر الآیۃ (۳۔۷)

❷ قطعۃ من الحدیث انظر الفائق (۳۱۷/۲) وفی النسائی عن ابی ھریرۃ: او دوسی۔

﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ﴾ (۳۔۱۴۶) تو جو مصیبتیں ان پر واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری۔

﴿وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ﴾ (۳۱۔۱۴) تکلیف پر تکلیف سہہ کر۔ یعنی جوں جوں پیٹ میں حمل کا بوجھ بڑھتا ہے کمزوری پر کمزوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (۳۔۱۳۸) اور دیکھو بددل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔

﴿وَلَا تَهِنُوْا فِى ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ﴾ (۴۔۱۰۴) اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا۔

﴿ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ﴾ (۸۔۱۸) (بات یہ ہے) کچھ شک نہیں کہ خدا کافروں کی تدبیر کو کمزور کر دینے والا ہے۔

(و ہ ی)

اَلْوَهْيُ: کے معنی چمڑے کے کپڑے یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا شگاف ہو جانا کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:۔

وَهَتْ عَزَالَى السَّحَابِ بِمَائِهَا: بادل کے دھانے پر پانی کے زور سے ڈھیلے ہو گئے۔ یعنی خوب بارش ہوئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ﴾ (۶۹۔۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اسکی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اور وَهِيَ الشَّيْءُ کے معنی بندش کا ڈھیلا پڑ جانا کے ہیں۔

(و ی)

وَيْ (اسم صورت) یہ کلمہ حسرت وندامت اور اظہار تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے۔

وَيْ لِعَبْدِاللّٰهِ: عبداللہ پر افسوس یا تعجب ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (۲۸۔۸۲) ہائے شامت! خدا ہی تو...... جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے۔

﴿وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (۲۸۔۸۲) ہائے خرابی! کافر نجات نہیں پا سکتے۔

بعض وَيْ لِزَيْدٍ (بصلہ لام) اور بعض وَيْ زَيْدٍ (بغیر لام) بولتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَيْكَ اصل میں وَيْلَكَ ہی ہے لام حذف ہونے کے بعد وَيْكَ رہ گیا ہے۔

(و ی ل)

اَلْوَيْلُ اصمعی نے کہا ہے کہ وَيْلٌ برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لیے ویس اور ترحم کے لئے ویح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وَيْلٌ جہنم میں ایک وادی کا نام ہے تو ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ اس کے وضعی معنی ہیں۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے متعلق قرآن پاک نے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس میں ضرور داخل ہوں گے۔[1] چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

---

[1] قال السيد الآلوسی (؟ وجاء فی الحديث بطريق صحيح الفاظا عن رسول الله الويل وادٍ فی جهنم الخ واطلاقه على ذالك اما حقيقه شرعية واما مجاز لغوى من اطلاق لفظ الحال على المحل ولا يمكن ان يكون حقيقة لغوية لان العرب تكلمت به فی نظمها ونثر هاقبل ان يجيئ القرآن ولم تطلقه على ذالك (۱/۲۷۴) فهذا يؤيد ما قال المولف انه معمول على المجاز ۱۲۔

﴿فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ وَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ﴾ (۲۔۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے، اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں ﴿وَ وَيۡلٌ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ﴾ (۱۴۔۲) اور کافروں کے لیے (سخت عذاب کی جگہ) خرابی ہے۔

﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ﴾ (۴۵۔۷) ہر جھوٹے گنہگار پر افسوس ہے۔

﴿فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ (۱۹۔۳۷) سو جو لوگ کافر ہوئے ان کو خرابی ہے۔

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ﴾ (۸۳۔۱) ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

﴿يٰوَيۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا﴾ (۳۶۔۵۲) (اے ہے) ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے (جگا) اٹھایا۔

﴿يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ﴾ (۲۱۔۱۴) ہائے شامت بے شک ہم ظالم تھے۔

﴿يٰوَيۡلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيۡنَ﴾ (۶۸۔۳۱) ہائے شامت ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔

❀❀❀

كِتَابُ الْهَاءِ

(ہ ب ط)

اَلْھُبُوْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کے قہراً یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں۔جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور اَلْھَبُوْط (بفتح الہاء) صیغہ صفت ہے یعنی نیچے گرنے والی چیز۔

ھَبَطَ: (فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے ھَبَطْتُ اَنَا: میں نیچے اتر پڑا اور ھَبَطْتُ غَیْرِیْ دوسرے کو نیچے اتار دیا۔قرآن میں ہے:۔

﴿وَ اِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (۲۔۷۴) اور بعض پتھر ایسے بھی (ہوتے ہیں) جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ ھَبوط انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ اِنْزَالٌ (الافعال) کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لیے استعمال کیا ہے جیسے ملائکہ، قرآن، بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر ہونے پر تنبیہ مقصود ہے۔وہاں لفظ ھُبُوْط استعمال کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَقُلْنَا اھْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۲۔۳۶) اور ہم نے حکم دیا کہ تم (سب اتر جاؤ تم ایک کے دشمن ایک۔

﴿فَاھْبِطْ مِنْھَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْھَا﴾ (۷۔۱۳) تو بہشت سے نیچے اتر کیونکہ تیری ہستی نہیں کہ تو بہشت میں رہ کر شیخی مارے۔

﴿اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (۲۔۶۱) (اچھا تو) کسی شہر میں اتر پڑو۔کہ جو مانگتے ہو (وہاں) تم کو ملے گا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے۔کیونکہ اس کے مابعد کی آیت۔

﴿وَ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۔۶۱) اور ان پر ذلت اور محتاجی لپس دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں آ گئے۔اس وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

﴿قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا﴾ (۲۔۳۸) ہم نے حکم دیا کہ تم سب (کے سب) یہاں سے اتر جاؤ۔محاورہ ہے۔ ھَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِیْلِ: بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی (لاغر کر دیا) اور اَلْھَبِیْطُ: اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں۔جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

(ہ ب و)

ھَبَا (ن) اَلْغُبَارُ کے معنی غبار کے اڑنے اور فضا میں پھیل جانے کے ہیں اور ھَبْوَةٌ (بروزن) غَبْرَةٌ اور ھَبَاءٌ کے معنی غبار یا ان کے باریک ذرّات کے ہیں جو کمرے کے اندر روشندان سے دھوپ کی کرنیں اندر

پڑنے سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (۲۵۔۲۳)اوران کو اس طرح رائیگاں کردیں گے۔جیسے بکھری ہوئی دھول۔ ﴿فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا﴾ (۵۶۔۶)تو (پہاڑ ایسے) ہو جائیں گے (جیسے) ذرّے پڑے ہوئے اڑ رہے ہیں۔

(ھ ج د)

اَلْهُجُوْدُ کے معنی نیند کے ہیں اور نائم (سوئے ہوئے) آدمی کو هَاجِدٌ کہا جاتا ہے اور هَجَّدْتُهٗ فَتَهَجَّدَ (ازالہ ماخذ) کے معنی ہیں: میں نے اس کی نیند کو دور کیا تو وہ جاگ گیا جیسا کہ مَرَّضْتُهٗ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے مرض کو دور کیا قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (۱۷۔۷۹)اور رات کے وقت میں نماز تہجد بھی پڑھا کرو۔ ❶

اس آیت میں رات کے قیام میں قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔جیسے دوسری جگہ اسی کو ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ﴾ (۷۳۔۲)رات (کے وقت نماز) میں کھڑے رہا کرو ساری رات سے کم یعنی آدھی رات۔ قیام کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

اَلْمُتَهَجِّدُ کے معنی رات کو نیند سے اٹھ کر نماز پڑھنے والا کے ہیں۔

اَهْجَدَ الْبَعِيْرُ: کے معنی اونٹ کا خواب کے وقت اپنا سینہ زمین پر رکھ دینے کے ہیں۔

(ھ ج ر)

اَلْهَجْرُ وَالْهِجْرَانُ کے معنی ایک انسان کے دوسرے سے جدا ہونے کے ہیں عام اس سے کہ یہ جدائی بدنی ہو یا زبان سے ہو یا دل سے۔چنانچہ آیت کریمہ:۔ ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ﴾ (۴۔۳۴) پھر ان کے ساتھ سونا ترک کرو۔

میں مفارقت بدنی مراد ہے اور کنایتاً ان سے مجامعت ترک کردینے کا حکم دیا۔اور آیت ﴿اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ (۲۵۔۳۰) کہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

میں دل یا دل اور زبان دونوں کے ذریعہ جدا ہونا مراد ہے (یعنی نہ تو انہوں نے اس کی تلاوت کی اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی طرف دھیان دیا) اور آیت:۔ ﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ (۷۳۔۱۰)اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو۔

میں تینوں طرح الگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی جَمِيْلًا کی قید لگا کر اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ حسنِ سلوک اور مجالست کسی صورت میں بھی ترک نہ ہونے پائے۔اس طرح آیت ﴿وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا﴾ (۱۹۔۴۶)اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔میں بھی ترک بوجوہ ثلاثہ مراد ہے۔اور آیت:۔ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۷۴۔۵)اور ناپاکی سے دور رہو میں بھی ہر لحاظ سے رجز کو ترک کردینے کی ترغیب ہے۔

اَلْمُهَاجَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کے دوسرے سے کٹ جانے اور چھوڑ دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔ ﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا﴾ (۲۔۲۱۸)اور خدا کے لیے وطن

---

❶ من الاضداد یاتی بمعنی النوم والیقظة (ابو الطیب ۶۷۸۔۶۸۱) وفیه اکثر ما یقال فی النائم الها جدو فی المستیقظ المتهجد وكذا قال ابن الاعرابی راجع اللسان (هجد) ۱۲۔

چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے۔

اور آیات قرآنیہ۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ (۵۹۔۸) (فے کے مال میں) محتاج مہاجرین کا (بھی) حق ہے۔ جو (کافروں کے ظلم سے) اپنے گھر اور مال سے بے دخل کر دیئے گئے۔

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ﴾ (۴۔۱۰۰) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے۔

﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۴۔۸۹) تو جب تک (یہ لوگ) خدا کی راہ میں (یعنی خدا کے لیے) ہجرت نہ کر آئیں ان میں سے (کسی کو بھی اپنا) دوست نہ بنانا۔

میں مہاجرت کے ظاہر معنی تو دار الکفر سے نکل کر دارالاسلام کی طرف چلے آنے کے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی لیکن بعض نے کہا ہے۔ کہ ہجرت کا حقیقی اقتضاء یہ ہے کہ انسان شہوت نفسانی، اخلاق ذمیمہ اور دیگر گناہوں کو کلیتہً ترک کر دے اور آیت:۔

﴿اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ﴾ (۲۹۔۲۶) اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ) میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف (جہاں کہیں اس کو منظور ہوگا) نکل جاؤں گا۔ کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی قوم کو خیر باد کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جاؤں گا۔ اور فرمایا:۔

﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا﴾ (۴۔۹۷) کیا اللہ تعالیٰ کی (اتنی لمبی چوڑی) زمین (اس قدر) گنجائش نہیں رکھتی تھی کہ تم اس میں (کسی طرف کو) ہجرت کر کے چلے جاتے۔

ہاں جس طرح ظاہری ہجرت کا اقتضا یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانی کو خیر باد کہہ دے۔ اس طرح دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی مجاہدہ بالنفس کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں مروی ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے ایک جہاد سے واپسی کے موقع پر صحابہ کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا[1]: (۱۵۵)

((رَجَعْتُمْ مِّنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ)) کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہو۔ یعنی دشمن کے ساتھ جہاد کے بعد اب نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔[2] (۱۵۶)

((هَاجِرُوْا وَلَا تَهَجَّرُوْا)) یعنی صحیح طور پر مہاجر ہو اور عمل کو ترک کر کے محض زبان سے مہاجر ہونے کے جھوٹے دعاوی نہ کرو۔

اَلْهُجْرُ کے معنی ہذیان کے ہیں جس کے براہونے کی وجہ

---

[1] وفی البیھقی فی الزھد و الدیلمی فی مسنده من حدیث جابر قَدِمْتُم بدل رجعتم وزاد قیل وما الجهاد الاکبر قال مجاھدة العبد ھواه وفیه ضعف واورده النسائی فی الکنی من قول ابراھیم بن عبلة احد التابعین وفی الکشاف ان النبی ﷺ رجع من بعض غزواته فقال رجعنا الحدیث قال الحافظ فی تخریجه ھکذ ذکره الثعلبی بغیر سند (راجع تخریج الکشاف ص ۱۱٤ رقم ۳۳) وکنز العمال (۲۸٦/٤)۔

[2] موقوف علی عمرؓ والمستدرك للحاکم (۸/۳) غریب ابی عبید (۳۱۱/۳) والحدیث فی الفائق (۲۱٦/۲) بطوله عن زربن حبیش ۱۲۔

سے اسے ترک کر دینا چاہیے اور حدیث میں ہے۔ ❶ (۱۵۷)
((لَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا)) فحش کلامی نہ کرو۔
اور اَهْجَرَ فُلَانٌ کے معنی ہی اس نے قصداً فحش کلامی کی
اور هَجَرَ الْمَرِيْضُ کے معنی مریض کے بے ہوشی میں
بڑبڑانے کے ہیں۔ اور آیت:۔
﴿مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ﴾ (۲۳۔۶۷)
(تو تم) اکڑ اکڑ کر شغل بناتے ہو بیہودہ بکواس کرتے
(الٹے پاؤں بھاگتے)
میں ایک قرأت تُهْجِرُوْنَ (باب افعال سے) بھی
ہے۔ اور کبھی هجر (بکواس) میں مبالغہ کرنے والے کو
بھی مُهْجِر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو اس لحاظ سے
هُجْر کے معنی قصداً بکواس کرنا بھی آ جاتے ہیں۔ جیسا
کہ شاعر نے کہا ہے ❷ (الطّویل)

(۴۷۰) كَمَا جِدَةِ الْاَعْرَاقِ قَالَ ابْنُ ضَرَّةٍ
عَلَيْهَا كَلَامًا جَارَ فِيْهِ وَاَهْجَرَا

شریف النسل عورت کی طرح جس کی سوکن کے لڑکے نے
اس کے بارے میں بے انصافی اور فحش کلامی کی ہو (اور وہ
اپنی براءت کے لیے بار بار ہاتھ اٹھا رہی ہو)
اور محاورہ ہے: رَمَاهُ بِهَاجِرَةِ كَلَامِهٖ: یعنی فلاں نے
اس کو فحش گالیاں دیں۔ اور فُلَانٌ هِجِّيْرَاهُ کے معنی
ہیں۔ ❸ کہ فلاں کا یہ شیوہ بن چکا ہے اور یہ اس وقت کہا
جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی چیز کا کثرت سے ذکر کرے
اور مریض کی طرح اس کے متعلق ہر وقت بڑ اتا رہے اور
هَجِيْرٌ کا لفظ اصل میں تو عادات ذمیمہ کے متعلق بولا جاتا
ہے۔ مگر جو لوگ اسکے صحیح معنوی استعمال کا لحاظ نہیں کرتے
وہ اسے اس کی ضد (یعنی اچھی عادت کے معنی) میں بھی
استعمال کر لیتے ہیں۔
اَلْهَجِيْرُ وَالْهَاجِرَةُ کے معنی دوپہر کا وقت، کے ہیں۔
کیونکہ عموماً مسافر سخت گرمی کی وجہ سے اس وقت سفر کو
ترک کر کے راحت حاصل کرتا ہے تو گویا اسے لوگوں نے
چھوڑ دیا اور اس وقت نے لوگوں کو چھوڑ دیا۔
اَلْهِجَارُ: یہ عقال و زمام کے وزن پر ہے اور اسکے معنی
اونٹ کا پاؤں باندھنے کی رسی، کے ہیں وہ رسی چونکہ
دوسرے اونٹوں سے علیحدگی کا سبب بنتی ہے اس لیے اسے
هِجَارٌ بھی کہتے ہیں۔ اور مَهْجُوْرٌ اس اونٹ کو کہتے
ہیں۔ جو هِجَار (رسی) کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ اور
پھر اونٹ کی اس رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر کمان کی تانت
کو بھی هِجَارُ الْقَوْسِ کہہ دیا جاتا ہے۔

(ھ ج ع)

اَلْهُجُوْعُ کے معنی رات کو سونا کے ہیں۔
قرآن میں ہے۔
﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ (۵۱۔۱۷)

---

❶ وتمام الحديث زوروا القبور ولا تقولوا هجراره عن زيد بن ثابت' الفتح الكبير للنبهاني (۱٤٤/۲) والنهاية (۲٥٥/٤) واللسان والمجمع (هجر) واضداد ابى الطيب (٦٨٥) والطبراني فى الصغير (۱۸۳) او الفائق (۳۲۱/۲)۔

❷ قاله شماخ بن ضرار الغطفاني يصف سير ناقته ويشبه ذراعيها فى مشيها بذراع امرءة صفتها كذا وفى رواية ديوانه ممجدة الاعراق بدل كما جدة الاعراق والبيت فى اللسان (هجر) وامالى المرتضىٰ (۱: ٥٥٦) وفى ديوانه من قصيدة طويلة (۲٦۔۳٤)۔

❸ وفى الفائق (۳۲۱/۲)۔ كان عمرؓ يطوف بالبيت وهو يقول ربنا اننا الخ...... ماله هجيرى سواه وراجع ايضا غريب ابى عبيد (۳۱۸/۳) وفيه (۳۱۸/۳) وفيه غيرها) وفى (ج) مسند عمر (۱٥۱٤)۔

اور وہ (عبادت) میں مشغول رہنے کے سبب رات کو بہت کم سوتے تھے۔

اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور یہ بھی کہ وہ رات کو سوتے ہی نہیں تھے۔"

کیونکہ قلیل کا لفظ جس طرح نہایت تھوڑی چیز کے معنی میں آتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہو اس طرح کبھی نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ لَقِيْتُهٗ بَعْدَ هُجْعَةٍ کہ میں اسے رات کو کچھ دیر سو لینے کے بعد ملا اور هُجَعٌ (مثل قُوَمٌ) مدہوش اور بے خود آدمی کو کہتے ہیں۔ جو ہر چیز سے غافل ہو۔

(ھ د د)

اَلْهَدُّ کے معنی کسی چیز کو زور کی آواز کے ساتھ گرا دینے یا کسی بھاری چیز کے گر پڑنے کے ہیں اور کسی چیز کے گرنے کی آواز کو هَدَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ (۱۹۔۹۰) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔

اور وَهَدَوْتُ الْبَقَرَةَ: کے معنی گائے کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر گرانے کے ہیں اور هِدٌّ بمعنی مَهْدُوْدٌ (یعنی) گرائی ہوئی چیز کے، آتا ہے جیسے ذَبْحٌ بمعنی مَذْبُوحٌ اور کمزور بزدل آدمی کو بھی هِدٌّ کہا جاتا ہے۔ ایک محاورہ ہے۔

مَرَرْتُ بِرَجُلٍ هَدَّكَ مِنْ رَجُلٍ: میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو تیرے لیے فلاں ھ سے کافی ہے اصل میں اس کے معنی ہیں کہ جس کا وجود تجھے بے چین اور مضطرب کرتا ہے۔

هَدَّدْتُ فُلَانًا وَتَهَدَّدْتُهٗ: میں نے اسے دھمکایا اور ڈرایا۔

اَلْهَدْ هَدَةُ: بچے کو سلانے کے لیے تھپکی دینا اور ہلانا۔

اَلْهُدْهُدُ: ایک پرندے کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿مَا لِیَ لَاۤ اَرَی الْهُدْهُدَ﴾ (۲۷۔۲۰) کیا سبب ہے کہ ہد ہد نظر نہیں آتا۔

اس کی جمع هَدَا هِدُ آتی ہے۔ اور هُدَ اهِدُ ضمہ کے ساتھ واحد ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الکامل)

(۴۱۵) كَهُدَا هِدٍ كَسَرَ الرُّمَاةُ جَنَاحَهٗ
يَدْعُوْ لِقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ هَدِيْلًا

وہ اس حمام کی طرح پریشان تھا جس کے بازو شکاریوں نے توڑ دیئے ہوں اور وہ راستہ میں کھڑا واویلا کر رہا ہو۔

(ھ د م)

اَلْهَدْمُ (ض) کے اصل معنی عمارت کو گرا دینا

---

[1] قاله الراعی النمیری اعبید بن حصین من فحول الشعراء) (والبیت من قصیدة جمهریه (۳۳۱۔۳۳۷) فی نحو ۸۵ بیتا یمدح فیها عبدالملك بن مروان ویشکو السعاة مطلعها: مابال وفك بالفراش رحیلا اقذی بینك ام اردت رحیلا۔ وبعد البیت: وقع الربیع وقد تقارب خطوه۔ ورای لعقوته ته ازل نسولا۔ البیت فی الحمهرة (۳۳۵) والبلدان (رسم: بغیبغة اواللسان والصحاح (هد هد. هدل) والحیوان (۳: ۲٤۳) والحمهرة لابن درید ۷۲ او امالی الزجاجی ٥٤ والمعانی للقبتی ۱۸۸، ۳۰۰ والشاعر شبه رجلا اخذ المصدق ابله بهدهد کسرجناحه وقبل البیت: اخذ وا حمولته فاصبح قاعدا لایستطیع عن الدیار حویلا یدعو امیر المؤمنین و دونه خرق تحربه الریاح ذیولا۔ والراعی ممن ذکر الحمع فی الطبقة الاولی من الشعراء لاسلامیین وکان یقدم الفرزوق علی الحریر فاسکتفه فهجاه بقصیدته البائیة اولها۔ اقل اللوم عادل والعتابا۔ وقولی ان اصبت لقدر اصابا۔ راجع الحمحی ۱۷۳ والاغانی (۳۰/۱٦۸۔۱۷۳)

کے ہیں اس سے فعل هَــدَمَ آتا ہے اور گری ہوئی چیز کو هَــدَمٌ کہا جاتا ہے۔اور اسی سے استعارہ کے طور پر رائیگاں خون کو دَمٌ هَـدَمٌ کہا جاتا ہے اور یہی معنی هِـدْمٌ بکسر الہا کے ہیں لیکن یہ خاص کر بوسیدہ کپڑے پر بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اَهْدَامٌ آتی ہے۔اور هَـدَّمْتُ الْبِنَاءَ کے معنی بھی عمارت کو گرا دینے کے ہیں مگر اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ﴾ (۲۲۔۴۰) تو (نصاریٰ) کے صومعے بھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

(ھ د ی)

اَلْهِــدَايَةُ کے معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور اسی سے هَـدِيَّةٌ (فعلۃ) ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں۔ جو بغیر معاوضہ کے دیا جائے۔اور هَـوَادِي الْوَحْشِ جنگلی جانوروں کے پیش رو دستے کو کہتے ہیں جو گلے کا رہنما ہوتا ہے۔عرف میں دلالت اور رہنمائی کے لیے هَـدَيْتُ (افعال) استعمال ہوتا ہے۔جیسے اَهْـدَيْتُ الْهَـدِيَّةَ: میں نے ہدیہ بھیجا اور اَهْـدَيْتُ اِلَـى الْبَيْتِ: میں نے بیت اللہ کی طرف ہدی بھیجی۔یہاں پر شبہ ہوسکتا ہے۔کہ اگر هِـدَايَـه کے معنی لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں تو پھر کفار کو دوزخ کی طرف دھکیلنے کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔﴿فَـاهْـدُوْهُـمْ اِلَـى صِـرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾ (۳۷۔۲۳) پھران کو جہنم کے راستے پر چلا دو۔ ﴿وَ يَهْـدِيْـهِ اِلَـى عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ (۲۲۔۴) اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہدایت کے اصل معنی تو لطف وکرم کے ساتھ رہنمائی کے ہی ہیں۔لیکن یہاں کفار کے متعلق مبالغہ کے لیے بطور تہکم یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت۔﴿فَبَشِّـرْهُـمْ بِـعَـذَابٍ اَلِـيْمٍ﴾ (۸۴۔۲۴) تو (اے پیغمبر!انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے متعلق لفظ بشارت استعمال کیا ہے اور شاعر نے اپنے کلام[1] ()

(۴۵۲) تَحِيَّةُ بَيْنَهُمْ ضَرَبٌ وَجِيْعٌ

ان کا باہمی تحیہ تلوار کی دردناک ضرب ہے

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیّہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کی ہے۔

(۱) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اسی معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمیع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار چیز کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿رَبُّنَـا الَّـذِيْ اَعْـطٰـى كُـلَّ شَـيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَـدٰى﴾ (۲۰۔۵۰) ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی۔

(۲) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ نجات کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت:﴿وَجَـعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْـدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا﴾ (۳۲۔۲۴) اور ہم نے

---

[1] قاله عمر وبن معدی کرب وصدره: وخیل قدد لفت لهابخیل...... انظر لتخریجه (ب ش د)

بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے، میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۳) سوم ہدایت بمعنی توفیق خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷۔۱۷) جو لوگ روبراہ ہیں (قرآن کے سننے سے) خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

﴿مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ (۶۴۔۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ﴾ (۱۰۔۹) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کیے ان کے ایمان کی برکت سے ان کو ان کا پروردگار (نجات کا) رستہ دکھائے گا۔﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲۹۔۶۹) اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوشش کی۔ہم (بھی) ان کو ضرور اپنے رستے دکھائیں گے۔

﴿وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (۱۹۔۷۶) اور جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲۔۲۱۳) تو خدا نے (اپنی عنایت سے) مسلمانوں کو راہ دکھا دی۔

﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۲۔۹۰) جس کو چاہتا ہے (دین کا) سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۴) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾ (۴۷۔۵) (بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔اور آیت ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ﴾ میں فرمایا:﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (۷۔۴۳) خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پاسکتے۔

ہدایت کے یہ چاروں اقسام ترتیبی درجات کی حیثیت رکھتے ہیں۔یعنی جسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو۔وہ دوسرے درجہ ہدایت پر فائز نہیں ہوسکتا۔بلکہ وہ تو شرعاً مکلّف ہی نہیں رہتا۔علی ہذا القیاس جسے دوسرے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا اور جسے چوتھے درجہ کی ہدایت حاصل ہو تو اسے پہلے تینوں درجات لازماً حاصل ہوں گے۔اسی طرح تیسرے درجہ کی ہدایت کا حصول پہلے دو درجوں کی ہدایت کو مستلزم ہے اور اس کے برعکس درجہ اولیٰ کا حصول درجہ ثانیہ کو اور ثانیہ کا حصول ثالثہ کو مستلزم نہیں ہے۔ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کرسکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔چنانچہ فرمایا۔

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (۴۲۔۵۲)

اور بے شک (محمدؐ) سیدھا رستہ دکھاتے ہیں۔
﴿یَھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (۳۲-۲۴) جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔
﴿وَّ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ﴾ (۱۳-۷) اور ہر ایک قوم کے لیے رہنما ہوا کرتے ہیں۔
اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں۔ چنانچہ فرمایا:
﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ (۲۸-۵۶) (اے محمدؐ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔
اور قرآن پاک میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں یا تو ہدایت بمعنی ثالث ہے یعنی وہ توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی رابع ہے کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ چنانچہ آیت یَھْدِیْ اللّٰہِ قَوْمًا' کے آخر میں فرمایا۔
﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِیْ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (۹-۱۱۹) اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔
﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۱۶-۱۰۷) یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس لیے کہ خدا کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔
جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر یا کسی انسان کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ ہدایت خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو وہاں دعوت الی الحق اور صحیح رہنمائی کے علاوہ باقی اقسام ہدایت مراد ہیں یعنی کسی کو عقل اور توفیق بخشنا یا جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
﴿لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲-۲۷۲) (اے محمد ﷺ) تم ان لوگوں کو ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت بخشتا ہے۔
﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَمَعَھُمْ عَلَی الْھُدٰی﴾ (۶-۳۵) اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔
﴿وَ مَآ اَنْتَ بِھٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ﴾ (۲۷-۸۱) اور نہ اندھوں کو گمراہی سے (نکال کر) رستہ دکھا سکتے ہو۔
﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی ھُدٰھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ﴾ (۱۶-۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔
﴿وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ﴾ (۳۹-۳۶) اور جس کو خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔
﴿وَمَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ﴾ (۳۹-۳۷) اور جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔
﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۸-۵۶) (اے محمدؐ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے۔
اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰۔۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اور آیت: ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾ (۱۸۔۱۷) جس کو خدا ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ہدایت کا طلبگار اور متلاشی ہو اسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت یاب ہونے کی توفیق بخشا۔ اور راہ جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے برعکس جو شخص کفر و ضلالت کا خواہاں رہتا ہے وہ توفیق الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (۲۔۲۶۴) اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اور دوسری آیت میں كٰفِرِيْنَ کی جگہ ظٰلِمِيْنَ ہے۔ اور آیت۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۹۔۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے۔ ہدایت نہیں دیتا۔

میں كَاذِبٌ كَفَّارٌ سے مراد وہ شخص ہے جو ہدایت الٰہی کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ اگر چہ اس کے وضعی معنی نہیں ہیں لیکن حاصل مطلب یہی ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت قبول نہیں کرتا اسے اللہ تعالیٰ بھی ہدایت نہیں بخشا جیسے محاورہ ہے۔ مَنْ لَمْ يَقْبَلْ هَدِيَّتِيْ لَمْ اُهْدِلَهٗ وَمَنْ لَمْ يَقْبَلْ عَطِيَّتِيْ لَمْ اُعْطِهٖ...... یعنی جو شخص میرے ہدیہ یا عطیہ کو قبول نہیں کرے گا میں بھی اسے ہدیہ نہیں دوں گا۔ یا آپ کہیں: مَنْ رَغِبَ عَنِّيْ لَمْ اَرْغَبْ فِيْهِ کہ جو شخص مجھ سے اعراض کرتا ہے مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں پس آیت۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (۲۔۲۵) اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اور دوسری آیت میں اَلْفٰسِقِيْنَ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت

﴿اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى﴾ (۱۰۔۳۵) بھلا جو حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ یا وہ کہ جب تک کوئی اسے رستہ نہ بتائے رستہ نہ پائے۔

میں ایک قرأت لَا يَهْدِيْ اِلَّا اَنْ يُّهْدٰى ہے۔ یعنی وہ دوسرے کی رہنمائی نہیں کر سکتا بلکہ وہ خود رہنمائی کا محتاج ہے مطلب یہ ہے کہ ان میں علم و معرفت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور اگر انہیں کوئی شخص ہدایت دے بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ وہ بت (پتھر وغیرہ کی) بے جان مورتیاں ہیں پس اِلَّا اَنْ يُّهْدٰى سے بظاہر اگر چہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہدایت دینے سے وہ ہدایت پا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مجاز پر محمول ہے۔ جیسا کہ محض صوری مشابہت کی وجہ سے ان بتوں کو آیت:۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (۷۔۱۹۴) (مشرکو!) جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، تمہاری طرح کے بندے ہی ہیں۔ میں عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ کہد یا ہے حالانکہ وہ بے جان مجسمے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا: ﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ

وَ الْاَرْضِ شَیْـئًا وَّ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ﴾ (۱۶۔۷۳) اور خدا کے سوا ان کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمینوں میں روزی دینے کا ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ (کسی اور طرح کا) مقدور رکھتے ہیں۔

اور آیات کریمہ:۔﴿اِنَّا هَدَیْنٰـهُ السَّبِیْلَ﴾ (۷۶۔۳) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا۔

﴿وَهَدَیْنٰـهُ النَّجْدَیْنِ﴾ (۹۰۔۱۰) اور اس کو (خیر،شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

﴿وَهَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ (۳۷۔۱۰۸) اور ان کو سیدھا رستہ دکھایا۔

میں خیر وشر اور ثواب وعقاب کا رستہ مراد ہے۔جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے عقل وشریعت کے ذریعہ انسان کو ہدایت فرمائی ہے اور یہی معنی آیت:﴿فَرِیْـقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ﴾ (۷۔۳۰) ایک فریق کو تو اس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی۔

میں مراد ہیں اور آیت:﴿وَمَـنْ یُّـؤْمِـنْ بِـاللّٰهِ یَهْدِ قَـلْبَـهٗ﴾ (۶۴۔۱۱) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

میں ہدایت سے توفیق الٰہی مراد ہے جو کہ مومن کے دل میں القاء کی جاتی ہے اور وہ اپنے مشاغل میں اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی﴾ (۴۷۔۱۷) اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشتا ہے۔

لفظ ہدایت کبھی متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ لام یا الیٰ کے متعدی ہوتا ہے، چنانچہ تعدیہ بواسطہ الیٰ کے متعلق فرمایا:۔﴿فَـقَـدْ هُـدِیَ اِلٰـی صِـرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (۳۔۱۰۱) اور جس نے خدا (کی ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔

﴿وَاجْتَبَیْنٰاهُمْ وَهَدَیْنَا هُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (۶۔۸۰) اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

اور نیز فرمایا:۔

﴿اَفَمَـنْ یَّهْـدِیْ اِلَـی الْـحَـقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ﴾ (۱۰۔۳۵) بھلا جو شخص حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی .... وَاَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی﴾ (۷۹۔۱۸۔۱۹) کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے اور میں تمہیں تمہارے پروردگار کا رستہ بتاؤں تا کہ تجھ میں خوف پیدا ہو۔اور تعدیہ بنفسہٖ کے متعلق فرمایا:

﴿وَّ لَهَـدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا﴾ (۴۔۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھاتے۔

﴿وَهَـدَیْنٰا هُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ (۷۶۔۳) اور ہم نے انہیں سیدھا رستہ دکھایا۔

﴿اِهْـدِنَـا الـصِّـرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ (۱۔۵) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

﴿اَتُـرِیْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ﴾ (۴۔۸۸) کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا اس کو رستے پر لے آؤ۔

﴿وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا﴾ (۴۔۱۶۸) اور نہ انہیں رستہ ہی دکھائے گا۔

﴿اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ﴾ (۱۰-۴۳) تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے۔

﴿وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا﴾ (۴-۱۷۶) اور اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا رستہ دکھائے گا۔ پھر ہدایت و تعلیم دو باتوں کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی ایک یہ کہ معلم اپنی طرف سے کما حقہ سمجھانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ متعلم استفادہ کرنے کی کوتاہی سے کام نہ لے اگر ہادی یا معلم اپنی طرف سے تعلیم میں پوری کوشش کرے لیکن متعلم میں قبولیت کی صلاحیت نہ ہو تو اس کے عدم قبول کے لحاظ سے آپ (مجازاً) یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہدایت نہیں کی اور ہادی کے اپنی کوشش صرف کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس نے ہدایت اور تعلیم دی پس جب عدم قبولیت کی صورت میں (نفی اور اثبات کے ساتھ) دونوں طرح کہنا صحیح ہے تو کفار کے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت نہیں دی کیونکہ ہدایت و تعلیم پر قبولیت کا ثمرہ مرتب نہیں ہوا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی۔ کیونکہ انہی مبداء ہدایت یعنی (عقل و حواس) عطا فرمائے۔ پس آیت:۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (۹-۱۹) اور خدا ظالم یا ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

میں نفی معنی اول (یعنی عدم قبولیت) پر محمول ہوگی اور آیت: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی﴾ (۴۱-۱۷) اور جو ثمود تھے ان کو ہم نے سیدھا رستہ دکھا دیا تھا۔ مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔

میں اثبات ہدایت دوسرے معنی بَذْلُ السَّعْیِ یعنی کوشش کرنے کے لحاظ سے ہوگا۔ لیکن جہاں قبولیت حاصل نہ ہو وہاں یہ کہنا زیادہ اولی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت کی لیکن اس نے ہدایت الٰہی کو قبول نہ کیا۔ جیسا کہ آیت ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ الایة﴾ میں ہے اور آیت:

﴿لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی قَوْلِهٖ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ﴾ (۲-۱۴۲) (تم کہدو) کہ مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے۔

سیدھے رستے پر چلاتا ہے۔ الخ...... اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔ میں اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس سے رہنمائی حاصل کی اور آیت۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ (۱-۵) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

اور آیت: ﴿وَلَهَدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا﴾ (۴-۶۸) اور سیدھا رستہ بھی دکھا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ہدایت سے ہدایت عامہ یعنی قرآن پاک اور انبیاء کرام کے ذریعہ ہدایت کرنا مراد ہے۔ اور یہ اگرچہ ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ہمیں حصول ثواب کے لیے ان کلمات کے زبان سے ادا کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ جس طرح کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ الخ پڑھنے یعنی آپ پر درود بھیجنے کے ہم مکلف ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر رحمت بھیجتے اور آپ کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ﴾

(۳۳۔۵۶) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر دردگار پر درود بھیجتے ہیں۔سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ گمراہی اور شہوات نفسانیہ کے پنجہ میں گرفتار ہونے سے حفاظت کی دعا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں توفیق الٰہی کی طلب کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷۔۱۷) اور جو ہدایت یافتہ ہیں وہ ان کو مزید ہدایت بخشتا ہے۔میں وعدہ فرمایا ہے۔اور بعض نے آخرت میں ہدایت الی الجنۃ مراد لی ہے۔اسی طرح آیت

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ (۲۔۱۴۳) اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔

میں بھی ہدایت سے۔توفیق الٰہی مراد ہے۔جس کا ذکر کہ آیت۔

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ میں پایا جاتا ہے۔

اَلْهُدٰى اور هَدَايَةٌ اگرچہ لغۃً ہم معنی ہیں۔لیکن قرآن پاک نے هُدًى کا لفظ خاص کر ہدایت الٰہی کے لیے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۲۔۱) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ (۲۔۵) یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں۔﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (۲۔۱۵۸) لوگوں کے لیے رہنما ہے۔﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ (۲۔۳۸) جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے (تو اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ (۲۔۱۲۰) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔

﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ﴾ (۱۶۔۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے للچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے۔اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ (۲۔۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی۔

اَلْاِهْتِدَاءُ: (ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو امور دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا﴾ (۶۔۹۸) اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ (جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں) ان سے رستہ معلوم کرو۔

﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا﴾ (۴۔۹۸) اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں۔کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

لیکن کبھی اِهْتِدَاء کے معنی طلب ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۵۱) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب

اور معجزے عنایت کیے تا کہ تم ہدایت حاصل کرو۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۰) سوان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۳۔۲۰) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں۔

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۲۔۱۳۷) تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

اَلْمُهْتَدِیْ: اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتداء کر رہا ہو چنانچہ آیت:

﴿اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ﴾ (۵۔۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔ اور آیت:

﴿فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا﴾ (۱۰۔۱۰۸) تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں اِهْتِدَاءَ کا لفظ طلب ہدایت، اقتداء اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے۔ اسی طرح آیت: ﴿وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ﴾ (۲۷۔۲۴) اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے ہیں۔ اور ان کو رستے سے روک رکھا ہے پس وہ رستے پر نہیں آتے۔

میں بھی لَا یَهْتَدُوْنَ سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت:۔ ﴿وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾ (۲۰۔۸۲) اور جو توبہ کرلے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے۔ پھر سیدھے راستہ پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اِهْتَدٰی کے معنی لگا تار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کے ہیں۔ اور آیت:۔

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ کے بعد فرمایا:۔ ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (۲۔۱۵۷) اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔

میں مُهْتَدُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الٰہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لیے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ﴾ (۴۳۔۴۹) اے جادوگر! اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کر رکھا ہے، اس سے دعا کر۔ بے شک ہم ہدایت یاب ہوں گے۔ اور هَدْیٌ کا لفظ خاص کر اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف (ذبح کے لیے) بھیجا جائے۔ اخفش نے اس کا واحد هَدْیَةٌ لکھا ہے نر کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے

استعمال ہوتا ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ﴾ (۲۔۱۹۲) اور اگر (رستے میں) روک لیے جاؤ۔ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو)

﴿هَدْیًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ (۵۔۹۵) قربانی کعبے پہنچائی جائے ﴿وَ الْهَدْیَ وَ الْقَلَآئِدَ﴾ (۵۔۹۷) اور قربانی کو اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں۔

﴿وَالْهَدْیَ مَعْكُوفًا﴾ (۴۸۔۲۵) اور قربانیوں کو بھی کہ اپنی جگہ پہنچنے سے رکی رہیں۔

اَلْهَدِیَّةُ: ان تحائف کو کہا جاتا ہے جو ہم ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ﴾ (۲۷۔۳۵) اور میں ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں۔

﴿بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ (۲۷۔۳۶) بلکہ اپنے تحفے سے تم ہی خوش ہوتے ہوں گے۔

اَلْمِهْدٰی: طباق وغیرہ جس میں ہدیہ بھیجا جاتا ہے۔ اور اس شخص کو جو بہت زیادہ تحائف پیش کرنے کا عادی ہو اسے مِهْدَاءٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

وَاِنَّكَ مِهْدَاءُ الْخَنَانَطِفُ الْحَشَا

بے شک تو فحش گو اور بد باطن ہے۔

اَلْهَدِیُّ کے معنی قربانی کا جانور اور دلہن اور سیرت کے آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔

هَدَیْتُ الْعَرُوْسَ اِلٰی زَوْجِهَا: دلہن کو شوہر کے پاس بھیجا۔ مَا اَحْسَنَ هِدِیَّةَ فُلَانٍ وَهَدْیَهٗ: یعنی اس کی سیرت کتنی اچھی ہے۔ فُلَانٌ یُهَادٰی بَیْنَ اثْنَیْنِ: فلاں دو آدمیوں پر سہارا لے کر ان کے درمیان چلتا ہے۔

تَهَادَتِ الْمَرْءَةُ: عورت کا قربانی کے جانور کی طرح لڑکھڑا کر چلنا۔

(ھ ر ت)

آیت کریمہ:۔ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ﴾ (۲۔۱۰۲) اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے۔) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت ماروت پر اتری تھیں۔

کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتوں کے نام ہیں اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ انسانوں یا جنوں میں سے دو شیطانوں کے نام ہیں۔ اور یہ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ سے بدل البعض ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ جیسا کہ اَلْقَوْمُ قَالُوْا كَذَا زَیْدٌ وَعَمْرٌو میں زید اور عمرو قوم سے بدل البعض ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔

لغت میں اَلْهَرْتُ کے معنی منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا کے ہیں اور اسی سے فَرَسٌ هَرِیْتُ الشِّدْقِ کا محاورہ ہے یعنی وہ گھوڑا جس کی باچھیں وسیع ہوں اور اصل میں یہ لفظ هَرَتَ (ض ن) ثَوْبَهٗ سے مشتق ہے جس کے معنی کپڑا پھاڑنے کے ہیں اور جس عورت کی شرمگاہ کثرت

---

[1] قاله حسیل بن عرفطة بن فضلة الاسدی مخضرمی رای رسول الله ﷺ وروی عنه وهو ممن غیر علیه السلام اسماء هم فسماه حسینا (الاصابة رقم ۱۷۱۷) وعده ابوزید فی نوادره من شعراء الجاهلیة وذکره عنهم (کما فی لبیا (۳: ۱٤٦) هذا الاسم حسنا وهو تحریف والبیت وجدته بعد الکلال فی الحیوان (۳: ۱۰۲۔۱۰۳) (ثم فی ٤۹٤) فی اربعة ابیات وعجزه: شدید السباب رافع الصوت غالبه۔ وفی المطبوع تطف الحشا بدل نطف النشا محرف والتصویب من المراجع ۱۲۔

جماع سے کشادہ ہوگئی ہو اسے اَلْھَرِیْتُ کہا جاتا ہے۔

(ھ ر ع)

ھَرِعَ وَاُھْرِعَ کے معنی سختی اور تخویف سے ہانکنے اور (اور چلانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ﴾ (۱۱۔۷۸) اور لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ دوڑتے ہوئے آئے۔

اور ھَرِعَ بِرُمْحِہٖ فَتَھَرَّعَ کے معنی نیزے کو سرعت کے ساتھ کسی کی طرف سیدھا کرنے کے ہیں اور ھَرِیْعٌ تیز اور چلا کر رونے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْھَرِیْعُ (ایضاً) وَالْھَرْعَۃُ: چھوٹی جوں کو کہتے ہیں۔

(ھ ر ن)

ھٰرُوْنَ: (موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی کا نام ہے (یہ اسم عجمی ہے اور کلام عرب میں مادہ مستعمل نہیں ہے۔

(ھ ز ز)

اَلْھَزُّ کے معنی کسی چیز کو زور سے ہلانے کے ہیں۔ جیسے ھَزَزْتُ الرُّمْحَ: میں نے نیزہ زور سے ہلایا اِھْتَزَّ: افتعال اس کا مطاوع ہے۔ اس طرح ھَزَزْتَ فُلَانًا لِلْعَطَآءِ کے معنی ہیں ''میں نے فلاں کو بخشش کے لیے حرکت دی'' یعنی وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ قرآن میں ہے:۔

﴿وَھُزِّیْٓ اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَۃِ﴾ (۱۹۔۲۵) اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ۔

﴿فَلَمَّا رَاٰھَا تَھْتَزُّ کَاَنَّھَا جَآنٌّ﴾ (۲۷۔۱۰) جب اسے دیکھا تو (اس طرح) ہل رہی تھی گویا سانپ ہے اِھْتَزَّتِ النَّبَاتُ: نباتات (سبزے) کا لہلہانا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (۲۲۔۵) پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں۔ تو وہ شاداب ہوجاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے۔

اِھْتَزَّ الْکَوْکَبُ فِیْ اِنْقِضَاضِہٖ: ستارے کا تیزی کے ساتھ ٹوٹنا اور سَیْفٌ ھَزْھَازٌ کے معنی لچکدار تلوار کے ہیں اور شفاف پانی کو مَاءٌ ھَزْھِزٌ کہا جاتا ہے اسی طرح ھُزْھُزٌ کے معنی سبک اور ہلکے پھلکے آدمی کے بھی آتے ہیں۔

(ھ ز ع)

اَلْھَزْءٌ کے معنی اندرونی طور پر کسی کا مذاق اڑانا کے ہیں۔ اور کبھی یہ مذاق کی طرح گفتگو پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ قصداً مذاق اڑانے کے معنی میں فرمایا:۔

﴿اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا﴾ (۵۔۵۸) یہ اسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔

﴿وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا اتَّخَذَھَا ھُزُوًا﴾ (۴۵۔۹) اور جب ہماری کچھ آیتیں اسے معلوم ہوتی ہیں تو ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔

﴿وَاِذَا رَاٰکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا ھُزُوًا﴾ (۲۱۔۳۶) اور جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو تم سے استہزاء کرتے ہیں۔

﴿اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا﴾ (۲۔۶۷) کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو۔ ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا﴾ (۲۔۲۳۱) اور خدا کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ۔

اس آیت میں انہیں سخت سرزنش کی گئی ہے۔ اور ان کی خباثت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ایات الٰہی کا علم اور ان کی صداقت سے آگاہ ہونے کے بعد ان کا مذاق اڑاتے

ہیں۔ ھَزِئْتُ بِہٖ وَاسْتَھْزَأْتُ کے معنی کسی کا مذاق اڑانے کے ہیں اور اَلْاِسْتِھْزَاءُ: اصل میں طلب ھزء کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آ جاتے ہیں۔ جیسے اِسْتِجَابَۃٌ کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں۔ اور یہ اِجَابَۃٌ (جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قُلْ اَبِاللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۹۔۶۵) کہو کیا تم خدا اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

﴿وَ حَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۱۱۔۸) اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو گھیر لے گی۔

﴿وَمَا یَاْتِیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُ وْنَ﴾ (۱۵۔۱۱) اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

﴿اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا﴾ (۴۔۱۴۰) کہ جب تم (کہیں) سنو کہ خدا کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔

﴿وَ لَقَدِ اسْتُھْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِکَ﴾ (۶۔۱۰) اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر ہوتے رہے۔

حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو ولعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہٰذا آیت:

﴿اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَ یَمُدُّ ھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ﴾ (۲۔۱۵) (ان) منافقوں سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

میں یَسْتَھْزِئُ کے معنی یا تو اِسْتِھْزَاء کی سزا دینے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ دیر تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعتہً پکڑ لیا یہاں امہال کو اِسْتِھْزَاء سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے انہوں نے ھُزْءٌ کی طرح دھوکا کھایا پس یہ استدراج کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا:۔

﴿سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (۷۔۱۸۲) ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہو گا۔

اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزاء اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء سے باخبر ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکا دے اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دیے بغیر اس سے احتراز کرے تو کہا جاتا ہے۔ خَدَعَہٗ یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔ [1] (۱۵۸) ((ان المستھزئین فی الدنیا یفتح لھم باب من الجنۃ فیسرعون نحوہ فاذا انتھوا الیہ سد علیھم)) کہ جو لوگ دنیا میں دین الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لیے سرپٹ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

---

[1] مروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ من التابعین تحت تفسیر الآیۃ ﴿فضرب بینھم بسور باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب﴾ (الحدید)

چنانچہ آیت:﴿فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ﴾ (۸۳۔۳۴) تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے۔

میں بعض کے نزدیک ضحک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت ﴿سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ (۹۔۷۹) خدا ان پر ہنستا ہے اور ان کے لیے تکلیف دینے والا عذاب تیار ہے۔ میں بھی اس قسم کی تاویل ہو سکتی ہے۔

(ھ ز ل)

اَلْھَزْلُ کے معنی لا حاصل اور بے نتیجہ بات کے ہیں گویا وہ ھُزَال (لاغری) ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ (۸۶۔۱۳،۱۴) کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والی ہے اور بیہودہ بات نہیں۔

(ھ ز م)

اَلْھَزْمُ کے اصل معنی کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینے کے ہیں۔خشک اور پرانے مشکیزہ کو دبا کر توڑ ڈالنے یا تربوز، ککڑی وغیرہ کے توڑنے پر ھزم کا لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے ہزیمت (بمعنی شکست) ہے جس طرح حَطْمٌ یا کَسْرٌ کا لفظ (مجازاً) شکست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح ھَزَمَ کا لفظ بھی اس معنی میں بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ تو طالوت علیہ السلام کی فوج نے خدا کے حکم سے ان کو ہزیمت دی۔(۲۔۲۵۱)﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ (۳۸۔۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔[1]

اور فَاقِرَۃٌ کی طرح ھَازِمَۃٌ بھی بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے۔اَصَابَتْهُ هَازِمَةُ الدَّهْرِ: اسے بڑی مصیبت پہنچی۔

هَزَمَ الرَّعْدُ: گرج کی آواز کا شکستہ ہونا۔

اَلْمِهْزَامُ: ایک لکڑی جس کے سرے پر آگ لگا کر بچے کھیلتے ہیں۔گویا وہ اس سے دوسرے لڑکوں کو ہزیمت دیتے ہیں اور کمینے (دنی) شخص کے متعلق هَزَمَ وَاهْتَزَمَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(ھ ش ش)

اَلْھَشُّ: (ض) کے معنی بھی ھَزٌّ کی طرح کسی چیز کو حرکت دینے کے ہیں۔لیکن یہ کسی نرم چیز کو حرکت دینے پر بولا جاتا ہے۔جیسے هَشَّ الْوَرَقَ: درخت سے پتے جھاڑنا قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِیْ﴾ (۲۰۔۱۸) اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔

هَشَّ الرَّغِیْفُ فِی التَّنُّوْرِ: روٹی کا تنور میں پھول کر نرم ہو جانا۔

نَاقَةٌ هَشُوْشٌ: نرم مزاج اور بہت دودھ دینے والی اونٹنی اور وہ گھوڑا جسے بہت زیادہ پسینہ آئے۔ اسے بھی هَشُوْشٌ کہا جاتا ہے۔اس کے بالمقابل جس گھوڑے سے پسینہ نہ آئے اسے صَلُوْدٌ کہا جاتا ہے۔رَجُلٌ هَشُّ الْوَجْهِ: ہشاش بشاش آدمی۔

اور هَشَشْتُ وَهَشَّ لِلْمَعْرُوْفِ (ض): سخاوت کے وقت خوش ہونا۔

فُلَانٌ ذُوْهَشَاشٍ: نیک خو اور سخی مرد۔

---

[1] وایضا انظر (٥٤۔٤٥)

(ھ ش م)

اَلْھَشْمُ: اصل میں سوکھی یا نرم چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاَصْبَحَ ھَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ﴾ (۱۸۔۴۵) پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

﴿فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۴۔۳۱) تو وہ ایسے ہو گئی جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔اور ہڈی وغیرہ (سخت چیز) کے توڑنے پر ھَشْمٌ بولا جاتا ہے۔اور اسی سے ھَشَمْتُ الْخُبْزَ کا محاورہ ہے۔جس کے معنی سوکھی روٹی کو توڑ کر ثرید بنانے کے ہیں۔شاعر نے کہا ہے[1] ()

(۴۵۳) عَمْرُو الْعَلَا ھَشَمَ الثَّرِيْدَ لِقَوْمِهٖ
وَرِجَالُ مَكَّةَ مُسْنِتُوْنَ عِجَافٌ

عمرو العلا نے خشک سالی کے زمانہ میں اپنی قوم کو ثرید کھلایا جب کہ مکہ مکرمہ کے سردار قحط سالی کی وجہ سے دبلے ہو رہے تھے۔

ھَاشِمَةٌ: سر کا زخم جس سے کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ جائے۔

اِهْتَشَمَ كُلَّ مَا فِيْ ضَرْعِ النَّاقَةِ اونٹنی کے پستانوں سے تمام دودھ نچوڑ لیا۔محاورہ ہے۔

تَهَشَّمَ فُلَانٌ عَلٰى فُلَانٍ: کسی پر مہربان ہونا۔

(ھ ض م)

اَلْهَضْمُ: (ض) کے اصلی معنی کسی نرم چیز کو کچلنا کے ہیں۔محاورہ ہے۔ھَضَمْتُهٗ فَانْهَضَمَ میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ ٹوٹ گیا۔اور باریک سرکنڈا جسے بانسری کی طرح بجایا جاتا ہے اسے مَهْزُوْمَةٌ کہتے ہیں اور اسی سے نازک بانسری کو مِزْمَارٌ مُهْضَمٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ: اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہونے کی وجہ سے کچلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اَلْهَاضُوْمُ: کھانا ہضم کرنے کا چورن بَطْنٌ هَضُوْمٌ پچکا ہوا پیٹ۔كَشْحٌ مِهْضَمٌ: پتلی کمر۔

اِمْرَءَةٌ هَضِيْمَةُ الْكَشْحَيْنِ: پتلی کمر والی عورت اور استعارہ کے طور پر هَضْمٌ: بمعنی ظلم بھی آتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ (۲۰۔۱۱۲) تو ان کو ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔

(ھ ط ع)

هَطَعَ الرَّجُلُ بِبَصَرِهٖ کے معنی ہیں: اس نے نظر جما کر دیکھا اور گردن اٹھا کر چلنے والے اونٹ کو بَعِيْرٌ مُهْطِعٌ کہا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ﴾ (۱۴۔۴۳) (اور لوگ) سر اٹھائے ہوئے

---

[1] عمرو العلاء هاشم بن مناف جد رسول الله ﷺ ويكنى ابانضلة راجع الطبقات (۱ : ۴۳) والاشتقاق والبداية والنهاية (۲ : ۳۵۲) ورسائل جاحظ ۶۸ ونوادر ابى زيد (۱۶۷) وصبح الاعشى (۱ : ۱۵۸) والبخلاء (۲۳۰) والخلاف فى القائل نسبه بعضهم الى ابن الزبعرى۔ راجع السيرة (۱ : ۹۴) والعينى (۱ : ۱۴) وابن ابى الحديد (۳۰/۴۵۳) وامالى المرتضى (۱ : ۱۵۸/۲ : ۲۶۹) وفى اللسان (هشم) منسوب الى بنت هاشم وفى الكامل (۲۱۶) بغير عزو وفيه وعمر والذى بدل عمرو والعلا وقال الصواب عمرو العلى والشطر الثانى فى البحر (۵ : ۳۰۰) وفى تاريخ الطبرى (۲ : ۱۲) والمرزبانى ۳ قاله مطرو وبن كعب الخزاعى ۱۲۔

(میدان قیامت کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ نہ سکیں گی۔

﴿مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ﴾ (۵۴۔۸) اس بلانے والے کی طرف دوڑتے جاتے ہوں گے۔

(ھل)

هَلْ: یہ حرف استخبار اور کبھی استفہام کے لیے آتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:۔

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ (۶۔۱۴۹) کہدو کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے (اگر ہے) تو اسے ہمارے سامنے نکالو۔

اور کبھی تنبیہ، تبکیت یا نفی کے لیے چنانچہ آیات:۔ ﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ (۱۹۔۹۸) بھلا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا (کہیں) ان کی بھنک سنتے ہو۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (۱۹۔۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ (۶۷۔۳) ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو کیا تجھے (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟

میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیات:۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۲۔۲۱۰) کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں نازل ہو۔ اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (۶۔۱۵۸) یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ﴾ (۴۳۔۶۶) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت......

﴿هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۷۔۱۴۷) یہ جیسے عمل کرتے ہیں ویسا ہی ان کو بدلہ ملے گا۔

﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (۲۱۔۳) یہ شخص (کچھ بھی) نہیں ہے مگر تمہارے جیسا آدمی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تنبیہ اور اس کی سطوت سے تخویف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

(ھ ل ل)

اَلْهَلَالُ: مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اسے قمر کہا جاتا ہے اس کی جمع اَهِلَّةٌ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ﴾ (۲۔۱۸۹) (اے محمدؐ) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہدو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی) میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔ یعنی ہلال کے طلوع ہونے اور اس کے کم و بیش ہونے کی حکمت پوچھتے ہیں۔

تشبیہ کے طور پر هَلَالٌ کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) شکار کرنے کا نیزہ جو ہلال کی طرح دوشاخ کا ہوتا ہے۔ (۲) ایک قسم کا زہریلا سانپ (۳) کنویں کے تلے میں تھوڑا سا پانی جو گول دائرے کی شکل پر ہوتا ہے۔ (۴) چکی کا کنارہ۔ (جب کہ ٹوٹ جائے)

اَهَلَّ الْهِلَالُ کے معنی چاند نظر آنے کے ہیں۔ اور

اِسْتَهَلَّ کے معنی روئت ہلال ہیں۔لیکن کبھی استہلال بمعنی ہلال بھی آ جاتا ہے جیسے اِسْتِجَابَۃ بمعنی اَجَابَۃ الْاِهْلَالُ کے معنی چاند کے نظر آنے پر آواز بلند کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ عام آواز بلند کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے تشبیہاً اَهَلَّ الصَّبِیُّ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بچے نے آواز بلند کی اور آیت۔

﴿وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ (۲-۱۷۳) اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔

کے معنی ہیں کہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے یعنی جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِهْلَال اور تَهَلُّلٌ کے معنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے کے ہیں۔اور یہ لفظ جملہ مخفف ہے۔جیسے کہ تَبَسْمَلَ وَبَسْمَلَةٌ اور نَحْوَ قَلَ وَحَوْقَلَةٌ کے معنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنے کے ہیں اور اسی سے اِهْلَالِ بِالْحَجِّ ہے جس کے معنی بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے ہیں اور باریک جھر جھرے کپڑے کو ثواب مُهَلْهَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شعر مُهَلْهَلٌ ہے جس کے معنی عمدہ شعر کے ہیں۔

(ھ ل ک)

اَلْهَلَاكُ: یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ایک یہ کہ کسی چیز کا اپنے پاس سے جاتے رہنا خواہ وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے فرمایا:۔

﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطَانِيَهْ﴾ (۶۹-۲۹) ہائے! میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

دوسرے [۲] یہ کہ کسی چیز میں خرابی اور تغیر پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ طعام (کھانا) کے خراب ہونے پر هَلَكَ الطَّعَامُ بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی نسل کو نابود کر دے۔موت [۳] کے معنی میں جیسے فرمایا: ﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ﴾ (۴-۱۷۷) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے۔

اور قرآن پاک نے کفار کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (۴۵-۲۴) اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

قرآن پاک میں ہلاکت کا لفظ بری موت کے لیے استعمال ہوا ہے صرف آیت (۲-۲۵) اور آیت ﴿وَلَقَدْ جَآئَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآئَكُمْ بِهٖ حَتّٰى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا﴾ (۴۰-۳۴) اور پہلے یوسف (علیہ السلام) بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔تو جو وہ لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

میں موت کے معنی مراد ہیں۔چہارم [۴] یہ کہ کسی چیز کا اس دنیا سے کلی طور پر معدوم ہو جانا۔اور یہی معنی فنا کے ہیں جس کی طرف کہ آیت: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (۲۸-۸۸) اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ [۵] عذاب، خوف اور فقر پر بھی ہلاکت کا لفظ بولا جاتا ہے۔چنانچہ آیات:۔

﴿وَمَا يُهْلِكُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾

(۶۔۲۶) مگر (ان باتوں سے) اپنے آپ ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور (اس سے) بےخبر ہیں۔

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (۱۹۔۷۴) اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتیں ہلاک کر دیں۔ ﴿وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا﴾ (۷۔۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔

﴿فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنَاهَا﴾ (۴۳۔۴۵) اور بہت سی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا۔

﴿اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا﴾ (۷۔۱۵۵) کیا تو اس فعل کی سزا میں جو ہم سے بےعقل لوگوں نے کیا ہے ہمیں ہلاک کر دے گا؟

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:۔

﴿فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۴۶۔۵) سو اب وہی ہلاک ہوں گے۔ جو نافرمان تھے۔

میں ہلاکت سے ہلاکت کبریٰ یعنی عذاب مراد ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا (۱۵۹) لَا شَرَّ كَشَرٍّ بَعْدَهُ النَّارُ کہ اس شر کے برابر کوئی شر نہیں ہے جس کے بعد دوزخ کا سامنا ہو۔ اور فرمایا:۔

﴿وَمَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ﴾ (۲۷۔۴۹) اور ہم تو اس کے گھر والوں کے موقعہ ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔

اَلْهُلْكُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں اور جو چیز مُؤَدِّيْ اِلَى الْهَلَاكِ یعنی موجب ہلاکت ہو اسے تَهْلُكَة کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (۲۔۱۹۵) اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور اِمْرَءَةٌ هَلُوْكٌ کے معنی نازک خرام عورت کے ہیں۔ گویا وہ چلتے وقت زمین پر گری پڑتی ہے شاعر نے کہا ہے [1] (الطّویل)

(۴۵۴) مَرِيْضَاتُ اَوْبَاتِ التَّهَادِيْ كَاَنَّمَا
تَخَافُ عَلٰى اَحْشَائِهَا اَنْ تَقَطَّعَا

وہ عورتوں کے درمیان مریض کی طرح لڑکھڑا کر اس انداز سے چلتی ہے گویا اسے اپنی کمر یا انتڑیوں کے کٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

اور کنایۃ کے طور پر هَلُوْكٌ کا بدکار عورت کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مائل ہو کر خراماں خراماں چلتی ہے۔

اَلْهَالِكِيُّ اصل میں یہ هَالِكَةٌ قبیلہ کے ایک آہنگر کا نام تھا پھر اس مناسبت سے ہر آہنگر کو هَالِكِيٌّ کہا جانے لگا ہے۔

اَلْهُلْكُ: (ایضاً) برباد ہونے والی چیز۔

(ھ ل م)

هَلُمَّ: (اسم فعل) کے معنی کسی چیز کی طرف بلانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل هَالُمَّ ہے۔ اور یہ لَمَمْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اصلاح کرنے کے ہیں۔ هَا کا الف حذف ہونے کے بعد هَلُمَّ بن گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل هَلْ اَلَمَّ ہے گویا یہ اصل میں هَلْ لَّكَ فِيْ كَذَا اَمَّهٗ...... (بمعنی قصدہ) کا مخفف ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

---

[1] فی الحماسة لابی تمام (۲: ۹۳) قاله مسلم بن الولید وفی المرزوقی رقم (۸۴۹۸) "آخر" وفی المحاضرات للمؤلف (۲: ۱۳۹) ویستحسن لـلسعدی ای لرجل من بنی سعد وبعده: تسیب انسیاب الایم اخصره الندی۔ فرفع من اعطافه ماتر فعا۔ والبیتان فی الحیوان (۴: ۲۵۹) وفی روایته مریضة اثناء التهادی ویرفع من اطرافه بدل فرفع من اعطافه والبیت فی مجموعة المعانی (۲۵۹)۔

﴿وَ الْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا﴾ (۳۳۔۱۸) اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ بعض اسے فعل غیر متصرف مانتے ہیں اور تثنیہ، جمع (نیز تذکیر و تانیث) میں اسے ایک ہی حالت پر رہنے دیتے ہیں اور قرآن پاک بھی اسی کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اور بعض فعل متصرف مانتے ہیں (اور آخر میں ضمائر کا الحاق کرتے ہیں جیسے) هَلُمَّا، هَلُمُّوْا، هَلُمِّیْ، هَلْمُمْنَ۔

(ھ م م)

اَلْهَمُّ کے معنی پگھلا دینے والے غم کے ہیں اور یہ هَمَمْتُ الشَّحْمَ فَانْهَمَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے چربی کو پگھلایا چنانچہ وہ پگھل گئی اصل میں هَمَّ کے معنی اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل ہی میں ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ [1] ()

(۴۵۵) وَهَمُّكَ مَالَمْ تُمْضِهٖ لَكَ مُنْصِبٌ

اور جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تجھے بے چین رکھے گا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْا﴾ (۵۔۱۱) جب ایک جماعت ... نے ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں۔

﴿وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا﴾ (۱۲۔۲۴) اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے (اگر)

﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ (۳۔۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے جی چھوڑ دینا چاہا۔

﴿لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ﴾ (۴۔۱۱۳) تو ان میں سے ایک جماعت ...... قصد کر ہی چکی تھی۔

﴿وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ﴾ (۹۔۱۳) اور انہوں نے پیغمبر (خدا کے جلاوطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا)

﴿وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ﴾ (۴۰۔۵) اور ہر امت نے اپنے پیغمبر کے بارے میں یہی قصد کیا کہ......۔

اَهَمَّنِیْ كَذَا: مجھے فلاں چیز نے بے چین کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ (۳۔۱۵۴) اور کچھ لوگ جن کو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ محاورہ ہے: هٰذَا رَجُلٌ هَمُّكَ مِنْ رَجُلٍ اَوْهَمَّتُكَ مِنْ رَجُلٍ: وہ آدمی تجھے بس کرتا ہے (بمعنی نَاهِیْكَ) اَلْهَوَامُّ حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے۔ رَجُلٌ هَمٌّ: پیر فرتوت، مونث هِمَّةٌ گویا کبرسنی نے اسے پگھلا دیا ہے۔

(ھ م د)

هَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کا بجھ جانا کے ہیں۔ اور خشک اور بنجر زمین کو اَرْضٌ هَامِدَةٌ کہتے ہیں اور نَبَاتٌ هَامِدَةٌ کے معنی خشک گھاس کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿وَ تَرَی الْاَرْضَ هَامِدَةً﴾ (۲۲۔۵) اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے (کہ ایک وقت میں) زمین خشک (پڑی ہوتی ہے)

اَلْاِهْمَادُ (افعال) کے معنی کسی جگہ اقامت کرنے کے ہیں گویا وہ سکونت پذیر ہو کر بجھ گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہماد کے معنی سرعت رفتاری کے بھی آتے ہیں۔ اگر یہ قول صحیح ہو تو یہ لفظ اِشْكَاءٌ کی طرح (اضداد سے) ہوگا۔ جو کبھی شکایت کرنے اور کبھی ازالہ شکایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(ھ م ر)

اَلْهَمْرُ (ض) کے معنی آنسو یا پانی بہا دینے

---

[1] لم اجده۔

کے ہیں۔جیسے هَمَرَہٗ فَانْهَمَرَ: اس نے پانی بہایا چنانچہ وہ بہہ پڑا۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ﴾ (۵۴۔۱۱) پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیئے۔

هَمَرَ مَا فِي الضَّرْعِ: تھنوں سے تمام دودھ دوہ لینا۔

هَمَرَ الرَّجُلُ فِي الْكَلَامِ: باتوں میں بہ جانا (یعنی بکواس کرنا) فُلَانٌ يُهَامِرُ الشَّيْءَ کوئی چیز مقدار سے زیادہ لے لینا۔چٹ کر جانا اور اسی سے محاورہ ہے۔

هَمَرَ لَهٗ مِنْ مَّالِهٖ: اس نے اسے بہت زیادہ مال دیا۔

اَلْهَمِيْرَةُ: بہت بوڑھی عورت۔

(ھ م ز)

اَلْهَمْزُ کے اصل معنی کسی چیز کو دبا کر نچوڑنے کے ہیں۔چنانچہ محاورہ ہے: هَمَزْتُ الشَّيْءَ فِي كَفِّيْ میں نے فلاں چیز کو اپنی ہتھیلی میں دبا کر نچوڑا اور اس سے حرف ہمزہ ہے جو کہ زبان کو جھٹکا دے کر پڑھا جاتا ہے اور همز کے معنی غیبت کرنا بھی آتے ہیں۔قرآن پاک میں ہے: ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (۶۸۔۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا، چغلیاں لئے پھرنے والا۔اور هَامِزٌ وَهَمْزَةٌ وَهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا کے ہیں جو قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۱۰۴۔۱) ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغلخور کی خرابی ہے۔

شاعر نے کہا ہے [1] (البسیط)

(۴۵۶) وَاِنِ اغْتَبْتُ فَاَنْتَ الْهَامِزُ اللُّمَزَةُ

اگر غیبت کی جائے تو تو طعن آمیز اشارتیں کرنے والا بدگو ہے۔

قرآن میں ہے۔﴿مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (۲۳۔۹۷) کہو اے پروردگار میں شیاطین کے وساوس سے پناہ مانگتا ہوں۔

(ھ م س)

اَلْهَمْسُ کے معنی خفی آواز کے ہیں اور هَمْسُ الْاَقْدَامِ کے معنی ہیں پاؤں کی ہلکی سی آہٹ۔قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا﴾ (۲۰۔۱۰۸) تو تم خفی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔

(ھنا)

هُنَا (یہاں) یہ زمانہ اور جگہ قریب کی طرف اشارہ کرنے کے آتا ہے۔لیکن عموماً جگہ کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذا، ذاك ذالك، کی طرح هُنَا هُنَاكَ وَهُنَالِكَ تینوں طرح بولا جاتا ہے۔قرآن میں ہے: ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ (۳۸۔۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔

﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (۵۔۲۴) ہم یہیں بیٹھے رہیں

---

[1] البیت لزیاد الاعجم وصدرہ: وقدنی بودی اذا الاقیتنی...... وفی روایۃ وان اغیّب علی البناء للمجھول وفی روایۃ اللسان (ھمز) والطبرسی (۳۰: ۲۲۹) وان تعنیبت وکنت بدل فانت والبیت من شواھد ابی عبیدۃ فی مجازہ رقم (۲۹۴) وفی روایتہ۔ اذا لقیتك تبدی لی مکاشرہ۔ وان اغیت فانت العائب اللمزہ۔ راجع ایضا شواھد الکشاف (۴۰) واللسان (ھمز) والطبری (۱۰۔۱۵۶) (۳۰/۲۹۱) والسحاوندی (۱: ۲۰۱) واصلاح یعقوب (۴۲۸) واعراب ثلاثین (۱۸۰) وزیاد الاعجم ھو زیاد بن سلیمان الاعجم ویکنی ابا امامۃ لہ ترجمۃ فی المؤتلف (۱۳۱) والاغانی (۱۴۔۹۸)

گے۔﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ﴾ (۱۰۔۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرے گا۔

﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۳۳۔۱۱) وہاں مومن آزمائے گئے۔

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ (۱۸۔۴۴) یہاں (سے ثابت ہوا کہ) حکومت سب خدائے برحق کی ہے۔

﴿فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ﴾ (۷۔۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

(ھن)

هَنٌ: شرمگاہ یا اس قسم کی قبیح الذکر چیزوں سے کنایہ ہوتا ہے۔محاورہ ہے:۔فِیْ فُلَانٍ هَنَاتٌ: فلاں میں بری خصلتیں ہیں اور روایت (۱۶۰) سَتَكُوْنُ هَنَاتٌ (عنقریب فتنہ وفساد ظاہر ہوں گے) میں بھی هَنَاتٍ اسی معنی پر محمول ہے۔

(ھ ن ء)

اَلْهَنِیْئُ: ہر وہ چیز جو بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے اور نتائج کے اعتبار سے بھی خوش کن ہو اصل میں یہ لفظ طعام کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور هَنِیءَ الطَّعَامُ فَهُوَ هَنِیْءٌ کے معنی طعام کے خوشگوار ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ (۴۔۴) تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (۶۹۔۲۴) اور جو (عمل) تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو۔اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۷۷۔۴۳) جو (عمل) تم کرتے رہے تھے اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔

اَلْهِنَاءُ: ایک قسم کا تارکول جو (خارشی اونٹ پر) ملا جاتا ہے۔چنانچہ محاورہ ہے: هَنَأْتُ الْاِبِلَ فَهِیَ مَهْنُوْءَةٌ یعنی میں نے اونٹ پر تارکول ملا۔

(ھ و د)

اَلْهُوْدُ کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے اَلتَّهْوِیْدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی رینگنے کے ہیں۔لیکن عرف میں هُوْدٌ بمعنی تَوْبَةٌ استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (۷۔۱۵۶) ہم تیری طرف رجوع کر چکے۔بعض نے کہا ہے لفظ یہود بھی اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ سے ماخوذ ہے۔یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا۔لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لیے جیسا کہ لفظ نصاریٰ اصل میں مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ سے ماخوذ ہے۔پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے۔هَادَ فُلَانٌ کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ (۲۔۶۲) جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی۔ کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی مسمیٰ کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں۔مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے متعلق تَفَرْعَنَ فُلَانٌ (کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح تَطَفَّلَ فُلَانٌ کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلائے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔

تَهَوَّدَ فِیْ مَشْیِهٖ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں۔ اور یہود کے توراۃ کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لیے گئے ہیں۔

هَوَّدَ الرَّائِضُ الدَّابَّةَ: رائض کا سواری کو نرمی سے چلانا

هُوْدٌ: اصل میں هَائِدٌ کی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام ہے[1]

(ھ و ر)

هَارَ الْبَنَاءُ تَهَوَّرَ: کے معنی ہیں عمارت منہدم ہوگئی اور یہی معنی اِنْهَارَ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (۹۔۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ میں لے گری۔

ایک قرأت میں هَارَ ہے اور بِئْرٌ هَائِرٌ وَهَارٌ وَهَارٍ وَمُهَارٍ: ویران کنویں کو کہتے ہیں پھر ویران کنویں کی مناسبت سے..... کمزور اور عاجز آدمی کو بھی هَارٍ یا هَائِرٌ کہا جاتا ہے۔

تَهَوَّرَ اللَّيْلُ: رات کا سخت تاریک ہونا۔

تَهَوَّرَ الشِّتَاءُ: کے معنی جاڑے کا اکثر موسم گزر جانے کے ہیں اور بعض نے تَهَيَّرَ: کہا ہے جو اجوف یائی (ھ ی ر) ہے کیونکہ اگر یہ وادی ہوتا تو تَهَيَّرَ کی بجائے تَهَوَّرَ کہا جاتا۔

(ھ و ن)

اَلْهَوَانُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کا کسی ایسے موقعہ پر نرمی کا اظہار کرنا جس میں اس کی سبکی نہ ہو یہ قابل ستائش ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵۔۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر متواضع ہوکر چلتے ہیں۔

اور آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔(۱۶۱) اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لَيِّنٌ: کہ مومن متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ دوم هَانٌ بمعنی ذلت اور رسوائی کے آتا ہے یعنی دوسرا انسان اس پر مسلط ہوکر اسے سبکسار کرے تو یہ قابل مذمت ہے چنانچہ اس معنی میں فرمایا:﴿فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ﴾ (۴۶۔۲۰) سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے ﴿فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ﴾ (۴۱۔۱۷) تو...... کڑک نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت کا عذاب تھا۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (۲۔۹۰) اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (۳۔۱۷۸) اور آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (۲۲۔۵۷) انکے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ (۲۲۔۱۸) اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔

هَانَ الْاَمْرُ عَلٰى فُلَانٍ (علی کے ساتھ) کے معنی کسی معاملہ کے آسان ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ﴾ (۱۹۔۲۱) کہ یہ مجھے آسان ہے۔

---

[1] هود بن عبدالله يتصل نسبه الى نوح عليه السلام بسبع وسائط ارسل الى قوم عاد انظر لقصّته فى القرآن (۷۔۶۵ تا ۷۲) (۲۶۔۱۳۲ تا ۱۴۰ ﴿﴾(۴۶۔ ۲۱ تا ۲۶)

﴿وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (۳۰۔۲۷) اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔

﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا﴾ (۲۴۔۱۵) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے ہو۔

هَاوُوْنَ: کمزور یہ هَوْنٌ سے ہے اور چونکہ فَاعُلٌ کا وزن کلام عرب میں نہیں پایا اس لیے هَاوُنٌ کی بجائے هَاوُوْنٌ (بروزن فاعول) کہا جاتا ہے۔

(ھ و ی)

اَلْهَوٰی: (س) اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اور جو نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو اسے بھی هَوَیٰ کہہ دیتے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے شرف ومنزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور آخرت میں اسے هَاوِيَةٌ (دوزخ) میں لے جا کر ڈال دیں گی۔

اَلْهَوِيُّ: (ض) کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾ (۱۰۱۔۹) اسکا مرجع هاویہ ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ هَوَتْ اُمُّهٗ کی طرح ایک محاورہ ہے اور بعض کے نزدیک دوزخ کے ایک طبقے کا نام ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" اور بعض نے آیت: ﴿وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ میں هَوَاءٌ کے معنی خالی یعنی بے قرار کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا﴾ (۲۸۔۱۰) موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خواہشات انسانی کی اتباع کی سخت مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ ﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ﴾ (۴۵۔۲۳) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ ﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى﴾ (۳۸۔۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ ﴿وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ﴾ (۱۸۔۲۸) اور وہ اپنی خواہش کی پیروی نہ کرتا ہے۔ اور آیت: ﴿وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ (۲۔۱۲۰) اگر تم ان کی خواہشوں پر چلو گے۔ میں اَهْوَاءٌ جمع لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ ان سے ہر ایک کی خواہش دوسرے سے مختلف اور جدا ہے۔ اور یہ کہ ایک کی خواہش غیر متناہی ہونے میں اَهْوَاء کا حکم رکھتی ہے لہٰذا ایسی خواہشات کی پیروی کرنا سراسر ضلالت اور اپنے آپ کو ورطہ حیرت میں ڈالنے کے مترادف ہے نیز فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۴۵۔۱۸) اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا ﴿وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا﴾ (۵۔۷۷) اور اس قوم کی خواہشوں پر مت چلو (جو تم سے پہلے) گمراہ ہو چکے ہیں۔ ﴿قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ﴾ (۶۔۵۶) (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں تمہاری خواہشوں پر نہیں چلتا۔ ایسا کروں تو میں گمراہ ہو چکا ہوں گا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (۴۲۔۱۵) اور ان (یہود ونصاریٰ کی خواہشوں پر مت چلو اور ان سے (صاف) کہہ دو کہ میرا تو اس پر ایمان ہے۔ جو خدا نے اتارا۔

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۲۸۔۵۰) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

اَلْهُوِيُّ: (بفتح الہا) کے معنی پستی کی طرف اترنے کے ہیں۔اور اس کے بالمقابل هُوِيٌّ (بضم الہا) کے معنی بلندی پر چڑھنے کے ہیں۔ [1] شاعر نے کہا ہے [2] (الکامل)

(۴۵۷) يهوِىْ محارِمَهَا هُوِىَّ الْاَجْدَلِ

اس کی تنگ گھاٹیوں میں صفرہ کی طرح تیز چلتا ہے۔

اَلْهَوَاءُ: آسمان وزمین کے مابین فضا کو کہتے ہیں۔اور بعض نے آیت:﴿وَ اَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ (۱۴۔۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی بے قرار ہونے میں هَوَاء کی طرح ہوں گے۔

تَهَاوَى: (تفاعل) کے معنی ایک دوسرے کے پیچھے مَهْوَاة (یعنی گڑھے) میں گرنے کے ہیں۔

اَهْوَاهُ: اسے فضا میں لے جا کر نیچے دے مارا۔ قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى﴾ (۵۳۔۵۳) اور اسی نے الٹی بستیوں کو دے پٹکا۔

اِسْتَهْوٰى کے معنی عقل کو لے کر اڑنے اور پھسلا دینے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔﴿كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ﴾ (۶۔۷۱) جیسے کسی کو شیاطین (جنات) نے...... بھلا دیا ہو۔

(ہ ی ت)

هَيْتَ اور هَلُمَّ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں اور آیت:﴿وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ﴾ (۱۲۔۲۳) کہنے لگی (یوسف علیہ السلام) چلے آؤ۔ میں ایک قرأت هِيْتُ لَكَ بھی ہے۔جس کے معنی تَهَيَّاتُ لَكَ کے ہیں یعنی میں تیرے لیے تیار ہوں اور هَيَّتَ بِهٖ وَتَهَيَّتَ کے معنی هَيْتَ لَكَ کہنے کے ہیں۔

هَاتِ: (اسم فعل) لاؤ۔تثنیہ اور جمع کے لیے هَاتِيَا وَهَاتُوْا آتا ہے۔قرآن پاک میں ہے ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ (۲۔۱۱۱) (اے پیغمبر علیہ السلام) ان سے تم کہدو کہ...... دلیل پیش کرو۔فراء کا کہنا ہے کہ کلام عرب میں هَاتَيْتُ مستعمل نہیں ہے یہ صرف اہل حیرہ کی لغت ہے اور اس سے لاهَاتِ (فعل نہی) استعمال نہیں ہوتا۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلْمُهَاتَاهُ وَالْهِتَاءُ (مفاعلہ) هات صیغہ امر ہے

هَيْهَاتُ یہ کلمہ کسی چیز کے بعید از قیاس ہونے کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں هَيْهَاتَ هَيْهَاتِ اور هَيْهَاتًا تین لغت ہیں اور اسی سے قرآن پاک میں ہے۔﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ﴾ (۲۳۔۳۶) جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (بہت) بعید اور (بہت) بعید ہے۔

زجاج نے هَيْهَاتَ کے معنی اَلْبُعْدُ کیے ہیں دوسرے

---

[1] قال الخناجی فی شرح الدرة (۲۵۲) لیس هذا مما اتفقوا علیه بل هو قول لبعض اهل اللغة (انظر ایضًا شرح اشعار صفدیل للمرزوقی ۱۲۔

[2] لابی کبیر الهذلی عامر بن الحلبس) یصف تابط شرابا لشجاعة ومسدر واذا رمیت به الفحاج رأیتَهٗ...... والبیت فی الحماسة (مع المرزوقی ۹۱۔۱۲) وفیه غوار بها بدل مخار مها واللسان (خرم) وشواهد الکشاف ۹۶ والبحر (۵: ۴۲۹) والسیوطی ۸۱۔

اہل لغت نے کہا ہے کہ زجاج کو (لِمَا) کے نام کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اس کی اصل بَعُدَ الْاَمْرُ وَالْوَعْدُ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ہے اور اس میں ایک لغت هَيْهًا بھی ہے۔ اَلْفَسْوِیْ نے کہا ہے کہ هَيْهَاتِ کسرہ تا کے ساتھ هَيْهَاتَ (بفتحہ تاء) کی جمع ہے۔

(ھ ی ج)

هَاجَ الْبَقْلُ: (ض) کے معنی بقول کے پک کر زور پڑ جانے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا﴾ (۳۹۔۲۱) پھر وہ (پک کر) خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ) زرد ہو گئی ہے۔

اور اَهْيَجَتِ الْاَرْضُ کے معنی زمین کے خشک گھاس والی ہونے کے ہیں۔ هَاجَ الدَّمُ وَالْفَحْلُ هَيْجًا وَهِيَاجًا کے معنی خون یا نر اونٹ کے جوش مارنے کے ہیں اور هَيَّجْتُ الشَّرَّ وَالْحَرْبَ کے معنی شر یا لڑائی بھڑکانے کے اسی سے اَلْهَيْجَاءُ (بالمد والقصر) ہے جس کے معنی لڑائی کے ہیں۔اور هَيَّجْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو برانگیختہ کرنے کے ہیں۔

(ھ ی م)

رَجُلٌ هَيْمَانُ وَهَائِمٌ: سخت پیاسا آدمی۔ هَائِمٌ کی جمع هِيْمٌ آتی ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ﴾ (۵۶۔۵۵) اور پیو گے بھی تو اس طرح جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

اَلْهِيَامُ: اونٹ کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے اسے اتنی پیاس لگتی ہے کہ سیر نہیں ہوتا۔اور شوریدگی عشق کے لیے یہ کلمہ ضرب المثل ہے۔ هَامَ عَلٰى وَجْهِهٖ سرگردان پھرنا۔قرآن پاک میں ہے:۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ﴾ (۲۶۔۲۲۵) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔

یعنی مدح، ذم وغیرہ ہر قسم کے موضوع سخن میں وہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور اسی سے اَلْهَائِمُ عَلٰى وَجْهِهٖ ہے جس کے معنی سرگردان پھرنے کے بھی آتے ہیں۔اور شوریدہ عشق اور پیاسا ہونے کے بھی اور هِيْمٌ کے معنی پیاسے اونٹوں کے ہیں اور خشک ریت بھی چونکہ پیاسے اونٹوں کی طرح پانی نگل لیتی ہے اس لیے خشک ریت کو اَلْهِيَام کہا جاتا ہے۔

(ھ ی ء)

اَلْهَيْئَةُ: اصل میں کسی چیز کی حالت کو کہتے ہیں اس سے کہ وہ حالت محسوسہ ہو یا معقولہ، لیکن عموماً یہ لفظ حالت محسوسہ یعنی شکل وصورت پر بولا جاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:۔﴿اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ (۳۔۴۹) کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بہ شکل پرند بناتا ہوں۔

اَلْمُهَايَاةُ: (مہموز) جس کے لیے لوگ تیار ہوں۔اور اس پر موافقت کا اظہار کریں۔

هَيَّاءَ کے معنی کسی معاملہ کے لیے اسباب مہیا کرنے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ (۱۸۔۱۰) اور ہمارے کام میں درستی (کے سامان) مہیا کر۔

﴿وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ (۱۸۔۱۶) اور تمہارے کاموں میں آسانی (کے سامان) مہیا کرے گا۔

اور اِيَّاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا، میں ایک لغت هِيَّاكَ اَنْ

تَفْعَلَ کَذَا بھی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے [1]

(۴۵۸) هِيَّاكَ هِيَّاكَ وَحَنْوَاءَ الْعَنَقِ

گردن مروڑنے یعنی تکبر سے دور رہو۔

(ھا)

ھَا: یہ حرف تنبیہ ہے اور ذَا، ذہٖ، اُوْلَاءِ اسم اشارہ کے شروع میں آتا ہے اور اس کے لئے بمنزلہ جز سمجھا جاتا ہے مگر ھَا اَنْتُمْ میں حرف ھا استفہام کے لیے ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ﴾ (۳۔۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا۔

﴿هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَهُمْ﴾ (۳۔۱۱۹) دیکھو تم ایسے (صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو۔

﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ﴾ (۴۔۱۰۹) بھلا تم لوگ......ان کی طرف سے بحث کر لیتے ہو۔

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲۔۸۵) پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔

﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ﴾ (۴۔۱۴۳) نہ ان کی طرف (ہوتے ہو) نہ ان کی طرف

هَاءُمُ (اسم فعل) بمعنی خُذْ بھی آتا ہے اور هَاتِ (لاؤ) کی ضد ہے اور اس کی گردان یوں ہے۔

هَاؤُمَ، هَاؤُمَا، هَاؤُمُوْا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿هَاۗؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ﴾ (۶۹۔۱۹) لیجیے میرا اعمالنامہ پڑھیے۔ اور اس میں ایک لغت بغیر میم کے بھی ہے۔ جیسے هَا، هَاآ، هَاؤُا، هَائِیْ، هِأْنَ بروزن خِفْنَ بعض اس کے آخر میں كَ ضمیر کا اضافہ کر کے تثنیہ جمع اور تذکیر و تانیث کے لیے ضمیر میں تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے هَاكَ، هَاكُمَا الخ

اور بعض اسم فعل بنا کر اسے هَاءَ يَهَاءُ بروزن خَافَ يَخَافُ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک هَائٰی يُهَائِی مثل نَادٰی يُنَادِی ہے اور بقول بعض متکلم مضارع کا صیغہ اَهَاءُ بروزن اَخَالُ آتا ہے۔

❀❀❀

---

[1] وفی اللسان (حنو) انشده اللحیانی عن الکسائی وصدره: یاخالِ هلا قلت اِذْاَعْطَیْتَنِی۔ وایضا اللسان (هیا) والبیت فی ابدال ابی الطیب ۲/ ۵۷۰ وبعده۔ اعطیتنیها فاتیا اضراسها۔ لوتعلف البیض به لم نیفلق قال صاحب الابدال وعند الفراء انما یقال هیاك فی موضع زجر ولا یقولون هیاك اکرمت ۱۲۔

کِتَابُ الْیَاء

(ی ب س)

یَبِسَ (س) اَلشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کا خشک ہو جانا کے ہیں۔ اور تر گھاس جب خشک ہو جائے تو اسے یَبْسٌ (بسکون الباء) کہا جاتا ہے اور جس جگہ پر پانی ہو اور پھر خشک ہو جائے اسے یَبَسٌ (بفتح البا) کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ (۲۰۔۷۷) تو ان کے لیے دریا میں لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو۔

اور پنڈلیوں کے جن حصوں پر گوشت نہیں ہوتا ان کو اَیْبَسَانِ (تثنیہ) کہا جاتا ہے۔

(ی ت م)

اَلْیُتْمُ کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پدری سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یتیم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یُتْمٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:﴿اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوٰى﴾ (۹۳۔۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔

﴿يَتِيمًا وَّاَسِيرًا﴾ (۷۶۔۸) یتیموں اور قیدیوں کو۔

یَتِیْم کی جمع یَتَامٰی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ﴾ (۴۔۲) اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کر دو۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى﴾ (۴۔۱۰) جو لوگ یتیموں کا مال (ناجائز طور پر) کھاتے ہیں۔ ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ (۲۔۲۲۰) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

مجازاً ہر یکتا اور بے مثل چیز کو عربی میں یتیم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ گوہر یکتا کو دُرَّۃٌ یَتِیْمَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔ اور اس میں اس کے مادہ کے منقطع ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور دُرَّۃٌ کے ساتھ تشبیہ دے کر یکتا مکان کو بھی یتیم کہہ دیا جاتا ہے۔

(ی د ی)

اَلْیَدُ کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں یَدْیٌ (ناقص یائی) ہے کیونکہ اس کی جمع اَیْدٍ وَیَدِیٌّ اور تثنیہ یَدَیَانِ اور فعل یَدَیْتُہٗ آتا ہے جس کے معنی ہاتھ مارنے کے ہیں۔

عام طور پر اس کی جمع اَیْدٍ (افعل) آتی ہے کیونکہ اکثر طور پر فعل (بسکون عین) کی جمع افعل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فَلْسٌ وَاَفْلُسٌ وَکَلْبٌ وَاَکْلُبٌ لیکن کبھی اس کی جمع یَدِیٌّ (فعیل) بھی آ جاتی ہے جیسے عَبْدٌ وَعَبِیْدٌ اور کبھی فَعَلٌ (بفتح العین) کی جمع بھی اَفْعَلٌ کے وزن پر آ جاتی ہے جیسے زَمَنٌ، اَزْمُنٌ وَجَبَلٌ، اَجْبُلٌ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾ (۵۔۱۱) جب ایک جماعت نے

ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں تو اس نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔

﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ﴾ (۷۔۱۹۵) یا ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

استعارہ کے طور پر یَـدٌ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے بمعنی نعمت، اور اسی سے یَدَیْتُ اِلَیْهِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی پر احسان کرنے کے ہیں۔ اس کی جمع اَیَادٍ آتی ہے اور کبھی یَدِیٌّ بھی آ جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❶ ()

(۹۵۹) فَاِنَّ لَهٗ عِنْدِیْ یَدِیًّا وَاَنْعُمَا

کیونکہ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔

(۲) کسی چیز پر قبضہ یا ملک جیسے هٰذَا فِیْ یَدِ فُلَانٍ (یہ فلاں کے اختیار میں ہے) قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿اِلَّآ اَنْ یَّـعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ (۲۔۲۳۷) ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد، جن کے قبضہ قدرت میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں۔

نیز محاورہ:۔ وَقَعَ فِیْ یَدَیْ عَدْلٍ: وہ عدل کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ (۳) بمعنی قوت جیسے لِفُـلَانٍ یَدٌ عَلٰی کَذَا فلاں کو اس پر قدرت حاصل ہے۔ مَـالِـیْ لِکَذَا یَدٌ اَوْ مَالِیْ بِهٖ یَدَانِ: یہ میری قدرت سے باہر ہے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (الکامل)

(۹۶۰) فَاعْمَدْ لِمَا تَعْلُوْ فَمَا لَكَ بِالَّذِیْ لَا تَسْتَطِیْعُ مِنَ الْاُمُوْرِ یَدَانِ

جو کام تو کر سکتا ہے اس کا قصد کیجیے اور جو امور تیری استطاعت سے بالا ہیں ان سے تعلق مت رکھیے۔ اس معنی کے لحاظ سے تشبیہ کے طور پر دَهْـرٌ کی طرف بھی یَـدٌ کی اضافت ہوتی ہے۔ جیسے یَدُ الدَّهْرِ اَوْ یَدُ الْمِسْنَدِ اور شاعر نے ہوا کی طرف ید کی نسبت کرتے ہوئے کہا ہے ❸ (الکامل)

(۹۶۱) بِیَدِ الشَّمَالِ زِمَامُهَا

جب کہ اس کی باگ ڈور شمالی ہوا کے ہاتھ میں تھی کیونکہ ہوا میں زور اور قوت ہوتی ہے۔

وَضَـعَ یَـدَهٗ فِیْ کَذَا کے معنی کسی کام کو شروع کرنے کے ہیں اور اطلاق اَلْیَـدِ وَاِمْسَـاکُهَا: سخاوت اور بخل سے کیا ہوتا ہے جیسا کہ سخی کے متعلق یَـدُهٗ مُـطْلَقَةٌ اور بخیل کے متعلق یَـدُهٗ مَغْلُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

❶ لاعشی القیسی الجاهلی یمدح نعمان بن المنذر و صدره : فلن اذكر النعمان الابصالح......... ولم اجد فی دیوانه والبیت فی اللسان (یدی سود، نعم) وشواهد الكشاف والمحكم (نعم) ونسبه الی النابغة وابن البری نسبه یضمرة بن ضمرة النهشلی

❷ لكعب بن سعد الغنوی كما فی اللسان (وعلا) والقالی (۲: ۳۱٤) وهو الصواب لان فی اول الابیات خطاب لابنه علی بن كعب وقیل لعلی بن عدی الغنوی وقال بعضهم لعلی بن العذیر الغنوی كما فی البیان (۳: ۸۰) والاضداد للاصمعی ۷ السجستانی ۱۰۸ وابن الانباری ٤۳، ۵۷ والسمط (۱: ۸۳) وتهذیب الالفاظ (٤۵٤) واضدادو ابن السكیت (۱٦٦) وابی الطیب (٤۰۱) والبحر (۵: ۱۵۸) (۳: ۵۲٤)

❸ قطعة بیت للبید فی معلقته (۱۵۸) والبیت یتمامه وغداة ریح قد كشفت وقرة۔ اذا صبحت...... والبیت فی اللسان (ید) والانصاف (۱٤٤) والصناعتین (۲۸۵) والعمدة (۱: ۲٦۹) الحصری) (٤: ۱۲۳) وشرح السبع لابن الانباری ۵۷۸ وشرح العشر للتبریزی (۱۵۸) وفی روایة قدوزعت بدل قد كشفت ۱۲۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (۵۔۶۴) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ بندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت ہو، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

محاورہ ہے: نَفَضْتُ يَدِيْ عَنْ كَذَا: میں نے فلاں چیز سے ہاتھ جھاڑ لیا یعنی اسے چھوڑ دیا۔

اَيَّدَ (تفعیل) کے معنی کسی کی تائید یا اس کی مدد کرنے کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (۵۔۱۱۰) جب میں نے روح القدس (یعنی جبریل) سے تمہاری مدد کی۔اور آیت کریمہ۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ (۲۔۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

میں کتابت کو ہاتھوں کی طرف نسبت کرکے ان تحریروں کے بناوٹی ہونے پر تنبیہ کی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان کی دروغ بیانی پر تنبیہ کرنے کے لیے قول کی نسبت اَفْوَاہ کی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:۔﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا﴾ (۷۔۹۵) یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

میں اَيْدٍ (ہاتھ) سے مراد قوت ہے اسی معنی میں فرمایا: ﴿اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ﴾ (۳۸۔۴۵) جو قوت والے اور صاحب نظر تھے۔

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ﴾ (۳۸۔۱۷) اور ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (۹۔۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

میں عَنْ يَّدٍ سے مراد یہ ہے کہ اس نعمت کے عوض جو ان کی سکونت گاہوں میں برقرار رکھے جانے سے انہیں حاصل ہوئی ہے، جزیہ ادا کریں تو عَنْ يَّدٍ موضع حال میں ہے۔ اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تمہاری حاکمیت اور اپنی محکومی کا اقرار کرتے ہوئے جزیہ ادا کریں۔محاورہ ہے: خُذْ كَذَا اَثَرَ ذِيْ يَدَيْنِ (۴) يَدٌ بمعنی حامی اور مددگار کے آتا ہے جیسے اَنَا يَدُكَ (میں تمہارا مددگار ہوں) فُلَانٌ يَدُ فُلَانٍ (وہ فلاں کا مددگار ہے) اسی معنی میں اولیاء اللہ کو اَيْدِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے۔اسی بنا پر آیت کریمہ:۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ (۴۸۔۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں۔خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

میں آنحضرت ﷺ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے تو گویا اللہ کا ہاتھ ان پر ہے۔اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں۔ [1] (۱۶۲) ((لا يَزَالَ الْعَبْدُ يتقرب الى بالنوافل حتى احبه فاذا احببته كنت سمعه الذى يسمع به

[1] الحديث باختلاف الفاظه فى الطب عن ابى امامة وابن عساكر عن انسؓ وعائشة والحكيم ع طس ابونعيم فى الطب ق فى الزهد (انظر كنزالعمال رقم (۱۱۵۶-۶۱)

وبصره الذی یبصره ویده التی یبطش بها))
''بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں جس سے سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔''

﴿مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ﴾ (۳۶۔۷۱) جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائیں۔

اسی طرح آیت:

﴿لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ (۳۸۔۷۵) جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

میں اللہ کے اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا کرنے سے وہ خصوصی تولیت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اور اس عنایت ربانی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ یَـدٌ کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ اعضاء انسانی میں سب سے اعلیٰ عضو ہے جس کے ذریعہ انسان کوئی کام سرانجام دیتا ہے لہٰذا یہاں لفظ ید سے تشبیہ کا وہم نہیں ہونا چاہیے۔بعض نے کہا ہے کہ بِیَدَیَّ کے معنی بِنِعْمَتِهٖ ہے اور قَطَعْتُهٗ بِالسِّکِّیْنِ کی طرح یہاں باءآلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ خَـرَجَ بِسَیْـفِـهٖ کی طرح باءبمعنی مع کے ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اسے پیدا کیا درآں حالا یکہ ہمارے دنیوی اور اخروی انعامات اس کے شامل حال تھے جن کی رعایت کرکے وہ سعادت کبریٰ حاصل کرسکتا ہے۔

رَجُلٌ یَدِیٌّ وَامْرَءَ ۃٌ یَدِیَّۃٌ: ماہر کاریگر مرد وعورت۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِیْ اَیْدِیْهِمْ﴾ (۷۔۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں سُقِطَ فِیْ اَیْدِیْهِمْ معنی نادم ہونے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔فُلَانٌ سُقِطَ فِیْ یَدِهٖ وَاُسْقِطَ وہ پشیمان ہوا یا اس کے معنی حسرت سے ہاتھ ملنے کے ہیں۔ جسے فرمایا:

﴿فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْهَا﴾ (۱۸۔۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴۔۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے حق بات کو قبول نہ کیا جس کے قبول کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا جیسا کہ محاورہ ہے۔رَدَّ یَدَهٗ فِیْ فَمِهٖ: یعنی اس کی بات نہ مانی۔

بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ انہوں نے انبیاء کرام کے ہاتھوں کو ان کے مونہوں کی طرف لوٹا دیا یعنی ان سے کہنے لگے کہ اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہو اور بعض نے اَیْدِیْهِمْ سے مراد انعامات لیے ہیں یعنی انہوں نے پیغمبروں تک کی تکذیب کرکے ان کے احسانات کو ان کے مونہوں پر دے مارا یعنی ان کے نصائح اور مواعظ پر کان نہ دھرا جو ان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔

(ی س ر)

اَلْیُسْـرُ کے معنی آسانی اور سہولت کے ہیں۔ عُسْرٌ کی ضد ہے۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ

الْعُسْرَ﴾ (۲۔۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے۔اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ (۶۵۔۷) خدا عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشے گا۔

﴿وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا﴾ (۱۸۔۸۸) بلکہ اس سے نرم بات کہیں گے۔

﴿فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا﴾ (۵۱۔۳) پھر نرمی سے چلتی ہیں۔

تَيَسَّرَ كَذَا وَاسْتَيْسَرَ کے معنی آسان ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۲۔۱۹۶) اگر رستے میں روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو، کردو۔

﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ (۷۳۔۲۰) تو جتنا آسانی سے ہوسکے پڑھ لیا کرو۔

اسی سے اَيْسَرَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے سہولت سے بچہ جننے کے ہیں۔

يَسَّرْتُ كَذَا کے معنی کسی کام کو آسان اور سہل کردینے کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ﴾ (۵۴۔۱۷) اور ہم نے قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے آسان کردیا۔

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹۔۹۷) (اے پیغمبر) یہ (قرآن) تمہاری زبان میں آسان (نازل) کیا ہے۔

اَلْيُسْرٰى: (اسم) بمعنی یُسْر قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ (۹۲۔۷) اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ (۹۲۔۱۰) اسے سختی میں پہنچائیں گے۔میں عُسْرٰی کے ساتھ تَیسیر کا لفظ بطور تہکم لایا گیا ہے۔جس طرح کہ آیت۔

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (۴۵۔۸) میں عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اَلْيَسِيْرُ وَالْمَيْسُوْرُ سہل اور آسان۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا﴾ (۱۷۔۲۸) تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو۔

اور کبھی یَسِیْر کے معنی حقیر چیز بھی آتے ہیں۔چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿يُضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا﴾ (۳۳۔۳۰) اس کو دوگنی سزا دی جائے گی اور یہ (بات) خدا کو آسان ہے۔

میں لفظ یَسِیْرًا کے معنی آسان اور سہل کے ہیں اور آیت ﴿وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا﴾ (۳۳۔۱۴) اور اس کے لیے بہت کم توقف کریں۔

میں اس کے معنی بہت کم عرصہ کے ہیں۔

اَلْمَيْسَرَةُ وَالْيَسَارُ کے معنی غنا اور مالی وسعت کے ہیں۔چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ (۲۔۲۸۰) تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)

اور یَسَارٌ کا لفظ کبھی یَمِیْن کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے بعض اس کو یِسَارٌ بکسرالیا پڑھتے ہیں۔اَلْيَسَرَاتُ: پاہائے سبک

اَلْمَيْسِرُ: (قمار بازی) یہ بھی یُسْرٌ سے مشتق ہے (کیونکہ قمار بازی میں بھی بلا تکلف مال حاصل ہوجاتا ہے۔

(ی ق ن)

اَلْیَقِیْنُ کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایہ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں۔اسی لیے یہ صفات علم سے ہے اور معرفت، درایۃ وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ عِلْمُ الْیَقِیْنِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے۔لیکن مَعْرِفَۃُ الْیَقِیْنِ نہیں بولتے۔ اور علم الیقین، وعین الیقین، وحق الیقین میں قدرے معنوی فرق پایا جاتا ہے۔ جسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے۔اِسْتَیْقَنَ وَاَیْقَنَ یقین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ (۴۵۔۳۲) ہم اس کو محض ظن ہی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا۔

﴿وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ﴾ (۵۱۔۲۰) اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

﴿لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ﴾ (۴۵۔۴) یقین کرنے والوں کے لیے اور آیت کریمہ:۔

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا﴾ (۴۔۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہو جانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن وتخمین سے ان کے قتل ہو جانے کا حکم لگاتے ہیں۔

(ی م م)

اَلْیَمُّ کے معنی دریا اور سمندر کے ہیں۔قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ﴾ (۲۸۔۷) تو اسے دریا میں ڈال دینا۔یَمَّمْتُ کَذَا وَتَیَمَّمْتُ: قصد کرنا قرآن میں ہے۔﴿فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا﴾ (۵۔۶) تو پاک مٹی لو۔یَمَّمْتُهٗ بِرُمْحِیْ میں نے اسے نیزے کا نشانہ بنایا اَلْیَمَامُ: جنگلی کبوتر کو کہتے ہیں اور یَمَامَۃٌ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام پر (صوبہ یمن کے ایک) شہر کا نام اَلْیَمَامَۃ رکھا گیا تھا۔

(ی م ن)

اَلْیَمِیْنُ کے اصل معنی دایاں ہاتھ یا دائیں جانب کے ہیں۔اور آیت کریمہ:۔﴿وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ﴾ (۳۹۔۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

میں حق تعالیٰ کی طرف یمین کی نسبت مجازی ہے۔جیسا کہ ید وغیرہا کے الفاظ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔یہاں آسمان کے لیے یمین اور بعد میں آیت:۔

﴿وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ﴾ (۳۹۔۶۷) (اور قیامت کے دن) تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔ارض کے متعلق قَبْضَۃٌ کا لفظ لانے میں (ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے) جو اس کتاب کے بعد بیان ہوگا۔اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ﴾ (۳۷۔۲۸) تم ہی ہمارے پاس دائیں (اور بائیں) سے آتے تھے۔

میں یمین سے مراد جانب حق ہے یعنی تم جانب حق سے ہمیں پھیرتے تھے اور آیت کریمہ:۔

﴿لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ﴾ (۶۹۔۴۵) تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔

میں دایاں ہاتھ پکڑ لینے سے مراد روک دینا ہے۔ جیسے

محاورہ ہے:۔ خُذْ بِيَمِيْنِ فُلَانٍ عَنْ تَعَاطِي الْهِجَاءِ: یعنی فلاں کو ہجو سے روک دو۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کا داہنا ہاتھ چونکہ اعضا میں افضل سمجھا جاتا ہے اس لیے معنی یہ ہونگے کہ ہم بہتر حال میں بھی اسے باشرف اعضا سے پکڑ کر منع کر دیتے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۲۷) اور دہنے ہاتھ والے۔

میں داہنی سمت والوں سے مراد اہل سعادت ہیں کیونکہ عرف میں میامن (بابرکت) کو یمین اور مشائم (منحوس) کوشمال کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر یمین کا لفظ برکت وسعادت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ﴾ (۵۶۔۹۰،۹۱) اگر وہ دائیں ہاتھ والوں (یعنی اصحاب خیر وبرکت) سے ہے تو (کہا جائے گا کہ) تجھ پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔ اوراسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ [1] (الوافر)

(۴۶۲) اِذَا مَا رَايَةٌ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ
تَلَقَّاهَا عَرَابَةُ بِالْيَمِيْنِ

جب کبھی فضل ومجد کے کاموں کے لیے جھنڈا بلند کیا جاتا ہے تو عَرَابَةَ اسے خیر وبرکت کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔

نیز اَلْيَمِيْنُ بمعنی دایاں ہاتھ سے استعارہ کے طور پر لفظ يَمِيْنٌ قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ (عرب) قسم کھاتے یا عہد کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (۶۸۔۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو قیامت کے دن تک چلی جائیں گی۔

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (۶۔۱۰۹) اور یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (۲۔۲۲۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ﴾ (۹۔۱۲) اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور عربی محاورہ وَيَمِيْنُ اللّٰهِ (اللہ کی قسم) میں يَمِيْن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی جاتی ہے۔ کہ قسم کھانے والا اللہ کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ اور جب ایک شخص دوسرے سے عہدو پیمان باندھتا ہے تو وہ اس کا مَوَالِي الْيَمِيْن کہلاتا ہے اور کسی چیز پر ملک اور قبضہ ظاہر کرنے کے لیے فِيْ يدِ یْ کی بنسبت مِلْكُ يَمِيْنِي کا محاورہ زیادہ بلیغ

[1] قاله شماخ بن ضرار النهشلى يمدح عرابة الاوسى فيما بذل له وسق بعير تمرا وكان مدحه سببا لاشتهار الاوسى الصحابى والبيت فى الشعراء (۱: ۲۷۸) والاصابة (۴: ۲۳۴) والخزانة (۱: ۴۵۳/۲: ۲۲۳) والبحر المحيط (۱: ۱۶۰) والعمدة (۱: ۴۱/۲: ۱۳۱) وامالى القالى (۱: ۲۷۱) واسد الغابة (۳: ۳۹۹) ونقد الشعر ۲۵ وهو غير منسوب فى الطبرى (۲۳: ۳۲) واللسان (يمن والسمط (۶۰۷) وابن الشجرى (۲: ۱۶۵) والكامل (۱۳۳، ۶۴۵) والمشكل للقبتى (۱۸۸) وقبانه: رايت عرابة الاوسى يسمو۔ الى الخيرات منقطع القرين والبيتان فى تاريخ الطبرى (۲: ۱۹۱) والمنتخب ۳۸۴ ونقد الشعر (۱: ۱۹۰) وابن الانبارى (۵۷۵) والعقد (۲: ۲۸۸)۔

ہے۔ اسی بنا پر غلام او رلونڈیوں کے بارے میں قرآن پاک نے اس محاورہ کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
﴿مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (۴۔۲۵) جو تمہارے قبضے میں آ گئی ہوں۔
اور حدیث میں حجر اسود کو یمین اللہ کہا گیا ہے۔ ❶ (۱۶۳) کیونکہ اس کے ذریعہ قرب الٰہی کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔
يَمِيْنٌ سے يُمْنٌ کا لفظ ماخوذ ہے جو خیر و برکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ هُوَ مَيْمُوْنُ النَّقِيْبَةِ: وہ سعادت مند ہے اور مَيْمَنَةٌ کے معنی دائیں جانب بھی آتے ہیں۔

(ی ن ع)

يَنَعَتِ (ف) اَلثَّمْرَةُ يَنْعًا وَيُنْعًا وَاَيْنَعَتْ (افعال) اَيْنَاعًا کے معنی پھل کے پک کر بالکل تیار ہو جانے کے ہیں اور پختہ پھل کو يَانِعَةٌ يَا مُوْنِعَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔
﴿اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَا اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ﴾ (۶۔۱۰۰) یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلنے کو اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو۔
ابن ابی اسحاق کی قراءت میں وَيُنْعِهٖ (ضمہ یاء کے ساتھ) ہے۔ جو کہ يَانِعٌ کی جمع ہے اور يَانِعٌ کے معنی نہایت پختہ پھل کے ہیں۔

(ی ء س)

اَلْيَأْسُ: (مصدر س) کے معنی نا امید ہونے کے ہیں۔ اور يَئِسَ (مجرد) وَاسْتَيْأَسَ (استفعال) دونوں ہم معنی ہیں جیسے عَجِبَ فَاسْتَعْجَبَ وَسَخِرَ وَاسْتَسْخَرَ قرآن پاک میں ہے:۔
﴿فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا﴾ (۱۲۔۸۰) جب وہ اس سے نا امید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔
﴿حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ﴾ (۱۲۔۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبر نا امید ہو گئے۔
﴿قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ﴾ (۶۰۔۱۳) جس طرح کافروں کو مُردوں (کے جی اٹھنے) کی امید نہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی آخرت (کے آنے) کی امید نہیں۔
اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ: تو نا امید (اور) ناشکرا (ہو جاتا) ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
﴿اَفَلَمْ يَايْئَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۱۳۔۳۱) تو کیا مومنوں کو اس سے اطمینان نہیں ہے۔
کی تفسیر میں بعض نے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی اَفَلَمْ يَعْلَمْ کے ہیں یعنی کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں بلکہ یہ اس کے لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انتفاء کا علم اس سے نا امید ہونے کو مستلزم ہوتا ہے لہٰذا یہاں بھی (بلحاظ قرائن) یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ يَيْئَسُ بمعنی يَعْلَمُ ہے۔

(ی و م)

اَلْيَوْمَ: (ن) یہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے۔ اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

---

❶ والحدیث فی نزهة المجالس ۱۲۔

خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا اک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔قرآن پاک میں ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ﴾ (۳۔۱۵۵) جولوگ تم سے (احد کے دن) جب کہ...... دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ ہو گئیں (جنگ سے بھاگ گئے۔

﴿قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (۴۱۔۹) کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔

میں زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کے معنی اور اس کی تحقیق اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کی جائے گی اور کبھی یَوْمٌ کے بعد "اذ" بڑھا دیا جاتا ہے اور (اضافت کے ساتھ) یَوْمَئِذٍ پڑھا جاتا ہے اور یہ کسی معیّن زمانہ کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس صورت میں یہ معرب بھی ہوسکتا ہے۔اور "اذ" کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے مبنی بھی۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وَ اَلْقَوْا اِلَی اللّٰهِ یَوْمَئِذِ نِ السَّلَمَ﴾ (۱۶۔۸۷) اور اس روز خدا کے سامنے سرنگوں ہوں جائیں گے۔

﴿فَذٰلِکَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ﴾ (۷۴۔۹) وہ دن بڑی مشکل کا دن ہوگا۔اور آیت کریمہ:۔

﴿وَ ذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ﴾ (۱۴۔۵) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ میں ایام کی لفظِ جلالت کی طرف اضافت تشریفی ہے اور ایام سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و انعام کے سمندر بہا دیئے تھے۔

(یٰسٓ)

یٰسٓ: (۳۶۔۱) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اے انسان کے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ دوسرے اوائل سُوَر کی طرح یہ بھی حروف مقطعات سے ہے۔

(الیاء)

یہ حروف ندا میں سے ہے اور دور سے کسی کو آواز دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔مگر جب ذات باری تعالیٰ کو دعا کے وقت یارب کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہے بلکہ اس امر پر تنبیہ کے لیے ہے کہ دعا کنندہ اپنے آپ کو اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے دور خیال کرتا ہے۔

❀❀❀

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
فَقَدْ تَمَّتْ بِفَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی